مرتبہ
مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

12

پچاس افسانے
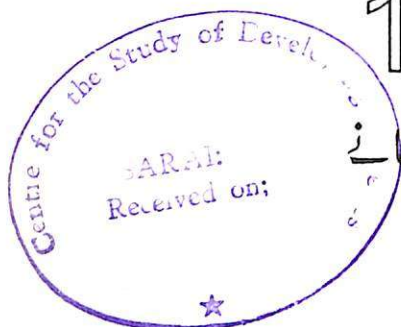
مرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظرعام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیات پریم چند" کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان جلدوں میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،

ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،

متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک، تراجم : جلد 21 و جلد 22

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

"کلیات پریم چند" کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید مشوروں کا خیر مقدم ہے۔

اگر پریم چند کی کوئی تحریر / تحریریں دریافت ہوتی ہیں تو آئندہ ایڈیشنوں میں انھیں شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل براے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کر کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکرگزار ہے۔ ''کلیات پریم چند'' کے مرتب مدن گوپال اور پروجکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل براے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ''کلیاتِ پریم چند'' کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل براے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

پیش گفتار

منشی پریم چند کا شمار اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان سے پہلے پریوں کے قصے اور طلسمی واقعات پر مبنی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ہریجنوں اور کسانوں کے ساتھ ظلم اور بے انصافی، بے جوڑ شادیاں اور لوٹ کھسوٹ کے واقعات جو سماج کو گھن کی طرح سے کھائے جارہے تھے، ان کا ذکر ادب میں اس لیے نہیں ہوتا تھا کیونکہ ادیبوں کا کام سماجی اصلاح نہیں بلکہ ادبی تفریح اور ادب کو اعلیٰ معیاروں پر پیش کرنا تھا۔ سماجی واقعات کے بارے میں صرف اخبارات لکھتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی کے مطابق ہے اور اللہ کی مرضی کے خلاف انسان کا دخل ممکن نہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب سماجی بیداری کی لہر اٹھ کھڑی ہوئی تو لامحالا ادیب بھی اس بیداری سے متاثر ہوئے۔ پریم چند نے خاص طور سے ان اثرات کو قبول کیا اور کہا کہ تفریح مہیا کرانا بھانڈوں اور نقادوں کا کام ہے۔ مصنف کا فرض ہے کہ ادب کو سیاسی سماجی اور مذہبی اصلاحات کا ذریعہ بنائے۔ جب ادیب ہاتھ میں قلم اٹھائے تو اسے احساس ہونا چاہیے کہ وہ سماج کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے گا اور سوتے ہوؤں کو جگائے گا۔ اگر وہ یہ کام نہیں کرسکتا تو وہ ناکام مصنف ہے۔

پریم چند کی پہلی کہانی کا عنوان تھا ''دنیا کا سب سے انمول رتن''۔ یہ کہانی اور اس دور کی چار اور کہانیوں (شیخ مخمور، یہ میرا وطن ہے، صلہء ماتم، عشق دنیا اور حب وطن) کو سوز وطن مجموعہ میں زمانہ پریس نے اپریل 1908 میں نواب رائے کے نام سے

شائع کیا۔

پریم چند کے اپنے الفاظ میں، "اس وقت ملک میں تقسیم بنگال کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑ چکی تھی"۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔ دیباچے میں لکھا تھا۔ "ہر ایک قوم کا علم ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اوپر کچھ نہیں تھا۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدیدی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال رفیع ہو جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقطہ جمائیں"۔ سوز وطن کا اشتہار اگست 1908 میں زمانہ میں شائع ہوا۔ اشتہار شاید مصنف نے آپ ہی لکھا تھا، یہ تھا۔

"سوز وطن سوز وطن سوز وطن"۔

"زمانہ کے مشہور اور مقبول مضمون نگار منشی نواب رائے کی تازہ ترین اور بہترین اردو زبان میں حسن و عشق، وصل و فراق، عیاری و مکاری، جنگ و جدل وغیرہ کی بہت سی داستانیں موجود ہیں اور ان میں بعض بہت ہی دلچسپ ہیں۔ مگر ایسے قصے جن میں سوز وطن کی چاشنی ہو، جن میں حب وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے، اس وقت تک معدوم تھے۔ اس کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں۔ ممکن ہے کہ انھیں پڑھ کر ناظرین کے دل میں وطن کی الفت کا پاک جذبہ موجزن

ہو جائے۔ بیانیہ نہایت لطیف اور دلکش ہے اور اندازِ بیان رقت آمیز۔ سائز چھوٹا، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا سودیشی قسم اول اور نیز معمولی سودیشی کاغذ پر۔ قیمت چار آنہ قسم دوم معمولی سودیشی کاغذ پر قیمت تین آنہ۔ چھ جز کی کتاب اس قیمت پر مفت ہے"۔

فرمائش بنام منیجر زمانہ، نیا چوک، کانپور۔

سوزِ وطن کے تبصرے آریہ گزٹ، سوراجیہ، ہندوستان وغیرہ میں شائع ہوئے۔ فروری 1909 میں نواب رائے نے سوزِ وطن کی ایک کاپی ہندی کے مشہور رسالہ سرسوتی کے ایڈیٹر کو تبصرہ کے لیے بھیجی۔ ایڈیٹر مہاویر پرساد دویدی نے لکھا "اس کتاب کی رچنا اردو کے مشہور ادیب نواب رائے نے کی ہے۔ قیمت 4 آنہ، ملنے کا پتہ بابو وجے نرائن لال نیا چوک کانپور"۔ یہ وجے نرائن لال نواب رائے کے ہم عمر اور سوتیلی ماں کے بھائی تھے اور نواب رائے کے گھر پر ہی رہتے تھے۔ مصنف نواب رائے کا پتہ اس طرح پبلک کے سامنے آگیا۔

سوزِ وطن زمانہ پریس میں چھپی تھی۔ غلطی سے زمانہ پریس کے نام کو کتاب پر نہیں دیا گیا۔ اس وقت کے قانون کے تحت یہ ایک جرم تھا۔ پولیس نے تفتیش شروع کردی، اور انھیں پتہ چلا کہ کتاب کا مصنف نواب رائے ایک سرکاری ملازم ہے جس کا اصل نام دھنپت رائے ہے۔ اطلاع حکام تک پہنچی۔ ضلع کے کلکٹر نے دھنپت رائے کو طلب کیا اور جیسا پریم چند نے "اپنی کہانی" میں لکھا ہے۔ دھنپت رائے سے سوزِ وطن کی ہر کہانی کے بارے میں جانکاری حاصل کرکے کہا کہ ان سب کہانیوں میں Sedition (بغاوت) بھرا ہے۔ اگر تم مغل راج میں ہوتے تو تمھارے ہاتھ کاٹ دیے جاتے۔ شکر ہے برٹش سرکار ہے۔ جتنی کاپیاں پڑی ہیں ان کو کلکٹر کے حوالے کردو"۔ دھنپت رائے کو تاکید بھی کی گئی کہ آگے سے لکھنا بند کرو۔ اگر لکھو تو سرکاری محکمے کی اجازت لے کر۔

ادھر نواب رائے کے افسانوں کی شہرت اور اُدھر یہ پابندی۔ ایک قصہ "آتش کدۂ گناہ" زمانہ کے دفتر میں پڑا تھا۔ دیانرائن نگم نے اس کے مصنف کا نام نواب رائے کے بجائے "افسانہ کہن" لکھا۔ یہ مارچ 1910 کے زمانہ میں چھپا۔ اپریل 1910 کے شمارے میں ایک اور افسانہ چھپا۔ عنوان تھا "سیر درویش" اس پر مصنف کا نام نواب رائے ہی دیا گیا، مگر اپریل اور مئی کی قسطوں پر کوئی نام نہیں۔ صرف جملہ حقوق محفوظ لکھا

گیا۔ اگست 1910 کے شمارے میں ایک قصہ چھپا "رانی سارندھا" مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔

سرکاری حکم کی تعمیل سے بچنے کے لیے دھنپت رائے نے ایک نیا قلمی نام اختیار کیا۔ یہ تھا پریم چند۔ اس کے نام سے شائع ہونے والی پہلی کہانی تھی "بڑے گھر کی بیٹی"۔ یہ دسمبر 1910 کے زمانہ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ نام میں کچھ جادو تھا۔ یہ قصہ دنیا بھر کی زبانوں سے ٹکر لے سکتا تھا۔ کیونکہ اس نام کو دیانرائن نگم نے ہی تجویز کیا تھا، یہ نام صرف زمانہ کے لیے ہی محدود تھا۔ ایک نیا رسالہ ادیب نکلا تھا اس کے ایڈیٹر تھے ان کے دوست پیارے لال شاکر میرٹھی۔ اس میں مصنف کا نام اس طرح لکھا جاتا تھا۔ "د۔ر" (دھنپت رائے)

پریم چند کے افسانے بہت مقبول ہوئے۔ دھوم مچ گئی۔ اردو سے ہندی میں ترجمے ہوئے اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے ترجمے شائع ہونے لگے۔ پریم چند نے سوچا پچیس افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے، وہ افسانے تھے، ماممتا، وکرما دتیہ کا تیغہ، بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، راج ہٹ، راجہ ہردول، نمک کا داروغہ، عالم بے عمل، گناہ کا اگن کنڈ، بے غرض محسن، آہ بیکس، آلہا، خون سفید، صرف ایک آواز، اندھیر، بانکا زمیندار، تریا چرتر، سوت، شکاری راج کمار، کرموں کا پھل، مناؤن، مرہم، اماوس کی رات، غیرت کی کٹار، منزل مقصود۔ افسانے مقبول تھے مگر پبلشروں کا قحط تھا۔ کوئی شائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ پریم چند نے فیصلہ کیا کہ اسے زمانہ پریس سے شائع کرایا جائے۔ دیانرائن سے شرکت کی بات کی۔ اگر نقصان ہوا تو آدھا آدھا۔ زمانہ پریس کو پیشگی درکار تھی مگر منیجر نے مطلع کیا کہ ان کو رسالہ سے ملنے والی رقم پیشگی رقم سے زیادہ ہے۔ خیر خط و کتابت شروع ہوئی۔ یکم اکتوبر 1913 کو پریم چند نے دیا نرائن نگم کو لکھا "غالباً پریم پچیسی اب شب بلا تک نہ چھپ سکے گی ...... اگر آپ کا پریس اتنا وقت ہی نہ نکال سکے تو میں بدرجہ مجبوری یہ التماس کروں گا کہ یا تو میرے 72 روپے عطا فرمائیں یا پریم پچیسی کے 4½ جزو چھپے ہوئے ریل کے ذریعے میرے پاس بھیج دیں۔ غالباً میں ان درخواستوں میں غیر معقولیت سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں کسی دوسرے پبلشر کو ڈھونڈوں گا۔ صرف دیباچہ اور ٹائٹل کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی نہ ہوسکا تو شہد اور

گھی لگا کر ان اوراق پریشاں کو چاٹوں گا اور سمجھوں گا کہ زرخود میحورم، یا میوۂ در محنت خود میخورم۔ بہرحال آپ جو کچھ فیصلہ کریں جلد کریں اور مجھے مطلع فرمائیں۔ قیامت کے انتظار میں بیٹھنے سے تو یہی بہتر ہے کہ جو کچھ اس وقت ملتا ہے مل جائے"۔

اگلے ہی مہینے : "آپ میری کتاب (جلد اوّل) جلدی سے چھپوا دیجیے تاکہ اس کی قدردانی دیکھ کر دوسرے حصے میں ہاتھ لگے اور کچھ منافع بھی ہو۔ کیا کہوں آپ نے مجھے اچھالنے میں کوئی کسر نہیں رکھی، خوب اچھالا، مگر میں ہی قسمت کا لنڈورا ہوں کہ پرواز نہیں کر سکتا بلکہ نیچے گرنے کے لیے ڈرتا ہوں"۔ بعد میں پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا کہ پریم پچیسی میں نے اپنے خرچ پر زمانہ پریس سے چھپوائی تھی۔

پریم پچیسی دو حصوں میں شائع ہوئی تھی۔ حصہ اول کو چھپنے میں دو سال لگ گئے۔ یہ 1914 میں شائع ہوئی۔ پریم پچیسی کی کاپیاں تبصرہ کے لیے ارسال کی گئیں۔ اشتہار چھپوائے گئے۔ کاپیاں اعلیٰ ادیبوں اور نقادوں کو بھی بھیجی گئیں تاکہ ان کی رائے آئے اور ان کا رسائل میں دیے جانے والے اشتہاروں میں استعمال کیا جاسکے۔ الناظر لکھنؤ کے ستمبر 1915 کے شمارے میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں ڈاکٹر محمد اقبال کی رائے درج ہے۔ علامہ اقبال نے مصنف کو تحریر فرمایا تھا "آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید اردو لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش زبان میں ادا کرسکتا ہے"۔

منشی جی کی کہانیاں اردو میں مقبول تو تھیں مگر کتابی صورت میں یہ بکتی نہیں تھیں۔ 2/ مارچ 1917 کو پریم چند نے دیانرائن نگم کو لکھا "پریم پچیسی حصہ دوم میں ذرا سرگرمی فرمایئے۔ جلدی ختم ہو جائے۔ ابھی بہت کچھ چھپوانا ہے۔ اگر پہلی منزل میں اتنا رُکے تو پھر اتنی لمبی زندگی کہاں سے آئے گی۔ تعطیل گرما کے پہلے ختم ہو جانا ضروری ہے"۔

پریم پچیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو لکھا کہ "اس کے چھپوانے

کا کام شروع کردیا ہے۔ اور یہ یکم جولائی 1917 تک پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا"۔
زمانہ کے مدیر نے لکھا "یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ منشی پریم چند کے افسانوں نے پبلک میں کتنی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ امر تسلیم ہے کہ صاحب موصوف کے زبردست اور عظیم قلم نے اپنے جادو بھرے قصوں میں اخلاقی اوصاف، حب وطن و حسن و عشق کی بولتی چالتی تصویریں اور ان کے نہایت پاکیزہ پہلو کو نرالے ڈھنگ میں دکھائے ہیں۔ پریم پچیسی حصہ دوم میں ایسے دلچسپ اور پُر اثر قصے درج کیے گئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شائقین جو منشی پریم چند صاحب کے جادونگار کا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں قیمت ایک روپیہ"۔

پریم پچیسی کا حصہ اول 1914 میں شائع ہوا تھا حصہ دوم 1918 میں۔ ایک سال بعد پریم چند نے نگم کو لکھا کہ "آپ کے منیجر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم پچیسی حصہ دوم کی کل 119 جلدیں نکلی ہیں۔ اس حساب سے تو شاید کتاب میری زندگی میں بھی نہ نکل سکے گی"۔

اس ناامیدی کے برعکس وہ پریم بتیسی کی اشاعت کے لیے تیار تھے۔ دو حصوں میں بتیس قصے تھے: سرِ پُر غرور، راجپوت کی بیٹی، نگاہِ ناز، بیٹی کا دَھن، دھوکا، پچھتاوا، شعلۂ حسن، اناتھ لڑکی، پنچایت، سوت، بانگِ سحر، مرضِ مبارک، قربانی، دفتری، دو بھائی، بازیافت، بوڑھی کاکی، بینک کا دیوالا، زنجیر ہوس، سوتیلی ماں، مشعلِ ہدایت، خنجر وفا، خوابِ پریشاں، راہِ خدمت، جج اکبر، آتما رام، ایمان کا فیصلہ، فتح، دُرگا کا مندر، خونِ حرمت، اصلاح اور جگنو کی چمک۔ اگست 1919 میں نگم کو لکھا کہ "ذرا منیجر صاحب زمانہ سے دریافت کر کے مطلع کریں کہ بتیسی کی چھپائی فی جز کتنی ہوگی۔ اس معاملے میں مجھے امید ہے کہ آپ کے امکان میں جتنی رعایت ہوگی اس سے دریغ نہ فرمائیں گے"۔ تین مہینے بعد "پریم بتیسی کے مضامین کی ترتیب بھیجتا ہوں کتاب شروع کردیجیے"۔

کچھ ہی دنوں بعد پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا "پریم بتیسی حصہ اول چھپ رہی ہے۔ غالباً دو مہینے میں تیار ہوجائے گی۔ کیا آپ پریم بتیسی کا حصہ دوم اپنے اہتمام (دارالاشاعت) سے شائع نہیں کرسکتے۔ بازارحسن تو ابھی معلوم نہیں کب تک تیار ہو۔ اس اثنا میں اگر بتیسی حصہ دوم آپ شائع کرسکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے

دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ میں دے دوں گا۔ کوئی دس جزو کی کتاب ہوگی"۔ امتیاز علی تاج پریم بتیسی حصہ دوم کی اشاعت کے لیے تیار ہوگئے۔ پریم چند نے 30 ستمبر 1919 کو لکھا "حصہ دوم کے لیے میں نے کون کون سے قصے تجویز کیے تھے۔ ان کی فہرست مجھے بھیج دیجیے۔ مجھے یاد نہیں آتا"۔ "مسطر 21 سطروں کا ہونا چاہیے (کیونکہ) اسی پر حصہ اول چھپ رہا ہے۔ کاغذ میں نے حصہ اول کے لیے بیس پاؤنڈ کا لگایا ہے اگر آپ بھی یہی کاغذ لگائیں تو دونوں حصوں میں یکسانیت آجائے اور تب قیمت بھی یکساں رکھی جائے گی۔ گھٹیا کاغذ لگانا بے جوڑ ہوگا"۔ 16 دسمبر 1919 کے خط میں "کاغذ برا نہیں ہے۔ اس پر چھپنے دیجیے۔ چھپے ہوئے فارم رد کر دینے سے نقصان ہوگا۔ میرا کاغذ ان سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن مضائقہ نہیں۔ سستا کاغذ رہے گا تو کتاب بھی ارزاں ہوگی۔ مسطر یہی رکھا جائے مگر کاتب کو تاکید کر دی جائے کہ مکالمے ہمیشہ نئی سطروں سے شروع کیا کرے"۔ چار مہینے بعد 22 اپریل 1920 کو "معلوم نہیں کاغذ دستیاب ہوا یا نہیں۔ میرے ہندی پبلشر کلکتہ سے آپ کے پاس ہر قسم کا کاغذ سُبھتے کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ نصف قیمت پیشگی درکار ہوگی۔ اگر آپ اسے منظور فرمائیں تو کاغذ آجائے گا"۔ 16 جون 1920 "سن کر خوشی ہوئی کہ کاغذ آگیا اور پریم بتیسی کی کتابت مکمل ہوگئی اب تو اسے چھپوا بھی ڈالیں۔ حصہ اول بھی غالباً آخر جولائی تک تیار ہوجائے گا۔ جولائی تو کیا اگست آخر تک۔ حصہ اول ابھی تک دیانرائن نگم صاحب کی بے توجہی کے سبب معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ مگر امید ہے کہ حصہ دوم کا شائع ہونا تازیانے کا کام دے گا۔ اور یہی میری غرض تھی"۔

دیانرائن نگم کو کاغذ کے دستیاب ہونے میں مشکلات تھیں۔ پریم چند نے 10 دسمبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی کا ٹائٹل ابھی لگایا یا نہیں؟ اب تو للله دیر نہ کیجیے۔ جیسا کاغذ ملے اچھا یا بُرا بڑھیا یا گھٹیا، براؤن، کالا، پیلا، نیلا، سبز، سرخ، نارنگی، لیکن ٹائٹل چھپوا دیجیے اور کتاب کی چھ سو جلدیں (قسم اول 500، قسم دوم 100) لاہور بھجوا دیجیے"۔ دس دن بعد "بتیسی کا پیکٹ ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر رُو دیا۔ بس اور کیا لکھوں۔ کتاب کی مٹی خراب ہوگئی۔ آپ نے بہتر کاغذ نہ پاکر وہ کاغذ استعمال کرلیا ہوگا۔ غالباً کتاب کی تقدیر میں اس طرح بگڑنا لکھا تھا۔ خیر فی الحال چلنے دیجیے۔ لاہور والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ ٹائٹل بدل ڈالیں۔ آپ کے یہاں بھی اچھا کاغذ ملتے ہی ٹائٹل بدلنا پڑے گا۔ کچھ نقصان

ہوگا مگر غم نہیں"۔

پریم چند نے دیانرائن نگم کو پھر لکھا "پریم بتیسی ابھی تیار ہوکر نہیں آئی۔ ٹائٹل پیج میں زیادہ تردد اور جلدیں تیار ہونے کی امید نہ ہو تو آپ اس کی سات سو جلدیں بغیر ٹائٹل کے لاہور دفتر کہکشاں کو روانہ کردیں۔ وہ اپنا ٹائٹل چھپوا کر لگالیں گے اجرت مجھ سے وضع کرلیں گے"۔

پریم بتیسی کے دیباچے میں پریم چند نے لکھا "میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ پریم پچیسی کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا اڈیشن ختم ہونے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے۔ یہ قدردانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی۔ لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے اردو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یا سارا تو بار اشاعت کے گودام ہی میں پڑا سڑے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا۔ اب صرف یہی آرزو ہے کہ ایک منتخب مجموعہ پریم چالیسا یا پریم پچاسا کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا ماحصل ہوگا اور اسی پر قناعت کروں گا"۔

پریم بتیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو 30 اکتوبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی دیکھا، باغ باغ ہوگیا۔ مجھے یہ مجموعہ نہایت پسند آیا۔ کتابت اور جلی ہوتی تو بہتر ہوتا، تب قیمت اور زیادہ رکھنی پڑتی فی الجملہ کتاب خوب چھپی ہے۔ اور میں اس کے لیے آپ کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ دیکھیں پبلک اس کی کیا قدر کرتی ہے۔ پہلا حصہ بھی شاید اس ماہ میں تیار ہوجائے۔ میں نے زمانہ کو لکھ دیا ہے کہ آپ کے یہاں پانچ سو کتابیں بھیج دیں"۔

اپنے دوست دیانرائن نگم کے زمانہ پریس سے اتنے پریشان تھے کہ جب زمانہ پریس کے منیجر نے پریم چند کو لکھا کہ پریم پچیسی کے دونوں حصے ختم ہوچکے ہیں اور انھوں نے دوسرے اڈیشن کے لیے اصرار کیا تو پریم چند نے امتیاز علی تاج کو (14 ستمبر 1920) لکھا کہ "میں نے عہد کر لیا ہے کہ زمانہ کی گردش میں نہیں پڑوں گا، اگر آپ اسے نکال سکیں تو بہتر ہے"۔

پریم چند کے افسانوں کے ترجمہ ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی چھپنے لگے، ہندی میں تو ان کا خاص استقبال ہوا۔ پریم چند کے ایک دوست منن دویدی گجپوری تحصیلدار نے پریم چند سے کہا کہ وہ ہندی میں بھی لکھیں۔ ہندی کے مشہور رسالے سرسوتی دسمبر 1915 میں پریم چند کی پہلی کہانی "سوت" شائع ہوئی۔ اردو میں اسی عنوان سے یہ پریم بتیسی میں شامل کی گئی۔

ہندی میں پریم چند کے افسانوں کی دھوم مچ گئی۔ جہاں اردو میں ناشروں کا قحط تھا وہاں ہندی کے ناشروں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جون 1917 میں ان کا پہلا ہندی مجموعہ "سپت سروج" ہندی پستک ایجنسی گورکھپور نے شائع کیا۔ اس میں سات کہانیاں (بڑے گھر کی بیٹی، سوت، سجنتا کا ڈنڈ، پنچ پرمیشور، نمک کا داروغہ، اپدیش اور پریکشا) شامل تھیں۔ اس کے دیباچے میں گجپوری نے لکھا:

"اردو سنسار کے ہندو مہار تھیوں میں پریم چند جی کا استھان بہت اونچا ہے۔ انیک ناموں سے آپ کی پستکیں اردو سنسار کی شوبھا بڑھا رہی ہیں۔ اردو پتروں نے آپ کی رچناؤں کی مکت کنٹھ سے پرشنسا کی ہے۔ ہرش کی بات ہے کہ ماتر بھاشا ہندی نے کچھ دنوں سے آپ کے چت کو آکرشت کیا ہے۔ پریم چند نے اُسے پوجنارتھ ناگری مندر میں پرویش کیا اور ماتا نے اسے ہردلے سے لگا کر اپنے اس لیش شالی پُتر کو اپنایا ہے۔ اس پرتبھا شالی لیکھک مہانُوبھاو نے اتنی جلدی ہندی سنسار میں اپنا نام کر لیا ہے کہ آشچریہ ہوتا ہے۔ آپ کی کہانیاں ہندی سنسار میں انوٹھی چیز ہیں۔ ہندی پتر پتریکائیں آپ کے لیکھوں کے لیے لالائت رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا وِچار ہے کہ آپ کی گلپیں ساہتیہ مارتنڈ رویندر بابو کی رچناؤں سے ٹکر لیتی ہیں۔ ایسے وِدوان اور پرسدّھ لیکھک کے وشیہ میں لکھنا اناوشیک اور انوچت ہوگا"۔

اگلے سال بمبئی کے ہندی گرنتھ رتناکر نے نو قصوں کو "نو ندھی" کے عنوان سے مجموعہ شائع کیا۔ قصے تھے: راجہ ہردول، رانی سارندھا، مریادا کی بیدی، پاپ کا اگنی کنڈ، جگنو کی چمک، دھوکا، اماوس کی رات، پچھتاوا، ممتا۔ اسی سال گورکھپور کی ہندی پستک ایجنسی نے تیسرا مجموعہ پریم پورنا شائع کیا۔ اس میں پندرہ افسانے شامل کیے گئے۔ افسانے تھے: ایشوریہ نیائے، شنکھ ناد، خون سفید، غریب کی ہائے، دوبھائی، بیٹی کا دھن، دھرم

ہو گا مگر غم نہیں"۔

پریم چند نے دیانرائن نگم کو پھر لکھا "پریم بتیسی ابھی تیار ہو کر نہیں آئی۔ ٹائٹل پیج میں زیادہ تردد اور جلدیں تیار ہونے کی امید نہ ہو تو آپ اس کی سات سو جلدیں بغیر ٹائٹل کے لاہور دفتر کہکشاں کو روانہ کردیں۔ وہ اپنا ٹائٹل چھپوا کر لگالیں گے اجرت مجھ سے وضع کرلیں گے"۔

پریم بتیسی کے دیباچے میں پریم چند نے لکھا "میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ پریم پچیسی کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا اڈیشن ختم ہونے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے۔ یہ قدردانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی۔ لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے اردو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یا سارا تومار اشاعت کے گودام ہی میں پڑا سڑے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا۔ اب صرف یہی آرزو ہے کہ ایک منتخب مجموعہ پریم چالیسا یا پریم پچاسا کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا ماحصل ہوگا اور اسی پر قناعت کروں گا"۔

پریم بتیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو 30 اکتوبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی دیکھا، باغ باغ ہوگیا۔ مجھے یہ مجموعہ نہایت پسند آیا۔ کتابت اور جلی ہوتی تو بہتر ہوتا، تب قیمت اور زیادہ رکھنی پڑتی فی الجملہ کتاب خوب چھپی ہے۔ اور میں اس کے لیے آپ کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ دیکھیں پبلک اس کی کیا قدر کرتی ہے۔ پہلا حصہ بھی شاید اس ماہ میں تیار ہوجائے۔ میں نے زمانہ کو لکھ دیا ہے کہ آپ کے یہاں پانچ سو کتابیں بھیج دیں"۔

اپنے دوست دیانرائن نگم کے زمانہ پریس سے اتنے پریشان تھے کہ جب زمانہ پریس کے منیجر نے پریم چند کو لکھا کہ پریم پچیسی کے دونوں حصے ختم ہوچکے ہیں اور انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے لیے اصرار کیا تو پریم چند نے امتیاز علی تاج کو (14 ستمبر 1920) لکھا کہ "میں نے عہد کر لیا ہے کہ زمانہ کی گردش میں نہیں پڑوں گا، اگر آپ اسے نکال سکیں تو بہتر ہے"۔

پریم چند کے افسانوں کے ترجمہ ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی چھپنے لگے، ہندی میں تو ان کا خاص استقبال ہوا۔ پریم چند کے ایک دوست منن دویدی گجپوری تحصیلدار نے پریم چند سے کہا کہ وہ ہندی میں بھی لکھیں۔ ہندی کے مشہور رسالے سرسوتی دسمبر 1915 میں پریم چند کی پہلی کہانی "سوت" شائع ہوئی۔ اردو میں اسی عنوان سے یہ پریم بتیسی میں شامل کی گئی۔

ہندی میں پریم چند کے افسانوں کی دھوم مچ گئی۔ جہاں اردو میں ناشروں کا قحط تھا وہاں ہندی کے ناشروں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جون 1917 میں ان کا پہلا ہندی مجموعہ "سپت سروج" ہندی پستک ایجنسی گورکھپور نے شائع کیا۔ اس میں سات کہانیاں (بڑے گھر کی بیٹی، سوت، سجنتا کا ڈنڈ، پنچ پرمیشور، نمک کا داروغہ، اپدیش اور پریکشا) شامل تھیں۔ اس کے دیباچے میں گجپوری نے لکھا:

"اردو سنسار کے ہندو مہارتھیوں میں پریم چند جی کا استھان بہت اونچا ہے۔ انیک ناموں سے آپ کی پستکیں اردو سنسار کی شوبھا بڑھا رہی ہیں۔ اردو پتروں نے آپ کی رچناؤں کی مکت کنٹھ سے پرشنسا کی ہے۔ ہرش کی بات ہے کہ ماتر بھاشا ہندی نے کچھ دنوں سے آپ کے چت کو آکرشت کیا ہے۔ پریم چند نے اُسے پوجنارتھ ناگری مندر میں پرویش کیا اور ماتا نے اسے ہردلے سے لگا کر اپنے اس لیش شالی پتر کو اپنایا ہے۔ اس پرتبھا شالی لیکھک مہانوبھاو نے اتنی جلدی ہندی سنسار میں اپنا نام کر لیا ہے کہ آشچریہ ہوتا ہے۔ آپ کی کہانیاں ہندی سنسار میں انوٹھی چیز ہیں۔ ہندی پتر پتریکائیں آپ کے لیکھوں کے لیے لالائت رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا وِچار ہے کہ آپ کی گلپیں ساہتیہ مارتنڈ رویندر بابو کی رچناؤں سے ٹکر لیتی ہیں۔ ایسے ودوان اور پرسدھ لیکھک کے وشیہ میں لکھنا اناوشیک اور انوچت ہوگا"۔

اگلے سال بمبئی کے ہندی گرنتھ رتناکر نے نو قصوں کو "نوندھی" کے عنوان سے مجموعہ شائع کیا۔ قصے تھے: راجہ ہردول، رانی سارندھا، مریادا کی بیدی، پاپ کا اگنی کنڈ، جگنو کی چمک، دھوکا، اماوس کی رات، پچھتاوا، ممتا۔ اسی سال گورکھپور کی ہندی پستک ایجنسی نے تیسرا مجموعہ پریم پورنا شائع کیا۔ اس میں پندرہ افسانے شامل کیے گئے۔ افسانے تھے: ایشوریہ نیائے، شنکھ ناد، خون سفید، غریب کی ہائے، دوبھائی، بیٹی کا دھن، دھرم

سنکٹ، درگا کا مندر، سیوا مارگ، شکاری راج کمار، بلیدان، بودھ، سچائی کا اپہار، مہاتیر تھ۔

جہاں پریم بتیسی کی 1920 میں اشاعت کے بعد آٹھ سال تک اردو کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا وہاں انھیں آٹھ سالوں میں ہندی میں پریم پچیسی (اردو کی کتاب سے مختلف افسانے تھے)۔ ٹالسٹائی کی 22 کہانیاں، بڑے گھر کی بیٹی، نمک کا داروغہ، لال فیتہ، بینک کا دیوالہ کے علاوہ پریم پرسون (گیارہ قصے)، پریم دوادِشی (12 قصے)، پریم پرتکیا (19 قصے)، پریم پرمود (17 کہانیاں)، اگنی سادھی (8 قصے) اور شانتی شائع ہوئے۔

29 اگست 1928 کے خط میں پریم چند نے نگم کو لکھا تھا، ''اپنی کہانیوں کے ایک مجموعہ کو میں نے یہاں خود چھپوانا شروع کیا ہے۔ دس فارم چھپ گئے ہیں۔ شاید ایک فارم اور ہو۔ اس کا نام رکھا ہے خاک پروانہ۔ اس میں چودہ کہانیں ہیں۔ کپتان، خاک پروانہ، ملاپ، بڑے بابو، فکر دنیا، ستیاگرہ، تالیف، مستعار گھڑی، نغمہ روح، عجیب ہولی، دعوت، مزار آتشیں، خودی، نادان دوست۔ زمانہ کے اکتوبر نومبر 1928 شمارہ میں اشتہار تھا اور فروری 1929 میں تبصرہ۔ (دوسرے گیلانی پریس کے ایڈیشن میں علاحدگی اور تحریک شامل کر دی گئیں)۔

اسی سال (1928 میں ہی) خواب و خیال کے نام سے ایک مجموعہ لاہور کے لاجپت رائے اینڈ سنز نے شائع کیا۔ اس میں مندرجہ ذیل چودہ کہانیاں تھیں۔ نوک محبت، فتح، عبرت، خودی، دعوتِ شیراز، شدھی، ستی۔ جھونک، دست غیب، لال فیتہ، موٹھ، شطرنج کی بازی، مایۂ تفریح، نخل امید، فلسفی کی

اسی سال ایک اور مجموعہ، انڈین پریس الہٰ آباد سے چھپوایا۔ یہ تھا فردوسِ خیال، اس میں بارہ افسانے تھے : نزولِ برق، بھوت، توبہ، ڈگری کے روپے، تہذیب کا راز، بھاڑے کا ٹٹو، راہِ نجات، سوا سیر گیہوں، لیلیٰ، عفو، مریدی، نیک بختی کے تازیانے۔ 23 اپریل 1930 دیانرائن نگم کو لکھے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان افسانوں کا ہندی سے اردو میں ترجمہ پریم چند نے خود کیا۔

آٹھ سال قبل ستمبر 1920 میں پریم چند نے تاج صاحب کو ایک قصہ بھیجا تھا۔ عنوان تھا ''دفتری''۔ اسی خط میں تاج کو مطلع کیا کہ یہ قصہ پریم چالیسی کا پہلا قصہ ہوگا۔ مگر چالیسی کی اشاعت نو سال بعد ہو سکی۔ اور یہ نہ تو زمانہ پریس سے، نہ ہی دارالاشاعت

سے بلکہ اسے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے شائع کیا۔ اس کے ناشر سعید مبارک علی نے خود پریم چند سے لکھنؤ میں ملاقات کی اور سوزِ وطن اور پریم چالیسی، خانہ پروانہ اور کربلا کی اشاعت کے لیے اجازت مانگی اور یہ بھی پوچھا کے صفحے میں کتنی سطریں ہوں۔ پریم چالیسی کے بارے میں اب مزید معلومات نہیں ہے۔ بس یہی معلوم ہے کہ پریم چالیسی 1930 میں دو حصوں میں شائع ہوئی۔ اس میں شائع ہوئے قصے یوں ہیں۔ حصہ اول میں : چوری، قزاقی، انتقام، رام لیلا، دین داری، سہاگ کا جنازہ، داروغہ کی سرگزشت، خانۂ برباد، کشمکش، الزام، منتر، انسان کا مقدس فرض، استعفیٰ، کفارہ، دیوی، قوم کا خادم، ترسول، مندر، نُبھنی، آنسوؤں کی ہولی۔ حصہ دوم میں : مجبوری، چکمہ، ابھاگن، حسرت، دیوی، جنت کی دیوی، سزا، دو سکھیاں، ماں، بیوی سے شوہر، پوس کی رات، جلوس، لیلیٰ، حرز جاں، مزار الفت، عفو، جہاد، امتحان، بند دروازہ۔

مارچ 1934 نرائن دت سہگل نے لاہور سے تیرہ کہانیوں کا مجموعہ آخری تحفہ شائع کیا۔ قصے تھے : جیل، آخری تحفہ، طلوع محبت، دو بیل، ادیب کی عزت، ڈیمانسٹریشن، نجات، شکار، آخری حیلہ، قاتل، وفا کی دیوی، برات، ستی۔

اردو گھر دہلی سے 1936 میں زادِ راہ شائع ہوئی۔ اس میں پندرہ کہانیاں تھیں : آشیاں برباد، ڈامل کا قیدی، قہر خدا کا، بڑے بھائی صاحب، لعنت، لاٹری، خانۂ داماد، فریب، زیور کا ڈبہ، وفا کی دیوی، زادِ راہ، مِس پدما، حقیقت، ہولی کی چھٹی۔

اپنی وفات سے تین سال پہلے پریم چند نے ”میرے بہترین افسانے“ (جو کتاب منزل کشمیری گیٹ، لاہور 1933 نے شائع کی تھی) کے دیباچہ میں لکھا تھا: ”میرے دوست مدت سے مصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ مجموعہ منتخب کردوں جس کے مطالعہ سے لوگ زندگی کے متعلق میرے نظریات معلوم کرسکیں۔ یہ انتخاب اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں میں نے محض ان کہانیوں کو چنا ہے جنھیں میں پسند کرتا ہوں اور جنھیں جدا جدا نوعیت کے نقادوں نے بھی سراہا ہے“۔ یہ کہانیاں ہیں : راہِ نجات، منتر، مہاتیرتھ، پنچ پرمیشور، رانی سارندھا، دو بیل، شطرنج کی بازی، ستی، پرائشچت، سجان بھگت۔

عصمت ڈپو دلی نے پریم چند کی وفات کے بعد 1937 میں دودھ کی قیمت شائع

کیا، اس میں نو کہانیاں ہیں : عصمت، کسم، وفا کا دیوتا، اکسیر، عیدگاہ، سکون قلب، ریاست کا دیوان، دودھ کی قیمت، زاویہ نگاہ۔

پریم چند نے 19 مارچ 1935 کو حسام الدین غوری کو لکھا تھا ”واردات چھپ رہا ہے“۔ اس میں تیرہ افسانے ہیں : گلی ڈنڈا، مفت کرم داشتن، بدنصیب ماں، انصاف کی پولس، بیوی، مالکن، شکوہ شکایت، روشنی، معصوم بچہ، سوانگ، شانتی، قاتل کی ماں، غم نداری، بُز بخر۔

دودھ کی قیمت کے بعد پریم چند کے قصوں کا کوئی مصدقہ مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ 1978 میں میں نے تیس قصوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ کو اشاعت کے لیے دیا تھا۔ کاپی رائٹ کی وجہ سے یہ کئی سال تک شائع نہیں ہوسکا۔ تب میں نے اسے واپس لے کر ستار پبلشر کو دے دیا کچھ سال بعد پتہ چلا کہ وہ مسودہ گم ہوگیا۔ اس میں بہت سی وہ کہانیاں تھی جو گوئنکا کے اپراپیہ ساہتیہ میں پیش کی گئی ہیں۔

پریم چند کی وفات سے قبل اردو اور ہندی میں ان کی لگ بھگ پچاس تصانیف شائع ہوچکی تھیں۔ تاریخ وار فہرست پیش ہے۔ (1) سوز وطن، (2) سیر درویش، (3) روٹھی رانی، (4) پریم پچیسی (حصہ اول)، (5) سپت سروج، (6) نوندھی، (7) پریم پورنما، (8) پریم پچیسی (حصہ دوم)، (9) پرم بتیسی (حصہ اول)، (10) پریم بتیسی (حصہ دوم)، (11) پریم پرتما، (12) نمک کا داروغہ، (13) پنچ پرمیشور، (14) پریم پچیسی (ہندی)، (15) ٹالسٹائے کی کہانیاں، (16) پریم پرسون، (17) بینک کا دیوالہ، (18) پریم دوادشی، (19) پریم پرتکیا، (20) پریم پرمود، (21) شانتی، (22) اگنی سمادھی، (23) خاک پروانہ، (24) خواب و خیال، (25) فردوس خیال، (26) پریم چترتھی، (27) پریم تیرتھ، (28) پانچ پھول، (29) سپت سُمن، (30) سمر یاترا، (31) پریم چالیسی (حصہ اول)، (32) پریم چالیسی (حصہ دوم)، (33) پریم گنج، (34) پریرنا، (35) سروسریشٹھ کہانیاں، (36) میرے بہترین افسانے، (37) پنچ پرسون، (38) آخری تحفہ، (39) نوجیون، (40) پریم پی یوش، (41) مرتک بھوج، (42) نجات، (43) مان سرور (حصہ اول)، (44) مان سرور (حصہ دوم)، (45) زادِ راہ، (46) دودھ کی قیمت، (47) واردات، (48) دیہات کے افسانے، (49) جیل، (50) گرامیہ جیون کی کہانیاں۔

افسانوں میں مذکورہ بالا نمبر 2، 3، 13، 17، 30، 34، 41، 42 وغیرہ شاید ایسی کہانیاں تھیں جنھیں صرف ایک کہانی کے طور پر پیش کیا گیا۔ کچھ دو یا تین، چار، پانچ، چھ، سات، نو، بارہ، پندرہ، سترہ کہانیوں کے مجموعہ بھی تھے۔

وفات کے تھوڑا پہلے پریم چند نے مان سرور کے عنوان سے دو مجموعے شائع کیے تھے۔ ان میں 53 قصے تھے۔ اس کے بعد ان کے بڑے بیٹے شری پت نے ایک مجموعہ "کفن" شائع کیا جس میں بارہ قصے تھے۔ اس کے علاوہ 150 قصے ہندی اور اردو کے رسالوں میں تلاش کر انھیں مان سرور کے اگلے چھ حصوں میں شائع کیا۔ پھر 1962 میں پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے نے 56 کہانیوں کو زمانہ اور دوسرے اردو ہندی رسالوں سے اکٹھا کر کے گپت دھن کے دو حصوں میں شائع کیا۔ اس کے کئی سال بعد شری پت رائے نے سولہ کہانیاں پیش کیں۔ کمل کشور گوئنکا نے ان سولہ کے علاوہ سولہ اور قصے ڈھونڈ نکالے۔ انھیں پریم چند کے 'اپراپیہ ساہتیہ' میں شائع کیا۔

مان سرور (آٹھ حصے) کفن، گپت دھن (دو حصے) اور پریم چند کے اپراپیہ ساہتیہ میں شائع ہوئے افسانوں کے علاوہ دو کہانیاں قاتل اور بارات اردو میں پریم چند کے نام سے چھپی ہیں اور یہی دونوں کہانیاں شیورانی دیوی کے مجموعے ناری ہردے میں بھی چھپی ہیں۔ میں نے 1959 میں امرت رائے کو خط لکھ کر پوچھا بھی تھا (شیورانی دیوی حیات تھیں) ایسا کیوں؟ جواب نہیں آیا میرا خیال ہے یہ کہانیاں پریم چند کی ہی ہیں۔ اردو کا متن تو انھیں کا ہے۔

مان سرور (حصہ چار) کی "سمسیا" وہی افسانہ ہے جو مان سرور (آٹھ) میں "وشم سمسیا" کے عنوان سے ہے۔ گوئنکا کے پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ میں روئے سیاہ وہی کہانی ہے جو اسی کتاب میں پرتگیا کے عنوان سے ہے۔ گوئنکا کے اپراپیہ ساہتیہ میں "پرتشٹھا کی ہتیا" وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں "عزت کا خون" کے عنوان سے شامل ہے۔ اسی طرح "بہنی" بھی دوبار شامل ہوگئی ہے۔ مان سرور حصہ دوم کی "نیائے" وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں "نبی کا نیتی نرواہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ "لال فیتہ" اور "وفا کی دیوی" کسی ہندی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ تقریباً 100 ہندی کہانیاں ہیں جن کا اردو ترجمہ نہیں شائع ہوا ہے۔

کچھ محقق بمبوق اور پلشم کے نام سے شائع شدہ کہانیوں کو پریم چند کی کہانیاں سمجھتے ہیں میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں۔ پلشم مشہور فلمی ایکٹرس مینا کماری کے نانا پیارے لال شاکر میرٹھی کا قلمی نام تھا جنھوں نے دیانرائن نگم کے ساتھ کام کیا تھا اور بعد میں ادیب کے مدیر بنے۔ بمبوق کے نام سے ایک ادیب زمانہ میں لکھتے تھے مگر وہ اپنے نام کے ساتھ ایم ایس سی بھی لکھتے تھے۔ نیرنگ خیال میں ایک خاتین انیس فاطمہ بن بمبوق کے نام سے لکھتی تھیں۔ جب بمبوق کی کہانیاں شائع ہوئیں اس وقت پریم چند بہت مقبول تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نام سے افسانے لکھتے۔ یہاں یہ لکھنا بھی واجب ہوگا کہ ایک دوسرے پریم چند بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے مجموعوں کو لاہور سے چھپوایا تھا۔ یہ اپنے نام کے بعد ایم.اے. لکھتے تھے جبکہ منشی پریم چند صرف بی.اے. ہی تھے۔ ایک محقق کے مطابق ان کے اس نام سے 17 مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ راقم الحروف نے کچھ مجموعوں کو عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا ہے۔

کچھ محققین نے داراشکوہ کا دربار کو افسانوں میں شامل کرنا چاہا ہے۔ یہ ستمبر 1908 میں لاہور کے ماہ وار رسالہ آزاد میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ نہیں انشائیہ ہے۔ پریم چند تاریخی واقعات کو موضوع بناکر افسانے ضرور لکھتے تھے جیسے امتحان، نزول برق، دل کی رانی، زنجیر ہوس، مگر ان سب میں وہ ڈرامائی کیفیت پیدا کردیتے تھے۔ داراشکوہ کا دربار میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے فرزند عظیم کی زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تو مضمون ایسے ہی ہے جیسے پریم چند کا کراوم ویل پر مضمون۔ اسے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا جارہا ہے۔ ایسا ہی ایک اور مضمون ہے بھرت۔ اسے بھی افسانوں کی فہرست میں نہیں رکھا گیا ہے۔

ابتدائی دور سے پریم چند کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ رابندرناتھ ٹیگور کی کہانیوں کے اردو ترجمے کیے تھے اور شائع کرائے تھے۔ ان کی تفصیل دستیاب نہیں ہے ٹالسٹائی کی بیس سے زیادہ کہانیوں کے ترجمے بھی کیے۔ کچھ کہانیاں بچوں کے لیے ہیں۔ جیسے جنگل کی کہانیاں یا کتے کی کہانی۔ ان کہانیوں کو بھی پریم پچاسا میں شامل نہیں کیا گیا۔

1907 میں نواب رائے کا شائع ہونے والا ایک قصہ تھا روٹھی رانی۔ یہ ہندی

سے ترجمہ تھا۔ اس کے آخر میں لکھا تھا "ماخوذ و ترجمہ از ہندی نواب رائے" اس قصہ کے مصنف تھے منشی دیوی پرساد ساکن جودھپور، جن کے والد اجمیر کی درگاہ کے نائب رہ چکے تھے۔ دیوی پرساد فارسی اور ہندی کے مصنف تھے ریاست جودھپور میں ہندی کو سرکاری زبان بنوانے میں سرگرم تھے۔ تقریباً ساٹھ ہندی کتابوں کے مصنف تھے۔ مغل بادشاہوں اور راجستھان کے مہاراجاؤں پر کتابیں لکھی تھیں۔ ایک کتاب کا عنوان تھا "روٹھی رانی"۔ منشی دھنپت رائے جو نواب رائے کے نام سے رسائل میں لکھتے تھے (اور آگے چل کر پریم چند بنے) اس کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کا اردو ترجمہ کرکے اسے زمانہ کے اپریل تا اگست 1907 کے شماروں میں شائع کرایا۔ مدیر دیانرائن نگم نے اسے قصہ کا خطاب دیا ہے۔ اور اسے ایک کتابچہ کی شکل میں بھی چھاپ کر زمانے کے دفتر سے فروخت بھی کیا تھا۔ اس کے ٹائٹل پر بھی لکھا تھا، "ایک قصہ"۔ میں نے یہ معلومات اپنی کتاب پریم چند لٹریری بایوگرافی میں پیش کی تھی۔ امرت رائے نے روٹھی رانی کو ایک ناول قرار کرکے منگلاچرن میں شائع کیا۔ حالانکہ زمانہ میں کوئی ناول شائع نہیں ہوا۔ میں بھی دیانرائن نگم کی طرح روٹھی رانی کو قصہ مانتا ہوں اور اسے پریم پچاسا میں شامل کیا ہے۔

پریم پچاسا کی چھ جلدوں میں ایک درجن سے زائد افسانے ایسے ہیں جو بنگالی، انگریزی اور روسی کے افسانوں کے ترجمے ہیں۔ پریم چند کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ ایک میٹرک پاس اسکول ماسٹر بندیل کھنڈ کے جنگلوں میں بسے، گاؤں یا چھوٹے قصبوں میں اسکول کا معائنہ کرنے والا کہاں سے ڈکنس، ہاتھرن اوسکروائلڈ، ٹیگور کو تلاش کرکے پڑھتا اور افسانے لکھتا تھا۔ ان افسانوں کے ترجموں کو پریم چالیسا میں شامل کیا ہے کچھ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں۔ انگریزی کی کتابوں کے علاوہ وہ روسی اور فرانسیسی مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھتے، اگر ان کہانیوں سے متاثر ہوتے تو ان کے پلاٹ کو لے کر اردو میں کہانی لکھ ڈالتے تھے۔ مگر یہ ذکر نہ کرتے کہ یہ افسانے کہاں سے ماخوذ ہیں۔ عام طور پر ترجموں کے اختتام پر نواب رائے یا د۔ر۔ (دھنپت رائے) لکھتے تھے مگر اصل مصنف کا نام نہیں دیتے تھے۔ "سگِ لیلیٰ" میں کرداروں کے نام وہی ہیں جو اصل افسانے میں ہے مگر یہ افسانہ کس کا لکھا ہے اس کی کوئی جانکاری نہیں۔ کبھی ماحول

بدیشی ہوتا کبھی ہندستانی، چارلس ڈکنس کی ایک کہانی کے کردار سے متاثر ہوکر "اشکِ ندامت" لکھی اس کے کردار بدیشی ہیں۔ کبھی کبھی بنگلہ کہانیوں کے ہندی ترجمے کو لے کر اسے اردو میں لکھ ڈالتے۔ جیسے دھوکے کی ٹٹی، خوف رسوائی، اپنے فن کا استاد، قاتل، یہ بالکل ترجمے نہیں تھے بلکہ (ہندی ترجمے) تھیم کو لے کر لکھتے تھے۔ اور ان کہانیوں کو صرف اردو رسائل میں ہی چھپواتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کی سیر کہسار کو ہندی میں پروت یاترا کے نام سے لکھا۔ یہ کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔ پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا تھا کہ اشکِ ندامت اور آبِ حیات کے بعد وہ ترجمہ نہیں کریں گے۔ حقیقت برعکس ہے انھیں جب کوئی افسانہ اچھا لگتا تھا تو اس کے بنا پر افسانہ لکھ کر رسائل کو بھیج دیتے۔ ایک بار قبول کیا کہ انھوں نے Eternal City کے ایک جزو سے متاثر ہوکر ایک کہانی "وشواس" لکھی ہے۔ ایک روسی فنکار کیپین سیو جنھوں نے پریم چند کا ہندی میں مطالعہ کیا تھا۔ مجھے 1950 میں بتایا تھا کہ پریم چند کی ایک کہانی گورکی کی کہانی سٹی آف ییلوڈیول کا ترجمہ سا تھا۔ ایک اور کہانی چیخوف کی کہانی کا۔ ایک افسانہ تھا قیدی۔

امتیاز علی تاج کو 3 جولائی 1919 کو لکھا "کل میں نے چمپا کو خاص طور سے پڑھا۔ مصنف نے خوب لکھا ہے۔ اگر کوئی ہندو صاحب ہیں تو خیر اور اگر مسلمان صاحب ہیں تو ان کی قلم کی داد دیتا ہوں۔ قصہ خوب بنایا گیا ہے۔ سری کانت کا کیریکٹر قابل تعریف ہے۔ میں نے اس قصہ کو ہندی میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

دسمبر 1942 میں راقم الحروف نے پریم چند کے فرزند شری پت رائے سے پیشکش کی تھی کہ پریم چند کے افسانوں کو ایک سلسلے میں شائع کریں (میری خط و کتابت ڈاکٹر شیام سنگھ ششی کی کتاب "پریم چند کے مدن گوپال" ہندی میں شائع ہو چکی ہے) مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ بعد میں ایک دو ناشروں سے غیر رسمی بات ہوئی۔ کوئی اشاعت کے لیے تیار نہ ہوا۔ پریم چند کی پیدائش کے ایک سو سال بعد ان کی بہت تقریبیں ہوئی ہیں مگر اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے جس اسکیم کو اپنایا ہے اس کے تحت دیگر تنقیحات کے علاوہ ان کے تمام افسانوں کو پریم پچاسا کی چھ جلدوں میں پیش کیا جارہا ہے۔

کلیات کی ان جلدوں میں وہ تمام قصے شامل ہیں جو پریم چند نے پہلے اردو میں

لکھے اور وہ بھی جن کی تخلیق پہلی بار ہندی میں اور ان کی حیات میں اردو میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ وہ تمام قصے بھی ہیں جو صرف ہندی میں شائع ہوئے اور جنھیں پہلی بار اردو کے قارئین کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ کونسل نے ان قصوں کو ترجمہ کے بجائے انھیں اردو رسم الخط میں پیش کیا ہے۔ کونسل کا یہ بھی فیصلہ تھا کہ ان کے تمام ناولوں، مضامین اور قصوں کو تاریخ وار پیش کیا جائے۔

پریم چند کے اردو ہندی افسانوں کا تقابلی مطالعہ میں نے 1957 میں کیا تھا اور دو حصوں میں ایک فہرست تیار کی تھی جس میں یہ بتایا گیا کہ کون سا افسانہ کب اور کہاں ہندی، اردو میں شائع ہوا اور کس مجموعہ میں شامل ہے۔ اس کی ایک کاپی گوینکا لے گئے تھے دوسری میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے لیکن آج تک شائع نہ کرا سکا۔ 1962 میں امرت رائے نے صرف 224 ہندی افسانوں کی فہرست پیش کی تھی اس کے سات سال بعد ڈاکٹر جعفر رضا نے ایک فہرست تیار کی تھی پھر رادھا کرشن نے اور شیلس زیدی نے بھی ایک فہرست شائع کی، مگر کسی بھی فہرست میں مکمل اور مستند جانکاری نہیں۔

پریم چند بعض اوقات قصہ کا عنوان بدل دیتے تھے۔ ایک کہانی تھی دوا اور دارو۔ اس کا نام بدل کر کپتان کر دیا۔ شامتِ اعمال کو بدل کر خاکِ پروانہ کر دیا۔ موت اور زندگی کی جگہ امرت، حسن و شباب کو بدل کر کشمکش کر دیا گیا، ہندی میں آگا پیچھا، سکونِ قلب کو بدل کر شانتی۔ زمانہ میں شائع کہانی معمہ کو بدل کر سمسیا کردیا۔ ایک مجموعے میں وِشم سمسیا بھی اسی کا نام رکھا۔

قارئین کو مدنظر رکھتے ہوئے پریم چند کرداروں کے نام بھی بدل دیتے تھے۔ کہکشاں میں ایک افسانہ حجِ اکبر شائع ہوا تھا اس میں کردار تھے۔ صابر حسین، شاکرہ نصیر عباسی جب یہ ہندی میں شائع ہوا تو کردار تھے۔ رودر منی، سکھدا، کیلاسی، دو بھائی (جو زمانہ میں شائع ہوئی تھی) کے کردار تھے کرشن، بلدیو، واسودیو، یشودھا، رادھا۔ اس پر دوستوں نے اعتراض کیا۔ ایڈیٹر کو خط لکھ کر صفائی پیش کی۔ جب یہ کہانی ہندی رسائل میں چھپی تو کرداروں کے نئے نام تھے۔ شیودت، کیدار، کلاوتی، مادھو وغیرہ۔ ایک کہانی آتما رام کے متعلق کہکشاں کے مدیر امتیاز علی تاج کو لکھا۔ "یہ اس قدر ہندو ہوگئی ہے کہ کہکشاں کے لائق نہیں آپ خود ہندو سہی مگر آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں"۔

کرداروں کے نام بدلنے کی وجہ سے اور ترجمہ میں ترمیم کی وجہ سے ہندی اور اردو میں قصوں کے تقابل میں کافی دقتیں پیش آتی ہیں کچھ رسالوں کو چھوڑ کر باقی کی زندگی پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سید علی اکبر اکبر آبادی نے 1910 میں آگرہ سے ادیب نکالا جو صرف ایک سال چلا پھر نوبت رائے نظر نے اسی نام سے الہ آباد سے شائع کیا۔ یہ تین سال چلا۔ لکھنؤ سے برج نرائن چکبست نے 1918 میں صبح امید نکالا۔ 1926 میں ان کی وفات ہوئی۔ سدرشن نے لاہور سے چندن نکالا جو کچھ ہی سال چلا۔ زمانہ ہی صرف ایک ایسا رسالہ تھا جو 1902 سے لے کر 1945 تک شائع ہوا۔ کہکشاں، تہذیب نسواں، پھول اور شاہکار کچھ سال کے بعد بند کر دیے گئے۔ مگر زمانہ کی فائلیں کچھ لائبریریوں میں دستیاب تو ہیں مگر سب شمارے مشکل سے ملتے ہیں۔ کچھ شماروں سے صفحات بھی غائب ہیں۔ زمانہ کے علاوہ دوسرے کم عمر رسالوں کی فائلوں کے بارے میں میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کچھ پرانے رسالوں کی فائلیں جنھیں میں نے پچاس سال پہلے دیکھی تھی اب غائب ہیں۔ آج ادیب، العصر، کہکشاں، عصمت، ذخیرہ، نیرنگ خیال، صبح امید، ہمدرد، آزاد، تہذیب نسواں، پھول، ہزار داستان کے شماروں کی عدم موجودگی میں سارے قصص کی نقل اور ترتیب اور حواشی میں ساری تفصیلات دینے کا کام بھی آسان نہیں ہے۔

جب پریم چند نے عدم تشدد کے بعد سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا تو ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ افسانے ہی تھے۔ ناول سے انھیں بہت کچھ نہیں ملا، نہ ہی افسانوں کے مجموعوں سے۔ ان کی حیات میں شاید ہی کسی اردو کتاب کا دوسرا تیسرا ایڈیشن نکلا ہو بہت سے ناشروں نے انھیں رائلٹی بھی نہیں دی۔ 1941 میں مجھے سید گیلانی صاحب نے بتلایا تھا کہ پریم چالیسی کی بہت سی کاپیاں پڑی تھیں اور انھوں نے شری پت رائے کو لکھا تھا کہ لاگت کی رقم دے کر وہ ان کاپیوں کو لے جائیں۔

پریم چند کے زیادہ افسانے ہندی میں شائع ہوتے پھر ان کا ترجمہ رسائل یا اخبار میں شائع ہوتا۔ پریم چند کوشش کرتے کہ افسانے کو اردو اور ہندی رسائل کو ایک ساتھ ہی بھیجیں۔ اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ خود کرتے یا کسی شاگرد یا دوست سے کروا کر رسالوں کو بھیج دیتے تھے۔ ایک بار نگم کو لکھا کہ ترجمہ اقبال ورما سحر

ہنگامی سے کروالیں۔ کبھی کبھی ان کے ہندی کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ بغیر اجازت کر دیا جاتا جو اصل افسانے سے مختلف ہوتا۔ اکتوبر 1922 کو دیانرائن نگم کو ایک خط میں لکھا ''زمانہ کے لیے ایک مضمون لکھا۔ اس کا ہندی ترجمہ کلکتہ کے ایک رسالے میں نکلا تھا۔ میں نے مضمون صاف کیا مگر ہندی میں نکلنے کے تیسرے دن ہی اس کا ترجمہ لاہور کے پرتاپ میں نظر آیا...... حالانکہ لاہوری ترجمہ بالکل بھدا ہے مگر قصہ تو وہی ہے۔'' یہی کیفیت کچھ اور قصوں کی بھی ہو سکتی ہے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ پریم چند کو افسانہ نگاری میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اردو ہندی رسالوں سے فرمائش آتی رہتی تھیں۔ پریم چند قصہ لکھتے۔ رسالہ کو بھیج دیتے، یہ چھپ جاتا، رسالہ کی کاپی آتی، اسے دیکھتے۔ کبھی دوست اور احباب پڑھنے کے لیے لے جاتے اس کی تعریف ہوتی اور پریم چند بھول جاتے کون لے گیا۔ عام طور پر واپس بھی کوئی نہ کرتا تھا، مگر انھیں تو اس کی اشاعت اور معاوضہ کی فکر تھی معاوضہ آیا بات ختم ہوگئی۔ جب نئے مجموعے کی اشاعت کی بات شروع ہوتی تب دماغ پر زور ڈالا جاتا۔ اگر قصہ یاد آگیا اور قصہ دستیاب نہیں ہوا تو ایڈیٹر کو نقل کے لیے لکھتے۔ اگر قصہ یاد نہیں رہا تو اسے اس مجموعے میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ اور جب یاد آگیا تو اس کی نقل یا اس کی کاپی کروا کر کسی دوسرے رسالے کو بھیج دیتے اور پھر بعد کے مجموعے میں شامل کرلیتے۔ ایک دو مثال پیش کرنا چاہوں گا۔

جون 1910 کے زمانہ میں ایک قصہ چھپا شکار، جب پریم پچیسی یا پریم بتیسی کے لیے قصے اکٹھے کررہے تھے تو اس کا دھیان نہیں آیا، اکتوبر 1931 میں اسے چندن میں شائع کروایا اور اسے آخری تحفہ میں شامل کیا گیا۔ ایک اور کہانی تھی ملاپ، یہ زمانہ جون 1913 میں شائع ہوئی تھی۔ پندرہ سال بعد اسے خاک پروانہ میں شامل کیا گیا۔ ایک افسانہ دونوں طرف سے زمانہ مارچ 1911 میں شائع ہوئی۔ کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔

عام طور پر پریم چند کے قصے 10، 15 صفحات کے ہوتے تھے مگر کچھ قصے ایسے بھی ہیں جن کی ضخامت 50، 60 صفحات ہیں، روٹھی رانی، دو سکھیاں وغیرہ۔ کچھ کہانیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کہانی لفظ کا استعمال زیب نہیں دیتا۔ جیسے بانسری (یہ صرف 8 یا 10 لائنس کی کہانی ہے) کہکشاں لاہور کے جس شمارہ میں یہ کہانی چھپی تھی اس کی فہرست

میں لکھا تھا بانسری۔ (کہانی مصنف پریم چند) گیلانی الکٹرانک پریس کے مالک سید مبارک شاہ گیلانی نے 1941 میں راقم الحروف کو بتلایا تھا کہ جب پریم چالیسی چھپ رہی تھی تو انھوں نے پریم چند کو ایک خط لکھا کہ فارم چھپ رہا ہے۔ دو صفحے خالی ہیں، کچھ لکھ دیجیے اور پریم چند نے دو صفحے کی کہانی لکھ دی۔ شاید اس کہانی کا عنوان تھا، دیوی۔ ایک دوسری تھی قوم کا خادم۔ بند دروازہ وغیرہ اسی صف میں آتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک اپورن کہانی بھی شامل ہے جسے ڈاکٹر گوینکا نے ڈھونڈھ نکالا ہے۔

ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ وفات سے دس پندرہ سال پہلے پریم چند نے لگ بھگ بیس افسانے لکھے جن کا تعلق ان کے بچپن یا معلّی کے زمانے کے تجربات سے ہے۔ قزاقی، بڑے بھائی صاحب، چوری، گلی ڈنڈا، میری پہلی رچنا، ہولی کی چھٹی، جیون سار، میری کہانی، آپ بیتی، ڈھپورسنکھ، لال فیتہ، مفت کرم داشتن، لاٹری، دفتری، شکوہ و شکایت، نغمۂ روح وغیرہ۔

ان مضامین کو اور پریم چند سے انگریزی بنگلہ یا روسی سے ترجمہ کو اس مجموعہ میں شامل کرنے پر اعتراض ہوسکتا ہے مگر پریم چند کے لڑکوں نے خود انھیں افسانوں کے مجموعوں میں شائع کیا ہے۔ اس لیے ان ترجموں کو پریم پچاسا میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک درجن طنزیہ کہانیاں ہیں جن کا مرکزی کردار موٹے رام شاسٹری ہے۔ اس کو لے کر عزت ہتک کا دعوا بھی ہوا تھا۔

پریم چند کے افسانوں کی پہلی تخلیق سوز وطن کی پانچ کہانیوں کا موضوع تھا حب الوطنی۔ اسے برٹش سرکار نے باغی قرار دیا اور انھیں حکم ہوا کہ وہ بغیر اجازت لکھنا بند کردیں اور اگر لکھیں تو باقاعدہ اجازت لے کر۔ ان دنوں پریم چند بنڈیل کھنڈ میں دورہ کرتے تھے یہاں بندیلوں اور راجپوتوں کی شادی کے قصے سنتے تھے۔ ہندستان کے قدیم بہادروں کے قصوں کو قلم بند کرنا اور عوام میں ذرا اعتماد پیدا کرنا حب الوطنی کا دوسرا پہلو تھا۔ انھوں نے کرشمۂ انتقام، راجا ہردل، رانی سارندھا، وکرمہ دتیہ کا تیغہ، گناہ کا اگن کنڈ وغیرہ کتنے ہی قصے لکھے۔

سیاسی حالات کے ساتھ ہی پریم چند نے سماجی مذہبی اقتصادی حالات کا بھی جائزہ لیا اور عوام کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کی۔ سماج مذہب

اور گھر کی کمزوریوں اور توہمات سے پردہ اٹھایا تاکہ عوام انھیں دور کرنے کے لیے کمر کسیں۔

1918 میں پریم چند نے نگم کو لکھا کہ ان کی معراج زندگی تھی ایک اچھے اخبار کی ایڈیٹری جو کسانوں کا حامی اور مددگار ہو۔

پریم چند کی پیدائش گاؤں میں ہوئی تھی تا زندگی دیہاتی زندگی سے ان کا نزدیک کا رشتہ رہا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں گاؤں کے مسائل کو خصوصی اہمیت دی اور ان کو اپنے قصوں کا موضوع بنایا۔ کسانوں، مزدوروں اور پچھڑے طبقوں جیسے دھوبی، کرمی، نائی، چمار کی پریشانیوں پر گہرائی سے غور کیا۔ انھیں پرکھا اور محسوس کیا کہ ایک طرف تو تھی ان کی نیکی اور سچائی کی زندگی اور دوسری طرف تھی مہاجنوں، مذہب کے ٹھیکداروں، زمیندار کے اہلکاروں اور سرکاری حکاموں کی زبردستی اور مکاری اور بے ایمانی۔ کسان کی زندگی میں جدوجہد ہے، محنت ہے اور فاقہ مستی ہے۔ اپنے افسانوں میں پریم چند نے ان کا سچا اور صحیح نقشہ پیش کیا۔ ان کے کردار جیتے جاگتے انسان ہیں جو آج بھی گاؤں اور شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے ہیں۔ مصنف کا فرض ہے کہ غربت اور امیری کے درمیان فرق کو دور کیا جائے۔ ادب کو زندگی اور اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اردو ادب میں پریم چند نے ہماری معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی۔ ان کے افسانوں میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے مسائل اور دشواریوں کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ خانہ داری کے مختلف پہلو ان کے کرداروں اور سیاسی بیداری کی تحریک میں کندھے سے کندھا ملا کر شرکت پیش کی ہے۔ پریم چند سماج اور گھر کی کمزوریوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے گھاس والی، مالکن، سبھاگی، سہاگ کی ساڑی، بڑے گھر کی بیٹی، آشیاں برباد، قاتل کی ماں، ستی، علاحدگی، سمر یاترا، اجلاس، ان افسانوں میں کتنی ہی مثالیں ہیں جہاں عورتیں دشواریاں کا سامنا کرتی ہیں۔

پچھڑے لوگوں کا ایک طبقہ ہے ہریجنوں کا جنھیں آج دلت کہا جاتا ہے۔ غریبوں کے ہمدرد پریم چند ان پر ظلم و ستم کی صحیح دردناک تصویر پیش کرتے ہیں۔ جیسے ٹھاکر کا کنواں، طلوع محبت، نیچ ذات کی لڑکی، نجات، دودھ کی قیمت، جرمانہ وغیرہ ان کے کتنے ہی قصے ہیں جنھیں پڑھ کر رونا آتا ہے اور ان کے لیے ان کی سخت مخالفت بھی

ہوئی۔ ایک طبقے نے انھیں نفرت کا پرچارک تک کہا۔

پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علم بردار بھی تھے۔ ان کے لیے دیہات کی زندگی اور روایات، باہمی محبت اور رواداری کا نمونہ تھی۔ فرقہ وارانہ نفرت کی فضا ہندستان کے دیہات میں بالکل نہیں ہے۔ پریم چند کے کتنے ہی کردار (ہندو مسلم) کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں۔ پنچایت میں ہندو مسلم شریک ہوتے ہیں۔ پریم چند اور امن پسندی برادرانہ برتاؤ کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

کتنے ہی قصوں میں جیسے پنچایت، قربانی، سفید خون، سجان بھگت، سواسیر گیہوں، بانکا زمیندار، پوس کی رات، ہولی کی چھٹی، پچھتاوا، بانگ سحر، بیٹی کا دھن، اندھیر، مشعلِ ہدایت میں دیہاتی زندگی کے روشن پہلو پیش کرتے ہیں۔ ان میں دیہاتی فضا پیش کی گئی ہے۔ دیہات کے الفاظ اور محاورات جو صرف بول چال میں زبان پر ہوتے تھے پریم چند نے ادب میں داخل کر کے انھیں اپنی سلیس اور عام فہم پُر لطف زبان اور دلکش اچھوتے انداز بیان میں پیش کیا۔ یہی پریم چند کی قوت تخلیق کا راز ہے کسانوں اور پچھڑے طبقوں کے دکھ درد کی کہانی پڑھ کر قارئین مصنف کے ساتھ مسکراتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں یا سینے پر ہاتھ رکھ کر آنسو بہاتے ہیں۔

پریم چند قصے کیسے لکھتے تھے۔ اس بارے میں ان ے ایک خط کو پڑھیے جسے انھوں نے فروری 1934 میں نیرنگ خیال کے ایڈیٹر کو لکھا تھا:

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اسی میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ افسانے کے حسبِ حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُر لطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے

میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے "دل کی رانی"۔ میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کردیا تھا۔ ایسے دشمنِ قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا ہے۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی و جذباتی محاسن پیدا کیے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کرسکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہوگیا۔ کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کیے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقعہ سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینے بھر میں شاید میں نے دو افسانے سے زیادہ نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیریکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوجانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کرسکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثر لاتی ہے ادبی خوبیاں جمع کرتی۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہوجانے کے بعد میں اسے خود پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ

حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت پسند کیا اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا''۔

پریم چند نے ''میرے بہترین افسانے'' کے دیباچہ میں لکھا تھا، ان کے قصوں کی تعداد تین سو ہے۔ ان افسانوں کو ''کلیات پریم چند کی چھ جلدوں (جلد 9، جلد 10، جلد 11، جلد 12، جلد 13 اور جلد 14) میں پیش کیا گیا ہے۔

مدن گوپال

دیوی

پن بابو کے لیے عورت دنیا کی سب سے حسین شے تھی۔ وہ شاعر تھے اور ان کے شاعرانہ تخیل کے لیے نسوانی حسن اور شباب کا ذکر ہی سب سے دلآویز مشغلہ تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تب ہی سے انھوں نے اس حسینہ کا تصور کرنا شروع کیا، جو ان کے دل کی رانی ہوگی۔ اس میں طلوع سحر کی شگفتگی ہوگی۔ پھول کی نزاکت، کندن کی چمک، بسنت کی فرحت، کوئل کی آواز، وہ سارے شاعرانہ اوصاف سے مزین ہوگی۔ وہ اسی تصور کے دلدادہ تھے۔ اپنی غزلوں میں اُسی کو مخاطب کرتے۔ دوستوں سے اسی کا چرچا کرتے اور ہمیشہ اسی خیال میں مست رہتے تھے۔ وہ دن بھی قریب آگیا تھا۔ جب ان کی آرزوئیں ہرے ہرے پتوں سے لہرائیں گی۔ اس باغ میں بہار کے دن آئیں گے۔ کالج کا آخری امتحان ختم ہوگیا تھا اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے۔

(2)

شادی طے ہوگئی۔ پن بابو نے عروس کو ایک نظر دیکھنے کی بہت ضد کی۔ لیکن جب ان کے ماموں نے یقین دلایا کہ لڑکی نہایت حسین ہے تو خاموش ہوگئے۔ دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ دلہن زیوروں سے لدی ہوئی منڈپ میں لائی گئی۔ تو اس کے ہاتھ پاؤں نظر آئے۔ کتنی نازک اور خوبصورت انگلیاں تھیں! اعضا کا تناسب کتنا دلکش تھا۔ پن باغ باغ ہوگئے۔ دوسرے دن رخصتی ہوگئی۔

پن بابو دیدار کے لیے بے قرار تھے۔ بار بار اپنے گھوڑے کو دلہن کی پالکی کے پاس لاتے تھے۔ لیکن درشن نہ ہوتے تھے۔ پالکی پر موٹا پردہ پڑا ہوا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر ہوگیا۔ کہاروں نے ایک درخت کے سایہ میں پالکی اتار دی۔ اور چنا چبینہ کرنے کے لیے کنوئیں پر چلے گئے۔ پن کو منہ مانگی مراد ملی۔ چپکے سے دلہن کے پاس جا پہنچے۔ وہ پالکی سے سر نکالے، گھونگھٹ ہٹائے باہر جھانک رہی تھی۔ پن نے اسے دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ نفرت، غصہ اور مایوسی نے جیسے ان کے دل کو کچل دیا۔ یہ وہ حسن و نزاکت کی دیوی نہ تھی جس کی وہ برسوں سے پرستش کر رہے تھے۔ یہ ایک چوڑے

منہ، چپٹی ناک اور پھولے ہوئے رخساروں والی مکروہ صورت عورت تھی۔ جس پر صنف نازک کا کسی طرح بھی اطلاق نہ ہو سکتا تھا۔ پٙن کی ساری مستی رخصت ہوگئی۔ آہ! اس بھاگوان کو میرے ہی گلے پڑنا تھا۔ کیا اس کے لیے دنیا میں اور کوئی شوہر نہ ملتا تھا۔ انھیں اپنے ماموں پر غصہ آیا۔ جس نے عروس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے تھے۔ مگر خیریت ہوئی کہ وہ اس وقت وہاں نہ تھے۔ پٙن سوچنے لگا میں اس عورت سے کیسے بولوں گا؟ کیسے اس کے ساتھ یہ زندگی بسر کروں گا۔ اس کی طرف تو تاکنے ہی سے نفرت ہوتی ہے۔ ایسی مکروہ صورتیں بھی دنیا میں ہیں اس کی اسے خبر نہ تھی۔ کیا منہ ایشور نے بنایا ہے۔ کیا آنکھیں ہیں لاحول... ولاقوۃ...!

(3)

پٙن زندگی سے بیزار تھا۔ وہ اپنے ماموں سے لڑا۔ سسُر کو ایک طولانی عتاب نامہ لکھا۔ ماں باپ سے ردّ و کد کی۔ اور آخر گھر سے بھاگ جانے کے منصوبے باندھنے لگا۔ آشا پر اُسے رحم آتا تھا۔ وہ اپنے تئیں سمجھاتا کہ اس میں اس غریب کی کیا خطا ہے۔ اس نے زبردستی تو مجھ سے شادی نہیں کی۔ لیکن رحم اور تحمل اس نفرت پر غالب نہ آسکتا تھا۔ جو آشا کو دیکھتے ہی اُس کی رگ رگ میں سرایت کر جاتی تھی۔ آشا اپنے اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی۔ طرح طرح کے بال سنوارتی۔ گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر سنگار کرتی۔ لیکن پٙن کو یہ شُتر غمزے معلوم ہوتے تھے۔ کئی کئی دن گھر میں نہ آتا۔ وہ یہ بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کا بیاہ ہوگیا ہے۔

ایک دن کھانا کھانے کے وقت آشا نے اس سے کہا۔ اب تو آپ کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ کیا میرے کارن گھر چھوڑ دیجیے گا؟

پٙن نے منہ پھیر کر کہا۔ گھر ہی پر تو رہتا ہوں۔ آج کل نوکری کی تلاش ہے۔ اسی لیے دوڑ دھوپ زیادہ کرنی پڑتی ہے۔

آشا: کسی ڈاکٹر سے میری صورت کیوں نہیں بنوا دیتے۔ سنتی ہوں۔ آج کل منہ سدھارنے والے ڈاکٹر پیدا ہوگئے ہیں۔

پٙن: کیوں ناحق چڑھاتی ہو۔ کھانے دوگی یا نہیں؟

آشا: آخر اس مرض کی دوا کون کرے گا۔

چین نے جھنجلا کر کہا۔ اس مرض کی دوا نہیں ہے۔ جو کام ایشور سے نہ ہو سکا وہ آدمی کیا کرے گا۔

آشا: یہ تو تمھیں سوچو، کہ ایشور کی غلطی کی مجھے سزا دے رہے ہو۔ دنیا میں کون ایسا آدمی ہے۔ جسے اچھی صورت بری لگتی ہو۔ لیکن تم نے سنا ہے کہ کسی عورت نے اپنے شوہر کو محض بدصورت ہونے کے باعث چھوڑ دیا؟شاید دوسرے ملکوں میں عورتیں اتنی صورت پرست ہوں۔ لیکن یہاں تو نہیں ہیں۔

چین نے بگڑ کر کہا۔ کیوں ناحق سر کھا رہی ہو۔ میں تم سے بحث تو نہیں کر رہا ہوں۔ دل پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ دلیلوں کا ہی اس پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ میں تمھیں کچھ کہتا تو نہیں ہوں۔ پھر کیوں مجھ سے حجت کرتی ہو؟

آشا یہ جھڑکی سن کر چلی گئی۔ اسے معلوم ہوگیا کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے میری طرف سے اپنا دل سخت بنا لیا ہے۔

(4)

چین تو روز سیر سپاٹے کرتے۔ کبھی کبھی رات رات بھر غائب رہتے۔ ادھر آشا فکر اور غم سے گھلتے گھلتے بیمار پڑ گئی۔ لیکن چین بھول کر بھی اسے دیکھنے نہ جاتے۔ تیمار داری تو دور رہی۔ اتنا ہی نہیں، وہ دل میں مناتے تھے کہ یہ مر جاتی تو گلا چھوٹتا۔ اب کی دفعہ خوب دیکھ بھال کر اپنی پسند کی شادی کرتا۔

اب وہ اور بھی کھیل کھیلے۔ پہلے آشا سے کچھ دبتے تھے۔ کم سے کم یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی میری حرکات پر نگاہ رکھنے والا بھی ہے۔ اب وہ خیال بھی غائب ہوگیا۔ یہاں تک پینگ بڑھے کہ مردانے کمرے ہی میں احباب کے جمگھٹ ہونے لگے۔ لیکن نفس پرستی صرف دولت کا ہی ستیاناس نہیں کرتی۔ اس سے کہیں زیادہ قوائے ذہنی و جسمانی کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ چین کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ جسم لاغر ہوگیا۔ پسلیوں کی ہڈیاں نکل آئیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ بناؤ سنوار کرتے۔ روز تیل ملتے۔ خط صاف کرتے۔ کپڑے بدلتے، پر چہرہ پر وہ چمک اور سرخی نہ تھی۔ جو صحت کی برکت ہے۔ رنگ و روغن سے کیا ہو سکتا تھا۔

ایک دن آشا برآمدے پر چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ادھر ہفتوں سے اس نے پٹن کو نہ دیکھا تھا۔ آج انھیں دیکھنے کو جی چاہا۔ اُسے خوف تھا کہ وہ نہ آئیں گے۔ پھر بھی وہ اس خواہش کو دور نہ کر سکی۔ پٹن کو بلا بھیجا۔ پٹن کو بھی اس پر کچھ رحم آ گیا۔ آکر سامنے کھڑے ہو گئے۔ آشا نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونک پڑی۔ وہ اتنے لاغر ہو گئے تھے کہ پہچاننا مشکل تھا۔ بولی۔ کیا تم بھی بیمار ہو؟مجھ سے بھی زیادہ گھُل گئے ہو؟

پٹن نے بے دِلی سے کہا۔ اُونہہ، زندگی میں رکھا ہی کیا ہے کہ زندہ رہنے کی فکر کروں۔

آشا: زندہ رہنے کی فکر نہ کرنے سے بھی کوئی اتنا دبلا نہیں ہو جاتا۔ تم اپنی کوئی دوا کیوں نہیں کرتے؟

یہ کہہ کر اس نے پٹن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی چارپائی پر بٹھا لیا۔ پٹن نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ ان کا مزاج آج بہت نرم ہو گیا تھا۔ غصہ یا وحشت یا دل آزاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ آشا کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

پٹن چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ میری دوا اب موت کرے گی۔ میں تمھیں جلانے کے لیے نہیں کہتا۔ ایشور جانتا ہے۔ میں تمھارا دل نہیں دُکھانا چاہتا۔ مگر اب میں زیادہ نہ جیوں گا۔ مجھے کسی خوفناک بیماری کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں تمھاری کچھ خدمت نہ کر سکا۔ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ غشی سی آجاتی ہے۔

یہ کہتے کہتے وہ یکایک کانپ اٹھے۔ سارے جسم میں رعشہ آ گیا۔ غش کھا کر چارپائی پر گر پڑے۔ اورہاتھ پاؤں پٹکنے لگے۔ اعضا میں تشنج ہونے لگا۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ جسم پسینہ سے تر ہو گیا۔

آشا کی بیماری غائب ہو گئی۔ وہ مہینوں تک بستر نہ چھوڑ سکتی تھی۔ پر اس وقت اس کے نحیف اعضا میں ایک برقی قوت دوڑ گئی۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر پٹن کو سنبھالا اور ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ گھر بھر میں ہلچل پڑ گئی۔ باہر خبر

ہوئی۔ دوستوں نے دوڑ کر ڈاکٹر کو بلایا۔ کوئی تدبیر کار گر نہ ہوئی۔ پن نے آنکھیں نہ کھولیں۔ شام ہوتے ہوتے ان کا منہ ٹیڑھا ہوگیا۔ اور جسم کا بایاں حصہ بے جان ہو گیا۔ ہلنا تو دور رہا، منہ سے بات تک نکلنی مشکل ہوگئی۔ یہ غشی نہ تھی۔ فالج کا دورہ تھا۔

(5)

فالج کے مریض کی تیمارداری آسان نہیں ہے۔ اس پر آشا خود مہینوں سے بیمار تھی۔ لیکن اس مرض کے سامنے وہ اپنی بیماری بھول گئی۔ اس کی بیماری جسمانی نہیں، روحانی تھی۔ روح کا جسم سے تعلق ہے۔ اس لیے جسم پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ دو ہفتہ تک پن کی حالت بہت نازک رہی۔ زندگی اور موت میں برابر کشمکش ہوتی رہی۔ آشا دن کے دن اور رات کی رات ان کی خدمت میں لگی رہتی۔ وقت پر دوا پلانا۔ ان کے ذرا ذرا اشاروں کو سمجھنا اور کھانے پینے کے متعلق ڈاکٹر کی حرف بہ حرف تعمیل کرنا اُسی کا کام تھا۔ اپنا سر درد سے پھٹا کرتا۔ بخار سے جسم پھُنکا جاتا۔ پر اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔

آخر پن کی حالت کچھ سنبھلی۔ ان کا بایاں پیر تو مفلوج ہوگیا۔ چہرہ کی کجی بھی بدستور قائم تھی۔ پر توتلی زبان میں کچھ بولنے لگے تھے۔ ان کا مردانہ حسن خاک میں مل گیا تھا۔ چہرہ اتنا ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ جیسے کوئی ربڑ کے کھلونے کو کھینچ کر بڑھا دے۔ بیٹری کی مدد سے ذرا دیر کے لیے بیٹھ یا کھڑے ہو تو جاتے تھے۔ لیکن چلنے پھرنے کی طاقت نہ تھی۔ ایک دن لیٹے لیٹے انھیں کیا جانے کیا خیال آیا۔ آئینہ لے کر اپنا منہ دیکھنے لگے ایسی مکروہ صورت انھوں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ خود ڈر گئے۔ غمناک لہجے میں بولے۔

''آشا! بھگوان نے مجھے غرور کی سزا دے دی۔ یہ اسی بد سلوکی کا بدلہ ہے۔ جو میں نے تمھارے ساتھ کی ہے۔ اب اگر میری طرف دیکھ کر تم نفرت سے منہ پھیر لو تو مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس کمینے پن......''

آشا نے اُن کے منھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میں تو آپ کو اب بھی اُسی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ مجھے تو آپ میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔

پچن۔ واہ !بندر کا سا منہ نکل آیا ہے۔ تم کہتی ہو کوئی فرق ہی نہیں۔ میں اب کبھی باہر نہ نکلوں گا۔ ایشور نے مجھے وہی سزا دی۔ جس کا میں مستحق تھا۔

(6)

بہت علاج معالجہ کیا گیا۔ مگر پچن کا منہ نہ سیدھا ہوا۔ ہاں پیروں میں اتنی طاقت آگئی کہ اب وہ چلنے پھرنے لگے۔

آشا نے ان کی بیماری میں کچھ منتیں مانی تھیں۔ آج وہی تقریب تھی۔ محلہ کی عورتیں جمع تھیں۔ گانا بجانا ہو رہا تھا۔ ایک سہیلی نے پوچھا۔ کیوں آشا ایک بات پوچھوں برا تو نہ مانو گی۔ اب تو تمھیں ان کا منہ ذرا بھی اچھا نہ لگتا ہوگا۔

آشا نے متین انداز سے کہا۔ مجھے تو پہلے سے کہیں اچھا لگتا ہے۔

"چلو باتیں بناتی ہو۔"

"نہیں بہن! سچ کہتی ہوں۔ صورت کے بدلے مجھے ان کا دل مل گیا۔ جو صورت سے کہیں قیمتی ہے۔"

پچن اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی دوست جمع تھے۔ تاش ہو رہا تھا۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو آنگن میں کھلتی تھی۔ ایک دوست نے اسے چپکے سے کھول دیا اور جھانک کر بولے۔ آج تو تمھارے یہاں پریوں کا اچھا جمگھٹا ہو رہا ہے۔

پچن : "بند کر دو۔ کوئی دیکھ لے گا۔"

"ذرا ٹھہرو بھئی۔ دیکھنے دو۔ کیسی اچھی اچھی صورتیں ہیں۔ تمھیں ان سبھوں میں کون سب سے اچھی معلوم ہوتی ہے؟"

پچن نے اڑتی ہوئی نظروں سے آنگن کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہی جو تھال میں پھول رکھ رہی ہے۔

"واہ ری آپ کی نگاہ !سبحان اللہ ! کیا صورت کے ساتھ تمھاری نگاہ بھی بدل گئی۔ مجھے تو وہ سب سے بدصورت معلوم ہوتی ہے۔"

"اس لیے کہ تم اس کی صرف ظاہری صورت دیکھ رہے ہو۔ اور میں اس کا

باطن دیکھ رہا ہوں۔ "

اچھا۔ تو یہی جناب کی اہلیہ ہیں۔

"جی" ہاں یہ وہی دیوی ہے۔ جس پر میں ہزاروں پریوں کو قربان کر سکتا ہوں۔

(یہ افسانہ چاند کے مئی جون 1925 کے شمارہ میں "استری اور پرش" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ ہندی میں مان سرودر 3 اور اردو میں پریم چالیسی نمبر 2 میں شامل ہے۔)

نیچ ذات کی لڑکی

(1)

ماں اور بیٹی ایک جھونپڑی میں گاؤں کے اس سرے پر رہتی تھیں۔ بیٹی باغوں سے پتیاں جمع کر لاتی ماں بھاڑ جھونکتی۔ یہی ان کے گذران کی صورت تھی سیر دو سیر اناج مل جاتا تھا۔ کھا کر پڑ رہتی تھیں۔ ماں بیوہ تھی۔ بیٹی ''کنواری ''گھر میں اور کوئی آدمی نہ تھا ماں کانام تھا گنگا، بیٹی کا گورا۔

گنگا کو کئی سال سے یہ فکر تھی کہ کہیں گورا کی سگائی ہو جائے لیکن کہیں بات پکی نہ ہوتی تھی۔ شوہر کے مر جانے کے بعد گنگا نے شادی نہ کی تھی نہ اور کوئی کام کرتی تھی۔ اس سے لوگوں کو شک ہوگیا تھا کہ آخر اس کا گذر کیسے ہو تا ہے۔ اور لوگ چھاتی پھاڑکر محنت کرتے ہیں۔ پھر بھی پیٹ بھر روٹی میسر نہیں آتی۔ یہ عورت کوئی دھندھا نہیں کرتی۔ پھر بھی اپنی لڑکی کے ساتھ آرام سے رہتی ہے۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ ضرور اس میں کچھ نہ کچھ راز ہے۔ رفتہ رفتہ اس شبہ نے یقین کی صورت اختیار کر لی، اور اب تک زندہ تھا۔ برادری میں کوئی گورا سے سگائی کرنے پر رضامند نہ ہو تا تھا۔

شوورون کی برادری بہت محدود ہوتی ہے۔ دس پانچ کوس سے زیادہ اس کا دائرہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک دوسرے کے عیب و حسن کسی سے چھپے نہیں رہتے نہ ان کی پردہ پوشی کی جا سکتی ہے۔

اس الزام سے بری ہونے کے لیے ماں نے بیٹی کے ساتھ کئی تیرتھ کیے اوڑیسہ تک ہو آئی لیکن الزام دور نہ ہوا۔ گورا جوان تھی۔ حسین تھی مگر اسے کسی نے کنوئیں پر یا کھیتوں میں ہنستے بولتے نہیں دیکھا۔ اس کی نگاہ کبھی اوپر نہ اٹھتی تھی لیکن یہ باتیں بھی حسن ظن کی بدلے بدگمانیوں کا باعث ہو تی تھیں۔ ضرور کوئی نہ کوئی معاملہ ہے کوئی جوان عورت اتنی خشک اور بے لوث نہیں ہو سکتی یوں ہی دن گذرتے جاتے تھے۔ بڑھیا دن بہ دن فکر سے گھل رہی تھی۔ حسینہ کا حسن دن بہ دن نکھرتا جاتا تھا۔

(2)

ایک دن ایک پردیسی کہار گاؤں سے ہو کر گذرا دس بارہ کوس سے آیا تھا۔ نوکری کی تلاش میں کلکتہ جا رہا تھا۔ رات ہو گئی کسی کہار کا گھر پوچھتا ہوا گنگا کے گھر آگیا۔ گنگا اس کے لیے گیہوں کا آٹا لائی گھر سے برتن نکال کر دیے۔ کہار نے پکایا کھایا سویا باتیں ہونے لگیں شادی کی گفتگو چھڑ گئی۔ کہار جوان تھا۔ گورا پر نگاہ پڑی۔ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھا اور اس کی شرمیلی ادائیں اس کے دل میں کھب گئیں۔ سگائی کرنے پر راضی ہوگیا۔ لوٹ کر چلا گیا۔ دو چار گہنے اپنی بہن کے یہاں سے لایا۔ گاؤں کے بازار سے دو دھوتیاں لیں اور اکیلا سگائی کرنے آ پہنچا۔ سگائی ہو گئی یہیں رہنے لگا۔ گنگا بیٹی اور داماد کو آنکھوں سے دور نہ کر سکتی تھی۔

مگر دس ہی پانچ دنوں میں منگرو کے کانوں میں ادھر ادھر کی باتیں پڑنے لگیں۔ اپنی برادری ہی کے نہیں غیر لوگ بھی اس کے کان بھرا کرتے۔ یہ باتیں سن سن کر منگرو پچھتاتا تھا کہ ناحق یہاں پھنسا مگر گورا کی جدائی کا خیال کرتے ہی اس کا دل کانپ اٹھتا تھا۔

ایک مہینہ کے بعد منگرو اپنی بہن کے گہنے لوٹانے گیا۔ بہن نے اور کچھ تو نہ کہا۔ لیکن کھانا کھانے کے وقت اس کا بہنوئی اس کے ساتھ کھانے نہ بیٹھا۔ منگرو کو اکیلے ہی چوکے پر بیٹھنا پڑا۔ منگرو نے بہنوئی سے پوچھا تم کیوں نہیں آتے۔

بہنوئی نے کہا تم کھالو میں پھر کھالوں گا۔

منگرو۔ بات کیا ہے تم کھانے کیوں نہیں اٹھتے؟

بہنوئی۔ جب تک پنچایت نہ ہو جائے گی میں تمھارے ساتھ کیسے کھا سکتا ہوں۔ برادری تو تمھارے لیے نہ چھوڑ دوں گا۔

منگرو چوکے سے اٹھ آیا۔ مرزئی پہنی اور سسرال چلا گیا۔

اسی رات کو وہ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر کہیں چلا گیا۔ گورا نیند میں مست پڑی ہوئی تھی اسے کیا خبر تھی کہ وہ رتن جو میں نے مدت کے بعد پایا تھا۔ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑے جارہا ہے۔

(3)

کئی سال بیت گئے۔ منگرو کا پتہ نہ چلا۔ کوئی خط نہ آیا مگر گورا بہت خوش نظر آتی وہ مانگ میں سیندور ڈالتی۔ صاف کپڑے پہنتی۔ منگرو ایک بھجن کی پرانی کتاب چھوڑ گیا تھا۔ اسے لے کر کبھی کبھی پڑھتی اور گاتی منگرو نے اُسے ہندی سکھا دی تھی ٹٹول ٹٹول کر بھجن پڑھ لیتی تھی۔ پہلے وہ اکیلی بیٹھی رہتی تھی۔ گاؤں کی اور عورتوں کے ساتھ اسے بولتے چالتے شرم آتی تھی۔ اس کے پاس وہ چیز نہ تھی جو دوسروں کے پاس تھی۔ اور عورتیں اپنے اپنے شوہر کی باتیں کرتیں گورا کا شوہر کہاں تھا۔ وہ کس کی باتیں کرتی۔ اب اس کے بھی شوہر تھا۔ اب وہ اور عورتوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی حقدار تھی۔ وہ بھی منگرو کا ذکر کرتی منگرو کتنا محنتی ہے۔ کتنا شریف دکھتا ہے دلیر۔ ان تذکروں سے اسے سیری ہی نہ ہوتی تھی۔

عورتیں پوچھتیں۔ تجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔

گورا کہتی۔ کیا کرتے بہن، مرد کبھی سسرال میں پڑا رہتا ہے۔ دیس پردیس میں نکل کر چار پیسہ کمانا ہی تو مردوں کا کام ہے۔ نہیں تو عزت آبرو کا نباہ کیسے ہو۔

جب کوئی پوچھتا چٹھی پتر کیوں نہیں بھیجتے تو ہنس کر کہتی۔ اپنا پتہ ٹھکانہ بتاتے ڈرتے ہیں جانتے ہیں نہ کہ گورا آکر سر پر سوار ہو جائے گی۔ سچ کہتی ہوں بہن، مجھے اس کا پتہ ٹھکانہ معلوم ہو جائے تو یہاں ایک دن نہ رہا جائے۔ وہ بہت اچھا کرتے ہیں کہ میرے پاس چٹھی پتر نہیں بھیجتے بیچارے پردیس میں کہاں گھر گرہستی سنبھالتے پھریں گے۔

(4)

اس طرح کئی سال گذر گئے ایک دن کلکتہ سے ایک آدمی آیا۔ اس کا گھر بھی نزدیک ہی تھا کلکتہ میں منگرو سے اس کی دوستی تھی۔ منگرو نے اس کے ہاتھ گورا کے لیے کچھ روپئے ایک پیتل کا خوبصورت کلسا اور ایک اچھی سی ساری بھیجی تھی۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ منگرو کلکتہ کے کسی کارخانے میں نوکر ہے اور آرام سے ہے۔ اس دن گورا کو جو خوشی ہوئی اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے بات بات میں ہنسی پڑتی تھی زمین پر پانوں ہی نہ پڑتے تھے معلوم ہوتا تھا زمین آسمان پر اڑی جارہی ہے

ہر ایک چیز زیادہ روشن، زیادہ خوش آئند، زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ ہر ایک چیز۔ اس کی کتیا طوطا اسے مبارکباد دیتے ہوئے جان پڑتے تھے۔ اس کی ان بڑی بڑی کالی کالی آنکھوں میں غرور زیادہ تھا یا خوشی اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

آج اسے معمول سے قبل ہی بھاڑ جلادی اور شام تک جلائے رہی۔ مگر بھنائی کچھ نہ ملی سارا دن اسے باتوں میں ہی کاٹ دیا کسی کا دانہ کچا رہ گیا۔ کسی کا جل گیا کبھی ناند میں بالو بھرتی جاتی کبھی بلا بالو کے ہی کرچھلا چلاتی۔

گنگا نے بیٹی سے کہا لوکاویاس کی چیزوں کو کیا یہاں کوئی اس کی آس لگائے بیٹھا ہے کیا اس کلسے کے بغیر ہم پیاسوں مرتے تھے یا اس ساڑی کے بغیر کوئی ننگا تھا۔ روپے کیا خیرات بھیجے ہیں وہ بڑے کلونت ہیں تو بیٹھے رہے یہاں کوئی ان کے روپے پیسے کا بھوکا نہیں ہے۔ چھوڑ کے چلے گئے اب یہ ڈلار۔

گورا نے ہنس کر کہا۔ کیسے جانتی ہو کہ اماں کہ چھوڑ کے چلے گئے چھوڑ کر جاتے تو یہ چیزیں کیوں بھیجتے انھیں تو پردیس میں بھی ہماری یاد بنی ہوئی ہے۔ ان کی چیزیں لوٹادوں گی تو ان کے دل میں نہ جانے کیا خیال آئے۔

روز سویرے گورا اس پیتل کے کلسے کو بالو سے مانجتی اور اس میں پانی بھر کر رکھ دیتی وہ روز بروز زیادہ چمکدار ہو تا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ابھی ٹھٹھیرے کی دوکان سے آیا ہے۔ کلسے کو کنوئیں میں اتنی احتیاط سے ڈالتی کہ کنوئیں کی دیواروں کی ذرا بھی ٹکر نہ لگے۔ بہت آہستہ آہستہ کھینچتی اور جب کو لھے پر کلسے کو لیکر وہ گھر چلتی تو معلوم ہو تا وہ کلسے میں امرت لے جارہی ہے۔

گاؤں میں ایسا پوربی کلسا کسی کے پاس نہ تھا۔ پھر منگرو کا بھیجا ہوا۔ پردیسی پیا کی یادگار۔ اس کی محبت کا روشن ثبوت۔ اس پر پھول نہیں چڑھاتی تھی۔ چندن نہیں لگاتی تھی لیکن دل میں اس کی عزت دیوتا سے کم نہ تھی۔ میلے ہاتھوں میں اسے کبھی نہ چھوتی نہ کسی کو چھونے دیتی۔ دروازہ پر کوئی آدمی آکر پانی مانگتا تو اسی کلسے کا پانی دیتی اسی کلسے کا پانی باسدیو کو چڑھاتی تھی۔

ایک بار گورا بیمار پڑی۔ اتنی کمزور ہوگئی کہ کھڑا بھی نہ ہوا جاتا تھا لیکن کلسے کو مانجھنا اس نے نہ چھوڑا۔ روز سویرے اٹھ کر یہ کام کرتی تھی معلوم نہیں اس کام کے

لیے اس کے جسم میں کہاں سے طاقت آجاتی تھی۔

اس کے بعد دس سال تک پھر منگرو نے کھوج خبر نہ لی۔ ادہر گنگا بھی مر گئی اور گورا بالکل اکیلی رہ گئی۔

اب گورا کا سن بھی ڈھل چلا تھا گھر کا کام کاج بھی اکیلے کرنا پڑتا۔ ماں کے کریا کرم میں اپنے گہنے گروی رکھ دیے تھے انھیں چھڑانے کے لیے روپیوں کی فکر تھی اس لیے دو تین گھروں کا دھندھا بھی کرنے لگی تھی۔ لیکن پہلا کام اپنے کلسے کو مانجنا اور اس میں پانی بھرنا تھا۔

ایک بار اس کے دروازے سے کوئی اس کی بکری چرا لے گیا چوکیدار نے تھانہ میں اطلاع کر دی۔ تھانہ سے تھانہ دار صاحب موقع واردات پر آ پہنچے۔ انھوں نے گورا کے شوہر کا نام پوچھا، کسی نے بتلا دیا منگرو تھانہ دار نے منشی سے لکھوایا۔ گورا زوجہ منگرو۔ یہ الفاظ گورا کے کانوں کو بہت پیارے لگے۔ وہ منگرو کی بیوی ہے۔ تھانہ دار داروغہ حاکم بھی منگرو کو پوچھتے ہیں سرکاری کاغذوں میں بھی میں ان کی زوجہ لکھ دی گئی اب بھلا کس بات کی کمی؟

گاؤں میں شادی بیاہ کے موقع پر گاؤں بھر کی سہاگن عورتوں کی مانگ میں سیندور بھرا جاتا ہے۔ گورا ان موقعوں پر سو کام چھوڑ کر پہنچتی تھی۔ اس عورتوں کے ساتھ اپنی مانگ میں سیندور بھروانا اس کی حسن نسائیت کو روشن کر دیتا تھا۔

بہت دن کے بعد گورا کا نام پوچھتا ہوا ایک ڈاکیہ گاؤں میں آیا گورا کے نام ایک بیرنگ چٹھی تھی چٹھی کلکتہ سے آئی تھی۔ گورا نے چٹھی لینے کو ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ معلوم نہیں خوشی سے یا کسی سانحہ کے خیال سے جب ڈاکیہ چلا گیا تو گورا نے چٹھی کھولی اور پڑھتے ہی پچھاڑ کھا کر گر پڑی منگرو مر گیا تھا۔

گورا کا سہاگ اٹھ گیا اسے پھر کسی نے کسی کے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا جس مانگ میں سیندور کی موٹی سی دھار بہا کرتی تھی وہاں اب سفیدی تھی۔ گویا خاک اڑ رہی تھی۔ نہ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں نہ آنکھوں میں کاجل۔ وہ اب بیوہ ہوگئی۔ بیوہ عورت اپنی منحوس صورت لے کے کس کے گھر جائے۔

گاؤں کی عورتیں سمجھانے لگیں۔ اب رو دھو کر کیا کروگی۔ دھیرج کرو۔

بھگوان نے جو کرم میں لکھا تھا وہ ہوا۔ گورا نے کہا ہاں بہن اب دھیرج کرنے کے سوا اور کیا کروں گی۔ اتنی لالسا رہ گئی کہ میں ان کی سیوا نہ کر سکی۔

گورا کو کامل یقین تھا کہ منگرو نے میری ہی فکر میں، میری ہی محبت میں۔ میری ہی یاد میں جان دی۔ وہ بھرا ہوا بدن، وہ چوڑا سینہ، وہ جوانی اسے رہ رہ کے یاد آتی تھی۔ ایسا آدمی اتنی جلد مر سکتاہے۔ میری فکر میں ان کی جان گئی۔

برسات کے دن تھے۔ موسلادھار پانی برس رہاتھا۔ گورا کی جھونپڑی بری طرح ٹپک رہی تھی۔ منگرو کی برسی قریب تھی۔ گورا نے گھی، تیل، آٹا، چاول، سب جمع کر رکھا تھا۔ رات بھر جھونپڑی سے پانی ''اچ اچ'' کر پھینکتی رہی۔ خوب بھیگی بخار آگیا اور کئی دن تک وہ چار پائی سے نہ اٹھ سکی مگر کوئی پرسان نہ تھا۔

پانچ دن گذر گئے تھے۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ پانی اس طرح برس رہاتھا کہ آسمان ہی پھٹ پڑے گا۔ گورا کو پیاس لگی مگر کلسے میں پانی نہ تھا۔ بارہ سال سے اس نے اسی کلسے ہی سے پانی پیا تھا۔ کسی گھڑے کا پانی اس کے حلق سے نیچے نہ اُترتا ہی نہ تھا۔ وہ اٹھی اور کلسے کو مانجنے لگی کئی دن سے کلسا مانجہ نہ گیا تھا۔ پھر وہ رسی لے کر پانی بھرنے چلی۔ راستہ بھر گھٹنے تک پانی میں چل کر وہ کنویں پر پہنچی اور ہانپ کانپ کر کلسا کھینچ کر باہر نکالا پھر کلسا لے کر گھر چلی۔ مارے کمزوری کے ایک ایک قدم چلنا مشکل تھا کیچڑ اور پانی سے لت پت جب وہ گھر پہنچی تو ہاتھ سے کلسا چھوٹ کر گر ہٹا اور وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔

صبح کو لوگوں نے دیکھا تو گورا چارپائی پر مری پڑی ہوئی تھی چار پائی کے پاس کلسا اوندھا پڑا ہوا تھا اور منگرو کی دی ہوئی کتاب سرہانے رکھی ہوئی تھی لوگ تعجب کر رہے تھے کہ نیچ ذاتوں میں بھی اتنی عصمت اتنی وفا اتنی شوہر پرستی ہوتی ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار زمانہ کے دسمبر 1925 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ ہندی میں چاند کے شمارہ میں''شودر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ہندی میں مان سرودور 2 میں شامل ہے۔ اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔)

لیلیٰ

یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ لیلیٰ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے؟ اور کیا کرتی ہے؟ ایک دن لوگوں نے ایک بے مثال حسینہ کو طہران کے ایک گوشہ میں اپنے دف پر حافظ کی یہ غزل جھوم جھوم کر گاتے سنا۔

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند چناں نہ ماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

اور سارا طہران اُس پر فدا ہو گیا... یہی لیلیٰ تھی۔

لیلیٰ کے حُسن و دلکش کا تصور کرنا ہو تو افق کی شگفتہ سُرخی کو خیال میں لائیے، جب نیلگوں آسماں زرّیں شعاعوں سے منور ہو تا ہے۔ موسم بہار کو خیال میں لائیے، جب باغ میں رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں اور اُن پر بُلبلیں چہچہاتی ہیں۔

لیلیٰ کی دلکش آواز کا تصور کرنا ہو تو اس گھنٹی کی آواز پیہم کو خیال میں لائیے جو رات کی سحر کار خموشی میں اونٹوں کی گردنوں میں بجتی ہوئی سنائی دیتی ہے یا اُس بانسری کی آواز کو جو دوپہر کی تکان افزا سکوت میں کسی درخت کے سایہ سے مچلتی ہوئی نکلتی ہے۔

جس وقت لیلیٰ مست ہوکر گاتی تھی تو اس کے چہرہ پر ایک غیر معمولی رونق آجاتی تھی۔ وہ اُس آنے والے دن کا پیغام سناتی تھی۔ جب ملک میں امن کی سلطنت ہوگی۔ جب خوں ریزیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ وہ بادشاہوں کو بیدار کرتی۔ یہ عیش و تنعم کب تک؟ یہ ثروت اور اقتدار کب تک؟ وہ رعایا کی خوابیدہ تمناؤں کو بیدار کرتی۔ ان کی رگ ہائے جاں کو اپنے نغموں سے مترنم کردیتی۔

سارا طہران لیلیٰ پر فدا تھا۔ مایوسیوں کے لیے وہ اُمید کا چراغ تھی۔ رنگین مزاجوں کے لیے جن کی حور، دولت مندوں کے لیے ضمیر بیدار۔ اور ذی اقتداروں کے لیے رحم و انصاف کا پیغام۔ جیسے روح مادہ کو کھینچ لیتی ہے اُسی طرح لیلیٰ نے انسانوں کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا اور یہ حسن بے مثال امرت کی طرح پاک، برف

کی طرح سفید اور گل نورس کی طرح تازہ تھا۔ اس کی ایک پُرمہر نگاہ، ایک شگفتہ تبسم، ایک رسیلی ادا پر سونے کے پہاڑ کھڑے ہوجاتے۔ اقتدار اس کی پرستش کرتا۔ ثروت اس کے پیروں کی خاک چومتی۔ لیکن لیلیٰ میں فقر کی استغنا تھی اور صبر کی بے نیازی۔ وہ شاعر کے تخیل کی طرح صرف مسرت اور آرزو کی چیز تھی۔

(2)

ایک دن شام کو طہران کا شاہزادہ گھوڑے پر سوار اُدھر سے نکلا۔ لیلیٰ گا رہی تھی۔ نادر نے گھوڑے کو روک لیا اور معلوم نہیں کتنی دیر تک ایک عالم بے خودی میں کھڑا سنتا رہا۔

مرا درد یست اندر دل اگر گویم زباں سوزد مرا دردیست ....

لحہ بہ لحہ شائقین کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا سارا طہران چلا آرہا ہے۔ دفعتاً نادر گھوڑے سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر یکایک لیلیٰ کے پاس جاکر اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ لوگ ادب سے اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔

لیلیٰ نے اس کی طرف غلط انداز نگاہ سے دیکھا۔ پر کچھ پوچھا نہیں، کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ بدستور گانے میں محو رہی۔ لیکن اُس کا گلا تھرانے لگا۔ جیسے باجے کا کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔

ایک شریف آدمی نے کہا۔ لیلیٰ! یہ ہمارے حضور شاہزادہ نادر ہیں۔

لیلیٰ بے پروائی سے بولی۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن یہاں شاہزادوں کا کیا کام۔ ان کے لیے محلات ہیں، محفلیں ہیں، شراب کا دور ہے۔ میں ان کے لیے گاتی ہوں جن کے دل میں درد ہے۔ ان کے لیے نہیں جن کے دل میں شوق ہے۔

شاہزادہ نے مجنونانہ لہجہ میں کہا۔ لیلیٰ! بیشک میں شوق کا غلام تھا مگر تم نے درد کا مزہ چکھا دیا۔

لیلیٰ پھر گانے لگی۔ لیکن آواز قابو میں نہ تھی۔ گویا اس کا گلا ہی نہ تھا۔ لیلیٰ نے مجبور ہوکر دف بغل میں دبایا اور اپنے مسکن کی طرف چلی۔ سامعین اس کے پیچھے پیچھے اس مقام تک آئے جہاں اس کا جھونپڑا تھا۔ جب وہ اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر پہنچی تو سبھی رخصت ہوچکے تھے۔ صرف ایک شخص جھونپڑے کے سامنے خاموش

مؤدب کھڑا تھا۔

لیلیٰ نے پوچھا، تم کون ہو؟

نادر نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا، تمھارا غلام نادر۔

لیلیٰ : میرے جھونپڑے میں تمھارے لیے بھی جگہ نکل آئے گی۔

نادر : نہیں لیلیٰ۔ میرے لیے یہ درخت کا سایہ کافی ہے۔

آج نادر کو باجرے کی خشک روٹیوں میں وہ لذت ملی جو نعمتوں کے خوان میں بھی کبھی نہ ملی تھی۔ کھا کر اس نے گھاس کا بستر بنایا اور اُسی درخت کے سایہ میں پڑ رہا۔

نادر سارے دن لیلیٰ کے نغمے سنتا۔ گلیوں میں، سڑکوں پر، جہاں وہ جاتی اس کے پیچھے پیچھے گھومتا اور رات کو خشک روٹیاں کھاکر اسی درخت کے نیچے سو رہتا۔ بادشاہ نے سمجھایا، ملکہ نے سمجھایا، اُمرا نے منتیں کیں۔ لیکن نادر کے سر سے لیلیٰ کا سودا نہ گیا بلکہ اس کے لیے اچھے سے اچھے کھانے بنواکر بھیجتی۔ پر نادر اس کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھتا۔

مگر لیلیٰ کے نغموں میں اب وہ شیرینی نہ تھی۔ نہ وہ لوچ تھا نہ وہ اثر۔ وہ اب بھی گاتی تھی۔ سننے والے اب بھی آتے تھے۔ مگر اب وہ اپنا دل خوش کرنے کو نہیں ان کا دل خوش کرنے کو گاتی تھی اور سننے والے بھی بے قرار ہوکر نہیں بلکہ اس کو خوش کرنے کے لیے آتے تھے۔

ایک روز لیلیٰ گانے نہ گئی تو نادر نے کہا، کیوں لیلیٰ آج کیا ہے؟

لیلیٰ نے کہا، اب کبھی نہ جاؤں گی۔ سچ کہنا تمھیں میرے گانے میں پہلے کا سا لُطف آتا ہے؟

نادر بولا، پہلے سے کہیں زیادہ۔

لیلیٰ : لیکن اور لوگ تو اب پسند نہیں کرتے؟

نادر : مجھے اس کا تعجب ہے۔

لیلیٰ : تعجب کی بات نہیں۔ اس دل میں پہلے سب کے لیے جگہ تھی۔ اس کا دروازہ کھلاہوا تھا۔ وہ سب کو خوش کرسکتا تھا۔ اس میں سے جو آواز نکلتی تھی وہ سب

کے دلوں میں پہنچتی تھی۔ اب تم نے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ اب وہاں صرف تم ہو۔ اس کی آواز تمھیں کو پسند آتی ہے۔ یہ دل اب تمھارے سوا اور کسی کے کام کا نہیں رہا۔ چلو۔ آج تک تم میرے غلام تھے۔ آج سے میں تمھاری کنیز ہوں۔ تھوڑی سی آگ لے کر اس جھونپڑے میں لگا دو۔ اس دف کو اُسی میں جلا دوں گی۔

(3)

کئی سال گزر گئے۔ نادر اب بادشاہ تھا وہ اُس کی ملکہ... ایران کی حکومت ایسی خوش اسلوبی سے کبھی نہ ہوئی تھی۔ دونوں ہی رعایا کے خدمت گزار تھے۔ محبت نے وہ مشکلیں بھی رفع کردیں۔ جو لیلیٰ کو پریشان کیے رہتی تھی۔ نادر شاہانہ اقتدار کا ضامن تھا۔ لیلیٰ حقوق عامہ کی لیکن عملاً ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ کبھی یہ دب جاتا۔ کبھی وہ دب جاتی۔ نادر لیلیٰ کا رُخ دیکھتا تھا۔ لیلیٰ نادر کا پاس کرتی تھی۔ کام سے فرصت ملتی تو دونوں کبھی گاتے بجاتے، کبھی دریا کی سیر کرتے۔ کبھی کسی درخت کے سایہ میں بیٹھے ہوئے حافظؔ کی غزلیں پڑھتے اور جھومتے۔ نہ لیلیٰ میں اب وہ سادگی تھی۔ نہ نادر میں اب وہ تکلف تھا۔ نادر کا لیلیٰ پر قابو تھا۔ جو معمولی بات تھی مگر لیلیٰ کا بھی نادر پر پورا قابو تھا۔ جو غیر معمولی بات تھی۔ جہاں بادشاہوں کے محل سرا میں بیگمات کے محلے بستے تھے، درجنوں اور کوڑیوں سے ان کا شمار ہوتا تھا وہاں لیلیٰ اکیلی تھی۔ جہاں محل سرا کا سالانہ خرچ کروڑوں تک پہنچتا تھا۔ وہاں اب ہزاروں سے زائد نہ تھا۔ یہ ساری قطع و برید لیلیٰ نے کی تھی۔ بادشاہ نادر تھا۔ حکومت لیلیٰ کے ہاتھوں میں تھی۔

مگر سیاسیات کے رموز حال تنقید نہیں ہوتے۔ اقتدار پرستوں کے دلوں میں اندیشے پیدا ہونے لگے۔ اگر ملک کا یہی حال رہا تو ملوکیت کے فنا ہوجانے میں شبہ نہیں۔ جمشید کا لگایا ہوا تناور درخت جس سے صدیوں تک آندھی اور طوفان کا مقابلہ کیا۔ اب ایک حسینہ کے نازک مگر قاتل ہاتھوں سے اُکھڑا جارہا تھا۔ اس تحریک نے احرار کو بھی مشتعل کیا۔ اگر ایران اس رفتار سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہوگا تو وہ قیامت سے پہلے منزل مقصود پر نہ پہنچے گا۔ دونوں جماعتوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئی۔ اور یہ کشمکش روز بروز زیادہ ہونے لگی۔

(4)

رات کا وقت تھا۔ لیلیٰ و نادر اپنی خواب گاہ میں بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ کمرہ میں کوئی آرائش نہ تھی۔ صرف ایک جاجم بچھا ہوا تھا۔

نادر نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا، بس یہ زیادتی نہیں۔ تمھاری چال ہو چکی۔ تمھارا پیدل پیٹ گیا۔

لیلیٰ : اچھا یہ شہ!

نادر : تمھارے ساتھ ہارنے میں جو مزہ ہے وہ جیتنے میں کہاں۔

لیلیٰ : اچھا! تو گویا آپ میرا دل خوش کررہے ہیں۔ شہ بچایئے۔ نہیں دوسری چال میں مات ہوتی ہے۔

نادر : (اردب دے کر) اچھا اب سنبھل جانا۔ ایک بار میرا فرزیں اُٹھا تو تمھاری صفوں کا صفایا کر دے گا۔

لیلیٰ : کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ یہ شہ! لایئے فرزیں۔ یہ نہ ہوگا۔

نادر : جب تک میرا دل آرام موجود ہے بادشاہ کو کوئی غم نہیں۔

لیلیٰ : اچھا یہ شہ! لایئے دل آرام کو ادھر۔ کہیے اب تو مات ہوئی۔

نادر : ہاں جانِ من! اب تو مات ہوگئی۔ جب میں ہی نثار ہوگیا تو میرا بادشاہ کب بچ سکتا تھا۔

لیلیٰ : تینوں ماتیں ہوگئیں۔ اب چپکے سے اپنا وعدہ وفا کیجیے۔ اور اس فرمان پر دستخط کر دیجیے۔

یہ کہہ کر لیلیٰ نے ایک فرمان نکالا جسے اس نے خود اپنے موتی کے سے حروف میں لکھا تھا۔ اس میں غلہ کی درآمد کا محصول گھٹا کر نصف کردیا گیا تھا۔ لیلیٰ رعایا کے فلاح کے لیے دل و جان سے کوشاں رہتی تھی۔ نادر نے اس شرط پر رعایت منظور کی تھی کہ لیلیٰ اسے تین ماتیں دے دے۔ وہ مشاق کھلاڑی تھا۔ یہ لیلیٰ جانتی تھی مگر یہ شطرنج کی بازی نہ تھی، صرف محبت کا کھیل تھا۔ نادر نے مسکرا کر فرمان پر دستخط کردیے۔

لیلیٰ کا چہرہ غرور سے سُرخ ہوگیا۔ جو کام برسوں کی تحریک سے نہ ہوسکتا تھا۔

وہ محبت کی ایک نگاہ نے پورا کر دیا۔ وہ یہ سوچ کر پھولی نہ سماتی تھی کہ جس وقت یہ فرمان سرکاری اخبار میں شائع ہوگا اس وقت احرار کتنے خوش اور اہلِ استبداد کتنے غضبناک ہوں گے۔

محبت سے سرشار نادر اس کے چاند سے مکھڑے کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کا قابو ہوتا تو حسن کی اس مورت کو اپنے دل میں بٹھا لیتا۔

(5)

دفعتاً صدر دروازہ پر ایک دل ہلا دینے والا شور سنائی دیا۔

ایک لمحہ میں خلقت کا ایک سیلاب ہتھیاروں سے مسلح آپہنچا اور اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ محافظوں کی جماعت دیوار کی مانند حائل ہوگئی۔ وہ خشمگیں جماعت دیواروں پر چڑھنے لگی۔ باب عالی پر بدست جنگ شروع ہوگئی۔

لیلیٰ رنج و ندامت سے سر جھکا کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا کیا یہی وہ مجمع ہے جس کی تکالیف کی داستان اُس کی زبان پر سحر بن جاتی تھی؟ یہی وہ کمزور، فاقہ کش، خستہ حال خلقت ہے جو اُسے جان سے زیادہ عزیز تھی۔

نادر بھی خاموش تھا لیکن شرم سے نہیں۔ اس کا چہرہ غضبناک ہورہا تھا۔ بار بار ہونٹ چباتا اور تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر رہ جاتا تھا۔ بار بار لیلیٰ کی طرف پُرسش کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ تمھاری منشا ہو تو دم زدن میں باغیوں کے پُرزے اُڑا دوں۔ مگر اس سے آنکھیں چار نہ ہوتی تھی۔

آخر وہ بے قرار ہوکر بولا۔ لیلیٰ میں اب برداشت نہیں کرسکتا۔ کیا کہتی ہو؟

لیلیٰ نے عاجزانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ذرا صبر کیجیے۔ پہلے ان لوگوں سے پوچھیے، چاہتے کیا ہیں؟

نادر محل کی چھت پر چڑھ گیا۔ لیلیٰ بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر آپہنچی۔ دونوں باغیوں کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ہزاروں گلوں سے آواز نکلی۔ وہ کھڑی ہے! وہ کھڑی ہے! لیلیٰ وہ کھڑی ہے۔ یہ وہ مجمع تھا جو لیلیٰ کے نغموں پر مست ہوجایا کرتا تھا۔

نادر نے بلند آواز میں باغیوں سے خطاب کیا۔ اے ایران کے بدنصیب رعایا! تم نے بغاوت کا جھنڈا کیوں کھڑا کیا ہے؟ کیا تم کو میرا اور اپنے خدا کا بالکل خوف نہیں

ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اپنی آنکھوں کے ایک اشارے سے تمھاری ہستی خاک میں ملا سکتا ہوں۔ میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ ایک لمحہ کے اندر یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ کلام پاک کی قسم، میں تمھارے خون کی ندی بہا دوں گا۔

سردار نے کہا، جو بندۂ عیش ہو اور آوازِ خلق کی طرف سے کان بند کرلے وہ ہمیں اپنے حکم کی تعمیل کے لیے مجبور نہیں کرسکتا۔ ہم اس وقت تک نہ جائیں گے جب تک شاہی محل لیلیٰ سے خالی نہ ہوجائے۔

نادر نے طیش میں آکر کہا۔ احسان فراموشو! تمھیں اپنی ملکہ کی شان میں ایسی بے ادبی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ جب سے لیلیٰ نے اس سلطنت کو زینت دی ہے اُس نے تمھارے ساتھ کتنی رعایتیں کی ہیں۔ کیا تم بھول گئے۔ ظالمو! یہ ملکہ ہے! مگر وہی کھانا کھاتی ہے جو تم کتوں کو کھلا دیتے ہو۔ وہی کپڑے پہنتی ہے جو تم فقیروں کو دے دیتے ہو۔ آکر محل سرا کو دیکھو۔ تم اسے اپنی جھونپڑیوں ہی کی طرح آرائش و تکلف سے خالی پاؤگے۔ لیلیٰ تمھاری ملکہ ہوکر بھی فقیروں کی زندگی بسر کرتی ہے۔ تمھیں اس کے قدموں کی خاک کو آنکھوں کا سُرمہ بنانا چاہیے۔ اس کی شان میں تم ایسی گستاخیاں کرتے ہو! افسوس! مجھے معلوم ہوگیا کہ تم جاہل ہو۔ انسانیت سے بے بہرہ۔ تم اسی قابل ہوکہ تمھاری گردنیں چھُری سے کاٹی جائیں اور تمھیں پیروں تلے روندا جائے۔

ہزاروں گلوں سے گھنگھور گرج کی صدا نکلی۔ "لیلیٰ ہماری دشمن ہے۔ وہ ہماری ملکہ نہیں ہے"۔

نادر نے غضبناک ہوکر کہا۔ تمھارے اوپر خدا کا قہر نازل ہو! جس خاتون نے تمھارے لیے خواب و خور حرام کردیا ہے اُسے تم اس طرح مطعون کرتے ہو۔

یہ دیکھو وہ فرمان ہے جس پر ابھی ابھی لیلیٰ نے مجھ سے جبراً دستخط کرائے ہیں۔ غلہ کا محصول درآمد نصف کردیا گیا ہے۔ کیا اب بھی تمھیں اطمینان نہیں ہوتا۔ جسے تم معتبر سمجھتے ہو اُسے یہ فرمان دیکھنے کے لیے بھیج دو۔

پھر وہی گرجتی ہوئی صدا نکلی۔ ہم اپنی تقدیر کو کسی فرد کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے۔ خواہ وہ لیلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔

نادر غصہ سے کانپنے لگا۔ لیلیٰ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ اگر رعایا کی یہی مرضی ہے کہ میں پھر دف بجا کر گاتی پھروں تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے نغموں سے ایک بار پھر اُن کے دلوں پر حکومت کر سکتی ہوں۔

نادر نے جوش میں آ کر کہا۔ لیلیٰ! میں رعایا کی تنک مزاجیوں کا غلام نہیں۔ اس سے پیشتر کہ میں تمھیں اپنے پہلو سے جُدا کروں، طہران کی گلیاں شنگرف ہو جائیں گی۔

نادر نے مینار پر چڑھ کر خطرہ کا گھنٹہ بجایا۔ سارے طہران میں اُس کی آواز گونج اُٹھی۔ محافظ فوج قلعہ میں موجود تھی۔ مگر ایک سپاہی بھی نظر نہ آیا۔

نادر نے دوبارہ گھنٹہ بجایا۔ اُس کی جھنکار سے آسمان تھرّا اُٹھا۔ ستارے کانپ اُٹھے مگر ایک سپاہی نہ نکلا۔

آخر نادر نے تیسری بار گھنٹہ بجایا۔ مگر اس کا جواب بھی صرف ایک کمزور صدائے واپسیں تھی۔

نادر نے سر پیٹ لیا۔ سمجھ گیا کہ بُرے دن آ گئے۔ اب بھی لیلیٰ کو رعایا کی ضد پر قربان کر کے وہ اپنی سلطنت کی حفاظت کر سکتا تھا مگر لیلیٰ اس سلطنت سے کہیں عزیز تھی۔ اس نے چھت پر آ کر لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے لیے ہوئے صدر دروازہ سے نکلا۔ احرار نے نعرہ فتح کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا۔ مگر کسی نے مزاحمت نہ کی۔ راستہ چھوڑ کر ہٹ گئے۔

دونوں چپ چاپ طہران کی گلیوں میں چلے جاتے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ بازاروں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کُتے مرعوب ہو گئے تھے۔ فقیروں نے بھی مسجدوں میں پناہ لی تھی۔ مگر یہ دونوں بے خوف چلے جا رہے تھے۔ نادر کی کمر میں تلوار تھی۔ لیلیٰ کے ہاتھ میں دف تھا۔ یہ اُن کی شوکت کی مٹی ہوئی نشانی تھی۔

(6)

پورا سال گزر گیا۔ لیلیٰ اور نادر دیس بدیس کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ سمرقند اور بخارا، نجد اور حلب، قاہرہ اور عدن سارے ملک انھوں نے چھان ڈالے۔

لیلیٰ کا دف پھر جادو کرنے لگا۔ اس کی آواز سنتے ہی شہروں میں اچھل مچ جاتی۔ چاروں طرف سے تواضع و تکریم ہونے لگتی۔ لیکن یہ دونوں رہ نورد کہیں ایک دن سے زیادہ نہ ٹھہرتے۔ نہ کسی کے دروازے پر جاتے۔ رُوکھا کھاتے اور کبھی کسی درخت کے نیچے، کبھی کسی پہاڑ کے غار میں اور کبھی سڑک کے کنارے رات بسر کرتے تھے۔ دنیا کے ظالمانہ برتاؤ نے انھیں دنیا سے بیزار کردیا تھا۔ اس کی ترغیبوں سے کوسوں بھاگتے تھے۔ انھیں تجربہ ہوگیا تھا کہ یہاں جس کے لیے جان دو وہی اپنا دشمن ہوجاتا ہے۔ جس کے ساتھ نیکی کرو وہی بدی پر کمر باندھتا ہے۔ بڑے بڑے رؤسا کے دعوتی پیغام آتے۔ مگر لیلیٰ کسی کی نہ سنتی تھی۔ نادر کو کبھی کبھی حکومت کا خبط سوار ہوجاتا۔ وہ چاہتا کہ پوشیدہ طور پر کافی فوج مہیا کرکے طہران پر حملہ کردوں اور باغیوں کو مغلوب کرکے بلا خدشہ حکومت کروں۔ مگر لیلیٰ کی بے دلی دیکھ کر اُسے کسی تحریک کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اُدھر ایران میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ جمہور سے تنگ آکر رؤسا نے بھی استبداد پر کمر باندھی تھی۔ اور فریقین میں متواتر معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ پورا سال گزر گیا۔ مگر کھیت جوتے بوئے نہ گئے۔ ملک میں قحط پڑا ہوا تھا۔ تجارت کی کسادہ بازاری تھی۔ خزانہ خالی۔ روز بروز جمہور کی طاقت رو بہ زوال تھی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ حُریت کے رضاکاروں نے ہتھیار ڈال دیے اور سلطنت کی عنان امراء کے ہاتھوں میں آگئی۔ مخالفین کو عبرتناک سزائیں دی گئیں۔ کچھ قید کیے گئے، کچھ جلا وطن ہوئے اور کتنوں ہی کو پھانسی دے دی گئی۔ جمہور کا خاتمہ ہوگیا۔ اب اقتدار پسندوں کو نادر کی یاد آئی۔ تجربہ نے ثابت کردیا کہ ملک میں جمہوریت کی صلاحیت نہیں ہے۔ ظاہر کے لیے دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ اس موقعہ پر ملوکیت ہی ملک کو بچا سکتی تھی۔ یہ بھی مسلم تھا کہ نادر اور لیلیٰ کو اب جمہوریت سے کوئی خاص رغبت نہ ہوگی۔ وہ رؤسا کے ہاتھوں میں کٹ پتلے بنے رہیں گے اور اس طرح ان لوگوں کو رعایا پر من مانی سختیاں کرنے کا موقعہ ملے گا۔ آپس میں مشورے ہوئے اور نادر کو منا لانے کے لیے رؤسا کا ایک وفد روانہ ہوا۔

(7)

شام کا وقت تھا۔ لیلیٰ اور نادر دمشق کی ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان پر سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ لیلیٰ قدرت کی بہار دیکھنے میں محو تھی اور نادر دورِ گزشتہ کی یاد میں۔ ایک کے لیے زندگی پُر بہار تھی، دوسرے کے لیے خارزار۔

دفعتاً بہت دور گرد اڑتی نظر آئی۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار چلے آرہے تھے۔ نادر اٹھ بیٹھا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ مسرت سے جگمگا اُٹھا۔ جسم لاغر میں جان سی پڑگئی۔ جوش سے بولا۔ "لیلیٰ یہ ایران کے لوگ ہیں۔ کلام پاک کی قسم، یہ ایران کے لوگ ہیں"۔

لیلیٰ نے آنے والوں کی طرف متفکر نظروں سے دیکھا اور بولی۔ اپنی تلوار سنبھال لو۔ شاید اس کی ضرورت پڑے۔

نادر۔ نہیں لیلیٰ۔ ایران کے لوگ اتنے فرومایہ نہیں ہوسکتے کہ ایک معذور آدمی پر تلوار اُٹھائیں۔

لیلیٰ۔ پہلے میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔

یہ رؤسا کا وفد تھا جو نادر کو تخت کی دعوت دینے آرہا تھا۔ نادر دوڑ کر اُن کے گلے سے لپٹ گیا۔ وہ اب ایران کا بادشاہ نہ تھا۔ ایک ایرانی سیاح تھا۔ بادشاہت مٹ گئی تھی۔ مگر ایرانیت روئیں روئیں میں بھری ہوئی تھی۔

نادر نے ان کا پیغام سن کر بے نیازی کی شان سے کہا۔ میں اس غربت میں بہت آرام سے ہوں۔ آپ لوگ مجھے دق نہ کریں۔

وفد کے سردار نے کہا۔ ہم حضور کا دامن نہ چھوڑیں گے۔ یہیں آپ کے قدموں پر نثار ہوجائیں گے۔

"اب مجھے اس کشمکش میں نہ ڈالیے۔ حکومت سے طبیعت سیر ہوگئی"۔

"حضور، شورش پسندوں کا اب نشان بھی نہیں باقی ہے۔ ہم لوگ انھیں پھر سر نہ اُٹھانے دیں گے۔ صرف حضور کا سہارا چاہیے"۔

اگر آپ مجھے اس ارادہ سے لے جانا چاہتے ہیں تو معاف رکھیے۔ میں نے اس سیر و سیاحت میں ہر ایک ملک کی رعایا کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا

ہوں کہ اُن کی حالت قابلِ رحم ہے۔ ایران میں مجھے کبھی ایسے موقعے نہ ملے تھے۔ میں رعایا کو اہلکاروں کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اب آپ لوگ مجھ سے یہ اُمید نہ رکھیں کہ میں آئینی غارت گری شروع کروں گا۔ اور اُمرا کی آسائش اور وقار کے لیے رعایا کا خون کروں گا۔ یہ عذاب اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔ میں میزان عدل برابر رکھوں گا اور اسی شرط پر ایران جاسکتا ہوں۔

لیلیٰ نے مسکرا کر کہا۔ تم رعایا کا قصور معاف کرسکتے ہو۔ کیونکہ اُسے تم سے کوئی عناد نہ تھا۔ اس کے دانت تو مجھ پر تھے۔ میں اُسے کیوں کر معاف کرسکتی ہوں۔

نادر نے متانت سے کہا۔ تم اتنی کینہ پرور نہیں ہو لیلیٰ! مجھے یقین نہیں آتا کہ تمھارے منھ سے یہ باتیں نکل رہی ہیں۔

اُسی روز سے جب احرار نے باب عالی پر ہنگامہ کیا تھا اور لیلیٰ کی جلاوطنی پر مصر ہوئے تھے۔ لیلیٰ کے خیالات میں انقلاب ہوگیا تھا۔ ابتدا ہی سے اُس نے عوام سے ہمدردی کرنا سیکھا تھا۔ فاقہ کشی اور برہنگی کی تکلیفیں جھیل چکی تھی۔ وہ شاہی عمال کو رعایا پر ظلم کرتے دیکھتی اور اس کا نازک دل تڑپ اٹھتا۔ وہ اپنے میں کوئی ایسی طاقت پیدا کرنا چاہتی تھی جو ظالموں کے دل میں رحم اور رعایا کے دل میں جرأت پیدا کرے۔ اس کا طفلانہ تصور اسے تخت شاہی پر بٹھا دیتا۔ جہاں وہ اپنے عدل و انصاف سے دنیا میں ایک نیا دور قائم کردیتی۔ کتنی ہی راتیں اس نے ایسے ہی خوابوں کے دیکھنے میں کاٹی تھیں۔ کتنی ہی بار وہ مظلوموں کے سرہانے بیٹھ کر روئی تھی۔ تب اُس میں نغمہ کا کمال رونما ہوا۔ اُسے اپنی قوت کا احساس ہونے لگا۔ وہ طفلانہ تصور زیادہ روشن، زیادہ مستحق ہوگیا۔ وہ اب اتنا بعید از امکان نہ تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔ دفعتاً نادر اس کے طفلانہ تصور کی بہار لیے ہوئے اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ خواب نے حقیقت کی شکل اختیار کی۔ لیکن حقیقت اتنی دل فریب، اتنی خوش آئند نہ تھی جتنا وہ خواب، اُسے زندگی کا نیا اور تلخ تجربہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ رعایا اتنی متحمل، اتنی عاجز اور بے زبان نہیں ہے۔ وہ اچھے سلوک کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ مقدرت پاکر اس کا اچھا استعمال نہیں کرسکتی۔ اُسی دن سے رعایا کی جانب سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ پر نادر کی خاطر وہ کیا کچھ نہ کرتی۔

(8)

جس روز نادر اور لیلیٰ نے پھر طہران میں قدم رکھا سارا شہر اُن کے خیر مقدم کے لیے اُمڈ پڑا۔ شہر پر ہیبت ایک اندھیرے بادل کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ امرا کے محلے آباد اور گلزار تھے۔ غربا کے محلے اجڑے ہوئے۔ جنھیں دیکھ کر جگر پاش پاش ہو جاتا تھا۔ نادر رو پڑا مگر لیلیٰ کے ہونٹوں پر بے رحمانہ تبسم تنا بیٹھا تھا۔

نادر نے باگ ڈور سنبھالی۔ مگر اب اور تب میں کتنا فرق تھا! تب کوئی طاقت اس کے سست قدموں کو آگے بڑھاتی رہتی تھی۔ اب وہ طاقت اس کے تیز قدموں کو روکتی تھی۔ وہ ہر روز دیکھتا کہ میں جو کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا۔ اور جو نہیں کرنا چاہتا وہی ہوتا ہے۔ مگر اس کا علاج اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ لیلیٰ میشت غیب کی طرح اس کے دل پر مسلط تھی۔ اس گردش کے ایام میں لیلیٰ کی زندگی کے جو چھپے ہوئے پہلو، جو پوشیدہ حقیقتیں آشکارا ہوئی تھیں وہ اتنی دلکش، اتنی لطف انگیز، اتنی ساحر تھیں کہ نادر اس کی منشا کو نوشتہ تقدیر سمجھتا تھا۔ لیلیٰ کی صحبت میں اس کی تمناؤں کا معراج تھا۔ اس کے لیے وہ کیا کچھ نہ کرسکتا تھا۔ رعایا کی اور اس کی سلطنت کی اس کے سامنے کیا ہستی تھی۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ رعایا کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔

(9)

ایک روز نادر شکار کھیلنے گیا اور ہمراہیوں سے الگ ہو کر جنگل میں بھٹکنے لگا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی اور رفیقوں کا کہیں پتہ نہیں۔ گھر لوٹنے کا راستہ بھی نہ معلوم تھا۔ آخر خدا کا نام لے کر وہ ایک طرف چل پڑا کہ کسی گاؤں یا آبادی کا نشان تو ملے گا۔ وہیں رات بھر پڑا رہوں گا۔ چلتے چلتے جنگل کے دوسرے سرے پر اُس کو ایک گاؤں نظر آیا۔ جس میں مشکل سے تین چار مکانات ہوں گے۔ ہاں ایک مسجد البتہ تھی۔ مسجد میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا مگر کسی آدمی کا نشان نہ تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس لیے کسی کو جگانا مناسب نہ تھا۔ نادر نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور اُسی مسجد میں رات بسر کرنے کی ٹھانی۔ وہاں ایک بوسیدہ چٹائی پڑی ہوئی

تھی۔ اس پر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر تک سوتا رہا۔ یکایک کسی کی آہٹ پاکر چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا نماز پڑھ رہا ہے۔ نادر کو تعجب ہوا کہ اس وقت کون سی نماز پڑھتا ہے۔ اُسے خبر ہی نہ تھی کہ رات ختم ہو چکی اور یہ فجر کی نماز ہے۔ وہ پڑا پڑا دیکھتا رہا۔ بوڑھے نے نماز ادا کی۔ پھر سینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگا۔

"اے خدائے پاک! تو ہی غریبوں کا مددگار اور بیکسوں کا سہارا ہے۔ تو اس ظالم بادشاہ کے مظالم دیکھتا ہے پھر بھی تیرا قہر اس پر نازل نہیں ہوتا۔ یہ کافر بے دین ایک حسینہ کے عشق میں اپنے کو اتنا بھول گیا ہے کہ نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے اور نہ کانوں سے سنتا ہے۔ اگر دیکھتا تو اسی حسینہ کی آنکھوں سے، سنتا ہے تو اسی حسینہ کے کانوں سے۔ تیری مخلوق اس مظالم سے تنگ آگئی ہے۔ یا تو اس ظالم کو جہنم واصل کردے یا ہم بیکسوں کو دنیا سے اُٹھا لے"۔

نادر کا خون سرد ہو گیا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ رعایا اُس سے مطمئن نہیں ہے۔ مگر اُسے کبھی یہ خیال نہ ہوا تھا کہ اس کی مصیبت اتنی ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔ بوڑھا تو خدا کی درگاہ میں فریاد کر کے رخصت ہو گیا پر نادر وہیں بے حس پڑا رہا گویا اس پر بجلی گر پڑی ہو۔

ایک ہفتہ تک نادر دربار میں نہ آیا اور نہ کسی مشیر کو ہی طلب کیا۔ سارے دن اندر پڑا سوچا کرتا۔ لیلیٰ اس کے پاس بار بار جاتی۔ کبھی اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کبھی اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر پوچھتی تم کیوں اتنے اُداس ہو؟ نادر اسے دیکھ کر رونے لگتا۔ مگر منھ سے کچھ نہ کہتا۔ نیک نامی یا لیلیٰ؟ یہی اس کے سامنے مشکل مسئلہ تھا۔ اس کے دل میں برابر کشمکش ہوتی رہتی تھی پر وہ کچھ تصفیہ نہ کرسکتا تھا۔ نیک نامی عزیز تھی۔ وہ بدنام ہو کر زندہ رہ سکتا تھا مگر لیلیٰ کے بغیر زندگی محال تھی۔

آٹھویں دن وہ مُسکراتا ہوا اُٹھا۔ اس نے تصفیہ کر لیا تھا۔ لیلیٰ میری ہے میں لیلیٰ کا ہوں! نہ میں اس سے الگ، نہ وہ مجھ سے جدا۔ جو کچھ وہ کرتی ہے وہ میرا۔ جو کچھ

میں کرتا ہوں وہ اُس کا ہے۔ یہاں من و تو کا فرق ہی کہاں ہے۔ بادشاہت چند روزہ ہے۔ فانی ہے۔ محبت قائم ہے۔ لافانی۔ ہم روزِ ابد تک ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے ہوئے بہشت کا لُطف اٹھائیں گے۔ ہمارا عشق ابد تک ستارہ کی طرح چمکتا رہے گا۔

نادر خوش ہوکر اُٹھا۔ اس کا چہرہ فتح کی سرخی سے لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے شجاعت ٹپکی پڑتی تھی۔ وہ لیلیٰ کی محبت کا جام پینے جارہا تھا۔ جسے ایک ہفتہ سے اُس نے منہ نہیں لگایا تھا۔ اس کا دل اس امنگ سے اُچھلا پڑتا تھا۔ جو آج سے پانچ سال پہلے پیدا ہوا کرتی تھی۔ محبت کا پھول کبھی نہیں مُرجھاتا۔ محبت کی ندی کبھی نہیں اُترتی۔

لیکن لیلیٰ کی آرام گاہ کا دروازہ بند تھا۔ اور اس کا دف جو روزانہ دروازہ پر ایک کھونٹی سے لٹکا رہتا تھا، غائب تھا۔ نادر کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ دروازہ بند ہونے کا مطلب تو یہ ہوسکتا تھا کہ لیلیٰ باغ میں ہوگی مگر دف کہاں گیا۔ ممکن ہے کہ وہ دف لے کر باغ میں گئی ہو۔ لیکن یہ اُداسی کیوں چھائی ہے۔ یہ حسرت کیوں برس رہی ہے۔

نادر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ لیلیٰ اندر نہ تھی۔ پلنگ بچھا ہوا تھا۔ شمع جل رہی تھی۔ وضو کا پانی رکھا ہوا تھا۔ نادر کے پیر کانپنے لگے۔ کیا لیلیٰ رات کو بھی نہیں سوئی۔ کمرہ کے ایک ایک چیز میں لیلیٰ کی یاد تھی۔ اس کی تصویر تھی۔ اس کی مہک تھا۔ مگر لیلیٰ نہ تھی۔ مکان سونا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بے نور آنکھ!

نادر کا دل بھر آیا اس کی ہمت نہ پڑی کہ کسی سے کچھ دریافت کرے۔ دل اتنا رنجیدہ ہوگیا کہ وہیں دیوار سا فرش پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ جب ذرا آنسو تھما تو آنسو پوچھنے لگا اور بستر کو سونگھا کہ شاید لیلیٰ کی کچھ خوشبو ہی معلوم ہو۔ لیکن خس اور گلاب کی مہک کے سوا اور کوئی خوشبو نہ تھی۔

دفعتاً اس کے تکیہ کے نیچے سے باہر نکلا ہوا ایک کاغذ کا پُرزہ نظر آیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کلیجہ کو سنبھال کر وہ پُرزہ نکال لیا اور سہمی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ ایک نظر میں سب کچھ معلوم ہوگیا۔ یہ نادر کی قسمت کا آخری فیصلہ تھا۔ نادر

کے منھ سے نکلا۔ ہائے لیلیٰ .... ! اور وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ لیلیٰ نے اس پُرزہ میں لکھا تھا:

"میرے پیارے نادر! .... تمھاری لیلیٰ تم سے جُدا ہوتی ہے ہمیشہ کے لیے۔ تلاش نہ کرنا۔ تم میرا سراغ نہ پاؤگے۔ میں تمھاری محبت کی کنیز تھی۔ تمھاری بادشاہت کی بھوکی نہیں۔ آج ایک ہفتہ سے دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری نگاہ پھری ہوئی ہے۔ تم مجھ سے نہیں بولتے۔ میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مجھ سے بیزار رہتے ہو۔ میں کن کن ارمانوں سے تمھارے پاس جاتی ہوں اور کتنی مایوس ہوکر لوٹتی ہوں۔ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ میں نے اس سزا کے لائق کوئی کام نہیں کیا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تمھاری بھلائی ہی کی نیت سے۔ ایک ہفتہ مجھے روتے ہی گزر گیا۔ مجھے معلوم ہورہا ہے کہ اب میں تمھاری نگاہوں سے گر گئی۔ تمھارے دل سے خارج ہوگئی..."!

لیلیٰ محبت کی لونڈی تھی۔ جب محبت نہ رہی تو لیلیٰ کیوں کر رہتی... رخصت !!"

نادر نے اس کاغذ کے پُرزے کو آنکھوں سے لگایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل ایک ہولناک بیابان کی طرح کھڑا سسک رہا تھا۔

ایک لمحہ میں اسی ہولناک بیابان سے ایک صدائے درد اُٹھی۔ لیلیٰ...! لیلیٰ...! جس نے اُس بیابان کے ایک ایک ذرے کو اسی صدا سے مترنم کردیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار سرسوتی کے جنوری 1926 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ مان سرودر 2 میں شامل ہے اور اردو میں فردوسِ خیال اور پریم چالیسی دونوں میں شامل ہے۔)

مریدی

گھر کے جھگڑوں اور عورتوں کے فقدان سے پنڈت چنتا من کے دل میں ترک وغنا کا جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے سنیاس لے لیا۔ اس وقت ان کے دلی دوست پنڈت موٹے رام جی شاشتری نے انھیں یوں نصیحت کی :

''دوست !ہمارے اچھے اچھے سادھو مہاتماؤں سے ساتھ رہا ہے۔ وہ جب کسی بھلے مانس کے دروازے جاتے ہیں تو گڑ گڑا کر ہاتھ نہیں پھیلاتے اور جھوٹ موٹ آشیر باد نہیں دینے لگتے کہ نارائن تمھارا چولا مست رکھے اور تم سدا سکھی رہو۔ یہ تو بھیکاریوں کادستور ہے۔ سنت لوگ دوارے پر جاتے ہی ہانک لگاتے ہیں۔ جس میں گھر کے لوگ چونک پڑیں اورشوق سے باہر دوڑیں۔ مجھے ایسی ہانک والی دو چار بانیاں (فقرے) معلوم ہیں، جی چاہے تو سیکھ لو۔ گدڑی بابا کہا کرتے تھے، مریں تو پانچوں مریں۔ یہ ہانک سنتے ہی لوگ ان کے پیروں پر گر پڑتے تھے۔ سدھ بھگت کی ہانک بہت بڑھیا تھی۔ کھاؤ پیو، چین کرو پہنو گہنا۔ پر بابا جی کے سونٹے سے ڈرتے رہنا۔ ننگا باباکہا کرتے تھے دے تو دے نہیں تو دلادے کھلادے پلادے سلادے۔ یہ سمجھ لو کہ تمھارا آدر اور تمھاری خاطرداری بہت کچھ تمھاری ہانک کے اوپر ہے۔ اور کیا کہوں؟ بھولنا مت ہم اور تم بہت دنوں ساتھ رہے، سینکڑوں بھوج ساتھ کھائے۔ جس نیوتے میں ہم اور تم دونوں پہنچتے تھے تو لاگ ڈانٹ سے ایک دو پتّل اور اُڑا جاتے تھے۔ تمھارے بنا اب میرا رنگ نہ جمے گا۔ ایشور تمھیں سدا سگندھ والی چیزیں کھلائے۔

چنتامن کو ان فقروں میں سے ایک بھی پسند نہ آیا۔ بولے میرے لیے کوئی بانی سوچو۔

موٹے رام : اچھا یہ بانی کیسی ہے کہ ''نہ دو گے تو ہم چڑھ بیٹھیں گے؟

چنتا من: ''ہاں مجھے پسند ہے۔ تم کہو تو اس میں کچھ کاٹ چھانٹ کروں۔''

موٹے رام: ''ہاں ہاں کرو۔''

چنتا: اچھا تو اس کو اس طرح رکھو۔ ''نہ دے گا تو ہم چڑھ بیٹھیں گے۔''

موٹے رام (اُچھل کر) نارائن جانتا ہے۔ یہ بانی اپنے رنگ میں نرالی ہے۔ بھگتی نے تمھارے گیان کو چمکا دیا ہے، بھلا ایک بار للکار کر کہو تو، دیکھیں کیسا کہتے ہو۔

چنتا من نے دونوں کان انگلیوں سے بند کر لیے اور اپنی پوری طاقت سے چلا کر بولے۔ نہ دے گا تو چڑھ بیٹھوں گا۔ یہ آواز ایسے زور شور کی تھی کہ موٹے رام بھی دفعتاً چونک پڑے۔ چمگاڈر گھبرا کر درختوں پر سے اڑ گئے، کتے بھوکنے لگے۔

موٹے رام: یار !تمھاری بانی سن کر میرا تو کلیجہ کانپ اٹھا۔ ایسی للکار کہیں سننے میں نہیں آئی۔ تم سنگھ کی طرح گرجتے ہو۔ بانی تو ٹھیک ہوگئی۔ اب کچھ دوسری باتیں بتاتا ہوں، کان دے کر سنو۔ سادھوؤں کی بھاکھا ہماری بول چال سے الگ ہوتی ہے۔ ہم کسی کو آپ کہتے ہیں کسی کو تم۔ سادھو لوگ چھوٹے بڑے، امیر، غریب، بوڑھے جوان سب کو "تو" کہہ کر پکارتے ہیں۔ مائی اور بابا سدا بولتے رہنا۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ سیدھی ہندی کبھی مت بولنا، نہیں تو بھرم کھل جائے گا۔ ٹیڑھی ہندی بولنا، یہ کہنا کہ مائی مجھ کو کچھ کھلا دے۔ سادھو لوگوں کی بولی ٹھیک نہیں ہے۔ پکا سادھو اسی بات کو یوں کہے گا۔ مائی !میرے کو بھوجن کرادے تیرے کو بڑا پن ہوگا۔

چنتا۔ یار، ہم تیرے کو کہاں تک گن گاویں۔ تیرے لیے میرے ساتھ بڑا سلوک کیا ہے۔

اس طرح نصیحت دے کر موٹے رام رخصت ہوئے۔ چنتا من جی آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گانجہ بھنگ کی دکان کے سامنے کئی جٹا دھاری سادھو بیٹھے ہوئے گانجہ کے دم لگا رہے ہیں۔ چنتا من کو دیکھ کر ایک مہاتما نے اپنی جے کار سنائی "چل چل جلدی لے کر چل نہیں تو کرتا ہوں بے کل۔"

ایک دوسرے سادھو نے کڑک کر کہا۔ ارا رارا دھم، اب کیا ہے گم(غم)

ابھی یہ کڑاکا آسمان میں گونج رہا تھا کہ تیسرے مہاتما نے گرج کر اپنی بانی سنائی "یہ دیس بنگلا جس کو دیکھا نہ بھالا، چٹ پٹ، بھر دے پیالا۔"

چنتا من کی جی سے اب نہ رہا گیا۔ انھوں نے بھی کڑک کر کہا۔ "نہ دے گا تو چڑھ بیٹھوں گا۔"

یہ سن کر سادھوؤں نے چنتا من کی عزت سے آؤ بھگت کی، فوراً گانجے کی چلم بھری گئی اور اسے سلگانے کا بار پنڈت جی پر ڈالا گیا۔ بے چارے بڑے پس و پیش میں پڑے۔ سوچا کہ اگر چلم نہیں لیتا تو ابھی ساری قلعی کھل جائے گی۔ مجبوراً چلم لے لی۔ لیکن جس نے کبھی گانجہ نہ پیا ہو وہ بہت کوشش کرنے پر بھی دم نہیں لگا سکتا۔ انھوں نے آنکھیں بند کر کے اپنی سمجھ میں تو بڑی زور سے دم لگائی، چلم ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، آنکھیں نکل آئیں، منہ سے کف بہنے لگا۔ مگر نہ تو منہ سے دھوئیں کا بادل نکلا اور نہ چلم ہی سلگی۔ ان کی یہ خامی انھیں سادھوؤں کی جماعت سے بدر کر دینے کے لیے کافی تھی۔ دو تین سادھو جھلا کر آگے بڑھے اور بڑی بے رحمی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

ایک مہاتما: تیرے کو دھکار ہے۔

دوسرا مہاتما: تیرے کو لاج نہیں آتی، سادھو بنا ہے مورکھ۔

پنڈت جی شرمندہ ہو کر سامنے کی ایک حلوائی کی دوکان پر جا بیٹھے اور سادھوؤں نے کھنجڑی بجا بجا کر یہ بھجن گانا شروع کیا:

مایا ہے سنسار سنو لیا، مایا ہے سنسار
دھرم ادھرم سبھی کچھ جھوٹا یہی گیان بیوپار
سنولیا، مایا ہے سنسار
گانجے بھنگ کو برجت کرتے، ہے ان پر دھکار
سنولیا، مایا ہے سنسار

(یہ افسانہ پہلی بار 1926 میں "پریم پرتیما میں گورو منتر" کے عنوان سے شائع ہوا اردو مجموعہ "فردوس خیال" میں شائع ہے)

پریم سوتر

سنسار میں کچھ ایسے منشیہ بھی ہوتے ہیں جنھیں دوسروں کے مکھ سے اپنی استری کی سوندریہ پرشنسا سن کر اتنا ہی آنند ہوتا ہے جتنا اپنی کیرتی کی چرچا سن کر۔ پچھمی سبھیتا کے پرسار کے ساتھ ایسے پرانیوں کی سنکھیا بڑھتی جارہی ہے۔ پشوپتی ناتھ ورما انھیں لوگوں میں تھے۔ جب لوگ ان کی پرم سندری استری کی تعریف کرتے ہوئے کہتے۔ اوہو۔ کتنی انوپم روپ راشی ہے، کتنا الوکک سوندریہ ہے، تب ورما جی مارے خوشی اور گرو کے پھول اٹھتے تھے۔

سندھیا کا سمے تھا۔ موٹر تیار کھڑی تھی۔ ورما جی سیر کرنے جارہے تھے، کنتو پربھا جانے کو اتسک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی کوئی اُپنیاس پڑھ رہی تھی۔

ورما جی نے کہا۔ تم تو ابھی تک بیٹھی پڑھ رہی ہو؟

میرا تو اس سمے جانے کا جی نہیں چاہتا۔

نہیں پریہ، اس سمے تمھارا نہ چلنا ستم ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہو کہ تمھاری اس مدھر چھوی کو گھر سے باہر بھی تو لوگ دیکھیں۔

جی نہیں، مجھے یہ لالسا نہیں ہے۔ میرے روپ کی شوبھا کیول تمھارے لیے ہے، اور تمھیں کو دکھانا چاہتی ہوں۔

نہیں، میں اتنا سوارتھاندھ نہیں ہوں۔ جب تم سیر کرنے نکلو میں لوگوں سے یہ سننا چاہتا ہوں کہ کتنی منوہر چھوی ہے۔ پشوپتی کتنا بھاگیہ شالی پروش ہے۔

تم چاہو، میں نہیں چاہتی۔ تو اسی بات پر آج میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ تم بھی مت جاؤ۔ ہم دونوں اپنے ہی باغ میں ٹہلیں گے۔ تم حوض کے کنارے ہری گھاس پر لیٹ جانا، میں تمھیں وینا بجا کر سناؤں گی۔ تمھارے لیے پھولوں کا ہار بناؤں گی۔ چاندنی میں تمھارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلوں گی۔

نہیں نہیں پربھا، آج ہمیں اوشیہ چلنا پڑے گا۔ تم کرشنا سے آج ملنے کا وعدہ

کر آئی ہو۔وہ بیٹھی ہمارا راستہ دیکھ رہی ہوگی۔

ہمارے نہ جانے سے اسے کتنا دکھ ہوگا۔

ہائے۔ وہی کرشنا بار بار وہی کرشنا۔ پتی کے مکھ سے نت یہ نام چنگاری کی بھانتی اڑ کر پربھا کو جلا کر بھسم کر دیتا تھا۔

پربھا کو اب معلوم ہوا کہ آج یہ باہر جانے کے لیے کیوں اتنے اُتسک ہیں۔ اسی لیے آج انھوں نے مجھ سے کیشوں کو سنوارنے کے لیے اتنا آگرہ کیا تھا۔ وہ ساری تیاری اسی کلٹا کرشنا سے ملنے کے لیے تھی۔

اس نے درڑھ سور میں کہا۔ تمھیں جانا ہو جاؤ، میں نہ جاؤں گی۔

ورما جی نے کہا۔ اچھی بات ہے، میں ہی چلا جاؤں گا۔

(2)

پشو پتی کے جانے کے بعد پربھا کو ایسا جان پڑا کہ وہ واٹیکا اسے کاٹنے دوڑ رہی تھی۔ اِرشیا کی جوالا سے اس کا کومل ہردے بھسم ہونے لگا۔ وے وہاں کرشنا کے ساتھ بیٹھے وہار کر رہے ہوں گے۔ اسی ناگن کے سے کیش والی کرشنا کے ساتھ جس کے آنکھوں میں گھاتک وِشِ بھرا ہوا ہے۔ مردوں کی بدّھی کیوں اتنی ستھول ہوتی ہے؟ انھیں کرشنا کی چنک منک میں کیوں اتنا موہت کر لیا ہے۔ اس کے مکھ سے میرے پیر کا تلوا کہیں سندر ہے۔ ہاں، میں ایک بچے کی ماں ہوں اور وہ نویونا ہے۔ ذرا دیکھنا چاہیے، ان میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

یہ سوچ کر وہ اپنی ساس کے پاس آکر بولی۔ اماں اس سمے اکیلے جی گھبراتا ہے، چلیے کہیں گھوم آویں۔

ساس بہو پر پران دیتی تھی، چلنے پر راضی ہو گئی۔ گاڑی تیار کرا کے دونوں گھومنے چلی۔ پربھا کا سرنگار دیکھ کر بھرم ہو سکتا تھا کہ وہ بہت پرسنِ ہے۔ کنتو اس کے انغتل میں ایسی بھیشن جوالا دہک رہی تھی، اسے چھپانے کے لیے وہ میٹھے سور میں ایک گیت گاتی جارہی تھی۔

گاڑی ایک سُرمیہ اُپون میں اڑی جارہی تھی۔ سڑک کے دونوں اور وشال وِرکشوں کی سکھد چھایا پڑ رہی تھی۔ گاڑی کے قیمتی گھوڑے گرو سے پونچھ اور سر

اٹھائے ٹپ ٹپ کرتے جارہے تھے۔ اہا۔ وہ سامنے کرشنا کا بنگلہ آگیا، جس کے چاروں اور گلاب کی بیل لگی ہوئی تھی۔ اس کے پھول اس سے نردے کانٹوں کی بھانتی پربھا کے ہردے میں چبھنے لگے۔ اس نے اڑتی ہوئی نگاہ سے بنگلے کی اور تاکا۔ پشوپتی کا پتہ نہ تھا، ہاں کرشنا اور اس کی بہن مایا باغیچے میں وچر رہی تھی۔ گاڑی بنگلے کے سامنے سے نکل ہی چکی تھی کہ دونوں بہنوں نے پربھا کو پکارا اور ایک شن میں دونوں بالیکائیں ہرنیوں کی بھانتی اُچھلتی کودتی پھاٹک کی اور دوڑی۔ گاڑی رک گئی۔

کرشنا نے ہنس کر ساس سے کہا۔ اماں جی، آج آپ پربھا کو ایک آدھ گھنٹے کے لیے ہمارے پاس چھوڑ جایئے۔ آپ ادھر سے لوٹیں تب انھیں لیتی جایئے گا، یہ کہہ کر دونوں نے پربھا کو گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ ساس کیسے انکار کرتی جب گاڑی چلی گئی تب دونوں بہنوں نے پربھا کو باغیچے میں ایک بینچ پر لا بٹھایا۔ پربھا کو ان دونوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے، بڑی جھجھک ہو رہی تھی۔ وہ ان سے ہنس کر بولنا چاہتی تھی۔ اپنی کسی بات سے من کا بھاؤ پرکٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کنتو ہردے ان سے کھنچا ہی رہا۔ کرشنا نے پربھا کی ساڑی میں ایک ترو دِرشٹ ڈال کر کہا۔ بہن، کیا یہ ساڑی بھی لی ہے۔اس کا گلابی رنگ تو تم پر نہیں کھلتا۔ کوئی اور رنگ کیوں نہ کیا؟

پربھا: ان کی پسند ہے، میں کیا کرتی۔

دونوں بہنیں ٹھٹھا مار کر ہنس پڑی۔ پھر مایا نے کہا۔ ان مہاشے کی رُچی کا کیا کہنا، ساری دنیا سے نرالی ہے۔ ابھی ادھر سے گئے ہیں۔ سر پر اس سے بھی ادھک لال پگڑی تھی۔

سہسا پشوپتی بھی سیر سے لوٹتا ہوا سامنے سے نکلا۔ پربھا کو دونوں بہنوں کے ساتھ دیکھ کر اس کے جی میں آیا کہ موٹر روک لے وہ اکیلے ان دونوں سے ملنا ششٹاچار کے وِرودھ سمجھتا تھا۔ اسی لیے وہ پربھا کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ جاتے سمے وہ بہت ساہس کرنے پر بھی موٹر سے نہ اتر سکا تھا۔ پربھا کو وہ دیکھ کر اس سُواوسر سے لابھ اٹھانے کی اس کی بڑی اچھا ہوئی۔ لیکن دونوں بہنوں کی ہاسیہ دھونی سن کر وہ سنکوچ وَش نہ اترا۔ تھوڑی دیر تک تینوں رمنیاں چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ تب کرشنا بولی۔ پشوپتی بابو یہاں آنا چاہتے ہیں۔ پرشرم کے مارے نہیں آئے۔ میرا وِچار ہے کہ

سمبندھیوں کو آپس میں اتنا سنکوچ نہ کرنا چاہیے۔ سماج کا یہ نیم کم سے کم مجھے برا معلوم ہوتا ہے تمھارا کیا وِچار ہے؟ پربھا؟

پربھا نے ونیگ بھاؤ سے کہا۔ یہ سماج کا انیائے ہے۔

پربھا اس سے بھومی کی اُور تاک رہی تھی۔ پر اس کی آنکھوں سے ایسا ترسکار نکل رہا تھا جس نے دونوں بہنوں کے پریہاس کو لجّا سوچک مون میں پری نت کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے ایک چنگاری سی نکلی، جس نے دونوں یوتیوں کے آمود پرمود اور اس کودرتی کو جلا ڈالا جو پربھا کے پتی پراین ہردے کو وانوں سے بیدھ رہی تھی، اس ہردے کو جس میں اپنے پتی کے سوا اور کسی کو جگہ نہ تھی۔

مایا نے جب دیکھا کہ پربھا اس وقت کرودھ سے بھری بیٹھی ہے، تب بیچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی آؤ بہن ذرا ٹہلیں، یہاں بیٹھے رہنے سے تو ٹہلنا ہی اچھا ہے۔

پربھا جیوں کی تیوں بیٹھی رہی۔ پر وہ دونوں بہنیں باغ میں ٹہلنے لگی۔ اس وقت پربھا کا دھیان ان دونوں کے وسترا بھوشن کی اور گیا۔ مایا بنگال کی گلابی ریشم کی ایک مہین ساڑی پہنے ہوئے تھی جس میں نہ جانے کتنی چنٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریشمی چھتری تھی جسے اس نے سوریہ کی اتم کرنوں سے بچنے کے لیے کھول لیا تھا۔ کرشنا کے وستر بھی ویسے ہی تھے، ہاں اس کی ساڑی پیلے رنگ کی تھی اور اس کے گھنگھرالے بال ساڑی کے نیچے سے نکل کر ماتھے اور گالوں پر لہرا رہے تھے۔

پربھا نے ایک ہی نگاہ سے تاڑ لیا کہ ان دونوں یوتیوں میں کسی کو اس کے پتی سے پریم نہیں ہے۔ کیول آمود پسا کے وَشی بھوت ہو کر یہ سویم بدنام ہوں گی۔ اور اس کے سرل ہردے پتی کو بھی بدنام کر دے گی۔ اس نے ٹھان لیا کہ میں اپنے بھرمر کو اِن وِشاکت (زہریلا) پشپو سے بچاؤں گی اور چاہے جو کچھ ہو اسے ان کے اوپر منڈرانے نہ دوگی۔ کیونکہ یہاں کیول روپ اور باس ہے، رس کا نام نہیں۔

پربھا اپنے گھر لوٹتے ہی اس کمرے میں گئی جہاں اس کی لڑکی شانتی اپنی دائی کے گود میں کھیل رہی تھی۔ اپنی ننھی جیتی جاگتی گڑیا کی صورت دیکھتے ہی پربھا کی آنکھیں سجل ہو گئیں۔ اس نے ماتر اسنیہ سے وبھور ہو کر بالکا کو گود میں اٹھا لیا مانوں کسی بھینکر پشو سے اس کی رکشا کررہی ہے اس دسّہہ ویدنا کی دشا میں اس کے منہ سے

یہ شبد نکل گئے۔

بچی، تیرے باپ کو لوگ تجھ سے چھننا چاہتے ہیں۔ ہائے تو کیا اناتھ ہو جائے گی؟ نہیں نہیں اگر میرا بس چلے گا تو میں ان نربل ہاتھوں سے انھیں بچاؤں گی۔

آج سے پربھا وشادے بھاؤناؤں میں مگن رہنے لگی۔ آنے ولی وپتی کی کلپنا کر کے کبھی کبھی بھیاتر ہو کر چلا پڑتی۔ اس کی آنکھیوں میں اس وپتی کی تصویر کھنچ جاتی جو اس کی اُور قدم بڑھائے چلی آتی تھی۔ پر اس بالیکا کی توتلی باتیں اور اس کی آنکھوں کی نیہہ شنک جیوتی پربھا کے وکل ہردے کو شانت کردیتی۔ وہ لڑکی کو گود میں اٹھا لیتی اور وہ مدھر ہسیہ چھوی جو بالکا کے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر کھیلتی ہوتی پربھا کی ساری شنکاؤں اور بادھاؤں کو چھن بھن کر دیتی۔ ان وشواس سے نیترو میں آشا کا پرکاش اسے آشوست کر دیتا۔

ہاں۔ ابھاگنی پربھا تو کیا جانتی ہے کیا ہونے والا ہے؟

گریشم کال کی چاندنی رات تھی۔ سپتمی کا چاند پرکرتی پر اپنا مند شیتل پرکاش ڈال رہا تھا۔ پشوپتی مولسری کی ایک ڈالی ہاتھ میں پکڑے اور تنے سے چپٹا ہوا مایا کی کمرے کی اور ٹکٹکی لگائے تاک رہاتھا۔ کمرے کا دُوار کھلا ہوا تھا اور شانت نشا میں ریشمی ساڑیوں کی سرسراہٹ کے ساتھ دو رمنیوں کی مدُھر ہاسیہ دُھونی مل کر پشوپتی کے کانوں تک پہنچے پہنچتے آکاش میں ولین ہوجاتی تھی۔ ایکایک دونوں بہنیں کمرے سے نکلیں اور اسی اور چلی جہاں پشوپتی کھڑا تھا۔ جب دونوں اس وِرکش کے پاس پہنچیں تب پشوپتی کی پرچھائی دیکھ کر کرشنا چونک پڑی اور بولی۔ ہے بہن۔ یہ کیا ہے؟

پشوپتی ورکش کے نیچے سے آکرسامنے کھڑا ہوگیا۔ کرشنا انھیں پہچان گئی اورکٹھور سور میں بولی۔ آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟ بتلایئے یہاں آپ کا کیا کام ہے؟ بولیے جلدی۔پشوپتی کی سٹی پٹی گم ہوگئی۔ اس اوسر کے لیے اس نے جو پریم واکیہ رٹے تھے وے سب وسمرت ہوگئے۔ سشنک ہو کر بولا۔ کچھ نہیں پر یہ آج سندھیا سمے جب میں آپ کے مکان کے سامنے سے آرہا تھا تب میں نے آپ کو اپنی بہن سے کہتے سنا کہ آج رات کو آپ اس ورکش کے نیچے بیٹھ کر چاندنی کا آنند اُٹھائیں گی۔ میں بھی آپ سے کچھ کہنے کے لیے۔ آپ کے چرنوں پر اپنا... سمرپت کرنے

کے لیے...

یہ سنتے ہی کرشنا کی آنکھوں سے چنچل جوالا سی نکلی اور اس کے ہونٹوں پر وینگیہ پورن ہاسیہ کی جھلک دکھائی دی۔ بولی۔ مہاشیہ آپ تو آج ایک وِچتر ابھینے کرنے لگے۔ کرپا کرکے پیروں پر سے تو اٹھیے اور جو کچھ کہنا چاہتے ہو، جلد کہہ ڈالیے اور جتنے آنسو گرانے ہوں ایک سکنڈ میں گرا دیجیے میں رک رک کر اور گھگھیا گھگھیا کر باتیں کرنے والوں کو پسند نہیں کرتی۔ ہاں اور ذرا باتیں اور رونا ساتھ ساتھ نہ ہوں۔ کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ نہ کہیں گے ؟ لیجیے سمے بیت گیا اور جاتی ہوں۔

کرشنا وہاں سے چل دی۔ مایا بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ پشوپتی ایک شن (لمحہ) وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ مانو وہ سوئی ہے جو چمبک کے آکرشن سے آپ ہی آپ کھنچا چلا جاتا ہے۔

سہسا کرشنا رک گئی اور بولی۔ سنیے پشوپتی بابو۔ آج سندھیا سمے پربھا کی باتوں سے معلوم ہوگیا کہ انھیں آپ کا اور میرا ملنا، جلنا بالکل نہیں بھاتا...

پشوپتی : پربھا کی تو آپ چرچا ہی چھوڑ دیجیے۔

کرشنا : کیوں چھوڑ دوں؟ کیا وہ آپ کی استری نہیں ہے؟ آپ اس سمے اسے گھر میں اکیلی چھوڑ کر مجھ سے کیا کہنے آئے ہیں ؟ یہی کہ ان کی چرچا نہ کروں؟

پشوپتی : جی نہیں یہ کہنے کے لیے کہ اب یہ ورہاگنی نہیں سہی جاتی۔

کرشنا نے ٹھٹھا مار کر کہا۔ آپ تو اس کلا میں بہت نپن جان پڑتے ہیں۔ پریم! سمرپن! ورہاگنی! یہ شبد آپ نے کہاں سیکھے؟

پشوپتی : کرشنا مجھے تم سے اتنا پریم ہے کہ میں پاگل ہوگیا ہوں۔

کرشنا : تمھیں پربھا سے کیوں پریم نہیں ہے؟

پشوپتی : میں تو تمھارا اپاسک ہوں۔

کرشنا : لیکن یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم پربھا کے سوامی ہو؟

پشوپتی : تمھارا تو داس ہوں۔

کرشنا : میں ایسی باتیں نہیں سننا چاہتی۔

پشوپتی : تمھیں میری ایک ایک بات سننی پڑے گی۔ تم جو چاہو وہ کرنے کو میں تیار ہوں۔

کرشنا: اگر یہ باتیں کہیں وہ سن لے تو؟

پشوپتی: سن لے تو سن لے۔ میں ہر بات کے لیے تیار ہوں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اگر تمھاری مجھ پر کرپا درشٹ نہ ہوئی تو میں مر جاؤں گا۔

کرشنا: تمھیں یہ باتیں کرتے سمے اپنی پتنی کا دھیان نہیں آتا؟

پشوپتی: میں اس کا پتی نہیں ہونا چاہتا۔ میں تو تمھارا داس ہونے کے لیے بنایا گیا ہوں۔ وہ سوگندھ جو اس سمے تمھاری گلابی ساڑی سے نکل رہی ہے۔ میری جان ہے۔ تمھارے یہ چھوٹے چھوٹے سُندر پاؤں، میرے پران ہیں۔ تمھاری ہنسی تمھاری چھوی، تمھارا ایک ایک انگ میرا پران ہے۔ میں کیول تمھارے لیے پیدا ہوا ہوں۔

کرشنا: بھئی اب تو سنتے سنتے کان بھر گئے۔ یہ واکھیان اور یہ گدھ کاویہ سننے کے لیے میرے پاس سمے نہیں ہے۔ او مایا مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ چل کر اندر بیٹھے۔

یہ نشٹھر شبد سن کر پشوپتی کے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔ مگر اب اس کا من یہی چاہتا تھا کہ کرشنا کے پیروں پر گر پڑے اور اس سے بھی کرن شبدوں میں اپنی پریم کتھا سنائے۔ کنتو دونوں بہنیں اتنی دیر میں اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھیں اور دُوار بند کر لیا تھا۔ پشوپتی کے نراش گھر لوٹ آنے کے سوا کوئی چارا نہ رہ گیا۔

کرشنا اپنے کمرے میں جاکر تھکی ہوئی سی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔ کہیں پربھا سن لے تو بات کا بتنگڑھ ہوجائے۔ سارے شہر میں اس کی چرچا ہونے لگے اور ہمیں کہیں منہ دیکھانے کی جگہ نہ رہے اور یہ سب ایک ذرا سی دل لگی کے کارن۔ پر پشوپتی کا پریم سچا ہے۔ اس میں سندیہ نہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، انتہ کرن سے کہتا ہے اگر میں اس وقت ذرا سا سنکیت کر دوں تو وہ پربھا کو بھی چھوڑدے گا۔ اپنے آپے میں نہیں ہے۔ جو کچھ کہوں وہ کرنے کو تیار ہے۔ لیکن نہیں پربھا، ڈرومت، میں تمھارا سروناش نہ کروں گی۔ تم مجھ سے بہت نیچے ہو۔ یہ میرے انوپم سوندریہ کے لیے گورو کی بات نہیں کہ تم جیسی روپ وِہینا سے بازی مار لے جاؤں۔ ابھاگے پشوپتی۔ تمھارے بھاگیہ میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہو چکا۔ تمھارے اوپر مجھے دیا آتی ہے۔ پر کیا کیا جائے۔

(4)

ایک خط پہلے ہاتھ پڑ چکا تھا۔ یہ دوسرا پتر تھا۔ جو پربھا کو پتی دیو کے کوٹ کی جیب میں ملا۔ کیسا پتر تھا؟ آہ اسے پڑھتے ہی پربھا کی دیہہ میں ایک جوالا سی اٹھنے لگی۔ تو یوں کہیے کہ یہ اب کرشنا کے ہو چکے۔ اب اس میں کوئی سندیہہ نہیں رہا۔ اب میرے جینے کا دھکار ہے۔ جب جیون میں کوئی سکھ ہی نہیں رہا، تو کیوں نہ اس بوجھ کو اتار کر پھیک دوں۔ وہی پشوپتی، جسے کویتا سے لیش ماتر بھی رچی نہ تھی۔ اب کوی ہو گیا تھا اور کرشنا کو چھندوں میں پتر لکھتا تھا۔ پربھا نے اپنے سوامی کو اُدھر سے ہٹانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس سے ہو سکتا تھا۔ پر پریم کا پرواہ اس کے روکے نہ رکا اور آج اس پرواہ میں اس کے جیون کی نوکا نرادھار وہی چلی جا رہی ہے۔

اس میں سندیہہ نہیں کہ پربھا کو اپنے پتی سے سچا پریم تھا۔ لیکن آتم سمرپن کی تشٹ آتم سمرپن سے ہی ہوتی ہے۔ وہ اُوپیکشا اور نشٹھرتا کو سہن نہیں کر سکتی۔ پربھا کے من میں ودروہ کا بھاؤ جاگرت ہونے لگا۔ اس کا آتما ابھمان جاتا رہا۔ اس کے من میں نہ جانے کتنے بھیشن سنکلپ ہوتے کنتو اپنی اسمرتھتا اور دینتا پر آپ ہی آپ رونے لگتی۔ آہ اس کا سروسو اس سے چھین لیا گیا اور اب سنسار میں اس کا کوئی متر نہیں، کوئی ساتھی نہیں۔

پشوپتی آج کل نتیہ بناؤں سنوار میں مگن رہتا نتیہ نئے نئے سوٹ بدلتا۔ اسے آئینے کے سامنے اپنے بالوں کو سنوارتے دیکھ کر پربھا کے آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ یہ ساری تیاری اسی دشٹا کے لیے ہو رہی ہے۔ یہ چنتا زہریلی سانپ کی بھانتی اسے ڈس لیتی تھی۔ وہ اب اپنے پتی کی پرتیک بات پرتیک گتی کو سُوکشم درشٹ سے دیکھتی۔ کتنی ہی باتیں جن پر وہ پہلے دھیان بھی نہ دیتی تھی۔ اب اسے رہسیہ سے بھری ہوئی جان پڑتی۔ وہ رات کو نہ سوتی، کبھی پشوپتی کی جیب ٹٹولتی، کبھی اس کے میز پر رکھے ہوئے پتروں کو پڑھتی۔ اسی ٹوہ میں وہ رات دن پڑی رہتی۔

وہ سوچنے لگی۔ میں کیا پریم ونچت بنی بیٹھی رہوں؟ کیا میں پرانیشوری نہیں بن سکتی۔ جیون امر نہیں ہے اور یوون بھی تھوڑے ہی دنوں کا مہمان ہوتا ہے۔ کیا اسے پریتیکا بن کر ہی کاٹنا ہوگا۔ آہ نردئی تو نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھ سے آنکھ پھیر لی پر

سب سے بڑا انرتھ یہ کیا کہ مجھے جیون کا گلیشت مارگ دکھا دیا۔ میں بھی وشواس گھات کر کے تجھے دھوکا دے کر کیا کلوشت پریم کا آنند نہیں اٹھا سکتی؟ اشودھارا سے سینچ کر ہی سہی، پر کیا اپنے لیے کوئی وانکا نہیں لگا سکتی؟ وہ سامنے کے مکان میں گھنگھرالے بال والا یُوک رہتا ہے اور جب موقع پاتا ہے میری اُور سچیشٹ نیتروں سے دیکھتا ہے۔ کیا کیول ایک پریم کٹاکش سے میں اس کے ہردے پر ادھیکار نہیں پراپت کر سکتی؟ اگر میں اس بھانتی اس نشٹھرتا کا بدلا لوں تو کیا انوچت ہوگا؟ آخر میں نے اپنا جیون اپنے پتی کو کس لیے سونپا تھا؟ اسی لیے تو کہ سکھ سے جیون وییت کروں۔ چاہوں اور چاہی جاؤں اور اس پریم سامراجیہ کی ادھیشوری بنی رہوں۔ مگر آہ۔ وے ساری ابھلاشائیں دھول میں ملک گئیں۔ اب مرے لیے کیا رہ گیا ہے؟ آج یدی میں مر جاؤں تو کون روئے گا؟ نہیں گھی کے چراغ جلائے جائیں گے۔ کرشنا ہنس کر کہے گی۔ اب بس ہم ہیں اور تم۔ ہمارے بیچ میں کوئی بادھا کوئی کنٹک نہیں۔

آخر پربھا ان کلوشِت بھاؤناوں کے پرواہ میں بہہ چلی۔ اس کے ہردے میں راتوں کو ندرا اور آشا وہین راتوں کو بڑے پربل ویگ سے یہ طوفان اٹھنے لگا۔ پریم تو اب کسی انیہ پروش کے ساتھ کرہی نہ سکتی تھی۔ یہ ویاپار تو جیون میں کیول ایک ہی بار ہوتا ہے۔ لیکن وہ پرانیشوری اوشیہ بن سکتی تھی اور اس کے لیے ایک مدھر مسکان ایک بانکی نگاہ کافی تھی اور جب وہ کسی کی پریمکا ہوجائے گی تو یہ وچار کہ میں نے پتی سے اس کی بے وفائی کا بدلا لے لیا۔ کتنا آنند پرد ہوگا۔ تب وہ اس کی مکھ کی اُور کتنے گرو، کتنے سنتوش، کتنے اُلاس سے دیکھے گی۔

سندھیا کا سمے تھا۔ پشوپتی سیر کرنے گیا تھا۔ پربھا کوٹھے پر چڑھ گئی اور سامنے والے مکان کی اُور دیکھا۔ گھنگھرالے بال والا یوک اس کے کوٹھے کی اور تاک رہا تھا۔ پربھانے آج پہلی بار اس یوک کی اور مسکرا کر دیکھا۔ یوک بھی مسکرایا اور اپنی گردن جھکا کر مانو یہ سنکیت کیا کہ آپ کی پریم درشٹ کا بھکاری ہوں۔ پربھا نے گرو سے بھری ہوئی درشٹ ادھر ادھر دوڑائی۔ مانو وہ پشوپتی سے کہنا چاہتی تھی۔ تم اس کلٹا کے پیروں پڑتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میرے ہردے کو چوٹ نہیں لگتی۔ تو تم بھی دیکھو اور اپنے ہردے پر چوٹ نہ لگنے دو، تم اسے پیار کرو میں (بھی اس سے ہنسوں

بولوں کیوں؟ یہ اچھا نہیں لگتا؟ اس درشیہ کو شانت چت سے نہیں دیکھ سکتے ؟ کیوں رکت کھولنے لگتا ہے؟ میں وہی تو کررہی ہوں جو تم کر رہے ہو۔
آہ! یدی پشوپتی کو گیات ہوجاتا کہ میری نشٹھر تا نے اس ستی کے ہردے کی کتنی کایا پلٹ کردی ہے تو کیا اسے اپنے کرتیہ پر پشچاتاپ نہ ہوتا۔ کیا وہ اپنے کیے پر لجّت نہ ہوتا۔

پربھا نے اس یوک سے اشارے میں کہا۔ آج ہم اور تم پورو والے میدان میں ملیں گے اور کوٹھے کے نیچے اتر آئی۔ پربھا کے ہردے میں اس سمے ایک وہی اُت نکتا تھی جن میں پرتیکار کا آنند مسنترت تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جاکر اپنے چنے ہوئے آبھوشن پہننے لگی۔ ایک شن (لمحہ) میں وہ ایک فالسئی رنگ کی ریشمی ساڑی پہنے کمرے سے نکلی اور باہر جانا ہی چاہتی تھی کہ شانتا نے پکارا۔ اماں جی، آپ کہاں جارہی ہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔
پربھا نے جھٹ بالیکا کو گود میں اٹھا لیا اور اسے چھاتی سے لگاتے ہی اس کے وچاروں نے پلٹا کھایا۔ ان بال نیتروں میں اس کے پرتی کتنا اسیم وشواس، کتنا سرل اسنہہ، کتنا پوتر پریم جھلک رہا تھا۔ اسے اس سمے ماتا کا کرتویہ یاد آیا۔ کیا اس کی پریم کا نشہ اس کے وات سلیہ بھاؤ کو کچل دے گی۔ کیا وہ پرتیکار کی پربل اچھا پر اپنے ماتر کرتویہ کو بلیدان کر دے گی؟ کیا وہ اپنے چھٹرک سکھ کے لیے اس بالیکا کا بھوشیہ اس کا جیون دھول میں ملادے گی؟ پربھا کی آنکھوں سے آنسو کی دو بوندیں گر پڑیں۔ اس نے کہا۔ نہیں، کداپی نہیں، میں اپنی پیاری بچی کے لیے سب کچھ سہ سکتی ہوں۔

(5)

ایک مہینہ گزر گیا۔ پربھا اپنی چنتاؤں کو بھول جانے کی چیشٹا کرتی رہتی تھی۔ پر پشوپتی نتیہ کسی نہ کسی بہانے سے کرشنا کی چرچا کیا کرتا۔ کبھی کبھی ہنس کر کہتا۔ پربھا، اگر تمھاری انومتی ہو تو میں کرشنا سے وِواہ کرلوں۔ پربھا اس کے جواب میں رونے کے سوا اور کیا کرسکتی تھی؟

آخر ایک دن پشوپتی نے اس سے ونے پورن شبدوں میں کہا۔ کیا کہوں پربھا، اس رمنی کی چھوی میری آنکھوں سے نہیں اترتی۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ یہ

کہہ کر اس نے کئی بار اپنا ماتھا ٹھونکا۔ پربھا کا ہردے کرونا سے دروت ہوگیا۔ اس کی دشا اس روگی کی سی تھی جو یہ جانتا ہو کہ موت اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ پھر بھی اس کی جیون لالسا دن دن بڑھتی جاتی ہو۔ پربھا ان ساری باتوں پر بھی اپنے پتی پر پریم کرتی تھی۔ اور استری سولبھ سوبھاؤ کے انوسار کوئی بہانا کھوجتی تھی کہ اس کے اپرادھوں کو بھول جائے اور اسے شما کردے۔

ایک دن پشوپتی بڑی رات گئے گھر آیا اور رات بھر نیند میں کرشنا، کرشنا، کہہ کر بّراتا رہا۔ پربھا نے اپنے پریتم کا یہ اَرتِ ناد سنا اور ساری رات چپکے چپکے رویا کی رویا کی...... بس رویا کی......

پراتہ کال وہ پشوپتی کے لیے دودھ کا پیالہ لیے کھڑی تھی کہ وہ اس کے پیروں پر گر پڑا اور بولا۔ پربھا میری تم سے ایک و نے ۔ہے تمھیں میری رکشا کر سکتی ہو۔ نہیں میں مر جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سن کر تمھیں بہت کشٹ ہوگا۔ لیکن مجھ پر دیا کرو۔ میں تمھاری اس کرپا کو کبھی نہ بھولوں گا۔ مجھ پر دیا کرو۔

پربھا کانپنے لگی۔ پشوپتی کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہ اس کا دل صاف بتا رہا تھا۔ پھر بھی وہ بھئے بھیت ہوکر پیچھے ہٹ گئی اور دودھ کا پیالہ میز پر رکھ کر اپنے پیلے مکھ کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھپا لیا۔ پشوپتی نے پھر بھی سب کچھ کہہ ہی ڈالا۔ لالسا اگنی اب اندر نہ رہ سکتی تھی۔ اس کی جوالا باہر نکل ہی پڑی۔ تاتپریہ یہ تھا کہ پشوپتی نے کرشنا کے ساتھ ویواہ کرنے کا نشچیہ کر لیا تھا۔ وہ اسے دوسرے گھر میں رکھے گا اور پربھا کے یہاں دو رات اور ایک رات اس کے یہاں رہے گا۔

یہ باتیں سن کر پربھا روئی نہیں۔ ورن استمبھِت ہوکر کھڑی رہ گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے گلے میں کوئی چیز اٹکی ہوئی ہے اور وہ سانس نہیں لے سکتی۔

پشوپتی نے پھر کہا۔ پربھا تم نہیں جانتی کہ جتنا پریم تم سے مجھے آج ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ میں تم سے الگ نہیں ہو سکتا میں جیون پرینت تمھیں اسی بھانتی پیار کرتا رہوں گا۔ پر کرشنا مجھے مار ڈالے گی۔ کیول تمھیں میری رکشا کر سکتی ہو۔ مجھے اس کے ہاتھ مت چھوڑو، پریے!

ابھاگنی پربھا! تجھ سے پوچھ تاچھ کر تیری گردن پر چھری چلائی جارہی ہے۔ تو

گردن جھکا دے گی یا آتم گورو سے سر اٹھا کر کہے گی۔ میں یہ نیچ پرستاؤ نہیں سن سکتی!

پربھا نے ان دو باتوں میں ایک بھی نہ کی۔ وہ اچیت ہو کر بھومی پر گر پڑی۔ جب ہوش آیا۔ کہنے لگی۔ بہت اچھا، جیسی تمھاری اِچھا۔ لیکن مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنی ماں کے گھر جاؤں گی۔ میری شانتا مجھے دے دو۔

یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی وہاں سے شانتا کو لینے چلی گئی اور اسے گود میں لے کر کمرے سے باہر نکلی۔ پشوپتی لجا اور گلانی سے سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے آتا رہا اور کہتا رہا۔ جیسی تمھاری اِچھا ہو پربھا وہ کرو۔ اور میں کیا کہو۔ کنتو میری پیاری پربھا، وعدہ کرو کہ تم مجھے شما کر دو گی۔ کنتو پربھا نے اس کو کچھ جواب نہ دیا اور برابر دوار کی اُور چلتی رہی۔ تب پشوپتی نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا اور اس کے مرجھائے ہوئے پر اَشرو سنچت کپولوں کو چوم چوم کر کہنے لگا۔ پریے مجھے بھول نہ جانا۔ تمھاری یاد میرے ہردے میں سدیو بنی رہے گی۔ اپنی انگوٹھی مجھے دیتی جاؤ۔ میں اسے تمھاری نشانی سمجھ کر رکھوں گا اور اسے ہردے سے لگا کر اس داہ کو شیتل کروں گا۔ ایشور کے لیے پربھا مجھے چھوڑنا مت۔ مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ ایک سپتاہ کے لیے اپنی ماتا کے پاس جا کر رہو۔ پھر میں تمھیں جا کر لاؤں گا۔

پربھا نے پشوپتی کے کرپاش سے اپنے کو چھڑا لیا اور اپنی لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے گاڑی کی اور چلی۔ اس نے پشوپتی کو نہ کوئی اتر دیا اور نہ یہ سنا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

(6)

اماں، آپ کیوں ہنس رہی ہیں؟

کچھ تو نہیں بیٹی۔

وہ پیلے پیلے پرانے کاغذ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟

یہ اس رِن کے پرزے ہیں جو واپس نہیں ملا۔

یہ تو پرانے خط معلوم ہوتے ہیں؟

نہیں بیٹی۔

بات یہ تھی کہ پربھا اپنی چودہ ورش کی پوتی پتری کے سامنے ستیہ کا پردہ نہیں

کھولنا چاہتی تھی۔ ہاں وے کاغذ واستو میں ایک ایسے قرض کے پرزے تھے جو واپس نہیں ملا۔ یہ وہی پرانے پتر تھے جو آج ایک کتاب میں رکھے ہوئے ملے تھے اور ایسے پھول کی پنکھڑیوں کی بھانتی دکھائی دیتے تھے جن کا رنگ اور گندھ کتاب میں رکھے رکھے اڑ گئی ہو تتھاپی وے سکھ کے دنوں کی یاد دلا رہے تھے اور اس کارن پربھا کی درشٹ میں وے بہو مولیہ تھے۔

شانتا سمجھ گئی کہ اماں کوئی ایسا کام کر رہی ہیں جس کی خبر مجھے نہیں کرنا چاہتی اور اس بات سے پرسنّ ہو کر کہ میری دکھی ماتا آج اپنا شوک بھول گئی ہیں اور جتنی دیر وہ اس آنند میں مگن رہے اتنا ہی اچھا ہے۔ ایک بہانے سے باہر چلی گئی۔ پربھا جب کمرے میں اکیلی رہ گئی تب اس نے ان پتروں کو پھر پڑھنا شروع کیا۔

آہ۔ ان چودہ ورشوں میں کیا کچھ نہیں ہو گیا۔ اس سمے اس ورہنی کے ہردے میں کتنی ہی پورو سمرتیاں جاگرت ہو گئیں۔ جنھوں نے ہرش اور شوک کے سروت ایک ساتھ ہی کھول دیے۔

پربھا کے چلے جانے کے بعد پشوپتی نے بہت چاہا کہ کرشنا سے اس کا وواہ ہو جائے پر وہ راضی نہ ہوئی۔ اسی نیراشیہ اور کرودھ کی دشا میں پشوپتی ایک کمپنی کا ایجنٹ ہو کر یورپ چلا گیا۔ تب پھر اسے پربھا کی یاد آئی، کچھ دنوں تک اس کے پاس سے شما پراتھنا پورن پتر آتے رہے۔ جن میں وہ بہت جلدی گھر آکر پربھا سے ملنے کا وعدہ کرتا رہا اور پریم کے اس نئے پرواہ میں پرانی کٹوتاؤں کو جل مگن کر دینے کے آشا سے سوپن دیکھتا رہا۔ پتی پرائنا پربھا کے سنتپت ہردے میں پھر آشا کی ہریالی لہرانے لگی۔ مرجھائی ہوئی آشا لتائیں پھر پلوت ہونے لگی۔ کنتو یہ بھی بھاگیہ کی ایک کیریڑا ہی تھی۔ تھوڑی ہی دنوں میں راسک پشوپتی ایک نئے پریم جال میں پھنس گیا اور تب سے اس کے پتر آنے بند ہو گئے اس وقت پربھا کے ہاتھ میں وہی پتر تھے جو اس کے پتی نے یوورپ سے اس سمے بھیجے تھے جب نیراشیہ کا گھاؤ ہرا تھا۔ کتنی چکنی چپڑی باتیں تھی۔ کیسے کیسے دل خوش کرنے والے وعدے تھے۔ اس کے بعد ہی معلوم ہوا کہ پشوپتی نے ایک انگریز لڑکی سے وواہ کر لیا۔ پربھا پر وجر سا گر پڑا۔ اس کے ہردے کے ٹکرے ہو گئے۔ ساری آشاؤں پر پانی پھر گیا۔ اس کا نربل شریر اس آگھات کو سہن

نہ کر سکا۔ اسے جور آنے لگا اور کسی کو اس کے جیون کی آشا نہ رہی۔ وہ سویم مرتیو کی ابھلاشنی تھی اور معلوم بھی ہوتا تھا کہ موت کسی سرپ کی بھانتی اس کی دیہہ سے لپٹ گئی ہے۔ لیکن بلانے سے موت بھی نہیں آتی۔ جور شانت ہو گیا اور پربھا پھر وہی آشاوہین جیون ویتیت کرنے لگی۔

(7)

ایک دن پربھا نے سنا کہ پشوپتی یوروپ سے لوٹ آیا ہے اور وہ یوروپی استری اس کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لوٹنے کے کارن وہی استری ہوئی ہے۔ وہ عورت بارہ سال تک اس کی سہوگنی رہی پر ایک دن ایک انگریز یوک کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس بھیشن اور اتینت کٹھور آگھات نے پشوپتی کی کمر توڑ دی۔ وہ نوکری چھوڑ کر گھر چلا آیا۔ اب اس کی صورت اتنی بدل گئی کہ اس کے متر لوگ اس سے بازار میں ملتے تو اسے پہچان نہ سکتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بوڑھا کمر جھکائے چلا جاتا ہے۔ اس کے بال تک سفید ہو گئے۔

گھر آکر پشوپتی نے ایک دن شانتا کو بلا بھیجا۔ اس طرح شانتا اس کے گھر آنے جانے لگی۔ وہ اپنے پتا کے وشا دیکھ کر من ہی من کڑھتی تھی۔

اس بیچ میں شانتا کے وواہ کے سندیش آنے لگے۔ لیکن پربھا کو اپنے وواہک جیون میں جو انوبھو ہوا تھا وہ اسے اس سندیشوں کو لوٹانے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ سوچتی کہیں اس لڑکی کی- بھی وہی گتی نہ ہو جو میری ہوئی ہے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یدی شانتا کا وواہ ہو گیا تو اسے انتم اوستھا میں بھی مجھے چین نہ ملے گا اور مرنے کے بعد بھی میں پتری کا شوک لے کر جاؤں گی۔ لیکن انت میں ایک ایسے اچھے گھرانے سے سندیش آیا کہ پربھا اسے 'ناہیں' نہ کر سکی۔ گھر بہت ہی سمپن تھا۔ ور بھی بہت ہی سویوگیہ۔ پربھا کو سویکار ہی کرنا پڑا۔ لیکن پتا کی انومتی بھی آوشیک تھی۔ پربھا نے اس وشے میں پشوپتی کو ایک پتر لکھا اور شانتا کے ہی ہاتھ سے بھیج دیا۔

جب شانتا پتر لے کر چلی گئی تب پربھا بھوجن بنانے چلی گئی۔ بھانتی بھانتی کے امن گل کلپنائیں اس کے من میں آنے لگی اور چولہے سے نکلتے ہوئے دھوئیں میں اسے ایک چتر سا دیکھائی دیا کہ شانتا کے پتلے پتلے ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں اور وہ کانپ

رہی ہے اور جس طرح پربھا پتی گرہ سے آکر ماتا کی گود میں گرگئی تھی اسی طرح شانتا بھی آکر ماتا کی گود میں گر پڑی ہے۔

(8)

پشوپتی نے پربھا کا پتر پڑھا تو اسے چپ سی لگ گئی اس نے اپنا سگریٹ جلایا اور زور زور سے کھینچنے لگا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبھی مونچھوں کو دانتوں سے کاٹتا کبھی کچھڑی داڑھی کو نیچے کی اور کھینچتا۔ سہسا وہ شانتا کے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور کانپتے ہوئے سور میں بولا۔ بٹی جس گھر کو تیری ماں سویکار کرتی ہے اسے میں کیسے نا ہیں کرسکتا ہوں۔ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر حامی بھری ہوگی۔ ایشور کرے تم صدا سوبھاگیہ وتی رہو۔ مجھے دکھ ہے تو اتنا ہی کہ جب تو اپنے گھر چلی جائے گی تب تیری ماتا اکیلی رہ جائے گی۔ کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہ رہے گا۔ کوئی ایسا اوپائے سوچ کہ تیری ماتا کا کلیش دور ہو اور میں بھی اس طرح مارا مارا نہ پھروں۔ ایسا اُپائے تو ہی نکال سکتی ہے۔ سمجھو ہے لجا اور سنکوچ کے کارن میں اپنے ہردے کی بات تجھ سے کبھی نہ کہہ سکتا لیکن اب تو جارہی ہے اور مجھے سنکوچ کے تیاگ کرنے کے سوا اور کوئی اوپائے نہیں ہے۔ تیری ماں تجھے پیار کرتی ہے اور تیرا انورودھ کبھی نہ ٹالے گی۔ میری دشا جو تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے یہ ان سے کہہ دینا۔ جا تیرا سوبھاگیہ امر ہو۔

شانتا روتی ہوئی پتا کے چھاتی سے لپٹ گئی اور یہ سمے سے پہلے بوڑھا ہو جانے والا منشیہ اپنی دور اسناؤں کا دنڈ بھوگنے کے بعد پشچاتاب اور گلانی کے آنسو بہا بہا کر شانتا کی کیش راشی کو بھگونے لگا۔

پتی پرانا پربھا کیا شانتا کا انورودھ ٹال سکتی تھی؟ اس پریم سوتر نے دونوں بھگن ہردیوں کو سدیو کے لیے ملا دیا۔

(یہ افسانہ ماہنامہ سرسوتی الہ آباد میں جنوری 1926 میں شائع ہوا گپت دھن 2 میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔)

تالیف

پنڈت لیلا دھر چوبے کی زبان میں جادو تھا۔ جس وقت وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگتے سامعین پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، ان کی تقریروں میں خیالات بہت کم ہوتے تھے۔ الفاظ بھی بہت موزوں نہ ہوتے۔ لیکن ان کا اندازِ بیان اتنا موثر اور دلکش تھا کہ ایک ہی تقریر کو بار بار دہرانے پر بھی اس کا اثر کم نہ ہوتا۔ بلکہ ہر بار قند مکرر اور سہ مکرر کا مزہ آتا۔ ہمیں تو یقین نہیں آتا۔ پر سننے والے کہتے ہیں کہ انھیں صرف ایک تقریر یاد ہے اور اسی کو وہ لفظ بہ لفظ ہر بار نئے انداز سے ادا کرتے ہیں۔ ان کی تقریروں کی خاص صفت تھی تفاخر قومی۔ وہ حال میں نہیں ماضی میں پرواز کرتے تھے۔ فوراً پرانے زمانے کے ہندو عروج کا نقشہ کھینچ کر لوگوں کو گرویدہ کر لیتے۔ سجنو! یونان کا مورخ کہتا ہے کہ چندر گپت کے زمانے میں، ہندوستان میں گھروں میں قفل نہیں لگائے جاتے تھے۔ چوری کی وارداتیں معدوم تھیں اور زنا کاری عنقا۔ حضرات ان سے کوئی آدمی جوان نہ مرتا تھا (چیرز) ہاں ان کا کبھی کوئی آدمی جوان نہ مرتا تھا۔ باپ کے سامنے بیٹے کا مرنا بعید از قیاس بات تھی۔ غرض موجودہ زمانہ کی نکبت اور ز۔۔ قدیم کی ثروت اور شوکت کا راگ الاپ کر وہ لوگوں کو متوالا بنا دیتے۔ اسی تاثیر زبان کی بدولت ان کا اکابرِ قوم میں شمار تھا، خصوصاً ہندو سبھا کے تو وہ نا خدا ہی سمجھے جاتے تھے۔ ہندو سبھائی خادموں میں ایسا جاں نثار دوسرا نہ تھا یوں کہیے کہ سبھا کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ دولت تو ان کے پاس نہ تھی۔ کم سے کم لوگوں کا خیال ایسا ہی تھا لیکن درد اور جوش اور ہمت سے انھوں نے حصہ وافر پایا تھا اور یہ سب قوم کے نذر تھا۔ شدھی کی تحریک کے تو وہ روحِ رواں تھے۔ ہندو قوم کی فنا اور بقاء کا مسئلہ اب ان کے خیال میں شدھی کی تحریک پر اٹکا ہوا تھا۔ شدھی کے سوا اب کوئی دوسری صورت ان کے زندہ رہنے کی نہ تھی۔ قوم کی ساری اخلاقی، جسمانی، ذہنی، تمدنی، مالی مصیبتوں کا دفعیہ اسی تحریک کی کامیابی میں تھا۔ اور وہ اس میں دل وجان سے کوشاں رہتے تھے۔ چندہ وصول کرنے میں چوبے جی کو ید طولیٰ تھا۔ ایشور نے وہ طاقت عطا کی تھی کہ پتھر سے تیل نکال

لیتے تھے۔ کنجوس کو تو وہ ایسا الٹے استرے سے مونڈتے تھے کہ انھیں زندگی بھر کے لیے سبق مل جاتا تھا۔ کان پکڑتے کہ اب کسی تحریک کے قریب نہ جائیں گے۔ چندہ کے معاملہ میں پنڈت جی لسانی، لفاظی، گندم نمائی، افترا، تملق، چشم نمائی، تخویف، تحریض ہر آلے سے کام لینا انسب سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا خیال تھا کہ قومی چندہ کے لیے ڈاکہ اور سرقہ تک جائز ہے۔

(2)

گرمی کا موسم تھا لیلا دھر جی کسی کوہستانی مقام میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ سیر کی سیر ہو جائے گی اور کچھ قومی چندہ بھی وصول ہو جائے گا۔ چندہ کی بدولت انھیں زادِ راہ سے گونہ بے فکری رہتی تھی۔ اگر ایک ہزار وصول کر کے چار پانچ سو روپے خرچ ہو جائیں تو ہندو سبھا کا کیا نقصان۔ اسے تو کچھ نہ کچھ مل ہی گئے۔ پنڈت جی نے اب تک موعیاں جانے کا ارادہ کیا تھا۔ جب سے شدھی کی تحریک جاری ہوئی تھی۔ ان کی مالی حالت بہت کچھ روبہ اصلاح ہوگئی تھی۔ لیکن خادم قوم کے لیے یہ موقع کہاں کہ وہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ سکے۔ خبر آئی کہ مدارس میں مسلمانوں نے طوفان مچا رکھا ہے۔ ہندوؤں کے خطے کے خطے مشرف بہ اسلام ہوتے جاتے ہیں۔ علماء نے بڑے جوش سے تبلیغ کا کام شروع کر دیا ہے۔ اگر جلد ہندو سبھا کی طرف سے انتظام نہ ہوا تو یہ لوگ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ پنڈت جی نے معاً پہاڑ کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دکن جانے کو تیار ہوگئے۔ ہندو سبھا کے سکریٹری نے جب بچشم تر ان سے گزارش کی کہ اس مہم کو آپ ہی سر کر سکتے ہیں۔ ایسا کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آتا جسے یہ کام سپرد کیا جا سکے۔ قوم کی حالت زار پر ترس کھائیے تو چوبے جی انکار نہ کر سکے۔ فوراً خدام کی ایک جمعیّت فراہم کی گئی اور قافلہ چوبے جی کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔ ہندو سبھا کی جانب سے اسے رخصتی دعوت دی گئی۔ ایک فیاض رئیس نے پنڈت جی کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی۔ اور ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں آدمی رخصت کرنے آئے۔ سفر میں کیا کیا واقعے پیش آئے، اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کئی جگہ تھیلیاں ملیں۔ رتلام کی ریاست نے ایک شامیانہ نذر کیا۔ بڑودہ ریاست نے خدام

کے لیے ایک موٹر پیش کیا۔ یہاں تک کہ مدراس پہنچتے پہنچتے خدام کے ہاتھ ایک معقول رقم کے علاوہ ضرورت کے کتنے ہی سامان آگئے۔ وہاں آبادی سے دور ایک کھلے ہوئے میدان میں ہندو سبھا کا شامیانہ نصب ہوگیا۔ قومی جھنڈا لہرانے لگا۔ خدام نے اپنی اپنی وردیاں نکالیں۔ مقامی باثر ہندوؤں نے ضیافت کے سامان مہیا کیے۔ راوئیاں کھڑی ہوگئیں، چاروں طرف ایسی چہل پہل نظر آنے لگی گویا کسی بڑے راجا کی فرودگاہ ہے۔

(3)

رات کے آٹھ بجے تھے۔ اچھوتوں کی ایک بستی کے قریب ہندو سبھا کے خدام کا خیمہ گیس کی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ جس میں زیادہ تر اچھوتوں کی تعداد تھی۔ ان کے لیے الگ ٹاٹ بچھا دیئے گئے تھے۔ اونچی ذات کے ہندو فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت لیلا دھر کی جادو اثر تقریر ہورہی تھی۔ ہم انھیں رشیوں کی اولاد ہیں جو آسمان کے نیچے آسمان بنا سکتے تھے۔ دفعتاً ایک بوڑھے اچھوت نے اٹھ کر پوچھا ہم لوگ بھی انھیں رشیوں کی اولاد ہیں۔

لیلادھر : بیشک تم بھی انھیں رشیوں کی سنتان ہو۔ تمھاری رگوں میں انھیں تپسّیوں کا خون دوڑ رہا ہے گو آج کا ظالم، بے درد، کم اندیش، تنگ دل، ہندو سماج تمھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے لیکن تم کسی ہندو سے نیچے نہیں ہو۔ چاہے وہ اپنے کو کتنا ہی اونچا کیوں نہ سمجھتا ہو۔

بوڑھا : تمھاری ہندو سبھا کیوں ہم لوگوں کی خبر نہیں لیتی۔

لیلادھر : ہندو سبھا کا جنم ابھی تھوڑے ہی دنوں سے ہوا ہے اور اس قلیل عرصہ میں اس نے جتنے کام کیے ہیں ان پر اسے جس قدر فخر ہو زیبا ہے۔ ہندو قوم ایک عرصہ دراز کے بعد بیدار ہوئی ہے۔ اور اب وہ زمانہ قریب ہے جب اس ملک میں کوئی ہندو کسی ہندو کو نیچ نہ سمجھ سکے گا۔ جب سب ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں گے، رام نے نشاد کو چھاتی سے لگایا تھا اور شبری کے جوٹھے پھل کھائے تھے۔

بوڑھا : جب آپ انھیں مہاتماؤں کی سنتان ہیں تو پھر اونچ نیچ میں کیوں اتنا بھید

مانتے ہیں۔

چوبے : اس لیے کہ ہم پتت ہیں، اگیان میں پڑ کر ان مہاتماؤں کو بھول گئے ہیں۔

بوڑھا : اب تو آپ کو ہوش آیا ہے ہمارے ساتھ بھوجن کیجیے۔

چوبے : میں کسی ہندو کے ہاتھ کا بھوجن کر سکتا ہوں۔

بوڑھا : میرے لڑکے سے اپنی کنیا کا بواہ کیجیے گا؟"

چوبے : تم میرے ساتھ مذاق کرتے ہو!جب تک تمھارے جنم کا سنسکار نہ بدل جائیں۔ جب تک تم میں وچار پرکاش نہ آ جائے۔ اس وقت تک بواہ کا سمبندھ نہیں ہو سکتا۔

بوڑھا : جب آپ خود پتت مانتے ہیں۔ خود اگیان میں پڑے ہوئے ہیں تو آپ کو ہمارے سنسکاروں کو برا کہنے کا کیا حق ہے؟ جایئے ابھی کچھ دنوں اپنی آتما کا سدھار کیجیے۔ آپ کا دل ابھی تک ابھیمان سے بھرا ہوا ہے، وہ ابھی بھید بھاؤ سے مکت نہیں ہوا۔ اب اس دیوتا کی شرن جارہے ہیں جس کے ماننے والے ہم سے گلے ملنے کو آج تیار ہیں۔ ہم کو ان سے ملنے کے لیے اپنے سنسکاروں کے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جیسے ہیں اچھے یا برے۔ ویسے ہی وہ ہم کو اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ آپ اگر اونچے ہیں تو اونچے بنے رہیے۔ ہم میں اڑنے کی طاقت نہیں۔ ہم ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہ رہیں۔ جن کے ساتھ ہمیں اڑنا نہ پڑے گا۔ آخر ہم میں کیا برائیاں ہیں جن کی وجہ سے آپ ہمیں نیچ سمجھتے ہیں۔ ہم شراب پیتے ہیں لیکن آپ شرابیوں کی جوتیاں چاٹتے ہیں۔ ہم مانس کھاتے ہیں۔ لیکن آپ گئو کا مانس کھانے والوں کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔ اسی لیے نہ کہ وہ آپ کو ٹھوکر جمائیں گے۔ ہم بھی آج راجا ہو جائیں۔ تو آپ ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔ وہی اونچا ہے جو بلوان ہے۔ وہی نیچا ہے جو نربل ہے۔ یہی آپ کا دھرم ہے۔

یہ کہہ کر بوڑھا وہاں سے چلا گیا اور اس کے ساتھ سارے آدمی اٹھ گئے۔ صرف چوبے جی اور ان کے چیلے پلیٹ فارم پر کھڑے رہ گئے۔ گویا نغمہ کے بعد اس کی صدائے بازگشت گونج رہی ہو۔

(4)

تبلیغی جماعت نے جب سے چوبے جی کے آنے کی خبر سنی تھی اس فکر میں تھی کہ کسی حکمت سے اسے یہاں سے دور کرنا چاہیے۔ چوبے جی کا نام دور دور تک مشہور تھا۔ ان کی سحر کار تقریر کا لوہا سب مانتے تھے۔ اگر ان کے قدم یہاں جم گئے تو پھر تبلیغ کو راہِ فرار کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے گا۔ پہلے سوچا کہ کوئی مذہبی مباحثہ چھیڑ دیا جائے۔ لیکن یہ خیال مانع ہوا کہ ان کندۂ ناتراشوں پر مباحثہ کا شاید کوئی اثر نہ ہو۔ آخر یہ رائے طے پائی کہ چوبے جی کی مرمت کی جائے، رات کو کچھ لوگ ہندو سبھا کے کیمپ میں جاکر چھپ جائیں۔ جوں ہی موقعہ دیکھیں کمین گاہوں سے نکل پڑیں اور اپنا کام کر کے رفو چکر ہو جائیں۔ مذہبی فدائیوں کی وہاں کیا کمی۔ کئی آدمی کمر کس کر تیار ہوگئے عیدو اور وفاتی دونوں بلا کے سرفروش تھے انھیں منہ مانگی مراد ملی۔

رات کے دو بجے تھے۔ ہندو کیمپ نیند میں مست تھا۔ لیلا دھر بھنگ کے نشے میں چور ہندو سبھا کے سکریٹری کو خط لکھ رہے تھے۔ حالت خراب ہے۔ حریفوں نے یہاں اپنا اڈا جما لیا ہے۔ یہاں جب تک باقاعدہ کیمپ نہ کھولا جائے گا، کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ فی الفور روپے ارسال فرمایئے۔ اس موقع پر اگر سبھا نے بخل کیا تو ہمیشہ کے لیے اسے کف افسوس ملنا پڑے گا۔ میری طرف سے اخباروں میں ایک اپیل علاحدہ نکال دیجیے۔ یہاں کامیابی کا راز روپیہ ہے۔ چاروں طرف سے صدا آرہی ہے، روپیہ !روپیہ!عیسائیوں نے روپے سے اپنی دھاک بٹھائی۔ تبلیغ روپے سے عمل تسخیر کر رہا ہے اور ہم تقدیر کا دامن پکڑے بیٹھے ہیں۔ کوری تقریر سے کچھ نہ ہوگا۔ آخر میں کوئی دیوتا تو نہیں، جو محض تقریر کے جادو سے کایا پلٹ کردوں گا۔ اگر وہ لوگ ایک خرچ کریں تو ہمیں دو خرچ کرنے کو تیار رہنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے ہی جسم کے اعضاء پر نشتر چلایا جا رہا ہے آہ ! ہندو جاتی! تیرے یہ بُرے دن آ گئے کہ دشمن چاروں طرف سے تجھ پر حربے چلا رہے ہیں اور تو جمود کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔

یکایک عیدو اور وفاتی چھرے لیے ہوئے خیمہ میں گھس پڑے، پنڈت جی انھیں دیکھتے ہی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خیمہ سے بھاگنے کی راہ دیکھنے لگے۔ جب مفر

نظر نہ آیا۔ تو ہمت یاس سے کام لے کر بولے تم لوگ کون ہو۔ کیا چاہتے ہو۔
عیدو: ہم لوگ حضرت میکائیل کے فرشتے ہیں۔ تمھاری روح قبض کرنے آئے ہیں۔
یہ کہہ کر دونوں نے چھرے مارنے شروع کیے۔ لیلا دھر کیم آدمی تھے مشکل سے جنبش کر سکتے تھے تین پاؤ امرتیوں کا ناشتہ کرتے۔ بھوجن کے وقت سوا پاؤ گھی دال میں کھاتے۔ تیسرے پہر بادام اور دودھ ملا کر شربت پیتے، جس میں بھنگ کی ہلکی سی چاشنی ہوتی تھی۔ رات کو بالائی، پوریاں، حلوہ وغیرہ مرغن اشیاء کثیر مقدار میں چٹ کر جاتے۔ ایسا آدمی اکھاڑے میں چاہے گھنٹوں پٹ پڑا رہے یہاں تک کہ حریف عاجز آ کر اسے چھوڑ دے لیکن چھرے کے سامنے چستی اور پھرتی کی ضرورت تھی، وہ یہاں مفقود تھی۔ قاتلوں نے تابڑ توڑ اتنی چھریاں ماریں کہ بے چارے چلا بھی نہ سکے۔ حالانکہ چلانا بھی اس وقت بے سود تھا آخر زخموں سے چور ہو کر وہ گر پڑے قاتلوں نے سمجھا کام تمام ہوگیا۔ نو دو گیارہ ہوگئے۔

(5)

صبح کو گردو نواح میں شور مچ گیا۔ ہزاروں آدمی واردات پر جمع ہوگئے۔ پنڈت جی کو زخم گہرے لگے تھے مگر ابھی جان باقی تھی۔ لوگوں نے قیاس دوڑانا شروع کیا یہ حرکت کس کی ہے۔ گھنٹوں رائے زنی ہوتی رہی، کوئی کہتا ڈاکوؤں کی حرکت ہے کوئی کسی رقیب کو مورد الزام ٹھہراتا۔ لیکن کسی کو نہ سوجھتی تھی کہ زخمی کی مرہم پٹی کی فکر کرے، سرکاری شفاخانہ وہاں سے بیس میل پر تھا۔ ادھر حالت اتنی نازک تھی کہ نہ جانے کون سی سانس دم واپسیں ہو۔ کیمپ کے آدمیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ نظریں بچا بچا کر لوگ یکے بعد دیگرے کھسکتے جاتے تھے۔ آج چوبے جی کی باری تھی۔ کل نہ جانے ہم میں سے کس کے سر آفت آئے۔ کوئی یہاں جان دینے تو آئے نہیں قوم کی خدمت کرنے آئے ہیں۔ اگر خدمت کے معنی جانبازی ہے تو ہم اس خدمت سے درگزرے۔ اگر جان ہی دینی ہے تو فوج میں نہ چلے جائیں گے جہاں ایک دن صوبیدار میجر ہو سکتے ہیں یہاں کیوں پڑے رہیں گے۔ کون کہے کہ ہندو سبھا ہمارے بال بچوں کے لیے وظیفہ مقرر کردے گی۔

شام ہوتے ہوتے کیمپ میں سناٹا چھا گیا۔ کیمپ کا ایک آدمی بھی باقی نہ رہا

تماشائیوں کا ہجوم بھی کم ہوا۔ پنڈت جی ۔بے چارے خاک و خون میں لپٹے بیہوش نیم جان، مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے ہوش نہ تھا۔ پر درد کا حس باقی تھا۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے بیہڑ میدان۔ جنگلی جانور سرِشام سے شکار کی تلاش میں نکل پڑتے تھے۔ رات کیسے گزرے گی؟

اچھوتوں کا بوڑھا مکھیا آج کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ نو بجے رات کو گھر آیا تو خبر سُنی گھر والوں سے بولا۔ تم نے پنڈت جی کی مرہم پٹی کی فکر بھی نہیں کی۔ ان کا یہاں کوئی دوسرا بیٹھا ہوا ہے؟ ان کے ساتھ کے آدمی پردیسی ٹھہرے۔ گھبراگئے ہوں گے شاید بھاگ بھی گئے ہوں۔ یہ تو تمھارا دھرم تھا زخمی کو گھر لاتے اس کی دوا دارو کرتے ہمارے ہی اپکار کے لیے تو وہ یہاں آئے تھے۔ اگر ہماری فکر نہ ہوتی تو وہ یہ زحمت کیوں اٹھاتے اور زخمی کیوں ہوتے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ تو ہمارے لیے سینکڑوں کوس سے آئیں اور ایسے ایسے ظلم اٹھائیں اور ہم ان کی خبر تک نہ لیں۔ پر ماتما کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اتنا بڑا گاؤں ہے۔ کسی میں بھی اتنی دیا نہ آئی۔ اگر کوئی جانور اٹھا لے گیا ہو تو سو کس پر مصیبت پڑے گی۔ پرماتما کے یہاں کون پکڑا جائے گا؟کس کے منہ میں کالک لگے گی۔

یہ کہتا ہوا وہ الٹے قدم لوٹا۔ اور ہندو سبھا کیمپ کی طرف چلا، سارا گاؤں اس کی رضا کا غلام تھا۔ چودھری کا حکم سب کے لیے قانون تھا۔ اس کے جاتے ہی لوگ ڈولی لے کر کیمپ کی طرف چلے۔ چودھری نے پنڈت جی کو بڑی نرمی سے اٹھا کر ڈولی میں لٹایا اور ایک لمحہ میں ڈولی اس کے گھر پہنچ گئی۔ دور کے گاؤں میں ایک نائی رہتا تھا وہی وہاں کا سرجن تھا۔ وہیں تک لوگوں کی دوڑ تھی، اچھے ہوتے تو اس کے ہاتھوں۔ مرتے تو اس کے ہاتھوں۔ راتوں رات اس کے پاس قاصد دوڑایا گیا۔ اور وہ غریب آدھی رات کے قریب اس پہاڑی راستے اور اندھیری رات میں گرتا پڑتا چودھری کے گھر آ پہنچا۔ دیکھئے یہ جہلا کی تہذیب کا نمونہ! آپ کا سرجن رات کو باہر نہیں نکلتا۔ نکلتا ہے تو دُگنی تگنی فیس لے کر۔ اگر سواری نہ ہو تو قدم نہ اٹھائے۔ وہاں آدھی رات کو غریب خبر پاتے ہی دوڑا چلا آتا ہے کسی صلہ کی تمنا میں اگر کچھ مل جائے تو واہ واہ، ورنہ کسی سے شکایت نہیں۔ سانپ کا منتر جاننے والا۔ اگر حادثہ کی خبر پا کر دوڑ

نہ پڑے تو اسے پاپ لگتا ہے۔ ندی چڑھی ہو رات اندھیری ہو، کوئی پرواہ نہیں اس کا دھرم ہے کہ مار گزیدہ کے پاس آئے اور حتی الامکان اس کی خدمت کرے۔ نائی نے زخمی کو دیکھا اس کے زخموں کو دھویا مرہم دکھا پٹی باندھی اور وہیں لیٹ رہا۔ تین دن تک وہ پنڈت کے سرہانے سے نہ ٹلا، یہاں تک کہ پنڈت جی نے آنکھیں کھولیں۔

(6)

مہینے بھر تک پنڈت جی چارپائی پر پڑے رہے۔ زخم روز بروز بھرتے جاتے تھے۔ جسم میں قوت عود کرتی جاتی تھی۔ لیکن نائی کی سخت تاکید تھی کہ یہ اٹھنے نہ پائیں۔ سارا گھر ان کی تیمار داری میں مصروف تھا۔ گھر ہی نہیں، گاؤں بھر کے مرد عورتیں ان کی خدمت کرتے۔ خود چاہے فاقے کر جائیں لیکن پنڈت جی کے لیے مقوی غذا بہم پہنچاتے۔ ایک آدمی سارے کام چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھا پنکھا جھلتا رہتا۔ انھیں سہارے سے کروٹ بدلاتا، اٹھاتا، حوائج کے لیے چارپائی سے نیچے اتارنا ہوتا تھا اور ایک مستقل تیمار دار کے بغیر ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ وہ لوگ یہ ساری خدمت فرخندہ پیشانی سے کرتے۔ کسی کے دل میں یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ کہاں کی بلا گلے پڑی۔ چوبے جی زود رنج ہوگئے تھے۔ بیماری میں انسان کچھ چڑ چڑا ہو ہی جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر تنگ جاتے اور گھر والوں کو ڈانٹ بیٹھتے پر کوئی برا نہ مانتا، خاص کر اس لیے کہ ذرا سی دیر میں پنڈت جی بچشم پُر نم معذرت کرنے لگتے ان کا ضمیر کہتا تم ان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ یہ بے چارے مزدور ہیں انھیں اتنی فرصت کہاں کہ کسی کی تیمارداری کریں۔ تمھارے ساتھ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ کیا کم ہے کہ تم اس سے زیادہ کی امید رکھتے ہو۔ دہقانوں کے اس ایثار کے مقابلہ میں پنڈت جی کو اپنی دنیا پرستی پر شرم آتی ہے وہ سوچتے اگر میرے کوئی باہر کا آدمی یوں آکر پڑ جاتا تو میں اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ شاید قریب کھڑا بھی نہ ہوتا۔ وہ بے چارہ کراہ کراہ کر مر جاتا۔ میری تیمارداری معالجہ اور خوراک میں ان غریبوں کے سینکڑوں روپے صرف ہوگئے۔ یہ کتنے بے غرض، کتنے فراخ دل، کتنے پاک نفس لوگ ہیں اور میں انھیں شدھ کرنے چلا تھا انھیں انسانیت کا سبق دینے چلا تھا۔ میں انھیں جاہل غیر مہذب نیچ سمجھتا تھا۔ ہم عالموں سے جاہل ہی اچھے۔ ہم

تہذیب یافتوں سے یہ غیر مہذب لوگ ہزار درجہ بہتر۔ ہم اونچوں سے یہ نیچے بدرجہا قابل عزت۔ اگر تہذیب، علم اور شرافت کے معنی دنیا پروری، تنگ دلی اور غرور ہے تو اس علم اور اس تہذیب کو سلام۔

ان خیالات نے پنڈت جی کے باطن پر عمل کرنا شروع کیا ان کی خود شدھی ہونے لگی، منتروں سے نہیں، اگنی کنڈے کے سامنے نہیں، گوبر کھلا کر نہیں بلکہ وہ سچی شدھی وہ معنوی تالیف جو حق و باطل کی تالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کے غرور نے انکسار کے سامنے سر جھکا دیا۔ خود غرضی نے ایثار کے سامنے بوسہ دیا۔ انھیں معلوم ہوا یہ دیوتا لوگ ہیں اور مجھے پرماتما نے اصلاحِ باطن کے لیے ان کے بیچ میں ڈال رکھا ہے۔

رفتہ رفتہ پنڈت جی میں چلنے پھرنے کی طاقت آگئی اور وہ ان احسانات عظیم کے اظہار شکریہ کا موقعہ ڈھونڈنے لگے۔ ایشور کی کچھ مرضی! اسی زمانہ میں اس علاقے میں پلیگ کا دورہ ہوا۔ اچھوتوں میں یہ وہم پھیلا ہوا تھا کہ یہ کوئی شیطانی بلا ہے اور جو آدمی کسی طاعون زدہ کی امداد کرے گا۔ وہ اور اُس کا خاندان اس شیطان کے قہر کا شکار ہوگا۔ توہمات کے زیر اثر انسان سے حیوانی حرکات سرزد ہوا کرتی ہیں یہاں تک کہ آدمیوں کا بلدان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ طاعون کا دورہ ہوتے ہی کئی آدمی بیمار ہوگئے اور سارے گاؤں کے لوگ انھیں ان کی قسمت پر چھوڑ کر گاؤں کے باہر نکل گئے۔ کوئی ان غریبوں کے نزدیک نہ جاتا۔ ان کی تیمار داری تو در کنار شیطان کے پنجہ میں پھنسا ہوا انسان شیطان سے کم خوف انگیز نہ تھا۔ بوڑھے چودھری بھی شیطان کی زد میں آگئے۔

صبح کا وقت تھا گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دو تین گھروں کے دروازے کھلے تھے۔ مگر انسان کا وجود نہ تھا۔ چوبے جی گاؤں میں داخل ہوئے انھیں بھی گاؤں والے اپنے ساتھ زبردستی کھینچ لے گئے تھے۔ اس وقت بھی آدمی ان کے ساتھ گاؤں کے ڈانڈے تک منع کرتے ہوئے آئے۔ انھیں خوف تھا کہ گاؤں میں جاکر پنڈت جی سلامت نہ لوٹیں گے۔ لیکن پنڈت جی نے انھیں تشفی دی۔ اور انھیں رخصت کر کے گاؤں میں آئے۔ ان کا دل بھی ایک نا معلوم خوف سے دھڑک رہا تھا مگر انھوں

نے دل کو مضبوط کیا اور چودھری کے مکان میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو بوڑھا چودھری آنکھیں بند کیے توکل کی تصویر بنا ایک ٹوٹی کھاٹ پر پڑا ہوا ہے ان کی آہٹ پاتے ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ تھیں۔

چوبے جی نے پوچھا: چودھری کیسی طبیعت ہے۔

چودھری: اچھا ہوں۔ تم جاؤ۔ چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ۔ کیا گاؤں والوں نے تم کو نہیں بتلایا، کچھ نہیں بتلایا، کیسے بے سمجھ ہیں کیسے نردئی ہیں جاؤ مجھے مرنے دو۔

چوبے: گھبراؤ مت مجھے بہت سے منتر یاد ہیں۔ بھوت پریت میرا کچھ نہیں کر سکتے۔

چودھری: ارے بابا کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ یہاں سے جاؤ۔ نہیں، نہیں مجھے مت چھونا۔ مگر چوبے جی نے نہ مانا۔ چودھری کے پاس بیٹھ کر انھوں نے اس کے جسم پر ہاتھ رکھا تو سارا بدن توے کی طرح جل رہا تھا۔ بغل میں ایک گلٹی نکل آئی تھی مگر پلیگ خوفناک قسم کا نہ تھا۔ چوبے جی نے فوراً آگ جلائی اور گلٹی کو پتھر سے سینکنا شروع کیا۔ چودھری لیٹے لیٹے ان کی طرف مرعوب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ یہ کوئی دیوتا ہے۔ اب تک شیطان نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ چوبے جی نے آدھ گھنٹہ تک گلٹی کو سینکا اور تب دوسرے مریضوں کے یہاں پہنچے وہاں بھی یہی کیفیت تھی۔ ایک بالکل بے ہوش تھا مگر دو ہوش میں تھے۔ انھوں نے بھی چوبے جی کو بھگانا چاہا مگر چوبے جی نے ان کی تشفی کی یہاں تک کہ وہ بھی خاموش ہوگئے۔

اگر چہ سرکار شفاخانہ وہاں سے دس کوس پر تھا اور راستہ نہایت خراب، اس پر پنڈت جی ابھی تک کمزور تھے پر انھوں نے گلٹیوں کو کپڑے سے باندھ کر شفاخانے سے دوا لانے کی ٹھانی۔ سوچے اگر مر بھی گئے تو کیا غم، انھیں لوگوں نے تو مجھے دوبارہ زندگی عطا کی ورنہ اب تک جنگلی جانوروں کے پیٹ میں ہضم ہوگیا ہوتا۔ بھاگا بھاگ چلے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستہ میں کسی کا ٹٹو چرتا ہوا مل گیا راس پڑی ہوئی تھی۔ آپ جھٹ اس پر سوار ہوگئے۔ دل کو سمجھایا۔ ٹٹو میں کہیں لیے تو جاتا نہیں لوٹ کر یہیں چھوڑ دوں گا۔ مالک صاحب بہت گرم پڑیں گے تو ایک روپیہ ان کے حوالے کردوں گا۔ ٹٹو تھا سبک خرام۔ تیسرے پہر منزل مقصود پر جا پہنچا، چوبے جی

سرجن سے ملے۔ گاؤں کی ساری کیفیت بیان کی اور مرہم اور ادویات کا بکس لیے ہوئے پھر لوٹے، ٹٹو کو راستہ میں چھوڑ دیا۔ آٹھ بجتے بجتے گاؤں میں آپہنچے اور اسی وقت مریضوں کو دوا پلا دی۔ پہلے تو کوئی مریض دوا پینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں بھوت مہاشے بگڑ نہ جائیں کہ یہ میرے پنجے سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور غصہ میں آکر میرے بال بچوں کو ستائیں۔ لیکن پنڈت جی نے دلاسا دے دے کر دوائیں پلا دیں پھر مرہم بھی رکھ دیا۔

آج پنڈت جی میں اتنی قوت نہ جانے کہاں سے آگئی تھی۔ دن بھر دوڑے۔ بیس کوس کی منزل طے کی مگر نہ ماندگی اور تکان کا غلبہ تھا نہ نیند کا۔ ساری رات مریضوں کی خدمت میں مصروف رہے کبھی اس گھر میں جاتے کبھی اس گھر میں۔ باری باری تینوں مریضوں کی خدمت کرتے تھے۔

پانچ دن تک یہی کیفیت رہی۔ چوبے جی نے ملکوتی ایثار سے کام لیا۔ کھانے پینے کی چیزیں برتن وغیرہ تو گھروں میں موجود تھے پر وہ ایک بار بمشکل تمام کچھ بنا کر بھوک مٹا لیتے تھے باقی سارا دن اور ساری رات مریضوں کے علاج و معالجہ اور عیادت میں صرف کرتے مریضوں کو بچنا تھا بچ گئے۔ مگر اس کا جس پنڈت جی کو ہوا۔

(7)

اس جانبازانہ عیادت نے لوگوں کو چوبے جی کا معتقد بنا دیا۔ جنھیں لوگوں نے مایوس العلاج سمجھ لیا تھا۔ وہ چنگے ہوگئے جن کی ساری زندگی کی امیدیں منقطع ہوگئی تھیں وہ زندہ تھے۔ پنڈت نے انھیں شیطان کے پنجہ بے درد سے نجات دے دی تھی۔ یہ عام خیال تھا کہ پنڈت جی کی بھوتوں سے خونریز جنگ ہوئی اور پنڈت جی ان پر غالب آئے اگر وہ جان پر کھیل کر ان آدمیوں کی حمایت نہ کرتے تو ان کا بچنا محال تھا۔ یہ آدمی نہیں کوئی دیوتا ہیں ضرور دیوتا ہیں۔ دیوتاؤں کے سوا اور کون غریب ستم زدوں کی حمایت کرتا ہے کون بیکسوں کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے بھوتوں کی فوج آئی ہوگی ایک سے ایک مہیب اور کریہہ منظر دیو سامنے آئے ہوں گے۔ مگر اس شیر نے سھوں کو نیچا دکھایا۔

ایک آدمی بولا۔ کسی دیوتا کا اوتار ہے۔

بوڑھے چودھری نے کہا۔ دیوتا کا اوتار نہیں تمھارا سر، دھرماتما آدمی ہیں اور دھرماتما آدمی دیوتاؤں سے بڑھا ہوتا ہے۔ رات کی رات جاگتے رہتے تھے پلک تک نہیں جھپکتی تھی۔ کبھی میرے پاس بیٹھتے تھے۔ کبھی بھیکو کے پاس جاتے۔ کبھی چمرو کے گھر۔ نہ کھانے کی فکر رہتی تھی نہ پینے کی۔ دوا پلانا۔ دوڑ کر پانی دینا۔ میں تو ایمان کی کہتا ہوں۔ اپنا بیٹا بھی ہوتا اس طرح سے خدمت نہ کرتا۔

بھیکو : میں تو کبھی کبھی غصہ میں آکر گالیاں دینے لگتا تھا، لیکن کیا مجال کہ ذرا بھی من میلا ہو۔ ایسا دھیرج تو کسی میں دیکھا ہی نہیں۔ میری تو اگر وہ جان بھی مانگیں تودونوں ہاتھوں سے دے دوں۔

چودھری : میں نے تو طے کرلیا ہے کہ اب ان کا چیلا ہو جاؤں گا۔ پرانے زمانے میں ایسے ہی رشی مہاتما ہوتے ہوں گے ایسے مہاتماؤں کی شرن چھوڑ کر اور کہاں جاؤں۔ مولوی لوگ بھی باتیں بڑی اچھی اچھی کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے یہاں اونچ نیچ بھید نہیں لیکن ان لوگوں کے دل صاف نہیں ہیں۔ نہیں تو کیا ایسے مہاتما پر چھپ کر وار کرتے۔ ہم لوگ بھوتوں کے پنجے میں پھنس گئے تھے ان میں سے کوئی پاس نہ پھٹکا۔ جس دھرم میں سچے مہاتما نہیں وہ دھرم کبھی سچا نہیں ہو سکتا۔ تم لوگوں کی مرضی جیسی ہو وہ کرو۔ لیکن میں تو اپنا دھرم نہ چھوڑوں گا۔ پہلے میں سمجھتا تھا۔ ہمارا دھرم مردہ ہوگیا ہے جبھی تو یہ خرابیاں آ گئی ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ہمارا دھرم جیتا جاگتا ہے اس میں اب بھی دُکھیوں کا دکھ ہرنے والے رشی مہاتما پیدا ہو رہے ہیں۔

بھیکو : چودھری تم نے میرے من کی بات کہہ دی میں بھی سوچ رہاتھا ایسے مہاتما کو چھوڑ کر اب ہم اور کسی کی بھگتی نہ کریں گے۔

چمرو : اب مولوی لوگ آئیں گے تو دور ہی سے سلام کروں گا۔ ہم کسی سے نیچے نہیں ہیں۔ ایسے ایسے مہاتما جن کے لیے اپنی جان کی پرواہ نہ کریں وہ نیچے نہیں ہو سکتے۔ یوں ہی دیر تک لوگوں میں باتیں ہوتی رہیں اور دوسرے دن سارے گاؤں نے پنڈت جی کو اپنا گورو بنایا۔ اور سارے علاقے میں ان کی پاک نفسی کا شہرہ ہوگیا۔ جوق کے جوق ان کے درشنوں کو آنے لگے۔ ہندو

دھرم کے اکھڑے ہوئے قدم، یہ صدائے امید سنتے ہی سنبھل گئے اور بڑوبے جی کو تالیف کا ایک ایسا منتر ہاتھ آگیا جو کبھی چوک ہی نہ سکتا تھا جس سے چاروں پدارتھ، آٹھوں سدھیاں اور ساری ردھیاں مل جاتی ہیں۔

(یہ افسانہ پہلی بار"مادھوری" کے فروری 1926 کے شمارہ میں ""منتر" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ہندی میں 'مان سروور' 5 میں اور اردو میں 'خاک پروانہ' میں شامل ہے۔)

آدھار

سارے گاؤں میں متھرا کا سا گھٹیلا جوان نہ تھا۔ کوئی بیس برس کی عمر تھی۔ مَیس بھیگ رہی تھیں۔ گائیں چراتا، دودھ پیتا، کسرت کرتا، کشتی لڑتا تھا اور سارے دن بانسری بجاتا ہاٹ میں وِچرتا تھا۔ بیاہ ہوگیا تھا۔ پر ابھی کوئی بال بچہ نہ تھا۔ گھر میں کئی ہل کی کھیتی تھی۔ کئی چھوٹے بڑے بھائی تھے۔ وہ سب مل جل کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ متھرا پر سارے گھر کو گرو تھا اسے سب سے اچھا بھوجن ملتا اور سب سے کم کام کرنا پڑتا۔ جب اسے جانگھیے، لنگوٹے۔ نال یا مُگدر کے لیے روپے پیسے کی ضرورت پڑتی تو ترت دے دیے جاتے۔ سارے گھر کی یہی ابھی لاشا تھی کہ متھرا پہلوان ہوجائے اور اکھاڑے میں اپنے سوائے کو پچھاڑے۔ اس لاڈ پیار سے متھرا ذرا ٹرّا ہوگیا تھا۔ گائیں کسی کے کھیت میں پڑی ہیں اور آپ اکھاڑے میں دنڈ لگا رہا ہے۔ کوئی اُلاہنا دیتا تو اس کی تیوریاں بدل جاتیں۔ گرج کر کہتا جو من میں آئے کرلو۔ متھرا تو اکھاڑا چھوڑ کر ہانکنے نہ جائیں گے، پر اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر کسی کو اس سے الجھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ لوگ غم کھا جاتے تھے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ تال تلیا سوکھی پڑی تھیں۔ زوروں کی لو چلنے لگی تھی۔ گاؤں میں کہیں سے ایک سانڈ آنکلا اور گائیوں کے ساتھ ہو لیا۔ سارے دن تو گائیوں کے ساتھ رہتا۔ رات کو بستی میں گھس آتا اور کھونٹوں سے بندھے بیلوں کو سینگوں سے مارتا۔ کبھی کسی کی گیلی دیوار کو سینگوں سے کھود ڈالتا، کبھی گھر کا کوڑا سینگوں سے اڑاتا۔ کئی کسانوں نے ساگ بھاجی لگا رکھی تھی، سارے دن سینچتے سینچتے مرتے تھے۔ یہ سانڈ رات ان کو ہرے بھرے کھیتوں میں پہنچ جاتا اور کھیت کا کھیت تباہ کر دیتا۔ لوگ اسے ڈنڈو سے مارتے۔ گاؤں کے باہر بھگا آتے۔ لیکن ذرا دیر میں پھر گائیوں میں پہنچ جاتا۔ کسی کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ اس سنکٹ کو کیسے ٹالا جائے۔ متھرا کا گھر گاؤں کے بیچ میں تھا۔ اس لیے اس کے بیلوں کو سانڈ سے کوئی ہانی (نقصان) نہ پہنچتی تھی۔ گاؤں میں اُپدرو مچا ہوا تھا اور متھرا کو ذرا بھی چنتا نہ تھی۔

آخر جب دھریہ کا انتم بندھن ٹوٹ گیا تو ایک دن لوگوں نے جاکر متھرا کو گھیرا اور بولا۔ بھائی، کہو تو گاؤں میں رہیں۔ کہو تو نکل جائیں۔ جب کھیتی ہی نہ بچے گی تو رہ کر کیا کریں گے؟ تمھاری گائیوں کے پیچھے ہمارا ستیاناش ہوا جاتا ہے۔ اور تم رنگ میں مست ہو۔ اگر بھگوان نے تمھیں بل دیا ہے تو اس سے دوسرے کی رکشا کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ سب کو پیس کر پی جاؤ۔ سانڈ تمھاری گائیوں کے کارن آتا ہے اور اسے بھگانا تمھارا کام ہے۔ لیکن تم کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔ مانوں تم سے کچھ مطلب ہی نہیں۔

متھرا کو ان کی دشا پر دیا آئی۔ بلوان منشیہ پرا یہ دیالو ہوتا ہے۔ بولا۔ اچھا جاؤ۔ ہم آج سانڈ کو بھگا دیں گے۔

ایک آدمی نے کہا۔ دور تک بھگانا۔ نہیں تو پھر لوٹ آئے گا۔ متھرا نے لاٹھی کندھے پر رکھتے ہوئے اُتر دیا۔ اب لوٹ کر نہ آئے گا۔

(2)

چلچلاتی دوپہر تھی اور متھرا سانڈ کو بھگائے لیے جاتا تھا۔ دونوں پسینے میں تر تھے۔ سانڈ بار بار گاؤں کی اُور گھومنے کی چیشٹا کرتا۔ لیکن متھرا اس کا ارادہ تاڑ کر دور ہی سے اس کی راہ چھینک لیتا۔ سانڈ کرودھ سے ان مکت ہو کر کبھی کبھی پیچھے مڑ کر متھرا پر توڑ کرنا چاہتا لیکن اس سمے متھرا سامنا بچاکر بغل سے تابڑ توڑ اتنی لاٹھیاں جماتا کہ سانڈ کو پھر بھاگنا پڑتا۔ کبھی دونوں ارہر کے کھیتوں میں دوڑتے، کبھی جھاڑیوں میں۔ ارہر کی کھونٹیوں سے متھرا کے پاؤں لہو لہان ہو رہے تھے۔ جھاڑیوں میں دھوتی پھٹ گئی تھی۔ پر اسے اس سمے سانڈ کا پچھا کرنے کے سوا اور کوئی سدھ نہ تھی۔ گاؤں پر گاؤں آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔ متھرا نے نشچے کر لیا کہ اسے ندی پار بھگائے بنا دم نہ لوں گا۔ اس کا کنٹھ سوکھ گیا تھا اور آنکھیں لال ہوگئی تھیں۔ روم روم سے چنگاریاں سی نکل رہی تھی۔ دم اُکھڑ گیا تھا۔ لیکن وہ ایک شن (لمحہ) کے لیے بھی دم نہ لیتا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹوں کی دوڑ کے بعد جاکر ندی نظر آئی۔ یہیں ہار جیت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ یہیں دونوں کھلاڑیوں کو اپنے داؤ پیچ کے جوہر دکھانے تھے۔ سانڈ سوچتا تھا، اگر ندی میں اترا تو یہ مار ہی ڈالے گا۔ ایک بار جان لڑا کر لوٹنے کی کوشش کرنی

چاہیے۔ متھرا سوچتا تھا۔ اگر یہ لوٹ پڑا تو اتنی محنت ویرتھ ہوجائے گی اور گاؤں کے لوگ میری ہنسی اڑائیں گے۔ دونوں اپنے اپنے گھات میں تھے۔ سانڈ نے بہت چاہا کہ تیز دوڑ کر آگے نکل جاؤں اور وہاں سے پیچھے کو پھروں۔ پر متھرا نے اسے مڑنے کا موقع نہ دیا۔ اس کی جان اس وقت سوئی کی نوک پر تھی۔ ایک ہاتھ بھی چوکا اور پران گئے۔ ذرا پیر پھسلا اور پھر اٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ آخر منشیہ نے پشو پر وجے پائی اور سانڈ کو ندی میں گھسنے کے سوا اور کوئی اپائے نہ سوجھا۔ متھرا بھی اس کے پیچھے ندی میں بیٹھ گیا۔ اور اتنے ڈنڈے لگائے کہ اس کی لاٹھی ٹوٹ گئی۔

(3)

اب متھرا کو زوروں کی پیاس لگی۔ اس نے ندی میں منہ لگا دیا۔ اس طرح ہونک ہونک کر پینے لگامانو ساری ندی پی جائے گا۔ اسے اپنے جیون میں کبھی پانی اتنا اچھا نہ لگا تھا۔ اور نہ کبھی اس نے اتنا پانی پیا تھا۔ معلوم نہیں پانچ سیر پی گیا یا دس سیر، لیکن پانی گرم تھا۔ پیاس نہیں بجھی ذرا دیر میں پھر ندی میں منہ لگا دیا اور اتنا پانی پیا کہ پیٹ میں سانس لینے کی جگہ بھی نہ رہی۔ تب گیلی دھوتی کندھے پر ڈال کر گھر کی اور چلا۔

لیکن دس ہی پانچ پگ چلا ہوگا کہ پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اس نے سوچا۔ دوڑ کر پانی پینے سے ایسا درد اکثر ہوجاتا ہے۔ ذرا دیر میں دور ہوجائے گا۔ لیکن درد بڑھنے لگا۔ اور متھرا کا آگے جانا کٹھن ہوگیا۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا اور درد سے بے چین ہو کر زمین پر لوٹنے لگا۔ کبھی پیٹ کو دباتا، کبھی کھڑا ہو جاتا۔ کبھی بیٹھ جاتا۔ پر درد بڑھتا ہی جاتا تھا۔انت میں اس نے زور زور سے کراہنا اور رونا شروع کیا پروہاں کون بیٹھا تھا۔ جو اس کی خبر لیتا۔ دور تک کوئی گاؤں نہیں، نہ آدمی نہ آدم ذات، بچارہ دوپہری کے سناٹے میں تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ ہم کڑے سے کڑا گھاؤ سہہ سکتے ہیں لیکن ذرا سا بھی ویتی کرم نہیں سہہ سکتے۔ وہی دیو کا سا جوان جو کوسوں تک سانڈ کو بھگاتا چلا آیا تھا۔ تتووں کے ورودّھ کا ایک وار بھی نہ سہہ سکا۔ کون جانتا تھا کہ یہ دوڑ اس کے لیے موت کی دوڑ ہوگی۔ کوئی جانتا تھا کہ موت ہی سانڈ کا روپ دھر کر اسے یوں نچا رہی ہے۔ کون جانتا تھا کہ جل جس کے بنا اس کے پران

اونٹھوں پر آرہے تھے۔ اس کے لیے وِش کا کام کرے گا۔

سندھیا سے اس کے گھر والے اُسے ڈھونڈتے ہوئے آئے۔ دیکھا تو وہ امنت وشرام میں مگن تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ گاؤں والے اپنے کام دھندے میں لگے۔ گھر والوں نے رو دھو کر صبر کیا۔ پر ابھاگنی ودھوا کے آنسو کیسے پچھتے۔ وہ ہردم روتی رہتی۔ آنکھیں چاہے بند بھی ہو جاتیں، پر ہر دے ہمیہ روتا رہتا تھا۔ اس گھر میں اب کیسے نرواہ ہوگا؟ کس آدھار پر جیوں گی؟ اپنے لیے جینا یا تو مہاتماؤں کو آتا ہے یا لمپٹوں ہی کو۔ انوپا کو یہ کلا کیا معلوم؟ اس کے لیے تو جیون کا ایک آدھار چاہیے تھا۔ جسے وہ اپنا سروسو سمجھے، جس کے لیے وہ جئے جس پر وہ گھمنڈ کرے۔ گھر والوں کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہ کوئی دوسرا گھر کرلے۔ اس میں بدنامی تھی۔ اس کے سوا ایسی سوشیل گھر کے کاموں میں ایسی کوشل لین دین کے معاملے میں اتنی چتر اور رنگ روپ کی ایسی سراہنی استری کا کسی دوسرے کے گھر پڑجانا ہی انھیں آسہائے تھا۔ ادھر انوپا کے میکے والے ایک جگہ بات چیت پکی کر رہے تھے۔ جب سب باتیں طے ہوگیں تو ایک دن انوپا کا بھائی اسے بدا کرانے آپہنچا۔

اب تو گھر میں کھلبلی مچی۔ ادھر کہا گیا۔ ہم بدا نہ کریں گے۔ بھائی نے کہا ہم بنا بدا کرائے مانے گے نہیں۔ گاؤں کے آدمی جمع ہوگئے۔ پنچایت ہونے لگی۔ یہ نشچے ہوا کہ انوپا پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کا جی چاہے چلی جائے، جی چاہے رہے۔ یہاں والوں کو وشواس تھا کہ انوپا اتنی جلدی دوسرا گھر کرنے پر راضی نہ ہوگی۔ دو چار بار وہ ایسا کہہ بھی چکی تھی۔ لیکن اس وقت جو پوچھا گیا تو وہ جانے کو تیار تھی۔ آخر اس کی بدائی کا سامان ہونے لگا۔ ڈولی آگئی۔ گاؤں بھر کی استریاں اسے دیکھنے آئیں۔ انوپا اٹھ کر اپنی ساس کے پیروں پر گر پڑی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ اماں کہا سنا معاف کرنا۔ جی میں تو تھا کہ اسی گھر میں پڑی رہو پر بھگوان کو منظور نہیں ہے۔

یہ کہتے کہتے اس کی زبان بند ہوگئی۔

ساس کرونا سے دوہل ہو اٹھی۔ بولی۔ بیٹی جہاں جاؤ وہاں سکھی رہو۔ ہمارے بھاگیہ ہی پھوٹ گئے نہیں تو کیوں تمھیں اس گھر سے جانا پڑتا۔ بھگوان کا دیا سب کچھ

ہے۔ پر انھوں نے جو نہیں دیا اس میں اپنا کیا بس۔ آج تمھارا دیور سیانا ہوتا تو بگڑی بات بن جاتی۔ تمھارے من میں بیٹھے تو اسی کو اپنا سمجھو۔ پالو پوسو۔ بڑا ہو جائے گا تو سگائی کردوں گی۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے واسودیو سے پوچھا۔ کیوں رے۔ بھوجائی سے سگائی کرے گا؟

واسودیو کی عمر پانچ سال سے ادھک نہ تھی۔ اب کی اس کا بیاہ ہونے والا تھا۔ بات چیت ہو چکی تھی۔ بولا۔تب تو دوسرے کے گھر نہ جائے گی نہ؟

ماں : نہیں جب تیرے ساتھ بیاہ ہو جائے گا تو کیوں جائے گی؟

واسودیو : تب میں کروں گا۔

ماں : اچھا اس سے پوچھ، تجھ سے بیاہ کرے گی۔

واسودیو انوپا کی گود میں جا بیٹھا اور شرماتا ہوا بولا۔

ہم سے بیاہ کرے گی؟

یہ کہہ کر وہ ہنسے لگا۔ لیکن انوپا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ واسودیو کو چھاتی سے لگاتی ہوئی بولی۔ اماں دل سے کہتی ہو؟

ساس : بھگوان جانتے ہیں۔

انوپا : آج سے یہ میرے ہوگئے؟

ساس : ہاں سارا گاؤں دیکھ رہا ہے۔

انوپا : تو بھیا سے کہلا بھیجو، گھر جائیں، میں ان کے ساتھ نہ جاؤں گی۔

انوپا کو جیون کے لیے کسی آدھار کی ضرورت تھی۔ وہ آدھار مل گیا۔ سیوا منشیہ کی سوا بھاوک ورتی ہے سیوا ہی اس کے جیون کا آدھار ہے۔

انوپا نے واسودیو کو پالنا پوسنا شروع کیا۔ ابٹن اور تیل لگاتی۔ دودھ روٹی مل مل کر کھلاتی۔ آپ تالاب نہانے جاتی تو اسے بھی نہلاتی۔ کھیت میں جاتی تو اسے بھی ساتھ لے جاتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس سے اتنا ہل مل گیا کہ ایک شن (لمحہ) کے لیے بھی اسے نہ چھوڑتا۔ ماں کو بھول گیا۔ کچھ کھانے کو جی چاہتا تو انوپا سے مانگتا۔ کھیت میں مار کھاتا تو روتا ہوا انوپا کے پاس آتا۔ انوپا ہی اسے سلاتی۔ انوپا ہی جگاتی۔ بیمار ہو تو انوپا ہی گود میں لے کر بدلو وید کے گھر جاتی۔ وہی دوائیں پلاتی۔

گاؤں کے استری پروش اس کی یہ پریم تپسیا دیکھتے اور دانتوں انگلی دباتے۔ پہلے پہلے ہی کسی کو اس پر وشواس تھا۔ لوگ سمجھتے تھے، سال دو سال میں اس کا جی اوب جائے گا اور کسی طرف کا راستہ لے گی اس دودھ منھے بالک کے نام پر کب تک بیٹھی رہے گی۔ لیکن یہ ساری آشنکائیں نرمول نکلیں۔ انوپا کو کسی نے اپنے ورت سے وچلت ہوتے نہ دیکھا۔ جس ہردے میں سیوا کا سَروت بہہ رہا ہو۔ سوادھین سیوا کا۔ اس میں واسناؤں کے لیے کہاں استھان۔ واسنا کا وار نرمم، آشاہین، آدھار ہین پرانیوں پر ہوتا ہے۔ چور کی اندھیرے ہی میں چلتی ہے۔ اُجالے میں نہیں۔ واسودیو کو بھی کسرت کا شوق تھا۔ اس کی شکل صورت متھرا سے ملتی جلتی تھی۔ ڈیل ڈول بھی ویسا ہی تھا۔ اس نے پھر اکھاڑا جگایا اور اس کی بانسری کی تانے پھر کھیتوں میں گونجنے لگی۔

اس بھانتی 13 برس گذر گئے۔ واسُو دیو اور انوپا میں سگائی کی تیاری ہونے لگی۔

(5)

لیکن اب انوپا وہ انوپا نہ تھی، جس نے 14 ورشِ پہلے واسو دیو کو پتی بھاؤ سے دیکھا تھا، اب اس بھاؤ کا استھان ماتر بھاؤ نے لے لیا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ ایک گہرے سوچ میں ڈوبی رہتی تھی۔ سگائی کے دن جیو جیو نکٹ آتے تھے۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ اپنے جیون میں اتنے بڑے پریورتن کی کلپنا ہی سے اس کا کلیجہ دہل اٹھتا تھا۔ جسے بالک کی بھانتی پالا پوسا،اسے پتی بناتے ہوئے لجا سے اس کا مکھ لال ہوجا تا تھا۔ دوار پر نگاڑا بج رہا تھا۔

برادری کے لوگ جمع تھے۔ گھر میں گانا ہو رہا تھا۔ آج سگائی کی تیتھی تھی۔

سہسا انوپا نے جا کر ساس سے کہا۔ اماں میں تو لاج کے مارے مری جاتی ہوں۔

ساس نے بھونچکی ہو کر پوچھا۔ کیوں بٹی کیا ہے؟

انوپا : میں سگائی نہ کروں گی۔

ساس : کیسی بات کرتی ہے بٹی؟ ساری تیاری ہو گئی۔ لوگ سنے گے تو کیا کہیں گے؟

انوپا : جو چاہے کہیں جن کے نام پر 14 برس بیٹھی رہی اسی کے نام پر اب بھی بیٹھی رہوگی۔ میں نے سمجھا تھا مرد کے بنا عورت سے رہا نہ جاتا ہوگا میری تو بھگوان نے عزت آبرو سے نباہ دی۔ جب نئی عمر کے دن کٹ گئے تو اب

کون چنتا ہے۔ واسودیو کی سگائی کوئی لڑکی کھوج کر کر دو۔ جیسے اب تک اسے پالا۔ اسی طرح اب اس کے بال بچوں کو پالوں گی۔

(یہ افسانہ ہندی مجموعہ پریم پرمود 1926 میں پہلی بار شائع ہوا اردو کے کسی رسالے یا مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

قزاقی

میری بچپن کی یاد داشتوں میں قزاقی ایک نہ فراموش ہونے ولا شخص ہے، آج چالیس برس گزر گئے مگر قزاقی کا تصور ابھی تک آنکھوں میں ہے۔ میں ان دنوں اپنے والد کے ساتھ ضلع اعظم گڈھ کی ایک تحصیل میں تھا۔ قزاقی ذات کا پاسی تھا۔ بڑا ہی ہنس مکھ، بڑا ہمت ور، بڑا ہی زندہ دل۔ وہ روزانہ ڈاک کا تھیلا لے کر آتا، رات بھر رہتا اور سویرے ڈاک لے کر چلا جاتا، شام کو پھر ادھر سے ڈاک لے کر آ جاتا، میں تمام دن بے صبری سے اس کا منتظر رہتا، جوں ہی چار بجتے، میں بے چین ہو کر سڑک پر جاکر کھڑا ہو جاتا اور تھوڑی دیر میں قزاقی کندھے پر بلم رکھے اس کے گھونگھرو بجاتا دور سے دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیتا، وہ سانولے رنگ کا مضبوط اور لمبے قد کا جوان تھا۔ اس کا جسم سانچے میں ایسا ڈھلا ہوا کہ چابک دست مصور بھی اس میں کوئی عیب نہ نکال سکتا تھا اُس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اس کے سڈول چہرے پر بہت ہی بھلی لگتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اورتیز دوڑنے لگتا، اس کے بلم کے گھونگھرو اور زور سے بجنے لگتے اور میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اچھلنے لگتا، خوشی کی امنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اورایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا، وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا، بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہوگا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی، اور جب قزاقی مجھے اپنے کندھے پر لیے ہوئے دوڑنے لگتا تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر اڑا چلا جارہا ہوں۔

قزاقی ڈاک خانہ میں پہنچتا تو پسینہ سے تر ہو جاتا لیکن آرام کرنے کی عادت نہ تھی، تھیلا رکھتے ہی وہ ہم لوگوں کو لے کر کسی میدان میں نکل جاتا، کبھی ہمارے ساتھ کھیلتا، کبھی برہے گاکر سناتا اور کبھی کہانیاں کہتا۔ اسے چوری، ڈاکہ، مار پیٹ، بھوت پریت کے صدہا قصے یاد تھے۔ میں یہ قصے سن کر حیرت آمیز سرور میں محو ہو جاتا، ان کے قصوں کے چور، ڈاکو سچے بہادر ہوتے تھے جو امرا کو لوٹ کر غربا و مساکین کی پرورش کرتے تھے، مجھے ان سے نفرت کے بجائے عقیدت ہوتی تھی؟

(2)

ایک روز قزاقی کو ڈاک کا تھیلا لے کر آنے میں دیر ہوگئی۔ آفتاب غروب ہوگیا اور وہ نظر نہ آیا۔ میں کھویا ہوا سڑک پر دور دور تک آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا تھا مگر وہ مانوس صورت نہ نظر آتی تھی۔ کان لگا کر سنتا تھا مگر "جھن جھن" کی وہ مسرت افزا آواز نہ سنائی دیتی تھی، روشنی کے ساتھ میری امید بھی غائب ہو جاتی تھی ادھر سے کسی کو آتے دیکھتا تو پوچھتا۔ قزاقی آتا ہے؟ مگر یہ تو کوئی سنتا ہی نہ تھا یا صرف سر ہلا دیتا تھا۔

دفعتاً "جھن جھن" کی آواز کانوں میں آئی۔ مجھے اندھیرے میں چاروں طرف بھوت ہی بھوت نظر آتے تھے، حتیٰ کہ والدہ کے کمرے میں طاق پر رکھی ہوئی مٹھائی بھی اندھیرا ہونے پر میرے لیے قابل ترک ہو جاتی تھی، مگر وہ آواز سنتے ہی میں اس طرف زور سے دوڑا، ہاں وہ قزاقی ہی تھا! اسے دیکھتے ہی میری بے قراری غصہ میں تبدیل ہوگئی میں اسے مارنے لگا پھر روٹھ کر الگ کھڑا ہوگیا۔

قزاقی نے ہنس کر کہا۔ مارو گے تو میں ایک چیز لایا ہوں وہ نہ دوں گا۔

میں نے ہمت کر کے کہا۔ جاؤ نہ دینا، میں لوں گا ہی نہیں۔

قزاقی : ابھی دکھادوں تو دوڑ کر گودی میں اٹھالو گے۔

میں نے پگھل کر کہا۔ اچھا دکھا دو۔

قزاقی : تو آکر میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ، بھاگ چلوں، آج بہت دیر ہوگئی بابو جی بگڑ رہے ہوں گے۔ میں نے اکڑ کر کہا پہلے دکھا دو۔

میری فتح ہوئی، اگر قزاقی کو دیر کا خوف نہ ہوتا اور ایک منٹ بھی زیادہ ٹھہر سکتا تو شاید یہ پانسا پلٹ جاتا۔ اس نے کوئی چیز دکھلائی جسے وہ ایک ہاتھ سے سینہ سے چمٹائے ہوئے تھا۔ لانبا منہ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

میں نے دوڑ کر اسے قزاقی کی گود سے لے لیا۔ وہ ہرن کا بچہ تھا۔ آہ، میری اس خوشی کا کون اندازہ کرے؟ اس وقت سے مشکل امتحانات پاس کیے، بڑا عہدہ بھی پایا، رائے بہادر بھی ہوا، مگر ویسی خوشی پھر نہ نصیب ہوئی، میں اسے گود میں لیے اس کے نرم و نازک مس سے لطف اندوز ہوتا ہوا مکان کی طرف دوڑا۔ قزاقی کو آنے

میں اتنی دیر ہوئی، اس کا خیال ہی نہ رہا۔

میں نے پوچھا۔ یہ کہاں ملا، قزاقی؟

قزاقی : بھیّا یہاں سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا جنگل ہے، اس میں بہت سے ہرن ہیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کوئی بچہ مل جائے تو تمھیں دوں، آج یہ بچّہ بھی ہرنوں کے جھنڈ کے ساتھ دکھائی دیا، میں جھنڈ کی طرف دوڑا تو سب کے سب بھاگے۔ یہ بچہ بھی بھاگا پر میں نے پیچھا نہ چھوڑا اور ہرن تو بہت دور نکل گئے پر یہی بچہ پیچھے رہ گیا، میں نے اسے پکڑ لیا، اسی سے تو اتنی دیر ہوئی۔

اس طرح باتیں کرتے ہم دونوں ڈاک خانہ پہنچے، بابوجی نے مجھے نہ دیکھا، ہرن کے بچے کو بھی نہ دیکھا، قزاقی ہی پر ان کی نگاہ پڑی، بگڑ کر بولے۔ آج اتنی دیر کہاں لگائی؟ اب تھیلا لے کر آیا ہے۔ اسے لے کر کیا کروں؟ ڈاک تو چلی گئی، بتا تو نے اتنی دیر کہاں لگائی؟

قزاقی کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

بابوجی نے کہا۔ تجھے شاید اب نوکری نہیں کرنی ہے، رذیل ہے نہ، پیٹ بھرا تو موٹا ہوگیا۔ جب بھوکوں مرنے لگے گا تب آنکھیں کھلیں گی۔

قزاقی خاموش کھڑا رہا۔

بابو جی کا غصہ اور بڑھا، بولے۔ اچھا تھیلا رکھ دے اور اپنے گھر کی راہ لے۔ سُور، اب ڈاک لے کر آیا ہے تیرا کیا بگڑے گا؟ جہاں چاہے گا مزدوری کرے گا۔ ماتھے تو میرے جائے گی، جواب تو مجھ سے طلب ہوگا۔

قزاقی نے رونی صورت بنا کر کہا سرکار، اب کبھی دیر نہ ہوگی۔

بابو : آج کیوں دیر کی۔ اس کا جواب دے۔

قزاقی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ تعجب تو یہ تھا کہ میری زبان بھی بند ہوگئی، بابوجی بڑے غصہ ور تھے۔ انھیں کام بہت کرنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے بات بات پر جھنجھلا پڑتے تھے، میں تو ان کے سامنے کبھی جاتا ہی نہ تھا، وہ بھی مجھے کبھی پیار نہ کرتے تھے۔ دن میں صرف دوبار ایک ایک گھنٹہ کے لیے کھانا کھانے گھر جاتے تھے،

باقی تمام دن دفتر میں لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے بار بار ایک اسسٹنٹ کے لیے افسروں سے درخواست کی تھی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ تعطیل کے دن بھی بابوجی دفتر ہی میں رہتے تھے۔ صرف والدہ ان کے غصے کو فرو کرنا جانتی تھیں۔ مگر وہ دفتر میں کیسے آئیں؟ بے چارہ قزاقی اسی وقت میرے دیکھتے دیکھتے نکال دیا گیا، اس کا بلّم، چپراس اور صافہ چھین لیا گیا اوراسے ڈاک خانہ سے نکل جانے کا نادرشاہی حکم سنا دیا گیا۔ آہ! اس وقت میرا ایسا جی چاہتا تھا کہ میرے پاس سونے کی لنکا ہوتی تو قزاقی کو دے دیتا اور بابوجی کو دکھلا دیتا کہ آپ کے نکال دینے سے قزاقی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ کسی سپاہی کو اپنی تلوار پر جتنا غرور ہوتا ہے اتنا ہی غرور قزاقی کو اپنی چپراس پر تھا۔ جب وہ چپراس کھولنے لگا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس سارے فساد کی جڑ وہ نازک شے تھی جو میری گود میں منہ چھپائے ایسے آرام سے بیٹھی تھی گویا ماں کی گود میں ہو۔ جب قزاقی چلا تو میں بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلا، میرے گھر کے دروازے پر آکر قزاقی نے کہا۔ بھیا !اب گھر جاؤ سانجھ ہو گئی۔

میں چپ کھڑا اپنے آنسوؤں کے جوش کو پوری طاقت سے ضبط کر رہا تھا۔

قزاقی پھر بولا۔ بھیا میں کہیں باہر تھوڑا ہی چلا جاؤں گا۔ پھر آؤں گا اور تمھیں کندھے پر بٹھاکر دوڑاؤں گا۔ بابوجی نے نوکری لے لی ہے تو کیا اتنا بھی نہ کرنے دیں گے ؟تم کو چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا، بھیا جا کر اماں سے کہہ دو، کجا کی جاتا ہے، اس کا کہا سنا ماپھ کریں۔

میں دوڑا ہوا گھر گیا مگر ماں سے کچھ کہنے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں رسوئی سے باہر آکر پوچھنے لگیں۔ کیاہوا بیٹا؟ کس نے مارا؟بابوجی نے کچھ کہا ہے؟ اچھا رہ تو جاؤ، آج گھر آتے ہیں تو پوچھتی ہوں، جب دیکھو میرے لڑکے کو مارا کرتے ہیں، چپ رہو بیٹا، اب تم ان کے پاس کبھی مت جانا۔

میں نے بڑی مشکل سے آواز سنبھال کر کہا۔ ”قزاقی“...

ماں نے سمجھا کہ قزاقی نے مارا ہے، اچھا آنے دو قزاقی کو، دیکھ کھڑے۔ کھڑے نکلوائے دیتی ہوں، ہرکارہ ہو کر میرے راجا بیٹے کو مارے، آج ہی تو صافہ، بلّم، سب چھنوائے لیتی ہوں۔ واہ!

میں نے جلدی سے کہا نہیں، قزاقی نے نہیں مارا بابو جی نے اسے نکال دیا۔ اس کا صافہ، بلّم، چھین لیا، چپراس بھی لے لی۔

ماں۔ یہ تمھارے بابو جی نے بہت برا کیا ہے وہ بے چارہ اپنے کام میں مستعد رہتا ہے پھر اسے کیوں نکالا؟

میں نے کہا۔ آج اُسے دیر ہو گئی تھی۔

یہ کہہ کر میں نے ہرن کے بچے کو گودی سے اتار دیا۔ گھر میں اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ اب تک ماں کی نگاہ بھی اس پر نہ پڑی تھی۔ اسے پھدکتے دیکھ کر وہ یکایک چونک پڑیں اورلپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہیں وہ خوفناک جانور مجھے کاٹ نہ لے، میں کہاں تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، کہاں ماں کی اس گھراہٹ پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

ماں۔ ارے یہ تو ہرن کا بچہ ہے۔ کہاں ملا؟

میں نے ہرن کے بچے کا سارا ماجرا اور اس کے خوفناک نتیجہ کا حال ابتدا سے انتہا تک کہہ سنایا۔ اماں! یہ اتنا تیز بھاگتا ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا تو پکڑ نہ سکتا۔ سَن سَن ہوا کی طرح اڑتا چلا جاتا تھا۔ قزاقی پانچ چھ گھنٹے تک برابر اس کے پیچھے دوڑتا رہا تب کہیں بچہ جا کر ملا۔ اماں؟ قزاقی کی طرح کوئی دنیا بھر میں نہیں دوڑ سکتا، اسی سے تو دیر ہو گئی، سو بابو جی نے بے چارے کو نکال دیا، چپراس صافہ، بلّم سب چھین لیے۔ اب بے چارہ کیا کرے گا؟ بھوکوں مر جائے گا۔

ماں نے پوچھا۔ کہاں ہے قزاقی، ذرا اسے بلا تو لاؤ۔

میں نے کہا۔ باہر تو کھڑا ہے۔ کہتا ہے، اماں جی سے میرا کہا سُنا معاف کرا دینا۔

اب تک ماں میری باتوں کا مذاق سمجھ رہی تھیں، شاید وہ سمجھتی تھیں کہ بابو جی نے قزاقی کو ڈانٹا ہوگا، مگر میرا آخری جملہ سن کر انھیں خیال ہوا کہ کہیں واقعی تو قزاقی برخاست نہیں کر دیا گیا۔ وہ باہر جا کر قزاقی قزاقی پکارنے لگیں مگر قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے بار بار پکارا، رو رو کر پکارا، مگر قزاقی وہاں نہ تھا۔

کھانا تو میں نے کھا لیا۔ بچے غم میں بھی کھانا ترک نہیں کرتے۔ خصوصاً جب ربڑی بھی سامنے ہو، مگر بڑی رات تک پڑے پڑے سوچتا رہا، میرے پاس روپے

ہوتے تو ایک لاکھ روپے قزاقی کو دے دیتا اور کہتا کہ بابوجی سے مت بولنا۔ بے چارہ بھوکوں مر جائے گا۔ دیکھیں کل آتا ہے یا نہیں، اب کیا کرے گا آکر؟ مگر آنے کو تو کہہ گیا ہے۔ میں کل اسے اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں گا۔ یہی ہوائی قلعے بناتے بناتے مجھے نیند آگئی۔

(3)

دوسرے روز میں تمام دن اپنے ہرن کے بچے کی آؤ بھگت میں مشغول رہا۔ پہلے اس کے نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی۔ منو نام رکھاگیا پھر میں نے اس کا اپنے جملہ دوستوں اور ہم سبق لڑکوں سے تعارف کرایا، ایک ہی روز میں وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ اتنی ہی دیر میں میں نے اسے اپنی زندگی میں ایک اہم جگہ دے دی، اپنے مستقبل میں بننے والے شاندار محل میں اس کے لیے ایک علاحدہ کمرہ بنانے کا بھی تہیہ کرلیا۔ پلنگ، فٹن وغیرہ کی بھی تجاویز کرلیں۔

لیکن شام ہوتے ہی میں سب چھوڑ چھاڑ کر سڑک پر جا کھڑا ہوا اور قزاقی کی راہ دیکھنے لگا، یہ جانتا تھا کہ قزاقی نکال دیا گیا ہے، اب اسے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے امید ہو رہی تھی کہ وہ آرہا ہے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ قزاقی بھوکوں مر رہا ہوگا، میں فوراً گھر گیا، والدہ چراغ جلا رہی تھیں، میں نے چپکے سے ایک ٹوکری میں آٹا نکالا اور آٹا ہاتھوں میں لپیٹے، ٹوکری سے گرتے ہوئے آٹے کی ایک لکیر بناتا ہوا بھاگا۔ آکر سڑک پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ قزاقی سامنے سے آتا نظر پڑا۔ اس کے پاس بلّم بھی تھا، کمر میں چپراس بھی تھی، اور سر پر صافہ بھی بندھا ہوا تھا، میں دوڑ کراس کی کمر سے لپٹ گیا اور متحیر ہو کر بولا۔ تمھیں چپراس اور بلّم کہاں سے مل گیا قزاقی؟ قزاقی نے مجھے اٹھاکر کندھے پر بٹھلاتے ہوئے کہا وہ چپراس کس کام کی تھی بھیا وہ تو گلامی کی چپراس تھی یہ اپنی خوشی کی چپراس ہے۔ پہلے سرکار کا نوکر تھا اب تمھارانوکر ہوں۔

یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ ٹوکری پرپڑی جو وہیں رکھی تھی۔ بولا۔ یہ آٹاکیسا ہے بھیا۔ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ تمھارے ہی لیے تولایا ہوں تم بھوکے ہوگے آج کیا کھایا ہوگا؟

قزاقی کی آنکھیں تو میں نہ دیکھ سکا اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا تھا، ہاں، اس کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس کا گلا بھر آیا ہے بولا۔ بھیا! کیا روٹی کھاؤں گا، دال، نمک، گھی اور تو کچھ نہیں ہے۔

میں اپنے کہے پر بڑا نادم ہوا۔ سچ تو ہے کہ بے چارہ روکھی روٹیاں کیسے کھائے گا؟لیکن نمک، دال، گھی اور کیسے لاؤں؟ اب تو ماں چوکے میں ہوں گی آٹا لے کر تو کسی طرح بھاگ آیا تھا۔ (ابھی تک مجھے نہ معلوم تھا کہ میری چوری پکڑ لی گئی، آٹے کی لکیر نے سراغ دے دیا ہے) اب یہ تین تین کیسے لاؤں گا؟ ماں سے مانگوں گا تو کبھی نہ دیں گی۔ ایک ایک پیسے کے لیے تو گھنٹوں رلاتی ہیں۔ اتنی سبھی چیزیں کیوں دینے لگیں، یکایک مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں نے اپنی کتابوں کے بستہ میں کئی آنے پیسے رکھ چھوڑے تھے۔ مجھے پیسے جمع کر کے رکھنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی، معلوم نہیں، اب وہ عادت کیوں تبدیل ہوگئی۔ اب بھی وہی حالت ہوتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا، بابو جی مجھے پیار تو کبھی نہ کرتے تھے مگر پیسے خوب دیتے تھے شاید اپنے کام میں مصروف رہنے کے سبب مجھ سے گلا چھڑانے کے لیے، اسی کام کو سب سے آسان سمجھتے تھے۔ انکار کرنے میں میرے رونے اور مچلنے کا اندیشہ تھا۔ اس بلا کو وہ دور سے ہی ٹال دیتے تھے۔ ماں کا مزاج اس کے ٹھیک برعکس تھا۔ انھیں میرے رونے اور مچلنے سے کسی کام میں، خلل پڑنے کا خوف نہ تھا۔ آدمی لیٹے لیٹے دن بھر رونا سن سکتا ہے۔ حساب لگاتے ہوئے زور کی آواز سے بھی دھیان بٹ جاتا ہے۔ اماں مجھے پیار تو بہت کرتی تھیں مگر پیسہ کا نام سنتے ہی ان کی تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ میرے پاس کتابیں نہ تھیں، ہاں ایک بستہ تھا۔ جس میں ڈاک خانہ کے دو چار فارم تہ کر کے کتابی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا دال، نمک اور گھی کے لیے کیااتنے پیسے کافی نہ ہوں گے؟ میری تو مٹھی میں نہیں سماتے! خیر یہ فیصلہ کر کے میں نے کہا۔ اچھا، مجھے اتار دو۔ تو میں دال اور نمک لادوں، مگر روز آیا کروگے نہ؟

قزاقی : بھیا کھانے کو دوگے تو کیوں نہ آؤں گا؟

میں نے کہا۔ میں روز کھانے کو دوں گا۔

قزاقی بولا : تو میں بھی روج آؤں گا۔

میں نیچے اترا اور دوڑ کر اپنی ساری پونجی اٹھا لایا۔ قزاقی کو روزانہ بلانے کے لیے اس وقت میرے پاس کوہ نور ہیرا ہوتا تو اسے بھی نذر کرنے میں مجھے تامل نہ ہوتا۔

قزاقی نے متحیر ہو کر پوچھا۔ یہ پیسے کہاں پائے، بھیا؟

میں نے فخر سے کہا، میرے ہی تو ہیں۔

قزاقی۔ تمھاری اماں جی تم کو ماریں گی۔ کہیں گی کہ کجا کی نے پھسلا کر منگوا لیے ہوں گے۔ بھیا، ان پیسوں کی مٹھائی لے لینا اور آٹا مٹکے میں رکھ دینا، میں بھوکوں نہیں مرتا، میرے دو ہاتھ ہیں، بھلا میں بھوکوں مر سکتا ہوں؟

میں نے ہر چند کہا کہ پیسے میرے ہیں لیکن قزاقی نے نہ لیے۔ اس نے بڑی دیر تک ادھر ادھر کی سیر کرائی۔ گیت سنائے اور مجھے گھر پہنچا کر چلا گیا۔ میرے دروازے پر آٹے کی ٹوکری بھی رکھ دی۔

میں نے مکان میں قدم ہی رکھا تھا کہ ماں نے ڈانٹ کر کہا کیوں رے چور تو آٹا کہاں لے گیا تھا؟اب چوری کرنا سیکھتا ہے؟ بتا کس کو آٹا دے آیا ورنہ تیری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔

میری نانی مر گئی۔ ماں غصّہ میں شیرنی ہو جاتی تھی میں سٹ پٹا کر بولا۔ کسی کو تو نہیں دے آیا۔

ماں : تو نے آٹا نہیں نکالا؟ دیکھ کتنا آٹا سارے صحن میں بکھرا پڑا ہے۔ میں خاموش کھڑا تھا، وہ کتنا ہی دھمکاتی تھیں چمکارتی تھیں، مگر میری زبان نہ کھلتی تھی۔ آنے والی مصیبت کے خوف سے جان سوکھ رہی تھی۔ یہاں تک بھی کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بگڑتی کیوں ہو؟ آٹا تو دروازے پر رکھا ہوا ہے۔ نہ اٹھا کر لاتے بنتا تھا، گویا کام کرنے کی قوت ہی جاتی رہی۔ گویا پیروں میں ہلنے کی طاقت ہی نہ تھا، دفعتاً قزاقی نے پکارا۔ بہو جی آٹا یہ دروجے پر رکھا ہوا ہے۔ بھیا مجھے دینے کو لے گئے تھے۔

یہ سنتے ہی ماں دروازے کی طرف چلی گئی، قزاقی سے وہ پردہ نہ کرتی تھی، انھوں نے قزاقی سے کوئی بات کی یا نہیں، یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اماں جی خالی ٹوکری لیے ہوئے گھر میں آئیں، پھر کوٹھری میں جاکر صندوق سے کچھ نکالا اور دروازہ

کی طرف گئیں، میں نے دیکھا، ان کی مٹھی بند تھی، اب مجھ سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا۔ ماں کے پیچھے پیچھے میں بھی گیا، ماں نے دروازے پر کئی بار پکارا مگر قزاقی چلا گیا تھا!

میں نے بڑی بہادری سے کہا، میں جا کر کھوج لاؤں، اماں جی؟ ماں نے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا، تم اندھیرے میں کہاں جاؤ گے؟ ابھی تو کھڑا تھا۔ میں نے کہا کہ یہیں رہنا، میں آتی ہوں، تب تک نہ جانے کہاں کھسک گیا، بڑا سنکوچی آدمی ہے، آٹا تو لیتا ہی نہ تھا۔ میں نے زبردستی اس کے انگوچھے میں باندھ دیا، مجھے تو بے چارے پر بڑا ترس آتا ہے، نہ جانے غریب کے گھر میں کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ روپے لائی تھی کہ دے دوں گی مگر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

اب تو مجھے بھی ہمت ہوئی، میں نے اپنی چوری کی پوری داستان کہہ ڈالی۔ بچوں کے ساتھ سمجھ دار بچے بن کر والدین ان پر جتنا اثر ڈال سکتے ہیں، جتنی نصیحت دے سکتے ہیں، اتنا بڈھے بن کر نہیں۔

ماں نے کہا۔ تم نے مجھ سے پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیا میں قزاقی کو تھوڑا سا آٹا نہ دے دیتی؟

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، دل میں کہا، اس وقت تمھیں قزاقی پر رحم آگیا ہے، جو چاہو دے ڈالو لیکن میں مانگتا تو مارنے کے لیے دوڑتیں۔ ہاں یہ سوچ کر دل خوش ہوا کہ اب قزاقی بھوکوں نہ مرے گا، اماں جی اسے روز کھانے کو دیں گی اور وہ روز مجھے کندھے پر بٹھاکر سیر کرادے گا۔

دوسرے روز میں دن بھر متو کے ساتھ کھیلتا رہا، شام کو سڑک پر جاکر کھڑا ہوگیا، مگر اندھیرا ہوگیا اور قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا، چراغ جل گیا، راستہ میں سناٹا چھا گیا مگر قزاقی نہ آیا؟ میں روتا ہوا گھر آیا ماں نے پوچھا، کیوں روتے ہو بیٹا؟ کیا قزاقی نہیں آیا۔

میں اور زور سے رونے لگا، ماں نے مجھے چھاتی سے لگالیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان کا گلا بھی بھر آیا ہے، انھوں نے کہا، بیٹا؟ چپ ہوجاؤ، میں کل کسی ہرکارے کو بھیج کر قزاقی کو بلاؤں گی۔

میں روتے ہی روتے سوگیا۔ صبح جیوں ہی آنکھیں کھلیں، میں نے ماں سے کہا۔

قزاقی کو بلوا دو۔

ماں نے کہا۔ آدمی گیا ہے بیٹا! قزاقی آتا ہوگا۔ میں خوش ہو کر کھیلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اماں جی جو بات کہتی ہیں اسے پورا ضرور کرتی ہیں۔ انھوں نے صبح سویرے ہی ایک ہرکارہ کو بھیج دیا تھا، دس بجے جب میں منو کو لیے ہوئے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ قزاقی اپنے گھر پر نہیں ملا، اس کی بیوی رو رہی تھی کہ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

بچوں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے، اس کا اندازہ دوسرا نہیں کرسکتا ان میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہوتے، انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی بات انھیں بے چین کررہی ہے، کون سا کانٹا ان کے دل میں کھٹک رہا ہے، کیوں بار بار انھیں رونا آتا ہے۔ کیوں وہ من مارے بیٹھے ہیں، کھیلنے میں جی نہیں لگتا، میری بھی ~~یہی حالت تھی،~~ کبھی گھر میں آتا، کبھی باہر جاتا، کبھی سڑک پر جاپہنچتا۔ آنکھیں قزاقی کو ڈھونڈ رہی تھی، وہ کہاں چلا گیا، کہیں بھاگ تو نہیں گیا۔

تیسرے پہر کو میں گم شدہ سا سڑک پر کھڑا تھا، یکایک میں نے قزاقی کو ایک گلی میں دیکھا، ہاں وہ قزاقی ہی تھا، میں اس کی طرف پکارتا ہوا دوڑا مگر گلی میں اس کا پتہ نہ تھا نہ جانے کدھر غائب ہوگیا، میں نے گلی کو اس سرے سے اس سرے تک دیکھا مگر کہیں قزاقی کی بو تک نہ ملی۔

گھر جاکر میں نے ماں سے یہ بات کہی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یہ بات سن کر بہت متفکر ہوگئیں۔ اس کے بعد دو تین روز تک قزاقی نہ دکھائی دیا، میں بھی اب اس کو کچھ کچھ بھولنے لگا، بچے پہلے جتنی محبت کرتے ہیں بعد کو اتنا ہی بے اعتنا بھی ہو جاتے ہیں، جس کھلونے پر جان دیتے ہیں اسی کو دو چار روز بعد پٹک کر توڑ بھی ڈالتے ہیں۔

دس بارہ روز اور گزر گئے۔ دوپہر کا وقت تھا، بابو جی کھانا کھارہے تھے۔ میں منّو کے پیروں میں پتیل کی پہنچیاں باندھ رہا تھا، ایک عورت گھونگھٹ نکالے ہوئے آئی اور صحن میں کھڑی ہوگئی، اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے تھے، مگر گوری اور خوبصورت عورت تھی، اس نے مجھ سے پوچھا بھیا، بہو جی کہاں ہیں؟ میں نے اس کے

پاس جاکر اس کا منہ دیکھتے ہوئے کہا۔ تم کون ہو؟ کیا بیچتی ہو؟

عورت : کچھ بیچتی نہیں ہوں، تمھارے لیے یہ کمل گٹے لائی ہوں۔ بھیا تمھیں تو کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں نا؟ میں نے اس کے ہاتھوں سے لٹکی ہوئی پوٹلی کو شوق بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ کہاں سے لائی ہو، دیکھیں۔

عورت : تمھارے ہر کارے نے بھیجا ہے بھیا

میں نے اچھل کر پوچھا قزاقی نے؟

عورت نے سر ہلاکر ہاں کہا اور پوٹلی کھولنے لگی، اتنے میں ماں بھی رسوئی سے نکل آئیں اس نے ماں کے پیر چھوئے، ماں نے پوچھا تو قزاقی کی گھر والی ہے؟

عورت نے سر جھکالیا۔

ماں : آج کل قزاقی کیا کرتا ہے۔

عورت نے رو کر کہا۔ بہو جی، جس دن سے آپ کے پاس سے آنا لے کر گئے ہیں۔ اسی دن سے بیمار پڑے ہیں، بس بھیا بھیا کیا کرتے ہیں، بھیا ہی میں ان کا من بسا رہتا ہے۔ چونک چونک کر بھیا بھیا کہتے ہوئے درواجے کی طرف دوڑتے ہیں۔ نہ جانے انھیں کیا ہوگیا ہے، بہو جی، ایک دن مجھ سے کچھ کہا نہ سنا، گھر سے چل دیے اور ایک گلی میں چھپ کر بھیا کو دیکھتے رہے، جب بھیا نے انھیں دیکھ لیا تو بھاگے، تمھارے پاس آتے ہوئے لجاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ہاں ہاں میں نے اس دن تم سے جو کہا تھا، اماں جی۔

ماں : گھر میں کچھ کھانے پینے کو ہے؟

عورت : ہاں بہو جی، تمھارے آسرباد سے کھانے پینے کا دکھ تو نہیں ہے۔ آج سویرے اٹھے اور تالاب کی طرف چلے گئے، بہت کہتی رہی کہ باہر مت جاؤ، ہوا لگ جائے گی، مگر نہ مانے مارے کمزوری کے پاؤں بھی کانپنے لگتے ہیں، مگر تالاب میں گھس کر یہ کمل گٹے توڑ لائے اور مجھ سے کہا کہ لے کر جا بھیا کو دے آ۔ انھیں کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کسل چھیم (خیر و عافیت) پوچھتی آنا۔

میں نے پوٹلی سے کمل گٹے نکال لیے اور مزے سے کھا رہا تھا، ماں نے بہت

آنکھیں دکھائیں مگر یہاں اتنا صبر کہاں؟

ماں نے کہا۔ کہہ دینا سب کسل ہے۔

میں نے کہا، یہ بھی کہہ دینا کہ بھیا نے بلایا ہے۔ نہ جاؤ گے تو پھر تم سے کبھی نہ بولیں گے، ہاں۔

بابو جی کھانا کھاکر نکل آئے تھے، تولیے سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے بولے اور یہ بھی کہہ دینا کے صاحب نے تم کو بحال کردیا ہے، جلد جاؤ ورنہ کوئی دوسرا آدمی رکھ لیا جاوے گا۔

عورت نے اپنا کپڑا اٹھایا چلی گئی۔ ماں نے پکارا مگر وہ نہ رکی۔ شاید اماں جی اسے آٹا دال دینا چاہتی تھیں۔

ماں نے پوچھا۔ سچ مچ بحال ہوگیا۔

بابو جی : اور کیا جھوٹ ہی بلارہا ہوں۔ میں نے تو پانچویں ہی روز اس کی بحالی رپورٹ کی تھی۔

ماں : یہ تم نے بہت اچھا کیا۔

بابو جی : اس کی بیماری کی یہی دوا ہے۔

(4)

علی الصباح میں اٹھا تو کیا دیکھتاہوں کہ قزاقی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آرہا ہے۔ وہ بہت دبلا ہوگیاتھا معلوم ہوتا تھا، بوڑھا ہوگیا ہے، ہرا بھرا درخت سوکھ کر ٹھونٹھ سا ہوگیا تھا۔ میں اس کی طرف دوڑا اور اس کی کمر سے لپٹ گیا، قزاقی نے میرے گالوں کو چوما اور مجھے اٹھاکر کندھے پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ اٹھ سکا، تب وہ چوپایوں کی طرح زمین پر ہاتھوں اور گھٹنوں پر کھڑا ہوگیا اور میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوکر ڈاک خانہ کی طرف چلا، میں اس وقت خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور شاید قزاقی مجھ سے بھی زیادہ خوش تھا۔

بابو جی نے کہا۔ قزاقی تم بحال ہوگے اب کبھی دیر نہ کرنا۔

قزاقی روتا ہوا والد صاحب کے قدموں پر گرپڑا۔ مگر شاید میرے نصیب میں دو سکھ بھوگنا بدا نہ تھا منّو ملا تو قزاقی چھوٹا، قزاقی آیا تو منّو ہاتھ سے گیا اور ایسا گیا کہ اس

کے جانے کا رنج آج تک ہے۔ متّو میری ہی تھالی میں کھاتا تھا، جب تک میں کھانے نہ بیٹھوں، وہ کبھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ اسے بھات سے بہت ہی رغبت تھی مگر جب تک خوب گھی نہ پڑا ہو اس کا جی نہ بھرتا تھا، وہ میرے ہی ساتھ سوتا بھی تھا اور میرے ہی ساتھ اٹھتا بھی، صفائی تو اسے اس قدر پسند تھی کہ رفع حاجت کے لیے گھر سے باہر میدان میں نکل جاتا تھا، کتوں سے اس کو چڑھ تھی، کتوں کو گھر میں نہ گھسنے دیتا تھا، کتے کو دیکھتے ہی تھالی سے اٹھ جاتا اور اسے دوڑا کر گھر سے باہر نکال دیتا تھا۔

قزاقی کو ڈاک خانہ میں چھوڑ کر جب میں کھانا کھانے گیا تو متّو بھی آبیٹھا ابھی دو چار ہی لقمے کھائے تھے کہ ایک بڑا سا جھبرا کتا صحن میں نظر آیا۔ متّو اسے دیکھتے ہی دوڑا، دوسرے مکان میں جاکر کتا چوہا ہو جاتا ہے جھبرا کتا اسے آتے دیکھ کر بھاگا، متّو کو اب گھر لوٹ آنا چاہیے تھا مگر وہ کتا اس کے لیے ملک الموت تھا۔ متّو کو اسے گھر سے نکال کر بھی صبر نہ ہوا وہ اسے گھر سے باہر میدان میں بھی دوڑانے لگا۔ متّو کو شاید خیال نہ رہا کہ یہاں میری عملداری نہیں ہے۔ وہ اس احاطہ میں پہنچ گیا جہاں جھبرے کا بھی اتنا ہی اقتدار تھا، جتنا متّو کا۔ متّو کتوں کو بھگاتے بھگاتے شاید اپنے قوت بازو پر گھمنڈ کرنے لگا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھتا تھا کہ مکان میں اس کی حمایت میں مالک مکان کا خوف کام کیا کرتا ہے، جھبرے نے اس میدان میں آتے ہی پلٹ کر متّو کی گردن دبا دی۔ بے چارے متّو کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ جب پڑوسیوں نے شور مچایا تو میں دوڑا، دیکھا تو متّو مرا پڑا ہے اور جھبرے کا کہیں پتہ نہیں۔

(یہ افسانہ پہلی بار ''مادھوری'' اپریل 1926 میں شائع ہوا تھا۔ ہندی میں ''مانسرودور'' 5 اور اردو مجموعہ ''پریم چالیسی'' میں شامل ہے۔)

فریب

(1)

دنیا میں کوئی شخص اگر ایسا ہوتا جس کی نگاہ لوگوں کے دلوں کے اندر گھس سکتی تو ایسے بہت کم لوگ ہوتے جو اس کے سامنے سیدھی آنکھیں کرکے دیکھ سکتے۔ مہلا آشرم کی جگنوبائی کے متعلق لوگوں کو ایسی نگاہ کا گمان تھا۔ وہ ناخواندہ بوڑھی غریب عورت تھی، مسکین صورت لیکن جیسے کسی ہوشیار پروف ریڈر کی نگاہ غلطیوں ہی پر جا پڑتی ہے اس کی آنکھیں بھی باطن کے داغوں پر پڑ جاتیں، شہر میں کوئی ایسی سربرآوردہ خاتون نہ تھی جس کے متعلق دو چار راز کی باتیں اسے معلوم نہ ہوں۔ اس کا پستہ قد، نحیف جسم، سفید بال، اور پرشکن چہرہ اس کی جانب سے حسنِ ظن پیدا کرتے تھے۔ مہلائیں اسے اپنا محرم راز بنا لیتی تھیں اور ہمیشہ کے لیے اس کے دام میں پھنس جاتی تھیں۔ جس پر وہ ایک بار قابو پا لیتی اس پر سختی سے حکومت کرتی، اس کا کام مہلا آشرم میں عورتوں کی خدمت تواضع کرنا تھا۔ جس میں انھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ لیکن دیویاں اس کی صورت سے کانپتی تھیں۔ اس کا ایسا رعب تھا کہ جوں ہی وہ کمرے میں قدم رکھتی، لبوں پر آئی ہوئی ہنسی جیسے رو پڑتی تھی۔ چہکنے والی آوازیں خاموش ہو جاتی تھیں۔ گویا اس کے چہرے پر دیویوں کو اپنے پچھلے کارناموں کی جھلک نظر آتی تھی... وہ راز جو پہلے ایک کیڑے کی طرح حقیر اور کم بضاعت ہوتا ہے دنوں کے ساتھ جسیم اور خوفناک ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم اس کی یاد ہی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اور اگر اپنے ہی کارناموں کی بات ہوتی تو زیادہ تر عورتیں جگنو سے اجتناب کرتیں مگر یہاں تو سسرال ننھیال دونوں طرف کی حفاظت کرنا پڑتی تھی اور جس قلعہ میں اس قدر دروازے ہوں اس کی حفاظت کون کر سکتا ہے۔ وہاں تو حملہ آور کے سامنے سر جھکا دینے میں ہی خیریت ہے۔ جگنو کے دل میں ہزاروں مردے دفن تھے، جب ضرورت پڑتی اکھاڑ لیتی۔ جہاں کسی عورت نے دون کی لی یا شان دکھلائی وہیں جگنو کی تیوریاں بدلیں۔ اس کی ایک کڑی نگاہ اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیتی

تھی۔ مگر مستورات اس سے نفرت کرتی ہوں، یہ بات نہ تھی۔ سبھی اس سے بڑے چاؤ سے ملتیں اور اس کی آؤ بھگت کرتیں۔ اپنے ہمسایوں کی بدنامی ہمیشہ لوگوں کو دلچسپی کا سامان ہی رہا ہے اور جگنو کے پاس اس کی کمی نہ تھی۔

(2)

شہر میں اندومتی پاٹھ شالا نام کا ایک لڑکیوں کا اسکول تھا۔ حال میں مس خورشید اس کی ہیڈ مسٹرس ہو کر آئی تھیں۔ شہر میں مستورات کا دوسرا کلب نہ تھا۔ مس خورشید ایک دن آشرم میں تشریف لائیں۔ ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ کوئی دوسری عورت آشرم میں نہ تھی۔ ان کی بڑی مدارت ہوئی۔ پہلے ہی دن معلوم ہو گیا کہ مس خورشید کی آمد سے آشرم میں جان سی پڑ جائے گی۔ کچھ اس طرح دل کھول کر ہر ایک سے ملیں، کچھ ایسی دلچسپ باتیں کیں کہ تمام عورتیں فریفتہ ہو گئیں۔ گانے میں ہوشیار تھیں۔ تقریر بھی خوب کرتی تھیں اور ناٹک کے پارٹ ادا کرنے میں تو انھوں نے لندن میں خاص نام پیدا کیا تھا۔ ایسی ہمہ صفت موصوف خاتون کی آمد آشرم کی خوش قسمتی تھی۔ گلابی گورا رنگ، نازک اندام، نرگسی آنکھیں، نئے فیشن کے کٹے ہوئے بال، ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا، خوبصورتی کی اس سے اچھی تصویر کسی نے کم دیکھی ہوگی۔

چلتے وقت مس خورشید نے مسز ٹنڈن سے جو آشرم کی انچارج تھیں، بلا کر پوچھا "وہ بڑھیا کون ہے؟"

جگنو کئی کئی مرتبہ کمرے میں آکر مس خورشید کو متجسس نگاہوں سے دیکھ چکی تھی، جیسے کوئی شہسوار نئی گھوڑی کو دیکھ رہا ہو۔

مسز ٹنڈن نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ اوپر کے کام پر نوکر ہے کوئی کام ہو تو بلاؤں۔"

مس خورشید نے شکریہ ادا کر کے کہا۔ "جی نہیں کوئی خاص کام نہیں ہے، مجھے چالباز معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھ رہی ہوں یہاں پر وہ نوکر نہیں بلکہ مالکہ ہے۔

مسز ٹنڈن تو جگنو سے جلی بیٹھی ہی تھیں، اب تو بیوگی کا داغ لگانے کے لیے وہ سدا سہاگن کہا کرتی تھی۔ مس خورشید سے اس کی جتنی برائی ہو سکی وہ کی اور اسے

خبردار رہنے کا مشورہ دیا۔

مس خورشید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تب تو خوفناک عورت ہے جبھی تو اس سے سب عورتیں کانپتی ہیں۔ آپ اسے نکال کیوں نہیں دیتیں۔ ایسی چڑیل کو ایک دن بھی نہ رکھنا چاہیے۔“

مسز ٹنڈن نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ نکال کیسے دوں۔ زندگی مشکل ہو جائے۔ ہماری قسمت اس کی مٹھی میں ہے۔ آپ پر دو چار دنوں میں اس کے جوہر کھلیں گے میں تو ڈرتی ہوں کہ کہیں آپ بھی اس کے پنجے میں نہ پھنس جائیں۔ اس کے سامنے بھول کر بھی کسی مرد سے بات نہ کیجیے گا۔ اس کے مخبر خدا جانے کہاں کہاں لگے ہوئے ہیں۔ نوکروں سے مل کر بھید یہ لے۔ ڈاکیوں سے مل کر خط یہ دیکھے۔ لڑکیوں کو پھسلا کر گھر کا حال یہ پوچھے۔ اس رانڈ کو تو خفیہ پولیس میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔ یہاں نہ جانے کیوں آمری۔“

مسز خورشید فکر میں ڈوب گئیں۔ گویا اس عقدے کو حل کرنے کی ترکیب سوچ رہی ہوں۔ ایک لمحہ بعد بولیں ”اچھا میں ٹھیک کروں گی۔ “

مسز ٹنڈن : ”نکال دینے سے کیا ہوگا اس کی زبان تو بند نہ ہوگی۔ تب اور بھی نڈر ہو کر کیچڑ اُچھالے گی۔

مس خورشید نے اطمینان کے لہجہ میں کہا ”میں اس کی زبان بھی بند کر دوں گی بہن، آپ دیکھ لیجیے گا۔ ٹکے کی عورت یہاں راج کر رہی ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ چلی گئیں تو مسز ٹنڈن نے جگنو کو بلا کر کہا۔ ”ان نئی مس صاحبہ کو دیکھا پرنسپل ہیں۔“

جگنو نے بغض سے بھرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”آپ دیکھیں، میں ایسی سینکڑوں چھوکریاں دیکھ چکی ہوں۔ آنکھ کا پانی جیسے مر گیا ہو۔ “

مسز ٹنڈن : ”آہستہ بولو، تمھیں کچا ہی کھا جائیں گی۔ ان سے ڈرتی رہنا۔ کہہ گئی ہیں، میں اسے ٹھیک کر کے چھوڑوں گی۔ میں نے سوچا تمھیں خبر دار کر دوں۔ ایسا نہ ہو اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات کہہ بیٹھو۔

جگنو نے گویا تلوار کھینچ کر کہا ”مجھے خبردار رہنے کی ضرورت نہیں۔ انھیں خبر

دار کر دیجیے گا۔ یہاں کا آنا نہ بند کردوں تو اپنے باپ کی نہیں۔ وہ گھوم کر دنیا دیکھ آئی ہیں تو یہاں گھر بیٹھے دنیا دیکھ چکی ہوں۔"

مسز ٹنڈن نے پیٹھ ٹھونکی۔ "میں نے سمجھا دیا۔ آگے تم جانو تمھارا کام۔"

جگنو : آپ چپ چاپ دیکھتی جایئے کیسا تگنی کا ناچ نچاتی ہوں۔ اس نے اب تک بیاہ کیوں نہیں کیا؟ عمر تو تیس کے لگ بھگ ہو گی۔"

مسز ٹنڈن نے ردا جمایا۔ "وہ کہتی ہیں میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ کسی مرد کے ہاتھوں میں اپنی آزادی کیوں بیچوں؟

جگنو نے آنکھ نچا کر کہا۔ "ایسی بہت سی کنواریاں دیکھ چکی ہوں۔ ستر چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔"

اتنے میں اور کئی مستورات آ گئیں اور بات کا سلسہ بند ہو گیا۔

(3)

دوسرے دن جگنو مس خورشید کے بنگلے پر پہنچی۔ اتفاق سے مس خورشید ہوا کھانے گئی ہوئی تھی۔ خانساماں نے پوچھا۔ "کہاں سے آئی ہو؟"

جگنو : "یہیں رہتی ہوں بیٹا۔ میم صاحبہ کہاں سے آئی ہیں۔ تم تو ان کے پرانے نوکر ہو گے؟"

"ناگپور سے آئی ہیں۔ میرا گھر بھی وہیں ہے۔ دس سال سے ان کے ساتھ ہوں۔"

جگنو : "کسی اونچے خاندان کی ہوں گی وہ تو، رنگ ڈھنگ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔"

خانساماں : "خاندان تو کچھ ایسا اونچا نہیں ہے۔ ہاں تقدیر کی اچھی ہیں۔ ان کی ماں ابھی تک مشن میں تیس روپے ماہوار پاتی ہیں۔ یہ پڑھنے میں تیز تھیں۔ وظیفہ مل گیا ولایت چلی گئیں۔ بس تقدیر کھل گئی۔ اب تو اپنی ماں کو بلانے والی ہیں۔ لیکن وہ بڑھیا شاید ہی آوے، یہ گرجے ورجے نہیں جاتیں۔ اس لیے دونوں میں پٹتی نہیں۔"

جگنو : "مزاج کی تیز معلوم ہوتی ہیں۔"

خانساماں : ”نہیں! مائی بہت نیک ہیں۔ ہاں گرجے نہیں جاتیں، تم کیا نوکری کی تلاش میں ہو؟کرنا چاہتی ہوتو کر لو۔ ایک آیا رکھنا چاہتی ہیں۔“

جگنو : ”نہیں بیٹا! اب میں نوکری کیا کروں گی۔ اس بنگلہ میں پہلے جو میم صاحبہ رہتی تھیں۔ ”وہ مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ میں نے سوچا چلو نئی میم صاحبہ کو دعا دے آؤں۔“

خانساماں: ”یہ دعا لینے والی میم صاحبہ نہیں ہیں۔“ایسوں سے بہت چڑتی ہیں۔ کوئی مانگنے والا آیا اور اسے ڈانٹ بتائی۔ کہتی ہیں بنا کام کے کسی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ بھلاچاہتی ہو تو چپکے سے راہ لو۔“

جگنو : ”تو یہ کہو ان کا کوئی دھرم نہیں ہے، پھر بھلا غریبوں پر کیوں رحم کرنے لگیں۔“

جگنو کو اپنی دیوار کھڑی کرنے کے لیے کافی مصالحہ مل گیا۔ ”نیچ خاندان ہیں۔ ماں سے نہیں بنتی، دھرم کرم سے خالی ہیں۔“ پہلے دھاوے میں اتنی کامیابی کم نہ تھی۔ چلتے چلتے خانساماں سے اتنا اور پوچھا۔ ”ان کے صاحب کیا کرتے ہیں۔“

خانساماں نے مسکرا کر کہا۔ ”ان کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔ صاحب کہاں ہوں گے۔“

جگنو نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ”ارے ابھی تک بیاہ نہیں ہوا۔ ہمارے یہاں تو دنیا ہنسنے لگے۔“

اپنا اپنا رواج ہے۔ ”ان کے ہاں کتنی عورتیں عمر بھر بیاہ نہیں کرتیں۔“

جگنو نے افسردہ دلی سے کہا۔ ”ایسی کنواریاں تو بہت دیکھ چکی ہوں۔ ہماری برادری میں کوئی اس طرح رہے تو تھڑی تھڑی ہو جائے لیکن ان کے ہاں جو جی میں آئے کرے۔ کوئی پوچھتا نہیں۔

اتنے میں مس خورشید آ پہنچیں، گلابی جاڑا پڑنے لگا تھا۔ مس صاحبہ ساڑی کے اوپر اوورکوٹ پہنے ہوئے تھیں۔ ایک ہاتھ میں چھاتا تھا دوسرے میں کتے کی زنجیر، نسیم سحری میں ورزش نے گالوں کو سرخ بنا دیا تھا۔ جگنو نے جھک کر سلام کیا، پر انھوں نے اسے دیکھ کر بھی نہ دیکھا۔ اندر جاکر خانساماں کو بلا کر پوچھا۔ ”یہ عورت کیا

کرنے آئی ہے۔"

خانساماں نے جوتے کا فیتہ کھولتے ہوئے کہا۔ "بھکارن ہے حضور! پر سمجھدار ہے۔ میں نے کہا یہاں نوکری کروگی تو راضی نہیں ہوئی۔ پوچھنے لگی ان کے صاحب کیا کرتے ہیں۔ جب میں نے بتا دیا تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ اور ہونا ہی چاہیے۔ ہندوؤں میں تو دودھ پیتی بچیوں تک کا بیاہ ہو جاتا ہے۔

خورشید نے سوال کیا۔ "اور وہ کیا کہتی تھی"

"اور تو کوئی بات نہیں حضور"

اچھا! اسے میرے پاس بھیج دو۔ "

(4)

جگنو نے جوں ہی قدم رکھا مس خورشید نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ "آیئے ماتا جی !میں ذراسیر کرنے چلی گئی تھی۔ آپ کے آشرم میں توسب خیریت ہے۔"

جگنو ایک کرسی کا تکیہ پکڑ کر کھڑے کھڑے بولی۔ "سب خیریت ہے مس صاحبہ! میں نے کہا۔ آپ کو دعائیں دے آؤں۔ میں آپ کی لونڈی ہوں۔ جب کوئی کام پڑے مجھے یاد کیجیے گا۔ یہاں اکیلے تو حضور کو اچھا نہ لگتا ہوگا۔"

مس خورشید "مجھے اپنے اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ بڑا لطف آتا ہے، وہ سب میری ہی لڑکیاں ہیں۔"

جگنو نے مادرانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "یہ ٹھیک ہے مس صاحبہ! پر اپنا اپنا ہی ہے۔ دوسرا اپنا ہو جائے تو اپنوں کے لیے کیوں کوئی روئے۔"

اچانک ایک خوبصورت نوجوان ریشمی سوٹ ڈالے اندر داخل ہوا۔ مس خورشید نے اس طرح دوڑ کر اس کا استقبال کیا گویا خوشی کے مارے جامہ میں پھولی نہیں سماتی تھی۔ جگنو اسے دیکھ کر کونے میں دبک گئی۔

مس خورشید نے نوجوان سے گلے مل کر کہا۔ "پیارے میں کب سے تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ (جگنو سے) ماں جی آپ جائیں پھر کبھی آنا۔ یہ میرے پیارے دوست ولیم کنگ ہیں۔ ہم اور یہ دونوں بہت دنوں ساتھ ساتھ پڑھے ہیں۔

جگنو چپکے سے نکل کر باہر چلی آئی۔ خانساماں کھڑا تھا پوچھا۔ "یہ لونڈا کون ہے؟"

خانساماں نے سر ہلا کر کہا۔ "میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے۔ شاید کنوار پن سے دل بھر گیا، اچھا طرحدار جوان ہے۔"

جگنو : "دونوں اس طرح ٹوٹ کر گلے ملے ہیں کہ میں شرم کے مارے گڑ گئی۔ دونوں لپٹ گئے، لونڈا مجھے دیکھ کر کچھ جھجکا بھی، پر تمھاری مس صاحب تو جیسے متوالی ہوگئی تھیں۔"

خانساماں نے کہا۔ "مجھے تو کچھ بے ڈھب معاملہ نظر آتا ہے۔"

جگنو تو یہاں سے سیدھی مسز ٹنڈن کے گھر پہنچی، ادھر مس خورشید اور نوجوان میں باتیں ہونے لگیں۔

مس خورشید نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم نے اپنا پارٹ خوب کھیلا لیلا۔ بڑھیا سچ مچ چندھیا گئی تھی۔"

لیلا : "میں تو ڈر رہی تھی کہیں بھانپ نہ جائے۔"

مس خورشید : "مجھے یقین تھا وہ آج ضرور آئے گی، میں نے دور ہی سے اسے برآمدے میں دیکھا۔ اور تمھیں اطلاع دی۔ آج آشرم میں بڑے مزے رہیں گے۔ جی چاہتا ہے عورتوں کی کانا پھوسیاں سنوں۔ دیکھ لینا سب ہی اس کی باتوں پر یقین کرلیں گی۔"

لیلا : "تم بھی تو جان بوجھ کر دلدل میں پاؤں رکھ رہی ہو۔"

مس خورشید : "مجھے ناٹک کھیلنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ بہن ذرا دل لگی رہے گی۔ بڑھیا نے بڑا ظلم ڈھا رکھا ہے۔ ذرا اسے سبق دینا چاہتی ہوں، کل تم اسی وقت اسی ٹھاٹ سے پھر آجانا۔ بڑھیا کل پھر آئے گی۔ اس کے پیٹ میں پانی ہضم نہ ہوگا۔ جس وقت وہ آئے گی تمھیں خبر دوں گی۔ بس تم چھیلا بنی پہنچ جانا۔"

(5)

آشرم میں اس دن جگنو کو دم مارنے کی فرصت نہ تھی، اس نے سارا حال مسز ٹنڈن سے کہا۔ مسز ٹنڈن دوڑی ہوئی آشرم میں پہنچیں اور دوسری عورتوں کو خبر

سنائی۔ جگنو تصدیق کرنے کے لیے بلائی گئی۔ جو عورت آتی وہ جگنو کی زبان سے یہ کہانی سنتی، ہر ایک ریہرسل میں کچھ نہ کچھ رنگ چڑھ جاتا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوتے ہوتے سارے شہر کے مہذب حلقہ میں یہ خبر پھیل گئی۔

ایک عورت نے پوچھا۔ "یہ آدمی ہے کون؟"

مسز ٹنڈن: "سنا ہے ان کے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ دونوں میں پہلے سے کچھ بات چیت رہی ہوگی۔ وہی تو میں کہتی تھی اتنی عمر ہوگئی۔ یہ کنواری کیسے بیٹھی ہے۔ اب قلعی کھلی۔"

جگنو: "اور کچھ ہو یا نہ ہو، جوان تو بانکا ہے۔"

مسز ٹنڈن: "یہ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کا حال ہے۔"

جگنو: "میں تو اس کی صورت دیکھتے ہی تاڑ گئی تھی۔ دھوپ میں بال سفید نہیں کیے ہیں۔"

مسز ٹنڈن: "کل پھر جانا"۔

جگنو: "کل نہیں میں آج ہی رات کو جاؤں گی۔" لیکن رات کو جانے کے لیے کوئی بہانہ ضروری تھا، مسز ٹنڈن نے آشرم کے لیے ایک کتاب منگوا بھیجی، رات کے نو بجے جگنو مس خورشید کے بنگلہ پر پہنچی، اتفاق سے لیلاوتی وہاں موجود تھی۔ بولی۔ "یہ بڑھیا بے طرح پیچھے پڑی ہے۔"

مس خورشید: "میں نے تم سے کہا تھا اس کے پیٹ میں پانی نہ پچے گا۔ تم جاکر روپ بھر آؤ، تب تک میں اسے باتوں میں لگاتی ہوں۔ شرابیوں کی طرح اول جلول بکنا شروع کر دینا۔ بس یوں بن جانا جیسے میں اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

لیلا مشن میں ڈاکٹر تھی، اس کا بنگلہ بھی پاس ہی تھا۔ وہ چلی گئی۔ مس خورشید نے جگنو کو بلایا، جگنو نے ایک پرزہ دے کر کہا، مسز ٹنڈن نے یہ کتاب مانگی ہے، مجھے آنے میں دیر ہوگئی، میں اس وقت آپ کو تکلیف نہ دیتی، پر سویرے ہی وہ اسے مانگے گی۔ ہزاروں روپیہ مہینہ کی آمدنی ہے مس صاحبہ! مگر ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑتی ہے۔ ان کے دروازے پر بھکاری کو بھیک تک نہیں ملتی۔"

مس خورشید نے پرزہ دے کر کہا۔ اس وقت تو یہ کتاب نہیں مل سکتی۔ صبح

لے جانا۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ پردہ اٹھا کر کمرے میں چلی گئی۔ وہاں سے کوئی پندرہ منٹ میں ایک خوبصورت سی ساڑی پہنے، عطر میں بسی ہوئی منہ پر پاؤڈر لگائے نکلی۔ جگنو نے ایسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اوہو، یہ سنگار! اس وقت وہ لونڈا آنے والا ہوگا۔ تب ہی یہ تیاریاں ہیں۔ ورنہ سونے کے وقت کنواریوں کو بناؤسنگار کی کیا ضرورت۔ جگنو کی رائے میں عورتوں کے بناؤ سنگار کا صرف ایک مدعا تھا، خاوند کو لبھانا، اس لیے سہاگنوں کے سوا سنگار سب کے لیے منع تھا۔ ابھی خورشید کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ جوتے کی چرمر سنائی دی اورایک منٹ میں ولیم کنگ نے کمرے میں قدم رکھا، اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور کپڑوں سے شراب کی بو آ رہی تھی، وہ مس خورشید سے لپٹ گیا۔ مس خورشید نے اپنے کو اس کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چلو ہٹو، شراب پی کر آئے ہو"۔

ولیم کنگ سے شرابیوں کی طرح کہا۔ "آج تمھیں بھی پلاؤں گا۔"

مس خورشید نے اس طرح جگنو کی موجودگی کا اشارہ کیا کہ جگنو کی نظر پڑ جائے پر کنگ نشہ میں مست تھا، اس نے جگنو کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

مس خورشید نے غصہ سے اپنے کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے چلو ہٹو۔"

کنگ : اتنے دنوں سے چوروں کی طرح آتا ہوں۔ آج سے کھلے خزانے آوں گا؟

"تم تو پاگل ہو رہے ہو، دیکھتے نہیں کمرے میں کون بیٹھا ہوا ہے۔"

کنگ نے حیران ہو کر جگنو کی طرف دیکھا اور جھک کر بولا۔ "یہ بڑھیا کب آئی۔ تو یہاں کیوں آئی بڈھی شیطان کی بچی! یہاں بھید لینے آئی ہے۔ ہم کو بدنام کر نا چاہتی ہے، میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔"

جگنو بلی کی طرح کمرے سے نکلی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ ادھر کمرے سے قہقہے اٹھ اٹھ کر کمرے کی چھت کو ہلانے لگے۔

جگنو اسی وقت مسز ٹنڈن کے گھر پہنچی، اس کے پیٹ میں بلبلے اٹھ رہے تھے۔

مگر مسز ٹنڈن سو گئی تھیں۔ وہاں سے نا اُمید ہو کر اس نے کئی دوسرے گھروں کی کنڈیاں کھٹکھٹائیں، پر کوئی دروازہ نہ کھلا۔ اور غریب کو ساری رات اسی طرح کاٹنی پڑی جیسے کوئی روتا ہوا بچہ گود میں ہو، صبح وہ آشرم میں جا کر کودی۔ کوئی آدھے گھنٹے میں مسز ٹنڈن بھی آئیں۔ اسے دیکھ کر اُس نے منہ پھیر لیا۔

مسز ٹنڈن نے پوچھا۔ ''رات میرے گھر گئی تھیں۔ اس وقت مجھے مہاراج نے کہا۔''

جگنو نے بے پروائی سے کہا۔ ''پیاسا ہی تو کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔ مجھے آگ میں جھونک کر آپ دور ہٹ گئیں۔ بھگوان نے حفاظت کی، ورنہ کل جان ہی گئی تھی۔

مسز ٹنڈن نے بے قراری سے کہا۔ ''کیا ہوا کچھ تو کہو۔ مجھے تم نے جگا کیوں نہ لیا۔ تم جانتی ہو میری عادت جلد سو جانے کی ہے۔''

جگنو : ''مہاراج نے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ جگا کیسے لیتی۔ آپ کو اتنا تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ وہ وہاں گئی ہے تو آتی ہوگی۔ گھڑی بھر بعد سوتیں تو کیا بگڑتا۔ پر آپ کو کسی کی کیا پروا؟''

مسز ٹنڈن : '' تو کیا ہوا، مس خورشید مارنے دوڑیں کیا؟''

جگنو : ''وہ نہیں مارنے دوڑیں۔ ان کا وہ خصم مارنے دوڑا، لال لال آنکھیں نکالے آیا اور مجھ سے کہا، نکل جا۔ میں جب تک نکلی تب تک ہنٹر کھینچ کر دوڑ ہی تو پڑا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر نہ بھاگتی تو کھال ادھیڑ ڈالتا اور وہ رانڈ بیٹھی تماشا دیکھتی رہی۔ دونوں میں پہلے سے سازباز ہوگی۔ ایسی فاحشہ عورت کا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔ بازاری عورت بھی اتنی بے شرم نہیں ہوگی۔''

ذرا دیر میں اور مستورات بھی آ پہنچیں۔ یہ حال سننے کے لیے سب ہی بے قرار تھیں۔ جگنو کی قینچی لگاتار چلتی رہی۔ مستورات کو اس پریم کتھا سے اس قدر لطف حاصل ہورہا تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ ایک ایک بات کو کرید کرید کر پوچھتی تھیں۔ گھر کے کام دھندے بھول گئیں، کھانے پینے کی سدھ نہ رہی، اور ایک بار سن کر ان کا جی نہ بھرتا تھا۔ بار بار وہی سنتی تھیں اور نیا چٹخارہ لیتی تھیں۔ مسز ٹنڈن نے آخر کہا ''اس آشرم میں ایسی عورتوں کا لانا غیرواجب ہے۔ آپ لوگ اس سوال پر غور کریں۔''

مسز پانڈیا نے تائید کی۔ "ہم آشرم کو اپنے معیار سے گرانا نہیں چاہتے، میں تو کہتی ہوں ایسی عورت کسی بھی اسکول کی پرنسپل بننے کے لائق نہیں۔"

مسز پانگڑا نے کہا۔ "جگنو بائی نے ٹھیک کہا تھا۔ ایسی عورت کا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔ اس سے صاف کہہ دینا چاہیے۔ آپ یہاں تشریف نہ لائیں۔"

ابھی یہی کھچڑی پک رہی تھی کہ آشرم کے سامنے ایک موٹر آکر رُکی۔ عورتوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو موٹر میں مس خورشید اور ولیم کنگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جگنو نے منہ پھیلا کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہی لونڈا ہے۔ عورتوں کا سارا جھنڈ چک کے سامنے آنے کے لیے بے چین ہوگیا۔"

مس خورشید نے موٹر سے اتر کر پٹ بند کردیا اور آشرم کے دروازہ کی طرف چلیں۔ مستورات بھاگ بھاگ کر اپنی اپنی جگہ پر آبیٹھیں۔ مس خورشید نے کمرہ میں قدم رکھا، کسی نے استقبال نہ کیا۔ مس خورشید نے بے جھجک نظروں سے جگنو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا، "بائی جی رات آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔"

جگنو نے بہتیری دیدہ دلیر عورتیں دیکھی تھیں۔ پر اس دیدہ دلیری نے اسے حیران کر دیا۔ چور ہاتھ میں چوری کا مال لیے شاہ کو للکار رہا تھا۔

جگنو نے اینٹھ کر کہا۔ "جی نہ بھرا ہو تو اب پٹوا دو۔ سامنے ہی تو ہیں۔"

خورشید : "وہ اس وقت اپنا قصور معاف کرانے آئے ہیں، رات وہ نشے میں تھے۔"

جگنو نے مسز ٹنڈن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اور آپ بھی تو کچھ کم نشہ میں نہیں تھیں۔"

خورشید نے مذاق سمجھ کر کہا۔ "میں نے آج تک کبھی نہیں پی ہے مجھ پر جھوٹا الزام مت لگاؤ۔"

جگنو نے لاٹھی ماردی۔ "شراب بھی بڑے نشے کی چیز ہے کوئی، وہ اسی کا نشہ ان صاحب کو کیوں پردہ میں ڈھانک دیا۔ یہ بھی تو ان کی صورت دیکھتیں۔"

مس خورشید نے شرارت کی "صورت تو ان کی لاکھوں میں ایک ہے"

مسز ٹنڈن نے صاف کہا۔ "نہیں ان کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔ آشرم کو ہم بدنام نہیں کرنا چاہتے۔"

مس خورشید نے ضد کی ”معاملے کو صاف کرنے کے لیے ان کا آپ لوگوں کے سامنے آنا ضروری ہے۔ یک طرفہ آپ فیصلہ کیوں کرتی ہیں۔“

مسز ٹنڈن نے ٹالنے کے لیے کہا۔ ”یہاں کوئی مقدمہ تھوڑا ہی پیش ہے۔“

مس خورشید : ”واہ میری عزت میں بٹا لگایا جا رہا ہے اور آپ کہتی ہیں کوئی مقدمہ نہیں ہے۔ مسٹر کنگ آئیں گے اور آپ لوگوں کو ان کا بیان سننا ہوگا۔“

سوائے مسز ٹنڈن کے سب ہی عورتیں مسٹر کنگ کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں۔ کسی نے اختلاف نہ کیا۔

خورشید نے دروازہ پر آکر اونچی آواز سے کہا تم” ذرا یہاں چلے آؤ۔“

پٹ کھلا اور مس لیلاوتی ریشمی ساڑی پہنے ہوئے مسکراتی نکل آئی۔

آشرم میں سناٹا چھا گیا۔ عورتیں حیران ہو کر لیلاوتی دیوی کو دیکھنے لگیں۔

جگنو نے آنکھیں چمکا کر کہا ”انھیں کہاں چھپادیا آپ نے۔“

خورشید۔ ”وہ چھومنتر سے اڑ گئے جاکر گاڑی میں دیکھو۔“

جگنو لپک کر گاڑی کے پاس گئی اور خوب دیکھ بھال کر منھ لٹکائے ہوئے لوٹی۔

مس خورشید نے پوچھا۔ ”کیا ہوا ملا کوئی؟“

جگنو : ”میں یہ تریا چر تر کیا جانوں (لیلاوتی کو غور سے دیکھ کر کہا) مردوں کو ساڑی پہنا کر آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ یہی تو ہیں وہ رات والے صاحب۔“

خورشید۔ خوب پہچانتی ہو۔“

جگنو : ”ہاں ہاں کیا اندھی ہوں۔“

مسز ٹنڈن ”کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو جگنو، یہ تو ڈاکٹر لیلاوتی ہیں۔“

جگنو: ”(انگلی نچاکر)ارے جاؤ لیلاوتی ہیں، ساڑی پہن کر عورت بنتے لاج بھی نہیں آتی۔ تم رات کو ان کے گھر تھے۔“

لیلاوتی نے مذاق کے لہجہ میں کہا ”میں کب انکار کر رہی ہوں۔ رات کو ولیم کنگ بن جاتی ہوں۔ اس میں بات ہی کیا ہے۔“

مستورات کو سچائی کی روشنی دکھائی دی، چاروں طرف قہقہے بلند ہوئے کوئی تالیاں بجاتی تھی۔ کوئی ڈاکٹر لیلاوتی کی گردن میں لپٹی جاتی تھی۔ کوئی مس خورشید کی

پیٹھ پر تھپکیاں دیتی تھی۔ کئی منٹ تک ہو حق مچا رہا۔ جگنو کا منہ اس روشنی میں بالکل ذرا سا نکل آیا۔ زبان بند ہوگئی۔ ایسا چرکہ اس نے کبھی نہ کھایا تھا۔ اتنی ذلیل کبھی نہ ہوئی تھی۔

مسز مہرا نے ڈانٹ بتائی۔ "اب بولو دائی، لگی منہ پر سیاہی کہ نہیں۔"

مسز بانگڑا۔ "یہ اسی طرح سب کو بدنام کرتی ہے۔"

لیلاوتی۔ "آپ لوگ بھی تو جو یہ کہتی ہے اس پر یقین کر لیتی ہیں۔"

مس خورشید نے کہا۔ "ذرا اس سے پوچھو میرے پیچھے کیوں پڑگئی تھی۔"

مسز ٹنڈن نے پکارا "جگنو کہاں گئی۔"

تلاش ہونے لگی، جگنو غائب۔

اس دن سے پھر کسی نے جگنو کی صورت نہیں دیکھی۔ آشرم کی تاریخ میں یہ معاملہ آج بھی مایۂ تفریح بنا ہوا ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے اگست 1926ء میں شائع ہوا۔ عنوان تھا "لانچھن" اردو میں یہ زاد راہ میں شامل ہے۔)

رام لیلا

(1)

ایک طرف ایک مدت سے رام لیلا دیکھنے نہیں گیا۔ بندروں کے بھدے چہرے لگائے نصف ٹانگوں کا پاجامہ اور سیاہ رنگ کا اونچا کرتہ پہنے آدمیوں کو دوڑتے اور ''ہو ہو''کرتے دیکھ کر اب ہنسی آتی ہے، مزہ نہیں آتا، بنارس کی لیلا زمانہ میں مشہور ہے۔ سنا ہے کہ لوگ اسے دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔ میں بھی بڑے شوق سے دیکھنے گیا مگر مجھے تو وہاں کی لیلا اور کسی بالکل دیہاتی لیلا میں کوئی فرق نظر نہ آیا، ہاں، رام نگر کی لیلا میں کچھ سازوں سامان عمدہ ہے۔ راچھسوں اور بندروں کے چہرے پیتل کے ہیں، گدائیں بھی پیتل کی ہیں۔ شاید بن باسی بھائیوں کے مکٹ سچے کام کے ہوں، لیکن سازو سامان کے سوا وہاں بھی بجز ''ہو ہو '' کے اور کچھ نہیں۔ پھر بھی لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب مجھے بھی رام لیلا میں لطف آتا تھا۔ لطف تو بہت سبک لفظ ہے، وہ لطف دیوانگی سے کم نہ تھا۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت رام لیلا کا میدان میرے مکان سے بہت کم فاصلہ پر تھا۔ اورجس مکان میں لیلاکرنے والوں کا روپ بھرا جاتا تھا وہ تومیرے مکان سے ملا ہوا تھا۔ دو بجے دن سے بناؤ سنگار ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ میں دوپہر ہی سے وہاں جا بیٹھتا اور جس حوصلے سے دوڑ دوڑ کر چھوٹے موٹے کام کرتا اس حوصلہ سے تو آج اپنی پنشن لینے بھی نہیں جاتا۔ ایک کوٹھری میں راجکماروں کا سنگار ہوتا تھا۔ اس کے بدن پر ''رام راج'' (سفیدی) پیس کر لگائی جاتی، چہرے پر پاؤڈر ملا جاتا تھا اور پاؤڈر پر سرخ سبزاور نیلے رنگ کی بندیاں دی جاتی تھیں سارا ماتھا، بھویں، گال اور ٹھوڑی ان بندیوں سے مزین ہو جاتی تھی۔ اس کام میں ایک ہی شخص ہوشیار تھا، وہی باری باری سے تینوں مورتوں کا سنگار کرتا تھا۔ رنگ کی پیالیوں میں پانی لانا ''رام راج'' پیسنا پنکھا جھلنا، میرا کام تھا۔ جب ان ساری تیاریوں کے بعد بوان نکلتا تو اس پررام چندر جی کے پیچھے بیٹھ کر مجھے فخرو مسرت کا

جو احساس ہوتا وہ اب لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی پر بیٹھ کر بھی نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ جب ہوم ممبر صاحب نے کونسل میں میری ایک تجویز کی تائید کی تھی اس وقت مجھے فخر و مسرت کا کچھ ویسا ہی احساس ہوا تھا۔ ہاں ایک مرتبہ جب میرا لڑکا نائب تحصیلداری کے لیے نامزد ہوا اس وقت بھی کچھ اس طرح کے احساس سے دل پھڑک اٹھا تھا۔ مگر ان میں اور اس طفلانہ احساس کے لطف میں بڑا فرق ہے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس میں جنت میں بیٹھا ہوں۔

نکھاو کی ناؤ لیلا کا دن تھا۔ میں دو چار لڑکوں کے بہکانے میں آکر گلی ڈنڈا کھیلنے لگا تھا۔ آج سنگار دیکھنے نہ گیا، بوان بھی نکلا مگر میں نے کھیلنا نہ چھوڑا۔ مجھے اپنا داؤں لینا تھا۔ اپنا داؤں چھوڑنے کے لیے اگر اس سے کہیں زیادہ ایثار کی ضرورت تھی، جتنا میں کر سکتا تھا، اگر داؤں دینا ہوتا تو میں کب کا بھاگ کھڑا ہوتا لیکن داؤں لینے میں کچھ اور ہی بات ہوتی ہے۔ خیر داؤں پورا ہوا اگر میں چاہتا، تو دھوکا دے کر دس پانچ منٹ اور زچ کر سکتا تھا۔ اس کی کافی گنجائش تھی۔ مگر اب اس کا موقع نہ تھا۔ میں سیدھا نالے کی طرف دوڑا، بوان لب آب پہنچ چکا تھا۔ میں نے دور سے دیکھا کہ ملاح کشتی لیے آرہا ہے۔ میں دوڑا، مگر آدمیوں کے بھیڑ میں دوڑنا مشکل تھا۔ آخر جب میں بھیڑ کو ہٹاتا ہوا اور سخت کوشش سے آگے بڑھتا ہوا گھاٹ پر پہنچا تو نکھاو اپنی کشتی کھول چکا تھا۔ رام چندر سے میری کتنی عقیدت تھی۔ میں اپنے سبق کی پرواہ نہ کر کے انھیں پڑھا دیا کرتا تھا کہ وہ فیل نہ ہو جائیں۔ مجھ سے زیادہ عمر والے ہو کر بھی وہ نیچے درجہ میں پڑھتے تھے مگراس وقت وہی رام چندر کشتی میں بیٹھے اس طرح منہ پھیرے چلے جاتے تھے۔ گویا مجھ سے ذرا بھی تعارف نہیں، نقل میں اصل کی کچھ بو باس آ ہی جاتی ہے۔ جن کی چتون بھگتوں کے لیے بھی ہمیشہ تیکھی رہے، وہ مجھ پر کیوں التفات کرتے؟ میں بے قرار ہو کر اس بچھڑے کی طرح کودنے لگا جس کی گردن پر پہلی مرتبہ جوا رکھا گیا ہو۔ کبھی لپک کر نالے کی طرف جانا، کبھی کسی مدد کی تلاش میں پیچھے کی طرف دوڑنا، مگر سب کے سب اسی دھن میں مست تھے۔ میری چیخ و پکار کسی کے کانوں تک نہ پہنچی اس وقت سے بڑی مصیبتیں جھیلیں مگر اس وقت جتنا رنج ہوا اتنا عمر بھر کبھی نہ ہوا تھا۔

میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اب رام چندر جی سے کبھی نہ ملوں گا، نہ کبھی کھانے کی چیز ہی انھیں دوں گا۔ مگر جوں ہی وہ نالے کو پار کر کے پل کی طرف سے لوٹے، میں دوڑ کر بوان پر چڑھ گیا، اور ایسا خوش ہوا کہ گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔

(2)

رام لیلا ختم ہوگئی تھی راج گدی ہونے والی تھی، مگر نہ جانے کیوں دیر ہو رہی تھی، شاید چندہ کم وصولہ ہوا تھا ان دنوں رام چندر جی کی کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ انھیں نہ تو گھر جانے کی اجازت ملتی تھی اور نہ ان کے کھانے پینے ہی کا انتظام ہوتا تھا۔ چودھری صاحب کے یہاں صرف ایک وقت کے کھانے کا سامان کوئی تین بجے دن کو ملتا تھا۔ بقیہ تمام دن کوئی پانی کو نہ پوچھتا تھا لیکن میری عقیدت بھی جیوں کی تیوں برقرار تھی، میری نگاہوں میں وہ اب بھی رام چندر ہی تھے۔ مکان پر مجھے کھانے کی جو چیز ملتی اسے لے کر میں رام چندر ہی کو دے دیتا۔ انھیں کھلانے میں مجھے جو مسرت ہوتی تھی وہ خود کھا لینے میں کبھی نہ ہوتی، کوئی مٹھائی یا پھل پاتے ہی میں بے تحاشا چوپال کی طرف دوڑتا، اگر رام چندر وہاں نہ ملتے تو انھیں چاروں طرف تلاش کرتا اور جب تک وہ چیز انھیں نہ کھلا دیتا مجھے چین نہ آتا۔

خیر راج گدی کا دن آیا۔ رام لیلا کے میدان میں ایک بڑا شامیانہ نصب کیا گیا۔ اس کی خوب آرائش کی گئی۔ طوائفوں کا گروہ بھی آ پہنچا۔ شام کو رام چندر کی سواری نکلی اور ہر دروازے پر ان کی آرتی اتاری گئی اپنی عقیدت کے مطابق کسی نے روپے دیے اور کسی نے پیسے۔ میرے والد پولس کے آدمی تھے پس انھوں نے بلا کچھ پیش کش ہی آرتی اتاری۔ اس وقت مجھے جتنی ندامت محسوس ہوئی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ اس وقت میرے پاس اتفاقاً ایک روپیہ تھا۔ میرے ماموں صاحب دسہرے کے قبل آئے تھے اور مجھے ایک روپیہ دے گئے تھے اس روپیہ کو میں نے رکھ چھوڑا تھا۔ دسہرہ کے دن بھی اسے خرچ نہ کرسکا۔ میں نے فوراً وہ روپیہ لا کر آرتی کی تھالی میں ڈال دیا والد صاحب میرے طرف غضب آمیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئے۔ انھوں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن منہ ایسا بنا لیا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میری اس دیدہ دلیری سے ان کی شان میں فرق آ گیا۔ رات کے دس بجتے بجتے اس طوائف کا خاتمہ

ہوا۔ آرتی کی تھالی روپیوں پیسوں سے بھری ہوئی تھی، ٹھیک تو کہہ نہیں سکتا مگر اب ایسا قیاس ہوتا ہے کہ کل 25-24 روپیوں سے کم نہ تھے۔ چودھری صاحب اس رقم سے کچھ زیادہ ہی خرچ کر چکے تھے۔ انھیں اس کی بڑی بے فکر ہوئی کہ کسی طرح کم از کم دو سو روپیہ اور وصول ہو جاویں اور اس کی بہترین ترکیب انھیں یہ معلوم ہوئی کہ رنڈیوں کے ذریعے محفل میں وصولی ہو۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ جاویں اور محفل کا رنگ جم جاوے تو آبادی جان حسن پرستوں کی کلائیاں پکڑ پکڑ کر ایسے ناز و اداز دکھلائے کہ لوگ شرماتے شرماتے بھی کچھ نہ کچھ دے ہی نکلیں۔ آبادی جان اور چودھری صاحب میں مشورہ ہونے لگا۔ اتفاقاً میں ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا چودھری صاحب نے سمجھا ہوگا یہ لونڈا ابھی کیا سمجھے گا۔ مگر یہاں بفضلہٖ عقل کے پتلے تھے، ساری داستان سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔

چودھری : سنو آبادی جان، یہ تمھاری زیادتی ہے، ہمارا تمھارا پہلا کوئی سابقہ تو ہے نہیں۔ ایشور نے چاہا تو یہاں ہمیشہ تمھاری آمد و رفت ہی رہے گی اب کے چندہ بہت کم آیا ورنہ میں تم سے اس قدر اصرار نہ کرتا۔

آبادی : آپ مجھ سے بھی زمین دارانہ چالیں چلتے ہیں. کیوں؟ مگر یہاں حضور کی دال نہ گلے گی۔ واہ روپے تو میں وصول کروں اور مونچھوں پر تاؤ آپ دیں۔ کمائی کا یہ اچھا ڈھنگ نکالا ہے۔ ایسی کمائی سے تو واقعی آپ تھوڑے دنوں میں بادشاہ ہو جائیں گے، اس کے مقابلہ میں زمینداری جھک مارے گی بس کل ہی سے ایک چکلہ کھول دیجیے، قسم خدا کی مالامال ہو جائے گا۔

چودھری : تم تو مذاق کرتی ہو اور یہاں قافیہ تنگ ہو رہا ہے۔

آبادی : تو آپ بھی تو مجھ سے استادی کرتے ہیں، یہاں آپ جیسے کاہلوں کو روز انگلی پر نچاتی ہوں۔

چودھری : آخر تمھارا منشاء کیا ہے۔

آبادی : جو کچھ وصولی کروں اس میں نصف میرا اور نصف آپ کا۔ لائیے ہاتھ ماریے۔

چودھری : یہی سہی۔

آبادی : اچھا تو پہلے میرے سو روپے گنا دیجیے۔ بعد کو آپ حیلہ سازی کرنے لگیں گے۔

چودھری : واہ۔ وہ بھی لوگی اور یہ بھی۔

آبادی : اچھا کیا آپ سمجھتے تھے کہ اپنی اجرت چھوڑ دوں گی بلہاری آپ کی سمجھ کی، خوب، کیوں نہ ہو دیوانہ بکار خویش ہشیار۔

چودھری : تو کیا تم نے دوگنی فیس لینے کی ٹھانی ہے۔

آبادی : اگر آپ کو سودفعہ غرض ہو تو ورنہ میرے ایک سو روپے تو کہیں گئے نہیں مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے جو لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتی ہوئی پھروں۔

چودھری کی ایک نہ چلی، انھیں آبادی جان سے دبنا ہی پڑا، ناچ شروع ہوا آبادی جان بلا کی شوخ عورت تھی۔ ایک تو کمسن اور اس پر حسین اور اس کی ادائیں تو اس غضب کی تھیں کہ میری طبیعت بھی مست ہوئی جاتی تھی۔ لوگوں کے پہچاننے کا وصف بھی اس میں کچھ کم نہ تھا۔ جس کے سامنے بیٹھ گئی، اس سے کچھ نہ کچھ لے ہی لیا، پانچ روپے سے کم تو شاید ہی کسی نے دیے ہوں۔ والد صاحب کے سامنے بھی وہ جا بیٹھی، میں شرم کے مارے گڑ گیا، جب اس نے کلائی پکری اس وقت تو میں سہم گیا۔ مجھے یقین تھا کہ والد صاحب اس کا ہاتھ جھٹک دیں گے اور شاید اسے پھٹکار بھی دیں۔ مگر یہ کیا ہورہا ہے۔ ایشور میری آنکھیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں؟ والد صاحب مونچھوں میں ہنس رہے تھے۔ ایسی میٹھی ہنسی میں نے ان کے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی۔ ان کی آنکھیں نشہ محبت سے سرشار تھیں ان کا ایک ایک رونگٹا متحرک ہو رہا تھا مگر ایشور نے میری شرم رکھ لی، وہ دیکھو، انھوں نے آہستہ سے آبادی جان کے نازک ہاتھوں سے اپنی کلائی چھڑالی۔ ارے یہ پھر کیا ہوا۔ آبادی تو ان کے گلے میں باہیں ڈالے دیتی ہے۔ اب کے والد صاحب اسے ضرور پیٹیں گے۔ چڑیل کو ذرا بھی حیا نہیں۔

ایک صاحب نے مسکرا کر کہا۔ یہاں تمھاری دال نہ گلے گی، آبادی جان اور دروازہ دیکھو۔

بات تو ان صاحب نے میرے دل کی کہی اور بہت مناسب کہی مگر نہ جانے

کیوں والد صاحب نے ان کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور مونچھوں پر تاؤ دیا۔ منہ سے تو وہ کچھ نہ بولے مگر ان کا بشرہ زبان حال سے غصہ بھرے لفظوں میں کہہ رہا تھا، تو بنیا مجھے سمجھتا کیا ہے؟ یہاں ایسے مواقع پر جان تک نثار کرنے کو تیار ہیں!روپیہ کی تو حقیقت ہی کیا ہے؟ تیرا جی چاہے تو آزما لے۔ تجھ سے دوگنی رقم نہ دے ڈالوں تومنہ نہ دکھلاؤں۔ آہ حیرت، اف غضب، ارے زمین تو شق نہیں ہو جاتی؟ آسمان تو پھٹ کیوں نہیں جاتا؟آہ مجھے موت کیوں نہیں آجاتی؟ والد صاحب جیب میں ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ وہ کوئی چیز نکالی اور سیٹھ جی کو دکھلا کر آبادی جان کو دے دی۔ آہ!یہ تو اشرفی ہے چاروں طرف تالیاں بجنے لگیں۔ سیٹھ جی الّو بن گئے والد صاحب سے منہ کی کھائی۔ یہ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ والد نے ایک اشرفی نکال کر آبادی جان کو دے دی۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت ایسی فخر آمیز خوشی تھی گویا انھوں نے حاتم کی قبر پر لات ماری ہو۔ یہی والد صاحب تو ہیں جنھوں نے مجھے آرتی میں ایک روپیہ ڈالتے دیکھ میری طرف اس طرح دیکھا تھا گویا مجھے پھاڑ ہی کھائیں گے۔ میرے اس بجا اور مناسب برتاؤ سے ان کی شان میں فرق آتا تھا اور اس وقت ایسے نفرت آمیز اور مذموم طرزِ عمل پر وہ فخر مسرت سے جامہ میں پھولے نہ سماتے تھے۔

بی آبادی جان نے ایک دلربانہ تبسم کے ساتھ والد صاحب کو سلام کیا، پھر وہ آگے بڑھی مگر مجھ سے وہاں بیٹھا نہ گیا۔ بار ندامت سے میرا سر جھکا جاتا تھا، اگر میری آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے اس پر کبھی اعتبار نہ ہوتا۔ میں باہر جو کچھ دیکھتا سنتا تھا اس کی خبر والدہ صاحب کے کانوں تک ضرور پہنچا دیتا تھا مگر اس معاملہ کو میں نے ان سے پوشیدہ رکھا۔ میں جانتا تھا انھیں اس بات سے بڑا رنج ہوگا۔

ساری رات گانا ہوتا رہا طبلے کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ چل کر دیکھوں مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں کسی کو منہ کیسے دکھاؤں گا؟ کہیں کسی نے والد صاحب کا تذکرہ کر دیا تو میں کیا کروں گا؟

علی الصباح رام چندر جی کی بدائی (رخصت) ہونے والی تھی، میں پلنگ سے اٹھتے ہی آنکھیں ملتا ہوا چوپال کی طرف بھاگا خوف ہو رہا تھا کہ کہیں رام چندر چلے نہ

گئے ہوں۔ پہنچا تو دیکھا کہ طوائفوں کی سواریاں جانے کے لیے تیار ہیں۔ بیسوں آدمی حسرت بھرے دلوں کے ساتھ ان کے چاروں طرف جمع ہیں میں نے ان کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔ سیدھا رام چندر کے پاس پہنچا لکشمن اور سیتا بیٹھے رو رہے تھے اور رام چندر کھڑے کندھے پر لوٹا ڈور ڈالے انھیں سمجھا رہے تھے میرے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا۔ میں نے مغموم لہجہ میں رام چندر سے پوچھا کیا تمھاری بدائی ہوگئی؟

رام چندر : ہاں ہو تو گئی، ہماری بدائی ہی کیا؟جودھری ہی صاحب نے کہہ دیا، جاؤ۔ چلے جاتے ہیں۔

میں : کیا روپے اور کپڑے نہیں ملے؟

رام چندر : ابھی نہیں ملے چودھری صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت صاحب بچت میں روپے نہیں ہیں پھر آکر لے جانا۔

میں : کچھ نہیں ملا۔

رام چندر : ایک پیسہ بھی نہیں! کہتے ہیں کچھ بچت نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا تھا؛ کچھ روپے مل جائیں گے تو پڑھنے کی کتابیں لوں گا۔ سو کچھ نہ ملا سفر خرچ بھی نہیں دیا۔ کہتے ہیں کون سا دور ہے پیدل چلے جاؤ۔

مجھے ایسا غصہ آیا کہ چل کر چودھری کو آڑے ہاتھوں لوں۔ رنڈیوں کے لیے روپے سواریاں سب کچھ مگر بیچارے رام چندر اور ان کے ساتھیوں کے لیے کچھ بھی نہیں۔ جن لوگوں نے آبادی جان پر دس دس بیس بیس روپے نچھاور کیے تھے۔ ان کے پاس کیا انھیں دینے کے لیے دو دو چار چار آنے پیسے بھی نہیں ہیں۔ والد صاحب نے بھی تو آبادی جان کو ایک اشرفی دی تھی۔ دیکھو ان کے نام پر کیا دیتے ہیں، میں دوڑا ہوا والد کے پاس گیا۔ وہ کہیں تفتیش پر جانے کو تیار کھڑے تھے، مجھے دیکھ کر بولے۔ ”کہاں گھوم رہے ہو؟ پڑھنے کے وقت تمھیں سیر سپاٹے کی سوجھتی ہے؟“

میں نے کہا۔ گیا تھا چوپال، رام چندر رخصت ہو رہے ہیں۔ انھیں چودھری صاحب نے کچھ نہیں دیا۔

والد : تو تمھیں اس کی کیا فکر پڑی ہے۔

میں : وہ جائیں گے کیسے؟ ان کے پاس سفر خرچ بھی تو نہیں ہے۔

والد : کیا کچھ خرچ بھی نہیں دیا۔ یہ چودھری صاحب کی بے انصافی ہے۔

میں : اگر آپ دو روپیہ دے دیں تو میں انھیں دے آؤں، اتنے خرچ سے وہ شاید گھر پہنچ جاویں۔

والد صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ جاؤ اپنی کتاب دیکھو۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔

یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہوگئے۔ اسی روز سے والد صاحب پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا۔ میں نے پھر کبھی، ان کی ڈانٹ ڈپٹ کی پرواہ نہیں کی۔

میرا دل کہتا ہے کہ آپ کو مجھے نصیحت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھے ان کی صورت سے نفرت ہوگئی۔ وہ جو کہتے، میں ٹھیک اس کے بر عکس کرتا۔ اگر چہ اس سے میرا ہی نقصان ہوا مگر اس وقت میرا دل غدارانہ خیالات سے مملو تھا۔

میرے پاس دو آنے پیسے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پیسے اٹھا لیے اور جاکر شرماتے شرماتے رام چندر کو دے دیے ان پیسوں کو دیکھ کر رام چندر کو جتنی خوشی ہوئی وہ میرے لیے امید سے زیادہ تھی۔ ایک دم ٹوٹ گویا پیاسے کو پانی مل گیا۔ وہی دو آنے پیسے لے کر تینوں مورتیں رخصت ہو گئیں، میں تنہا ان کو بڑے گاؤں کے باہر تک پہنچانے گیا۔

انھیں پہنچا کر لوٹا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے مگر دل میں مسرت کا دریا موجزن تھا۔

(یہ مضمون پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ "مادھوری" کے اکتوبر 1926 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سروور 5 میں شامل ہے۔ اردو میں پریم چالیسی میں شامل ہے۔)

دعوت

پنڈت موٹے رام شاستری نے گھر کے اندر جاکر اپنے توند پر ہاتھ پھیرا اور گرج کر کہا:

اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام۔ داس ملوکا کہہ گئے کہ سب کے داتا رام۔

سونا نے مسکرا کر کہا کہ کوئی میٹھی تازی خبر ہے کیا؟

شاستری جی نے پینترا بدل کر کہا۔ مار لیا آج۔ ایسا تاک کر مارا کہ چاروں شانے چت، سارے گھر کا نیوتہ! سارے گھر کا! وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ ماروں گا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں گے۔

سونا نے کہا: کہیں پہلے کی طرح اب بھی دھوکا نہ ہو۔ پکا پوڑھا کر لیا ہے نہ ؟

موٹے رام نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ ایسا اشگون منہ سے نہ نکالو۔ بڑے جپ تپ کے بعد یہ شبھ دن آیا ہے جو تیاریاں کرنی ہیں کر لو۔

سونا: وہ تو کروں گی ہی کیا اتنا بھی نہیں جانتی۔ جنم بھر گھاس تھوڑا ہی کھودتی رہی ہوں مگر دعوت سارے گھر کی ہے نا۔

موٹے رام: اب اور کیسے کہوں۔ پورے گھر بھر کا نیوتہ ہے۔ اس کا مطلب سمجھ میں نہ آیا ہو تو مجھ سے پوچھو۔ عالموں کی بات سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں اگر ان کی بات سب ہی سمجھ لیں تو پھر عالم ہی کیسا! بات یہ ہے کہ مرادپور کی رانی صاحبہ سات برہمنوں کو بھوجن کرانا چاہتی ہیں۔ کون کون مہاشے میرے ساتھ جائیں گے یہ طے کرنا میرا کام ہے۔ جب الگورام شاستری۔ بینی رام شاستری۔ چھیدی رام شاستری۔ بھوانی رام شاستری، پھینکورام شاستری اور پنڈت موٹے رام شاستری اتنے آدمی اپنے گھر ہی میں ہیں تو باہر برہمنوں کو ڈھونڈنے کون جائے۔

سونا: یہ تو کل چھ ہوئے ساتواں آدمی کون ہے؟

موٹے رام: ذرا اپنی عقل دوڑاؤ

سونا: ایک پتّل گھر لیتے آنا۔

موٹے رام: پھر وہی بات کہی جس میں بدنامی ہو۔ چھی چھی پتّل گھر لاؤں۔ کھانا گھر لا کر کھانے میں وہ مزا کہاں جو ججمان کے گھر بیٹھ کر بھوجن کرنے میں ہے۔

سنو ساتویں مہاشے ہیں پنڈت سونا رام شاستری۔

سونا: چلو دل لگی کرتے ہو بھلا میں کہاں جاؤں گی۔

موٹے رام: ایسے ہی مشکل موقعوں پر تو علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ قابل آدمی حالات کو اپنا غلام بنالیتے ہی۔ اور بے وقوف قسمت کا نام لے کر روتے ہیں۔ سونا دیوی اور سونا رام میں کیا فرق ہے؟ صرف ایک پوشاک کا؟ اس ساڑھی کو میری طرح باندھ لو۔ میری مرزائی پہن کر چادر اوپر سے اوڑھ لو۔ پگڑی باندھ دوں گا۔ پھر سونا دیوی سے پنڈت سونا رام بننے میں کیا کسر باقی رہ گئی۔

سونا نے ہنس کر کہا۔ مجھے تو شرم آئے گی۔

موٹے رام: تمھیں کرنا ہی کیا ہے صرف بیٹھی کھاتی رہنا۔ باتیں تو ہم کریں گے۔

سونا نے اپنے دل ہی دل میں مٹھائیوں کا خیال کر کے کہا۔ "بڑا مزہ آئے گا۔"

موٹے رام: بس اب دیر کرنے کا کام نہیں تیاریاں شروع کر دو۔

سونا: کتنی پھنکی بنالوں۔

موٹے رام: یہ میں نہیں جانتا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ رنگ خوب جمے۔

سونا: ہاں ایک بات پوچھنا بھول ہی گئی۔ اپنے پاؤں کے بچھوؤں کو کیا کروں؟

موٹے رام نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ انھیں اٹھا کر رکھ دینا اور کیا کروگی۔

سونا: نہیں، چاہے جو کچھ ہو۔ میں اپنے بچھوے نہ اتاروں گی۔

موٹے رام نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ اچھا پہنے چلو۔ گوبردھن دھاری یہ بیڑا بھی پار لگا دیں گے۔ بس پاؤں میں بہت سے کپڑے لپیٹ لینا۔ میں کہہ دوں گا کہ ان پنڈت جی کو پیل پا کا روگ ہے کیوں کیسی سوجھی؟

سونا نے پرتحسین نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔ جنم بھر پڑھا نہیں ہے۔

(2)

شام کے وقت پنڈت جی نے اپنے پانچوں بیٹوں کو بلایا اور سمجھانے لگے لڑکو!

کوئی کام کرنے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لینا چاہیے کہ کیسے کیا ہوگا۔ اگر رانی صاحبہ تم لوگوں سے پتہ نشان دریافت کریں تو میرا نام ہرگز مت لینا۔ سوچو کتنی شرم و بدنامی کی بات ہے کہ مجھ جیسا وِدوان بھوجن کے لیے اتنا بڑا ڈھونگ رچے۔ تم سب ذرا دیر کے لیے بھول جانا کہ میرے بیٹے ہو۔ سنسار میں ناموں کی کمی نہیں۔ کوئی اچھا سا نام چن کر بتا دینا۔ پتا کا نام بدل دینے سے کوئی گالی نہیں چڑھتی۔

الگورام : آپ ہی کوئی نام بتا دیجیے۔

موٹے رام : اچھی بات ہے سنو۔ الگورام کے پتا کا نام ہے پنڈت کیشو پانڈے خوب یاد کرلو۔ بنی رام پنڈت منگر داد جھا کا بیٹا ہے دیکھو یاد رکھنا۔ چھیدی رام تیرے باپ کا نام دمڑی تیواری۔ دیکھ بھولنا نہیں۔ بھوانی! تو اپنے باپ کا نام گنگوپانڈے بتلانا۔ دیکھ اگر بھولا تو خیر نہیں۔ بیٹا پھینکورام! تم یاد کرلو۔ ستو رام پاٹھک۔ بس اب ٹھیک ہے اچھا میں دوبارہ پوچھتا ہوں۔ الگو تیرے پتا کا نام کیا ہے؟

الگو : پنڈت کیشو پانڈے۔

موٹے رام : ٹھیک ہے اچھا بنی رام تو بتلا۔

بنی رام : دمڑی تواری۔

چھیدی رام : واہ یہ تو میرے باپ کا نام ہے۔

موٹے رام : افسوس پنڈت کا لڑکا ہو کر تو ایک نام بھی یاد نہیں رکھ سکتا۔ تیرے باپ کا نام ہے منگرداد جھا۔ کہہ پچاس مرتبہ منگر داد جھا۔ منگرداد جھا۔

پنڈت موٹے رام شاستری اپنے بیٹوں کا اسی طرح امتحان لے رہے تھے کہ ان کے پیارے دوست چنتا منی جی نے دروازے پر آواز دی۔

پنڈت موٹے رام ایسے گھبرائے کہ سر پیر کی خبر نہ رہی۔ لڑکوں کو بھگانا ہی چاہتے تھے کہ پنڈت چنتا منی گھر کے اندر آگئے۔ دونوں پنڈتوں میں بچپن سے گاڑھی دوستی تھی۔ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ بھوجن کے لیے جایا کرتے تھے۔ لیکن آج موٹے رام چنتا منی کو ساتھ نہ لے جانا چاہتے تھے۔ اگر ان کو ساتھ لے جائیں تو گھر کے ایک آدمی کو چھوڑنا پڑے۔ اس زبردست ایثار کے لیے پنڈت موٹے رام تیار نہ تھے۔

پنڈت چنتا منی نے جو یہ مجمع دیکھا تو کچھ بھانپ کر بولے۔ بھائی اکیلے اکیلے معلوم ہوتا ہے کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے۔

موٹے رام نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔ دوست کیسی باتیں کرتے ہو۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ مجھے کوئی موکا ملا ہو۔ اور میں تم کو اپنے ساتھ نہ لے گیا ہوں۔ معلوم نہیں کہ جمانہ بدل گیا یا کچھ گرہ کا پھیر ہے کہ آج کل تو کوئی جھوٹوں بھی بات نہیں پوچھتا۔

چنتا منی: اچھا تو یہاں لڑکے کیوں جمع ہیں۔

موٹے رام: میں لڑکوں کو پڑھا رہا تھا۔

چنتا منی کو اب بھی یقین نہ آیا پنڈت موٹے رام کے سب سے چھوٹے بیٹے پھیکو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ بیٹا کیا پڑھ رہے ہو؟

موٹے رام نے اس خوف سے کہ بچہ کہیں سارا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ چنتا منی سے کہا اجی یہ کچھ نہیں پڑھتا دن بھر کھیلا کرتا ہے۔

پھیکو رام کے لیے یہ الزام ناقابل برداشت تھا۔ اس نے رو کر کہا پتاجی یوں ہی کہا کرتے ہیں کہ یہ پڑھتا نہیں دن بھر کھیلا کرتا ہے۔ ہم کو تو یاد ہے پنڈت ستیورام پھاٹک۔

موٹے رام نے گھور کر پھیکو رام کی طرف دیکھا اور کہا۔ جا باہر کھیل۔

پھیکو: آپ مجھے کیوں ڈانٹتے ہیں کہیے تو جاتا ہوں پنڈت ستیو رام پاٹھک۔

پنڈت موٹے رام مارے غصہ کے تھر تھر کانپنے لگے۔ پھیکو کو مارنے کے لیے اٹھے۔ مگر چنتا منی نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ یار آخر معاملہ کیا ہے۔

موٹے رام: کچھ نہیں۔ تم کو تو یوں ہی شک ہوتا ہے۔

پنڈت چنتا منی کے شبہ کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ مگر باوجود غور کرنے کے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ستیو رام پاٹھ کے کیا معنی ہیں۔

چنتا منی پنڈت موٹے رام کے مکان سے رخصت ہو کر نکلے پر اس امید سے کہ شاید کچھ پتہ مل جائے اپنے مکان نہ گئے۔ باہر سڑک پر ٹہلتے رہے، اتنے میں پھیکو رام گھر سے باہر نکلا۔ چنتا منی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے پوچھا۔ کہاں نیوتہ ہے بیٹا۔

اتفاق سے کہیں اس بات کی بھنک پنڈت موٹے رام کے کانوں تک پہنچ گئی۔ گھبرا کر باہر نکلے۔ ان کی شکل دیکھتے ہی پنڈت چنتا منی پھیکو کو گود اٹھا کر بھاگے۔ پنڈت موٹے رام سمجھے کہ اب بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہ کہتے ہوئے پنڈت چنتا منی کے پیچھے دوڑے۔ ارے لڑکے کو کیوں لیے جاتے ہو۔ دُشٹ کہیں کا۔ چنتا منی کہے دیتا ہوں کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ پھر کبھی کسی نیوتے میں نہ لے جاؤں گا۔ بھلا چاہتے ہو تو پھینکو کو گود سے اتار دو۔ مگر پنڈت چنتا منی نے ایک نہ سنی بھاگتے ہی چلے گئے۔ پنڈت موٹے رام اسم بامسمّی تھے ان کے لیے ایک قدم دوڑنا بھی مشکل تھا۔ مگر اس وقت بڑی ہمت سے کام لے کر کے بھینسے کی طرح ہانپتے اور کلمات نازیبا بکتے ہوئے چنتا منی کے پیچھے دُلکی چال سے چلے جارہے تھے۔ اتفاق سے پنڈت موٹے رام کی دھوتی ڈھیلی ہوگئی اور وہ الجھ کر گر پڑے۔ چنتا منی نے پیچھے پھر کر یہ حالت دیکھی تو رک گئے اور پھینکو رام سے پوچھا۔ کیوں بیٹا کہاں نیوتہ ہے بتا دو ہم تمھیں مٹھائی دیں گے۔

پھینکو رام : رانی کے یہاں۔

چنتا منی : کہاں کی رانی۔

پھینکو رام : یہ میں نہیں جانتا۔ بس رانی ہیں۔

شہر میں کئی رانیاں تھیں۔ پنڈت جی نے سوچا کہ سب رانیوں کے محلوں کا چکر لگاؤں گا۔ جہاں بھوج ہوگا وہاں ضرور بھیڑ بھاڑ ہوگی۔ بس پتہ مل ہی جائے گا۔ یہ خیال کر کے وہ لوٹ پڑے اور پھینکو کو گود میں لیے پنڈت موٹے رام کے پاس آئے۔ دیکھا تو وہ لیٹے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ گھبرا کر پوچھا۔ دوست گر کیسے پڑے؟ یہاں کہیں گڑھا بھی تو نہیں ہے۔

موٹے رام : تمھیں اس سے کیا مطلب۔ لڑکے کو لے جاؤ اور جو کچھ پوچھنا باقی ہے پوچھ لو۔

چنتامنی : میں یہ کپٹ بیوہار نہیں کرتا۔ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ تم برا مان گئے لے اٹھ بیٹھو۔ یار رام کا نام لے کر میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا۔

موٹے رام : جھوٹ بولتے ہو۔

پنڈت چنتا منی نے جو یہ مجمع دیکھا تو کچھ بھانپ کر بولے۔ بھائی اکیلے اکیلے معلوم ہوتا ہے کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے۔

موٹے رام نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔ دوست کیسی باتیں کرتے ہو۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ مجھے کوئی موکا ملا ہو۔ اور میں تم کو اپنے ساتھ نہ لے گیا ہوں۔ معلوم نہیں کہ جمانہ بدل گیا یا کچھ گرہ کا پھیر ہے کہ آج کل تو کوئی جھوٹوں بھی بات نہیں پوچھتا۔

چنتا منی : اچھا تو یہاں لڑکے کیوں جمع ہیں۔

موٹے رام : میں لڑکوں کو پڑھا رہا تھا۔

چنتا منی کو اب بھی یقین نہ آیا پنڈت موٹے رام کے سب سے چھوٹے بیٹے پھیکو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ بیٹا کیا پڑھ رہے ہو؟

موٹے رام نے اس خوف سے کہ بچہ کہیں سارا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ چنتا منی سے کہا اجی یہ کچھ نہیں پڑھتا دن بھر کھیلا کرتا ہے۔

پھیکو رام کے لیے یہ الزام ناقابل برداشت تھا۔ اس نے رو کر کہا پتا جی یوں ہی کہا کرتے ہیں کہ یہ پڑھتا نہیں دن بھر کھیلا کرتا ہے۔ ہم کو تو یاد ہے پنڈت ستیو رام پھاٹک۔

موٹے رام نے گھور کر پھیکو رام کی طرف دیکھا اور کہا۔ جا باہر کھیل۔

پھیکو : آپ مجھے کیوں ڈانٹتے ہیں کہے تو جاتا ہوں پنڈت ستیو رام پاٹھک۔

پنڈت موٹے رام مارے غصہ کے تھر تھر کانپنے لگے۔ پھیکو کو مارنے کے لیے اٹھے۔ مگر چنتا منی نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ یار آخر معاملہ کیا ہے۔

موٹے رام : کچھ نہیں۔ تم کو تو یوں ہی شک ہوتا ہے۔

پنڈت چنتا منی کے شبہ کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ مگر باوجود غور کرنے کے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ستیو رام پاٹھ کے کیا معنی ہیں۔

چنتا منی پنڈت موٹے رام کے مکان سے رخصت ہو کر نکلے پر اس امید سے کہ شاید کچھ پتہ مل جائے اپنے مکان نہ گئے۔ باہر سڑک پر ٹہلتے رہے، اتنے میں پھیکو رام گھر سے باہر نکلا۔ چنتا منی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے پوچھا۔ کہاں نیوتہ ہے بیٹا۔

اتفاق سے کہیں اس بات کی بھنک پنڈت موٹے رام کے کانوں تک پہنچ گئی۔ گھبرا کر باہر نکلے۔ ان کی شکل دیکھتے ہی پنڈت چنتا منی پھیکو کو گود اٹھا کر بھاگے۔ پنڈت موٹے رام سمجھے کہ اب بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہ کہتے ہوئے پنڈت چنتا منی کے پیچھے دوڑے۔ ارے لڑکے کو کیوں لیے جاتے ہو۔ دُشٹ کہیں کا۔ چنتا منی کہے دیتا ہوں کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ پھر کبھی کسی نیوتے میں نہ لے جاؤں گا۔ بھلا چاہتے ہو تو پھینکو کو گود سے اتار دو۔ مگر پنڈت چنتا منی نے ایک نہ سنی بھاگتے ہی چلے گئے۔ پنڈت موٹے رام اسم بامسمی تھے ان کے لیے ایک قدم دوڑنا بھی مشکل تھا۔ مگر اس وقت بڑی ہمت سے کام لے کر کے بھینسے کی طرح ہانپتے اور کلمات نازیبا بکتے ہوئے چنتا منی کے پیچھے ڈلکی چال سے چلے جارہے تھے۔ اتفاق سے پنڈت موٹے رام کی دھوتی ڈھیلی ہوگئی اور وہ الجھ کر گر پڑے۔ چنتا منی نے پیچھے پھر کر یہ حالت دیکھی تو رک گئے اور پھینکو رام سے پوچھا۔ کیوں بیٹا کہاں نیوتہ ہے بتا دو ہم تمھیں مٹھائی دیں گے۔

پھینکو رام : رانی کے یہاں۔

چنتا منی : کہاں کی رانی۔

پھینکو رام : یہ میں نہیں جانتا۔ بس رانی ہیں۔

شہر میں کئی رانیاں تھیں۔ پنڈت جی نے سوچا کہ سب رانیوں کے محلوں کا چکر لگاؤں گا۔ جہاں بھوج ہوگا وہاں ضرور بھیڑ بھاڑ ہوگی۔ بس پتہ مل ہی جائے گا۔ یہ خیال کر کے وہ لوٹ پڑے اور پھینکو کو گود میں لیے پنڈت موٹے رام کے پاس آئے۔ دیکھا تو وہ لیٹے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ گھبرا کر پوچھا۔ دوست گر کیسے پڑے؟ یہاں کہیں گڑھا بھی تو نہیں ہے۔

موٹے رام : تمھیں اس سے کیا مطلب۔ لڑکے کو لے جاؤ اور جو کچھ پوچھنا باقی ہے پوچھ لو۔

چنتا منی : میں یہ کپٹ بیوہار نہیں کرتا۔ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ تم برا مان گئے لے اٹھ بیٹھو۔ یار رام کا نام لے کر میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا۔

موٹے رام : جھوٹ بولتے ہو۔

چنتا منی : جنیو ہاتھ میں لے کر کہتا ہوں۔
موٹے رام : تم گنگا میں ڈوب کر قسم کھاؤ۔ جب بھی مجھے بشواس نہ آئے۔
چنتا منی : دوسرا یہ بات کہتا تو مونچھ اکھاڑ لیتا۔
موٹے رام : تو پھر آجاؤ۔
چنتا منی : پہلے پنڈتائن سے پوچھ لو۔ ابھی تم کو دس برس تک پڑھانے کا دعویٰ کرتا ہوں۔

پنڈت موٹے رام یہ طعنہ برداشت نہ کرسکے۔ فوراً اٹھ بیٹھے اور پنڈت چنتا منی سے علمی بحث شروع کردی۔ دونوں مہاشے اس زور کے ساتھ ساتھ گرج گرج ہنومان کے اشلوک پڑھ رہے تھے۔ جیسے دو پیپے آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔

موٹے رام : مہابلی بکرم بجرنگی۔
چنتا منی : بھوت پشاچ نکٹ نہ آوے۔
موٹے رام : جے جے ہنومان گسائیں۔
چنتا منی : پربھو رکھیے لاج ہماری

موٹے رام (بگڑ کر) یہ ہنومان چالیسا میں نہیں ہے۔

چنتا منی : یہ ہم نے رچا ہے کیا تمھاری طرح رٹنت ودیا ہے جتنا کہو اتنا رچ دیں۔
موٹے رام : ابے ہم رچنے پر آجائیں تو ایک دن میں ایک لاکھ ودیا رچ ڈالیں۔

دونوں مہاتما اپنی اپنی سخن گوئی کی ڈینگیں مار رہے تھے کہ اتنے میں کسی شخص نے چنتا منی کے گھر جاکر کہہ دیا پنڈت موٹے رام اور پنڈت چنتا منی میں بڑی لڑائی ہورہی ہے۔ پنڈت چنتا منی کے تین بیویاں تھیں۔ ان تینوں کا رعب سارے محلّہ پر چھایا ہوا تھا۔ پنڈت جی نے اپنی بیبیوں کے نام توبہت شیریں رکھے تھے۔ یعنی بڑی بیوی کو "امرتی" منجھلی کو "گلاب جامن" اور چھوٹی کو "موہن بھوگ" کہتے تھے۔ لیکن ان عورتوں کا مزاج اس قدر ترش تھا کہ توبہ بھلی۔ محلّہ کے سب آدمی ان سے ڈرتے تھے۔ لڑائی کی خبر پاتے ہی تینوں بیویاں پنڈت موٹے رام کے مکان کی طرف روانہ ہوئیں۔ چھوٹی بیوی پہلی دو عورتوں کے مقابلے میں کسی قدر دبلی تھی وہ لپک کر جلدی پہنچ گئی اس کی صورت دیکھتے ہی پنڈت موٹے رام کے حواس باختہ ہوگئے۔ سمجھ

گئے اب خیریت نہیں ہے۔ گھبرا کر گھر کی طرف بھاگے۔ چنتامنی نے للکار کر کہا۔
اجی بھاگے کیوں۔ کچھ مجا تو چکھتے جاؤ۔

موٹے رام نے بھاگتے ہوئے جواب دیا۔ میں ہار گیا بھائی۔ ہار گیا۔

(3)

رات کے اٹھ بجے پنڈت موٹے رام نے پوجا پاٹ اور اشنان سے فارغ ہو کر اپنی بیوی سے کہا۔ اب بہت دیر نہ کرنا چاہیے۔ پھنکی تیار ہے نا۔

سونا : پھنکی لیے تو کب سے بیٹھی ہوں۔ تمھیں کسی بات کی بھی سدھ نہیں رہتی۔ رات میں کون دیکھتا ہے کہ کتنی دیر پوجا کرتے ہو۔

موٹے رام : تم سمجھتی نہیں بھوجن کے لیے ہمیشہ دیر میں جانا چاہیے تاکہ ججمان یہ سمجھے کہ پنڈت جی کو یاد نہیں رہا۔ بھول گئے۔ لاؤ تھوڑی پھنکی لڑکوں کو بھی کھلا دیں۔

سونا : انھیں میں نے صبح ہی کھلا دی تھی۔

موٹے رام : کوئی سویا تو نہیں۔

سونا : آج بھلا کون سوئے گا۔ سب بھوک بھوک چلا رہے ہیں۔ میں نے ابھی ایک پیسے کے چنے منگوا دیے۔ سب کے سب اوپر بیٹھے کھا رہے ہیں (دیکھو آپس میں مار پیٹ بھی ہو رہی ہے)

موٹے رام : جی چاہتا ہے تمھاری گردن پکڑ کر اینٹھ دوں۔ بھلا چنے منگوانے کی کیا جرورت تھی۔ جب یہیں کھا لیں گے۔ تو ججمان کے یہاں تمھارا سر کھائیں گے۔

سونا : میں کیا کرتی سب مل کر رو رہے تھے۔

موٹے رام : روتے تھے رونے دیتی۔ رونے سے ان کا پیٹ نہ بھرتا بلکہ اور بھوک کھل جاتی۔

اتنے میں رانی کے ملازم نے دروازے پر آواز دی۔ پنڈت جی مہارانی بلا رہی ہیں۔ اور لوگوں کو بھی ساتھ لے کر جلدی چلو۔

پنڈت جی نے پرغرور نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ دعوت اسے کہتے ہیں۔

اس کے بعد باہر نکل کر رانی کے ملازم سے کہا تم اگر ذرا دیر اور نہ آتے تو میں کتھا سنانے چلا گیا ہوتا۔ مجھے تو بالکل یاد ہی نہیں تھا۔ تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔

(4)

نو بجے کے بعد پنڈت موٹے رام مردانہ لباس میں اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر رانی کے یہاں پہنچے۔ رانی صاحبہ نے پنڈت جی کو اندر بلا کر ان کے چرن چھوئے اور پھر مسکرا کر پوچھا آپ ان بچوں کو کہاں سے پکڑ لائے؟

موٹے رام: کرتا کیا سارا نگر چھان مارا۔ لیکن کسی برہمن نے آنا منظور نہ کیا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہیں۔ بڑی مشکل سے ان پنڈتوں کے لڑکوں کو لے آیا۔ کیوں پھینکو رام تمھارے پتاجی کا کیا نام ہے۔

پھینکو رام: پنڈت ستو رام پھاٹک۔

رانی: یہ بچہ بہت تیز اور ہونہار معلوم ہوتا ہے۔

جب لڑکوں نے دیکھا کہ رانی صا ب پھینکو رام کی تعریف کر رہی ہیں۔ تو انھوں نے بھی بغیر پوچھے ہوئے اپنے اپنے باپوں کے نام سنانا شروع کر دیئے۔

جب سامنے پتّل رکھ دیے گئے۔ اور بھنڈاری چاندی کی تھالی سامان لاکر ایک ایک کے سامنے رکھنے لگا تو پنڈت موٹے رام کو پنڈت چنتا منی کی یاد آئی۔ اگر وہ اس وقت ہوتے، تو خوب رنگ جمتا۔ اب کھانے میں لاگ ڈانٹ کیسے ہوگی۔ کیونکہ جب تک کوئی مقابلہ پر نہ ہو اس وقت تک کھاتے نہیں بنتا۔ سونا دیوی پر یہ خیال ظاہر کیا۔ سونا نے کہا تمھیں آج کیا ہوگیا ہے۔ اس کو کیوں بلانا چاہتے ہو؟

موٹے رام: کوئی ساتھ دینے والا بھی تو چاہیے۔

سونا: کیا میں تم سے کھانے میں دب جاؤں گی؟

موٹے رام: تم جانتی نہیں گھر کی بات اور ہے دنگل کی بات اور۔ اگر چنتا منی اس وقت آگیا تو جھنڈے گاڑ دوں گا؟

یہ کہہ کر پنڈت موٹے رام نے رانی سے کہا: میرے ایک خاص دوست اور بہت بڑے وِدّوان پنڈت چنتا منی جی ہیں۔ اجازت ہو تو ان کو بلا لوں۔ میں ان سے دعوت کے واسطے کہنا بھول گیا۔ ابھی یاد آئی۔

رانی: آپ کی مرضی ہو تو بلا لیجیے۔
موٹے رام: ہاں سرکار ابھی دوڑتا ہوا جاتا ہوں۔
رانی: آپ میری موٹر لے جائیں۔

موٹر تیار ہوئی اور موٹے رام چنتا منی کے گھر روانہ ہوئے۔ پنڈت چنتا منی اپنے صحن میں غمگین بیٹھے ہوئے تھے۔ آج ان کے سب سے بڑے دوست موٹے رام نے ان کے ساتھ بے وفائی کی۔ طرح طرح کے کھانوں کا خیال کر کے ان کی رال ٹپکی پڑ رہی تھی۔ بار بار اپنی بیبیوں سے کہتے۔ اوہو کیا رسیلی امرتیاں ہوں گی۔ اب میوے سے بھرے ہوئے لڈو آئے ہوں گے۔ ہائے موٹے رام اکیلے اکیلے ہی ان کا مزا لے گا۔ اتنے میں موٹے رام نے دروازہ پر پہنچ کر آواز دی۔ چنتا منی کی بڑی بیوی امرتی دیوی نے بگڑ کر کہا۔ "کون داڑھی جار اتنی رات کو جگاوت ہے۔"

موٹے رام: گالی مت دو۔ ارے ہم ہیں ہم۔
امرتی دیوی: ہے تیرے منہ میں جھلسا لگاؤں۔ نگوڑے۔ کہتا ہے ہم ہیں، ہم کو جانے تیں کون ہے۔
موٹے رام: ارے ہماری آواز نہیں پہچانتی۔ ہم ہیں ہم تمھارے دیور ہیں۔
امرتی: دور یہاں سے۔ تور لہاس (لاش) اٹھے۔ ہمارا دیور بنت ہے۔
موٹے رام: ہم ہیں ہم۔ تمھارے دیور پنڈت موٹے رام شاستری۔

امرتی دیوی نے دروازہ کھولا۔ اور موٹے رام سے کہا۔ ارے تم تھے اپنا نام پہلے نہ بتایا۔ جب اتنی گالیاں کھائیں تب بول نکلا۔

موٹے رام: چنتا منی دوست چلو۔ تم کو لینے آیا ہوں۔ رانی صاحبہ کے یہاں دعوت ہے۔
چنتامنی: جب تو نہ لے گئے اب جب بھوجن ہو چکا تو زخموں پر نمک چھڑکنے آئے ہیں۔
موٹے رام: نہیں یار ابھی بھوجن نہیں ہوا۔ میں تم کو لینے آیا ہوں۔ جلدی کرو آج تمھیں بدکر پچھاڑوں گا۔
چنتامنی: تم بے چارے مجھے کیا پچھاڑو گے سارے شہر میں تو کوئی ایسا مائی کا لال ہے نہیں۔

موٹے رام : اجی یہاں برسوں محنت کی ہے بھنڈارے کا بھنڈارا صاف کر دیں اور پھر
بھی کھانے کی خواہش باقی رہے بس یہی سمجھ لو کہ ہم کھانے کے بعد آج
تک کبھی کھڑے نہ ہو سکے جب گھر آئے گاڑی پر لد کر۔

چنتامنی : تو یہ کون بڑی بات ہے، ہم تو ہمشیہ مردے کی طرح ٹکٹکی پر اٹھا کر لائے
جاتے ہیں۔ ایسی ایسی ڈکاریں لیتے ہیں۔ جیسے بم کا گولہ چھوٹ رہا ہو ایک بار
خفیہ پولس نے اسی شبہ میں ہمارے گھر کی تلاشی بھی لی تھی۔

موٹے رام : جھوٹ بولتے ہو اس طرح کوئی ڈکار نہیں لے سکتا۔

چنتامنی : اچھا تو آکر سن لینا۔ ڈر کر بھاگ نہ جاؤ تو سہی۔

(5)

موٹررانی کے محل کے سامنے رکی اور دونوں مہاتما اترے۔ اب ہر ایک کو یہی فکر تھی کہ پہلے میں رانی صاحبہ کے سامنے جا کر اپنا رنگ جمالوں۔ دونوں قدم بڑھانے لگے۔ چنتا منی ہلکے ہونے کے سبب ذرا آگے بڑھ گئے تو پنڈت موٹے رام دوڑنے لگے۔ چنتا منی بھی دوڑ پڑے۔ آخر میں موٹے رام نے ہانپتے ہوئے کہا۔ یار، ٹھہر جاؤ۔ میرے پاؤں میں کانٹا لگ گیا ہے۔

چنتا منی : تو نکال لو۔ جب تک میں چلتا ہوں۔

موٹے رام نے بہت بہانے کیے۔ مگر چنتا منی نے ایک نہ سنی اور رانی صاحبہ
کے کمرے کے اندر پہنچ کر دم لیا۔

رانی صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں پنڈت جی نے سامنے پہنچ کر آواز لگائی۔

ہے ہے جسو دے تو بال کیشو مرارنا ما

رانی : کون ہے کیا مطلب ہے؟

چنتامنی : حضور میں ہوں پنڈت چنتامنی آپ نے مجھے بھوجن کے واسطے بلایا ہے۔

رانی : آپ ہی پنڈت چنتا منی ہیں۔ اچھا پنڈت موٹے رام شاستری کہاں رہ گئے؟

چنتامنی : سرکار وہ پیچھے آرہا ہے بھلا میرے برابر چل سکتا ہے۔ وہ تو میرا شاگرد ہے۔

رانی : اچھا تو وہ آپ کے شاگرد ہیں۔

چنتامنی : حضور میں کس منہ سے کہوں۔ برہمن کو خاکساری چاہیے۔ میرے سب

چیلے میرے گورو ہیں۔

اتنے میں پنڈت موٹے رام بھی ہانپتے ہوئے پہنچ گئے۔ رانی صاحبہ دونوں پنڈتوں کو اپنے ہمراہ لے کر کمرے سے باہر نکلیں۔ بھنڈاری نے سامان نکالنا شروع کیا۔ سونا دیوی اور اس کے بچے مارے بھوک کے بیتاب ہورہے تھے۔ چنتا منی نے رامائن کی چوپائیوں کا پاٹ شروع کیا۔ موٹے رام نے بہت کچھ ذہن دوڑایا۔ لیکن بھوک کی شدّت میں کوئی اشلوک یا کوئی منتر یاد نہ آیا۔ مجبور ہو کر وہ "رام بھج۔ رام بھج رام بھج رے من۔" اونچے سروں میں الاپنے لگے۔ چنتا منی کو بھی اب اپنی آواز بلند کرنی پڑی۔ موٹے رام نے بھی اور زور سے گرجنا شروع کیا۔ اتنے میں بھوگ کی تیاری ہوئی۔ نوکر چاکر مستعد ہوگئے۔ کسی نے گھنٹہ لیا، کسی نے گھڑیال کسی نے سنکھ کسی نے کرنال پنڈت چنتا منی نے لپک آرتی اٹھالی۔ موٹے رام دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ رانی کے پاس پہنچنے کا موقعہ ان کو نہ ملا۔ آرتی ختم ہوئی۔ پنڈت چنتامنی اور رانی صاحبہ کے درمیان کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ بھوجن شروع ہونے ہی کو تھا کہ رانی صاحبہ کا کتا رسوئی میں گھس گیا۔ پنڈت موٹے رام کے پیر تلے زمین نکل گئی۔ رانی صاحبہ نے کہا۔ بائیں یہ کتا کیسے چھوٹ گیا۔ افسوس ساری محنت اکارت ہوئی۔ اب تو رسوئی بھرسٹ ہوگئی۔

موٹے رام : سرکار کوئی ہرج نہیں ہے۔

سونا : جاگتے جاگتے آدھی رات گزر گئی اب یہ مصیبت پڑی۔

موٹے رام : اچھا تو ہم لوگ جاتے ہیں۔

رانی : ہاں تو اور کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ سب کو بیکار تکلیف ہوئی۔ اس کتے نے سارا کام بگاڑ دیا۔ بھنڈاری سارا سامان بھنگی کو دے دو۔ مگر ہاں یہ دو بچے بہت چھوٹے ہیں یہ کیوں بھوکے رہیں۔ تھوڑا سامان موجود ہے۔ وہ ان کو کھلا دینا چاہیے پھینکو رام مٹھائی کھاؤ گے؟

پھینکو : اور پھر آئے کس لیے تھے۔

رانی : اچھا سچ سچ بتاؤ۔ تمھارے باپ کا کیا نام ہے نہیں تو مٹھائی نہیں ملے گی۔

موٹے رام : اب جانے دیجیے مجھ کو دیر ہوتی ہے۔

چنتا منی : کیا ہرج ہے نام پوچھ لینے دو۔
موٹے رام : تم چپ رہو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔
رانی : آپ اتنا غصہ کیوں کرتے ہیں۔ نام پوچھنے میں بھی کوئی برائی ہے۔ ہاں ہاں
پھینکو رام اپنے باپ کا نام سچ سچ بتاؤ۔ پھر بہت سی مٹھائی کھانے کو دیں گے۔
بتا دو بیٹا بتا دو۔ ورنہ مٹھائی نہیں ملے گی۔

پھینکو رام نے آہستہ سے کوئی نام لیا۔ اس پر پنڈت موٹے رام نے بہت زور سے ڈانٹا۔

رانی : آپ بچے کو کیوں ڈانٹتے ہیں۔
موٹے رام : یہی تو زمانے میں آگ لگ گئی ہے کہ برہمنوں کو اپنے دروازہ پر بلا کر
ذلیل کیا جاتا ہے۔
چنتامنی : اس میں کیا بات ذلت کی ہے۔
موٹے رام : بس چپ رہنا۔ ورنہ سارا غصہ تم پر اترے گا۔ ماتا پتا کا تو پتہ نہیں۔
برہمن بن کر بیٹھے ہیں۔
چنتامنی : جو من چاہے کہہ لو۔ میں برہمن نہیں شُدر ہوں۔ مگر تم تو برہمن ہو جو
اپنے دھرم کی باتیں بھی نہیں جانتے۔ برہمن کا پہلا فرض غصہّ کو روکنا ہے۔
موٹے رام : ابے تو پیٹ کا غلام ہے۔
چنتامنی : کہہ تو دیا بھائی تم بڑے میں چھوٹا۔ تمھارے دروازہ کا میں کتا ہوں اور کچھ
کہو گے۔
رانی : پنڈت چنتا منی جی ایسا نہ کہیے۔ آپ بہت بزرگ ہیں۔ اتنے سخت کلمے سننے پر
بھی آپ کو غصہ نہیں آتا۔

پنڈت موٹے رام یہ کہہ کر ''اچھا چنتا منی سمجھوں گا۔ اپنے بچوں کے ہمراہ بھوکے پیاسے مکان کو واپس ہوئے۔

پنڈت موٹے رام اپنی قسمت کو کوستے ہوئے جارہے تھے۔ وہاں پنڈت چنتا منی کے پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ آسن مارے ترمال اڑا رہے تھے۔ رانی صاحبہ اپنے ہاتھ سے مٹھائیاں پروس رہی تھیں۔ اتنے میں چنتا منی نے ڈکار لے کر کہا۔

"سرکار نے دیکھا کتنا بے شرم آدمی ہے۔ اپنی عورت تک کو مردانے کپڑوں میں لے آیا۔ "

مگر آج میں نے بھی ایسا سبق دیا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔

چنتا منی نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔ سرکار کی بدھی کو دھنیہ ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی ماہنامہ سرسوتی کے نومبر 1926 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا 'نمنترن'۔ یہ مان سرودر 5 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ خاک پروانہ میں شامل ہے۔)

دینداری

(1)

دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی کے نوکر نہ ہوتے ہوئے سب کے نوکر ہوتے ہیں۔ جنھیں کوئی اپنا خاص کام نہ ہونے پر بھی سر اٹھانے کی فرصت نہیں ہوتی، جادو اسی قسم کے آدمیوں میں سے تھا، بالکل بے فکر نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے دشمنی، جو ذرا ہنس کر بولا اس کا غلام بے دام ہوگیا۔ بے دام کا کام کرنے میں اسے لطف آتا تھا۔ گاؤں میں کوئی بیمار پڑے، وہ بیمار کی تیمار داری کرنے کے لیے حاضر ہے، کہیے تو آدھی رات کو حکیم کے گھر چلا جاوے، کسی جڑی بوٹی کی تلاش میں منزلوں کی خاک چھان آوے۔ ممکن نہ تھا کہ وہ کسی غریب پر ظلم ہونا دیکھے اور خاموش رہ جائے پھر خواہ اسے کوئی مار ہی ڈالے، وہ حمایت سے باز نہ آتا تھا ایسے صدہا معرکے اس کے سامنے آچکے تھے۔ کانسٹبلوں سے رات دن اس کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی، اسی لیے لوگ اس کو احمق سمجھتے تھے اور بات بھی یہی تھی۔ جو آدمی کسی کا بھاری بوجھ دیکھ کر اس سے چھین کر اپنے سر پر لے لے۔ کسی کا چھپر اٹھانے یا آگ بجھانے کے لیے کوسوں دوڑا چلا جاوے اسے سمجھدار کون کہے گا؟ خلاصہ یہ کہ اس کی ذات سے دوسروں کو خواہ کتنا ہی نفع پہنچے، اسے خود کوئی نفع نہ پہنچتا تھا حتیٰ کہ دو روٹیوں کے لیے بھی دوسروں کا محتاج تھا۔ دیوانہ تو وہ تھا اور اس کا غم دوسرے لوگ کھاتے تھے۔

(2)

آخر جب لوگوں نے بہت لعنت ملامت کی، کیوں اپنی زندگی خراب کر رہے ہو؟ تم دوسروں کے لیے مرتے ہو، کوئی تمھارا پرسان حال بھی ہے؟ اگر ایک روز بیمار پڑجاؤگے تو کوئی چلو بھر پانی نہ دے۔ جب تک لوگوں کی خدمت کرتے ہو، لوگ خیرات سمجھ کر کھانے کو دے دیتے ہیں۔ جس دن آپڑے گی کوئی سیدھے منہ بات نہ کرے گا۔ تب جادو کی آنکھیں کھلیں برتن وغیرہ کچھ تھے ہی نہیں، وہ ایک روز اٹھا اور

کسی طرف چل نکلا۔ دو روز بعد ایک شہر میں جا پہنچا۔ شہر بہت بڑا تھا۔ محل آسمان سے باتیں کرنے والے، سڑکیں کشادہ اور صاف بازار پررونق مسجدوں اور مندروں کی تعداد اگر مکانات سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھی۔ دیہات میں نہ تو کوئی مسجد تھی نہ کوئی مندر تھا۔ مسلمان ایک چبوترے پر نماز پڑھ لیتے تھے اور ہندو ایک درخت کی جڑ میں پانی ڈال دیتے تھے شہر میں مذہب کا یہ دور دورہ دیکھ کر جامد کی مسرت و حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کی نگاہوں میں مذہب کی جتنی عزت تھی اتنی اور کسی دنیاوی شے کی نہ تھی۔ وہ سوچنے لگا یہ لوگ کتنے باایمان اور راست باز ہیں، ان میں کتنا رحم، کتنی دانائی اور کتنی ہمدردی ہوگی۔ جب ہی تو خدا نے انھیں اتنی خوشحالی بخشی ہے۔ وہ ہر آنے جانے والے کو عقیدت مند نگاہوں سے دیکھتا اور اس کے آگے ادب سے سر جھکاتا تھا۔ یہاں کے سبھی لوگ اسے فرشتہ صفت معلوم ہوتے تھے۔

گھومتے گھومتے شام ہوگئی۔ وہ تھک کر ایک مندر کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ مندر بہت بڑھا تھا، اوپر ایک سنہرا کلس چمک رہا تھا۔ جگت پر سنگ مرمر کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ مگر صحن میں جا بجا گوبر اور کوڑا پڑا تھا جامد کو گندگی سے نفرت تھی۔ مندر کی یہ حالت دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ کہیں جھاڑو مل جائے تو صاف کردوں مگر جھاڑو کہیں نظر نہ آیا، ناچار ہو کر اس نے اپنے دامن سے چبوترے کو صاف کرنا شروع کردیا۔

زار دیر میں بھگتوں کا مجمع ہونے لگا۔ انھوں نے جامد کو چبوترہ صاف کرتے دیکھا تو آپس میں گفتگو کرنے لگے۔

"ہے تو مسلمان!"

"مہتر ہوگا"

"نہیں، مہتر اپنے دامن سے صفائی نہیں کرتا، کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔

"ادھر کا جاسوس نہ ہو!"

"نہیں، چہرے سے تو بڑا غریب معلوم ہوتا ہے۔

"حسن نظامی کا کوئی مرید ہوگا"

"اجی گوبر کے لالچ سے صفائی کر رہا ہے۔ کوئی بھٹیارہ ہوگا (جامد سے) گوبر

مت لے جانا ہے، سمجھا! کہاں رہتا ہے۔ ؟"

"پردیسی مسافر ہوں، صاحب! مجھے گوبر لے کر کیا کرنا ہے؟ ٹھاکر جی کا مندر دیکھا تو آکر بیٹھ گیا، کوڑا پڑا ہوا تھا، میں نے سوچا دھرماتما لوگ آتے ہیں صفائی کرنے لگا۔

"تم تو مسلمان ہو نہ ؟"

"ٹھاکر جی تو سب کے ٹھاکر جی ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان"

"تم ٹھاکر جی کو مانتے ہو؟"

"ٹھاکر جی کو مانتے ہو؟"

"ٹھاکر جی کو کون نہ مانے گا، صاحب۔ جس نے پیدا کیا اسے نہ مانوں گا تو کسے مانوں گا۔ "

بھگتوں میں مشورہ ہونے لگا:۔

"دیہاتی ہے"

"پھانس لینا چاہیے، جانے نہ پاوے"

(3)

جاہد پھانس لیا گیا، اس کی آؤ بھگت ہونے لگی۔ ایک ہوا دار مکان رہنے کو ملا، دونوں وقت عمدہ کھانا ملنے لگا، دو چار آدمی ہر وقت اس کے پاس موجود رہتے۔ جاہد کو بھجن خوب یاد تھے۔ آواز بھی دلکش تھی، روزانہ مندر میں جاکر بھجن گاتا۔ عقیدت کے ساتھ خوش الحانی بھی ہو تو پھر کیا پوچھنا؟ لوگوں پر اس کے گانے کا بڑا اثر پڑتا، کتنے ہی لوگ گانا سننے ہی کے لالچ سے مندر آنے لگے۔ سب کو یقین ہو گیا کہ بھگوان نے یہ شکار چن کر بھیجا ہے ایک روز مندر میں بہت سے آدمی جمع ہوئے۔ صحن میں فرش بچھایا گیا۔ جاہد کا سر منڈوا دیا گیا اسے نئے کپڑے پہنائے گئے، ہوم ہوا۔ جاہد کے ہاتھوں سے شیرینی تقسیم کرائی گئی وہ اپنے مددگاروں کی سخاوت و عقیدت کا اور بھی قائل ہو گیا یہ لوگ کتنے شریف ہیں، مجھ جیسے پھٹے حال پردیسی کی اتنی خاطر و مدارات، اسی کو سچا مذہب کہتے ہیں۔ جاہد کو زندگی میں کبھی اتنا اعزاز نہ ملا تھا۔ یہاں وہی ہرزہ گرد نوجوان جسے لوگ احمق کہتے تھے۔ بھگتوں کا سردار بنا ہوا تھا،

صدہا آدمی صرف اس کے درشن کو آتے تھے۔ اس کی زبردست علیت کی کتنی ہی داستانیں رائج ہو گئیں، اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک بہت بڑے عالم مولوی کی شدھی ہوئی ہے، سیدھا سادھا جامد اس اعزاز کے راز کو بالکل نہ سمجھا تھا، ایسے دیندار اور ہمدرد لوگوں کی خاطر وہ کیا کچھ نہ کرتا؟ وہ روزانہ پوجا کرتا، بھجن گاتا، اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی، اپنے گاؤں میں بھی وہ برابر ست نارائن کی کتھا میں بیٹھا کرتا تھا۔ بھجن کیرتن کیا کرتا تھا۔ فرق یہی تھا کہ دیہات میں اس کی قدر نہ تھی۔ یہاں سب اس کے معتقد تھے۔

ایک روز جامد کئی بھگتوں کے ساتھ بیٹھا ہوا کوئی پران پڑھ رہا تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سڑک پر ایک طاقتور نوجوان پیشانی پر تلک لگائے اور گلے میں جنیو پہنے ایک بوڑھے کمزور آدمی کو مار رہا ہے بوڑھا روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے اور پیروں پڑ پڑ کر کہتا ہے کہ مہاراج میرا قصور معاف کرو مگر نوجوان کو اس پر ذرا بھی رحم نہیں آتا، جامد کا خون اُبل پڑا، ایسا منظر دیکھ کر وہ خاموش نہ بیٹھ سکتا تھا۔ وہ فوراً کود کر باہر نکلا اور اس جوان کے پاس جا کر بولا۔ اس بوڑھے کو کیوں مارتے ہو بھائی، تمھیں اس پر ذرا بھی رحم نہیں آتا؟

نوجوان : میں مارتے مارتے اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔

جامد : آخر اس نے کیا قصور کیا ہے؟ کچھ معلوم تو ہو۔

نوجوان : اس کی مرغی ہمارے گھر میں گھس گئی تھی جو سارا مکان گندہ کر آئی۔

جامد : تو کیا اس نے مرغی کو سکھا دیا تھا کہ تمھارا گھر گندہ کر آئے؟

بوڑھا : خداوند! میں تو اسے برابر کھانچے میں ڈھانکے رکھتا ہوں آج غفلت ہوگئی، کہتا ہوں، مہاراج! قصور معاف کرو مگر نہیں سنتے۔ حضور مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔

نوجوان : ابھی نہیں مارا ہے، اب ماروں گا، کھود کر گاڑ دوں گا۔

جامد : کھود کر گاڑ دوگے بھائی صاحب، تو تم بھی یوں نہ کھڑے رہوگے۔ سمجھ گئے؟ اگر پھر ہاتھ اٹھایا تو خیریت نہیں۔

جوان کو اپنی طاقت کا نشہ تھا اس نے پھر بوڑھے کو طمانچہ لگایا۔ مگر طمانچہ

پڑنے کے پہلے ہی جامد نے اس کی گردن پکڑ لی، دونوں میں کشتی ہونے لگی جامد مضبوط جوان تھا، اس نوجوان کو اٹھا کر پٹک دیا تو چاروں شانہ چت گر گیا اس کا گرنا تھا کہ بھگتوں کا مجمع جو اب تک مندر میں بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا، دوڑ پڑا اور جامد پر چاروں طرف سے چوٹیں پڑنے لگیں۔ جامد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ مجھے کیوں مار رہے ہیں، کوئی کچھ نہیں پوچھتا اس تلک لگائے ہوئے نوجوان کو کوئی کچھ نہیں کہتا' بس جو آتا ہے' مجھی پر ہاتھ صاف کرتا ہے آخر وہ بیدم ہوکر زمین پر گر پڑا، اس وقت لوگوں میں باتیں ہونے لگیں:-

" دغا دے گیا-"

دھت تیری ذات کی! ان ملیچھوں سے بھلائی کی امید نہ رکھنی چاہئے کوا کوؤں ہی کے ساتھ ملے گا، کمینہ جب کرے گا، کمینہ پن! اسے کوئی پوچھتا نہ تھا مندر میں جھاڑو لگا رہاتھا، بدن پر کپڑے کا تار بھی نہ تھا، ہم نے اس کی اتنی عزت کی، جانور سے آدمی بنا دیا، پھر بھی اپنا نہ ہوا-"

"ان کے مذہب کی تعلیم ہی یہی ہے؟"

جامد رات بھر سڑک کے کنارے پڑا ہوا شدت درد سے کراہتا رہا اسے مار کھانے کا غم نہ تھا، ایسی تکلیفیں وہ کتنی دفعہ اٹھا چکا تھا' اسے رنج و تعجب صرف اس امر کا تھا کہ ان لوگوں نے کیوں ایک دن میری اس قدرعزت کی اور کیوں آج بلا وجہ میری اتنی درگت بنائی؟ ان کی وہ شرافت آج کہاں گئی؟ میں تو وہی ہوں، میں نے کوئی قصور بھی نہیں کیا، میں نے تو وہی کیا جو ایسی حالت میں سبھی کو کرنا چاہئے۔ پھر ان لوگوں نے مجھ پر کیوں اتنا ظلم کیا؟فرشتے کیوں شیطان بن گئی؟

وہ رات بھر اسی الجھن میں پڑا۔ علی الصباح اٹھ کر ایک طرف کی راہ لی۔

(4)

جامد ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ وہی بڈھا اسے ملا اس کو دیکھتے ہی وہ بولا: قسم خدا کی، تم نے کل میری جان بچالی، سنا، ظالموں نے تم کو بری طرح پیٹا۔ میں تو موقع پاتے ہی نکل بھاگا، تم اب تک کہاں تھے؟ یہاں لوگ رات ہی سے تم سے ملنے کے لیے بیقرار ہورہے ہیں، قاضی صاحب رات ہی میں تمھیں کھوجنے نکلے تھے۔ مگر

تم نہ ملے' کل ہم دونوں تنہا پڑگئے تھے' دشمنوں نے ہمیں پیٹ لیا' نماز کا وقت تھا' یہاں سب لوگ مسجد میں تھے اگر ذرا بھی خبر ہو جاتی تو ایک ہزار لٹھ بند پہنچ جاتے اس وقت آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا قسم خدا کی' آج سے میں نے تین کوڑی مرغیاں پالی ہیں' دیکھوں پنڈت جی مہاراج اب کیا کرتے ہیں، قسم خدا کی، قاضی صاحب نے کہا کہ اگر وہ لونڈا ذرا بھی آنکھیں دکھلادے تو تم مجھ سے کہنا، یا تو بچّہ گھر چھوڑ کر بھاگیں گے یا ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دی جاوے گی۔

جامد کو لیے ہوئے وہ بڈھا قاضی زور آور حسین کے دروازہ پر پہنچا قاضی صاحب وضو کر رہے تھے، جامد کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے لگا لیا اور بولے: اللہ تمھیں آنکھیں ڈھونڈ رہی ہے، تم نے کل تنہا اتنے آدمیوں کے دانت کھٹے کر دیے کیوں نہ ہو، مومن کا خون ہے! کافروں کی حقیقت کیا؟ سنا کہ سب کے سب تمھاری شدھی کرنے جارہے تھے مگر تم نے ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے، اسلام کو ایسے ہی خادموں کی ضرورت ہے، تمھیں جیسے دینداروں سے اسلام روشن ہے، غلطی یہی ہے کہ تم نے ایک مہینہ بھر تک صبر نہیں کیا شادی ہوجانے دیتے تب مزہ آتا، ایک نازنین ساتھ لاتے اور دولت مفت واللہ تم نے عجلت کردی،

دن بھر عقیدت مندوں کا تانتا لگا رہا، جامد کو ایک نظر دیکھنے کا سب کو شوق تھا سبھی اس کی ہمت، طاقت، اور اس کے مذہبی جوش کی تعریف کرتے تھے۔

(5)

ایک پہر رات جاچکی تھی' مسافروں کی آمدو رفت کم ہوچکی تھی، جامد نے قاضی صاحب سے مذہبی کتاب پڑھنا شروع کیا- انھوں نے اس کے لیے اپنی بغل کا کمرہ خالی کر دیا تھا، وہ قاضی صاحب سے سبق لے کر آیا اور سونے جارہا تھا کہ دفعتاً اسے دروازے پر تانگے کے رکنے کی آواز سنائی دی، قاضی صاحب کے مرید اکثر آیا کرتے تھے، جامد نے سوچا کوئی مرید آیا ہوگا نیچے آیا تو دیکھا کہ ایک عورت تانگے سے اتر کر برآمدے میں کھڑی ہے اور تانگہ والا اس کا اسباب اُتار رہا ہے۔

عورت نے مکان کو ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ نہیں جی۔ مجھے خوب خیال ہے ان کا مکان یہ نہیں ہے، شاید تم بھول گئے ہو۔

تانگے والا : حضور تو مانتی ہی نہیں، کہہ دیا کہ بابو صاحب نے مکان بدل دیا ہے، اوپر چلیے۔

عورت نے جھجکتے ہوئے کہا۔ بلاتے کیوں نہیں؟ آواز دو۔

تانگے والا : اُو صاحب، آواز کیا دوں؟ جب جانتا ہوں، صاحب کا یہی مکان ہے تو فضول چلّانے سے کیا فائدہ؟ بچارے آرام کر رہے ہوں گے آرام میں خلل پڑے گا۔ آپ مطمئن رہیے، چلیے، اوپر چلیے۔

عورت اوپر چلی، پیچھے پیچھے ٹانگے والا اسباب لیے ہوئے چلا۔ جامد حیرت زدہ نیچے کھڑا رہا، یہ راز اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

تانگے والے کی آواز سنتے ہی قاضی صاحب چھت پر نکل آئے اور ایک عورت کو آتے دیکھ کر کمرے کی کھڑکیاں چاروں طرف سے بند کرکے کھونٹی سے لٹکی ہوئی تلوار اتارلی اور دروازے پر آکر کھڑے ہوگئے۔

عورت نے زینہ طے کر کے جیوں ہی چھت پر قدم رکھا کہ قاضی صاحب کو دیکھ کر جھجکی، وہ فوراً پیچھے کی طرف مڑنا چاہتی تھی کہ قاضی جی نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے کمرے میں گھسیٹ لائے۔ اسی اثنا میں جامد اور یہ تانگے والا یہ دونوں بھی اوپر آگیے تھے' جامد یہ نظارہ دیکھ کر متحیر ہوگیا تھا۔ راز اور بھی نا قابل فہم ہوگیا تھا یہ علم کا سمندر یہ انصاف کا مخزن، یہ شریعت، مذہب اور فلسفہ کا معدن اس وقت ایک ناآشنا عورت پر ظلم وتشدد کر رہا ہے۔ تانگہ والے کے ساتھ وہ بھی قاضی صاحب کے کمرہ میں چلا گیا۔ قاضی صاحب تو عورت کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھے تانگہ والے نے دروازہ بند کردیا۔

عورت نے تانگہ والے کی طرف خونیں نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تو مجھے یہاں کیوں لایا؟

قاضی نے تلوار چمکا کر کہا، پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ، سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔

عورت : تم تو مجھے کوئی مولوی معلوم ہوتے ہو کیا تمھیں خدا نے یہی سکھلایاہے کہ پرائی بہو بیٹیوں کو جبراً گھر میں بند کر کے ان کی آبرو ریزی کرو۔

قاضی : ہاں، خدا کا یہی حکم ہے کہ کافروں کو جس طرح ممکن ہو اسلام کے راستہ پر

لایا جاوے، اگر خوشی سے نہ آویں تو جبر سے۔

عورت : اسی طرح اگر کوئی تمھاری بہو بیٹیوں کو پکڑ کر بے آبرو کرے تو؟

قاضی : یہ تو ہو ہی رہاہے' جیسا تم ہمارے ساتھ کروگے۔ ویسا ہی ہم تمھارے ساتھ کریں گے۔ پھر ہم تو بے آبرو نہیں کرتے بلکہ صرف اپنے مذہب میں شامل کرتے ہیں، اسلام قبول کرنے سے آبرو بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں۔ ہندو قوم نے تو ہمیں مٹادینے کا بیڑا اٹھا یا ہے۔ وہ اس ملک سے ہمارا نام و نشان مٹادینا چاہتی ہے۔ دھوکہ سے، لالچ سے، جبر سے، مسلمان کو بے دین بنایا جارہا ہے۔ تو کیا مسلمان لوگ بیٹھے منہ تاکا کریں؟

عورت : ہندو کبھی ایسا ظلم نہیں کر سکتا، ممکن ہے کہ تم لوگوں کی شرارت سے تنگ آکر نیچے درجے کے لوگ اس طرح بدلا لینے لگے ہوں، مگر کوئی سچا ہندو اسے اب بھی پسند نہیں کرتا۔

قاضی نے کچھ سوچ کر کہا- بیشک پہلے اس طرح کی شرارتیں مسلمان شہدے کیا کرتے تھے مگر شریف لوگ ان حرکتوں کو برا سمجھتے تھے اور اپنی سکت بھر روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ تعلیم اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ کچھ دنوں میں یہ شہد اپن غائب ہوجاتا۔ مگر اب تو ساری ہندو قوم ہمیں نگلنے کے لیے تیار بیٹھی ہوئی ہے، پھر ہمارے لیے اور راستہ بھی کون ہے؟ ہم کمزور ہیں، اس لیے ہمیں مجبوراً اپنی ہستی قائم رکھنے کے لیے دغا و فریب سے کام لینا پڑتا ہے مگر تم اتنا گھبراتی کیوں ہو۔ تمھیں یہاں کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی، اسلام عورتوں کے لیے حقوق کا جتنا لحاظ رکھتاہے اتنا اور کوئی مذہب نہیں' اور مسلمان مرد تو اپنی بیوی پر جان دیتا ہے میرے نوجوان دوست(جامد) تمھارے سامنے کھڑے ہیں انھیں کے ساتھ تمھارا نکاح کردیا جاوے گا' بس آرام سے زندگی بسر کرنا۔

عورت : میں تمھیں اور تمھارے مذہب کو نفرت کے قابل سمجھتی ہوں تم کتے ہو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی دوسرا نام نہیں' خیریت اسی میں ہے کہ مجھے جانے دو ورنہ میں ابھی شور مچا دوں گی اور تمھارا سارا مولوی پن نکل جاوے گا۔

قاضی : اگر تم نے زبان کھولی تو تمھیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا بس اتنا سمجھ لو۔

عورت: آبرو کے سامنے جان کی کوئی حقیقت نہیں، تم میری جان لے سکتے ہو۔ مگر آبرو نہیں لے سکتے۔

قاضی: کیوں بے فائدہ ضد کرتی ہو؟

عورت نے دروازہ کے پاس جاکر کہا میں کہتی ہوں دروازہ کھول دو۔

حامد اب تک چپ چاپ کھڑا تھا جیوں ہی عورت دروازہ کی طرف چلی اور قاضی صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ حامد نے فوراً دروازہ کھول دیا اور قاضی صاحب سے بولا- انھیں چھوڑ دیجیے!

لیکن جب قاضی صاحب نے اس عورت کا ہاتھ نہ چھوڑا اور تانگے والا بھی اسے پکڑنے کے لیے بڑھا تو حامد نے ایک دھکا دے کر قاضی کو دھکیل دیا اور اس عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرہ سے باہر نکل گیا! تانگہ والا پیچھے لپکا مگر حامد نے اسے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ اوندھے منہ جاگرا۔ ایک لمحہ بعد حامد اور عورت، دونوں سڑک پر تھے۔

حامد : آپ کا مکان کس محلّہ میں ہے؟

عورت : یحییٰ گنج میں۔

حامد : چلیے میں آپ کو پہنچا آؤں۔

عورت : اس سے زیادہ اور کیا مہربانی ہوگی۔ میں آپ کی اس نیکی کو کبھی نہ بھولوں گی۔ آپ نے آج میری آبرو بچالی ورنہ میں کہیں کی نہ رہتی۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ بھلے اور برے ہر جگہ ہوتے ہیں میرے شوہر کا نام پنڈت راج کمار ہے۔

اسی وقت ایک تانگہ سڑک پر جاتا ہوا دکھائی دیا حامد نے عورت کو اس پر بیٹھا دیا اور خود بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اوپر سے قاضی صاحب نے حامد پر لٹھ چلا دیا جو تانگہ میں آلگا تانگہ روانہ ہوگیا۔

یحییٰ گنج میں پنڈت راجکمار کا پتہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ حامد نے جیوں ہی آواز دی، وہ گھبرائے ہوئے باہر نکل آئے اور عورت کو دیکھ کر بولے۔ تم کہاں رہ گئی تھیں اندرا؟ میں نے تو تمھیں اسٹیشن پر کہیں نہ دیکھا مجھے پہنچنے میں ذرا دیر ہوگئی

تھی، اتنی دیر کہاں لگی؟

اندرا نے مکان کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا، بڑی لمبی داستان ہے۔ ذرا دم لینے دو تو کہوں۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ آج اگر اس مسلمان نے میری مدد نہ کی ہوتی تو آبرو چلی گئی تھی۔

پنڈت جی پوری داستان سننے کے لیے اور بھی بیقرار ہو اٹھے، اندرا کے ساتھ ہی وہ بھی مکان میں چلے گئے مگر ایک ہی منٹ بعد باہر آکر حامد سے بولے۔ بھائی صاحب، شاید آپ اسے مبالغہ سمجھیں مگر مجھے اس وقت آپ کی شکل میں اپنی اِشت دیوتا و معبود کے درشن ہو رہے ہیں، میری زبان میں اتنی سکت نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں، آیئے بیٹھ جایئے۔

حامد : جی نہیں، آپ مجھے اجازت دیجیے۔

پنڈت : میں آپ کی اس نیکی کا کیا اجر دے سکتا ہوں؟

حامد : اس کا اجر یہی ہے کہ اس شرارت کا بدلہ کسی غریب مسلمان سے نہ لیجیے گا، آپ سے میری یہی التجا ہے۔

یہ کہہ کر حامد اٹھ کھڑا ہوا اور اسی اندھیری رات کے سناٹے میں شہر سے باہر نکل گیا، اس شہر کی زہریلی ہوا میں سانس لیتے ہوئے اس کا سر پھٹتا تھا۔ وہ جلد سے جلد شہر سے بھاگ کر اپنے گاؤں میں پہنچنا چاہتا تھا جہاں مذہب کا نام ہمدردی، محبت اور رفاقت تھا۔ دین اور دینداروں سے اسے نفرت ہوگئی تھی۔

(یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے دسمبر 1926 کے شمارے میں شائع ہوا۔ بعنوان ہنسا پرمودھرم۔ بان سرورر 5 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ پریم چالیسی میں شائع ہے۔)

بہشکار

پنڈت گیان چند نے گوونری کی اور سنتر شن نیتروں سے دیکھ کر کہا- مجھے ایسے نردئی پراڑیوں سے ذرا بھی سہانبھوت نہیں ہے۔ اس بربرتا کی بھی کوئی حد ہے کہ جس کے ساتھ تین ورش تک جیون کے سکھ بھوگے،اُسے ایک ذراسی بات پر گھر سے نکال دیا۔

گوونری نے آنکھیں نیچی کر کے پوچھا- آخر کیابات ہوئی تھی؟

گیان : کچھ بھی نہیں ۔ ایسی باتوں میں کوئی بات ہوتی ہے۔ شکایت ہے کہ کالندی زبان کی تیز ہے۔ تین سال تک زبان تیز نہ تھی، آج زبان کی تیز ہوگئی۔ کچھ نہیں ،کوئی دوسری چڑیانظر آئی ہوگی۔ اس کے لیے پنجرے کو خالی کرنا آوشیک تھا۔ بس یہ شکایت نکل آئی۔ میرابس چلے،تو ایسے دُشٹوں کوگولی ماردوں ۔ مجھے کئی بار کالندی سے بات چیت کرنے کا اَوسر ملاہے۔ میں نے ایسی ہنس مکھ دوسری ہی نہیں دیکھی۔

گوونری : تم نے سوم دت کو سمجھایانہیں ۔

گیان : ایسے لوگ سمجھانے سے نہیں مانتے۔ یہ لات کا آدمی ہے،باتوں کی اسے کیاپرواہ؟میرا تو یہ وچارہے کہ جس سے ایک بار سمبندھ ہوگیا،پھرچاہے وہ اچھی ہویابُری،اس کے ساتھ جیون بھرنرواہ کرناچاہیے!میں تو کہتاہوں ،اگراستری کے کُل میں کوئی دوش بھی نکل آئے،تو چھما سے کام لینا چاہیے۔

گوونری نے کاتر نیتروں سے دیکھ کرکہا-ایسے آدمی تو بہت کم ہوتے ہیں ۔

گیان : سمجھ ہی میں نہیں آتاکہ جس کے ساتھ اتنے دن ہنسے بولے،جس کے پریم کی اسمرتیاں ہردے کے ایک ایک اڑو میں سمائی ہوئی ہیں ،اسے در در ٹھوکریں کھانے کو کیسے چھوڑدیا۔ کم سے کم اتنا تو کرناچاہیے تھاکہ اسے کسی سُرکشِھت استھان پر پہنچادیتے اور اس کے نرواہ کا کوئی پربندھ کردیتے۔ نردئی نے اس طرح گھر سے نکالا،جیسے کوئی کتے کو نکالے۔ بیچاری گاؤں کے باہر بیٹھی رورہی ہے،کون کہہ سکتاہے،کہاں جائے گی۔ شایدمائکے میں بھی کوئی نہیں رہا۔ سوم دتّ کے ڈر کے مارے

گاؤں کا کوئی آدمی اس کے پاس بھی نہیں آتا۔ ایسے نِگڑ کا کیا ٹھکانا! جو آدمی استری کا نہ ہوا، وہ دوسرے کا کیا ہوگا۔ اس کی دُشا دیکھ کر میری آنکھوں میں تو آنسو بھر آئے۔ جی میں تو آیا، کہوں -بہن تم میرے گھر چلو؛ مگر تب تو سوم دتّ میرے پراڑوں کا گاہک ہو جاتا۔

گووندی : تم ذرا ایک بار پھر سمجھاؤ۔ اگر وہ کسی طرح نہ مانے، تو کالندی کو لیتے آنا۔

گیان : جاؤں؟

گووندی : ہاں ،اَوَشیہ جاؤ؛ اگر سوم دتّ کچھ کھری کھوٹی بھی کہے تو سن لینا۔

گیان چندر نے گووندی کو گلے لگا کر کہا- تمھارے ہردے میں بڑی دیا ہے، گووندی! لو جاتا ہوں، اگر سوم دتّ نے نہ مانا تو کالندی ہی کو لیتا آؤں گا۔ ابھی بہت دور نہ گئی ہوگی۔

(2)

تین ورش بیت گئے۔ گووندی ایک بچّے کی ماں ہو گئی۔ کالندی ابھی تک اسی گھر میں ہے۔ اس کے پتی نے دوسرا وِواہ کر لیا ہے۔ گووندی اور کالندی میں بہنوں کا سا پریم ہے۔ گووندی سدیو اس کی دلجوئی کرتی رہتی ہے۔ وہ اس کی کلپنا بھی نہیں کرتی کہ یہ کوئی غیر ہے اور میری روٹیوں پر پڑی ہوئی ہے، لیکن سوم دتّ کو کالندی کا یہاں رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ کوئی قانونی کاروائی کرنے کی تو ہمّت نہیں رکھتا۔ اور اس پرِستھتِ میں کر ہی کیا سکتا ہے، لیکن گیان چندر کا سر نیچا کرنے کے لیے اُدسر کھوجتا رہتا ہے۔

سندھیا کا سَمے تھا۔ گریشم کی اُشنر وایو ابھی تک بالکل شانت نہیں ہوئی تھی۔ گووندی گنگا جل بھرنے گئی تھی اور جل تٹ کی شیتل نرجنتا کا آنند اٹھا رہی تھی۔ سہسا اسے سوم دتّ آتا ہوا دکھائی دیا۔ گووندی نے آنچل سے منھ چھپا لیا اور کلسا لے کر چلنے ہی کو تھی کہ سوم دتّ نے سامنے آ کر کہا- ذرا ٹھہرو، گووندی، تم سے ایک بات کہنا ہے۔ تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم سے کہوں یا گیانو سے؟

گووندی نے دھیرے سے کہا : انھیں سے کہہ دیجیے۔

سوم دتّ : جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے، لیکن تمھاری دینتا پر دیا آتی ہے۔ جس

دن میں گیان چندر سے یہ بات کہہ دوں گا، تمھیں اس گھر سے نکلنا پڑے گا۔ میں نے ساری باتوں کا پتہ لگا لیا ہے۔ تمھارا باپ کون تھا، تمھاری ماں کی کیا دشا ہوئی، یہ ساری کتھا جانتا ہوں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ گیان چندر یہ کتھا سن کر تمھیں اپنے گھر میں رکھے گا؟اس کے وِچار کتنے ہی سُوادھین ہوں، پر جیتی مکھی نہیں نگل سکتا۔

گوونڈی نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا: جب آپ ساری باتیں جانتے ہیں، تو میں کیا کہوں؟ آپ جیسا اُچت سمجھیں کریں، لیکن میں نے تو آپ کے ساتھ کبھی کوئی بُرائی نہیں کی۔

سوم دتّ: تم لوگوں نے مجھے گاؤں میں کہیں منہ دکھانے کے یوگیہ نہیں رکھا۔ تِس پر کہتی ہو، میں نے تمھارے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی! تین سال سے کالندی کو آشریے دے کر میری آتما کو جو کشٹ پہنچایا ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ تین سال سے میں اس فکر میں تھا کہ کیسے اس اپمان کا دنڈ دوں۔ اب وہ اُدسر پا کر اسے کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا۔

گوونڈی: اگر آپ کی یہی اِچھا ہے کہ میں یہاں نہ رہوں، تو میں چلی جاؤں گی، آج ہی چلی جاؤں گی، لیکن ان سے آپ کچھ نہ کہیے۔ آپ کے پیروں پڑتی ہوں۔

سوم دتّ: کہاں چلی جاؤ گی؟

گوونڈی: اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے، تو گنگا جی تو ہیں۔

سوم دتّ: نہیں گوونڈی، میں اتنا نردئی نہیں ہوں۔ میں کیول اتنا چاہتا ہوں کہ تم کالندی کو اپنے گھر سے نکال دو اور میں کچھ نہیں چاہتا۔ تین دن کا سمے دیتا ہوں، خوب سوچ وچار کر لو۔ اگر کالندی تیسرے دن تمھارے گھر سے نہ نکلی، تو تم جانو گی۔

سوم دتّ وہاں سے چلا گیا۔ گوونڈی کلسا لیے مورتی کی بھانتی کھڑی رہ گئی۔ اس کے سمّکھ کٹھن سمسیا آ کھڑی ہوئی تھی، وہ تھی کالندی! گھر میں ایک ہی رہ سکتی تھی۔ دونوں کے لیے اس گھر میں استھان نہ تھا۔ کیا کالندی کے لیے وہ اپنا گھر، اپنا سُورگ تیاگ دے گی؟ کالندی اکیلی ہے، پتی نے اسے پہلے ہی چھوڑ دیا ہے، وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے، پر وہ اپنے پران آدھار اور پیارے بچّے کو چھوڑ کر کہاں جائے گی؟

لیکن کالندی سے وہ کیا کہے گی؟ جس کے ساتھ اتنے دنوں تک بہنوں کی طرح

رہی،اسے کیاوہ اپنے گھرسے نکال دے گی؟اس کا بچّہ کالندی سے کتناہلا ہوا تھا، کالندی اسے کتنا چاہتی تھی؟کیا اس پرتیکتا وِیتا کو وہ اپنے گھرسے نکال دے گی؟اس کے سوا اوراُپائے ہی کیا تھا؟ اس کا جیون اب ایک سوار تھی،دمبھی ویکتی کی دَیاپر اولمبت تھا۔ کیا اپنے پتی کے پریم پر وہ بھروسہ کر سکتی تھی! گیان چندر سہردے تھے، اُدار تھے، وچار شیل تھے، دِرڑھ تھے، پرکیا ان کا پریم ایمان، وینگ اور بھشکار جیسے آگھاتوں کو سہن کر سکتا تھا!

(3)

اسی دن سے گوندی اور کالندی میں کچھ پارتھکیہ سادکھائی دینے لگا۔ دونوں اب بہت کم ساتھ بیٹھتیں ۔ کالندی پکارتی، بہن آکر کھانا کھالو۔ گوندی کہتی تم کھالو، میں پھر کھالوں گی۔ پہلے کالندی بالک کو سارے دن کھلایاکرتی تھی،ماں کے پاس کیول دودھ پینے جاتا تھا۔ مگراب گوندی ہردم اسے اپنے ہی پاس رکھتی ہے۔ دونوں کے بیچ میں کوئی دیوار کھڑی ہوگئی ہے۔ کالندی باربار سوچتی ہے،آج کل مجھ سے یہ کیوں روٹھی ہوئی ہے؟ پر اسے کوئی کارن نہیں دکھائی دیتا۔ اسے بھئے ہورہاہے کہ کداچت یہ اب مجھے یہاں نہیں رکھناچاہتیں ۔ اسی چِنتا میں وہ غوطے کھایاکرتی ہے۔ کِنتو گوندی بھی اس سے کم چِنتت نہیں ہے۔ کالندی سے وہ اسنیہہ توڑنا چاہتی ہے، پر اس کی مَلان مورتی دیکھ کر اس کے ہردے کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ اس سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اُوہیلنا کے شبد منھ سے نہیں نکلتے۔ کداچت اسے گھرسے جاتے دیکھ کر وہ رو پڑے گی۔ اور زبردستی روک لے گی۔ اسی حیص بیص میں تین دن گزرگئے۔ کالندی گھر سے نہ نکلی۔ تیسرے دن سندھیا سَمے سوم دتّ ندی کے تٹ پر بڑی دیرتک کھڑا رہا۔ انت کو چاروں اور اندھیراچھاگیا۔ پھر بھی پیچھے پھرپھر کر جل تٹ کی اور دیکھتا جاتا تھا۔

رات کے دس بج گئے ہیں۔ ابھی گیان چندر گھرنہیں آئے ہیں۔ گوندی گھبرا رہی ہے۔ انھیں اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آج اتنی دیرکہاں لگارہے ہیں؟ شنکا سے اس کا ہردے کانپ رہاہے۔

سہسا مردانے کمرے کا دوار کھلنے کی آواز آئی۔ گوندی دوڑی ہوئی بیٹھک میں آئی، لیکن پتی کا مکھ دیکھتے ہی اس کی ساری دیہہ شِتھل پڑگئی،اس کے مکھ پر ہاسیہ تھا، پر

اس ہاسیہ میں بھاگیہ ترسکار جھلک رہا تھا۔ ودھی وام نے ایسے سیدھے سادے منشیہ کو بھی اپنی کریڑاکوشل کے لیے چن لیا۔ کیاوہ رہسیہ رونے کے یوگیہ تھا؟رہسیہ رونے کی وستو نہیں ،ہنسنے کی وستو ہے۔

گیان چندر نے گوونڈی کی اور نہیں دیکھا۔ کپڑے اتار کر ساودھانی سے الگنی پر رکھے،جوتااتارا اور فرش پر بیٹھ کر ایک پستک کے پنے الٹنے لگا۔

گوونڈی نے ڈرتے ڈرتے کہا- آج اتنی دیر کہاں کی؟بھوجن ٹھنڈا ہورہا ہے۔

گیان چندر نے فرش کی اور تاکتے ہوئے کہا- تم لوگ بھوجن کرلو،میں ایک متر کے گھر کھا کر آیا ہوں ۔

گوونڈی اس کا آشئے سمجھ گئی۔ ایک چھن کے بعد بولی-چلو،تھوڑا سا ہی کھالو۔

گیان : اب بالکل بھوک نہیں ہے۔

گوونڈی : تو میں بھی جاکر سورہتی ہوں ۔

گیان چندر نے اب گوونڈی کی اور دیکھ کر کہا : کیوں؟ تم کیوں نہ کھاؤگی؟

وہ اور کچھ نہ کہہ سکی گلابھر آیا۔

گیان چندر نے سمیپ آکر کہا : میں سچ کہتا ہوں، گوونڈی، ایک متر کے گھر بھوجن کر آیا ہوں۔ تم جاکر کھالو۔

(4)

گوونڈی پلنگ پر پڑی ہوئی چنتا،نراشیہ اوروشاد کے اپار ساگر میں غوطے کھارہی تھی۔ یدی کالنڈی کا اس نے بہشکار کردیاہوتا،تو آج اس وپتّی کا سامنا نہ کرناپڑتا،کنتو یہ امانشِک ویوہار اس کے لیے اسادھیہ تھا اور اس دشا میں بھی اسے اس کا دکھ نہ تھا۔ گیان چندر کی اور سے یوں ترسکرت ہونے کا بھی اسے دکھ نہ تھا۔ جو گیان چندر نتیہ دھرم اور سجنتا کی ڈینگیں مارا کرتا تھا،وہی آج اس کا اتنی نردتیا سے بہشکار کرتا ہوا جان پڑتا تھا،اس پر اسے لیش ماتر بھی دکھ،کرودھ یا دُویش نہ تھا۔ اس کے من کو کیول ایک بھاونا آندولت کررہی تھی۔ وہ اب اس گھر میں کیسے رہ سکتی ہے،اب تک وہ اس گھر کی سوامنی تھی!اس لیے نہ کہ وہ اپنے پتی کے پریم کی سوامنی تھی،پر اب وہ پریم سے ونچت ہوگئی تھی۔ اب اس گھرپر اس کا کیا ادھِکار تھا؟وہ اب اپنے پتی کو منھ ہی

کیسے دکھا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی، گیان چندر اپنے منھ سے اس کے وِرُدھ ایک شبد بھی نہ نکالیں گے، پر اس کے وِشے میں ایسی باتیں جان کر کیا وہ اس سے پریم کر سکتے تھے؟ کداپی نہیں !اس وقت نہ جانے کیا سمجھ کر چپ رہے۔ سویرے طوفان اٹھے گا۔ کتنے ہی وچارشیل ہوں، پر اپنے سماج سے نکل جانا کون پسند کرے گا؟ استریوں کی سنسار میں کمی نہیں، میری جگہ ہزاروں مل جائیں گی۔ میری کسی کو کیا پرواہ؟ اب یہاں رہنا بے حیائی ہے۔ آخر کوئی لاٹھی مار کر تھوڑے ہی نکال دے گا۔ حیادار کے لیے آنکھ کا اشارہ بہت ہے، منھ سے نہ کہیں من کی بات اور بھاو چھپے نہیں رہتے، لیکن میٹھی ندرا کی گود میں سوئے ہوئے ششو کو دیکھ کر ممتا نے اس کے اشنکت ہردے کو اور بھی کاتر کر دیا۔ اس اپنے پراڑوں کے آدھار کو وہ کیسے چھوڑے گی؟

ششو کو اس نے گود میں اٹھالیا اور کھڑی روتی رہی۔ تین سال کتنے آنند سے گزرے۔ اس نے سمجھا تھا کہ اسی بھانتِ سارا جیون کٹ جائے گا، لیکن اس کے بھاگیہ میں اس سے ادھک سکھ بھوگنا لکھا ہی نہ تھا۔ کرن ویدنا میں ڈوبے ہوئے یہ شبد اس کے مکھ سے نکل آئے۔ بھگوان!اگر تمھیں اس بھانتی میری دُرگتی کرنی تھی، تو تین سال، پہلے کیوں نہ کی؟ اس وقت یدی تم نے میرے جیون کا انت کردیا ہوتا، تو میں تمھیں دھنیواد دیتی۔ تین سال تک سوبھاگیہ کے سُرمیہ اُدّیان میں سوربھ، سمیر اور ماُدھریہ کا آنند اٹھانے کے بعد اس اُدّیان ہی کو اجاڑدیا۔ ہا! جس پودے کو اس نے اپنے پریم جل سے سینچا تھا، وے اب نِرمَم دربھاگیہ کے پیروں تلے کتنی نشٹھرتا سے کچلے جارہے تھے۔ گیان چندر کے شیل اور اسنیہہ کا اسمرن آیا، تو وہ رو پڑی۔ مردُاسمرتیاں آآکر ہردے کو مسوسنے لگیں۔

سہسا گیان چندر کے آنے سے وہ سنبھل بیٹھی۔ کٹھور سے کٹھور باتیں سننے کے لیے اس نے اپنے ہردے کو کڑا کرلیا، کنتو گیان چندر کے مکھ پر روش کا چنّھ بھی نہ تھا۔ انھوں نے آشچریہ سے پوچھا: کیا تم ابھی تک سوئی نہیں؟ جانتی ہو گئے بجے ہیں؟ بارہ سے اوپر ہیں۔

گوونُدی نے سہمے ہوئے کہا- تم بھی تو ابھی تک نہیں سوئے۔

گیان: میں نہ سوؤں، تو تم بھی نہ سوؤ؟ میں نہ کھاؤں، تو تم بھی نہ کھاؤ؟ میں

بیمار پڑوں، تو تم بھی بیمار پڑو؟ یہ کیوں؟ میں تو ایک جنم پتری بنا رہا تھا۔ کل دینی ہوگی۔ تم کیا کرتی رہیں، بولو؟

ان شبدوں میں کتنا سرل اسنیہہ تھا! کیا ترسکار کے بھاو اتنے لِلت شبدوں میں پرکٹ ہو سکتے ہیں؟ پروچِکتا کیا اتنی نرمل ہو سکتی ہے؟ شاید سوم دتّ نے ابھی وجر کا پرَہار نہیں کیا۔ اَوکاش نہ ملا ہوگا، لیکن ایسا ہے تو آج گھر اتنی دیر میں کیوں آئے؟ بھوجن کیوں نہ کیا، مجھ سے بولے تک نہیں، آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ میری اور آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ کیا یہ سمبھو ہے کہ اتنا کرودھ شانت ہو گیا ہو؟ یہ سمبھاونا کی چرم سیما سے بھی باہر ہے۔ تو کیا سوم دتّ کو مجھ پر دیا آگئی؟ پتھر پر دوب جمی؟ گووندی کچھ نشچے نہ کر سکی، اور جس بھانتی گرہ سکھ وِہین پتھک ورکش کی چھاؤں میں بھی آنند سے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے، اس کی اَویوستھا ہی اسے نشچنت بنا دیتی ہے، اسی بھانتی گووندی مانسک ویگرتا میں بھی اسوستھ ہوگئی۔ مسکرا کر اسنیہہ بردل سُور میں بولی: تمھاری ہی راہ تو دیکھ رہی تھی۔

یہ کہتے کہتے گووندی کا گلا بھر آیا، ویادھ کے جال میں پھڑپھڑاتی ہوئی چڑیا کیا بیٹھے راگ گا سکتی ہے؟ گیان چندر نے چارپائی پر بیٹھ کر کہا- جھوٹی بات، روز تو تم اب تک سوجایا کرتی تھیں۔

(5)

ایک سپتاہ بیت گیا، پر گیان چندر نے گووندی سے کچھ نہ پوچھا، اور نہ ان کے برتاؤ ہی سے ان کے منوگت بھاوں کا کچھ پرچے ملا۔ اگر ان کے ویوہاروں میں کچھ نوینتا تھی، تو یہ کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ اسنیہہ شیل نرّوند اور پرپھلوّن ہوگئے۔ گووندی کا اتنا آدر اور مان انھوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ ان کے پریتن شیل رہنے پر بھی گووندی ان کے منوبھاوں کو تاڑ رہی تھی اور اس کا چت پرَ تچھنر شنکا سے چنچل اور چھبدھ رہتا تھا۔ اب اسے اس میں لیش ماتر بھی سندیہہ نہیں تھا کہ سوم دتّ نے آگ لگا دی ہے۔ گیلی لکڑی میں پڑ کر وہ چنگاری بجھ جائے گی، یا جنگل کی سوکھی پتّیاں ہاہاکار کر کے جل اٹھیں گی، یہ کون جان سکتا ہے۔ لیکن اس سپتاہ کے گزرتے ہی اگنی کا پرکوپ ہونے لگا۔ گیان چندر ایک مہاجن کے منیم تھے۔ اس مہاجن نے کہہ

دیا- میرے یہاں اب آپ کا کام نہیں ۔ جتوکا کا دوسرا سادھن جگمانی ہے۔ جگمان بھی ایک ایک کر کے انھیں جواب دینے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے دوآر پر آنا جانا بند ہو گیا۔ آگ سوکھی پتیوں میں لگا کر اب ہرے ورکش کے چاروں اور منڈرانے لگی۔ پر گیان چندر کے مکھ میں گووندی کے پرتی ایک بھی کٹو،اپرؤ شبد نہ تھا۔ وہ اس سماجک ڈنڈ کی شاید کچھ پروا نہ کرتے،یدی دربھاگیہ وش اس نے اس کی جتوکا کے دوآر نہ بند کر دیے ہوتے۔ گووندی سب کچھ سمجھتی تھی،پر سنکوچ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتی تھی، اُس کے کارن اس کے پران پریہ پتی کی یہ دشا ہورہی ہے،یہ اس کے لیے ڈوب مرنے کی بات تھی۔ پر کیسے پران کا اُتسرگ کرے ۔ کیسے جیون کے موہ سے مکت ہو۔ اس وپتی میں سوامی کے پرتی اس کے روم روم سے شُبھ کامناؤں کی سریتا سی بہتی تھی،پر منھ سے ایک شبد بھی نہ نکلتا تھا۔ بھاگیہ کی سب سے نشٹھر لیلا اس دن ہوئی،جب کالندی بھی بنا کچھ کہے سنے سوم دتّ کے گھر جا پہنچی ۔ جس کے لیے یہ ساری یاتنائیں جھیلنی پڑیں ،اسی نے انت میں بے وفائی کی ۔ گیان چندر نے سنا تو کیول مسکرا دیے،پرگووندی اس کٹل آگھات کو اتنی شانتی سے سہن نہ کر سکی۔ کالندی کے پرتی اس کے مکھ سے اپریہ شبد نکل ہی آئے۔ گیان چندر نے کہا-اسے ویرتھ ہی کوستی ہو پریہ،اس کا کوئی دوش نہیں ۔ بھگوان ہماری پریکشا لے رہے ہیں ۔ اس وقت دھیریہ کے سوا ہمیں کسی سے کوئی آشا نہیں رکھنی چاہیے۔

جن بھاؤں کو گووندی کئی دنوں سے انت استھل میں دباتی چلی آتی تھی،وہ دھیریہ کا باندھ ٹوٹتے ہی بڑے ویگ سے باہر نکل پڑے۔ پتی کے سمکھ اپرادھیوں کی بھانتی ہاتھ باندھ کر اس نے کہا: سوامی،میرے ہی کارن آپ کو یہ سارے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔ میں ہی آپ کے کل کی کلنکنی ہوں۔ کیوں نہ مجھے کسی ایسی جگہ بھیج دیجیے، جہاں کوئی میری صورت تک نہ دیکھے۔ میں آپ سے ستیہ کہتی ہوں ......

گیان چندر نے گووندی کو اور کچھ نہ کہنے دیا۔ اسے ہردے سے لگا کر بولے : پریہ ایسی باتوں سے مجھے دکھی نہ کرو۔ تم آج بھی اتنی ہی پوتر ہو ،جتنی اس سمے تھیں جب دیوتاؤں کے سمکشھ میں نے آجیون پتنی ورت لیا تھا،تب مجھ سے تمھارا پرچے نہ تھا۔ اب میری دیہہ اور آتما کا ایک ایک پرماڑوں تمھارے اکشھے پریم سے آلوکت

ہورہاہے۔ اُبھاس اور نندا کی تو بات ہی کیا ہے، ڈردیوکا کٹھورتم آگھات بھی میرے وَرت کو بھنگ نہیں کر سکتا۔ اگر ڈوبیں گے تو ساتھ ساتھ ڈوبیں گے،تریں گے تو ساتھ ساتھ تریں گے۔ میرے جیون کا مکھیہ کرتویہ تمھارے پرتی ہے۔ سنسار اس کے پیچھے بہت پیچھے ہے۔

گوندی جی کو جان پڑا ،اس کے سمکھ کوئی دیو مورتی کھڑی ہے۔ سوامی میں اتنی شرڈھا،اتنی بھکتی، اسے آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔ گرد سے اس کا مستک اونچا ہو گیا اور مکھ پر سورگیہ آبھا جھلک پڑی۔ اس نے کچھ کہنے کا ساہس نہ کیا۔

(6)

سمپتّا اَپمان اور بہشکار کو تُچھ سمجھتی ہے۔ ان کے اَبھاو میں یہ بادھائیں پران انتک ہو جاتی ہیں ۔ گیان چندر دن کے دن گھر میں پڑے رہتے۔ گھر سے باہر نکلنے کا انھیں ساہس نہ ہوتا تھا۔ جب تک گوندی کے پاس گہنے تھے،تب تک بھوجن کی چنتا نہ تھی۔ کِنتو جب یہ آدھار بھی نہ رہ گیا، تو حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ کبھی کبھی نِراہاررہ جانا پڑتا۔ اپنی و۔تھا کس سے کہیں ،کون متر تھا؟کون اپنا تھا؟

گوندی پہلے بھی ہشٹ پُشٹ نہ تھی ؛پر اب تو اناہار اور انتروَیدنا کے کارن اس کی دیہہ اور بھی جیرن ہو گئی تھی۔ پہلے شِشو کے لیے دودھ مول لیا کرتی تھی۔ اب اس کی سامرتھیہ نہ تھی۔ بالک دن پر دن دُربَل ہوتا جاتاتھا۔ معلوم ہوتا تھا،اسے سوکھے کا روگ ہو گیا ہے۔ دن کے دن بچّہ کھرا کھاٹ پر پڑا ماتا کو نِراشیہ دِرشٹی سے دیکھا کرتا تھا ۔ کداچت اس کی بال بدّھو بھی اَوستھا کو سمجھتی تھی۔ کبھی کسی وستو کے لیے ہٹ نہ کرتا۔ اس کی بالوچت سرلتا،چنچلتا اور کریڑاشیلتا نے اب تک دیرگھ آشا وِہین پرتکشچھا کا روپ دھارن کر لیا تھا۔ ماتا پتا اس کی دَشا دیکھ کر من ہی من کڑھ کڑھ کر رہ جاتے تھے۔

سندھیا کاسمیہ تھا ۔ گوندی اندھیرے گھر میں بالک کے سرہانے چِنتا میں مگن بیٹھی تھی۔ آکاش پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا کے جھونکے اس کے اردھ نگن شریر میں شر کے سمان لگتے تھے۔ آج دن بھر بچّے نے کچھ نہ کھایا تھا۔ گھر میں کچھ تھا ہی نہیں ۔ چھدھا اگنی سے بالک چھٹ پٹا رہا تھا،پر یا تو رونا نہ چاہتا تھا،یا اس میں

رونے کی شکتی ہی نہ تھی۔

اتنے میں گیان چندر تیلی کے یہاں سے تیل لے کر آ پہنچے۔ دیپک جلا۔ دیپک کے چھینے پرکاش میں ماتا نے بالک کا مکھ دیکھا،تو سہم اٹھی۔ بالک کا مکھ پیلا پڑ گیا تھا اور پتلیاں اوپر چڑھ گئیں تھیں۔ اس نے گھبرا کر بالک کو گود میں اٹھایا۔ دیہہ ٹھنڈی تھی۔ چلا کر بولی : ہا بھگوان!میرے بچّے کو کیا ہوگیا؟ گیان چندر نے بالک کے مکھ کی اور دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اوربولے-ایشور،کیا ساری دَیا دِرشٹی ہمارے ہی اوپر کروگے۔

گوندی : ہائے! میرا لال مارے بھوک کے شیتھل ہو گیا ہے۔ کوئی ایسا نہیں، جو اسے دو گھونٹ دودھ پلا دے۔

یہ کہہ کر اس نے بالک کو پتی کی گود میں دے دیا اور ایک لُٹیا لے کر کالندی کے گھر دودھ مانگنے چلی۔ جس کالندی نے آج چھ مہینے سے اس گھر کی اور تاکا نہ تھا،اسی کے دوآر پر دودھ کی بھکشا مانگنے جاتے ہوئے اسے کتنی گلانی ،کتنا سنکوچ ہو رہا تھا ،وہ بھگوان کے سوا اور کون جان سکتا ہے۔ یہ وہی بالک ہے،جس پر ایک دن کالندی پران دیتی تھی،پر اس کی اور سے اب اس نے اپنا ہردَے کتنا کٹھور کر لیا تھا کہ گھر میں کئی گوئیں لگنے پر بھی ایک چلو دودھ نہ بھیجا۔ اسی کی دَیا بھکشا مانگنے آج، اندھیری رات میں، بھیگتی ہوئی گوندی دوڑی جا رہی ہے۔ ماتا !تیرے واتسلیہ کو دھنیہ ہے!

کالندی دیپک لیے دالان میں کھڑی گائے دُہا رہی تھی۔ پہلے سوامنی بننے کے لیے وہ سوت سے لڑا کرتی تھی۔ سیوکا کا پد اسے سوِکار نہ تھا۔ اب سیوکا کا پدسوِکار کر کے سوامنی بنی ہوئی تھی۔ گوندی کو دیکھ کر ترنت نکل آئی اور وِنّے سے بولی-کیا ہے بہن،پانی بوندی میں کیسے چلی آئیں ؟

گوندی نے سکوچاتے ہوئے کہا : لالہ بہت بھوکا ہے، کالندی! آج دن بھر کچھ نہیں ملا۔ تھوڑا سا دودھ لینے آئی ہوں۔

کالندی بھیتر جاکردودھ کا مٹکا لیے باہر نکل آئی اور بولی-جتنا چاہو،لے لو گوندی! دودھ کی کون کمی ہے۔ لالہ تو اب چلتا ہوگا! بہت جی چاہتا ہے کہ جاکر اسے دیکھ آوں ۔ لیکن جانے کا حکم نہیں ہے۔ پیٹ پالنا ہے،تو حکم ماننا ہی پڑے گا۔ تم نے

بتلایا ہی نہیں ، نہیں تو لالہ کے لیے دودھ کا توڑا تھوڑا ہے۔ میں چلی کیا آئی کہ تم نے اس کا منھ دیکھنے کو ترسا ڈالا۔ مجھے کبھی پوچھتا ہے؟

یہ کہتے ہوئے کالندی نے دودھ کا مٹکا گوندی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ گوندی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کالندی اتنی دَیا کرے گی،اس کی اسے آشا نہیں تھی۔ اب اسے گیان ہوا کہ یہ وہی دَیا شیلتا ،سیوا پرانیہ رمڑی ہے، جو پہلے تھی۔ لیش ماتر بھی انتر نہ تھا۔ بولی- اتنا دودھ لے کر کیا کروں گی، بہن۔ اس لوٹیا میں ڈال دو۔

کالندی : دودھ چھوٹے بڑے سبھی کھاتے ہیں۔ لے جاؤ،(دھیرے)یہ مت سمجھو کہ میں تمھارے گھر سے چلی آئی ،تو برائی ہو گئی۔ بھگوان کی دَیا سے اب یہاں کسی بات کی چنتا نہیں ہے۔ مجھ سے کہنے بھر کی دیر ہے۔ ہاں ،میں آؤں گی نہیں ۔ اس سے لاچار ہوں ۔ کل کسی بیلا لالہ کو لے کر ندی کنارے آجانا ۔ دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

گوندی دودھ کی ہانڈی لیے گھر چلی ،گرو پورن آنند کے مارے اس کے پیر اُڑے جاتے تھے۔ ڈیوڑھی میں پیر رکھتے ہی بولی- ذرا دیا دکھا دینا،یہاں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ایسا نہ ہو کہ دودھ گر پڑے۔ گیان چندر نے دیپک دکھا دیا ۔ گوندی نے بالک کو اپنی گود میں لِٹا کر کٹوری سے دودھ پلانا چاہا !پر ایک گھونٹ سے ادِھک دودھ کنٹھ میں نہ گیا۔ بالک نے ہچکی لی اور اپنی جیون لیلا سماپت کردی۔

کرن رودن سے گھر گونج اٹھا۔ ساری بستی کے لوگ چونک پڑے پر جب معلوم ہو گیا کہ گیان چندر کے گھر سے آواز آ رہی ہے،تو کوئی دوآر پر نہ آیا ۔ رات بھر بھگن ہردَے دمپتی روتے رہے۔ پراتہہ کال گیان چندر نے شَو اٹھا لیا اور شمشان کی اور چلے۔ سیکڑوں آدمیوں نے انھیں جاتے دیکھا،پر کوئی سمیپ نہ آیا۔

(7)

کل مریادا سنسار کی سب سے اُتم وستو ہے۔ اس پر پران تک نیوچھاور کر دیے جاتے ہیں۔ گیان چندر کے ہاتھ سے وہ وستو نکل گئی،جس پر انھیں گورَو تھا۔ وہ گرد، وہ آتم بل،وہ تیج جو پرمپرا نے اس کے ہردئے میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا ،اس کا کچھ انش تو پہلے ہی مٹ چکا تھا ،بچا کھچا پتر شوک نے مٹا دیا ۔ انھیں وشواس ہو گیا

کہ ان کے اَوِچار کا ایشور نے یہ ڈنڈ دیا ہے۔ دُر وِوَستھا ،جیرنتا اور مانسک دُربلتا سبھی اس وِشواس کو دِرڑھ کرتی تھیں ۔ وہ گوونڈی کو اب بھی نردوش سمجھتے تھے۔ اس کے پرتی ایک کٹو شبد ان کے منھ سے نہ نکلتا تھا،نہ کوئی کٹو بھاو ہی ان کے دل میں جگہ پاتا تھا۔ وِدھی کی کرور کریڑا ہی ان کا سَرو ناش کر رہی ہے،اس میں انھیں لیش ماتر بھی سندیہہ نہ تھا۔

اب یہ گھر انھیں پھاڑے کھاتا تھا۔ گھر کے پران سے نکل گئے تھے۔ اب ماتا کسے گود میں لے کر چاند ماما کو بلائے گی ،کسے ابٹن ملے گی،کس کے لیے پراتہہ کال حلوہ پکائے گی۔ اب سب کچھ شُونیہ تھا،معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہردے نکال لیے گئے ہیں۔ اپمان، کشٹ، اناہار،ان ساری وِڈمبناؤں کے ہوتے ہوئے بھی بالک کی بال کریڑاؤں میں وہ سب کچھ بھول جاتے تھے۔ اس کے اسینہہ مَے لالن پالن میں ہی اپنا جیون سارتھک سمجھتے تھے۔ اب چاروں اور اندھکار تھا۔

یدی ایسے منشیہ ہیں ،جنھیں وِپتّی سے اُتیجنا اور سااہس ملتا ہے،تو ایسے بھی منشیہ ہیں، جو آپتی کال میں کرتویہ ہین ، پُرشارتھ ہین اور اُدّیم ہین ہو جاتے ہیں ۔ گیان چندر شکشِت تھے، یوگیہ تھے ۔ یدی شہر میں جاکر دوڑ دھوپ کرتے،تو انھیں کہیں نہ کہیں کام مل جاتا۔ ویتن کم ہی سہی روٹیوں کو تو محتاج نہ رہتے،کنتو اَوِشواس انھیں گھر سے نکلنے نہ دیتا تھا۔ کہاں جائیں ،شہر میں کون جانتا ہے؟اگر دو چار پریچت پراڑیں ہیں بھی تو انھیں میری کیوں پرواہ ہونے لگی؟پھر اس دَشا میں جائیں کیسے؟دیہہ پر ثابت کپڑے بھی نہیں۔ جانے کے پہلے گوونڈی کے لیے کچھ نہ کچھ پر بندھ کرنا اَوشیک تھا۔ اس کا کوئی سُبھیتا نہ تھا۔ اِنھیں چنتاؤں میں پڑے پڑے ان کے دن کٹتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ انھیں گھر سے باہر نکلتے بھی بڑا سنکوچ ہوتا تھا۔ گوونڈی ہی پر اُدَرپار جن کا بھار تھا۔ بیچاری دن کو بچّوں کے کپڑے سیتی ،رات کو دوسروں کے لیے آٹا پیستی۔ گیان چندر سب کچھ دیکھتے تھے اور ماتھا ٹھونک کر رہ جاتے تھے۔

ایک دن بھوجن کرتے ہوئے گیان چندر نے آتم دھکار کے بھاو سے مسکرا کر کہا۔مجھ سا نرلج پُرش بھی سنسار میں دوسرانہ ہوگا،جسے استری کی کمائی کھاتے بھی موت نہیں آتی۔

گوونڈی نے بھوں سکوڑ کر کہا- تمھارے پیروں پڑتی ہوں، میرے سامنے ایسی باتیں مت کیا کرو۔ ہے تو یہ سب میرے ہی کارن؟

گیان : تم نے پورو جنم میں کوئی بڑا پاپ کیا تھا گوونڈی، جو مجھ جیسے نکھٹو کے پالے پڑیں ۔ میرے جیتے ہی تم وِدھوا ہو۔ دھکار ہے ایسے جیون کو !

گوونڈی : تم میرا ہی خون پیو!اگر پھر اس طرح کی کوئی بات منھ سے نکالو۔ تمھاری داسی بن کر میرا جنم سپھل ہو گیا۔ میں اسے پورو جنم کی تپسیہ کا پنیت پھل سمجھتی ہوں۔ دکھ سکھ کس پر نہیں آتا۔ تمھیں بھگوان کشل سے رکھیں، یہی میری ابھلاشا ہے۔

گیان : بھگوان تمھاری ابھلاشا پورن کریں !خوب چکی پیسو۔

گوونڈی : تمھاری بلا سے چکی پیستی ہوں ۔

گیان : ہاں، ہاں، پیسو۔ میں منع تھوڑے کرتا ہوں۔ تم نہ چکی پیسو گی، تو یہاں مونچھوں پر تاؤ دے کر کھائے گا کون، اچھا، آج دال میں گھی بھی ہے۔ ٹھیک ہے، اب میری چاندی ہے، بیڑا پار لگ جائے گا۔ اسی گاؤں میں بڑے بڑے اُچ کُل کی کنیائیں ہیں۔ اپنے وستر ابھوشن کے سامنے انھیں اور کسی کی پرواہ نہیں ۔ پتی مہاشے چاہیں چوری کرکے لائیں، چاہیں ڈاکہ مار کر لائیں، انھیں اس کی پرواہ نہیں ہے۔ تم میں وہ گُن نہیں ہیں۔ تم اُچ کُل کی کنیا نہیں ہو۔ واہ ری دنیا!ایسی پوتر دیویوں کا تیرے یہاں اَنادر ہوتا ہے!انھیں کُل کلنکنی سمجھا جاتا ہے!دھنیہ ہے تیرا وِیاپار!تم نے کچھ اور سنا؟ سوم دتّ نے میرے اسامیوں کو بہکا دیا ہے کہ لگان مت دینا، دیکھیں کیا کرتے ہیں۔ بتاؤ، زمیندار کو رقم کیسے چکاؤں گا؟

گوونڈی : میں سوم دتّ سے جاکر پوچھتی ہوں نہ؟ منع کیا کریں گے، کوئی دل لگی ہے!

گیان : نہیں گوونڈی، تم اس دُشٹ کے پاس مت جانا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھارے اوپر اس کی چھایا بھی پڑے۔ اسے خوب اَتیاچار کرنے دو۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ بھگوان کتنے نیائی ہیں۔

گوونڈی : تم آسامیوں کے پاس کیوں نہیں جاتے؟ ہمارے گھر نہ آئیں، ہمارا

چھوا پانی نہ پئیں، یا ہمارے روپیے بھی مار لیں گے؟

گیان : واہ، اس سے سرل تو کوئی کام ہی نہیں ہے۔ کہہ دیں گے، ہم روپیے دے چکے۔ سارا گاؤں اس کی طرف ہو جائے گا۔ میں تو اب گاؤں بھر کا دُروہی ہوں نہ۔ آج خوب ڈٹ کر بھوجن کیا۔ اب میں بھی رئیس ہوں، بنا ہاتھ پیر ہلائے گلچھرّے اُڑاتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں، تمھاری اُور سے اب میں نِشچنت ہو گیا۔ دیش ودیش بھی چلا جاؤں، تو تم اپنا نِرواہ کر سکتی ہو۔

گوونری : کہیں جانے کا کام نہیں ہے۔

گیان : تو یہاں جاتا ہی کون ہے۔ کیسے کتّے نے کاٹا ہے، جو یہ سیوا چھوڑ کر محنت مزدوری کرنے جائے۔ تم سچ مچ دیوی ہو، گوونری!

بھوجن کر کے گیان چندر باہر نکلے۔ گوونری بھوجن کر کے کوٹھری میں آئی، تو گیان چندر نہ تھے۔ سمجھی۔ کہیں باہر چلے گئے ہوں گے ۔ آج پتی کی باتوں سے اس کا چت کچھ پرسن تھا۔ شاید اب وہ نوکری چاکری کی کھوج میں کہیں جانے والے ہیں ۔ یہ آشا بندھ رہی تھی۔ ہاں ان کی وِینگوکتیوں کا بھاو اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ ایسی باتیں وہ کبھی نہ کرتے تھے۔ آج کیا سوجھی!

کچھ کپڑے سینے تھے۔ جاڑوں کے دن تھے ۔ گوونری دھوپ میں بیٹھ کر سینے لگی۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ ابھی تک گیان چندر نہیں آئے، تیل بتی کا سمے آیا، پھر بھوجن کی تیاری کرنے لگی۔ کالندی تھوڑا سا دودھ دے گئی تھی۔ گوونری کو تو بھوک نہ تھی، اب وہ ایک ہی بیلا کھاتی تھی۔ ہاں، گیان چندر کے لیے روٹیاں سیکنی تھیں۔ سوچا، دودھ ہے ہی، دودھ روٹی کھا لیں گے۔

بھوجن بنا کر نکلی ہی تھی کہ سوم دتّ نے آنگن میں آکر پوچھا: کہاں ہیں گیانو؟

گوونری : کہیں گئے ہیں ۔

سوم : کپڑے پہن کر گئے ہیں؟

گوونری : ہاں، کالی مرزئی پہنے تھے۔

سوم : جوتا بھی پہنے تھے؟

گوندی کی چھاتی دھڑدھڑ کرنے لگی۔ بولی - ہاں، جوتا تو پہنے تھے۔ کیوں پوچھتے ہو؟

سوم دتّ نے زور سے ہاتھ مار کر کہا-ہائے گیانو!ہائے!

گوندی گھبرا کر بولی-کیا ہوا، داداجی؟ ہائے! بتاتے کیوں نہیں؟ ہائے!

سوم : ابھی تھانے سے آرہا ہوں۔ وہاں ان کی لاش ملی ہے۔ ریل کے نیچے دب گئے! ہائے گیانو! مجھ ہتیارے کو کیوں نہ موت آ گئی؟

گوندی کے منہ سے پھر کوئی شبد نہ نکلا۔ انتم 'ہائے' کے ساتھ بہت دنوں تک تڑپتا ہوا پران پنچھی اڑ گیا۔

ایک چھن میں گاؤں کی کتنی ہی استریاں جمع ہو گئیں۔ سب کہتی تھیں - دیوی تھی! ستی تھی!

پراتہہ کال دو ارتھیاں گاؤں سے نکلیں۔ ایک پر ریشمی چندری کا کفن تھا، دوسری پر ریشمی شال کا۔ گاؤں کے دِوجوں میں سے کیول سوم دتّ ساتھ تھا۔ شیش گاؤں کے لوگ نیچی جاتِ والے آدمی تھے۔ سوم دتّ ہی نے داہ کریہ کا پربندھ کیا تھا۔ وہ رہ رہ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتی پیٹتا تھا اور زور زور سے چلاتا تھا- ہائے! ہائے گیانو!!

(یہ افسانہ پہلی بار چاند الہ آباد دسمبر 1926 میں شائع ہوا۔ مان سرودر 5 میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔)

بڑے بابو

تین سو پینسٹھ دن۔ کئی گھنٹے اور کئی منٹ کی متواتر پیہم مسلسل اور انتھک دوادوش کے بعد بالآخر منزل مقصود پر دھڑ سے پہنچ گیا۔ بڑے بابو کی زیارت حاصل ہوگئی، کرۂ خاکی نے کرۂ آتشیں کا طواف پورا کرلیا۔ اب تو آپ بھی میرے جغرانی تجربے کے قائل ہوگئے ہوں گے۔ اسے استعارہ نہ سمجھیے گا۔ بڑے بابو میں مہر نیمروز کی تابش تجلی اور حرارت تھی۔ اور میں کیا اور میری بساط کیا ایک مشت خاک!بڑے بابو مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ ہائے وہ تبسم پر جلال۔ میرے تن نیم جاں میں رعشہ سا آگیا۔ جی میں آیا بڑے بابو کے قدموں پر نثار ہو جاؤں۔ میں کافر نہیں۔ غالب کا مرید نہیں۔ جنت کے وجود پر مجھے یقین کامل ہے۔ اتنا ہی کامل جتنا اپنے خانۂ تاریک پر۔ لیکن فرشتے مجھے جنت لے جانے کے لیے آتے تو بھی یقیناً مجھے وہ مسرت بیکراں نہ حاصل ہوتی جو اس تبسم پُر نور سے ہوئی۔ آنکھوں مٰیں سرسوں پھول گئی۔ سارا دل و دماغ لالہ زار بن گیا۔ تخیل نے مصری اہرام کی تعمیر شروع کردی۔ سامنے کرسیوں پردوں اور خس کی ٹٹیوں سے سجا سجایا کمرہ تھا۔ دروازہ پر سائلوں کا انبوہ کثیر اور اپنی جانب ایک کرسی پر شان سے بیٹھے ہوئے قسام ازل کے دنیاوی فرائض ادا کر رہے تھے۔ نذر و نیاز کا طوفان بے تمیزی بپا تھا۔ اور میں شانِ استغنا سے کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔

دفعتاً ایک شیرانہ گرج نے زیر تعمیر اہرام کو متزلزل کر دیا۔ "کیا کام ہے؟"

ہائے تجاہل! اس پر ساری دنیا کے حسینوں کا تجاہل اور تغافل نثار۔ اس آستانہ دولت پر جبیں سائی کرتے تین سو پینسٹھ دن اور کئی منٹ گذر گئے۔ چوکھٹ زمین دوز ہوگیا۔ عیدو بساطی کی دکان کے آدھے کھلونے اورگوردھن حلوائی کی آدھی دکان اسی آستانہ پرنذر ہوگئی۔ اور مجھ سے آج سوال ہوتا ہے کیا کام ہے؟

مگر نہیں۔ یہ میری زیادتی ہے۔ سراسر ظلم ہے۔ جو فکر عالی اہم ملکی و مالی تمدنی معاملات میں شبانہ روز منہمک رہتی ہو۔ جو دماغ ڈاکیوں، سرکلروں پروانوں، حکم ناموں، نقشوں وغیرہ سے گرانبار ہو رہا ہو۔ اس کے نزدیک مجھ جیسے خاک کے پتلے کی حقیقت

ہی کیا۔ مچھر اپنے کو چاہے ہاتھی سمجھ لے، پر بیل کے سینگ کو اس کی کیا خبر۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ حضور کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔

بڑے بابو پھر گرجے۔ "کیا کام ہے؟"

اب کی بار میرے روئیں کھڑے ہوگئے۔ خدا کے فضل سے لحیم و شحیم آدمی! جن دنوں کالج تھا۔ میری شجاعت و بسالت کی دھوم تھی۔ ہاکی ٹیم کا کپتان 6 فٹ لمبا ٹیم کا نائب کپتان اور کرکٹ کا جنرل تھا۔ کتنے ہی گوروں کے جسم پر اب بھی میری شجاعت کے داغ باقی ہوں۔ ممکن ہے دو چار اب بھی بیساکھیاں لیے چلتے یا رینگتے ہوں۔ بمبئی کرانیکل اور ٹائمیز میں میرے گیندوں کی دھوم تھی مگر اس وقت بابو صاحب کی گرج سن کر میرے جسم میں رعشہ آگیا۔ کانپتے ہوئے بولا۔ "حضور کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔"

بڑے بابو نے اپنا سلیپر دار پیر میری طرف بڑھا کر کہا۔ "شوق سے لیجیے یہ قدم حاضر ہے۔ جتنے بوسے چاہے لیجیے۔ بے حساب معاملہ ہے مجھ سے قسم لے لیجیے جو میں شمار کروں۔ جب تک آپ کا منہ نہ تھک جائے لیے جائیے۔ میرے لیے اس سے بڑھ کرخوش نصیبی کا کیا موقعہ ہوگا۔ اوروں کو جو بات بڑی ریاضت بڑی چلہ کشی، بڑے زہدو اتقا سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ مجھے بیٹھے بٹھائے بغیر ہرڑ پھٹکری لگائے حاصل ہوگئی۔ واللہ ہوں میں بھی خوش نصیب۔ آپ اپنے دوست احباب اعزہ و اقربا بھی لائیں تو اور بھی بہتر میرا اذن عام ہے۔"

اس ستم ظریفی پر بڑے بابو شاید اپنے دل میں نازاں ہوں۔ ضرور ہوں گے۔ اس شومئے تقدیر کا برا ہو جو اس دروازہ کا گدا گربنائے ہوئے ہے۔ جی میں تو آیا کہ حضرت کے بڑھے ہوئے پیر کو کھینچ لوں اور آپ کو زندگی بھر کے لیے سبق دے دوں کہ بدنصیبوں سے دل لگی کرنے کا یہ مزہ ہے مگر بدنصیبی اگر دل پر جبر نہ کرائے جذبات کا قفل نہ ہوجائے۔ ذلت کا احساس نہ پیدا کرے۔ تو وہ بدنصیبی کیوں کہلائے۔ میں بھی ایک زمانے میں ستم ظریف تھا، اس وقت ان بڑے بابوؤں کی میری نگاہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ کتنے ہی بڑے بابوؤں کو رلا کر چھوڑ دیا۔ کوئی ایسا پروفیسر نہ تھا جس کا چہرہ میری صورت دیکھتے ہی دودنہ ہوجاتا ہو۔ ہزار ہزار روپیہ پانے والے

پروفیسروں کی مجھ سے کوردبتی تھی۔ ایسے کلرکوں کو میں سمجھتا ہی کیا تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ کہاں۔ دل میں پچھتایا کہ ناحق قدم بوسی کا لفظ زبان پر لایا۔ مگر عرض مدعا ضروری تھا۔ میں مصمم ارادہ کر کے آیا تھا کہ اس در سے آج کچھ لے کے ہی اٹھوں گا۔ میرے صبر اور بڑے بابو کے تجاہل میں تنگ آف اور تھا۔ دبی زبان سے بولا۔ ''حضور گریجوایٹ ہوں۔''

شکر ہے! ہزار شکر ہے!! بڑے بابو ہنسے جیسے ہانڈی اُبل پڑی ہو وہ گرج اور وہ کرخت آواز نہ تھی۔ میری جبہ سائی آخر کہاں تک اثر نہ کرتی شاید اثر کو میری دعا سے دشمنی نہیں۔ میرے کان بڑی بے قراری سے کلمات روح افزا سننے کے لیے منتظر تھے مگر آہ جتنی مایوسی ان کانوں کو ہوئی ہے۔ اتنی شاید کوہکن کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ تبسم نہ تھا۔ خندہ تقدیر تھا۔ حضور نے فرمایا:

''بڑی خوشی کی بات ہے ملک اور قوم کے لیے اس سے زیادہ خوشی کا کیا امر ہوسکتا ہے میری دلی تمنا ہے ملک کا ہر ایک نوجوان گریجوایٹ ہو جائے گریجوایٹ زندگی کے جس شعبہ میں جائے اس کو فروغ ہی پہنچائے گا۔ ملکی مالی تمدنی معاشرتی مذہبی غرض ہر ایک قسم کی تحریک کی بقا اور ارتقا گریجوایٹوں ہی پر منحصر ہے اگر ملک میں گریجویٹ کا یہ افسوسناک فقدان نہ ہوتا تو عدم تعاون کی تحریک کیوں اتنی جلدی مردہ ہو جاتی۔ کیوں بنے ہوئے رنگے ہوئے سیار۔ جوفروش گندم نما۔ زرپرست لیڈروں کو ڈاکہ زنی کے ایسے موقعے ملتے تبلیغ کیوں مبلغ علیہ السلام کی علت بنتی۔ گریجوایٹ میں حق و باطل کی تیز نگاہ کی وسعت اور موازنہ کی قابلیت ہونا امر لازم ہے۔ میری آنکھیں تو گریجویٹوں کو دیکھ کر نشہ کے درجہ تک محفوظ ہو جاتی ہیں۔ آپ بھی خدا کے فضل سے اپنی قسم کی بہت اچھی مثال ہیں۔ بالکل اپٹوڈیٹ، یہ شیروانی تو برکت اینڈ کو کے دکان کی سلی ہوئی ہوگی۔ جوتے بھی ڈاسن کے ہیں۔ کیوں نہ ہو آپ لوگوں نے قوم کے معیار زندگی کو بہت رفیع بنا دیا ہے اوراب وہ بہت جلد منزل مقصود پر پہنچے گی بلیک بورڈ بھی ہے۔ ویسٹ اینڈ کی رسٹ واچ بھی ہے بیشک! اب قومی بیڑے کو خواجہ خضر کی ضرورت ہی نہیں وہ اس کامنت شناس نہ ہوگا۔

ہائے تقدیر اور وائے تقدیر۔ اگر جانتا کہ یہ شیروانی اور فاونٹن پن اور رسٹ

واج یوں آماجگاہ ظرافت بنے گی تو احباب کا شرمندۂ احسان کیوں بنتا۔ نماز بخشوانے آیا تھا روزے گلے پڑے۔ کتابوں میں پڑھا تھا ہیئت کذائی اعلان ہے اپنی ناکامی کا۔ دعوت ہے اپنی تحقیر کی۔ تجربہ بھی مطالعہ کا شاہد تھا۔ چیتھڑے پوش بھیک منگوں کو کتنی بے دردی سے دھتکارتا ہوں۔ لیکن جب کوئی حضرت صوفی صافی بنے ہوئے گیسوئے دراز شانوں پر بکھیرے سنہرا عمامہ سر پر شان کجکلاہی سے باندھے صندلی رنگ کا نیچا کرتہ پہنے کمرہ میں آ پہنچتے ہیں تو جبراً ان کی تعظیم کرنی پڑتی ہے اوروہ ان کی پاک نفسی کے متعلق ہزاروں اشتباہات پیدا ہونے پر بھی چھوٹی سی چھوٹی رقم جو ان کی نذر کی جاتی ہے وہ ایک درجن بھکاریوں کو خوانِ نعمت کے سامان مہیا کردیتی۔ پرانی مثل ہے بھیس سے ہی بھیک ملتی ہے۔ پر آج اس کلیہ کی تکذیب ہوگئی۔ اب اہلیہ مکرمہ کی وہ تنبیہ یاد آئی جو اس نے چلتے وقت کی تھی۔ "کیوں خواہ مخواہ اپنی بے عزتی کرانے جارہے ہو۔ وہ صاف سمجھیں گے کہ یہ مانگے تانگے کا ٹھاٹھ ہے ایسے رئیس ہوتے تو میرے دروازے پر آتے ہی کیوں۔" اس وقت میں نے اس تنبیہ کو اہلیہ کی کم نگاہی اوردہقانیت پر محمول کیا تھا۔ پر اب معلوم ہوا کہ گنواریں بھی کبھی کبھی سوجھ کی باتیں کہتی ہیں۔ مگر اب دست تاسف ملنا بے سود ہے۔ میں نے عاجزانہ انداز سے کہا۔ حضور کہیں میری پرورش فرمائیں۔

بڑے بابو نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا میں کوئی عجیب الخلقت وجود ہوں۔ اور نہایت تشفی آمیز لہجہ میں بولے۔ آپ کی پرورش خدا کرے گا وہی سب کا رازق ہے ازل سے شعراء حکماء اولیا یہی تلقین کرتے آئے ہیں کہ خدا پر توکل رکھو۔ اورہم ہیں کہ ان کی ہدایت کو فراموش کر جاتے ہیں لیکن خیر، میں آپ کو صلاح نیک دینے میں بخل نہ کروں گا۔ آپ ایک اخبار نکال لیجیے۔ یقین مانیے اس کے لیے علمیت یا تدبّر کی ضرورت نہیں۔ آپ تو خدا کے فضل سے گریجوایٹ۔ حبوب امساک اور ملذذ و طلا کے نسخے لکھیے۔ طب اکبر میں آپ کو ہزاروں نسخے ملیں گے لائبریری جا کر نقل کر لایے اور اخبار میں نئے عنوان سے شائع کیجیے۔ کوک شاستر کا تو آپ نے مطالعہ کیا ہی ہوگا اگر نہ کیا ہوتو ایک بار کر جائیے اور اپنے اخبار میں لطف مواصلت کے طریقے ارقام فرمایئے۔ اعضاء شہوانی کے نام جتنے زیادہ آ سکیں بہتر ہے۔ پھر

دیکھیے کیسے ڈاکٹر اور پروفیسر اور ڈپٹی کلکٹر آپ کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اس کا خیال رہے کہ یہ کام حکیمانہ انداز سے کیا جائے۔ تاجرانہ اور حکیمانہ انداز میں تھوڑا فرق ہے۔ تاجر محض اپنی دواؤں کی تعریف کرتا ہے حکیم اصطلاحات اور اعضاء مخفی کی تشریح کر کے اپنے مضامین کو علمی رنگ دیتا ہے۔ تاجر کی تعریف سے لوگ بدظن ہو جاتے ہیں۔ حکیم کی تعریف اعتماد انگیز ہوتی ہے اگر اس معاملہ میں کچھ اتصواب کی ضرورت ہو تو رسالہ درویش حاضر ہے۔ اگر اس کام میں آپ کو کچھ دقت معلوم ہوتی ہو تو سوامی شردھا نند کی خدمت میں جاکر شدھی پر آمادگی ظاہر کیجیے پھر دیکھیے آپ کی کتنی تواضع اور تکریم ہوتی ہے۔ اتنا سمجھائے دیتا ہوں کہ شدھی کے لیے فوراً تیار نہ ہو جایئے گا۔ پہلے دن تو دو چار ہندو دھرم کی کتابیں مانگ لایئے گا۔ ایک ہفتہ کے بعد جاکر کچھ اعتراضات کیجیے گا مگر اعتراضات ایسے ہوں جن کا جواب آسانی سے دیا جاسکے۔ اس سے سوامی جی کو آپ کی تحقیق اور تجسس پر یقین ہو جائے گا۔ بس آپ کی چاندی ہے۔ آپ اس کے بعد اسلام کی مخالفت پر دو ایک مضمون یا سلسلۂ مضامین کسی ہندو رسالے میں لکھ دیں گے تو آپ کی زندگی اور معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے بھی ایک سہل نسخہ ہے۔ تبلیغی مشن میں شریک ہو جائے کسی ہندو عورت خصوصاً نوجوان بیوہ پر ڈورے ڈا لیے۔ آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی۔ کہ وہ کتنی آسانی سے آپ سے ملتفت ہوجاتی ہے۔ آپ اس کی حیات تاریک کے لیے مشعل ثابت ہوں گے۔ وہ بے عذر ہوتی ہے۔ شوق سے اسلام قبول کرے گی۔ بس آپ شہیدوں میں داخل ہوگئے اگر آپ ذرا احتیاط سے کام کرتے رہیں تو آپ کی زندگی بڑی فارغ البالی سے گذرے گی۔ ایک ہی کھیوے میں دین و دنیا دونوں ہی پار ہیں۔ جناب لیڈر بن جائیں گے۔ واللہ ایک ہفتہ میں آپ کا شمار معززین میں ہونے لگے گا۔ دین کے سچے پیرو ہزار ہا سیدھے سادھے مسلمان آپ کو دین کی ڈوبتی ہوئی کشتی کا ناخدا سمجھیں گے۔ پھر خدا کے سوا اور کسی کو خبر نہ ہوگی کہ آپ کے ہاتھ کیا آتا ہے اور وہ کہاں جاتا ہے اور خدا افشائے راز نہیں کرتا یہ آپ جانتے ہی ہیں۔ تعجب ہے کہ ان موقعوں پر آپ کی نگاہ کیوں نہیں جاتی۔ میں بڈھا ہوگیا اب کوئی نیا کام نہیں سیکھ سکتا ورنہ اس وقت لیڈروں کا لیڈر ہوتا۔

اس شعلہ انگیز ظرافت نے جسم میں شعلے پیدا کردیے۔ آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ تحمل کی برودت حائل بے خیر ہوگئی مگر قہر درویش برجان درویش کے مصداق سر جھکا کر کھڑا رہا۔ جتنی دلیلیں ذہین میں کئی دنوں سے ریزہ ریزہ کر کے رکھی تھیں صرف اظہار ہو گئیں۔ بہت سوچنے پر بھی کوئی نیا پہلو ذہن میں نہ آیا۔ یوں خدا کے فضل سے غبی یا کند ذہن نہیں ہوں۔ فکر رسا پائی ہے۔ اتنی فکر سے کوئی اچھی سی غزل ہو جاتی پر طبیعت ہی تو ہے نہ لڑی۔ اتفاق سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معاً یاد آگیا کہ سفارشی خطوط کا ایک دفتر بھی ساتھ لایا ہوں۔ رعب کا اوسان پر کیا اثر پڑتا ہے اس کا آج تجربہ ہوگیا۔ امید کی شگفتگی چہرہ پر نمودار ہوگئی خطوط کا پلندا ہاتھ میں لے کر بولا حضور یہ چند خطوط ہیں انھیں ملاحظہ فرمالیں۔

بڑے بابو نے بنڈل لے کر میز پر رکھ دیااوران پر ایک غلط انداز نظر ڈال کر بولے۔ آپ نے اب تک ان جواہر ریزوں کو کیوں چھپا رکھا تھا؟

میرے دل میں مسرت امید کا ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ گویائی نے عود کیا۔ امنگ سے بولا۔ حضور کے جاہ و جلال نے اتنا مرعوب اور مسحور کر دیا کہ مجھے ان خطوط کی یاد نہ رہی۔ حضور سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ میں نے ان کے لیے کسی قسم کی سعی و سفارش نہیں بہم پہنچائی۔ کسی قسم کی جستجو نہیں کی۔

بڑے بابو نے مسکراکر فرمایا اگر آپ ان کے لیے سعی و طلب کی انتہائی قوتیں صرف کرتے تو بھی میں آپ کو متہم نہ کرتا۔ آپ بیشک بڑے خوش نصیب ہیں کہ یہ نایاب... جنس آپ کو بے مانگے مل گئی۔ اسے زندگی کے سفر کا پاسپورٹ سمجھیے۔ واہ آپ کو خدا کے فضل سے ایک سے ایک قدردان نصیب ہوئے۔ آپ ذہین ہیں۔ راست باز ہیں بے لوث ہیں۔ اطاعت شعار ہیں۔ افوہ! آپ کے اوصاف کی تو کوئی انتہاہی نہیں۔ قسم خدا کی آپ جامع کمالات صوری و معنوی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ میں فراست، متانت، دیانت، صیانت، اصابت، نجابت، شرافت، جسارت سبھی انسانی اور ملکوتی صفات موجود ہیں۔ آپ تو نمائش میں رکھے جانے کے قابل معلوم ہوتے ہیں کہ دنیا نگاہ حیرت سے دیکھے اور دانتوں میں انگلی دبائے۔ آج کسی بھلے کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا کہ آپ جیسے پاکیزہ منش شخص سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو

زندگی کے ہر ایک شعبہ میں آپ کو نام و نمود کے مدارج تک پہنچا سکتے ہیں۔ سرکار کی ملازمت آپ جیسے با کمال اصحاب کے شایانِ شان نہیں۔ آپ کو یہ کب گوارا ہوگا۔ اس دائرہ میں آتے ہی انسان حیوان مطلق بن جاتا ہے۔ بولیے آپ اسے منظور کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں...!

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ جناب ذرا ان الفاظ کی توضیح فرمائیں۔ انسان کے حیوان مطلق بننے سے آپ کا کیا منشا ہے؟

بڑے بابو نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ یہ تو کوئی ایسا پیچیدہ توضیح طلب امر نہ تھا۔ جب تو مجھے اپنے حسن ظن میں کچھ ترمیم کرنی پڑے گی۔ اس دائرہ کے عبودیت کیشوں کے لیے سب سے ضروری اور لازمی صفت فراست ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے خیال پر یہ لفظ قادر ہے یا نہیں اس کا انگریزی مترادف ہے۔ انٹیوشن۔ کنایہ کے اصلی مفہوم کو سمجھنا۔ مثلاً اگر سرکار بہادر یعنی حاکم ضلع کو شکایت ہو کہ آپ کے علاقہ میں انکم ٹیکس کم وصول ہوتا ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس میں اندھا دھند اضافہ کریں؟ آمدنی کی پرواہ نہ کریں۔ آمدنی کا بڑھانا آپ کی معاملہ فہمی پر منحصر ہے۔ ایک خفیف سی دھمکی کام کر جائے گی اور انکم ٹیکس دو چندسہ چند ہو جائے گا۔ یقیناً آپ کو یہ ضمیر فروشی گوارہ نہ ہوگی۔

میں نے سمجھ لیا کہ میرا امتحان ہو رہا ہے۔ عاشقانہ سرگرمی سے بولا میں تو اسے ضمیر فروشی نہیں سمجھتا۔ یہ تو حق نمک ہے۔ میرا ضمیر اس درجہ نازک نہیں ہے۔

بڑے بابو نے میری طرف قدردانہ نگاہ سے دیکھ کر فرمایا۔

شاباش! مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی آپ مجھے ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شاید یہ دوسری شرط آپ کو منظور نہ ہو۔ اس دائرہ کے مریدوں کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے کو بھول جائیں۔ کچھ آیا ذہن شریف میں؟

میں نے دبی زبان سے کہا۔ جناب کو تکلیف تو ہوگی مگر ذرا پھر اس کی توضیح فرما دیجیے۔

بڑے بابو نے چیں بہ چیں ہوکے کہا۔ جناب یہ بار بار کی توضیح مجھے بری

معلوم ہوتی ہے۔ میں اس سے زیادہ آسان طریقہ پر اپنے خیال کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اپنے کو بھول جانا بہت ہی عام محاورہ ہے۔ اپنی خودی کو مٹادینا اپنی شخصیت کو فنا کر دینا ہے۔ اپنی پرسنلیٹی کو زائل کر دینا۔ آپ کی وضع قطع سے آپ کے خطاب و کلام سے آپ کے انداز و اطوار سے آپ کی ہندیت کی تکذیب ہو جانی چاہیے۔ آپ کی مذہبی اخلاقی اور تمدنی اثرات کا ایک قلم محو ہو جانا ضروری ہے۔ مجھے آپ کے بشرہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس توضیح پر بھی آپ میرا مفہوم سمجھنے پر قاصر ہیں۔ سنیے آپ غالبًا مسلمان ہیں، شاید آپ راسخ العقیدہ بھی ہوں۔ آپ نماز اور روزے کے پابند ہیں؟

میں نے انداز تفاخر سے کہا۔ جناب میں اتنا ہی راسخ العمل ہوں جتنا کوئی مولوی ہو سکتا ہے میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ الا اس وقت جب میں بستر علالت پر تھا۔

بڑے بابو نے مسکرا کر کہا یہ آپ کے پسندیدہ اخلاق ہی کہے دیتے ہیں مگر اس دائرہ میں آکر آپ کو اپنے عقیدہ اور عمل میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کرنی پڑے گی۔ یہاں آپ کا مذہب مذہبیت کا خامہ اختیار کرے گا۔ آپ بھول کر بھی اپنی پیشانی کو منت کش سجدہ نہ بنائیں۔ کوئی مضائقہ نہیں آپ بھول کر بھی زکوٰۃ سے اپنے کو ملوث نہ بنائیں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن آپ کو اپنے مذہب کے نام پر فریاد کرنے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہنا اور دوسروں کو آمادہ کرنا ہوگا۔ اگر آپ کے ضلع میں دو ڈپٹی کلکٹر ہندو ہیں اور مسلمان صرف ایک۔ تو آپ کا فرض ہے کہ ہزا یکسلینسی گورنر کی خدمت میں ایک وفد بھیجنے کے لیے روساء قوم کو آمادہ کریں۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ کسی میونسپلٹی نے قصابو کو شہر سے باہر دکان رکھنے کی تجویز پاس کردی ہے تو آپ کا فرض ہوگا کہ زعیمان قوم کو اس میونسپلٹی کی سرزنش کرنے کے لیے تحریک کریں۔ آپ کو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے قومی فدائیت کا راگ الاپنا چاہیے۔ مثلاً امتحان کے نتائج میں اگر آپ کو مسلمان طلباء کی تعداد مناسب سے کم نظر آئے تو آپ کو فوراً چانسلر کے پاس ایک گمنام خط لکھ بھیجنا ہوگا کہ اس معاملہ میں ضرور ہی سختی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں اسی انٹیوشن والی شرط کے ضمن میں آجاتی ہے آپ کو صراحتاً یا کنایتاً یہ لائحہ عمل قائم کرنے کے لیے ہدایت نہ کی جائے گی۔ سب کچھ

آپ کی فراست پر مبنی ہوگا۔ آپ نے اس جوہر سے بہرہ وافی پایا ہے تو آپ ایک دن ضرور منصب اعلیٰ پر پہنچیں گے۔ آپ کو حتی الامکان انگریزی میں تحریر و تقریر کرنی ہوگی، اس کے بغیر حکام آپ سے خوش نہ ہوں گے۔ لیکن قومی زبان کی حمایت اور اشاعت کی صدا آپ کی زبان سے پیہم نکلتی رہنی چاہیے۔ آپ شوق سے اخبارات کا چندہ ہضم کریں۔ مستعار کتابیں پڑھیں چاہے واپسی کے وقت کتاب کی قلب ہیئت کے باعث آپ کو معذرت ہی کیوں نہ کرنی پڑے لیکن زبان کی حمایت بانگ دہل سے کرتے رہیے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کو جس کا کھانا اسی کا گانا ہوگا۔ آپ کے قول سے فعل سے اوردل سے اپنے آقا کے فلاح اوراستحکام میں منہمک ہونا پڑے گا۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہوں کہ آقا کی خدمت کے ذریعہ قوم کی خدمت بھی کروں گا تو یہ خیال خام ہے سودا ہے جنوں ہے حماقت ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ فرمایئے۔ آپ اس حد تک اپنے کو بھول سکتے ہیں۔

مجھے جواب دینے میں ذرا تامل ہوا۔ حق یہ ہے کہ میں بھی آدمی ہوں اور بیسویں صدی کا آدمی ہوں۔ میں بیدار نہ سہی مگر بالکل غافل نہیں ہوں۔ میں بھی اپنے ملک اور قوم کو بام عروج پر دیکھنے کا متمنی ہوں۔ میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مذہب دنیا میں صرف ایک ہے اور اس کا نام ہے درد۔ مذہب کی موجودہ صورت دھڑے بندی کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ختنہ یا چوٹی سے کسی کی ماہیت نہیں تبدیل ہوسکتی۔ پرستش کے لیے کلیسا، مسجد، مندر کی میں بالکل ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہاں نفسانیت اور انانیت کو دبائے رکھنے کے لیے کسی عمل کی ضرورت تسلیم کرتا ہوں اس لیے نہیں کہ اس سے مجھے جنت ملے گی یا میری مکتی ہوگی۔ بلکہ صرف اس لیے کہ مجھے دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے اکراہ ہوگا۔ مجھ میں خودی کا خاصہ عنصر موجود ہے یوں اپنی رضا و رغبت سے کہیے آپ کی جوتیاں سیدھی کروں لیکن حکومت کی برداشت نہیں۔ محکوم بننا شرم ناک، حقارت انگیز سمجھتا ہوں۔ کسی غریب کو ظلم کا شکار ہوتے دیکھ کر میرے خون میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی سے دب کر رہنے سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن خیال حالات پر

تو فتح نہیں پا سکتا معاش کی فکر تو مقدم ہے۔ اتنے دنوں کے بعد بڑے بابو کی نگاہ کرم کو اپنی جانب ملتفت دیکھ کر بجز سر تسلیم خم کرنے کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ بولا۔ جناب میری جانب سے مطمئن رہیں۔ آقا کی خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کروں گا۔

"غیرت کو فنا کر دینا ہوگا"

"منظور۔"

"شرافت کے جذبات کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔"

"منظور"

"مخبری کرنی پڑے گی"

"منظور"

"تو بسم اللہ کل سے آپ کا نام امیدواروں کی فہرست میں لکھ دیا جائے گا"

میں نے سوچا تھا کل سے کوئی جگہ مل جائے گی اتنی ذلت قبول کرنے کے بعد معاش کے فکر سے تو آزادی نصیب ہوگی، اب حقیقت کھلی۔ بے اختیار منہ سے نکالا اور جگہ کب تک ملے گی؟

بڑے بابو ہنسے وہی دل خراش ہنسی جس میں ذم کا پہلو غالب تھا۔ جناب میں عالم الغیب نہیں۔ روشن ضمیر نہیں۔ بہتر ہو اس سوال کا جواب آپ کسی اولیا سے پوچھیں دستر خوان بچھادینا میرا کام ہے۔ کھانا آئے گا۔ اور وہ آپ کے حلق میں جائے گا۔ یہ پیشین گوئی میں نہیں کر سکتا۔ میں نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ میں تو اس سے بڑی عنایت کا منتظر تھا۔ بڑے بابو کرسی سے اٹھ کر بولے۔ قسم خدا کی آپ پرلے درجہ کے کوڑ مغز آدمی ہیں بالکل خشک دماغ۔ دستر خوان کا سامنے آجانا۔ آپ کوئی چھوٹی بات سمجھتے ہیں۔ لطف انتظار آپ کی نگاہ میں کوئی چیز نہیں۔ حالانکہ انتظار میں انسان عمریں گذار سکتا ہے۔ آپ روزانہ کچہری میں آئیں گے۔ عرض مندوں سے آپ کا سابقہ ہوگا۔ عمال سے آپ روشناس ہو جائیں گے۔ معاملے بٹھانے سودے پٹانے کے زرّیں موقعے ہاتھ آئیں گے۔ حکام کے لڑکے پڑھایئے۔ اگر گنڈے تعویذ کا فن سیکھ

لیجیے تو آپ کے حق میں بہت مفید ہو۔ کچھ طبّی معلو مات بہم پہنچایئے۔ اچھے ہوشیار زرگروں سے یارانہ پیدا کیجیے کیونکہ آپ کو ان سے اکثر سا بقہ پڑے گا۔ حکام کی مستو رات آپ ہی کی معرفت اپنی فر مائشیں پوری کرائیں گی مگر ان سب لٹکوں سے کارگر ایک اور لٹکا ہے۔ اگر وہ ہنر آپ میں ہے تو یقیناً آپ کے انتظا ر کی مدت میں بہت کچھ تخفیف ہو سکتی ہے۔ آپ حکام عالی مقام کے لیے سا مان تفریح مہیا کر سکتے ہیں؟

بڑے بابو میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرائے۔ سامان تفریح سے ان کی کیا مراد ہے یہ میں نہ سمجھ سکا۔ مگر پو چھتے ہوئے بھی خوف ہو تا تھا کہ کہیں بڑے بابو بگڑ نہ جائیں اور پھر معاملہ خراب ہو جائے۔ ایک اضطراب کی حالت میں زمین کی طرف تا کنے لگا۔

بڑے بابو تاڑ تو گئے کہ اس کی سمجھ میں میری بات نہ آئی۔ لیکن اب کہ وہ چین بجیں نہ ہوئے۔ نہ ہی ان کے لہجے میں ہمدردی کی جھلک تھی۔ فرمایا، یہ تو غیر ممکن ہے کہ آپ نے بازار کی سیر نہ کی ہو۔

میں نے شر ماتے ہوئے کہا۔ نہیں حضور بندہ اس کو چے سے نا آشنا ہے۔

بڑے بابو بولے تو آپ کو اس کوچہ کی خاک چھاننی پڑے گی۔ حکام بھی باصرہ اور سامعہ رکھتے ہیں۔ دن بھر کی دما غی تکان کے بعد فطرتاً شب کو ان کی طبیعت تفریح کی جا نب مائل ہوتی ہے،اگر آپ ان کے لیے حسن باصرہ فروز اور نغمہ سامعہ نواز کا انتظام سستے داموں کر سکتے ہیں یا کر سکیں تو۔ ۔ ۔

میں نے کسی قدر تیز ہو کر کہا آپ کا منشا یہ ہے کہ مجھے بازار حسن کی دلالی کرنی پڑے گی؟

بڑے بابو : تو آپ تیز کیوں ہوتے ہیں اگر اب تک اتنی موٹی سی بات آپ نہیں سمجھے تو یہ میرا قصور ہے یا آپ کی کوتاہ فہمی کا؟

میرے جسم میں آگ لگ گئی۔ ۔ جی میں آیا کہ بڑے بابو کو جی جٹسو کے دو چار ہاتھ دکھاؤں۔ مگر گھر کی بے سروسامانی کا خیال آگیا۔ بیوی کی منتظر آنکھیں اور بچوں کی گر سنہ صورتیں یاد آگئیں۔ ذلت کا ایک دریا حلق کے نیچے ڈھکیلتے ہوئے بو لا۔ جی

نہیں میں تیز نہیں ہوا تھا۔ ایسی بے ادبی مجھ سے نہیں ہو سکتی ہے (آنکھوں میں آنسوں بھر کر) ضرورت نے میری غیرت کو فنا کر دیا ہے۔ آپ میرا نام امیدواروں میں درج کریں۔ حالات مجھ سے جو کچھ کرائیں گے وہ سب کروں گا اور تا دم آخر آپ کا ممنون رہوں گا۔

(یہ قصہ پہلی بار اردو ماہنامہ بہارستان کے فروری 1927 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ خاک پروانہ میں شامل ہے ہندی میں گپت دھن 2 میں شائع ہوا ہے۔)

ستی

دو صدیوں سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے مگر چنتا دیوی کا نام برابر قائم ہے۔ بندیل کھنڈ کے ایک اُجاڑ مقام پر آج بھی منگل کے روز ہزاروں عورت مرد چنتادیوی کی پرستش کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اس دن یہ اُجاڑ فضا سہانے نغموں سے گونج اُٹھتی ہے۔ وہاں کے ٹیلے اور ٹھیکرے عورتوں کی رنگ رنگ والی پوشاکوں سے سج جاتے ہیں۔ دیوی کا مندر ایک بہت اونچے ٹیلے پر بنا ہوا ہے۔ اس کے کلس پر لہراتی ہوئی سرخ جھنڈی بہت دور سے نظر آتی ہے۔ مندر اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں دو آدمی ایک ساتھ مشکل سے سما سکتے ہیں۔ اس کے اندر کوئی مورت نہیں ہے صرف ایک چھوٹی سی بیدی بنی ہوئی ہے۔ نیچے سے مندر تک ایک سنگین زینہ ہے جس کے دونوں طرف دیوار بنی ہوئی ہے کہ بھیڑ میں دھکے سے کوئی نیچے نہ گر پڑے۔ یہیں چنتا دیوی ستی ہوئی تھیں مگر دستور زمانہ کے مطابق وہ اپنے مردہ شوہر کے ساتھ چتا پر نہیں بیٹھی تھی۔ اس کا شوہر دست بستہ سامنے کھڑا تھا مگر وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ وہ شوہر کے جسم کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی روح کے ساتھ ستی ہوئی تھی۔ اس چتا پر شوہر کا جسم نہ تھا اس کی آبرو جل کر خاک سیاہ ہو رہی تھی۔

(2)

جمنا کے کنارہ پر کالپی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ چنتا اسی مقام کے ایک بہادر بندیلے کی لڑکی تھی۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مرچکی تھی۔ اس کی پرورش و پرداخت کا بار اس کے باپ پر پڑا تھا۔ وہ لڑائیوں کا زمانہ تھا۔ سپاہیوں کو کمر کھولنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ وہ گھوڑے کی پشت پر کھانا کھاتے اور وہیں زین پر جھپکیاں لے لیتے تھے۔ چنتا کا بچپن باپ کے ساتھ میدان جنگ میں گزرا۔ اس کا باپ اسے کسی غار میں یا کسی درخت کی آڑ میں چھپا کر میدان میں چلا جاتا۔ بلا کسی خوف کے اطمینان سے بیٹھی ہوئی مٹی کے قلعے بناتی اور بگاڑتی۔ اس کے گھروندے قلعے ہوتے تھے۔ اس کی گڑیاں اوڑھنی نہ اوڑھتی تھیں۔ وہ سپاہیوں کے گڈے بناتی اور انھیں

لڑائی کے میدان میں کھڑا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا باپ شام کو بھی واپس نہ آتا مگر چنا کو خوف چھو تک نہ گیا تھا۔ ویران جنگلوں میں بھوکی پیاسی رات رات بھر بیٹھی رہتی۔ اس نے نیولے اور گیدڑ کی کہانیاں کبھی نہ سنی تھیں۔ بہادروں کی جانبازی کے افسانے سپاہیوں کی زبان سے سن سن کر وہ معیار پرست بن گئی تھی۔

ایک مرتبہ تین روز تک چنا کو اپنے باپ کی کچھ خبر نہ ملی وہ ایک پہاڑ کے غار میں بیٹھی ہوئی دل ہی دل میں ایک ایسا قلعہ تیار کررہی تھی جس کو دشمن کسی طرح بھی فتح نہ کر سکے۔ تمام دن وہ اسی قلعہ کا نقشہ سوچتی اور تمام رات اسی قلعہ کا خواب دیکھتی۔ تیسرے روز شام کو اس کے باپ کے کئی ساتھیوں نے آکر اس کے پاس رونا شروع کیا۔ چنا نے متعجب ہوکر پوچھا۔ داداجی کہاں ہیں۔ تم لوگ کیوں روتے ہو۔

کسی نے اس بات کا جواب نہ دیا۔ وہ زور سے ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔ چنا سمجھ گئی کہ اس کا باپ میدان جنگ میں مارا گیا۔ اس تیرہ سال والی لڑکی کی آنکھوں سے آنسوں کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ چہرہ ذرا بھی اُداس نہ ہوا۔ ایک آہ بھی نہ نکلی۔ ہنس کر بولی۔ اگر وہ لڑائی میں کام آئے تو تم لوگ روتے کیوں ہو۔ سپاہی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کون سی موت ہوسکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر ان کی بہادری کا اور کون سا صلہ مل سکتا ہے۔ یہ رونے کا نہیں بلکہ خوشی منانے کا موقع ہے۔

ایک سپاہی نے متفکرانہ لہجہ میں کہا۔ ہمیں تمھاری فکر ہے۔ تم اب کہاں رہوگی۔

چنا : اس کی تم کچھ فکر نہ کرو دادا۔ میں اپنے باپ کی بیٹی ہوں۔ جو کچھ انھوں نے کیا۔ وہی میں بھی کروں گی۔ اپنے وطن کی سرزمین کو دشمنوں کے پنجہ سے چھڑانے میں انھوں نے اپنی جان دے دی۔ میرے سامنے بھی وہی معیار ہے۔ جاکر اپنے آدمیوں کو سنبھالیے۔ میرے لیے ایک گھوڑے اور تیز ہتھیاروں کا بندوبست کر دیجیے۔ ایشور نے چاہا تو آپ لوگ مجھ کو کسی سے پیچھے نہ پاویں گے۔ لیکن اگر مجھے قدم پیچھے ہٹاتے دیکھا تو تلوار کے ایک وار سے میری زندگی کا خاتمہ کردینا۔ یہی آپ سے میری التجا ہے۔ جائیے اب دیر نہ کیجیے۔

سپاہیوں کو چنتا کے یہ بہادرانہ الفاظ سن کر کچھ بھی تعجب نہیں ہوا۔ ہاں انھیں یہ اندیشہ ضرور ہوا کہ کیا یہ نازک اندام لڑکی اپنے اس ارادہ پر قائم رہ سکے گی۔

(3)

پانچ سال گزر گئے۔ سارے صوبہ میں چنتا دیوی کی دھاک بیٹھ گئی۔ دشمنوں کے پیر اُکھڑ گئے۔ وہ فتح کا زندہ مجسمہ تھی۔ اسے تیروں اور تفنگوں کے سامنے بے خوف کھڑے دیکھ کر سپاہیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ اس کی موجودگی میں وہ کیسے قدم پیچھے ہٹاتے۔ جب نازک اندام عورت آگے بڑھے تو کون مرد قدم پیچھے ہٹا دے گا۔ حسن کی دیویوں کے سامنے سپاہیوں کی شجاعت ناقابل فتح ہو جاتی ہے۔ عورت کے لفظی تیر بہادروں کے لیے جانبازی کے خفیہ پیغام ہیں۔ اس کی ایک چتون بزدلوں میں بھی مردانگی پیدا کر دیتی ہے۔

چنتا کی خوبصورتی اور شہرت نے منچلے سورماؤں کو چاروں جانب سے کھینچ کھینچ کر اس کی فوج کو سجادیا۔ جان پر کھیلنے والے بھونرے ہر سمت سے آ آکر اس پھول پر منڈلانے لگے۔ انھیں بہادروں میں رتن سنگھ نامی ایک نوجوان راجپوت بھی تھا۔

یوں تو چنتا کے سپاہیوں میں سبھی تلوار کے دھنی تھے۔ بات پر جان دینے والے، اس کے اشارہ پر آگ میں کودنے والے۔ اس کا حکم پا کر آسمان کے تارے توڑ لانے پر بھی آمادہ ہو جاتے۔ لیکن رتن سب سے بڑھا ہوا تھا۔ چنتا بھی اس کو دل سے چاہتی تھی۔ رتن سنگھ دوسرے سپاہیوں کی طرح اکھڑ، منہ پھٹ یا گھمنڈی نہ تھا۔ وہ لوگ اپنی اپنی جوانمردی کا خوب بڑھا بڑھا کر بکھان کرتے۔ خودستائی کرتے ہوئے ان کی زبان نہ رکتی تھی۔ جو کچھ کرتے چنتا کو دکھانے کے لیے کرتے۔ ان کا مقصد اولیٰ ان کا فرض نہ تھا، بلکہ چنتا تھی۔ رتن سنگھ جو کچھ کرتا خاموش طریقہ پر۔ اپنی تعریف کرنی تو دور رہی' وہ خواہ کسی شیر کو ہی مار کر کیوں نہ آوے۔ اس کا تذکرہ تک نہ کرتا تھا۔ اس کی عاجزی اور انکساری تامل کی حد سے بھی متجاوز کر گئی تھی۔ دوسروں کی محبت میں عیش پسندی تھی۔ مگر رتن سنگھ کی محبتؔ میں غنا اور ایثار۔ اور لوگ میٹھی نیند سوتے تھے مگر رتن سنگھ تارے گن گن کر رات کاٹتا تھا۔ اور سبھی اپنے اپنے دلوں میں سمجھتے تھے کہ چنتا میری ہوگی۔ صرف رتن سنگھ نااُمید تھا۔ اور

اس لیے اس کو نہ کسی سے رغبت تھی نہ نفرت، دوسروں کو چھتا کے سامنے جھکتے دیکھ کر ان کی گویائی پر تعجب ہوتا۔ ہر لمحہ اس کی یاس انگیز، تاریکی اور بھی زیادہ گہری ہوتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی بیوقوفی پر جھنجلا اُٹھتا۔ کیوں ایشور نے اسے ان اوصاف سے بے بہرہ رکھا۔ جو عوتوں کے دل کو فریفتہ کرتے ہیں۔ اسے کون پوچھے گا۔ اس کے درد دل سے کون واقف ہے؟ مگر وہ دل میں جھنجلاکر رہ جاتا تھا۔ اس میں دکھاوے کی سکت ہی نہ تھی۔

نصف سے زیادہ رات جا چکی تھی۔ چھتا اپنے خیمہ میں آرام کر رہی تھی۔ سپاہی بھی سخت منزل طے کرنے کے بعد کچھ کھاپی کر غافل پڑے ہوئے تھے۔ آگے ایک گھنا جنگل تھا۔ جنگل کے دوسری طرف دشمنوں کا ایک دستہ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ چھتا اس کی آمد کی خبر پاکر رواں دواں چلی آرہی تھی۔ اس نے علی الصبح دشمنوں پر حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دشمنوں کو میرے آنے کی خبر نہ ہوگی۔ لیکن یہ اس کا محض خیال تھا اس کی فوج کا ایک آدمی دشمنوں سے ملا ہوا تھا۔ یہاں کی خبریں روزانہ وہاں پہنچتی رہتی تھیں۔ انھوں نے چھتا سے نجات پانے کے لیے ایک سازش کر رکھی تھی اس کو چپ چاپ قتل کردینے کے لیے تین شخصوں کو مقرر کر دیا تھا۔ ہر سہ اشخاص درندوں کی طرح دبے پاؤں جنگل کو پار کر کے آئے۔ اور درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ چھتا کا خیمہ کون سا ہے؟ کُل فوج بے خبر سو رہی تھی۔ اس سے انھیں اپنی کامیابی کاذرا بھی شبہ نہ تھا۔ وہ درختوں کی آڑ سے نکلے اور زمین پر مگر کی طرح رینگتے ہوئے چھتا کے خیمہ کی طرف چلے۔

ساری فوج بے خبر سوتی تھی۔ پہرہ والے سپاہی بھی تھک کر چور ہو جانے کے سبب نیند میں غافل پڑے تھے۔ صرف ایک شخص چھتا کے خیمہ کے پیچھے سردی کی وجہ سے سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ یہ رتن سنگھ تھا۔ آج اس نے یہ کوئی نئی بات نہیں کی تھی پڑاؤں میں اس کی راتیں اسی طرح چھتا کے خیمہ کے پیچھے بسر ہوتی تھیں۔ حملہ آوروں کی آہٹ پا کر اس نے تلوار نکال لی اور چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھا کہ تین آدمی جھکے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے پر وار کرکے آپس میں کٹ مریں ادھر تنہا تین جوانوں سے مقابلہ کرنے میں جان کا اندیشہ۔ زیادہ سوچنے کا موقع

نہ تھا۔ اس میں بہادروں کے فوری ارادہ کرنے کی قوت تھی۔ اس نے فوری تلوار کھینچ لی۔ اور ان پر ایک بارگی ٹوٹ پڑا۔ کئی منٹ تک تلواریں تیزی سے چلتی رہیں۔ پھر سناٹا ہو گیا۔ ادھر وہ تینوں زخمی ہو کر گر پڑے۔ ادھر یہ بھی زخموں سے چور ہو کر بے ہوش ہو گیا۔

علی الصباح چنتا اٹھی تو چاروں جوانوں کو زمین پر پڑا دیکھا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ قریب جا کر دیکھا تو حملہ آوروں کی جان نکل چکی تھی۔ مگر رتن سنگھ کی سانس چل رہی تھی۔ سارا واقعہ معاً سمجھ میں آگیا۔ نسائیت نے مردانگی پر فتح پائی۔ جن آنکھوں سے باپ کی موت پر آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرا تھا انھیں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے رتن سنگھ کے سر کو اپنے زانوں پر رکھ لیا اور اپنے دل کے صحن میں رچے ہوئے سوئمبر میں اس کے گلے میں جے مالا ڈال دی۔

(4)

ایک مہینے تک نہ رتن سنگھ کی آنکھیں کھلیں اور نہ چنتا کی آنکھیں بند ہوئیں۔ چنتا اس کے پاس سے ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہ ہوئی۔ اسے نہ اپنے علاقہ کی پرواہ تھی نہ دشمنوں کے بڑھتے چلے آنے کی فکر۔ رتن سنگھ پر اپنے لوازمات نچھاور کر چکی تھی۔ پورا مہینہ گزر جانے کے بعد رتن سنگھ کی آنکھ کھلی۔ دیکھا تو خود چارپائی پر پڑا ہوا ہے اور چنتا سامنے پنکھا لیے کھڑی ہے کمزور لہجہ میں بولا۔ چنتا! پنکھا مجھے دے دو۔ تمھیں تکلیف ہو رہی ہے۔

چنتا کا دل مسرت سے نغمہ ریز ہو گیا۔ ایک ماہ قبل جس خستہ و نحیف شخص کے سرہانے بیٹھ کر وہ مایوسی سے رویا کرتی تھی۔ آج اسے بولتے دیکھ کر اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اس نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ سوامی اگر یہ تکلیف ہے، تو آرام کیا ہے میں نہیں جانتی۔ اس سوامی کے لفظ میں عجیب منتر کی تاثیر تھی۔ رتن سنگھ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بجھا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ رگوں میں ایک نئی زندگی کی لہر پیدا ہو گئی اور وہ زندگی کتنی جذبہ خیز تھی۔ اس میں کتنا حوصلہ، کتنی حلاوت، کتنی مسرت، کتنی رقت تھی۔ رتن سنگھ کا ہر عضو پھڑک اٹھا۔ اسے اپنے بازوؤں میں غیر معلمولی قوت کا احساس ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ کل دنیا کو فتح کر سکتا ہے۔ اُڑ کر آسمان پر

پہنچ سکتا ہے۔ پہاڑوں کو پھاڑ سکتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے اسے ایسی آسودگی ہوئی گویا اس کی ساری مرادیں پوری ہوگئی ہیں۔ گویا اب وہ کسی سے کچھ نہیں چاہتا تھا شاید مہادیوجی کو بھی سامنے کھڑے ہوئے دیکھ کر منھ پھیر لے گا۔ کوئی بردان نہ مانگے گا۔ اسے اب کسی چیز کی بھی خواہش نہ تھی۔ اسے ایسا غرور ہو رہا تھا گویا اس سے زیادہ فارغ البال، اس سے زیادہ خوش نصیب شخص دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا۔

چنتا ابھی اپنی بات پوری نہ کرنے پائی تھی۔ اسی سلسلہ میں بولی۔ ہاں آپ کو میرے سبب البتہ ناقابل برداشت تکلیف اٹھانی پڑی۔

رتن سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ بلا تپسیا کے پھل نہیں ملتا۔

چنتا نے رتن سنگھ کو نازک ہاتھوں سے لٹاتے ہوئے کہا۔ اس پھل کے لیے تم نے تپسیا نہیں کی تھی۔ جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ تم صرف ایک کمزور عورت کی حفاظت کر رہے تھے۔ اگر میرے بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی تو بھی تم اتنی ہی تن دہی سے اس کی حفاظت کرتے مجھے اس کا یقین ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ میں نے تمام عمر کے لیے برہمچریہ (مجرد) کا عہد کر لیا تھا۔ مگر تمھاری جاں نثاری نے میرے اس عہد کو شکست کر ڈالا۔ میری پرورش بہادروں کی گود میں ہوئی ہے۔ میرا دل اسی شیر دل شخص کے قدموں پر نچھاور ہو سکتا ہے جو جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ شوقینوں کی اٹھکیلیوں، اور اوباشیوں کی نظر بازیوں اور چالاکوں کی چالاکیوں کی میرے دل میں ذرا بھی وقعت نہیں۔ ان کو ظاہرداریوں میں صرف تماشے کی طرح دیکھتی ہوں۔ تمھارے دل ہی میں میں نے سچا ایثار پایا ہے اور تمھاری کنیز ہوگئی۔ آج سے نہیں بلکہ بہت دنوں سے۔

(5)

وصال کی شب اولیں تھی۔ چاروں طرف سناٹا۔ صرف محبت بھرے دلوں میں تمناؤں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ چاروں طرف عشق افروز چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے تبسم آگیں منظر میں دولہا دلہن باہم اظہار عشق کر رہے تھے۔

دفعتاً خبر ملی کہ دشمنوں کی فوج قلعہ کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے۔ چنتا چونک پڑی۔ رتن سنگھ کھڑا ہوگیا۔ اور سامنے کھونٹی سے لٹکتی ہوئی تلوار اتار لی۔

چنتا نے اس کی طرف بزدلانہ محبت کی نظر سے دیکھ کر کہا۔ کچھ آدمیوں کو ادھر بھیج دو۔ تمھارے جانے کی کیا ضرورت ہے۔

رتن سنگھ نے بندوق کو کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ اب کے وہ لوگ بہت بڑی تعداد میں آرہے۔

چنتا : تو میں بھی چلوں گی۔

رتن : نہیں مجھے امید ہے کہ وہ لوگ ٹھہر نہ سکیں گے۔ میں ایک، ہی حملہ میں ان کے قدم اکھاڑدوں گا۔ یہ ایشور کی مرضی ہے کہ ہماری سہاگ رات فتح کی رات ہو۔

چنتا : نہ جانے میرا دل کیوں ڈر رہا ہے۔ جانے دینے کو جی نہیں چاہتا۔

رتن سنگھ نے اس سادہ اور محبت آمیز گفتار سے بے قرار ہو کر چنتا کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔ میں صبح تک واپس آجاؤں گا، پیاری!

چنتا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر با چشم نم بولی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم بہت دنوں میں واپس آؤگے۔ میرا دل تمھارے ساتھ رہے گا۔ جاؤ مگر روزانہ خبر بھیجتے رہنا تمھارے پیروں پڑتی ہوں۔ موقع و محل کا خیال کر کے حملہ کرنا۔ تمھاری عادت ہے کہ دشمن کو دیکھتے ہی بے قرار ہو جاتے ہو۔ اور جان پر کھیل کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہو۔ تم سے میری التجا ہے کہ موقع دیکھ کر کام کرنا۔ جاؤ جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح منھ دکھاؤ۔

چنتا کا دل افسردہ ہوگیا اس میں پہلے صرف فتح کی تمنا تھی اب عافیت کی تمنا اس پر غالب تھی۔ وہی بہادر لڑکی جو شیرنی کی طرح گرج کر دشمنوں کے کلیجے ہلا دیتی تھی آج اتنی کمزور ہو رہی تھی کہ جب رتن سنگھ گھوڑے پر سوار ہوا تو خود ہی دل میں دیوی سے اس کی جان کی خیر منا رہی تھی۔ جب تک وہ درختوں کی آڑ میں چھپ نہ گیا وہ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر وہ قلعے کے سب سے اونچے برج پر چڑھ گئی اور گھنٹوں اسی طرف تاکتی رہی۔ ہاں سونا تھا۔ پہاڑیوں نے رتن سنگھ کو پہلے ہی اپنی گود میں چھپا لیا تھا۔ مگر چنتا کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سامنے چلے جا رہے ہیں۔ جب صبح کا سرخ منظر درختوں کے درمیان سے نظر آنے لگا تو اس کی محویت دور ہوئی۔ معلوم

پہنچ سکتا ہے۔ پہاڑوں کو پھاڑ سکتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے اسے ایسی آسودگی ہوئی گویا اس کی ساری مرادیں پوری ہوگئی ہیں۔ گویا اب وہ کسی سے کچھ نہیں چاہتا تھا شاید مہادیو جی کو بھی سامنے کھڑے ہوئے دیکھ کر منھ پھیر لے گا۔ کوئی بردان نہ مانگے گا۔ اسے اب کسی چیز کی بھی خواہش نہ تھی۔ اسے ایسا غرور ہو رہا تھا گویا اس سے زیادہ فارغ البال، اس سے زیادہ خوش نصیب شخص دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا۔

چنتا ابھی اپنی بات پوری نہ کرنے پائی تھی۔ اسی سلسلہ میں بولی۔ ہاں آپ کو میرے سبب البتہ ناقابل برداشت تکلیف اٹھانی پڑی۔

رتن سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ بلا تپسیا کے پھل نہیں ملتا۔

چنتا نے رتن سنگھ کو نازک ہاتھوں سے لٹاتے ہوئے کہا۔ اس پھل کے لیے تم نے تپسیا نہیں کی تھی۔ جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ تم صرف ایک کمزور عورت کی حفاظت کر رہے تھے۔ اگر میرے بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی تو بھی تم اتنی ہی تن دہی سے اس کی حفاظت کرتے مجھے اس کا یقین ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ میں نے تمام عمر کے لیے برہمچریہ (مجرد) کا عہد کر لیا تھا۔ مگر تمھاری جاں نثاری نے میرے اس عہد کو شکست کر ڈالا۔ میری پرورش بہادروں کی گود میں ہوئی ہے۔ میرا دل اسی شیر دل شخص کے قدموں پر نچھاور ہو سکتا ہے جو جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ شوقینوں کی اٹھکیلیوں، اور اوباشیوں کی نظر بازیوں اور چالاکوں کی چالاکیوں کی میرے دل میں ذرا بھی وقعت نہیں۔ ان کو ظاہرداریوں میں صرف تماشے کی طرح دیکھتی ہوں۔ تمھارے دل ہی میں میں نے سچا ایثار پایا ہے اور تمھاری کنیز ہوگئی۔ آج سے نہیں بلکہ بہت دنوں سے۔

(5)

وصال کی شب اولیں تھی۔ چاروں طرف سناٹا۔ صرف محبت بھرے دلوں میں تمناؤں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ چاروں طرف عشق افروز چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے تبسم آگیں منظر میں دولہا دلہن باہم اظہار عشق کر رہے تھے۔

دفعتاً خبر ملی کہ دشمنوں کی فوج قلعہ کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے۔ چنتا چونک پڑی۔ رتن سنگھ کھڑا ہوگیا۔ اور سامنے کھونٹی سے لٹکتی ہوئی تلوار اتار لی۔

چنتا نے اس کی طرف بزدلانہ محبت کی نظر سے دیکھ کر کہا۔ کچھ آدمیوں کو ادھر بھیج دو۔ تمھارے جانے کی کیا ضرورت ہے۔

رتن سنگھ نے بندوق کو کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ اب کے وہ لوگ بہت بڑی تعداد میں آرہے۔

چنتا: تو میں بھی چلوں گی۔

رتن: نہیں مجھے امید ہے کہ وہ لوگ ٹھہر نہ سکیں گے۔ میں ایک ہی حملہ میں ان کے قدم اکھاڑدوں گا۔ یہ ایشور کی مرضی ہے کہ ہماری سہاگ رات فتح کی رات ہو۔

چنتا: نہ جانے میرا دل کیوں ڈر رہا ہے۔ جانے دینے کو جی نہیں چاہتا۔

رتن سنگھ نے اس سادہ اور محبت آمیز گفتار سے بے قرار ہو کر چنتا کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔ میں صبح تک واپس آجاؤں گا، پیاری!

چنتا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر با چشم نم بولی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم بہت دنوں میں واپس آؤگے۔ میرا دل تمھارے ساتھ رہے گا۔ جاؤ مگر روزانہ خبر بھیجتے رہنا تمھارے پیروں پڑتی ہوں۔ موقع و محل کا خیال کر کے حملہ کرنا۔ تمھاری عادت ہے کہ دشمن کو دیکھتے ہی بے قرار ہو جاتے ہو۔ اور جان پر کھیل کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہو۔ تم سے میری التجا ہے کہ موقع دیکھ کر کام کرنا۔ جاؤ جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح منہ دکھاؤ۔

چنتا کا دل افسردہ ہوگیا اس میں پہلے صرف فتح کی تمنا تھی اب عافیت کی تمنا اس پر غالب تھی۔ وہی بہادر لڑکی جو شیرنی کی طرح گرج کر دشمنوں کے کلیجے ہلا دیتی تھی آج اتنی کمزور ہو رہی تھی کہ جب رتن سنگھ گھوڑے پر سوار ہوا تو خود ہی دل میں دیوی سے اس کی جان کی خیر منا رہی تھی۔ جب تک وہ درختوں کی آڑ میں چھپ نہ گیا وہ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر وہ قلعے کے سب سے اونچے برج پر چڑھ گئی اور گھنٹوں اسی طرف تاکتی رہی۔ ہال سونا تھا۔ پہاڑیوں نے رتن سنگھ کو پہلے ہی اپنی گود میں چھپا لیا تھا۔ مگر چنتا کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سامنے چلے جا رہے ہیں۔ جب صبح کا سرخ منظر درختوں کے درمیان سے نظر آنے لگا تو اس کی محویت دور ہوئی۔ معلوم

ہو رہا تھا چاروں طرف سونا ہے وہ روتی ہوئی برج سے اتری اور پلنگ پر منہ ڈھانک کر رونے لگی۔

(6)

رتن سنگھ کے ساتھ مشکل سے سو آدمی تھے۔ مگر سبھی مشاق۔ موقع اور تعداد کو خیال میں نہ لانے والے اور خود اپنی جان کے دشمن جو بہادرانہ جوش سے بھرے ہوئے اور اسی قسم کا ایک متحرک گیت گاتے ہوئے گھوڑوں کو بڑھاتے ہوئے چلے جاتے تھے۔

بانکی تیری باگ سپاہی اس کی رکھنا لاج
تیغ تبر کچھ کام نہ آوے بکتر ڈھال یوں ہی رہ جائے
رکھیو من میں لاگ
سپاہی بانکی تیری باگ، اس کی رکھنا لاج

پہاڑیاں ان جنگی نغموں سے گونج رہی تھیں۔ گھوڑوں کی آواز تال کا کام دے رہی تھیں۔ حتیٰ کہ رات گزر گئی۔ آفتاب نے اپنی سرخ آنکھیں کھول دیں اور ان جانبازوں پر زرافشانی کرنے لگا۔

وہیں خونیں اجالے میں دشمنوں کی ایک فوج ایک پہاڑی پر خیمے ڈالے ہوئے نظر آئی۔

رتن سنگھ سر جھکائے اور فرقت زدہ دل کو تھامے ہوئے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ قدم آگے بڑھتا تھا مگر دل پیچھے ہٹتا تھا آج زندگی میں اول مرتبہ خیالات پریشان نے اسے مشوش بنا رکھا تھا۔ کون جانتا تھا کہ جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ جس بہشت کی راحت کو چھوڑ کر آیا تھا اس کی یاد رہ رہ کر دل کو مسوس رہی تھی۔ چنتا کی آنسو بھری آنکھیں یاد آتی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ گھوڑے کی باگ موڑ دے ہر لحہ جنگ کا حوصلہ کم ہوتا جاتا تھا۔ دفعتاً ایک سردار نے قریب آکر کہا۔ بھیا وہ دیکھو اونچی پہاڑی پر دشمن ڈیرے ڈالے پڑا ہے تمھاری کیا رائے ہے؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ فوراً ان پر حملہ کر دیں۔ غافل پڑے ہوئے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ دیر کرنے سے وہ بھی سنبھل جائیں گے۔ اور تب معاملہ نازک ہو جائے گا۔ ایک ہزار سے کم نہ ہوں گے۔

رتن سنگھ نے متفکرانہ نگاہوں سے دشمن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہاں معلوم تو ہوتا ہے۔

سردار : تو پھر دھاوا بول دیا جائے نا؟

رتن : جیسی تمھاری مرضی ہو۔ تعداد زیادہ ہے یہ سوچ لو۔

سردار : اس کی پراوہ نہیں۔ ہم اس سے بڑی فوجوں کو شکست دے چکے ہیں۔

رتن : یہ سچ ہے۔ مگر آگ میں کودنا مصلحت نہیں۔

سردار : تم کہتے ہو؟ سپاہی کی زندگی ہی آگ میں کودنے کے لیے ہے تمھارے حکم کی دیر ہے۔ پھر ہمارا جیوٹ دیکھنا۔

رتن : ابھی ہم لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ذرا آرام کر لینا بہتر ہے۔

سردار : نہیں بھیا۔ ان کو ہماری آہٹ مل گئی تو غضب ہو جائے گا۔

رتن : تو پھر دھاوا بول ہی دو۔

ایک لمحہ میں بہادروں نے گھوڑوں کی باگیں اٹھا دیں اور نیزے سنبھالتے ہوئے دشمن کی فوج پر حملہ آور ہوئے۔ مگر پہاڑی پر جاتے ہی ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دشمن غافل نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ان کے بارے میں جو قیاس کیا تھا۔ وہ غلط تھا، وہ کافی ہوشیار ہی نہ تھے بلکہ خود قلعہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے جب انھیں سامنے آتے دیکھا تو سمجھ گئے غلطی ہوئی۔ لیکن اب مقابلہ کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا پھر بھی وہ مایوس نہ ہوئے۔ رتن سنگھ جیسے باکمال افسر کے ساتھ انھیں کسی قسم کا اندیشہ نہ تھا وہ اس سے بھی زیادہ مشکل مواقع پر اپنے جنگی کمال کی بدولت فتح یاب ہو چکا تھا۔ کیا آج وہ اپنا کمال نہ دکھائے گا۔ ساری آنکھیں رتن سنگھ کو کھوج رہی تھیں مگر اس کا وہاں کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ کہاں چلا گیا یہ کوئی نہ جانتا تھا۔

مگر وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ایسی نازک حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ ایسا تو ناممکن ہے وہ ضرور یہیں ہے اور ہاری بازی کے جیتنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا ہے۔

ایک لمحہ میں دشمن ان کے مقابل آپہنچے۔ اتنی کثرالتعداد فوج کے آگے یہ

مٹھی بھر آدمی کیا کر سکتے تھے۔ چاروں طرف سے رتن سنگھ کی پکار ہونے لگی۔ بھیّا تم کہاں ہو؟ ہمیں کیا حکم دیتے ہو؟ دیکھتے ہو وہ لوگ سامنے آپہنچے۔ مگر تم ابھی تک خاموش کھڑے ہو۔ سامنے آکر ہمیں راستہ دکھاؤ۔ ہمارا حوصلہ بڑھاؤ۔

مگر اب بھی رتن سنگھ نہ دکھائی دیا۔ یہاں تک کہ دشمن کی فوج سر پر آپہنچی اور دونوں فوجوں میں تلواریں چلنے لگیں۔ بندیلوں نے سر بکف ہو کر لڑنا شروع کیا مگر ایک کو ایک بہت ہوتا ہے ایک اور دس کا مقابلہ کیا۔ یہ لڑائی نہ تھی۔ جان کی بازی تھی۔ بندیلوں میں پاس کی غیر معمولی طاقت تھی۔ خوب لڑے۔ مگر کیا مجال کہ قدم پیچھے ہٹے۔ ان میں اب ذرا بھی جماعت بندی نہ تھی جس سے جس قدر آگے بڑھتے بنا بڑھا۔ انجام کیا ہوگا اس کی کسی کو فکر نہ تھی کوئی تو دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا افسر کے قریب پہنچ گیا۔ کوئی اس کے ہاتھی پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہوا مارا گیا ان کی غیر معمولی ہمت دیکھ کر دشمنوں کے دل سے صدائے آفرین نکلتی تھی۔ لیکن ایسے جانبازوں نے نام پایا ہے۔ فتح نہیں پائی۔ ایک گھنٹہ میں اسٹیج کا پردہ گر گیا۔ تماشہ ختم ہوگیا۔ ایک آندھی تھی جو آئی اور درختوں کو اکھاڑتی ہوئی چلی گئی۔ متحد رہ کر یہی مٹھی بھر آدمی دشمنوں کے دانت کھٹے کر سکتے تھے مگر جس پر جماعت بندی کا بار تھا اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ فتح مند مرہٹوں نے ایک ایک نعش کو غور سے دیکھا۔ رتن سنگھ ان کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا اسی پر ان کے دانت لگے تھے۔ رتن سنگھ کے جیتے جی انھیں نیند حرام تھی۔ لوگوں نے پہاڑی کی ایک ایک چٹان دیکھ ڈالی مگر رتن سنگھ ہاتھ نہ آیا۔ جیت ہوئی پر ادھوری۔

(7)

چنتا کے دل میں آج نہ جانے کیوں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے وہ کبھی اتنی کمزور نہ تھی۔ بندیلوں کی ہار ہی کیوں ہوگی۔ اس کا کوئی سبب تو وہ نہ بتا سکتی تھی۔ مگر یہ خیال اس کے دل سے کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔ اس بدنصیب کی قسمت میں محبت کا سکھ بھوگنا بدا ہوتا تو کیا بچپن ہی میں ماں مر جاتی۔ باپ کے ساتھ جنگل جنگل گھومنا پڑتا۔ گڈھوں اور غاروں میں رہنا پڑتا۔ اور وہ سہارا بھی تو بہت دن نہ رہا۔ باپ بھی منہ موڑ کر چل دئے۔ جب سے اس کو ایک روز بھی تو

چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ بد قسمتی کیا اب اپنا مکروہ تماشہ چھوڑ دے گی۔ آہ! اس کے کمزور دل میں اس وقت ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ ایشور اس کے پیارے شوہر کو آج بخیریت واپس لادے تو اسے لے کر کسی دور کے گاؤں میں جا بسے گی اور اپنے شوہر کی خدمت اور پرستش میں اپنی زندگی وقف کر دے گی۔ اس لڑائی سے ہمیشہ کے لیے منھ موڑلے گی۔ آج پہلی مرتبہ نسائیت کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔

شام ہوگئی تھی۔ آفتاب کسی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح سر جھکائے ہوئے کوئی چھپنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ دفعتاً ایک سپاہی برہنہ سر، برہنہ پا۔ بلا کسی ہتھیار کے اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ چنتا پر گویا بجلی گری۔ ایک لمحہ تک وہ مبہوت سی بیٹھی رہی۔ پھر اُٹھ کر گھبرائی ہوئی سپاہی کے پاس گئی۔ اور مضطربانہ لہجہ میں پوچھا۔ کون کون بچا؟

سپاہی نے کہا۔ کوئی نہیں

''کوئی نہیں! کوئی نہیں۔'' چنتا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

سپاہی نے پھر کہا۔ ''مرہٹے قریب آپہنچے۔''

''قریب آپہنچے ؟''

''بہت قریب''

''تو فوراً چتا تیار کراؤ۔ وقت نہیں ہے۔''

''ابھی ہم لوگ تو سرفروشی کے لیے حاضر ہی ہیں۔''

''تمھاری جو مرضی۔ میرے فرض کا تو یہیں خاتمہ ہے۔''

''قلعہ بند کر کے ہم مہینوں لڑسکتے ہیں۔''

''تو جاکر لڑو۔ میری لڑائی اب کسی سے نہیں ہے۔''

ایک طرف تاریکی روشنی کو پیروں تلے کچلنا چاہتی تھی، دوسری طرف فاتح مرہٹے لہراتے ہوئے کھیتوں کو۔ اور قلعہ میں چتابن رہی تھی۔ جیوں ہی چراغ جلے کہ چتا میں بھی آگ لگی۔ ستی چنتا سولہوں سنگار کیے اپنے حسن بے نظیر کا نظارہ پیش کرتی ہوئی خوشی خوشی آگ کی راہ سے اپنے سوامی کے ''لوک'' کی جاترا کرنے جا رہی تھی۔

(8)

چتا کے چاروں طرف عورت مرد جمع تھے۔ حریفوں نے قلعہ کو محصور کر لیا ہے اس کی کسی کو فکر نہ تھی۔ رنج و غم سے سب کے چہرے اداس اور سر جھکے ہوئے تھے۔ ابھی کل اسی صحن میں شادی کا منڈپ سجایا گیا تھا۔ اس وقت چتا سلگ رہی ہے وہیں کل ہون کنڈ تھا۔ کل بھی اسی طرح آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے اسی طرح لوگ جمع تھے۔ مگر آج اور کل کے مناظر میں کتنا فرق ہے! ہاں، مادی آنکھوں کے لیے فرق ہو سکتا ہے۔ مگر دراصل یہ اسی یگیہ کی آخری آہوتی اور اسی عہد کا ایفا ہے۔

دفعتاً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی پڑنے لگیں۔ معلوم تھا کوئی سپاہی گھوڑے کو سرپٹ بھگاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ ایک لمحہ میں ٹاپوں کی آواز بند ہوگئی اور ایک سپاہی صحن میں دوڑتا ہوا آپہنچا۔ لوگوں نے متحیر ہو کر دیکھا وہ رتن سنگھ ہے۔

رتن سنگھ چتا کے قریب جا کر ہانپتا ہوا بولا۔ "پیاری میں تو ابھی زندہ ہوں" یہ تم نے کیا کر ڈالا۔

چتا میں آگ لگ چکی تھی۔ چتا کی ساڑی سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے رتن سنگھ پاگلوں کی طرح چتا میں گھس گیا اور چنتا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگا۔ لوگوں نے چاروں طرف سے لپک لپک کر چتا کی لکڑیاں ہٹانی شروع کیں۔ مگر چنتا نے شوہر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ صرف ہاتھوں سے اس کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔

رتن سنگھ سر پیٹ کر بولا۔ ہائے پیاری تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ میری طرف دیکھتی کیوں نہیں۔ میں تو زندہ ہوں۔

چتا سے آواز آئی۔ تمھارا نام رتن سنگھ ہے۔ مگر تم میرے رتن سنگھ نہیں ہو۔ تم میری طرف دیکھو تو۔ میں ہی تمھارا خادم، تمھارا عقیدت مند، تمھارا شوہر ہوں، "میرا شوہر بہادروں کی موت مر چکا۔"

ہائے کس طرح سمجھاؤں۔ ارے لوگو! کسی طرح آگ کو ٹھنڈا کرو۔ میں رتن سنگھ ہی ہوں۔ پیاری! کیا تم مجھے پہچانتی نہیں ہو؟"

آگ کی لپٹ چنتا کے چہرے تک پہنچ گئی۔ آگ میں کنول کھل گیا۔ چنتا صاف

لہجہ میں بولی۔ خوب پہچانتی ہوں۔ تم میرے رتن سنگھ نہیں۔ میرا رتن سنگھ سچا سورما تھا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے اس نکمے جسم کو بچانے کے لیے اپنے چھتری دھرم کو ترک نہ کر سکتا تھا۔ میں جس جواں مرد کے قدموں پر نثار ہو چکی تھی وہ دیوتاؤں کی بہشت میں رونق افروز ہے۔ رتن سنگھ کو بدنام مت کرو۔ وہ بہادر راجپوت تھا۔ میدان جنگ سے بھاگنے والا بزدل نہیں۔

آخر الفاظ نکلے ہی تھے کہ آگ کی لپٹ چتا کے سر سے اوپر پہنچی۔ پھر ایک لمحہ میں وہ حسن کی مورت۔ وہ اعلیٰ بہادری کی پجارن، وہ سچی ستی آگ میں جل کر بھسم ہو گئی۔

رتن سنگھ خاموشی سے مبہوت سا کھڑا ہوا یہ دردناک نظارہ دیکھتا رہا۔ پھر یکایک آہ سرد بھر کر اسی چتا میں کود پڑا۔

(یہ افسانہ لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے مارچ 1927 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرودر 5 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'خواب و خیال' میں شامل ہے۔)

نغمۂ روح

(1)

آدھی رات ندی کا کنارا۔ آسمان کے ستارے ساکن تھے۔ ندی کے ستارے لہروں کے ساتھ رواں۔ ایک نغمۂ فردوس کی دلکش روح پرور مستانہ صدائیں۔ اس خاموش اور تاریک منظر پر اس طرح چھا رہی تھیں۔ جیسے دل پر امیدیں چھائی رہتی ہیں۔ یا چہرہ پر غم۔

رانی منورمانے آج گورودیکشالی تھی۔ سارے دن دان اور برت میں مصروف رہنے کے بعد میٹھی نیند کی گود میں سو رہی تھی۔ دفعتاً آنکھیں کھلیں اور یہ دلکش صدائیں کانوں میں پہنچیں۔ بیقرار ہوگئی۔ جیسے پروانہ شمع دیکھ کر۔ صبر کی تاب نہ رہی۔ جیسے چیونٹی شکر کی بوپاتے ہی بیتاب ہوجاتی ہے۔ اُٹھی اور دربانوں چوکیداروں کی نگاہیں بچاتی ہوئی راج محل سے باہر نکل آئی۔ جیسے نالۂ درد سن کر آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔

ساحل پر خاردار جھاڑیاں تھیں۔ اُونچے کگار تھے۔ خوفناک جانور تھے۔ ان کی ہیبت ناک صدائیں تھیں۔ لاشیں تھیں اور ان سے زیادہ ان کا خیال تھا۔ منورما ناز و نزاکت کی پتلی تھی۔ پر نغمۂ شیریں کی کشش اسے ایک عالم محویت میں کھینچے لیے جاتی تھی۔ خطروں سے بے خبر۔

وہ گھنٹوں سرگرم رفتار رہی۔ یہاں تک کہ ندی راستہ میں حائل ہوگئی۔

(2)

منورمانے بے بسی کے ساتھ ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کنارے پر ایک کشتی نظر آئی مانجھی سے بولی۔ "میں اس پار جاؤں گی۔ اس دلکش راگ نے مجھے بیتاب کردیا ہے۔"

مانجھی: رات کو ناؤ نہیں کھول سکتا۔ ہواتیز ہے۔ لہریں ڈراونی۔ جان جوکھم ہے۔

منورما: میں رانی منورما ہوں۔ ناؤ کھول دے۔ منہ مانگی مزدوری دوں گی۔

مانجھی : تب تو ناؤ کسی طرح نہیں کھول سکتا۔ رانیوں کا اس ندی میں گزارہ نہیں۔

منورما : چودھری تیرے پاؤں پڑتی ہوں جلد ناؤ کھول دے۔ میری روح اس طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔

مانجھی : کیا انعام ملے گا؟

منورما : جو تو مانگے۔

مانجھی : آپ ہی کہہ دیں۔ میں گنوار کیا جانوں۔ رانیوں سے کیا چیز مانگنی چاہئے۔ کہیں کوئی ایسی چیز نہ مانگ بیٹھوں جو آپ کی شان کے خلاف ہو۔

منورما : میرا یہ ہار نہایت بیش قیمت ہے۔ میں اس کھیوے میں دیتی ہوں۔

منورما نے گلے سے ہار نکالا۔ اس کی ضیاء سے مانجھی کا چہرہ روشن ہوگیا۔ تند اور کرخت جس پر ایک مدت دراز کی سیاہی نے جھریاں ڈال دی تھیں۔

دفعتاً منورما کو ایسا معلوم ہوا کہ نغمہ کی صدا قریب تر ہوگئی۔ شاید کوئی عارف اپنی خودمستی کے عروج میں اس ساحل پر بیٹھا ہوا۔ فضاء تاریک کو مترنم کررہا ہے۔ رانی کا سینہ اُچھلنے لگا۔ آہ کتنا دلسوز نغمہ تھا۔ اس نے بے صبر ہوکر کہا۔ "مانجھی اب دیر نہ کرو۔ ناؤ کھول میں ایک لمحہ بھی صبر نہیں کرسکتی"۔

مانجھی : اس ہار کو لے کر میں کیا کروں گا؟

منورما : سچے موتی ہیں۔

مانجھی : اور بھی مصیبت۔ مانجھن گلے میں ڈال کر پڑوسیوں کو دکھائے گی۔ وہ سب ڈاہ سے جلیں گی۔ اسے گالیاں دیں گی۔ کوئی چور دیکھے گا تو اس کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگے گا۔ میری سنسان جھونپڑی میں دن دہاڑے ڈاکہ پڑ جائے گا۔ لوگ چوری کا اپرادھ لگائیں گے۔ نہیں مجھے یہ ہار نہیں چاہئے۔

منورما : تو جو کچھ مانگ وہی دوں گی۔ لیکن دیر نہ کر مجھے اب صبر نہیں ہے۔ انتظار کی مطلق تاب نہیں۔ اس راگ کی ایک ایک تان میری روح کو تڑپائے دیتی ہے۔

مانجھی : اس سے اچھی کوئی چیز دیجیے۔

منورما : آہ ظالم! تو مجھے باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا ہے۔ میں جو دیتی ہوں وہ لیتا نہیں آپ کچھ مانگتا نہیں۔ تجھے کیا معلوم میرے دل کی اس وقت کیا حالت

ہو رہی ہے۔ میں اس روحانی نعمت پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔

مانجھی : اور کیا دیجیے گا۔

منورما : میرے پاس اس سے بیش قیمت کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن تو ابھی ناؤ کھول دے تو وعدہ کرتی ہوں۔ تجھے اپنا محل دے دوں گی۔ جیسے دیکھنے کے لیے شاید کبھی تو بھی گیا ہو۔ خالص سنگ مرمر ہے۔ ہندوستان میں اس کا ثانی ہے نہیں۔ اب ایک لمحہ کی بھی دیر نہ کرو۔

مانجھی : (ہنس کر) اس محل میں رہ کر مجھے کیا آرام ملے گا۔ اُلٹے میرے بھائی بند دشمن ہو جائیں گے۔ اس ناؤ پر اندھیری رات میں بھی ڈر نہیں لگتا۔ آندھی چلتی رہتی ہے اور میں اس پر پڑا رہتا ہوں۔ لیکن وہ محل تو دن ہی کو پھاڑ کھائے گا۔ میرے گھر کے آدمی تو اس کے ایک کونے میں سماجائیں گے۔ اور آدمی کہاں سے لاؤں گا۔ میرے نوکر چاکر کہاں اتنا مال اسباب کہاں اس کی صفائی اور مرمت کہاں سے کراؤں گا۔ اس کی پھلواریاں سوکھ جائیں گی۔ اس کی کیاریوں میں گیدڑ بولیں گے اور اٹاریوں پر کبوتر اور ابابیلیں گھونسلے بنائیں گی۔

منورما دفعتاً ایک عالم مستی میں اُچھل پڑی۔ اسے معلوم ہوا کہ نغمہ قریب تر آگیا ہے۔ اس کی نزاکت اور لطافت زیادہ روشن ہوگئی تھی۔ جیسے بتی اکسا دینے سے چراغ زیادہ روشن ہوجاتا ہے۔ پہلے دلکش تھا تو اب ولولہ خیز ہوگیا تھا۔ منورما نے بیتاب ہوکر کہا۔ آہ! تو پھر تو اپنی زبان سے کیوں کچھ نہیں مانگتا۔ اُف اکتنا معرفت انگیز راگ ہے۔ کتنا وجد میں لانے والا۔ میں اب مطلق صبر نہیں کرسکتی۔ پانی نشیب میں جانے کے لیے جتنا بے قرار ہوتا ہے سانس ہوا کے لیے جتنی بے قرار ہوتی ہے۔ بو اُڑجانے کے لیے جتنی بے قرار ہوتی ہے۔ میں اس نغمہ کے لیے اتنی ہی بے قرار ہوں۔ اس نغمہ میں کوئل کی سی مستی ہے پپیہے کا درد ہے شیاما کا گداز ہے۔ اس میں آبشاروں کا زیر ہے طوفان کا بم ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے۔ جس سے معرفت بیدار ہوتی ہے۔ جس سے روح وجد کرتی ہے۔ جس سے قلب مرتعش ہوتا ہے۔ مانجھی اب ایک چھن کی دیر بھی میرے لیے عذاب موت ہے۔ جلد ناؤ کھول جس پھول کی یہ مہک ہے۔ جس چراغ کی روشنی ہے۔ اس تک مجھے پہنچادے میں دیکھ نہیں سکتی اس نغمہ کا خالق کہیں قریب ہی بیٹھا ہوا ہے۔ بہت قریب۔

مانجھی : " آپ کا محل میرے کام کا نہیں ہے۔ میری جھونپڑی اس سے کہیں زیادہ سہاونی ہے"۔

منورما : ہائے تو اب تجھے کیا دوں۔ یہ نغمہ نہیں ہے۔ یہ اس فضاء وسیع کی نزہت ہے۔ یہ سارے پھولوں کی روح ہے۔ ساری شیرینیوں کا عطر ہے۔ ساری حلاوتوں کا ساری کیفیتوں کا خلاصہ ہے۔ ناؤ کھول۔ میں جب تک جیوں گی تیری خدمت کروں گی۔ تیرے لیے پانی بھروں گی۔ تیرے جھوپڑے کی خاکروبی کروں گی۔ ہاں میں تیری راہ کے کنکر چنوں گی۔ تیرے جھونپڑے کو پھولوں سے سجاوں گی۔ تیری مانجھن کے پیر ملوں گی۔ پیارے مانجھی اگر میرے پاس سو جانیں ہوتیں تو میں اس نغمہ کے نذر کرتی۔ ایشور کے لیے اب مجھے مایوس نہ کر میرے صبر کا آخری قطرہ خشک ہو گیا اب اس اشتیاق میں شعلہ کی سوزش اور جلن ہے۔ اب یہ سر تیرے قدموں پر ہے۔

یہ کہتے کہتے منورما ایک جنون وجد کی حالت میں مانجھی کے قریب جاکر اس کے پیروں پر گر پڑی۔ اسے معلوم ہوا گویا وہ نغمہ روح پرور کسی شمع روشن کی طرح نور برستا ہوا میری طرف چلا آتا ہے۔ اس کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ وہ مست ہو کر جھومنے لگی ایسا معلوم ہوا کہ میں اڑی جاتی ہوں۔ اسے اپنے پہلو میں ستارے جھلملاتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس پر ایک بیخودی کا سرور چھا گیا اور تب وہی مستانہ نغمہ۔ وہی دلکش راگ اس کے منہ سے نکلنے لگا۔ وہی آب حیات کی بوندیں اس کے لبوں سے ٹپکنے لگیں۔ وہ خو اس نغمہ کا منبع تھی۔ ندی پار سے آنے والی روح پرور صدائیں اسی کے منہ سے نکل رہی تھیں۔

منورما کا چہرہ چاند کی طرح روشن ہو گیا تھا اور آنکھوں سے پریم کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

(یہ افسانہ پہلی بار اردو میں نیرنگ خیال کے مارچ، اپریل 1927 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ 'خاک پروانہ' میں شامل ہے۔ ہندی میں لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے اگست 1927 کے شمارے میں اُتم سنگیت کے عنوان سے شائع ہوا مان سرورور 5 میں شامل ہے۔

نخلِ اُمیّد

راجہ اندر ناتھ کا انتقال ہو جانے کے بعد کنور راج ناتھ کو دشمنوں نے چاروں طرف سے ایسا دبایا کہ انھیں اپنی جان بچا کر ایک اپنے دیرینہ خادم کے یہاں پناہ گزین ہونا پڑا جو ایک چھوٹے سے گاؤں کا جاگیردار تھا۔ کنور فطرتاً امن پسند، شعریت کے دلدادہ، ہنس کھیل کر وقت گزارنے والے نوجوان تھے۔ میدان جنگ کی بہ نسبت فضائے شعریت میں اپنا کمال دکھانا انھیں مرغوب تھا۔ سخن نواز احباب کے ساتھ کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے شعر و سخن کی گفتگو کرتے ہوئے ان میں جو حِظ حاصل ہوتا تھا وہ شکار یا شاہی دربار میں نہیں۔ اس پہاڑوں سے گھرے ہوئے گاؤں میں آکر انھیں جس سکون وسرور کا احساس ہوا، اس کے عوض وہ ایسے کئی کئی راج نچھاور کر سکتے تھے۔ جو پہاڑوں کی دلکش فضا، یہ نظر فریب سبزی، یہ دریائے رواں کا نغمۂ شیریں، یہ پرندوں کی دلکش آوازیں، یہ ہرن کے بچوں کی چھلانگیں، یہ دیہاتوں کی طفلانہ سادگی، یہ عورتوں کی محبوب شوخی یہ سبھی باتیں ان کے لیے نئی تھیں۔ مگر ان سبھوں سے بڑھ کر جو چیز ان کو اپنی جانب کھینچ رہی تھیں وہ جاگیردار کی نوجان لڑکی چندا تھی۔

چندا گھر کا سارا کام کاج خود ہی کرتی تھی۔ اس کو ماں کی گودی کھیلنا نصیب ہی نہ ہوا تھا۔ باپ کی خدمت گزاری میں ہی مصروف رہتی تھی۔ اس کی شادی اسی سال ہونے والی تھی کہ اسی درمیان میں کنور نے آکر اس کی زندگی میں نئے جذبات اور نئی امیدوں کی بنیاد ڈال دی۔ اس نے اپنے شوہر کی جو خیالی تصور اپنے دل میں کھینچ رکھی تھی۔ وہی گویا مجسم ہو کر اس کے سامنے آگئی تھی۔ ساتھ ہی کنور کی خیالی محبوبہ بھی چندا ہی کی شکل میں آموجود ہوتی تھی۔ لیکن کنور سمجھتے تھے کہ میرے ایسے نصیب کہاں۔ چندا بھی سمجھتی تھی، کہاں یہ اور کہاں میں؟

(2)

دوپہر کا وقت تھا اور جیٹھ کا مہینہ کھپریل کا مکان بھٹی کی طرح جلنے لگا۔ خس

کی ٹٹیوں اور تہ خانوں میں رہنے والے راج کنور کی طبیعت گرمی سے اس قدر پریشان ہوئی کہ وہ باہر نکل آئے اور سامنے کے باغ میں جا کر ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ دفعتاً انھوں نے دیکھا کہ چندا ندی سے پانی کا گھڑا لیے ہوئے چلی آرہی ہے۔ نیچے جلتی ہوئی ریت تھی۔ اوپر جلتا ہوا سورج۔ لو سے بدن جھلسا جاتا تھا۔ شاید اس وقت پیاس سے تڑپتے ہوئے آدمی کی بھی ندی تک جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ چندا پانی کیوں لینے گئی تھی۔ گھر میں پانی موجود ہے۔ پھر اس وقت وہ کیوں پانی لینے نکلی؟

کنور دوڑ کر اس کے پاس جا پہنچے اور اس کے ہاتھ سے گھڑا چھین لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ مجھے دے دو اور بھاگ کر سایہ میں چلی جاؤ۔ اس وقت پانی کا کیا کام تھا۔

چندا نے گھڑے کو نہ چھوڑا۔ سر سے کھسکا ہوا آنچل سنبھال کر بولی۔ تم اس وقت کیسے آگئے؟ شاید گرمی کے سبب اندر نہ رہ سکے۔

کنور: مجھے دے دو۔ ورنہ میں چھین لوں گا۔

چندا نے مسکرا کر کہا۔ راج کماروں کو گھڑا لے کر چلنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

کنور نے گھڑے کا منھ پکڑ کر کہا۔ اس قصور کی کافی سزا بھگت چکا ہوں۔ چندا! اب تو اپنے آپ کو راج کنور کہنے میں بھی شرم معلوم ہوتی ہے!

چندا: دیکھو دھوپ میں خود پریشان ہوتے ہو اور مجھے بھی پریشان کرتے ہو۔ گھڑا چھوڑ دو۔ سچ کہتی ہوں یہ پانی پوجا کے لیے ہے۔

کیا میرے لے جانے سے پوجا کا پانی نجس ہو جائے گا؟

اچھا بھائی نہیں مانتے تو تمھیں لے چلو۔ ہاں، نہیں تو؟

کنور گھڑا لے کر آگے آگے چلے اور چندا پیچھے پیچھے۔ باغیچے میں پہنچے تو چندا ایک چھوٹے سے پودے کے پاس رک کر بولی۔ اسی دیوتا کی پوجا کرنی ہے۔ گھڑا رکھ دو۔

کنور نے تعجب سے پوچھا۔ یہاں کون دیوتا ہے؟ مجھے تو نہیں نظر آتا۔

چندا نے پودے کو سینچتے ہوئے کہا۔ یہی تو میرا دیوتا ہے۔

پانی پڑنے سے پودے کی مرجھائی ہوئی پتیاں ہری ہوگئیں۔ گویا اس کی آنکھیں کھل گئی ہوں۔

کنور نے پوچھا۔ یہ پودا کیا تم نے لگایا ہے چندا ؟

چندا نے پودے کو ایک سیدھی لکڑی سے باندھتے ہوئے کہا۔ ہاں اس دن تو جب تم یہاں آئے۔ یہاں پہلے میری گڑیوں کا گھروندا تھا۔ میں نے گڑیوں پر سایہ کی غرض سے ایک امولا لگا دیا تھا۔ پھر مجھے اس کی یاد نہ رہی، گھر کے کام دھندوں میں بھول گئی۔ جس دن تم یہاں آئے، مجھے نہ جانے کیوں اس پودے کی یاد آگئی۔ میں نے آکر دیکھا تو یہ خشک ہو گیا تھا۔ میں نے فوراً پانی لا کر اس کو سینچا تو کچھ کچھ تازگی آگئی۔ تب سے روزانہ اسے سینچتی ہوں۔ دیکھو کتنا سر سبز ہو گیا ہے۔

یہ کہتے کہتے اس نے سر اٹھا کر کنور کی طرف تاکتے ہوئے کہا اور سب کام بھول جاؤں، پر اس پودے کو پانی دینا نہیں بھولتی۔ تمھیں اس کے پران داتا ہو۔ تمھیں نے آکر اس کو جلا دیا۔ ورنہ بے چارہ سوکھ ہی گیا تھا۔ یہ تمھارے خوش آمدید کی بارگاہ ہے۔ ذرا اسے دیکھو تو، معلوم ہوتا ہے ہنس رہا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ سچ کہتی ہوں، کبھی یہ روتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے، کبھی روٹھتا ہے۔ آج تمھارا لایا ہوا پانی پا کر پھولا نہیں سماتا۔ ایک ایک پتہ تمھارا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

کنور کو ایسا معلوم ہوا، گویا وہ پودا کوئی ننھا سا کھیلتا ہوا بچہ ہے، جسے چومنے سے خوش ہو کر کوئی بچہ گودی میں آنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے اسی طرح یہ پودا بھی ہاتھ پھیلاتا ہوا معلوم ہوا۔ اس کے ایک ایک رگ ریشہ میں چندا کی محبت جھلک رہی تھی۔

چندا کے گھر میں کشا ورزی کے سبھی آلات تھے۔ کنور ایک پھاوڑا اٹھا لائے اور پودے کا ایک تھالا بنا کر اس کے گرد ایک مینڈھ قائم کر دی۔ پھر کھرپی لے کر اندر کی مٹی کو گوڑ دیا۔ پودا اور بھی لہلہا اٹھا۔

چندا بولی۔ کچھ سنتے ہو! کیا کہہ رہا ہے ؟

کنور نے مسکرا کر کہا۔ ہاں کہتا ہے کہ اماں کی گود میں بیٹھوں گا۔

چندا : نہیں! کہہ رہا ہے کہ اتنی محبت کر کے پھر بھول نہ جانا۔

(3)

مگر کنور کے لیے ابھی شاہزادہ ہونے کی سزا بھگتنی باقی تھی۔ دشمنوں کو نہ جانے کیسے ان کا سراغ لگ گیا۔ ادھر تو خیر خواہوں کے اصرار سے مجبور ہو کر بوڑھا کبیر سنگھ چندا اور کنور کے بیاہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ادھر حریفوں کا ایک دستہ سر پر آپہنچا۔ کنور نے اس پودے کے آس پاس پھول پتے لگا کر ایک پھلواڑی سی سجا دی تھی۔ پودے کو سینچنا ان کا کام تھا۔ علی الصبح وہ کندھے پر کانور رکھے ندی سے پانی لا رہے تھے کہ دس بارہ آدمیوں نے انھیں راستہ میں گھیر لیا۔ کبیر سنگھ تلوار لے کر دوڑا۔ مگر دشمنوں نے اسے مار گرایا۔ تنہا غیر مسلح کنور کیا کرتا۔ کندھے پر کانور رکھے ہوئے بولا۔ اب کیوں میرے پیچھے پڑے ہو بھائی؟ میں نے تو سب کچھ چھوڑ دیا۔

سردار بولا۔ "ہمیں آپ کو پکڑلے جانے کا حکم ہے۔"

کنور : تمھارا آقا مجھے اس حالت میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خیر اگر دھرم سمجھو، تو کبیر سنگھ کی تلوار مجھے دے دو تاکہ اپنی آزادی کے لیے لڑ کر مر جاؤں۔"

اس کا جواب یہی ملا کہ سپاہیوں نے کنور کو پکڑ کر ان کی مشکیں باندھ دیں۔ اور پھر انھیں ایک گھوڑے پر بٹھا کر، گھوڑے کو بھگا دیا۔ کانور وہیں پڑی رہ گئی۔

اسی وقت چندا گھر میں سے نکلی۔ دیکھا کہ کانور پڑی ہوئی ہے اور کنور کو لوگ گھوڑے پر بٹھائے لیے جارہے ہیں۔ چوٹ کھائے ہوئے پرند کی طرح وہ کئی قدم دوڑی اور پھر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

دفعتاً اس کی نظر باپ کی نعش پر پڑی۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور نعش کے پاس جا پہنچی۔ کبیر ابھی مرا نہ تھا۔ جان آنکھوں میں اٹکی ہوئی تھی۔

وہ چندا کو دیکھتے ہی نہایت کمزور لہجہ میں بولا۔ "بیٹی کنور" اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔ جان نکل گئی۔ مگر "کنور" کے ایک لفظ نے اس کا مطلب ظاہر کر دیا۔

(4)

بیس سال گذر گئے۔ کنور قید سے رہائی نہ پا سکے۔

یہ ایک پہاڑی قلعہ تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ قلعہ میں انھیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ نوکر چاکر، کھانا کپڑا، سیر وشکار، کسی بات کی کمی نہ تھی۔

مگر اس جدائی کی آگ کو کون ٹھنڈا کرتا جو ہر وقت کنور کے دل میں جلا کرتی اب ان کی زندگی میں کوئی امید نہ تھی۔ کوئی اجالا نہ تھا۔ اگر کوئی خواہش تھی تو صرف یہی کہ ایک بار اس محبت کے تیرتھ کی یاترا کر لیں۔ جہاں انھیں وہ سب کچھ ملا جو انسان کو مل سکتا ہے۔ ہاں ان کے دل میں صرف یہی ایک خواہش تھی کہ اس پاک یادگار سے معمور سر زمین کی زیارت کر کے اپنی زندگی کا اس ندی کے کنارے خاتمہ کردیں۔ وہی ندی کا کنارہ، وہی درختوں کا کنج، وہی چندا کا چھوٹا سا خوبصورت مکان ان کی نگاہوں میں پھرا کرتا، اور وہ پودا جسے دونوں نے مل کر سینچا تھا۔ اس میں تو گویا اس کی جان ہی تھی۔ کیا وہ دن بھی آئے گا جب وہ اس پودے کو سرسبز پتیوں سے آراستہ دیکھے گا۔ کون جانے وہ اب ہے بھی یا خشک ہوگیا۔ کون اب اس کو سینچتا ہوگا؟ چندا اتنے دنوں تک بے بیاہی تھوڑا ہی بیٹھی ہوگی۔ ایسا ممکن بھی تو نہیں۔ اسے اب میری بھی یاد نہ ہوگی۔ ہاں شاید کبھی اس کو اپنے گھر کی یاد کھینچ لاتی ہو تو پودے کو دیکھ کر اسے میری یاد آجاتی ہو۔ مجھ جیسے بد نصیب کے لیے اس سے زیادہ اور کر ہی کیا سکتی ہے۔ اس سر زمین کو وہ ایک بار دیکھنے کے لیے اپنی زندگی دے سکتا تھا۔ مگر اس کی خواہش پوری نہ ہوتی تھی۔

آہ ایک زمانہ گزر گیا۔ غم و یاس نے اٹھتی ہوئی جوانی کو کچل ڈالا۔ نہ آنکھوں میں روشنی رہی اور نہ پیروں میں طاقت، زندگی کیا تھی۔ ایک رنج افزا خواب تھا۔ اس گھنی تاریکی میں اس کو کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بس زندگی کا سہارا ایک خواہش تھی۔ ایک خوش کن خواب، جسے زندگی میں نہ جانے اس نے کب دیکھا تھا۔ ایک بار پھر وہی خواب دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر اس کی خواہشوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسے کوئی حسرت نہ رہے گی۔ سارا غیر محدود مستقبل، ساری لا انتہا حسرتیں، اسی ایک خواب میں جذب ہو جاتی تھیں۔

اس کے محافظوں کو اب اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ انھیں اس پر رحم آتا تھا۔ رات کو پہرہ پر صرف کوئی ایک شخص رہ جاتا۔ اور لوگ میٹھی نیند سوتے تھے۔ کنور بھاگ سکتا ہے اس کا کوئی امکان کوئی اندیشہ نہ تھا۔ یہاں تک ایک روز یہ ایک پہرہ دار بھی بے فکر ہو کر بندوق لیے لیٹ رہا۔ نیند کسی خونخوار درندے کی

طرح تاک لگائے بیٹھی تھی۔ لیٹتے ہی ٹوٹ پڑی۔ کنور نے سپاہی کے خراٹے سنے۔ ان کا دل تیزی سے اچھلنے لگا۔ یہ موقع آج کتنے دنوں کے بعد ملا تھا وہ اٹھے۔ مگر پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ برآمدے کے نیچے قدم رکھنے کی جرآت نہ ہوسکی۔ کہیں اس کی نیند کھل گئی تو تشدد ان کی مدد کر سکتا تھا۔ سپاہی کی بغل میں اس کی تلوار پڑی تھی مگر محبت کو تشدد سے عداوت ہے۔ کنور نے سپاہی کو جگادیا' وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ رہا سہا اندیشہ بھی اس کے دل سے جاتا رہا۔ دوسری بار جو سویا تو وہ اور بھی خراٹے بھرنے لگا۔

علی الصبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے لپک کر کنور کے کمرہ میں جھانکا۔ کنور کا پتہ نہ تھا۔

کنور اس وقت ہوا کے گھوڑوں پر سوار خیال کی تیزی کے ساتھ بھاگا جارہا تھا۔ اس مقام کو جہاں اس نے مسرت کا خواب دیکھا تھا۔

قلعہ میں چاروں طرف تلاش ہوئی۔ افسر نے سوار دوڑائے۔ مگر کنور کا کہیں پتہ نہ تھا۔

(5)

پہاڑی راستوں کو طے کرنا مشکل، اس پر نا معلوم مقام کی قید، موت کے فرشتے پیچھے لگے ہوئے' جن سے بچنا دشوار۔ کنور کو ایک منزل مقصود تک پہنچنے میں مہینوں لگ گئے، جب سفر پورا ہوا تو کنور میں ایک خواہش کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا تھا۔ دن بھر کی مسافت کے بعد جب وہ اس مقام پر پہنچے تو شام ہوگئی تھی۔ وہاں بستی کا نام بھی نہ تھا۔ البتہ دوچار ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے اس بستی کے نشان کی صورت میں باقی رہ گئے تھے۔ وہ جھونپڑا جس میں کبھی محبت کا اُجالا تھا جس میں انھوں نے زندگی کی مسرت بھری گھڑیاں کاٹی تھیں۔ جو ان کی تمناؤں کا مرکز اور ان کی پوجا کا مندر تھا۔ اب ان کے دل کی طرح ویران ہوگیا تھا۔ جھونپڑے کی ویرانی خاموش زبان میں اپنی رقت بھری داستان سنارہی تھی۔ کنور اسے دیکھتے ہی "چندا چندا" پکارتا ہوا دوڑا۔ اس نے وہاں کی خاک کو ماتھے پر لگایا۔ گویا کسی دیوتا کی بھبھوت ہو' اور اس کی شکستہ دیواروں سے لپٹ کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ ہائے اے تمنا! وہ رونے ہی کے لیے اتنی

دور سے یہاں آیا تھا؟ رونے ہی کی تمنا اس کو اتنے دنوں سے بیتاب کر رہی تھی۔ مگر اس رونے میں کتنا بہشت کا سا سرور تھا۔ کیا کل دنیا کا سکھ ان آنسوؤں کی برابری کر سکتا تھا۔

پھر وہ جھونپڑے سے نکلا۔ سامنے میدان میں ایک درخت' سرسبز پتوں کو گود میں لیے گویا اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے کھڑا تھا۔ یہ وہی پودا تھا جسے آج سے بیس سال قبل ان دونوں نے نصب کیا تھا۔ کنور دیوانہ واردوڑا اور جاکر درخت سے لپٹ گیا۔ گویا کوئی باپ اپنے بے ماں کے بچہ کو سینہ سے لگائے ہوئے ہو۔ وہ اُسی محبت کی نشانی ہے۔ اسی لازوال محبت کی جو اتنے دنوں کے بعد آج اس قدر بڑھ گئی ہے۔ کنور کا دل ایسا شگفتہ ہوگیا۔ گویا وہ اس درخت کو اپنے اُندر رکھ لے گا کہ اسے ہوا کا جھونکا بھی نہ لگے۔ اس کے ایک ایک پتے پر چندا کی یاد منقش تھی۔ چڑیوں کا اتنا سہانا گیت کیا اس نے کبھی سنا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سکت نہ تھی۔ سارا بدن بھوک پیاس اور تکان سے مضمحل ہو رہا تھا۔ مگر وہ اس درخت پر چڑھ گیا۔ اس قدر تیزی سے کہ بندر بھی نہ چڑھتا۔ سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر اس نے چاروں طرف فخریہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہی اس کی اُمیدوں کا بہشت تھا۔ سارے منظر میں چندا ہی چندا تھی۔ دور کی نیلگوں پہاڑیوں پر چندا بیٹھی گا رہی تھی۔ آسمان پر تیرنے والی سرخ کشتیوں میں چندا بیٹھی اُڑی جارہی تھی۔ آفتاب کی سفید زرد شعاعوں پر چنداہی بیٹھی ہنس رہی تھی۔ کنورنے یہ خیال کیا کہ پرندہ ہوتا تو انھیں شاخوں پر بیٹھا ہوا زندگی کے دن گزار دیتا۔

جب اندھیرا ہوگیا تو کنور نیچے اُترا اور اسی درخت کے نیچے تھوڑی سی زمین صاف کر کے پتوں کا بستر لگایا اور اسی پر پڑرہا۔ یہی اس کی زندگی کا بہشتی خواب تھا۔ آہ یہی ترک دنیا! اب وہ اس درخت کا دامن چھوڑ کر اور کہیں بھی نہ جائے گا۔ دہلی کے تخت کے لیے بھی وہ اس جگہ کو نہ چھوڑے گا۔

(6)

اسی خوشنما اور صاف چاندنی میں دفعتاً ایک چڑیا آکر اس درخت پر بیٹھ گئی اور درد بھری آواز میں گانے لگی۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ درخت سردھن رہا ہے۔ وہ

پرسکوت رات اس درد بھرے راگ سے ہل اُٹھی۔ کنور کا دل اس طرح پیچ و تاب کھانے لگا گویا وہ شق ہوجائے گا۔ اس آواز میں درد اور فراق کے تیر سے بھرے ہوئے تھے۔ آہ' چڑیا تیرا جوڑا بھی ضرور بچھڑ گیا ہے ور نہ تیری آواز میں اتنا درد' اتنا سوز' اتنا شیون کہاں سے آتا۔ کنور کے دل کے ٹکڑے ہوجاتے تھے۔ ایک ایک راگ تیر کی طرح دل کو چھید ڈالتا تھا۔ وہاں بیٹھے نہ رہ سکے۔ اٹھ کر ایک بے خودی کی حالت دوڑتے ہوئے جھونپڑے میں گئے وہاں سے پھر درخت کے نیچے آئے۔ اس چڑیا کو کیسے پائیں۔ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

چڑیا کا گانا بند ہوا تو کنور کو نیند آگئی۔ انھیں خواب میں ایسا معلوم ہوا کہ وہی چڑیا اُن کے پاس آئی۔ کنور نے غور سے دیکھا تھا تو وہ چڑیا نہ تھی۔ چندا تھی۔ مجسم چندا تھی۔

کنور نے پوچھا۔ چندا یہ چڑیا یہاں کہاں سے آئی؟

چندا نے کہا۔ میں ہی تو وہ چڑیا ہوں۔

کنور : تم چڑیا ہو۔ کیا تمھیں گا رہی تھیں۔

چندا : ہاں پیارے میں ہی گا رہی تھی۔ اس طرح روتے ایک زمانہ گزر گیا۔

کنور : تمھارا گھونسلا کہاں ہے؟

چندا : اسی جھونپڑے میں جہاں تمھارا پلنگ تھا۔ اس پلنگ کے بان میں میں نے اپنا گھونسلا بنایا ہے۔

کنور : اور تمھارا جوڑا کہاں ہے۔

چندا : میں اکیلی ہوں۔ چندا کو اپنے پیارے کو یاد کرنے اور اس کے لیے رونے میں جو سکھ ہے وہ جوڑے میں نہیں۔ میں اکیلی اسی طرح رہوں گی اور اکیلی مروں گی۔

کنور: میں کیا چڑیا نہیں ہوسکتا؟

چندا چلی گئی۔ کنور کی آنکھ کھل گئی۔ صبح کی سرخی آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ چڑیا کنور کی آرام گاہ کے قریب ایک شاخ پر بیٹھی ہوئی چہک رہی تھی۔ اب اس میں فغاں نہ تھی۔ فریاد نہ تھی۔ اس میں سرور تھا۔ شوخی تھی۔ حظ تھا۔ وہ فراق کی گریہ وزاری نہیں وصال کا نغمہ شیریں تھا۔

کنور سوچنے لگا۔ اس خواب میں کیا راز ہے۔

(7)

کنور نے بستر سے اٹھتے ہی ایک جھاڑو بنایا۔ اور اس جھونپڑے کو صاف کرنے لگے۔ ان کے جیتے جی اس کی یہ تباہ حالت نہیں رہ سکتی۔ وہ اس کی دیواریں اٹھائیں گے۔ اس پر چھپر ڈالیں گے۔ اسے لیپیں گے۔ اس میں ان کی چندا کی یادگار موجود ہے۔ جھونپڑے کے ایک گوشہ میں وہ کانور رکھی ہوئی تھی۔ جس پر وہ پانی لا لا کر اس درخت کو سینچتے تھے۔ انھوں نے کانور اٹھالی اور پانی لانے چلے۔ دو روز سے کچھ نہ کھایا تھا۔ رات کو بھوک معلوم ہوئی تھی۔ مگر اس وقت کھانے کو بالکل جی نہ چاہتا تھا۔ بدن میں ایک عجیب جذبہ کا احساس ہوتا تھا۔ انھوں نے ندی سے پانی لا لا کر مٹی بھگونی شروع کی، دوڑتے ہوئے جاتے تھے اور دوڑتے ہوئے آتے تھے۔ اتنی سکت ان میں کبھی نہ تھی۔

ایک ہی دن میں دیوار اٹھ گئی۔ جتنی چار مزدور بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ اور کتنی سیدھی چکنی دیوار تھی کہ معمار بھی دیکھ کر خجل ہو جاتا۔ محبت کی طاقت غیر محدود ہے۔

شام ہوگئی چڑیوں نے بسیرا لیا۔ درختوں نے بھی آنکھیں بند کیں۔ مگر کنور کو آرام کہاں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں مٹی کے ردّے رکھے جا رہے تھے۔ ہائے ری امید کیا تو اس بے چارے کی جان ہی لے کر چھوڑے گی۔

درخت پر چڑیا کا میٹھا راگ سنائی دیا۔ کنور کے ہاتھ سے گھڑا چھوٹ گیا۔ ہاتھ پیروں میں مٹی لپٹے۔ وہ درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ اس راگ میں کتنی دلکشی تھی کتنی خوشی، کتنی چمک۔ انسانی نغمہ اس کے آگے ایک بے سُر الاپ تھا۔ اس میں یہ بیداری، یہ تحریک، یہ زندگی کہاں؟ نغمہ کے سرور میں غفلت ہے۔ مگر وہ غفلت کتنی یاد افزا ہوتی ہے۔ ماضی کو زندگی اور روشنی سے مزیّن کر کے علانیہ دکھادینے کی طاقت بجز نغمہ کے اور کس میں ہے؟ کنور کی نگاہ تصور کے سامنے وہ منظر آموجود ہوا جب چندا اسی پودے کو ندی سے پانی لا لا کر سینچتی تھی۔ آہ، کیا وہ دن پھر آسکتے ہیں۔

دفعتاً ایک مسافر آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ کنور کو دیکھ کر ایسے سوالات کرنے لگا جو

عموماً دوشناسوں میں ہوا کرتے ہیں۔ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو! کہاں جاؤگے؟ پہلے وہ بھی اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ مگر جب گاؤں اجڑ گیا تو قریب کے ایک دوسرے گاؤں میں جا بسا تھا۔ اس کے کھیت اب بھی یہاں تھے۔ رات کو جنگلی جانوروں سے اپنے کھیتوں کی حفاظت کرنے کے لیے وہ یہیں آکر سوتا تھا۔

کنور نے پوچھا۔ تمھیں معلوم ہے۔ اس گاؤں میں ایک کبیر سنگھ ٹھاکر رہتے تھے۔

کسان نے جوش کے لہجہ میں کہا۔ ہاں ہاں بھائی جانتا کیوں نہیں۔ بے چارے یہیں تو مارے گئے۔ تم سے کیا ان کی جان پہچان تھی۔

کنور : ہاں ان دنوں کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ میں بھی راجہ کی فوج میں نوکر تھا۔ ان کے گھر میں اور کوئی نہ تھا؟

کسان : ارے بھائی کچھ نہ پوچھو۔ بڑی دکھ بھری کہانی ہے۔ ان کی بیوی تو پہلے ہی مر چکی تھی۔ صرف لڑکی باقی تھی۔ آہ کیسی اچھی۔ نیک مزاج وہ لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں نور آجاتا تھا۔ بالکل بیکنٹھ کی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ جب کبیر سنگھ زندہ تھا۔ اسی وقت کنور اندرناتھ یہاں بھاگ کر آئے تھے اور اسی کے یہاں رہے تھے۔ اس لڑکی کی کنور سے کچھ بات چیت ہوگئی۔ جب کنور کو دشمنوں نے پکڑ لیا تو چندا گھر میں اکیلی رہ گئی۔ گاؤں والوں نے بہت چاہا کہ اس کا بیاہ ہو جائے۔ اس کے لیے بیاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ بھائی ایسا کون تھا جو اسے پاکر اپنے بھاگ کو نہ سراہتا مگر وہ کسی سے بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ یہ درخت جو تم دیکھ رہے ہو، اس وقت چھوٹا سا پودا تھا۔ اس کے گرد پھولوں کی کئی اور کیاریں بھی تھیں۔ انھیں کو گوڑنے نرانے سینچنے میں اس کا دن کٹتا۔ بس یہی کہتی کہ ہمارے کنور صاحب آتے ہوں گے۔

کنور کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینھ برسنے لگا۔ مسافر نے ذرا دم لے کر کہا۔ روز بروز گھلتی جاتی تھی۔ تمھیں یقین نہ آئے گا بھائی۔ اس نے دس برس اسی طرح گزار دیے۔ اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ مگر اب بھی اسے کنور صاحب کے آنے کی آس بندھی ہوئی تھی۔ آخر ایک روز اسی درخت کے نیچے اس کی لاش ملی۔ ایسی محبت کون کرے گا بھائی؟ کنور نہ جانے مرے کہ جئے کبھی انھیں اس برہ کی

ماری ہوئی کی یاد بھی آتی ہے یا نہیں۔ مگر اس نے تو محبت کو ایسا نبایا جیسا کہ چاہیے۔

کنور کو ایسا معلوم ہوا گویا دل دو نیم ہوا جا رہا ہے وہ کلیجہ تھام کر بیٹھ گئے۔ مسافر کے ہاتھ میں ایک سلگتا ہوا اپلا تھا۔ اس نے چلم بھری اور دو چار کش لے کر بولا۔

اس کے بعد یہ گھر گر گیا۔ گاؤں پہلے ہی اجاڑ تھا۔ اب تو اور بھی سنسان ہوگیا۔ دو چار آسامی یہاں آ بیٹھتے تھے۔ اب تو چڑیے کا بھوت بھی یہاں نہیں آتا۔ اس کے مرنے کے کئی مہینے بعد یہی چڑیا اس پیڑ پر بولی ہوئی سنائی دی۔ تب سے برابر اسے یہاں بولتے سنتا ہوں۔ رات کو سبھی چڑیاں سو جاتی ہیں۔ یہ رات بھر بولتی رہتی ہے۔ اس کا جوڑا کبھی دکھائی نہیں دیا۔ بس اکیلی ہے۔ دن بھر اسی جھونپڑے میں پڑی رہتی ہے۔ رات کو اس پیڑ پر آ بیٹھتی ہے۔ مگر اس وقت اس کے گانے میں کچھ اور ہی بات ہے ورنہ سن کر رونا آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی کلیجے کو مسوس رہا ہے۔ میں تو کبھی کبھی پڑے رو دیا کرتا ہوں۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہی چندا ہے، اب بھی کنور کی جدائی میں الاپ رہی ہے۔ مجھے بھی ایسا معلوم پڑتا ہے۔ آج نہ جانے کیوں خوش ہے۔

کسان تمباکو پی کر سوگیا۔ کنور کچھ دیر تک بے خوف سا کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا: چندا کیا سچ مچ تمھیں ہو۔ میرے پاس کیوں نہیں آتیں۔

ایک لمحہ میں چڑیا آکر اس کے ہاتھ پر بیٹھ گئی۔ چاندکی روشنی میں کنور نے چڑیا کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس کی آنکھیں کھل گئی ہوں۔ گویا آنکھوں کے سامنے سے کوئی پردہ ہٹ گیا ہے۔ چڑیا کی شکل میں بھی چندا کی صورت نمایاں تھی۔

دوسرے روز کسان سو کر اٹھا تو کنور کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

(8)

کنور اب نہیں ہیں۔ مگر ان کے جھونپڑے کی دیواریں بن گئی ہیں۔ اوپر پھوس کا نیا چھپر پڑ گیا ہے۔ اور جھونپڑے کے دروازے پر پھولوں کی کئی کیاریاں لگی ہوئی ہیں۔ گاؤں کے کسان لوگ اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے۔

اس جھونپڑے میں اب چڑیوں کے ایک جوڑے نے اپنا گھونسلا بنایا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ دانے چارے کے کھوج میں جاتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ رات کو دونوں اسی درخت کی شاخ پر بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا دلکش نغمہ رات کے سناٹے میں دور تک سنائی دیتا ہے۔ یہ چڑیوں کا جوڑا کنور اور چندا کا جوڑا ہے۔ اس میں کسی کو شک نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ایک بہیلئے نے ان چڑیوں کو پھنسانا چاہا۔ مگر گاؤں والوں نے اسے مار کر بھگا دیا۔

(یہ افسانہ لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے اپریل 1927 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا کا مناترو۔ یہ مان سروور 5 میں شامل ہے اردو میں اسے 'خواب و خیال' میں شائع کیا گیا ہے۔)

سوجان بھگت

سیدھے سادھے کسان روپیہ ہاتھ میں آتے ہی دھرم اور شہرت کی طرف جھکتے ہیں۔ امیر لوگوں کی طرح پہلے وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کی طرف نہیں دوڑتے۔ سوجان کی کھیتی میں کئی برس سے ہن برس رہا تھا۔ محنت تو گاؤں کے سبھی کسان کرتے ہیں۔ لیکن اس کا ستارہ اوج پر تھا۔ بنجر زمین میں دانہ بوتا تو بھی کچھ نہ کچھ پیدا ہو ہی جاتا۔ تین برس لگا تار ایکھ لگتی گئی۔ ادھر گڑ کا بھاؤ تیز تھا۔ کوئی دو اڑھائی ہزار ہاتھ میں آ گئے۔ بس ذہن کا جھکاؤ دھرم کی طرف ہوتا گیا۔ سادھو سنتوں کا خیر مقدم اور تعظیم ہونے لگی۔ دروازے پر دھونی جلنے لگی۔ قانون گو علاقہ میں آتے تو سوجان مہتو کے ہاں ٹھیرتے۔ حلقے کے کانسٹیبل، تھانیدار، محکمہ تعلیم کے افسر، ایک نہ ایک ان کے چوپال میں پڑا ہی رہتا۔ مہتو مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے۔ خوش بختی! ان کے ہاں اتنے بڑے بڑے آدمی آکر ٹھیرتے تھے۔ جن حاکموں کے سامنے ان کی زبان نہ کھلتی تھی۔ انھی کی زبان اب مہتو!مہتو! کہتے سوکھتی تھی۔ ایک مہاتما نے فضا اچھی دیکھی تو وہیں آسن جمادیا۔ گانج اور چرس کی بہار اڑنے لگی۔ ایک ڈھولک آئی۔ منجرے منگوائے گئے اور ست سنگ ہونے لگا۔ یہ سب سوجان کے دم سے ہی تھا۔ گھر میں سیروں دودھ ہوتا لیکن سوجان کے منہ میں ایک بوند جانی بھی حرام تھی۔ کبھی حاکم لوگ چکھتے اور کبھی سادھو۔ کسان کو دودھ گھی سے مطلب؟ اسے تو ساگ روٹی چاہیے۔ سوجان کی عاجزی کی انتہا نہ رہی سب کے سامنے سر جھکائے رہتا۔ ایسا نہ ہو لوگ کہنے لگیں دولت پاکر مغرور ہوگیا ہے۔ گاؤں میں کل تین ہی کنوئیں تھے۔ سبھی کھیتوں میں پانی نہ پہنچتا تھا۔ کھیتی ماری جاتی تھی۔ سوجان نے ایک پختہ کنواں اور بنوادیا۔ کنوئیں کے بیاہ، برہم بھوج اور یگیہ ہوا۔ جس دن کنواں چلا۔ اس روز جیسے سوجان کو دنیا بھر کی نعمتیں مل گئیں۔ جو کام گاؤں بھر میں کسی سے نہ ہوا تھا وہ باپ دادا کی عنایت سے سوجان نے کر دکھایا۔

ایک روز گاؤں میں گیا کے یاتری آکر ٹھیرے۔ سوجان ہی کے ہاں ان کا بھوجن ہوا۔ سوجان کے دل میں بھی گیا جانے کی بہت زور سے خواہش تھی۔ یہ اچھا

موقعہ پاکر وہ بھی چلنے کے لیے تیار ہوگئے۔

اس کی بیوی بلاقی نے کہا۔ ابھی "رہنے دو۔ اگلے سال چلیں گے۔" سوجان نے متانت سے جواب دیا۔ "اگلے برس کیا ہوگا۔ کون جانتا ہے؟دھرم کے کام میں میکھ نکالنا اچھا نہیں ہوتا۔ زندگی کا کیا بھروسہ؟"

"ہاتھ خالی ہو جائے گا"

"بھگوان کی اچھیا ہوگی تو روپیہ پھر آجائے گا۔ ان کے ہاں کس بات کی کمی ہے۔"

بلاقی اس کا کیا جواب دیتی۔ مذہبی فریضہ میں مداخلت کر کے اپنی عاقبت کیوں بگاڑتی؟ صبح ہی خاوند اور بیوی گیا کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں سے لوٹے تو یگیہ اور برہم بھوج کی ٹھیری۔ ساری برادری کو مدعو کیا گیا۔ گیارہ گاؤں میں سپاریاں بنٹیں۔ اس کروفر سے کام ہوا کہ چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ سب یہی کہتے تھے کہ بھگوان دولت دے تو دل بھی ایسا ہی دے۔ گھمنڈ تو چھو بھی نہ گیا۔ اپنے ہاتھ سے تیل اٹھاتا پھرتا ہے۔ خاندان کا نام روشن کردیا۔ بیٹا ہو تو ایسا ہو۔ باپ مرا تو گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اب لکشمی گھٹنے ٹیک کر آ بیٹھی ہے۔

ایک حاسد نے کہا۔ "کہیں گڑی ہوئی دولت مل گئی ہوگی۔" تو چاروں طرف سے اس پر لعنتیں برسنے لگیں۔ "ہاں !تمھارے باپ دادا جو خزانہ چھوڑا گئے ہیں وہی اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ ارے بھیا! یہ دھرم کی کمائی ہے۔ تم بھی تو سینہ پھاڑ کر محنت کرتے ہو۔ ایسی ایکھ نہیں ہوتی۔ بھگوان آدمی کا دل دیکھتے ہیں۔ جو خرچ کرنا جانتا ہے اسی کو دیتے ہیں۔"

(2)

سوجان مہتو سوجان بھگت ہوگئے۔ بھگتوں کے طور اطوار کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ بھگت بنا اشنان کیے کچھ نہیں کھاتے۔ گنگا اگر گھر سے دور ہو اور وہ دو پہر تک نہاکر لوٹ نہ سکتا ہو تو تہوار کے دن تو ضرور ہی وہاں جاتا ہے۔ بھجن اور پوجا تو اس کے گھر یقیناً ہونا چاہیے۔ پوجا پاٹھ اس کے لیے از بس ضروری ہے۔ کھانے پینے میں بھی

اسے خاص توجہ دینی پڑتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے جھوٹ ترک کرنا پڑتا ہے۔ بھگت غلط نہیں کہہ سکتا۔ عام آدمی کو اگر جھوٹ کی سزا ایک ملتی ہے تو بھگت کو ایک لاکھ سے کم نہیں ملتی۔ انجان کے لیے کتنے ہی قصور قابل معافی ہیں۔ سیانے کے لیے نہ معافی ہے اورنہ کفارہ، اگر ہے بھی تو بہت مشکل۔ سوجان کو اب بھگت کا وقار قائم رکھنا پڑا۔ اب تک اس کی زندگی مزدور کی زندگی تھی۔ زندگی کا کوئی معیار کوئی اصول اس کے سامنے نہ تھا۔ اب ان کی زندگی میں خیالات آگئے۔ راستہ کانٹوں سے بھر پور تھا۔ اپنی خدمت ہی پہلے اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ اسی ترازو سے وہ ہر چیز کو تولتا تھا۔ وہ اب انھیں مناسب اور نا مناسب کے کانٹوں پر تولنے لگا۔ یوں کہو کہ جہل کی دنیا سے نکل کر اب وہ علم کی دنیا میں آگیا۔ اس نے کچھ لین دین شروع کیا تھا۔ اب اسے بیاج لیتے ہوئے خجالت ہونے لگی۔ یہاں تک کہ گئوؤں کو دوہتے اسے بچھڑوں کا خیال لگا رہتا۔ کہیں بچھڑا بھوکا تو نہیں رہتا؟ورنہ اس کا دل دکھے گا۔ وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ کتنے ہی مقدموں میں اس نے جھوٹی شہادتیں دیں۔ کتنوں سے رشوت لے کر معاملہ رفع دفع کردیا تھا۔ اب ان کاموں سے اسے نفرت ہوتی تھی۔ جھوٹ اور ڈھونگ سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ پہلے اس کی یہ خواہش تھی کہ مزدوروں سے جس قدر کام لیا جا سکتا ہے، لے اور مزدوری جس قدر کم دی جا سکتی ہے دے،لیکن اب اسے کام سے زیادہ ان کی مزدوری کی فکر ہوتی تھی۔ کہیں بیچارے مزدور دل پر جبر نہ کریں۔ یہ اس کی واحد فکر ہوتی تھی کہ کہیں کسی کا رویاں نہ دکھے۔ اس کے دونوں جوان بیٹے بات بات پر اس پر پھبتیاں کستے۔ یہاں تک کہ بلاقی بھی اسے اب کورا بھگت سمجھنے لگی۔ جسے گھر کے بھلے بُرے سے کوئی سروکار نہ ہو۔ گیان کی دنیا میں آکر سوجان مہتو کورے بھگت ہوگئے۔

سوجان کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ تمام حقوق چھینے جانے لگے۔ کس کھیت میں کیا بونا ہے۔ کس کا کیا دینا ہے۔ کیا لینا ہے۔ کس بھاؤ کیا چیز بکی۔ ایسی اہم باتوں میں بھی بھگت جی کی صلاح نہ لی جاتی۔ بھگت کے پاس کوئی جانے ہی نہ پاتا۔ دونوں لڑکے یا خود بلاقی دور سے ہی معاملہ طے کرلیا کرتے۔ گاؤں بھر میں سوجان کی قدر و

منزلت بڑھتی جارہی تھی اور خود اس کے گھر میں کم ہو رہی تھی۔ لڑکے اس کی عزت اب بہت کرتے۔ اسے خود چارپائی اٹھاتے دیکھ کر دور سے ہی لپک کر تھام لیتے۔ اسے چلم نہ بھرنے دیتے۔ یہاں تک کہ خود دھوتی تک نہ چھٹکنے دیتے لیکن اثر اس کے ہاتھوں میں نہ تھا۔ وہ اب گھر کا مالک نہیں۔ مندر کا دیوتا تھا۔

(3)

ایک دن بلاقی اوکھلی میں دھان چھانٹ رہی تھی کہ ایک بھک منگا دروازہ پر آکر چلّانے لگا۔ بلاقی نے سوچا۔ دال بنالوں تو اسے دوں گی۔ اتنے میں بڑا لڑکا بھولا آکر بولا۔ ''اماں! ایک مہاتما دروازے پر کھڑا گلا پھاڑ رہے ہیں۔ کچھ دے دو۔ ورنہ اس کا دل روئے گا۔''

بلاقی نے طنز سے کہا۔ ''بھگت کے پاؤں میں کیا مہندی لگی ہے؟ کیوں کچھ لے جاکر نہیں دے دیتے؟ کیا میرے چار ہاتھ ہیں؟ کس کس کا دل سکھی رکھوں دن بھر تو تانتا بندھا رہتا ہے۔''

''چوپٹ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور کیا؟ ابھی مہنگو بینگن دینے آیا تھا۔ حساب سے سات من ہوتے تھے تولا تو پونے سات من ہی نکلے۔ میں نے کہا۔ دس سیر اور لا۔ تو آپ بیٹھے بیٹھے کہہ اٹھے۔ اب اتنی دور کہاں لینے جائے گا۔ وصولی لکھ لو۔ ورنہ اس کا دل دکھے گا۔ میں نے حساب بیباق نہیں لکھا۔ دس سیر باقی درج کر لیے۔''

بہت اچھا کیا تم نے۔ بکنے دیا کرو انھیں۔ دس پانچ مرتبہ منہ کی کھائیں گے تو خود بخود بولنا چھوڑ دیں گے۔

''دن بھر ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے ہی رہتے ہیں۔ سو مرتبہ کہہ دیا کہ تم گھر گرہستی کے معاملہ میں مت بولا کرو۔ لیکن اس سے بنا بولے رہا ہی نہ جاتا۔''

''میں جانتی کہ ان کا یہ حال ہوگا تو گورو منتر نہ لینے دیتی۔''

''بھگت کیا ہوئے کہ دین دنیا سے گئے۔ تمام دن پوجا پاٹھ میں ہی اڑ جاتا ہے۔ ابھی ایسے بوڑھے نہیں ہوگئے کہ کوئی کام ہی نہ کر سکیں۔''

بلاقی نے بات بدلی اور کہا۔ ''یہ تو تمھاری زیادتی ہے بھولا۔ اب بھلا ان سے

پھاوڑا، کدال کہاں پکڑا جاتا ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہتے ہیں۔ بیلوں کو دانہ پانی دیتے ہیں۔ گائے دوہاتے ہیں۔ اور بھی جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہیں۔"

فقیر ابھی کھڑا چلّا رہا تھا سوجان نے جب گھر سے کسی کو کچھ بھی لاتے نہ دیکھا تو اٹھ کر اندر گیا اور کڑے لہجہ میں بولا۔ "تم لوگوں کو کچھ سنائی نہیں دیتا کہ دروازہ پر کون گھنٹہ بھر سے کھڑا بھیک کے لیے چلّا رہا ہے؟ اپنا کام تو دن بھر کرنا ہی ہے۔ ایک ساعت بھگوان کا کام بھی تو کر لیا کرو۔"

بلاقی بولی۔ "تم تو بھگوان کا کام کرنے کے لیے بیٹھے ہی ہو۔ کیا گھر بھر بھی یہی کام کرے گا؟"

"کہیں آٹا رکھا ہے۔ تو لاؤ میں ہی نکال کر دے آؤں۔ تم رانی بنی بیٹھی رہو۔"

آٹا میں نے مر مر کر پیسا ہے۔ اناج دے دو۔ ایسے مسٹنڈوں کے لیے پہر رات اٹھ کر چکی نہیں چلاتی ہوں۔"

سوجان گودام میں گئے اور چھوٹی ٹوکری بھر جو لیے باہر نکلے جو سیر بھر سے کیا کم ہوں گے۔ سوجان نے جان بوجھ کر محض بلاقی اور بھولا کو چڑانے کے لیے بھیک کی موزوں مقدار سے تجاوز کیا تھا۔ اس پر بھی یہ دکھانے کے لیے کہ ٹوکری میں زیادہ جو نہیں ہیں۔ وہ اسے چٹکی سے تھامے ہوئے تھے۔ چٹکی اس قدر بوجھ نہ سنبھال سکتی تھی۔ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ایک لمحہ کی تاخیر ہونے سے ہی اس کے گر پڑنے کا خدشہ تھا۔ اس لیے وہ جلدی سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ اچانک بھولا نے چھابڑی ان کے ہاتھ سے چھین لی اور تیورا کر کہا۔

"مال غنیمت نہیں جو لٹانے چلے ہو۔ چھاتی پھاڑ پھاڑ کر کام کرتے ہیں تب گھر میں دانہ آتا ہے۔"

سوجان نے کھسیانہ ہو کر کہا۔ "میں بھی تو بیٹھا نہیں رہتا۔"

"بھیک بھیک سمجھ کر دی جاتی ہے۔ لٹائی نہیں جاتی۔ ہم تو ایک وقت کھا کر گزر کرتے ہیں کہ عزت بنی رہے اور تمھیں لٹانے کی سوجھتی ہے۔ تمھیں کیا معلوم کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔"

سوجان نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر آکر بھکاری سے کہہ دیا۔ ''بابا! اس وقت جاؤ گھر میں کسی کا ہاتھ خالی نہیں۔'' اور خود پیڑ تلے جاکر خیالات میں ڈوب گیا۔ ''اپنے ہی گھر میں اس کی یہ قدر؟ ابھی وہ اپاج نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ گھر کا کچھ نہ کچھ کام کرتا ہی ہوں۔ اس پر یہ توہین؟ اس نے یہ گھر بنایا۔ یہ ساری رونق اسی کے دم خم سے ہے۔ لیکن اب اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں۔ اب وہ دروازہ کا کتا ہے۔ گھر والے جو رُوکھا سُوکھا دے دیں۔ وہ وہی کھا کر پیٹ بھرلے۔ ایسی زندگی پر لعنت ہے! سوجان ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا۔''

شام ہوگئی۔ بھولا کا چھوٹا بھائی شنکر چلم بھر کر لایا۔ سوجان نے دیوار سے لگا کر رکھ دیا۔ دھیرے دھیرے تمباکو جل گیا۔ ذرا دیر بعد بھولا نے دروازہ پر چار پائی ڈال دی۔ سوجان پیڑ تلے سے نہ اٹھا۔ کچھ دیر اور گذری۔ کھانا تیار ہوا۔ بھولا بلانے آیا۔ سوجان نے کہا ''بھوک نہیں ہے۔''

بہت منانے پر بھی نہ اٹھا تب بلاقی نے آکر کہا۔ ''کھانا کھانے کیوں نہیں چلتے؟ جی تو اچھا ہے؟''

سوجان کو سب سے زیادہ غصہ بلاقی پر ہی تھا۔ یہ بھی لڑکوں کے ساتھ ہے۔ یہ بیٹھی دیکھتی رہی اور بھولا نے اناج میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس کے منہ سے اتنا بھی نہ نکلا کہ رہنے دے لے جاتے ہیں تو لے جانے دے۔ لڑکوں کو نہ معلوم ہو۔ کہ میں نے کتنی محنت سے یہ گرہستی بنائی ہے۔ لیکن اسے تومعلوم تھا۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ بھادوں کی اندھیری راتوں میں لاٹھی تھامے جوار کی حفاظت کی ہے۔ جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں بھی دم نہیں لیا۔ اور اب گھر پر میرا اتنا حق بھی نہیں کہ کسی کو بھیک بھی دے سکوں۔ مانا کہ بھیک اتنی نہیں دی جاتی۔ لیکن انھیں تو چپ رہنا چاہیے تھا۔ خواہ میں گھر میں آگ ہی کیوں نہ لگا دوں۔ قانون سے بھی تو میرا کچھ ہے۔ میں اپنا حصہ خود نہیں لیتا۔ دوسروں کو کھلادیتا ہوں۔ اس میں کسی کے باپ کا کیا جاتا ہے؟ اب اس وقت منانے آئی ہے۔ اسے میں نے کبھی آج تک پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا۔ ورنہ ایسی کون عورت ہے گاؤں میں جس نے شوہر کی

لاتیں نہ سہی ہوں۔ کبھی کڑی نگاہ سے دیکھا تک نہیں۔ روپے پیسے، لینا دینا سب اسی کے ہاتھ میں رکھا تھا۔ روپے جمع کر لیے ہیں تو مجھ سے ہی اکڑتی ہے۔ اب اسے لڑکے عزیز ہیں۔ میں تو گھر لٹاؤ نکھٹو اور بھونڈو ہوں۔ میری اسے کیا پروا۔ جب لڑکے نہ تھے تب میں گود میں اٹھا اٹھا کر وئید کے پاس لیے پھرا تھا۔ آج اس کے بیٹے ہیں اور یہ ان کی ماں ہے۔ میں تو باہر کا آدمی ہوں۔ مجھے گھر سے کیا مطلب؟

بولا : ''میں اب کھا پی کر کیا کروں گا؟ ہل جوتنے سے رہا۔ پھاوڑا چلا نہیں سکتا۔ مجھے کھلا کر اناج کو کیوں ضائع کروگی؟ رکھ دو بیٹا دوسری بار کھائے گا۔''

''تم تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہو۔ سچ کہا ہے۔ بڑھاپے میں آدمی کی عقل ماری جاتی ہے۔ بھولا نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ اتنی بھیک مت لے جاؤ۔ یا اور کچھ؟''

''ہاں !بیچارہ اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ ''تمھیں تو تب مزہ آتا۔ اگر وہ اوپر سے دو چار ڈنڈے بھی جما دیتا۔ کیوں؟اگر یہی خواہش ہے تو لو اب پوری کرو۔ بھولا کھا چکا ہوگا۔ اسے بلالاؤ۔ نہیں۔ بھولا کو کیوں بلاتی ہو۔ تمھیں جمادو نہ دو چار ہاتھ۔ اتنی کسر ہے۔ وہ بھی پوری ہو جائے۔''

ہاں! اور کیا؟ یہی تو عورت کا فرض ہے۔ اپنے بھاگ سراہو کہ مجھ جیسی سیدھی عورت مل گئی۔ جس بل چاہتے ہو۔ بٹھاتے ہو۔ ایسی منہ زور ہوتی تو گھر میں کیوں اب تک نباہ ہوتا؟''

ہاں بھئی۔ ''وہ تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ تم دیوی تھیں اور ہو۔ میں تب بھی راکشش تھا اور اب تو شیطان ہوں۔ بیٹے کماؤ ہیں۔ ان کی سی نہ کہے گی تو اور کس کی کہے گی؟ مجھ سے اب کیا لینا دینا؟''

''تم جھگڑا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ اور میں بچانا چاہتی ہوں کہ چار آدمی ہنسیں گے۔ چل کر کھانا کھالو سیدھے سے۔ نہیں تو میں بھی جاکر سو رہوں گی۔''

''تم بھوکی کیوں سو رہوگی؟ تمھارے بیٹوں کی تو کمائی ہے۔ ہاں ! میں تو بھلا اجنبی ہوں ہی۔''

"بیٹے تمھارے بھی تو ہیں۔"

"نہیں! میں ایسے بیٹوں سے باز آیا۔ کسی اور کے بیٹے ہوں گے۔ میرے بیٹے ہوتے تو کیا میری یہ درگت ہوتی؟"

"گالیاں دو گے میں کچھ اور کہہ بیٹھوں گی۔ سنتی تھی، مرد بڑے سمجھدار ہوتے ہیں لیکن تم تو سب سے نیارے ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ جیسا وقت دیکھے اسی کے مطابق کام کرے۔ اب ہمارا اور تمھارا گزارہ اسی میں ہے کہ نام کے مالک بنے رہیں۔ اور جو کچھ لڑکے چاہیں، کریں۔ میں یہ بات سمجھ گئی تو تم کیوں نہیں سمجھتے؟ جو کماتا ہے اسی کا گھر میں راج ہونا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ میں لڑکوں سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ تم کیوں اپنے من کی کرو؟ اتنے دن تو راج کرلیا۔ اب کیوں اس مایا میں پڑو؟ چلو کھانا کھالو۔"

"تو کیا میں دروازے کا کتا ہوں؟"

"بات جو تھی۔ میں نے کہہ دی اب خود کو جو چاہو سمجھو۔

سوجان نہ اٹھے۔ بلاقی تھک ہار کر چلی گئی۔

(4)

سوجان کے سامنے اب ایک نیا مسئلہ آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بہت دنوں سے گھر کا مالک تھا اور اب بھی یہی تصور کر تا تھا۔ حالات میں کتنا الٹ پھیر ہوگیا۔ اس کی اسے خبر نہ تھی۔ لڑکے اس کی عزت اور خدمت کرتے ہیں۔ اسی کی عزت اور خدمت کرتے ہیں۔ اسی سے وہ مغالطہ میں پڑ گیا تھا۔ لڑکے اس کے سامنے چلم نہیں پیتے۔ کھاٹ پر نہیں بیٹھتے۔ کیا یہ سب اس کے آقا ہونے کا ثبوت نہیں۔ لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ وہ محض عقیدت تھی۔ اس کے آقا ہونے کا ثبوت نہیں۔ کیا عقیدت کے عوض وہ اپنا آقا پن کا حق چھوڑ سکتا تھا؟ ہر گز نہیں۔ اب تک جس گھر میں راجہ تھا اسی میں غلام ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس گھر پر اب دوسروں کا غلبہ نہیں دیکھ سکتا۔ مندر کا پجاری ہو کر رہنا اسے قطعاً ناپسند تھا۔

نہ جانے کتنی رات باقی تھی کہ سوجان نے اٹھ کر گنڈا سے سے بیلوں کا چارہ

کاٹنا شروع کر دیا۔ سارا گاؤں سوتا تھا۔ لیکن سوجان چارہ کاٹ رہے تھے۔ اتنی محنت اپنی زندگی میں انھوں کبھی نہ کی تھی۔ جب سے انھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ تب سے ہی چارہ کے لیے ہائے ہائے مچی رہتی تھی۔ شنکر بھی کاٹتا اور بھولا بھی لیکن چارہ پورا ہی نہ پڑتا۔ آج وہ ان لونڈوں کو دکھا دے گا کہ چارہ کیسے کاٹا جاتا ہے۔ جلد ہی ان کے سامنے کاٹے ہوئے چارہ کا پہاڑ کھڑا ہوگیا۔ ٹکرے کس قدر مہین اور صاف تھے۔ جیسے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔

منہ اندھیرے بلاقی اٹھی تو کٹے ہوئے چارے کا ڈھیر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ بولی یہ "بھولا آج رات بھر چارہ ہی کاٹتا رہا۔ کتنا کہا کہ بیٹا جی سے جہان ہے۔ لیکن مانتا ہی نہیں۔ رات کو سویا ہی نہیں۔"

سوجان بھگت نے طنز سے کہا۔ 'وہ سوتا ہی کب ہے؟ جب دیکھتا ہوں کام ہی کرتا رہتا ہے۔ ایسا کماؤ دنیا میں اور کون ہوگا؟"

اتنے میں بھولا آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ اسے بھی یہ ڈھیر دیکھ کر تعجب ہوا۔ ماں سے بولا۔ "کیا شنکر آج بڑی رات گئے اٹھا تھا اماں؟"

"وہ تو پڑا سو رہا ہے۔ میں نے سمجھا تم نے کاٹا ہے"

"میں تو صبح اٹھ ہی نہیں سکتا۔ دن بھر چاہے جتنا کام کر لوں۔ لیکن رات کو مجھ سے نہیں اٹھا جاتا۔"

"تو کیا تمھارے دادا نے کاٹی ہے؟"

"ہاں یہی معلوم ہوتا ہے۔ رات بھر سوئے نہیں۔ مجھ سے کل رات بڑی بھول ہوئی۔ ارے! وہ تو ہل لے کر جارہے ہیں۔ جان دینے پر تل گئے ہیں کیا؟"

"غصیلے تو کبھی کے ہیں اب کسی کی سنیں گے تھوڑا ہی۔"

"شنکر کو جگا دو۔ میں بھی جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ہل لے جاؤں"

جب اور کسانوں کے ساتھ ہل لے کر بھولا کھیت میں پہنچا تو سوجان آدھا کھیت جوت چکے تھے۔ بھولا نے چپکے سے کام کرنا شروع کیا۔ سوجان سے کچھ بولنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی۔

دو پہر ہوئی سب کسانوں نے بیل چھوڑ دیے۔ لیکن سوجان اپنے کام میں مگن رہے۔ بھولا تھک گیا۔ اس کی بار بار یہی خواہش ہوتی کہ بیلوں کو کھول دے۔ مگر مارے خوف کے کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس کو حیرت ہوتی تھی کہ دادا کیسے اتنا کام کرتے ہیں آخر ڈرتے بولا۔

"دادا اب تو دو پہر ہوگئی بیل کھول دیں ذرا"

"ہاں کھول دو۔ تم بیلوں کو لے کر چلو میں ڈانڈ پھینک کر ابھی آیا۔"

"میں شام کو پھینک دوں گا۔"

"تم کیا پھینک دوگے۔ دیکھے نہیں کہ کھیت کٹورے کے مانند گہرا ہوگیا ہے۔ تبھی تو بیچ میں پانی جم جاتا ہے۔ اس طرح کے کھیت میں بیس من کا بیگھ ہونا تھا۔ تم لوگوں نے اس کا ستیا ناس کر دیا۔"

بیل کھول دیے گئے۔ بیلوں کو لے کر بھولا گھر چلا۔ لیکن سوجان ڈانڈ پھینکتے رہے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد وہ ڈانڈ پھینک کر گھر آئے۔ لیکن تھکن کا نام بھی نہ تھا۔ نہا کھا کر آرام کرنے کی بجائے انھوں نے بیلوں کو کھلانا شروع کردیا۔ ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ پاؤں ملے اور دم سہلائی بیلوں کی دم کھڑی تھی۔ سوجان کی گود میں سر رکھے رکھے۔ انھیں ناقابل بیان مسرت مل رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج انھیں یہ راحت میسر آئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے جذبے اُبل رہے تھے جیسے کہہ رہے تھے کہ تمھارے ساتھ رات دن ایک کرنے کو تیار ہیں۔

دوسرے کسانوں کی طرح بھولا ابھی کمر ہی سیدھی کر رہا تھا کہ سوجان ہل اٹھا کر کھیت کی طرف چل دیا۔ دونوں بیل امنگ سے بھرے بھاگے چلے جارہے تھے۔ جیسے انھیں خود کھیت میں پہنچنے کی جلدی تھی۔

بھولا نے غنودگی میں ہی باپ کو ہل لے جاتے دیکھا۔ لیکن اٹھ نہ سکا۔ اس کی ہمت چھوٹ گئی۔ اس نے کچھ اتنی محنت نہ کی تھی۔ اسے بنی بنائی گرہستی مل گئی تھی۔ اس کو ہی کسی نہ کسی طرح چلا رہا تھا۔ اس قیمت پر وہ گھر کا مالک بننے کے لیے تیار نہ تھا۔ جوان آدمی بیس دھندے ہوتے ہیں۔ ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کے لیے اسے

وقت چاہئے پڑوس کے گاؤں میں دنگل ہو رہا ہے۔ جوان آدمی خود کو کیسے وہاں جانے سے روک سکے گا؟ کسی گاؤں میں بارات آئی ہے محفل رقص و سرور گرم ہے۔ گبرو کیسے اس لطف سے محروم ہو سکتا ہے؟ بوڑھوں کے یے یہ روکاوٹیں نہیں۔ انھیں نہ ناچ گانے سے مطلب نہ کھیل تماشے سے غرض۔ محض اپنے کام سے سروکار ہے۔

بلاقی نے کہا۔ ''بھولا تمھارے دادا ہل لے کر گئے۔''

''جانے دو اماں۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔''

(5)

سوجان کے اس حوصلہ پر گاؤں بھر میں تبصرے ہوئے۔ نکل گئی ساری بھگتی۔ بنا ہوا تھا۔ مایا میں پھنسا ہوا ہے۔ آدمی کا ہے کو ہے۔ بھوت ہے۔ مگر بھگت جی کے دروازے پر اب بھی سادھو سنت آسن جمائے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اب کے اس کی دھرتی نے سونا اُگل دیا۔ کوٹھار میں اناج رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ جس کھیت میں مشکل سے پانچ من ہوتا تھا اب اس میں دس من اناج پیدا ہوا۔

چیت کا مہنہ تھا۔ کھلیانوں میں ست یگ کی حکومت تھی۔ جگہ جگہ اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہی وقت جب کسانوں کو ایک لحہ کے لیے اپنی زندگی کامیاب معلوم دیتی ہے۔ جب فخر سے ان کادل اچھلنے لگتا ہے۔ سوجان بھگت ٹوکروں میں اناج بھر بھر کر دیتے اور لڑکے انھیں تھام کر گھر پہنچاتے جاتے۔ کتنے ہی بھاٹ اور فقیر بھگت جی کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں وہ سادھو تھا جو آج سے آٹھ مہینے قبل ان کے در سے مایوس لوٹا تھا۔

اچانک بھگت نے اس فقیر سے پوچھا۔ ''کیوں بابا! آج کہاں کہاں چکر لگا آئے؟''

''ابھی تو کہیں نہیں گیا بھگت! پہلے تمھارے ہی پاس آیا ہوں۔''

''اچھا تمھارے سامنے یہ انبار ہے۔ جتنا اناج اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔''

فقیر نے حریص نگاہوں سے ڈھیرکو دیکھ کر کہا۔ ''جتنا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر دے دوگے اتنا ہی لے لوں گا۔''

"نہیں تم سے جتنا اٹھایا جا سکے اٹھا لو۔"

فقیر کے پاس ایک چادر تھی۔ اس نے کوئی دس سیر اناج اس میں بھرا اور اٹھانے لگا۔ جھجک کے مارے اور زیادہ بھرنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔

بھگت اس کے دل کا مطلب بھانپ کر حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولا :

"بس ! اتنا تو ایک بچہ بھی اٹھا لے جا سکتا ہے۔"

فقیر نے بھولا کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔"

"نہیں تم جھجکتے ہو۔ اتنا اور بھرو۔"

فقیر نے پانچ سیر اناج اور بھرا اور بھولا کی طرف متوحش نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اس کی طرف کیا دیکھتے ہو بابا جی ! میں جو کہتا ہوں وہی کرو۔ تم سے جتنا اٹھایا جا سکے اٹھاؤ۔"

فقیر ڈر رہا تھا کہ اگر اس نے اناج بھر لیا اور بھولا نے گٹھڑی نہ اٹھانے دی۔ تو کتنی خفت ہوگی۔ دوسرے فقیروں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ فقیر کتنا لالچی ہے۔ اسے اور اناج بھرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تب سوجان بھگت نے چادر میں اور اناج بھرا۔ اس کی گٹھڑی باندھ کر بولا "اسے اٹھالے جاؤ۔"

"بابا! اتنا تو مجھ سے اٹھ نہ سکے گا۔"

"ارے اتنا بھی نہ اٹھ سکے گا؟ بہت ہوگا تو من بھر۔ بھلا زور تو لگاؤ۔ دیکھوں اٹھا سکتے ہو یا نہیں۔"

فقیر نے گھٹڑی کو پہلے آزمایا۔ بھاری تھی۔ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔ بولا۔

"بھگت جی ! یہ مجھ سے نہ اٹھے گی۔"

"اچھا بتاؤ۔ کس گاؤں میں رہتے ہو؟"

"بڑی دور ہے بھگت جی! امولا کا نام تو سنا ہوگا؟"

"اچھا آگے آگے چلو میں پہنچا دوں گا۔"

یہ کہہ کر بھگت جی نے زور لگا کر گٹھڑی اٹھائی اور فقیر کے پیچھے ہو لیے۔

دیکھنے والے بھگت کا یہ جذبہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ بھگت جی پراس وقت کون سا نشہ سوار ہے۔ آٹھ مہینوں کی مسلسل اور ان تھک محنت کا انھیں آج پھل ملا ہے۔ آج انھوں نے اپناکھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کیا تھا۔ وہی تلوار جو کیلے کو بھی نہیں کاٹ سکتی۔ دھار پر چڑھ کر لوہے کو بھی کاٹ دیتی ہے انسانی زندگی میں دھن بڑے کام کی چیز ہے۔ جس میں لاگ ہے۔ وہ بوڑھا بھی جوان ہے جن میں لاگ نہیں،عزت نہیں، وہ جوان بھی ہو تو مردہ ہے۔ سوجان میں جمعیت تھی۔ اس نے اسے غیر معمولی قوت دی۔ چلتے وقت انھوں نے بھولا کو پر غرور نظروں سے دیکھا اور کہا۔ یہ بھاٹ اور فقیر کھڑے ہیں۔ ان سے کوئی خالی ہاتھ نہ جانے پائے۔"

بھولا سر جھکائے کھڑا رہا۔ اسے کچھ بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ بوڑھے باپ نے اسے ہرا دیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار مادھوری مئی 1927 میں شائع ہوا۔ مان سرودر 5 میں شامل ہے۔ اردو میں مجموعہ "میرے بہترین افسانے" میں شامل ہے۔)

مندر

(1)

مہرمادری، تجھے آفریں ہے! دنیا میں اور جو کچھ ہے، باطل ہے، سچ ہے مہرمادری ہی حق ہے، غیر فانی ہے۔ لازوال ہے، تین روز سے سکھیا کے منہ میں نہ اناج کا ایک دانہ گیا تھا اور نہ پانی کا ایک قطرہ۔ سامنے پوال پر ماں کا ننھا سا لال پڑا کراہ رہا تھا۔ آج تین روز سے اس نے آنکھیں نہ کھولی تھیں۔ ماں اسے گود میں اٹھالیتی، کبھی پوال پر سلاتی۔ ہنستے کھیلتے بچے کو دفعتاً کیا ہوگیا یہ کوئی نہ بتاتا تھا۔ ایسی حالت میں ماں کو بھوک اور پیاس کہاں؟ ایک دفعہ ایک گھونٹ پانی منہ میں لیا مگر اسے حلق سے نیچے نہ اتار سکی، اس دکھیا کی مصیبت کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک دل کے اندر وہ اپنے دو بچے گنگا کے سپرد کر چکی تھی، شوہر کا پہلے ہی خاتمہ ہو چکا تھا۔ اب اس بدنصیب کی زندگی کا سہارا جو کچھ تھا، یہی بچہ تھا۔ ہائے کیا ایشور اسے بھی اس کی گودی سے چھین لینا چاہتا ہے؟ یہ سوچتے ہی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی، اس بچہ کو وہ لمحہ بھر کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑتی تھی۔ اسے ساتھ لے کر گھاس چھیلنے جاتی، گھاس بیچنے بازار جاتی تو بچہ اس کی گود میں ہوتا۔ سکھیا نے اس کے لیے ایک چھوٹی سی کھرپی اور چھوٹی سی کھانچی بنوادی تھی۔ جیاون ماں کے ساتھ گھاس چھیلتا اور فخر سے کہتا، ''اماں! ہمیں بڑی سی کھرپی بنوادو، ہم بہت سی گھاس چھیلیں گے۔ تم درواجے ماچی پر بیٹھے رہنا، اماں بایں گھاس بیچ لاؤں گا۔ ماں پوچھتی، ہمارے لیے کیا کیا لاؤ گے، بیٹا؟ جیاون سرخ سرخ ساڑیوں کا وعدہ کرتا، اپنے لیے بہت سا گڑ بھی لانا چاہتا۔ وہی بھولی بھالی باتیں اس وقت یاد آآکر ماں کے دل میں نشتر سی چبھ رہی تھیں۔ جو بچہ کو دیکھتا یہی کہتا کہ کسی کی ڈیٹھ ہے۔ مگر کس کی ڈیٹھ ہے؟ اس بیوہ کا بھی دنیا میں کوئی بیری ہے؟ اگر اس کانام معلوم ہوجاتا تو سکھیا جا کر اس کے پیروں پڑتی اور بچہ کو اس کی گود میں ڈال دیتی۔ کیا اس کا دل رحم سے نہ پگھل جاتا؟ مگر نام کوئی نہیں بتاتا، ہائے کس سے پوچھے؟ کیا کرے۔

(2)

تین پہر رات گذر چکی تھی۔ سکھیا کا متفکر اور بے قرار دل جگہ جگہ دوڑ رہا تھا کس دیوی کی پناہ لے؟ کس دیوتا کی منت مانے؟ اسی سوچ میں پڑے پڑے اسے ایک جھپکی آگئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ اس کا شوہر آکر بچے کے سرہانے کھڑا ہوجاتا ہے اور بچہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے۔ ''رو مت سکھیا! تیرا بچہ اچھا ہوجائے گا۔ کل ٹھاکر جی کی پوجا کر دے وہی تیرے سہارے ہوں گے''۔ سکھیا کی آنکھ کھل گئی۔ ضرور ہی اس کا شوہر آیا تھا۔ اس میں سکھیا کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ ان کو اب میری سدھ ہے یہ سوچ کر اس کا دل امید سے معمور ہوگیا۔ فرط عقیدت اور محبت سے اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اس نے بچہ کو گودی میں اٹھا لیا اور آسان کی طرف تاکتی ہوئی ''بھگوان! میرا بچہ اچھا ہوجائے، میں تمھاری پوجا کروں گی، اناتھ بدھوا پر دیا کرو۔''

اسی وقت جیاون کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے پانی مانگا۔ ماں نے دوڑ کر کٹورے میں پانی لیا اور بچہ کو پلا دیا۔

جیاون نے پانی پی کر کہا۔ اماں رات ہے کہ دن؟

سکھیا: ابھی تو رات ہے بیٹا، تمھارا جی کیسا ہے؟

جیاون: اچھا ہے اماں، اب میں اچھا ہو گیا۔

سکھیا: تمھارے منہ میں گھی شکر ہو بیٹا، بھگوان کریں تم جلد اچھے ہو جاؤ، کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے۔

جیاون: ہاں اماں تھوڑا سا گڑ دے دو۔

سکھی: گڑ مت کھاؤ بھیّا۔ نکسان کرے گا۔ کہو تو کھچڑی بنادوں۔

جیاون: نہیں، میری اماں! جرا سا گڑ دے دو، تمھارے پیروں پڑوں۔ ماں اس کی ضد کو نہ ٹال سکی۔ اس نے تھوڑا سا گڑ نکال کرجیادن کے ہاتھ پر رکھ دیا اور ہانڈی کو بند ہی کر رہی تھی کہ کسی نے باہر سے آواز دی۔ وہ ہانڈی کو وہیں چھوڑ کر کواڑ کھولنے چلی گئی، جیادن نے گڑ کی دو پنڈیاں نکالیں اور جلد جلد کھا گیا۔

(3)

دن بھر جیاون کی طبیعت درست رہی۔ اس نے تھوڑی کھچڑی کھائی دو ایک بار آہستہ آہستہ دروازہ پر بھی گیا اور ہمجولیوں کے ساتھ کھیل نہ سکنے پر بھی انھیں کھیلتے دیکھ کر اس کا جی بہل گیا۔ سکھیا نے سمجھا کہ لڑکا اچھا ہوگیا۔ دو ایک روز میں جب پیسے ہاتھ میں آجائیں گے تو وہ ایک دن ٹھاکر جی کی پوجا کرنے جائے گی۔ جاڑے کا دن جھاڑو دینے، نہانے دھونے اور کھانے پینے میں گذر گیا مگر جب شام کے وقت جیادن کی طبیعت پھر بھاری ہو گئی تو سکھیا گھبرا اٹھی۔ معاً دل میں شک پیدا ہوا کہ پوجا میں دیر کرنے ہی سے بچہ پھر مرجھا گیا۔ ابھی تھوڑا دن باقی تھا وہ بچہ کو لٹا کر پوجا کا سامان کرنے لگی۔ پھول تو زمیندار کے باغیچہ میں مل گئے۔ تلسی کا درخت دروازہ پر ہی تھا۔ مگر ٹھاکر جی کے بھوگ کے لیے کچھ شیرینی بھی تو چاہیے تھی۔ ورنہ گاؤں والوں کو بانٹے گی کیا؟ ٹھاکر جی پر چڑھانے کے لیے ایک آنہ تو ضرور ہی چاہیے۔ سارا گاؤں چھان ڈالا کہیں پیسے اُدھار نہ ملے تب وہ مایوس ہوگئی، ہائے رے برے دن، کوئی چار آنے پیسے بھی نہیں دیتا۔ آخر اس نے اپنے ہاتھوں سے چاندی کے کڑے اتارے اور دوڑی ہوئی بنئے کی دوکان پر گئی، کڑے گرو رکھے بتاشے لیے اور دوڑی ہوئی گھر آئی۔ پوجا کا سامان فراہم ہو گیا تو اس نے بچہ کو گودی میں اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں پوجا کی تھالی لیے ہوئے مندر کی طرف دوڑی۔

مندر میں آرتی کا گھنٹہ بج رہا تھا۔ دس پانچ بھگت لوگ کھڑے ہوئے استت کر رہے تھے۔ اتنے میں سکھیا جاکر مندر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

پجاری نے پوچھا۔ کیا ہے رے؟ کیا کرنے آئی ہے؟

سکھیا چبوترے پر آکر بولی۔ ٹھاکر جی کی منوتی مانی تھی مہاراج، سو پوجا کرنے آئی ہوں۔

پجاری جی تمام دن زمیندار یئے آسامیوں کی پوجا کرتے تھے اور شام صبح ٹھاکر جی کی۔ رات کو مندر ہی میں سوتے تھے۔ مندر ہی میں آپ کا کھانا بھی پکتا تھا جس سے ٹھاکر دوارے کی ساری استر کاری سیاہ پڑ گئی تھی۔ وہ بڑے رحم دل تھے اور عقیدت مآب ایسے کہ خواہ کتنے ہی ٹھنڈ پڑے، کتنی ہی ٹھنڈی ہوا چلے مگر بلا اشنان

کیے منہ میں پانی نہ ڈالتے تھے۔ اگر اتنے پر بھی ان کے ہاتھوں اور پیروں میں میل کا پرت جما ہوا تھا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ بولے، تو کیا اندر چلی آوے گی؟ ہو تو چکی پوجا۔ یہاں آکر بھرشٹ کرے گی؟

ایک بھگت جی نے فرمایا۔ ٹھاکر جی کو پوتر (پاک) کرنے آئی ہے۔

سکھیا نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ٹھاکر جی کے چرن چھونے آئی ہوں سرکار پوجا کی سب سامگری لائی ہوں۔

پجاری : کیسی نادانی کی بات کرتی ہے رے، کچھ پاگل تو نہیں ہو گئی ہے؟ بھلا تو ٹھاکر جی کو کیسے چھوئے گی؟'

سکھیا کو اب تک کبھی ٹھاکر دوارے میں جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ حیرت سے بولی، سرکار! وہ تو سنسار کے مالک ہیں۔ ان کے درشن سے تو پاپی بھی تر جاتا ہے۔ ، میرے چھونے سے انھیں کیسے چھوت جائے گی؟

پجاری : ارے تو چمارن ہے کہ نہیں رے؟

سکھیا : تو بھگوان نے چماروں کو نہیں پیدا کیا ہے؟ چماروں کا بھگوان کوئی اور ہے؟ اس بچہ کی منوتی ہے، سرکار!

اس پر وہی بھگت جی جو اب استت ختم کر چکے تھے، ڈپٹ کر بولے مار بھگا دو چڑیل کو، بھرشٹ کرنے آئی ہے۔ پھینک دو تھالی والی۔ سنسار میں تو آپ ہی آگ لگی ہوئی ہے، چمار بھی ٹھاکر جی کی پوجا کرنے لگیں گے تو دھرتی رہے گی کہ پاتال کو چلی جائے گی۔

دوسرے بھگت جی بولے۔ اب بیچارے ٹھاکر جی کو چماروں کے ہاتھ کا کھانا پڑے گا۔ اب پرلے (قیامت) ہونے میں کوئی کسر نہیں ہے۔

ٹھنڈ پڑ رہی تھی سکھیا کھڑی کانپ رہی تھی اور یہاں مذہب کے ٹھیکہ دار لوگ زمانے کی حالت پر رائے زنی کر رہے تھے۔ بچہ ٹھنڈے کے مارے ماں کی چھاتی میں گھسا جاتا تھا مگر سکھیا وہاں سے ٹلنے کا نام نہ لیتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دونوں پیر زمین میں گڑ گئے ہیں۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ایسا جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ ٹھاکر جی کے قدموں پر گر پڑے، ٹھاکر جی کیا انھیں کے ہیں؟ ہم غریبوں کا ان

سے کوئی ناتا نہیں ہے؟ یہ لوگ کون ہوتے ہیں روکنے والے؟ مگر یہ خوف ہوتا تھا کہ کہیں ان لوگوں نے سچ مچ تھالی پھینک دی تو میں کیا کروں گی۔ دل ہی دل میں مسوس کر رہ جاتی تھی۔ یکایک اس کو ایک بات سوجھی۔ وہ وہاں سے کچھ دور جاکر ایک درخت کے نیچے تاریکی میں چھپ رہی اور ان بھگتوں کے چلے جانے کی راہ دیکھنے لگی۔

(4)

آرتی اور استت کے بعد بھگت لوگ بڑی دیر تک بھاگوت کا پاٹھ کرتے رہے دوسری طرف پجاری جی نے چولہا جلایا اور کھانا پکانے لگے، چولھے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں ہوں کرتے جاتے تھے اور وقفہ سے اپنی رائے کا اظہار بھی دس بجے رات تک کتھا ہوتی رہی اور دس بجے رات تک سکھیا درخت کے نیچے دھیان لگائے برابر کھڑی رہی۔

آخر بھگتوں نے ایک ایک کرکے گھر کی راہ لی۔ پجاری جی تنہا رہ گئے۔ اس وقت سکھیا جاکر مندر کے برآمدے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ جہاں پجاری جی آسن جمائے دیگچی کا اشتہاء خیز اور شیریں ترانہ سننے میں محو تھے۔ پجاری جی نے آہٹ پاکر گردن اٹھائی تو سکھیا کو کھڑا دیکھا۔ وہ چڑھ کر بولے، کیوں رے تو ابھی یہیں کھڑی ہے؟

سکھیا نے تھالی زمین پر رکھ دی اور ایک ہاتھ پھیلا کر گداگری کے لہجہ میں کہا۔ مہاراج جی، میں بڑی ابھاگن ہوں۔ یہی بچہ میرے جینے کا سہارا ہے، مجھ پر دیا کرو، تین دن سے اس نے سر نہیں اٹھایا۔ تمھیں بڑا جس ہوگا مہاراج جی۔

یہ کہتے کہتے سکھیا رونے لگی۔ پجاری جی رحم دل تو تھے۔ مگر چمارن کو ٹھاکر جی کے پاس جانے دینے کے ناشنیدہ گناہ عظیم کے مرتکب وہ کیسے ہو سکتے تھے؟ نہ جانے ٹھاکر جی اس کی کیا سزا دیں، آخر ان کے بھی تو بال بچے تھے۔ کہیں ٹھاکر جی ناراض ہو کر سارا گاؤں تباہ کردیں تو، بولے گھر جاکر بھگوان کا نام لے، تیرا بچہ اچھا ہوجائے گا۔ میں یہ تلسی دل دیتا ہوں۔ بچہ کو کھلا دے، چرنامرت اس کی آنکھوں میں لگا دے، بھگوان چاہیں گے تو سب اچھا ہی ہوگا۔

سکھیا: ٹھاکر جی کے چرنوں پر گرنے نہ دوگے۔ مہاراج جی؟ بڑی دکھیا ہوں۔ ادھار لے کر پوجا کی سامگری لائی ہوں۔ میں نے کل سپنا دیکھا تھا، مہاراج کہ ٹھاکر

جی کی پوجا کر، تیرا بچہ اچھا ہو جائے گا۔ میرے پاس روپیہ ہے وہ مجھ سے لے لو مجھ کو ایک چھین بھر ٹھاکر جی کے چرنوں پر گرنے دو۔

اس ترغیب نے پنڈت جی کو ایک لمحہ کے لیے ڈانواڈول کر دیا مگر جہالت کے سبب ایشور کا خوف ان کے دل میں کچھ نہ کچھ باقی تھا۔ سنبھل کر بولے۔ اری پگلی! ٹھاکر جی بھگتوں کے دل کا بھاؤ دیکھتے ہیں کہ چرن پر گرنا دیکھتے ہیں سنا نہیں ہے کہ من چنگا تو کٹھوت میں گنگا۔ دل میں بھگتی، (عقیدت) نہ ہو تو لاکھ کوئی بھگوان کے چرنوں پر گرے مگر کچھ نہ ہوگا۔ میرے پاس ایک جنتر (تعویذ) ہے دام تو اس کا بہت ہے پر تجھے ایک ہی روپیہ میں دے دوں گا۔ اسے بچہ کے گلے میں باندھ دینا، بس کل ہی وہ کھیلنے لگے گا۔

سکھیا: تو ٹھاکر جی کی پوجا نہ کرنے دوگے؟

پجاری: تیرے لیے اتنی ہی پوجا بہت ہے جو بات کبھی نہیں ہوئی۔ وہ آج میں کردوں اور گاؤں پر کوئی آفت آپڑے تو کیا ہو، اسے بھی تو سوچ لے۔ تو یہ جنتر لے جا، بھگوان چاہیں گے تو رات ہی بھر میں بچہ کا کلیس کٹ جائے گا۔ کسی کی ڈیٹھ لگ گئی ہے۔ ہے بھی تو چلبلا، معلوم ہوتا ہے چھتری ہے۔

سکھیا: جب سے یہ بیمار ہوا ہے میرے پران ہنون میں سمائے ہوئے ہیں۔

پجاری: بڑا ہونہار لڑکا ہے بھگوان جلا دیں، تیرے سارے دکھ دور دور کر دے گا۔ یہاں تو بہت کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ادھر دو تین دن سے نہیں دیکھا تھا۔

سکھیا: تو جنتر کو کیسے باندھوں گی، مہاراج۔

پجاری: میں کپڑے میں باندھ کر دیتا ہوں، بس گلے میں پہنا دینا، اب تو اس وقت نیا کپڑا کہاں کھوجنے جائے گی؟

سکھیا نے دو روپے پر کڑے گرو رکھے تھے۔ ایک پہلے ہی بھن چکا تھا۔ دوسرا پجاری جی کے نذر کیا اور تعویذ لے کر دل کو بہلاتی ہوئی گھر لوٹ گئی۔

(5)

سکھیا نے گھر پہنچ کر بچہ کے گلے میں تعویذ باندھ دیا۔ مگر جیوں جیوں رات گزرتی تھی اس کا بخار بھی بڑھتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ تین بجتے بجتے اس کے ہاتھ پیر

ٹھنڈے ہونے لگے۔ تب وہ گھبرا اٹھی اور سوچنے لگی۔ ہائے میں ناحق لالچ میں پڑی رہی اور بلا ٹھاکر جی کے درشن کیے چلی آئی۔ اگر میں اندر چلی جاتی اور بھگوان کے چرنوں پر گر پڑتی تو کوئی میرا کیا کرلیتا؟ یہی نہ ہوتا کہ لوگ مجھے دھکے دے کر نکال دیتے، شاید مارتے بھی مگر میرا مطلب تو پورا ہوجاتا، اگر میں ٹھاکر جی کے چرنوں کو اپنے آنسوؤں سے بھگو دیتی اور بچے کو ان کے چرنوں پر ڈال دیتی تو کیا انھیں دیا نہ آتی؟ وہ تو دیالو بھگوان ہیں، اناتھوں کے اِچھا پوری کرتے ہیں، کیا مجھ پر دیا نہ کرتے؟ یہ سوچ کر سکھیا کا دل بے چین ہوگیا۔ نہیں اب دیر کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ وہ ضرور جائے گی اور ٹھاکر جی کے چرنوں پر گر کر روئے گی۔ اس بیکس کے خوف زدہ دل کے لیے اب اس کے سوا کوئی اور ڈھارس کا ذریعہ نہ تھا، مندر کا دروازہ بند ہوگا تو وہ قفل کو توڑ ڈالے گی۔ ٹھاکر جی کیا کسی کے ہاتھوں بک گئے ہیں کہ کوئی انھیں بند کر رکھّے؟

رات کے تین بج گئے تھے۔ سکھیا نے بچے کو کمبل سے ڈھانک کر گود میں اٹھایا، ایک ہاتھ میں تھالی لی، اور مندر کی طرف چلی، گھر سے باہر نکلتے ہی سرد ہوا کے جھونکوں سے اس کا کلیجہ کانپنے لگا۔ سردی سے پاوں سن ہوئے جاتے تھے۔ اس پر چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مسافت دو فرلانگ سے کم کی نہ تھی، پگڈنڈی درختوں کے نیچے نیچے گئی تھی کچھ فاصلہ پر داہنے، جانب ایک تالاب تھا۔ کچھ فاصلے پر بانس کی کوٹھیاں تالاب میں ایک دھوبی مر گیا تھا اور بانس کی کوٹھیوں میں چڑیلوں کا اڈا تھا۔ بائیں جانب ہرے بھرے کھیت تھے۔ چاروں طرف "سن" کی آواز گونج رہی تھی، تاریکی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ دفعتاً گیدڑوں نے کرخت اور خوفناک آواز میں بولنا شروع کردیا۔ آہ، اگر کوئی اس کو لاکھ روپے بھی دیتا تو بھی وہ اس وقت یہاں نہ آتی۔ مگر مہرمادری سارے خوف و خطر کو مغلوب کیے ہوئے تھے۔ "ہے بھگوان سب تمھارا ہی آسرا ہے۔" یہی جپتی ہوئی وہ مندر کی طرف چلی جارہی تھی۔

مندر کے دروازے پر پہنچ کر سکھیا نے زنجیر ٹٹول کر دیکھی تو قفل لگا ہوا تھا پجاری جی برآمدے سے ملی ہوئے کمرے میں کواڑ بند کیے سو رہے تھے۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سکھیا چبوترے کے نیچے سے ایک اینٹ اٹھا لائی۔ اور زور زور سے قفل پر مارنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں نہ جانے اتنی سکت کہاں سے آگئی تھی۔

دو تین ضربوں میں قفل اور اینٹ دونوں ٹوٹ کر چوکھٹ پر گر پڑے۔ سکھیا نے دروازہ کھول دیا اور اندر جانا چاہتی تھی کہ پجاری جی کواڑ کھول کر گھبرائے ہوئے باہر نکل آئے اور "چور چور" کا شور مچاتے گاؤں کی طرف دوڑے۔ جاڑوں میں عموماً پہر رات ہی رہے لوگوں کی نیند کھل جاتی ہے۔ شور سنتے ہی کئی آدمی اِدھر اُدھر سے لالٹین لے کر نکل پڑے اور پوچھتے تھے کہاں ہے کہاں؟ کدھر گیا؟

پجاری: مندر کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ میں نے کھٹ پٹ کی آواز سنی۔

یکایک سکھیا برآمدے سے نکل کر چبوترے پر آئی اور بولی۔ چور نہیں ہے، میں ہوں، ٹھاکر جی کی پوجا کرنے آئی تھی۔ ابھی تو اندر گئی بھی نہیں تمام ہلہ (شور) مچا دیا۔

پجاری نے کہا۔ اب غضب ہوگیا، سکھیا مندر میں جاکر ٹھاکر جی کو بھرشٹ کر آئی۔

پھر کیا تھا، کئی آدمی جھلائے ہوئے لپکے اور سکھیا پر لات گھونسوں کی مار پڑنے لگی، سکھیا ایک ہاتھ سے بچے کو پکڑے ہوئے تھی اور دوسرے سے اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ یکایک اسے ایک مضبوط ٹھاکر نے اس زور سے دھکا دیا کہ بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا مگر نہ وہ رویا نہ وہ بولا۔ نہ اس نے سانس لی، سکھیا بھی گری پڑی تھی، سنبھل کر بچہ کو اٹھانے لگی تو اس کے چہرے پر نظر پڑی۔ ایسا معلوم ہوا، گویا پانی میں پرچھائیں ہو، اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ بچہ کا ماتھا چھو کر دیکھا، سارا بدن ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمبی سانس کھینچ اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اس کا چہرہ غصہّ سے تمتما اٹھا، اس کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے، دونوں مٹھیاں بندھ گئیں۔ دانت پیس کر بولی۔ پاپیو میرے بچے کی جان لے کر اب دور کیوں کھڑے ہو؟ مجھے بھی کیوں نہیں اسی کی طرح مار ڈالتے ہو؟ میرے چھونے سے ٹھاکر جی کو چھوت لگ گئی۔ پارس کو چھو کر لوہا سونا ہو جاتا ہے، پارس لوہا نہیں ہو جاتا۔ میرے چھونے سے ٹھاکر جی بھرشٹ ہو جائیں گے۔ مجھے بنایا تو بھرشٹ نہیں ہوئے لو اب کبھی ٹھاکر جی کو چھونے نہ آؤں گی۔ تالے میں بند کر کے رکھو، پہرا بٹھادو۔ ہائے تمھیں دیا چھو بھی نہیں گئی۔ تم اتنے کٹھور (سنگدل) ہو! بال بچے والے

ہو کر بھی تمھیں ایک ابھاگن ماں پر دیا نہ آئی، اس پر دھرم کے ٹھیکیدار بنتے ہو۔ تم سب کے سب ہتھیارے ہو! پورے ہتیارے ہو، ڈرو مت۔ میں تھانہ پولیس نہیں جاؤں گی، میرا نیائے بھگوان کریں گے۔ اب انھیں کے دربار میں پھر یاد (فریاد) کروں گی۔

کسی نے چوں نہ کی، کوئی ہلا تک نہیں، سب کے سب پتھر کی مورتوں کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔

اس اثناء میں سارا گاؤں جمع ہوگیا تھا۔ سکھیا نے ایک مرتبہ پھر بچے کی طرف دیکھا، منہ سے بیساختہ نکل گیا "ہائے میرا لال!" پھر وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑی روح پرواز کر گئی۔ ماں نے بچے پر جان وار دی۔

ماں، تو دھنیہ ہے! تیری سی عقیدت، تیری سی وفا کا دیوتاؤں میں بھی ہونا امر محال ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار الہ آباد ہندی ماہنامہ چاند کے مئی 1927 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ مانسرودر 5 میں شامل ہے اردو میں یہ پریم چالیسی میں شائع ہوا۔)

مستعار گھڑی

(1)

میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ لوگ سسرال جاتے ہیں تو نواب بن کر کیوں جاتے ہیں۔ آخر اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ ہم اگر لکھ پتی ہیں تو روٹیوں کے محتاج ہیں تو، شادی ہو جانے کے بعد اس کرو فر کا کسی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ شادی کے قبل تو اس کے معنی کچھ ہو سکتے تھے۔ ہماری مرفہ حالی حصول مقصد میں بہت کچھ معاون ہو سکتی تھی پردہ پوش ہو سکتی تھی۔ لیکن جب شادی ہو چکی بیگم صاحبہ ہمارے گھر کا کچا چٹھا جان گئیں اور اپنے گھر والوں کو بہ چشم ہائے نم اپنی کمبختی کی داستان سنا چکیں تو ہمارا ٹھاٹھ بجز نقصان کے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا ہے۔ ہماری بدحالی دیکھ کر ممکن ہے خوش دامن صاحب کو کچھ رحم آجاتا اور رخصتانہ کے بہانے کوئی معقول رقم ہاتھ لگ جاتی جس سے دو چار دن ہم بھی امارت کے مزے اڑاتے۔ ہمارا یہ کرو فر دیکھ کر تو وہ یقیناً یہی سمجھیں گی کہ آج کل اس کا ستارہ اقبال عرش ہفتم پر ہے۔

ورنہ کہیں نہ کہیں کوئی دفینہ پایا گیا ہے ادھر نائی اور کہار۔ اور نائن الگ انعام و اکرام کے لیے منہ پھیلائیں گے۔ مگر یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے میں نے حسب روایات قدیم پچھلی ہولیوں میں سسرال جانے کے واسطے بڑی بڑی تیاریاں کیں۔ ریشمی اچکن اور فیلکس کے بوٹ میری زندگی کے خواب ہائے زرّیں تھے اور شاید خواب ہی رہتے لیکن اس موقعہ پر میری علو ہمتی نے خواب کو واقعیت کا جامہ پہنا دیا۔ نقد کا سوال ہوتا تو بہ ایں ہمہ علو ہمتی اس خواب کو اصلیت کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا مگرایک دوست کی مہربانی و نوازش نے یہ مشکل آسان کردی۔ دونوں چیزیں وعدۂ فردا پر مل گئیں چمڑے کاسوٹ کیس ایک دوسرے دوست سے مانگ لایا اور فاؤنٹین پن ایک تیسرے دوست سے۔ دری پھٹ گئی تھی۔ لیکن بچھاون لے جانے کی میں نے ضرورت نہ سمجھی ورنہ خدا کے فضل سے قالین بھی مستعار مل سکتا تھا۔ ایسے آبرو کے موقعہ پر احباب غیر معمولی طور پر فیاض ہوجایا کرتے ہیں۔ کیونکہ آخر ایک دن انھیں بھی تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اب کسر صرف رسٹ واچ کی تھی۔ یوں تو

دوستوں میں اکثروں کے پاس رسٹ واچ تھی۔ میرے سوا ایسا بدنصیب کون ہوگا۔ لیکن میں سونے کی گھڑی چاہتا تھا اور وہ صرف دانو کے پاس تھی۔ دانو بابو میرے ہم جماعت رہ چکے تھے لیکن ادھر نہ جانے کیوں ان کے یہاں میری آمد و رفت کم ہوگئی تھی۔ آپس میں بے تکلفی نہ تھی۔ دانو روکھا آدمی تھا اور عاریت مثبت یا عاریت منفی دونوں ہی کے خلاف۔ خیر وہ رئیس ہیں اصول کی پابندی کر سکتے ہیں۔ میں کیا کہا کہ کروں۔ جانتا تھا کہ وہ صرف انکار کریں گے۔ مگر دل نہ مانا خوشامد بڑی چیز ہے اور خاص کر امرا کے لیے۔ اس خدا داد عطیہ کی بدولت میں نے اس زندگی میں بڑے بڑے معرکے سر کر دکھائے ہیں۔ اسی کی بدولت آج تیس روپے ماہوار پھٹکارتا ہوں۔ ایک ہزار گریجویٹوں سے کم امیدوار نہ تھے۔ لیکن سب منہ تکتے رہ گئے اور ایں جانب مونچھوں پر تاؤ دیتے گھر آئے۔ جس نے اتنا بڑا پالا مارا ہو اس کے دوست سے گھڑی لے لینا محال نہ تھا۔ شام کو جانے کی تیاری تھی۔ صبح کویں دانو کے پاس گیا اور ان کے چھوٹے بچے کو جو سامنے صحن میں کھیل رہا تھا۔ گود میں اٹھا کر لگا بھینچ بھینچ کے پیار کرنے۔ دانو نے پہلے تو مجھے آتا دیکھ کر تیوریاں چڑھائی تھیں۔ لیکن میری محبت دیکھ کر کچھ نرم پڑے۔ ان کے ہونٹوں کے کنارے ذرا پھیل گئے جنھیں شاید مدت دراز کے بعد یہ فراخی نصیب ہوئی تھی۔ بولے اجی کھیلنے دو پاجی کو۔ سوّر ہے تمھارا کرتا میلا ہوا جاتا ہے۔ میں تو اسے چھوتا بھی نہیں۔

میں نے بزرگانہ انداز سے کہا۔ "میرا کرتہ میلا ہو رہا ہے تو اس کی تمھیں کیا فکر ہے وہ ایسا پھول سا بچہ اور اس کی یہ قدر! تم جیسوں کو ایشور ناحق بچے دیتا ہے تمھیں بھاری معلوم ہوتا تو لاؤ مجھے دے دو۔"

یوں ملامت کر کے میں نے بچے کو کندھے پر بٹھا لیا اور کوئی پندرہ منٹ صحن میں اچکتا پھرا بچہ کھلکھلاتا تھا۔ اور مجھے دم نہ لینے دیتا تھا معلوم نہیں۔ اس سواری کا لطف پہلے بھی کبھی حاصل ہوا تھا یا نہیں۔ مگر تھا وہ بے حد خوش۔

دانو نے اسے اتار کر زمین پر بیٹھا دیا اور بولے کچھ پان پتا تو لایا نہیں اوپر سے سواری کر بیٹھا۔ جا اماں سے پان بنوا لا۔

بچہ مچل گیا۔ میں نے اسے بہلانے کے لیے دانو کو ہلکے ہاتھوں دو تین دھپ

جمائی اور ان کی رسٹ واچ سے مرصع کلائی پکڑ کر بولا۔ لے بیٹا ان کی گھڑی لے لو۔ یہ بہت مارا کرتے ہیں تمھیں۔ آپ تو گھڑی باندھ کر بیٹھتے ہیں اور ہمارے منے کے پاس گھڑی ہی نہیں۔

یہ کہتے ہوئے میں نے کلائی پر سے گھڑی کھول کر "بچے کی بانہہ پر باندھ دی اور تب اسے گود میں اٹھا کر بولا۔" بھیا اپنی گھڑی ہمیں دے دو۔

سیانے باپ کے بیٹے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ بچے نے گھڑی کو دوسرے ہاتھ سے چھپا کر کہا تم کو نہیں دیں گے۔

آخر میں نے اسے پھسلا کر گھڑی لے لی۔ اور اپنی کلائی پر باندھ لی، بچہ پان لینے چلا گیا۔ دانو بابو اپنی اس بے مثل گھڑی کے اوصاف حسنہ بیان کرنے لگے۔ ایسا سچا وقت بتانے والی گھڑی آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہے تو بھی سوس۔

دانو : اجی سِوس ہونے سے کیا ہوتا ہے لاکھوں سوس گھڑیاں دیکھ چکا ہوں۔ کسی کو سردی، کسی کو زکام، کسی کو گنٹھیا، کسی کو لقوہ، جب دیکھو اسپتال میں۔ گھڑی پہچانی جا سکے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں اچھی گھڑی اچھے دام دینے سے مل جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں تم گدھے ہو۔ دام خرچ کرنے سے ایشور نہیں ملتا۔ ایشور ملتا ہے گیان سے۔ اور گھڑی بھی ملتی ہے گیان سے۔ بہت سے جہیز دینے سے ور اچھا نہیں ملتا۔ ایسے قیمتی ور اکثر دھوکا دیتے ہیں۔ فاسٹ صاحب کو تم جانتے ہی ہوگے بس بندہ ایسوں ہی کی کھوج میں رہتا ہے۔ ایک دن شام کو آکر بیٹھ گیا شراب کی چاٹ تھی۔ جیب میں روپے ندارد۔ ان دنوں کی یاد کر کے زارو قطار رونے لگا جب شراب 8 آنے بوتل ملتی تھی۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے اور 25 روپے میں یہ گھڑی لے لی۔ اس کو تین سال ہوئے ہیں مگر آج تک کبھی ایک منٹ کا فرق نہیں پڑا۔ کوئی اس کی قیمت سو روپیہ آنکتا ہے، کوئی دو سو۔ کوئی ساڑھے تین سو کوئی پونے پانچ سو مگر میں کہتا ہوں تم سب گدھے ہو۔ ایک ہزار کے نیچے ایسی گھڑی نہیں مل سکتی۔ پتھر پر پٹک دو کیا مجال کہ بال آجائے۔

میں نے مسکرا کر کہا تب تو یار ایک دن کے لیے مانگی دے دو۔ باہر جانا ہے دوسروں کو بھی اس کی کرامات سناؤں گا۔

دانو : مانگے تو میں کوئی چیز نہیں دیتا بھئی۔ یہ میری زندگی کا اصول ہے۔ کیوں نہیں دیتا اس کا سنانے بیٹھوں تو الف لیلا کی داستان ہو جائے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ عاریت چیز دینا دوستی کی جڑ کھودنا۔ مروت کا گلا گھونٹنااور اپنے گھر میں آگ لگاناہے۔ آپ بہت مشتاق معلوم ہوتے ہیں اس لیے دو ایک واقعہ سنا ہی دوں۔ آپ کو فرصت ہے نا۔ ہاں آج تودفتر بند ہے ایک صاحب کئی لالٹینیں عاریت لے گئے۔ لوٹا نے آئے تو چمنیاں سب ٹوٹی ہوئیں۔ پوچھا یہ آپ نے کیا کیا تو بولے جناب مجھے چمنیوں سے کوئی دشمنی تو ہے نہیں۔ جو انھیں توڑ ڈالتا۔ جیسی گئی تھیں ویسی لوٹ آئیں۔ یہ تو آپ نے نہ فرمایا تھا کہ ان کے عوض نئی لالٹین لوں گا۔ واہ صاحب واہ یہ اچھا روز گار نکالا۔ بتایئے کیا کرتا۔ ایک دوسرے حضرت قالین لے گئے بدلے میں ایک بوسیدہ دری لے آئے پوچھا تو بولے۔ جناب آپ کو تو یہ دری مل بھی گئی اور نہ سہی تو گوڈر والے کے ہاتھ بیچ کر کچھ پیسے کھرے کر لیجیے گا۔ میں کس کے سامنے جاکر روؤں۔ میری پانچ قالینوں کا پتہ نہیں۔ کوئی صاحب سب کی سب سمیٹ کر لے گئے بتلایئے ان سے کیا کہتا۔ تب سے میں نے کان پکڑے کہ اب کسی کو چیز مانگے نہ دوں گا۔ سارا شہر مجھے بے مروت کج خلق مکھی چوس اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہے پر میں پرواہ نہیں کرتا۔ لیکن آپ میرے عزیز دوست ہیں اس لیے مایوس نہ کروں گا۔

القصہ میری فتح ہوئی۔ میں یہاں سے کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے چلا۔ تو زمین پر پاؤں نہ پڑتے تھے۔ گھڑی ملنے کی اتنی خوشی نہ تھی جتنی ایک شاطر پر فتح پانے کی۔ کیسا پھانسا ہے بچے کو!وہ سمجھتے تھے میں بڑا سیانا ہوں۔ نہ جانتے تھے کہ یہاں ان کے بھی گورو گھنٹال ہیں۔

(2)

اسی دن شام کو سسرال جا پہنچا اب یہ عقدہ کھلاکہ لوگ کیوں سسرال جاتے

وقت اتنا ٹھاٹ باٹ بناتے ہیں سارے گھر میں ہلچل پڑ گئی۔ مجھ پر کسی کی نگاہ نہ تھی سبھی میرے سازو سامان پر گرویدہ ہو رہے تھے۔ ایک سالا مٹھائی کی طشتری لایا دوسرا پان کی۔ نائن جھانک کر دیکھ گئی۔ سالیاں بھی چک کی آڑ میں کھڑی ہوگئیں اور خسر صاحب کی تو آنکھوں میں غرور کی سرخی جھلک رہی تھی گویا دنیا کو ان کی نظر انتخاب کی داد دینی چاہیے۔ میں تیس روپے ماہوار کا نوکریوں شان سے بیٹھا ہوا تھا جیسے بڑے بابو دفتر میں بیٹھے ہیں۔ کہار پنکھا جھل رہا تھا۔ نائی پاؤں دبا رہا تھا۔ یہ سب اسی کروفر کی کرامات تھی۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

رات کو دیوی جی نے پوچھا۔ سب روپے اڑا آئے کہ کچھ بچا بھی ہے۔

میرا سارا جوش الفت سرد پڑ گیا۔ نہ خیر و عافیت نہ محبت کے رازو نیاز شکوے شکایتیں، بس ہائے روپے ہائے روپے! جی میں آیا اسی وقت اٹھ کر چل دوں لیکن ضبط کر گیا۔ بولا میری آمدنی جو کچھ ہے وہ تو تمھیں معلوم ہی ہے۔

میں کیا جانوں تمھاری آمدنی کیا ہے۔ کماتے ہوگے اپنے لیے میرے لیے کیا کرتے ہو۔ تمھیں تو بھگوان نے عورت بنایا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ رات دن کنگھی چوٹی کیا کرتے تم ناحق مرد بنے۔ اپنے شوق سنگار سے بچتا ہی نہیں تم دوسروں کی کیا فکر کروگے؟

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ کیا تمھاری یہی مرضی ہے کہ اسی وقت چلا جاؤں۔

دیوی جی نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ چلے کیوں نہیں جاتے۔ میں تو تمھیں بلانے نہ گئی تھی یا میرے لیے کوئی روکڑ لائے ہو۔

میں نے ملامت آمیز انداز سے کہا۔ تمھاری نگاہ میں محبت کی کوئی قدر نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ روکڑ ہی ہے۔

دیوی جی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا محبت اپنے آپ سے کرتے ہوگے مجھ سے تو نہیں کرتے۔

تمھیں پہلے تو یہ شکایت نہ تھی۔

اس سے تمھیں یہ تو نہ سمجھ ہی لینا چاہیے تھا کہ روکڑ کی پرواہ نہیں کرتی لیکن دیکھتی ہوں جوں جوں تمھاری حیثیت بدل رہی ہے تمھارا دل بھی بدل رہا ہے اس

سے تو یہی اچھا تھا کہ تمھاری وہی حالت بنی رہتی۔ میں تمھارے ساتھ فاقے کر سکتی ہوں چیتھڑے پہن سکتی ہوں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ تم چین کرو۔ اور میں میکے میں پڑی تقدیر کو رویا کروں میری محبت اتنی بے غرض نہیں ہے۔

باہر میری جو قدر و منزلت ہوئی تھی اسے دیکھ کر میں اپنے ٹھاٹ پر پھولا نہ سمایا تھا اب یہاں اتنی بے قدری دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ ناحق یہ سوانگ رچا۔ اگر معمولی کپڑے پہنے رونی صورت بنائے آتا تو باہر والے چاہے سرد مہری سے پیش آتے دیوی جی تو خوش ہوتیں پر اب تو خفا ہو گئیں دیوی جی کی باتوں پر میں نے غور کیا تو مجھے ان سے ہمدردی ہو گئی۔ اگر وہ مرد ہوتیں اور میں عورت ہوتا تو کیا مجھے یہ گوارا ہوتا کہ وہ تو چھیلا بنی گھومیں اور میں پنجرے میں بند دانہ اور پانی کو ترسوں۔ مناسب تو یہ تھا کہ دیوی جی سے اپنی خوش بختی کا سارا راز کہہ سناتا۔ پر مردانہ خودداری نے اسے کسی طرح قبول نہ کیا اگر یہ سوانگ بھرنا سراسر غلطی تھی۔ تو اس کا پردہ کھولنا ناقابل عفو گناہ تھا۔ آخر میں نے پھر اسی چرب زبانی سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ جس نے اس سے زیادہ نازک موقعوں پر میری حمایت کی تھی محبت سے لبریز آواز میں بولا۔ جان من ! میری حالت اب بھی حسب سابق ہے لیکن تمھارے دیدار کا اشتیاق کھینچ لایا۔ دوستوں سے قرض لے کر یہ ساری چیزیں مول لیں۔ پھٹے حالوں آنے میں یہ خیال مانع ہوا کہ سب سے زیادہ رنج تمھیں ہوگا۔ اپنی حالت جو کچھ ہے وہ تو ہے ہی اس کا ڈھنڈورہ پیٹنا اور بھی شرمناک ہے۔

دیوی جی پگھل کر بولیں تو قرض لیا ہوگا۔

اور نقد کہاں دھرا تھا۔

گھڑی بھی ادھار ہی

ہاں ایک دوست کی دکان سے لے لی۔

کتنے کی ہے۔

باہر کسی نے پوچھا ہوتا تو میں نے پانسو سے کوڑی کم نہ بتلایا ہوتا لیکن یہاں 25 روپیہ ہی بتلانا مصلحت تھی۔

تب تو بڑی سستی مل گئی

اور نہیں میں پھنستا ہی کیوں۔

مجھے دیتے جانا۔

ایسا معلوم ہوا کہ میرے جسم میں خون کی حرکت بند ہو گئی سارے اعضاء مفلوج سے ہو گئے انکار کروں تو مارا جاؤں۔ منظور کروں تو پکڑا جاؤں۔ عجیب مصیبت میں جان پھنسی آج صبح یہ گھڑی پا کر میں پھولا نہ سماتا تھا، اس وقت وہ ایسی معلوم ہوئی کہ کوڑیالا کنڈلی مار بیٹھا ہے بولا۔ تمھارے لیے کوئی اچھی سی گھڑی لے دوں گا۔

جی نہیں معاف کیجیے آپ ہی اپنے لیے اچھی سی گھڑی لے لیجیے۔ مجھے تو یہی اچھی لگتی ہے۔ کلائی پر باندھے رہوں گی۔ جب جب اسے دیکھوں گی تمھاری یاد آئے گی۔ رام جانے تم نے آج تک مجھے کانی کوڑی بھی نہیں دی، اب انکار کرو گے تو پھر کوئی اور چیز مانگوں گی۔

اس دھمکی سے مجھے کوئی خاص پریشانی نہ ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ دل میں خوش ہونا چاہیے تھا کہ زندگی کو ایک بلائے عظیم سے نجات ملی۔ پر نہ جانے کیوں میں بدحواس ہو گیا۔ کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بولا۔ پیاری گھڑی کیا چیز ہے تمھارے لیے جان حاضر ہے۔ لاؤ تمھاری کلائی پر باندھ دوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ وقت کا ٹھیک اندازہ نہ ہونے سے کبھی کبھی دفتر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی اور پھٹکار سننا پڑے گی۔ گھڑی تمھاری ہے لیکن جب تک اور دوسری گھڑی نہ لے لوں اسے پاس رہنے دو۔ میں بہت جلد کوئی سستے داموں کی گھڑی اپنے لیے لے لوں گا اور تمھاری گھڑی تمھارے پاس پھیر دوں گا اس میں تو تمھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

دیوی نے میری کلائی سے گھڑی کھولتے ہوئے کہا۔ رام جانے تم بڑے چکمے باز ہو۔ پر یہاں کوئی ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں دو چار دن میں دوسری گھڑی لے لینا اس عرصہ میں ذرا سویرے دفتر چلے جانا۔

مجھے وقت کا اندازہ ہی نہیں سچ کہتا ہوں۔ کے بجے صبح ہوتی ہے اور کے بجے شام، اس کا مجھے آج تک علم نہ ہوا۔

تو کسی یار دوست سے مانگ کر کام چلانا میں تو اب نہ دوں گی۔

اب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ کلائی پر سے گھڑی کھلتے ہی دل پر فکر کا ایک پہاڑ سا آ بیٹھا۔ دانو کو کیا جواب دوں گا۔ یہ سوال کسی اندرونی درد کی طرح دل کو مسلنے لگا۔

(3)

جب تیسرے دن میں نے دانو بابو سے بہ چشم پرنم کہا کہ گھڑی تو کہیں کھو گئی تو وہ تسکین یا تشفی دینے کے بدلے بڑی بے رخی سے بولے۔ اسی لیے تمھیں گھڑی نہ دیتا تھا۔ میرے پاس وہ گھڑی تین سال رہی ایک دن بھی ادھر ادھر نہ ہوئی۔ تم نے تین دن میں اس کا وارا نیارا کر دیا خوب! ہو بڑے جو انمرد۔ کہاں گئے تھے؟

میں دل میں ڈر رہا تھا کہ خدا جانے کیا آفت آئے گی۔ دانو شاید سینکڑوں صلواتیں سنائے گا۔ مار بھی بیٹھے تو تعجب نہیں۔ دل کڑا کیے ہوئے تھا یہ دوستانہ تہدید مجھے بیش از امید نظر آئی ذرا تشفی ہوئی بولا۔ ذرا سسرال چلا گیا تھا۔

تو بھابی جان کو لوا لائے۔

جی ہاں بھابی جان کو لوا لایا اپنا گذر تو ہوتا نہیں بھابی جان کو کیسے لاتا۔

آخر تم اتنا کماتے ہو سب کا سب کیا کرتے ہو؟

کماتا ہوں کیا اپنا سر تیس ہی روپیہ تو...

تو تیسوں خرچ کر ڈالتے ہو۔

کیا تیس میرے لیے بہت ہیں۔

جب تمھاری آمدنی تیس روپیہ ہے تو یہ سب تمھیں اپنے اوپر خرچ کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ بیوی کب تک میکے پڑی رہے گی۔

جب تک کچھ ترقی نہیں ہوتی مجبوری ہے کس برتے پر لاؤں۔

اور ترقی دو چار سال نہ ہو تو؟

وہ تو ایشور ہی نے کہا ہے ادھر تو ایسی کوئی امید نہیں ہے۔

شاباش تب تو تمھاری پیٹھ ٹھونکنی چاہیے اور کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔ صبح کو بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہو؟

سارا وقت نہانے دھونے کھانے پینے میں صرف ہو جاتا ہے پھر یار دوستوں سے ملنا جلنا بھی ہے۔

تو بھئی تمھارا مرض لا دوا ہے۔ ایسے فضول آدمی کے ساتھ مجھے شمہ بھر ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ آپ کو معلوم ہے میری گھڑی پانسو روپیہ کی تھی اتنے روپے آپ کو دینے پڑیں گے۔ آپ اپنے لیے پندرہ روپیہ رکھ کر باقی پندرہ روپیہ میرے حوالے کرتے جائیے 30 مہینہ یا اڑھائی سال میں میرے روپے پٹ جائیں تب جی کھول کر دوستوں سے ملئے سمجھ گئے۔ میں نے پچاس روپے چھوڑ دیے اس سے زیادہ رعایت میں نہیں کر سکتا۔

میں نے رونی صورت بنا کر کہا پندرہ روپے میں میرا کیسے گذارہ ہو گا۔

گذارہ تو پانچ میں بھی ہو سکتا ہے اور پانسو میں بھی۔ اس کی نہ پوچھو اپنی اپنی حیثیت ہے۔ دانو بابو نے جس بے رخی اور بے اعتنائی سے یہ باتیں کہیں ان سے مجھے یقین ہو گیا کہ اب ان کی اور منت ساجت کرنی بیکار ہے۔ یہ حضرت اپنی پوری رقم لیے بنا نہ مانیں گے۔ گھڑی میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ دوسو کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے انھوں نے پہلے ہی اس کی قیمت مجھے بتادی تھی۔ اس امر میں اب قیل و قال کی گنجائش نہیں۔ قسمت ٹھونک کرگھر آیا۔ یہ شادی کرنے کا مزہ ہے اس وقت کتنا خوش تھا گویا نعمت عظمٰی ہاتھوں لگ رہی ہے اب نانی کے نام کو روؤں۔ گھڑی کا شوق چرایا تھا اس کا خمیازہ اٹھاؤں۔ نہ گھڑی کلائی پر باندھ کر جاتے تو ایسی کون سی کرکری ہوئی جاتی تھی مگر تم اس وقت کس کی سننے لگے تھے اب دیکھیں پندرہ میں کیسے گزر کرتے ہو تیس میں تو پورا ہی نہیں پڑتا تھا اب پندرہ میں تم کیا کرو گے۔

انھیں تفکرات میں پڑا پڑا سو گیا۔ کھانے کی بھی سدھ نہ رہی۔

(4)

اب ذرا سنئے کہ 30 روپے میں کیسے گزر کرتا تھا۔ لطف کی بات ہے اب تک 20 روپیہ ہوٹل کے دیتا تھا۔ دس روپیہ میں ناشتہ دھوبی نائی پان تمباکو سگریٹ دوست احباب کی خاطر، چائے کپڑا جوتا سر کا تیل سب کچھ ایسا کون شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا ایسی کون سی فضول مد تھی جس میں کفایت کرتا، تیس روپیہ میں ہی مشکل سے مہینہ ختم ہوتا تھا۔ اب 15 روپے میں کیسے نبھے گی۔ یہ خیال کر کے میں رو پڑا۔ مگر دانو کا قرض چکانا تھا۔ رو کر چکاتا یا ہنس کر۔ ایک بار جی میں آیا کہ سسرال جاکر گھڑی اٹھا

لاؤں لیکن دانو سے کہہ چکا ہوں گھڑی کھو گئی ہے۔ اب گھڑی لے کر جاتا تو وہ مجھے متلفی اور جھوٹا کہتے۔ میں نے سوچا کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تو سمجھا تھا کہ گھڑی کھو گئی لیکن سسرال گیا تو پتہ چل گیا۔ میری بیوی نے اڑا لی تھی۔ ہاں چال تو بری نہیں تھی لیکن دیوی جی سے کیا بہانہ کرتا؟ گھڑی پا کر وہ کتنی خوش ہوگئی تھی معلوم ہوتا تھا ساری دنیا کی دولت ہاتھ آگئی ہے اب جاکر گھڑی چھین لاتا تو شاید میری صورت بھی نہ دیکھتی ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ دانو بابو کے پاس جا کر رونے لگتا۔ زارو قطار رونے لگتا آج غصہ میں انھوں نے سخت ست کہا ہے دو چار دن بعد جب غصہ فرو ہو جائے گا تو انھیں ضرور مجھ پر رحم آ جائے گا۔ بچپن کی دوستی کیا اتنا اثر بھی نہیں دکھائے گی لیکن میں بے غیرت نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

دوسرے ہی دن ایک بہت سستے ہوٹل میں اٹھ گیا ہوٹل تو نام تھا۔ وہ ایک چڑیا خانہ بارہ روپے میں انتظام ہوگیا۔ دس کھانے کے اور دو مکان کے ناشتہ کے لیے دودھ اور چائے کی جگہ ایک آنے کی چنے لاکر رکھ دیئے۔ اوپر کے مصارف کے لیے تین رو پیہ رکھ لیے صاف پندرہ بچ گئے سخت نفس کشی تھی۔ تپسیا سمجھ لو نہ پان نہ سگریٹ نہ چاٹ نہ مٹھائی نہ لیمو نیڈر نہ برف نہ کسی کے آنا نہ جانا پورا سنیاس تھا۔ خواہشیں بار بار اٹھتی تھیں لیکن حباب کی مانند اپنی بے بضاعتی کے احساس سے بیٹھ جاتی تھیں۔ جب میں نے مہینہ کے آخیر میں 15 روپے لے کر دانو بابو کو دیئے تو ایسا معلوم ہوا کہ میرا سر کچھ اونچا ہوگیا ہے۔ کئی انگل لمبا ہوگیاہوں ایسی پر غرور مسرت مجھے اپنی زندگی میں کبھی نہ حاصل ہوئی تھی۔

دانو نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔ بچائے یا کسی سے مانگ لائے؟

بچائے ہیں مانگتا کس سے۔

کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

میں نے ستم ظریفانہ انداز سے کہا۔ بالکل نہیں بالکل بادشاہوں کی طرح بسر ہو رہی ہے۔ صبح کو تواب بھی خالی رہتے ہوکیوں آمدنی بڑھانے کی فکر نہیں کرتے؟

فکر تو بہت کرتا ہوں یہاں تک کہ اس میں غرق ہو جاتا ہوں وہ بجائے خود ایک کام ہوگیا ہے لیکن کوئی صورت نہیں پیدا ہوتی۔

یہاں سے لوٹا تو مجھے اپنے دل میں ایک نئی قوت ایک مردانہ حوصلہ کا احساس ہو رہا تھا وہ بیکسی جو دل پر مسلط رہتی تھی غائب ہو گئی۔

مزاج میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ جن خواہشات کا روکنا میرے لیے امر محال تھا ان کی طرف اب خیال بھی نہ جاتا تھا۔ جس پان کی دکان پر اپنا دل بے قرار ہو جاتا تھا اس طرف سے میں اب یوں سر اٹھا کر نکل جاتا تھا۔ گویا پان کھانا زنانوں کا کام ہے۔ میرے لیے سخت معیوب سگریٹ چائے چاٹ کسی چیز کی طرف دل مائل نہ ہوتا تھا۔ صبح کو بھیگے ہوئے چنے دونوں وقت روٹی اور دال بس اس کے سوا میرے لیے دنیا کی اور سب چیزیں ممنوع تھیں۔ ہیں ان کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب مجھے زندگی سے خاص الفت ہو گئی تھی افلاس میں موت کو دعوت کہاں سے دیتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں زندگی میں کچھ کر سکتا ہوں۔

ایک دن ایک دوست نے مجھ سے پان کے لیے اسرار کیا۔ میں نے نہ کھایا تب وہ بولے تم نے یار پان چھوڑ کر کمال کر دیا۔ میں قیاس بھی نہ کر سکتا تھا کہ تم پان چھوڑ دوگے۔ ہمیں بھی کوئی ترکیب بتاؤ کہ اس بلا سے نجات ملے۔

میں نے فاتحانہ انداز سے مسکرا کر کہا۔ اس کی ترکیب یہی ہے کہ پان نہ کھاؤ۔

جی تو نہیں مانتا۔

آپ ہی مان جائے گا۔

سگریٹ کے بغیر تو پیٹ پھولنے لگتا ہے۔

پھولنے دو آپ پچک جائے گا۔

اچھا تو آج سے میں نے پان اور سگریٹ دونوں چھوڑ دیئے۔

تم کیا چھوڑو گے غیر ممکن

میں نے انھیں اشتعال دلانے کے لیے یہ تعرض اختیار کی تھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ گرم ہو کر بولے اگر تم چھوڑ سکتے ہو تو میں بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ تم سے کسی بات میں کم نہیں ہوں۔

اچھی بات ہے دیکھوں گا۔

دیکھ لینا۔
میں نے آج تک پان یا سگریٹ کا شوق کرتے نہیں دیکھا۔
چار مہینے نکل گئے۔ دانو بابو کی ماہوار قسط میں ایک دن کی بھی دیر نہ ہوئی۔
پانچویں مہینے میں جب میں روپے لے کر گیا تو وہ ٹوٹ کر میرے گلے سے لپٹ گئے اور بولے یار تم دھن کے پکے۔ مگر سچ کہنا مجھے دل میں کوستے تو نہیں ہو؟
میں نے ہنس کر کہا اب تو نہیں کوستا لیکن پہلے ضرور کوستا تھا۔
اب کیوں رعایت کرنے لگے؟
اس لیے مجھ جیسے خانہ خراب آدمی کو جس طرح رہنا چاہیے وہ تم نے مجھے سکھا دیا۔ میری آمدنی میں نصف میری بیوی ہے پر اب تک میں اس کا حصہ بھی ہضم کر جاتا تھا اور بھی سیر نہ ہوتا۔ اب میں اس قابل ہو رہا ہوں کہ اس کا حصہ اسے دے دوں یا بلا کر اپنے ساتھ رکھوں تم نے مجھے بہت اچھا سبق دیا۔
اگر تمھاری آمدنی کچھ بڑھ جائے تو پھر وہی وطیرہ اختیار کر لو گے؟
ہرگز نہیں بیوی کو بلالوں گا یہ کتنی بے حیائی ہے کہ میری بیوی دوسروں کے سر پڑی رہے اچھا تو خوش ہو جاؤ تمھاری ترقی ہوگئی۔
مجھے یقین نہ آیا بولا میری ترقی کیسے ہوگی ابھی مجھ سے پہلے والے پڑے ناک رگڑ رہے ہیں۔
کہتا ہوں مان جاؤ مجھ سے تمھارے بڑے بابو کہتے تھے۔
مجھے اب بھی یقین نہ آیا لیکن فرط مسرت سے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ ادھر دانو بابو رخصت ہوئے ادھر میں بڑے بابو کے گھر پہنچا۔ بابو صاحب بیٹھے اپنی بکری دوہ رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو جھینپتے ہوئے بولے کیا کروں بھائی آج گوالا نہیں آیا (بعد میں معلوم ہوا کہ کوئی گوالا نہ تھا) اس لیے یہ بلا گلے پڑی چلو بیٹھو۔
میں کمرے میں جا بیٹھا۔ بابو جی کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد بھلے آدمی بنے ہوئے ہاتھ میں گڑگڑی لیے باہر نکلے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ بولا میں نے سنا ہے میری ترقی ہو رہی ہے؟
دانو بابو نے کہا ہوگا؟

جی ہاں ابھی کہا ہے مگر میرا نمبر تو آیا نہیں ترقی کیسے ہوئی؟
یہ نہ پوچھو افسروں کی نگاہ چاہیے نمبر سمبر کون پوچھتا ہے۔
لیکن آخر موقع کون سا ہے۔
کہہ دیا بھائی افسر لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ صاحب ایک دوسری مد سے تمھیں 15 روپے زیادہ دینا چاہتے ہیں۔ دانو بابو نے شاید ان سے تمھاری سفارش کی ہے۔
کسی دوسرے کا حق چھین کر تو مجھے یہ روپے نہیں دیے جا رہے ہیں۔
نہیں یہ بات نہیں میں خود اسے منظور نہ کرتا۔
مہینہ گزرا مجھے 45 روپیہ ملے مگر رجسٹر میں میرے نام کے سامنے وہی تیس لکھے ہیں۔ بڑے بابو نے تخلیہ میں بلا کر مجھے روپے دیے اور تاکید کردی کہ کسی سے نہ کہنا ورنہ داویلا مچ جائے گا۔
میں خوش خوش روپے لیے دانو بابو کے گھر پہنچا وہ میری باچھیں کھلی دیکھ کر بولے مار لائے ترقی۔ کیوں؟
ہاں یار روپے تو 15 ملے مگر ترقی نہیں ہوئی۔ کسی اور مد سے دیے گئے ہیں۔
اجی تمھیں روپے سے مطلب ہے یا مد سے۔ تو اب بھابی کو بلا لاؤ گے؟
نہیں ابھی نہیں!
تم نے تو کہا تھا ترقی ہو جائے گی تو بیوی کو لاؤں گا۔ اب کیا ہوگیا؟
میں سوچتا ہوں پہلے آپ کے روپے ادا کر دوں اب کے تیس روپے کی قسط ہوگی سال بھر میں روپے پٹ جائیں گے۔ تب آزاد ہو جاؤں گا۔
دانو بابو کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ وہ حضرت میٹھے بیر کی طرح اوپر سے روکھے اور اندر سے شیریں تھے۔ بولے نہیں بھئی اب کے مجھے کچھ مت دو۔ ریل کا خرچ کہاں سے لاؤ گے جاکر بھابی کو لے آؤ۔
میں نے دبدھے میں پڑ کر بولا۔ یار ابھی نہ مجبور کرو۔ شاید قسط ادا نہ کر سکوں۔
دانو بابو نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی گھڑی کے دام پا چکا۔ میں نے اسے پچیس ہی میں لیا تھا اور تین سال تک کام لے چکا۔ مجھے تم سے کچھ نہیں لینا چاہیے تھا۔ اپنی خود غرضی پر نادم ہوں۔

میری آنکھیں بھر آئیں۔ جی میں تو آیا کہ گھڑی کا سارا راز کہہ سناؤں۔ لیکن ضبط کر گیا۔ بولا۔ نہیں دانو بابو ! مجھے روپے ادا کر لینے دو۔ آخر تم اس گھڑی کو چار یا پانسو میں بیچ لیتے یا نہیں۔ میرے باعث تمھیں اتنا نقصان کیوں ہو؟

ارے بھئی اب گھڑی کا ذکر نہ کرو یہ بتاؤ کب جاؤ گے۔

ارے مکان تو پہلے ٹھیک کر لوں۔

تم جاؤ میں مکان کا انتظام کر دوں گا۔

مگر میں 5 سے زیادہ کرایہ نہ دے سکوں گا۔ شہر سے ذرا ہٹ کر مکان سستا مل جائے گا۔ اچھی بات ہے میں ٹھیک کر لوں گا کس گاڑی سے لوٹو گے۔

یہ ابھی کیا معلوم رخصتی کا معاملہ ہے۔ ساعت بنے یا نہ بنے۔ تم اس الجھن میں کیوں پڑو گے۔ دو چار دن میں مکان کا انتظام کر کے چلا جاؤں گا۔

جی نہیں آپ آج جایئے اور کل آیئے۔ میرا آدمی تمھیں اسٹیشن پر ملے گا۔

میں نے بہت حیلے حوالے کیے مگر اس بھلے آدمی نے ایک نہ سنی۔ مجھے اسی دن سسرال جانا پڑا۔

(5)

مجھے سسرال میں تین دن لگ گئے، چوتھے دن دیوی جی کے ساتھ رخصت ہوا دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں دانو بابو نے اسٹیشن پر کوئی آدمی نہ بھیجا ہو تو کس کے گھر جاؤں گا آج چوتھا دن ہے انھیں اتنی کیا غرض پڑی ہے کہ بار بار آدمی بھیجیں گاڑی میں سوار ہوتے وقت خیال آیا۔ تار دے دوں لیکن بارہ آنے کا سوال مانع ہوا۔

مگر جب گاڑی بنارس پہنچی تو دیکھتا ہوں دانو بابو خود ہیٹ ویٹ لگائے دو قلیوں کے ساتھ کھڑے ہیں مجھے دیکھتے ہی دوڑے اور بولے سسرال کی روٹیاں بہت پیاری لگ رہی تھیں کیا؟ تین دن سے روز دوڑ رہا ہوں جرمانہ دینے پڑے گا۔

دیوی جی سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئی تھیں میں چاہتا تھا جلدی سے تانگے پر بیٹھ کر چل دوں۔ گھڑی ان کی کلائی پر بندھی تھی۔ ڈرتا تھا کہیں دانو کی نظر اس پر نہ جا پڑے مگر تقدیر کے نوشتے کو کون ٹال سکتا ہے۔ میں دیوی جی سے دانو کی قصیدہ خوانی کر چکا تھا۔ اب جو دانو ان کے

قریب آ کر صندوق اٹھوانے لگا تو دیوی جی نے دونوں ہاتھوں سے انھیں نمسکار کیا۔ دانو نے گھڑی دیکھ لی۔ اس وقت تو کیا بولتے لیکن جوں ہی ہم دونوں دوسرے تانگے پر بیٹھ کر چلے تو دانو نے مسکرا کر کہا۔ کیا گھڑی دیوی جی نے چھپا دی تھی۔

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ نہیں یار میں ہی دے آیا تھا۔ دے کیا آیا تھا انھوں نے مجھ سے چھین لی تھی۔

توتم مجھ سے جھوٹ کیوں بولے؟

پھر کیا کرتا؟

اگر تم صاف صاف کہہ دیتے تو شاید میں اتنا کمینہ نہ تھا کہ تم سے اس کا تاوان لیتا لیکن خیر ایشور کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ تمھیں کچھ دنوں ایسی تپسیا کی ضرورت تھی۔

مکان ٹھیک کیا ہے۔

وہیں تو چل رہا ہوں۔

کیا کہیں تمھارے گھر کے قریب ہے تب تو کرایہ بہت ہوگا۔

نہیں میرے گھر سے ملا ہوا ہے مگر بہت سستا۔

دونوں تانگے دانو بابو کے دروازے پر رکے، آدمیوں نے دوڑ کر اسباب اتارنا شروع کیا۔ ایک لمحہ میں دانو کی اہلیہ نے آکر دیوی جی کو تانگے سے اتارا۔ معلوم ہوتا تھا ساری باتیں پہلے سے ہی طے ہو چکی تھیں۔

میں نے کہا تو پھر یہ کہو کہ ہم تمھارے بن بلائے مہمان ہیں۔

اب تم اپنی مرضی کا کوئی مکان ڈھونڈ لینا۔ دس پانچ دن تو یہیں رہو لیکن مجھے یہ زبر دستی کی مہمانی اچھی نہیں لگی۔ میں نے تیسرے ہی دن ایک مکان تلاش کرلیا۔ چلتے وقت دانو نے 100 روپے لے کر میرے سامنے رکھ دیے اور کہا یہ تمھاری امانت ہے لیتے جاؤ۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ میری امانت کیسی؟

15 روپے کے حساب 90 تم نے جمع کیے اس پر دس روپیہ بینک کا سود۔

مجھے دانو کی یہ دوست نوازی بوجھ معلوم ہوئی بولا تمھاری گھڑی لوٹا دوں۔ پھر

تم نے گھڑی کا ذکر کیا اس کا نام مت لو۔

تم مجھے چاروں طرف سے دبانا چاہتے ہو۔

ہاں دبانا چاہتا ہوں۔ تمھیں آدمی بنا رہا ہوں۔

تو آپ میرے استاد ہیں۔

جی ہاں ایسے استاد کی تمھیں ضرورت تھی۔

میں نے مجبور ہو کر کہا تو بھئی گھڑی؟

پھر تم نے گھڑی کا نام لیا۔

تم خود مجھے مجبور کر رہے ہو۔

بھابی جان کو میری نذر ہے۔

اور یہ سو روپیہ مجھے انعام ملے ہیں؟

جی ہاں یہ امتحان میں پاس ہو نے کا انعام ہے۔

تب تو ڈبل انعام ہوا۔

تمھاری تقدیر ہی اچھی ہے میں کیا کروں۔

میں نے یہ روپے سیونگ بنک میں جمع کر دیے۔ دس مکان کا کرایہ تھا۔ تمیں گھر کا خرچ اور پانچ بچت اب مجھے معلوم ہو ا کہ دانو نے مجھ سے یہ تپسیا نہ کرائی ہوتی تو میں نہ جانے کتنے دنوں تک آوارۂ خانماں خراب بنا رہتا۔ اسی تپسیا کی بدولت اب زندگی آرام سے کٹ رہی ہے مگر گھڑی کا قصہ میں نے آج تک دیوی جی سے نہ کہا۔

پانچ مہینے کے بعد میری ترقی ہوئی۔ فرضی ترقی نہیں اصلی ترقی۔ ڈر رہا تھا کہ بالائی مد والے 15 روپے ملتے ہیں یا نہیں۔ تنخواہ مل جانے پر بھی کئی منٹ تک شش و پنج کی حالت میں کھڑا رہا۔ جب اور لوگ چلے گئے تو بڑے بابو نے فرمایا کیا ابھی لالچ گھیرے ہوئے ہے اور اب اور کچھ نہ ملے گا۔

میں نے نادم ہو کر کہا۔ جی نہیں اس خیال سے نہیں کھڑا ہوں۔ صاحب نے اتنے دنوں میری پرورش کی۔ یہ کیا تھوڑا ہے۔ مگر کم سے کم یہ تو بتا دیجئے کہ کس مد کے روپے تھے؟

پوچھ کر کیا کروگے؟

کچھ نہیں یوں ہی جاننے کو جی چاہتا ہے۔
جاکر دانو بابو سے پوچھو۔
دفتر کا حال دانو بابو کو کیا معلوم۔
نہیں یہ حال وہی جانتے ہیں۔
میں ہوا کے گھوڑوں پر سوار دانو بابو کے گھر پہنچا اس عقدہ کو کھولے بغیر اب میرا زندہ رہنا محال تھا۔ دانو نے حیرت سے پوچھا۔ خیریت تو ہے۔ کہاں سے بھاگتے آئے ہو۔
میں نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ میرے یہاں توسب خیریت ہے لیکن تمھاری خیریت نظر نہیں آتی۔
کیوں بھائی میں نے کیا خطا کی ہے؟
میں نے اپنا سوال پیش کیا۔ دانو نے مسکراکر کہا بڑے بابو سے نہیں پوچھا؟ تمھارے دفتر کا حال بھلا میں کیا جانوں۔
دیکھو دانو مجھ سے اڑو گے تو اچھا نہ ہوگا۔ کیوں ناحق میرے ہاتھوں پٹو گے۔
پیٹنا چاہو تو پیٹ لو بھئی۔ سینکڑوں بار پیٹا ہے۔ ایک بار اور سہی۔ پاڑپڑ سے جو دھکیل دیا تھا۔ اس کا نشان اب تک باقی ہے یہ دیکھو۔
تم ٹال رہے ہو۔ اور میرا دم گھٹ رہا ہے سچ بتاؤ کیا بات تھی؟
بات کچھ نہیں تھی جی۔ محض دل لگی تھی۔ تیس روپے میں ایک آدمی کا گذر ہو سکتا ہے لیکن دو آدمیوں کا گذر کسی طرح نہیں ہو سکتا اور کچھ نہ سہی دونوں وقت روٹیاں تو ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اب اس کے لیے جو سزا چاہے دو، گناہ میرا ہی ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ "مادھوری" کے جولائی 1927 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا مانگے کی گھڑی نہ مانسروور 4 میں شامل ہے۔ اردو میں "خاک پروانہ" میں شامل ہے۔)

بابا جی کا بھوگ

رام دھن اُہر کے دوار پر ایک سادھو آکر بولا۔ بچہ بڑا کلیان ہو، کچھ سادھو پر شردّھا کرو۔

رام دھن نے جاکر استری سے کہا۔ سادھو دوار پر آئے ہیں انھیں کچھ دے دے۔

استری برتن مانجھ رہی تھی اور اس گھور چنتا میں مگن تھی کہ آج بھوجن کیا بنے گا۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہ تھا۔ چیت کا مہینہ تھا۔ کنتو یہاں دوپہر ہی کو اندھکار چھا گیا تھا۔ اپج ساری کی ساری کھلیان سے اٹھ گئی۔ آدھی مہاجن نے لے لی۔ آدھی زمین دار کے پیادوں نے وصول کی۔ بھوسا بیچا تو بیل کے بیپاری سے گلا چھوٹا۔ بس تھوڑی سے گانٹھ اپنے حصہ میں آئی۔ اسی کو پیٹ پیٹ کر ایک من بھر دانہ نکالا تھا۔ کسی طرح چیت کا مہینہ پار ہوا۔ اب آگے کیا ہوگا۔ کیا بیل کھائیں گے۔ کیا گھر کے پرانی کھائیں گے۔ یہ ایشور ہی جانے! پر دوار پر سادھو آگئے ہیں۔ اسے نراش کیسے لوٹائیں۔ اپنے دل میں کیا کہے گا۔

استری نے کہا۔ کیا دے دوں کچھ تو رہا نہیں؟

رام دھن: جا، دیکھ تو مٹکے میں، کچھ آٹا واٹا مل جائے تو لے آ۔

استری نے کہا مٹکے جھاڑ پونچھ کر تو کل ہی چولہا جلا تھا۔ کیا اس میں برکت ہوگی۔

رام دھن: تو مجھ سے تو یہ نہ کہا جائے گا بابا گھر میں کچھ نہیں ہے۔ کسی کے گھر سے مانگ لے۔

استری: جس سے لیا اسے دینے کی نوبت نہیں آئی۔ اب اور کس منھ سے مانگوں؟

رام دھن: دیوتاؤں کے لیے کچھ انگویا نکالا ہے نا وہی لاؤ دے آؤں۔

استری: دیوتاؤں کی پوجا کہاں سے ہوگی؟

رام دھن: دیوتا مانگنے تو نہیں آتے؟ سمائی ہوگی کرنا، نہ سمائی ہوگی نہ کرنا۔

استری: ارے تو کچھ انگویا بھی پنسیری دو پنسیری ہے؟ بہت ہوگا تو آدھ سیر۔ اس کے بعد کیا پھر کوئی سادھو نہ آئے گا۔ اسے تو جواب دینا پڑے گا۔

رام دھن: یہ بلا تو ٹلے گی پھر دیکھی جائے گی۔

استری جھنجھلا کر اٹھی اور ایک چھوٹی سی ہانڈی اٹھا لائی جس میں مشکل سے آدھا سیر آٹا تھا۔ وہ گیہوں کا آٹا بڑے جتن سے دیوتاؤں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ رام دھن کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ تب آٹا ایک کٹورے میں رکھ کر باہر آیا اور سادھو کی جھولی میں ڈال دیا۔

مہاتما نے آٹا لے کر کہا۔ بچہ اب تو سادھو آج یہیں رہے گا۔ کچھ تھوڑی سی دال دے تو سادھو کا بھوگ لگ جائے۔

رام دھن پھر آکر استری سے کہا۔ سنیوگ سے دال گھر میں تھی۔ رام دھن نے دال، نمک، اپلے جٹا دیے۔ پھر کنویں سے پانی کھینچ لایا۔ سادھو نے بڑی ودھی سے باٹیا بنائیں۔ دال پکائی آلو جھولی میں سے نکال کر بھرتا بنایا۔ جب سب سمگری تیار ہو گئی تو رام دھن سے بولے۔ بچہ بھگوان کے بھوگ کے لیے کوڑی بھر گھی چاہیے۔ رسوئی پوتر نہ ہوگی تو بھوگ کیسے لگے گا۔

رام دھن: بابا جی گھی تو گھر میں نہ ہوگا۔

سادھو: بچہ بھگوان کا دیا ترے پاس بہت ہے۔ ایسی باتیں نہ کہہ۔

رام دھن: مہاراج۔ میرے گائے بھینس کچھ نہیں ہے۔ گھی کہاں سے ہوگا۔

سادھو: بچہ بھگوان کے بھنڈار میں سب کچھ ہے جاکر مالکن سے کہو تو؟

رام دھن نے جاکر استری سے کہا۔ گھی مانگتے ہیں۔ مانگنے کو بھیک۔ پر گھی بنا کور نہیں دھنستا۔

استری: تو اسی دال میں سے تھوڑی سی لے کر بنئے کے یہاں سے لادو۔ جب سب کیا ہے تو اتنے کے لیے انھیں کیوں ناراض کرتے ہو؟

گھی آگیا۔ سادھو جی نے ٹھاکر جی کی پنڈی نکالی، گھنٹی بجائی اور بھوگ لگانے بیٹھے۔ خوب تن کر کھایا۔ پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوار پر لیٹ گئے۔ تھالی، بٹلی اور کلپھلی رام دھن گھر میں ماجھنے کے لیے اٹھا لے گیا۔

اس رات رام دھن کے گھر چولہا نہیں جلا۔ خالی دال پکا کر ہی پی لی۔
رام دھن لیٹا تو سوچ رہا تھا۔ مجھ سے تو یہی اچھے۔

('پریم پرتیما' جولائی 1927 میں شائع ہوا) یہ افسانہ اردو میں شائع نہیں ہوا۔
پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

ایکٹریس

(1)

رنگ منچ کا پردہ گر گیا۔ تارا دیوی نے شکنتلا کا پارٹ کھیل کر درشکوں کو مگدھ کردیا تھا۔ جس وقت شکنتلا کے روپ میں راجہ دُشینت کے سَمُکھ کھڑی گلانی، ویدنا، اور ترسکار سے اُتیجت بھاؤں کو آگنیہ شبدوں میں پرکٹ کر رہی تھی، درشک ورند شِشٹِتا کے نیئموں کی اُپیکشا کر کے منچ کی اُور اُنمتّوں کی بھانتی دوڑ پڑے تھے اور تارا دیوی کا یشوگان کرنے لگے تھے۔ کتنے ہی تو اسٹیج پر چڑھ گئے اور تارا دیوی کے چرنوں پر گر پڑے۔ سارا اسٹیج پھولوں سے پٹ گیا، آبھوشنوں کی ورشا ہونے لگی۔ یدی اسی چھن (لمحہ) مینکا کا وِمان نیچے آکر اسے اڑا نہ لے جاتا، تو کداچِت اس دَھکّم۔ دھکّے میں دس پانچ آدمیوں کی جان پر بن جاتی۔ منیجر... نے تُرنت آکر درشکوں کو گُنا گرِاہکتا کا دَھنیہ وَاد دیا اور وعدہ بھی کیا کہ دوسرے دن پھر وہی تماشا ہوگا۔ تب لوگوں کا موہانماد شانت ہوا۔ مگر ایک یُوک اس وقت بھی منچ پر کھڑا رہا۔ لمبے قد کا تھا، تیجسوی مدرا، کُندَن کا سا رنگ دیوتاؤں کا سا روپ، گٹھی ہوئی دیہہ، مُکھ سے ایک جیوتی سی پرس پھٹِت ہو رہی تھی۔ کوئی راج کمار معلوم ہوتا تھا۔

جب سارے درشک گن باہر نکل گئے، اس نے منیجر سے پوچھا۔ کیا میں تارا دیوی سے ایک چھن (لمحہ) کے لیے مل سکتا ہوں؟

منیجر نے اُپیکشا کے بھاؤ سے کہا۔ ہمارے یہاں ایسا نیم نہیں ہے۔

یوک نے پھر پوچھا۔ کیا آپ میرا کوئی پتر اس کے پاس بھیج سکتے ہیں؟

منیجر نے اسی اُپیکشا کے بھاؤ سے کہا۔ جی نہیں۔ چھما کیجیے گا۔ یہ ہمارے نیموں کے وِرُدھ ہے۔ یوک نے اور کچھ نہ کہا، نراش ہو کر اسٹیج کے نیچے اتر پڑا اور باہر جانا ہی چاہتا تھا کہ منیجر نے پوچھا۔ ذرا ٹھہر جایئے۔ آپ کا کارڈ؟ یوک نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر کچھ لکھا اور دے دیا۔ منیجر نے پرزے کو اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ کنور نرمل کانت چودھری اُو. بی. اِی.۔ منیجر کی کٹھور مدرا کومل ہوگئی۔ کنور نرمل

کانت۔ شہر کے سب سے بڑے رئیس اور تعلقے دار، ساہتیہ کے اُجّول رتن، سنگیت کے سِدّھ ہست آچاریہ، اُچّ کوٹی کے وِدّوان، آٹھ دس لاکھ سالانہ کے نفع دار، جن کے دان سے دیش کی کتنی ہی سنستھائیں چلتی تھیں۔ اس سے ایک چھد حقیر پست ذلیل معمولی پرارتھی کے روپ میں کھڑے تھے۔ منیجر اپنے اُپیکشھا بھاؤ پر لجّت ہو گیا۔ وِنمر شبدوں میں بولا۔ چھما کیجیے گا۔ مجھ سے بڑا اپرادھ ہوا۔ میں ابھی تارا دیوی کے پاس حضور کا کارڈ لیے جاتا ہوں۔

کنور صاحب نے اس سے رکنے کا اِشارہ کر کے کہا۔ نہیں، اب رہنے ہی دیجیے۔ میں کل پانچ بجے آؤں گا۔ اس وقت تارا دیوی کو کشٹ ہوگا۔ یہ ان کے وشرام کا سمے ہے۔

منیجر : مجھے وِشواس ہے کہ وہ آپ کی خاطر اتنا کشٹ سہرشِ سہ لیں گی، میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔

کِنتو کنور صاحب اپنا پریچے دینے کے بعد اب اپنی آترتا پر سنیم کا پردا ڈالنے کے لیے وِوَش تھے۔ منیجر کو سجّنتا کا دھنیہ واد دیا۔ اور کل آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

(2)

تارا ایک صاف ستھرے اور سجے ہوئے کمرے میں میز کے سامنے کسی وِچار میں مگن بیٹھی تھی۔ رات کا وہ درشیہ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ایسے دن جیون میں کیا بار بار آتے ہیں؟ کتنے منشیہ اس کے درشنوں کے لیے ویکل ہو رہے تھے! بس، ایک دوسرے پر پھاٹ پڑتے تھے۔ کتنوں کو اس نے پیروں سے ٹھکرا دیا تھا۔ ہاں، ٹھکرا دیا تھا۔ مگر اس سَمُوہ میں کیول ایک دِوّیہ مورتی اَوِچلت روپ سے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کتنا گمبھیر انوراگ تھا۔ کتنا دِرڑھ سنکلپ! ایسا جان پڑتا تھا۔ مانو دونوں نیتر اس کے ہردے میں چھپے جا رہے ہوں۔ آج پھر اس پروش کے درشن ہوں گے یا نہیں، کون جانتا ہے۔ لیکن یدی آج ان کے درشن ہوئے، تو تارا ان سے ایک بار بات چیت کیے بنا نہ جانے دے گی۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے آئینے کی اُور دیکھا، کمل کا پھول سا کھلا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ نووِکست پشپ پینتیس 35 بسنتوں کی بہار دیکھ چکا ہے۔ وہ کرانتی، وہ کوملتا،

وہ چپلتا، وہ مادھریہ کسی نویونا کو لجت کر سکتا تھا۔ تارا ایک بار پھر ہردے میں پریم کا دیپک جلا بیٹھی۔ آج سے بیس سال پہلے ایک بار اس کو پریم کا کٹو انُوبھو ہوا تھا۔ تب سے وہ ایک پرکار کا ویدھبیہ جیون وِیتیت کرتی رہی۔ کتنے پریمیوں نے اپنا ہردے اس کو بھینٹ کرنا چاہا تھا۔ پر اس نے کسی کی اُور آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ اُسے ان کے پریم میں کپٹ کی گندھ آتی تھی۔ مگر آہ۔ آج اس کا سنیم اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ایک بار پھر آج اسے ہردے میں اسی مدُھر ویدنا کا انوبھو ہوا، جو بیس سال پہلے ہوا تھا۔ ایک پُروش کا سومیہ سوروپ اس کی آنکھوں میں بس گیا، ہردے پٹ پر کھنچ گیا۔ اسے وہ کسی طرح بھول نہ سکتی تھی۔ اسی پُروش کو اس نے موٹر پر جاتے دیکھا ہوتا، تو کداچت ادھر دھیان بھی نہ کرتی۔ پر اسے اپنے سمکھ پریم کا اُپہار ہاتھ میں لیے دیکھ کر وہ اِستھِر نہ رہ سکی۔

سہسا دائی نے آکر کہا۔ بائی جی، رات کی سب چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ کہیے تو لاؤں؟

تارا نے کہا۔ نہیں، میرے پاس چیز لانے کی ضرورت نہیں۔ مگر ٹھہرو، کیا کیا چیزیں ہیں۔

ایک ڈھیر کا ڈھیر تو لگا ہے بائی جی، کہاں تک گِناؤں۔ اشرفیاں ہیں، برو چیز بال کے پن، بٹن، لاکٹ، انگوٹھیاں سبھی تو ہیں۔ ایک چھوٹے سے ڈبے میں ایک سُندر ہار ہے۔ میں نے آج تک ویسا ہار نہیں دیکھا۔ سب صندوق میں رکھ دیا ہے۔

اچھا، وہ صندوق میرے پاس لا۔ دائی نے صندوق لا کر میز پر رکھ دیا۔ ادھر ایک لڑکے نے ایک پتّر لا کر تارا کو دیا۔ تارا نے پتر کو اُتسُک نیتروں سے دیکھا۔ کنور نرمل کانت اُو. بی. اِی.۔ لڑکے سے پوچھا۔ یہ پتر کس نے دیا۔ وہ تو نہیں، جو ریشمی صافہ باندھے ہوئے تھے؟

لڑکے نے کیول اتنا کہا۔ مینیجر صاحب نے دیا ہے۔ اور لپکا ہوا باہر چلا گیا۔

صندوق میں سب سے پہلے ڈبا نظر آیا۔ تارا نے اسے کھولا تو سچے موتیوں کا سندر ہار تھا۔ ڈبے میں ایک طرف ایک کارڈ بھی تھا۔ تارا نے لپک کر اسے نکال لیا اور پڑھا۔ کنور نرمل کانت...! کارڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ جھپٹ کر

کُرسی سے اٹھی اور بڑے ویگ سے کئی کمروں اور برامدوں کو پار کرتی منیجر کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ منیجر نے کھڑے ہو کر اس کا سواگت کیا اور بولا۔ میں رات کی سپھلتا پر آپ کو بدھائی دیتا ہوں۔

تارا نے کھڑے کھڑے پوچھا۔ کنور نرمل کانت کیا باہر ہیں؟ لڑکا پتر دے کر بھاگ گیا۔ میں اس سے کچھ پوچھ نہ سکی۔ کنور صاحب کا ایک رقعہ تو رات ہی تمھارے چلے آنے کے بعد ملا تھا۔

تو آپ نے اس وقت میرے پاس کیوں نہ بھیج دیا؟

منیجر نے دبی زبان سے کہا۔ میں نے سمجھا، تم آرام کر رہی ہو گی، کشٹ دینا اُچت نہ سمجھا اور بھائی، صاف بات یہ ہے کہ میں ڈر رہا تھا، کہیں کنور صاحب کو تم سے ملا کر تمھیں کھو نہ بیٹھوں۔ اگر میں عورت ہوتا، تو اسی وقت ان کے پیچھے ہو لیتا۔ ایسا دیو روپ پُروش میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہی جو ریشمی صافہ باندھے کھڑے تھے تمھارے سامنے۔ تم نے بھی تو دیکھا تھا۔

تارا نے مانو اَردھ ندرا کی دشا میں کہا۔ ہاں، دیکھا تو تھا۔ کیا یہ پھر آئیں گے؟

ہاں، آج پانچ بجے شام کو۔ بڑے وِدوان آدمی ہیں، اور اس شہر کے سب سے بڑے رئیس۔

آج میں رِہرسل میں نہ آؤں گی۔

(3)

کنور صاحب آرہے ہوں گے۔ تارا آئینے کے سامنے بیٹھی ہے اور دائی اس کا سنگار کر رہی ہے۔ سنگار بھی اس زمانے میں ایک وِدّیا ہے پہلے پری پاٹی کے انوسار ہی سنگار کیا جاتا تھا۔ کویوں، چترکاروں، اور رسیکوں نے سنگار کی مریادا سی باندھ دی تھی۔ آنکھوں کے لیے کاجل لازمی تھا، ہاتھوں کے لیے مہندی، پاؤں کے لیے مہاور ایک ایک انگ ایک ایک آبھوشن کے لیے نردِشٹ تھا۔ آج وہ پری پاٹی نہیں رہی۔ آج پرتیک رمنی اپنی سُورچی سوبدّھی اور تُلناتمک بھاؤ سے سنگار کرتی ہیں۔ اس کا سوندریہ کس اپائے سے آکرشکتا کی سیما پر پہنچ سکتا ہے، یہی اس کا آدرش ہوتا ہے۔ تارا اس کلا میں نپن تھی۔ وہ پندرہ سال سے اس کمپنی میں تھی اور یہ سمست جیون اس نے

پروشوں کے ہردے سے کھیلنے ہی میں وِیتیت کیا تھا۔ کس چتون سے، کس مسکان سے، کس انگڑائی سے، کس طرح کیشوں کے بکھیر دینے سے دلوں کا قتل عام ہو جاتا ہے، اس کلا میں کون اس سے بڑھ کر ہو سکتا تھا۔ آج اس نے چن چن کر آزمائے ہوئے تیر ترکس سے نکالے، اور جب اپنے آستروں سے سج کر وہی دیوان خانے میں آئی، تو جان پڑا مانو سنسار کا سارا ماڈھریہ اس کی بلائیں لے رہا ہے۔ وہ میز کے پاس کھڑی ہو کر کنور صاحب کا کارڈ دیکھ رہی تھی۔ اس کے کان موٹر کی آواز کی اُور لگے ہوئے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ کنور صاحب اسی وقت آجائیں اور اسے اسی انداز سے کھڑے دیکھیں۔ اسی انداز سے وہ اس کے انگ پر تینگوں کی پورن چھوی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے اپنی سنگار کلا سے کال پر وجئے پالی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ چنچل نویونا اس اوستھا کو پہنچ چکی ہے، جب ہردے کو شانتی کی اِچھا ہوتی ہے۔ وہ کسی آشرم کے لیے آتر ہو اٹھتا ہے، اور اس کا اَبھیمان نمرتا کے آگے سر جھکا دیتا ہے؟

تارا دیوی کو بہت انتظار نہ کرنا پڑا۔ کنور صاحب شاید ملنے کے لیے اس سے بھی اُتسُک تھے۔ دس ہی منٹ کے بعد ان کی موٹر کی آواز آئی۔ تارا سنبھل گئی۔ ایک چھن (لمحہ) میں کنور صاحب نے کمرے میں پرویش کیا۔ تارا ششٹا چار کے لیے ہاتھ ملانا بھی بھول گئی، پروڑھا وستھا میں بھی پریم کی اُدِگنتا اور اساو دھانی کچھ کم نہیں ہوتی۔ وہ کسی سَلَجا یوتی کی بھانتی سر جھکائے کھڑی رہی۔

کنور صاحب کی نگاہ آتے ہی اس کی گردن پر پڑی۔ وہ موتیوں کا ہار، جو انھوں نے رات کو بھینٹ کیا تھا۔ چمک رہا تھا۔ کنور صاحب کو اتنا آنند اور کبھی نہ ہوا۔ انھیں ایک چھن (لمحہ) کے لیے ایسا جان پڑا مانو ان کے جیون کی ساری ابھی لاشا پوری ہو گئی۔ بولے۔ میں نے آپ کو آج اتنے سویرے کشٹ دیا، چھما کیجیے گا۔ یہ تو آپ کے آرام کا سمے ہوگا؟ تارا نے سر سے کھِسکتی ہوئی ساڑی کو سنبھال کر کہا۔ اس سے زیادہ آرام اور کیا ہو سکتا تھا کہ آپ کے درشن ہوئے۔ میں اس اُپہار کے لیے اور کیا آپ کو منوں دھینہ واد دیتی ہوں۔ اب تو کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہے گی؟ نرمل کانت نے مسکرا کر کہا۔ کبھی کبھی نہیں، روز آپ چاہے مجھ سے ملنا پسند نہ کریں، پر ایک بار اس ڈیوڑھی پر سر کو جھکا ہی جاؤں گا۔

تارا نے بھی مسکرا کر اُتر دیا۔ اسی وقت تک جب تک کہ منورنجن کی کوئی نئی وستو نظر نہ آجائے۔ کیوں؟

میرے لیے یہ منورنجن کا وشئے نہیں، مگر کوئی پروا نہیں۔ تمھارے منورنجن کے لیے یدی میرے پران بھی نکل جائیں، تو میں اپنا جیون سپھل سمجھوں گا۔

دونوں طرف سے اس پریتی کو نبھانے کے وعدے ہوئے، پھر دونوں نے ناشتہ کیا اور کل بھوج کا نیوتا دے کر کنور صاحب ودا ہوئے۔

(4)

ایک مہینہ گزر گیا، کنور صاحب دن میں کئی کئی بار آتے۔ انھیں ایک چھن (لمحہ) کا ویوگ بھی اسہائے تھا۔ کبھی دونوں بجرے پر دریا کی سیر کرتے، کبھی ہری ہری گھاس پر پارکوں میں بیٹھے باتیں کرتے، کبھی گانا بجانا ہوتا، نتیہ نئے پروگرام بنتے تھے۔ سارے شہر میں مشہور تھا کہ تارا بائی نے کنور صاحب کو پھانس لیا اور دونوں ہاتھوں سے سمپتی لوٹ رہی ہے۔ پر تارا کے لیے کنور صاحب کا پریم ہی ایک ایسی سمپتی تھی، جس کے سامنے دنیا بھر کی دولت ہیہ تھی۔ انھیں اپنے سامنے دیکھ کر اسے کسی وستو کی اِچھا نہ ہوتی تھی۔

مگر ایک مہینہ تک اس پریم کے بازار میں گھومنے پر بھی تارا کو وہ وستو نہ ملی، جس کے لیے اس کی آتما لولپ ہو رہی تھی۔ وہ کنور صاحب سے پریم کی، اپار اور اَتُل پریم کی، سچے اور نشکپٹ پریم کی باتیں روز سنتی تھی پر اس میں، وِواہ، کا شبد نہ آنے پاتا تھا۔ مانو پیاسے کو بازار سے پانی چھوڑ کر اور سب کچھ ملتا ہو ایسے پیاسے کو پانی کے سوا اور کس چیز سے ترپتی ہو سکتی ہے؟ پیاس بجھانے کے بعد، سَمبھَو ہے، اور چیزوں کی طرف اس کی رچی ہو، پر پیاسے کے لیے تو پانی سب سے مولیہ وان پدارتھ ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کنور صاحب اس کے اشارے پر پران تک دے دیں گے۔ لیکن وِواہ کی بات کیوں ان کی زبان سے نہیں نکلتی؟ کیا اس وشئے کا کوئی پتر لکھ کر اپنا آشئے کہہ دینا سَمبھَو تھا۔ پھر کیا وہ اس کو کیول ونود کی وستو بنا کر رکھنا چاہتے ہیں؟ یہ اپمان اس سے نہ سہا جائے گا۔ کنور کے ایک اشارے پر وہ آگ میں کود سکتی تھی، پر یہ اپمان اس کے لیے اَسہیہ تھا۔ کسی شوقین رئیس کے ساتھ وہ اس سے کچھ

دن پہلے شاید ایک دو مہینے رہ جاتی اور اسے نوچ کھسوٹ کر اپنی راہ لیتی۔ کنتو پریم کا بدلا پریم ہے، کنور صاحب کے ساتھ وہ یہ نرلجّ جیون وَیتیت کر سکتی تھی۔

ادھر کنور صاحب کے بھائی بند بھی غافل نہ تھے، وے کسی بھانتی انھیں تارا بائی کے پنجے سے چھوڑانا چاہتے تھے۔ کہیں کنور صاحب کا وِواہ ٹھیک کر دینا ہی ایک ایسا اُپائے تھا، جس سے سپھل ہونے کی آشا تھی۔ اور یہی ان لوگوں نے کیا۔ انھیں یہ بھے نہ تھا کہ کنور صاحب اس ایکٹریس سے وِواہ کریں گے۔ ہاں، یہ بھے اوشیہ تھا کہ کہیں ریاست کا کوئی حصہ اس کے نام کر دیں، یا اس کے آنے والے بچوں کو ریاست کا مالک بنادے۔ کنور صاحب پر چاروں اُور سے دباؤ پڑنے لگے۔ یہاں تک کی یوروپیئن اَدھیکاریوں نے بھی انھیں وِواہ کر لینے کی صلاح دی۔ اس دن سندھیا سمے کنور صاحب نے تارا بائی کے پاس جا کر کہا۔ تارا، دیکھو تم سے ایک بات کہتا ہوں، انکار نہ کرنا۔ تارا کا ہردے اُچھلنے لگا۔ بولی۔ کہیے کیا بات ہے؟ ایسی کون وَستو ہے، جسے آپ کی بھینٹ کر کے میں اپنے کو دھنیہ سمجھوں؟

بات منھ سے نکلنے کی دیر تھی۔ تارا نے سویکار کر لیا ہرشِ انماد کی دشا میں روتی ہوئی کنور صاحب کے پیروں پر گر پڑی۔

(5)

ایک چھن (لمحہ) کے بعد تارا نے کہا۔ میں تو نراش ہو چلی تھی۔ آپ نے بڑی لمبی پریکشھا لی۔

کنور صاحب نے زبان دانتوں تلے دبائی، مانو کوئی انوچت بات سن لی ہو۔

یہ بات نہیں ہے تارا۔ اگر مجھے وِشواس ہوتا کہ تم میری یاچنا سویکار کر لوگی۔ تو کداچت پہلے ہی دن میں نے بھکشا کے لیے ہاتھ پھیلایا ہوتا، اور میں جو کچھ ہوں، وہ تم جانتی ہی ہو، میں نے نشچیہ کر لیا تھا کہ عمر بھر تمھاری اپاسنا کرتا رہوں گا۔ شاید کبھی پرسَن ہو کر تم مجھے بنا مانگے ہی وردان دے دو۔ بس یہی میری ابھی لاشا تھی۔ مجھ میں اگر کوئی گُن ہے، تو یہی کہ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ جب تم ساہتیہ یا سنگیت یا دھرم پر اپنے وِچار پرکٹ کرنے لگتی ہو تو میں دنگ رہ جاتا ہوں اور اپنی چھدرتا پر لجّت ہو جاتا ہوں۔ تم میرے لیے سانسارک نہیں، سورگیہ ہو۔ مجھے آشچریہ یہ

یہی ہے کہ اس سے میں مارے خوشی کے پاگل کیوں نہیں ہو جاتا۔
کنور صاحب دیر تک اپنے دل کی باتیں کہتے رہے۔ ان کی وانی کبھی اتنی پر گلبھ نہ ہوئی تھی۔
تارا سر جھکائے سنتی تھی۔ پر آنند کی جگہ اس کے مکھ پر ایک پرکار کا چھوبھ لجّا سے ملا ہوا انکت ہو رہا تھا۔ یہ پُروش اتنا سَرَل ہردے، اتنا نشکپٹ ہے؟ اتنا وِنیت اُدار۔ سہسا کنور صاحب نے پوچھا۔ تو میرے بھاگیہ کس دن اُدے ہوں گے تارا؟ دیا کرکے بہت دنوں کے لیے نہ ٹالنا۔
تارا نے کنور رصاحب کی سرلتا سے پراست ہو کر چنتت سور میں کہا۔ قانون کا کیا کیجیے گا؟ کنور صاحب نے تتپرتا سے اُتّر دیا۔ اس وشے میں تم نشچنت رہو تارا، میں نے وکیلوں سے پوچھ لیا ہے۔ ایک قانون ایسا ہے جس کے انوسار ہم اور تم ایک پریم سوتر میں بندھ سکتے ہیں۔ اُسے سوِل میرج کہتے ہیں۔ بس، آج ہی کے دن وہ شُبھ مُہورت آئے گا، کیوں؟
تارا سر جھکائے رہی۔ بول نہ سکی۔
میں پراتہ کال آجاؤں گا۔ تیار رہنا۔
تارا سر جھکائے رہی۔ منھ سے ایک شبد نہ نکلا۔
کنور صاحب چلے گئے، پر تارا وہیں مورتی کی بھانتی بیٹھی رہی۔ پروشوں کے ہردے سے کریڑا کرنے والی چتُر ناری کیوں اتنی وِموڑھ ہو گئی ہے۔

(6)

وِواہ کا ایک دن اور باقی ہے۔ تارا کو چاروں اور سے بدھائیاں مل رہی ہیں۔ تھیٹر کے سبھی اِستری پُروشوں نے اپنی سامرتھیہ کے انُوسار اسے اچھے اچھے اُپہار دیے ہیں، کنور صاحب نے بھی آبھوشنوں سے سجا ہوا ایک سنگار دان بھینٹ کیا ہے، ان کے دو چار انت رنگ متروں نے بھانتی بھانتی کے سوگات بھیجے ہیں پر تارا کے سندر مکھ پر ہرش کی ریکھا بھی نہیں نظر آتی۔ وہ چھبدھ اور اُداس ہے اس کے من میں چار دنوں سے نرنتر یہی پرشن اٹھ رہا ہے۔ کیا کنور کے ساتھ وشواس گھات کرے؟ جس پریم کے دیوتا نے اس کے لیے اپنے کل مریادا کو تلانجلی دے دی، اپنے بندھو جنوں

سے ناتا توڑا، جس کا ہردے ہمکٹر کے سمان نش کلنک ہے پروت کے سمان وِشال، اسی سے کپٹ کرے۔ نہیں، وہ اتنی نیچتا نہیں کر سکتی۔ اپنے جیون میں اس نے کتنے ہی یووکوں سے پریم کا ابھینے کیا تھا، کتنے ہی پریم کے متوالوں کو وہ سبز باغ دکھا چکی تھی۔ پر کبھی اس کے من میں ایسی دُویدھا نہ ہوئی تھی۔ کبھی اس کے ہردے نے اس کا ترسکار نہ کیا تھا۔ کیا اس کا کارن اس کے سوا کچھ اور تھا کہ ایسا انوراگ اسے اور کہیں نہ ملا تھا۔

کیا وہ کنور صاحب کا جیون سکھی بنا سکتی ہے؟ ہاں اوشیہ۔ اس وِشے میں اسے لیش ماتر بھی سندھیہ نہیں تھا۔ بھکتی کے لیے ایسی کون سی وستو ہے، جو اساڈھیہ ہو، پر کیا وہ پراکرتی کو دھوکھا دے سکتی ہے۔ ڈھلتے ہوئے سُوریہ میں ماڈھیانیہ کا ساپرکاش ہو سکتا ہے؟ اسمبھو۔ وہ سپھورتی، وہ چپلتا، وہ وِنود، وہ سرل چھوِی، وہ تلّینتا، وہ تیاگ، وہ آتم وشواس وہ کہاں سے لائے گی، جس کے سَم مشرن کو یوون کہتے ہیں؟ نہیں، وہ کتنا ہی چاہے، پر کنور صاحب کے جیون کو سکھی نہیں بنا سکتی۔ بوڑھا بیل کبھی جوان بچھڑوں کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

آہ۔ اس نے یہ نوبت ہی کیوں آنے دی؟ اس نے کیوں کرتم سادھنو سے، بناوٹی سنگار سے کنور کو دھوکے میں ڈالا؟ اب اتنا سب کچھ ہو جانے پر وہ کس منھ سے کہے گی کہ میں رنگی ہوئی گڑیا ہوں، جوانی مجھ سے کب کی وِدا ہو چکی، اب کیول اس کا پدچنھ رہ گیا ہے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ تارا میز کے سامنے انھیں چنتاؤں میں مگن بیٹھی ہوئی تھی۔ میز پر اپہاروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، پر وہ کسی چیز کی اور آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ ابھی چار دن پہلے وہ انھیں چیزوں پر پران دیتی تھی، اسے ہمیشہ ایسی چیزوں کی تلاش رہتی تھی، جو کال کے چنھوں کو مٹا سکے، پر اب انھیں چیزوں سے اسے گھرنا ہو رہی ہے۔ پریم ستیہ ہے اور ستیہ اور متھیا، دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

تارا نے سوچا۔ کیوں نہ یہاں سے کہیں بھاگ جائے؟ کسی ایسی جگہ چلی جائے، جہاں کوئی اسے جانتا بھی نہ ہو۔ کچھ دنوں کے بعد جب کنور کا وِواہ ہو جائے تو وہ پھر

آکر ان سے ملے اور یہ سارا ورتانت ان سے کہہ سنائے۔ اس سے کنور پر وجزپات سا ہوگا۔ ہائے نہ جانے ان کی کیا دشا ہوگی، پر اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی مارگ نہیں ہے۔ اب ان کے دن رو، رو کر کٹیں گے، لیکن اسے کتنا ہی دکھ کیوں نہ ہو، وہ اپنے پریتم کے ساتھ چھل نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے اس سورگیہ پریم کی سمرتی، اس کی ویدنا ہی بہت ہے۔ اس سے ادھک اس کا اُدھیکار نہیں۔

دائی نے آکر کہا۔ بائی جی، چلیے کچھ تھوڑا سا بھوجن کر لیجیے اب تو بارہ بج گئے۔

تارا نے کہا: نہیں، ذرا بھی بھوک نہیں ہے۔ تم جاکر کھالو۔

دائی: دیکھیے، مجھے بھول نہ جایئے گا۔ میں ابھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔

تارا: اچھے اچھے کپڑے بنوا رکھے ہیں نہ؟

دائی: ارے بائی جی، مجھے اچھے کپڑے لے کر کیا کرنا ہے؟ آپ اپنا کوئی اتارا دے دیجیے گا۔

دائی چلی گئی۔ تارا نے گھڑی کی اُور دیکھا۔ سچ مچ بار بج گئے تھے۔ کیول چھ گھنٹے اور ہیں۔ پراتہ کال کنور صاحب اسے وِواہ مندر میں لے جانے کے لیے آجائیں گے۔ ہائے۔ بھگوان جس پدارتھ سے تم نے اتنے دنوں تک اسے وَنچت رکھا، وہ آج کیوں سامنے لائے؟ یہ بھی تمھاری کریڑا ہے۔

تارا نے ایک سفید ساڑی پہن لی۔ سارے آبھوشن اتار کر رکھ دیے۔ گرم پانی موجود تھا۔ صابن اور پانی سے منہ دھویا اور آئینے کے سَمّکھ جاکر کھڑی ہوگئی۔ کہاں تھی وہ چھوِی، وہ جیوتی، جو آنکھوں کو بھا لیتی تھی۔ روپ وہی تھا، پر کرانتی کہاں؟ اب بھی وہ یُوَن کا سوانگ بھر سکتی ہے؟

تارا کو اب وہاں ایک چھن بھی اور رہنا کٹھن ہو گیا۔ میز پر پھیلے ہوئے آبھوشن اور وِلاس کی سامگریاں مانو اسے کاٹنے لگی۔ یہ کرتم جیون اسہیہ ہو اٹھا۔ خس کی ٹٹیوں اور بجلی کے پنکھوں سے سجا ہوا شیتل بھون اسے بھٹی کے سمان تپانے لگا۔

اس نے سوچا۔ کہاں بھاگ کر جاؤں۔ ریل سے بھاگتی ہوں، تو بھاگنے نہ پاؤں گی۔ سویرے ہی کنورصاحب کے آدمی چھوٹیں گے اور چاروں طرف میری تلاش ہونے لگے گی۔ وہ ایسے راستے سے جائے گی جدھر کسی کا خیال بھی نہ جائے۔

تارا کا ہر ذرے اس سے گرو سے چھلکا پڑتا تھا۔ وہ دکھی نہ تھی، نراش نہ تھی۔ وہ پھر کنور صاحب سے ملے گی، کنتو وہ نہہ سوار تھ۔ سنیوگ ہوگا۔ پریم کے بنائے ہوئے کرتویہ مارگ پر چل رہی ہے، پھر دکھ کیوں ہو اور نراشا کیوں ہو؟ سہسا اسے خیال آیا۔ ایسا نہ ہو کنور صاحب اسے وہاں نہ پاکر شوک وِہلتا کی دَشا میں انرتھ کر بیٹھیں۔ اس کلپنا سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایک چھن کے لیے اس کا من کاتر ہو اٹھا۔ پھر وہ میز پر جا بیٹھی، اور یہ پتر لکھنے لگی۔

پریتم، مجھے چھما کرنا۔ میں اپنے کو تمھاری داسی بننے کے یوگیہ نہیں پاتی۔ تم نے مجھے پریم کا وہ سوروپ دکھا دیا۔ جس کی اس جیون میں میں آشانہ کر سکتی تھی۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ میں جب تک جیوں گی۔ تمھارے پریم میں مگن رہوں گی۔ مجھے ایسا جان پڑ رہا ہے کہ پریم کی سمرتی میں پریم کے بھوگ سے کہیں ادِھک ماذھریہ اور آنند ہے۔ میں پھر آؤں گی۔ پھر تمھارے درشن کروں گی، لیکن اُسی دشا میں جب تم وواہ کر لوگے۔ یہی میرے لوٹنے کی شرط ہے۔ میرے پرانوں کے پران، مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ یہ آبھوشن جو تم نے میرے لیے بھیجے تھے، اپنی اور سے نوودھو کے لیے چھوڑے جاتی ہوں۔ کیول وہ موتیوں کا ہار، جو تمھارے پریم کا پہلا اپہار ہے، اپنے ساتھ لیے جاتی ہوں۔ تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں، میری تلاش نہ کرنا، میں تمھاری ہوں اور سدا تمھاری رہوں گی۔

تمھاری، تارا۔

یہ پتر لکھ کر تارا نے میز پر رکھ دیا۔ موتیوں کا ہار گلے میں ڈالا اور باہر نکل آئی۔ تھیٹر ہال سے سنگیت کی دھونی آرہی تھی۔ ایک چھن (لمحہ) کے لیے اس کے پیر بندھ گئے۔ پندرہ ورشوں کا پُرانا سمبندھ آج ٹوٹا جا رہا تھا۔ سہسا اس نے منیجر کو آتے دیکھا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہ بڑی تیزی سے لپک کر دیوار کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ جیوں ہی منیجر نکل گیا وہ احاطے کے باہر آئی اور کچھ دور گلیوں میں چلنے کے بعد اس نے گنگا کا راستہ پکڑا۔

گنگا تٹ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دس پانچ سادھو وِیراگی دھونیوں کے سامنے لیٹے تھے۔ دس پانچ یاتری کمبل زمین پر بچھائے سو رہے تھے۔ گنگا کسی وِشال سرپ کی بھانتی

رینگتی چلی جاتی تھی۔ ایک چھوٹی سی نوکا کنارے پر لگی ہوئی تھی۔ ملاح نوکا میں بیٹھا ہوا تھا۔

تارا نے ملاح کو پکارا۔ او مانجھی، اس پار ناؤ لے چلے گا؟

مانجھی نے جواب دیا۔ اتنی رات گئے ناؤ نہ جائی۔

مگر دونی مزدوری کی بات سن کر اس نے ڈانٹ اٹھایا اور ناؤ کو کھولتا ہوا بولا۔ سرکار، اس پار کہاں جئی ہیں؟

اس پار ایک گاؤں میں جانا ہے۔

مودا اتنی رات گئے کونوں سواری سکاری نہ ملی۔

کوئی ہرج نہیں، تم مجھے اس پار پہنچا دو۔

مانجھی نے ناؤ کھول دی۔ تارا اس پر جا بیٹھی اور نوکا مند گتی سے چلنے لگی۔ مانو جیو سوپن سامراجیہ میں وچر رہا ہو۔

اسی سمے ایکادشی کا چاند، پرتھوی سے اس پار، اپنی اُجوَل نوکا کھیتا ہوا نکلا اور وِیوگ ساگر کو پار کرنے لگا۔

(یہ افسانہ ہندی میں 'مادھوری' اکتوبر 1927 میں پہلی بار شائع ہوا۔ ہندی مجموعہ مان سروور 5 میں شامل ہے۔ اردو میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔)

مزارِ آتشیں

(1)

اہل کمال کی صحبت میں برے بھی بھلے ہو جاتے ہیں۔ مگر پیاگ کی بدنصیبی تھی کہ اس پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ اسے گانجہ چرس اور بھنگ کی چاٹ پڑ گئی اور کاہلی تو اس کا لازمی نتیجہ تھی۔ تگ و دو اور تگ و تازہ میں یہ لطف کہاں! کسی برگد کے سائے میں دھونی لگی ہوئی۔ ایک جٹا دھاری مہاتما رونق افروز ہیں۔ عقیدت مندوں کا ایک حلقہ مؤدب بیٹھا ہوا ہے اور چرس کے دم لگ رہے ہیں۔ چلم بھرنا پیاگ کا کام تھا۔ عقیدت مندوں کو ثواب کے لیے پرلوک کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن پیاگ کی تقدیر اپنے ہاتھ میں تھی۔ چلم پر پہلا حق اسی کا ہوتا تھا۔ آہ! مہاتماؤں کی ان صحبتوں میں اسے کتنا روحانی سرور حاصل ہوتا تھا۔ اس پر بیخودی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ کسی دوسری منوّر اور مرصّع دنیا میں پہنچ جاتا تھا اس لیے جب اس کی بیوی رکمنی رات کے دس گیارہ بج جانے پر اسے بلانے آتی تو پیاگ کو حقیقت تلخ کا تجربہ ہوتا۔ دنیا اسے ایک پُرخار جنگل ہی نظر آتی، بالخصوص جب گھر آنے پر اسے معلوم ہوتا کہ چولھا نہیں جلا اور چنے چبینے کی فکر کرنا ہے۔ وہ ذات کا کمہر تھا گاؤں کی چوکیداری اس کی ملکیت تھی۔ دو روپے اور کچھ آنے تنخواہ کے ملتے تھے وردی اور صافہ مفت تھا۔

ہفتے میں ایک دن تھانے جاتا۔ وہاں حکام کے دروازوں پر جھاڑو لگاتا۔ اصطبل صاف کرتا اسی قبیل کے اور دوسرے کام کرتا جو بہ ضرورت کیے جاتے تھے کیونکہ سرکشی مالی اور جسمانی دونوں ہی پہلوؤں سے مہنگی پڑتی تھی آنسو یوں پیچتے تھے کہ چوکیداری میں اگر کوئی کام تھا تو اتنا ہی۔ اور چاروں کے لیے دو روپے کئی آنے کم نہ تھے۔ پھر گاؤں میں اگر بڑے آدمیوں پر نہیں تو رذیلوں پر رعب تھا۔ تنخواہ پنشن تھی۔ اور جب سے مہاتماؤں کی صحبت شروع ہوئی پیاگ کے صرف خاص کی مد میں آگئی۔ اور معاش کا مسئلہ روز بروز تشویش ناک صورت اختیار کرنے لگا۔ ان صوفیانہ چرچوں کے قبل دونوں گاؤں میں مزدوری کرتے تھے۔ رکمن لکڑیاں توڑ کر بازار لے

جاتی۔ پیاگ کبھی آرائشی کرتا کبھی ہل جوتتا۔ اسے کسی کام سے عار نہ تھا۔ ہنس مکھ زندہ دل نیک نیت اور محنتی آدمی تھا اور ایسا آدمی کبھی بھوکوں نہیں مرتا پھر خدمت گذار ایسا کہ کسی کام کے لیے نہیں نہ کرتا۔ کسی نے کچھ کہا اور وہ اچھا بھیا کہہ کر دوڑا اس لیے گاؤں میں اس کا رسوخ اور وقار کافی تھا۔ اس کی بدولت صوفیانہ مجلسوں کے باوجود دو تین سال تک اس کی آرام سے بسر ہوئی۔ دونوں وقت کا تو ذکر ہی کیا۔ جب مہتو کو یہ بات حاصل نہ تھی۔ جس کے دروازے پر چھ بیل بندھے نظر آتے تھے تو پیاگ کی کیا ہستی تھی ہاں ایک وقت کی دال روٹی میں کلام نہ تھا۔ مگر یہ مسئلہ روز بروز دشوار تر ہوتا جاتا تھا اس پر مزید یہ کہ رکمن بھی اب کسی وجہ سے اتنی وفاکیش اتنی جاں نثار اتنی جفاکش نہ تھی۔ اس کی قوت اظہار اور بیان میں حیرت انگیز تغیر ہوتا جاتا تھا۔ پیاگ کسی ایسے سخی کی تلاش میں تھا جو اسے فکر معاش سے آزاد کردے اور وہ بے غل وغش سرور روحانی سے بہر اندوز ہو۔ ایک دن رکمنی بازار سے لکڑیاں بیچ کر لوٹی تو پیاگ نے کہا۔ ”لا کچھ پیسے مجھے دے دے۔ دم لگا آؤں۔“ رکمنی نے منہ پھیر کر کہا۔ ”دم لگانے کا شوق ہے تو کام کیوں نہیں کرتے۔ کیا آج کل کوئی بابا نہیں ہیں؟“

پیاگ : ”بھلا چاہتی ہے تو پیسے دے دو۔ نہیں اس طرح تنگ کرے گی تو ایک دن میں کہیں نکل جاؤں گا۔ تب روئے گی۔“

رکمنی نے انگوٹھا دکھا کر کہا۔ ”روئے میری بلا۔ تم نکل جاؤ گے تو میں بھوکوں نہ مر جاؤں گی اب بھی چھاتی پھاڑ کر کماتی ہوں۔ تب بھی چھاتی پھاڑ کر کماؤں گی۔“

پیاگ: ”تو یہی فیصلا ہے۔“

رکمنی : ”ہاں ہاں کہہ تو دیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمھارا جو جی چاہے کرو۔“

پیاگ : ”گہنے بنوانے کے لیے پیسے ہیں اور میں پیسے مانگتا ہوں تو یوں جواب دیتی ہے۔“

رکمنی نے تنک کر کہا۔ ”گہنے بنواتی ہوں تو تمھاری چھاتی کیوں پھٹتی ہے تم نے ایک پیتل کا چھلا بھی تو نہیں دیا۔“

پیاگ اس دن گھر نہ آیا رات کے نو بج گئے تب رکمنی نے کھا پی کر کواڑ بند

کر لیے، سمجھی کہیں گاؤں میں چھپا بیٹھا ہوگا۔ سمجھتا ہوگا مجھے منانے آئے گی۔ میری بلا جاتی ہے۔ دوسرے دن بھی پیاگ نہ آیا۔ تب رکمنی کو اندیشہ ہوا۔ گاؤں بھر دیکھ آئی کسی اڈے پر چڑیا نہ ملی۔ اس دن اس نے رسوئی نہیں بنائی۔ رات کو لیٹی بھی تو بہت دیر تک آنکھیں نہ لگیں۔ خوف ہو رہا تھا پیاگ سچ مچ تو سادھو نہیں ہوگیا۔ اس نے سوچا سویرے چل کر پتا پتا چھان ڈالوں گی۔ کسی سادھو سنت کے پاس بیٹھا ہوگا۔ سویرے وہ چلنے کی تیاری کر رہی تھی کہ پیاگ آتا ہوا دکھائی دیا۔ مگر اکیلا نہ تھا اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت تھی۔ اس کی چھینٹ کی نئی ساری رنگی ہوئی چادر اور شرمیلی چال دیکھ کر رکمنی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ ایک لمحے تک مفلوج سی کھڑی رہی۔ تب اس نے بڑھ کر نئی سوت کو ہاتھوں سے سنبھال لیا اور اسے اس طرح آہستہ آہستہ گھر کے اندر لے چلی۔ جیسے کوئی مریض علاج سے مایوس ہو کر زہر کا گھونٹ حلق کے اندر لے جائے۔ جب محلے کی عورتیں چلی گئیں تو رکمنی نے پیاگ سے پوچھا اسے کہاں سے لائے؟ پیاگ نے ہنس کر کہا۔ "گھر سے بھاگی جاتی تھی۔ مجھے راستہ میں مل گئی ساتھ لے آیا۔ گھر کا کام دھندا کرے گی پڑی رہے گی۔"

رکمنی : معلوم ہوتا ہے مجھ سے تمھارا جی بھر گیا۔

پیاگ : "دت پگلی اسے تیری سیوا ٹہل کرنے کو لایا ہوں۔"

رکمنی نے ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "نئی کے آگے پرانی کون پوچھتا ہے۔"

پیاگ : "چل۔ من جس سے ملے وہی نئی ہے جس سے من نہ ملے وہ پرانی ہے۔ لا کچھ پیسے ہوں تو دے دو تین دن سے دم نہیں لگائی۔ پیر سیدھے نہیں پڑتے۔ ہاں دیکھ دو چار دن اس بے چاری کو کھلا پلا دے۔ پھر تو آپ ہی کام کرنے لگے گی۔"

رکمنی نے سموچا روپیہ لا کر پیاگ کو دے دیا۔ دوسری بار کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔

(2)

پیاگ میں اور چاہے کوئی مادہ ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ

سیاست کے ابتدائی اصولوں سے واقف تھا۔ اس نے افتراق کی پالیسی پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا ایک مہینے تک کسی قسم کی پریشانی نہ ہوئی۔ رکمنی بے عذر ہو گئی تھی بڑے سویرے اٹھتی اور کبھی لکڑیاں توڑ کر کبھی چارا کاٹ کر۔ کبھی اپلے تھاپ کر بازار چلی جاتی۔ وہاں جو کچھ ملتا۔ اس کا نصف تو پیاگ کے ہتھے چڑھتا اور نصف میں گھر کا کام چلتا۔ وہ سوت کو کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ پڑوسیوں سے کہتی۔ بہن سوت ہے تو کیا، ہے تو ابھی بہریا۔ دو چار مہینے بھی آرام سے نہ رہے گی تو کیا یاد کرے گی۔ میں تو کام کرنے کو ہوں ہی۔ گاؤں بھر میں اس کی وضعداری کا چرچا ہونے لگا۔ مگر صحبت یافتہ گھاگ پیاگ سب کچھ سمجھتا تھا اور اپنی پالیسی کی کامیابی پر خوش ہوتا تھا۔

ایک دن نئی بہو نے کہا۔ " دیدی اب تو گھر میں بیٹھے بیٹھے جی اُبتا ہے مجھے ایسی کوئی کام دلادو۔ "

رکمنی: کیا میرے منہ میں کالک پتوانے پر لگی ہوئی ہے۔ بھیتر کا کام کیے جا باہر کے واسطے تو میں ہوں ہی۔ "

بہو کا نام سلیا تھا۔ اس وقت تو سلیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن یہ لونڈیوں کی زندگی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ " میں دن بھر گھر کا کام کروں کوئی نہیں پوچھتا وہ باہر سے چار پیسے لاتی ہے تو مالکن بنی ہوئی ہے۔ اب میں بھی مزدوری کروں گی اور اس کا گھمنڈ توڑ دوں گی۔"

پیاگ پیسے کا یار ہے یہ حقیقت اس پر رفتہ رفتہ واضح طور پر آشکارا ہو گئی۔ جب رکمنی چارہ لے کر بازار چلی گئی تو گھر کی نئی لگائی گاؤں میں اپنا تعارف کرنے چلی گاؤں میں باہمن، ٹھاکر، کائستھ بنیے سبھی تھے۔ ان سب گھروں میں سلیا کی آؤ بھگت ہوئی۔ کسی نے چاول دیا۔ کسی نے کچھ، دوسرے دن سے سلیا پسائی کرنے لگی۔ اس نے دائرہ عمل میں قدم رکھا۔ پھر رات ہی سے چکّی کی آواز آنے لگی۔

پیاگ نے پوچھا۔ "آج سلیا بڑے سویرے پیسنے لگی"۔

رکمنی: "پیسنے کو کیا تھا۔ میں تو بجار سے آٹا لائی ہوں جاکر دیکھتی ہوں نا۔ "

رکمنی نے بروٹھے میں جاکر دیکھا تو سلیا ایک ٹوکری میں دس پندرہ سیر گیہوں رکھے پیس رہی ہے۔ رکمنی نے جاکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گیہوں کی ٹوکری اُٹھا کر

بولی۔ تجھ سے پیسنے کو کس نے کہا ہے؟ کس کا گیہوں پیس رہی ہے۔ "

سلیا نے بیباکانہ انداز سے کہا۔ " تم جاکر آرام سے سوتیں کیوں نہیں۔ میں پیستی ہوں۔ تو تمھارا کیا بگڑتا ہے چکی کی گھمر گھمر بھی نہیں سہی جاتی۔ لاؤ ٹوکری دے دو۔ بیٹھے بیٹھے کب تک کھاؤں گی۔ دو مہینے تو ہو گئے۔ "

رکمنی : " میں نے تجھ سے کچھ نہیں کہا۔ "

سلیا : تم چاہے کہو چاہے نہ کہو۔ اپنا دھرم بھی تو کچھ ہے۔ "

رکمنی : تو ابھی یہاں کے آدمیوں کو نہیں جانتی۔ آٹا پیاتے تو سب کو اچھا لگتا ہے پیسے دیتے وقت البتہ روتے ہیں۔ کس کا گیہوں ہے۔ میں سویرے اس کے گھر پٹک آؤں گی۔ "

سلیا نے رکمنی کے ہاتھ سے ٹوکری چھین لی اور بولی۔ "پیسے کیوں نہ دیں گے کچھ بیگار کرتی ہوں۔ "

رکمنی : تو نہ مانے گی۔

سلیا : "نہیں تمھاری لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔ "

پیاگ یہ تکرار سن کر آپہنچا اور رکمنی سے بولا۔ کام کرتی ہے تو کرنے دے اب کیا جنم بھر بہریا بنی رہے گی ہو تو گئے دو مہینے۔

رکمنی : "تم کیا جانو ناک تو میری کٹے گی۔ "

سلیا : "تو کیا کوئی بیٹھے بیٹھے کھلا دیتا ہے۔ چوکا برتن جھاڑو پینا کوٹنا یہ کون کرتا ہے۔ پانی کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے۔ مجھ سے اب یہ تمھارا کام نہ ہوگا۔

پیاگ : تو ہی بجار جایا کر۔ گھر کا کام رہنے دے رکمنی کرے گی۔ "

رکمنی : "ایسی بات منہ سے نکالتے لاج نہیں آتی۔ تین دن کی بہریا بجار میں گھومے گی تو سنسار کیا کہے گا۔ "

سلیا : "سنسار کیا کہے گا کیا کوئی عیب کرنے جاتی ہوں۔ "

سلیا کی ڈگری ہوگئی۔ عنان حکومت رکمنی کے ہاتھ سے نکل گئی۔ سلیا کی عملداری ہوئی۔ جوان عورت تھی۔ گیہوں پیس کر اُٹھی تو اور عورتوں کے ساتھ

گھاس چھیلنے چلی گئی اور اتنی گھاس چھیلی کہ سب دنگ رہ گئیں۔ گٹھا اُٹھائے نہ اُٹھتا تھا جو مرد اس کام میں بہت مشاق تھے ان سے بھی بازی مارلی۔ یہ گٹھا 12 آنے کو بکا۔ سلیا نے آٹا چاول دال تیل نمک ترکاری مصالحہ سب کچھ لیا۔ پھر بھی اس کے پاس 4 آنے بچ رہے۔ رکمنی نے سمجھ رکھا تھا کہ سلیا بازار سے دوچار آنے پیسے لے کر لوٹے گی تو اسے ڈانٹوں گی اور دوسرے دن سے پھر بازار جانے لگوں گی مگر یہ سامان دیکھے تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

پیاگ کھانے بیٹھا تو مسالادار ترکاری سے لب بند ہورہے تھے۔ مہینوں سے ایسی لذیذ چیز نہ میسّر ہوئی تھی۔ بہت خوش ہوا۔ کھانا کھا کر باہر جانے لگا تو سلیا بروٹھے میں کھڑی تھی۔ بولا آج کتنے پیسے ملے۔

سلیا: بارہ آنے ملے تھے۔

پیاگ: سب خرچ کرڈالے کچھ بچے ہوں تو مجھے دے دے۔

سلیا نے بچے ہوئے چار آنے نکال کردے دیے۔ پیاگ پیسے کھنکھناتا ہوا بولا" تو نے آج مالامال کردیا۔ رکمنی تو اتنے پیسے کبھی نہ دیتی تھی۔"

سلیا: "مجھے بٹور کر رکھنا تھوڑا ہے۔ پیسے کھانے پینے کے لیے ہیں گاڑکر رکھنے کے لیے؟"

پیاگ: "اب تو ہی بجار جایاکر۔ رکمنی گھر کا کام کرے گی اور دیکھ میں یہیں لیٹوں گا۔ جرا چلی آنا۔ تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

(3)

رکمنی اور سلیا میں اب معرکہ کار زار گرم ہوگیا۔ سلیا بر سر اختیار رہنے کے لیے روز بروز زیادہ محنت کرتی۔ پہر رات سے گیہوں پیستی پھر گھاس لاتی اور بازار جاتی۔ وہاں سے لوٹ کر جو گھنٹہ آدھ گھنٹہ وقت بچتا اسے بھی بیکار نہ کھوتی۔ سن کاتتی۔ رسی بنتی۔ رکمنی اس کے انتظام میں نقص نکالاکرتی۔ اور جب موقعہ ملتا گوبر بٹور کر اپلے پاتھتی اور گاؤں ہی میں اپلے بیچ کر پیسے لاتی۔ پیاگ کے دونوں ہاتھوں میں لڈو تھے۔ دونوں بیویاں اسے زیادہ سے زیادہ پیسے دینے اور اس کی خوشنودیِ مزاج کا بیشتر حصہ اپنے تصرف میں کرنے کی کوشش کرتی رہتیں مگر سلیا نے کچھ ایسا آسن جما

لیا تھا کہ کسی طرح ہٹائے نہ ہٹتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن دونوں میں اعلان جنگ ہوگیا۔ سلیا گھاس لے کر آئی تو پسینے میں تر تھی۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ اس نے سوچا نہاکر تب بازار جاؤں۔ گھاس دروازے پر رکھ کر وہ تالاب نہانے چلی گئی۔ رکمنی نے تھوڑی سی گھاس نکال کر پڑوسن کے گھر میں چھپادی اور گٹھے کو ڈھیلا کر کے برابر کر دیا۔ سلیا نہاکر لوٹی تو گھاس کم معلوم ہوئی۔ رکمنی سے پوچھا اس نے لاعلمی جتائی۔ سلیا نے گالیاں دینا شروع کیں جس نے میری گھاس چھوئی ہو۔ اس کے بدن میں کیڑے پڑیں۔ اس کے باپ اور بھائی مر جائیں اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں۔

رکمنی کچھ دیر تک ضبط کیے بیٹھی رہی مگر آخر خون میں اُبال آہی گیا۔ جھلا کر اُٹھی اور سلیا کے دو تین طمانچے لگادئے۔ سلیا ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی۔ سارا محلہ جمع ہوگیا۔ سلیا نے اپنے حسن خدمات سے گاؤں والوں میں حسد کی آگ مشتعل کردی تھی وہ سب سے زیادہ گھاس کیوں چھیلتی ہے؟ سب سے زیادہ لکڑیاں کیوں توڑلاتی ہے؟ اتنے سویرے کیوں اُٹھتی ہے۔ اتنے پیسے کیوں کماتی ہے۔ ان وجوہ نے اسے پڑوسیوں کی ہمدردی سے محردم کردیا تھا۔ سب اسی کو برا بھلا کہنے لگیں۔ مٹھی بھر گھاس کے لیے اتنا مہنامتھ مچاڈالا اتنی گھاس تو آدمی جھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ پھر تمھیں سوچنا چاہئے تھا کہ اگر کسی نے لے لی ہے۔ تو گاؤں گھر ہی کا ہوگا۔ باہر کا چور تو آیا نہیں۔ تم نے اتنی گالیاں کس کو دیں۔ پڑوسیوں کو ہی تو۔

اس دن پیاگ تھانے گیا تھا۔ شام کو لوٹا تو تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی آتے سلیا سے بول "لاکچھ پیسے دے تو دم لگاآؤں" سلیا اسے دیکھتے ہی باآواز بلند رونے لگی۔

پیاگ : "کیا ہوا کیا؟ کیوں روتی ہے۔ کہیں گی تو نہیں ہوگئی۔ نہیر سے تو کوئی آدمی نہیں آیا؟

سلیا : اب میرا اس گھر میں رہنا نہ ہوگا۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔ "

پیاگ : "ارے کچھ منہ سے توبول۔ ہواکیا۔ سنوں توسہی۔ گاؤں میں کسی نے گالی دی ہے۔ کسی نے کچھ کہاہے؟ گھر پھونک دوں اس کا چالان کروادوں۔ "

سلیانے رورو کر سارا قصہ بیان کیا۔ پیاگ پر اس دن تھانے میں خوب جوتے پڑے تھے۔ جھلایا ہوا تھا ہی یہ قصہ سناتو بدن میں آگ لگ گئی۔ رکمنی پانی بھرنے گئی

تھی۔ وہ گھڑا بھی نہ رکھنے پائی تھی کہ اس پر پل پڑا اور ماتے مارتے بیدم کردیا وہ مار کا
جواب گالیوں سے دیتی تھی اور ہر ایک گالی پر وہ اور بھی جھلا جھلا کر مارتا تھا یہاں تک
کہ رکمنی کی گھٹیاں پھوٹ گئیں۔ چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سلیا بیچ بیچ میں اشتعالک دیتی جاتی
تھی۔ واہ رے دیدہ! واہ ری جبان۔ ایسی تو عورت ہی نہیں دیکھی۔ عورت کاہے کو
ڈائن ہے جرا بھی منہ میں لگام نہیں۔" پیاگ مارتے مارتے تھک کر الگ جا بیٹھتا پر
رکمنی کی زبان نہ تھکتی تھی۔ بس اس کی زبان پر یہی رٹ لگی ہوئی تھی تو مرجا۔ تیری
مٹی نکلے تیری لاش نکلے۔ تجھے بھوانی کھائیں۔ تجھے مرگی آئے۔ پیاگ رہ رہ کر غصہ
سے بے اختیار ہوجاتا۔ اور جاکر دوچار لاتیں جمادیتا پر رکمنی میں غالبًا اب حس ہی نہ
تھا۔ وہ سر کے بال کھولے وہیں زمین پر بیٹھی انھیں منتروں کاجاپ کررہی تھی۔ اس
کے لہجہ میں اب غصہ نہ تھا۔ ایک مجنونانہ بے ساختگی تھی۔ اس کے وجود کا ذرّہ ذرّہ
انتقام کی آگ سے جل رہا تھا۔ اندھیرا ہوا تو رکمنی اُٹھ کر ایک طرف چلی گئی۔ موہ کا
آخری تار ٹوٹ گیا۔

(4)

جب فصل تیاری کے قریب ہوتی تھی تو ڈیڑھ دومہینے پیاگ کو ہار کی دیکھ بھال
کرنی پڑتی تھی۔ اسے کسانوں سے دونوں فصلوں پر ہل پیچھے کچھ بندھا ہوا تھا۔ ماگھ ہی
میں وہ ایک منڈیا ڈال لیتا تھا اور رات کو کھا پی کر آگ چلم تمباکو۔ چرس لیے ہوئے
اسی منڈیا میں آکر پڑرہتا تھا۔ چیت کے آخرتک اس کا یہی شغل رہتا تھا۔ یہ وہی زمانہ
تھا۔ فصل پکی ہوئی تیار کھڑی تھی۔ دوچار دن میں کٹائی شروع ہونے والی تھی۔ پیاگ
نے دس بجے رات تک رکمنی کی راہ دیکھی۔ پھر یہ سمجھ کر کہ شاید کسی پڑوسن کے
یہاں سورہی ہوگی اس نے کھا پی کر اپنی لاٹھی چلم آگ اُٹھائی اور سلیا سے بولا کیواڑ
بند کرلے۔ اگر رکمنی آئے تو کھول دینا۔ کھانے کو کہنا۔ منا کر کچھ جرور کھلادینا۔
تیرے پیچھے آج اتنا توپھان ہوگیا آج نہ جانے مجھے اتنا گسا کیسے آگیا۔ میں نے اسے
کبھی پھول کی چھڑی سے نہیں چھوا تھا کہیں ڈوب دھنس نہ مری ہو۔ نہیں تو کل
آپھت آجائے۔"

سلیا بولی: "نہ جانے وہ آئیں نہ آئیں۔ اکیلے کیسے رہوں گی۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے میں

اکیلے گھر میں کبھی نہ رہی۔"

پیاگ : "تو گھر میں کون رہے گا۔ سونا گھر پاکر کوئی لوٹا تھالی اُٹھالے جائے تو؟ ڈر کس بات کا ہے۔ پھر رکمنی تو آتی ہی ہوگی۔"

سلیا نے ٹٹی اندر سے بند کرلی۔ پیاگ مزرعے کی طرف چلا۔ دم کے سرور میں ایک بھجن گاتا جاتا تھا۔ "ٹھگنی کیوں نینا جھمکادے۔ کدو کاٹ مردنگ بنائے۔ نیسوکاٹ مجیرا پانچ تروئی منگل گاویں۔ ناچیں بالم کھیرا۔ ٹھگنی روپا پیہر کے روپ دکھا دے۔ سونا پیہر رجھادے گلے ڈال تلسی کی مالا۔ تہنی لوگ بھرماویں ٹھگنی۔ یکا یک اس نے دیکھا کہ سامنے ہار میں کسی نے آگ جلائی ایک شعلہ اٹھا اس نے چلا کر پوچھا کون ہے؟ ارے یہ کون آگ جلاتا ہے! اس کا جواب بلند ہونے والے شعلوں نے آتشین زبان سے دیا اب پیاگ کو معلوم ہوا کہ اس کی منڈیامیں آگ لگی ہوئی ہے۔ منڈیا ہار کے بیچوں بیچ میں تھی۔ جس میں وہ سارے مزرعے پر مرکزی نگاہ ڈال سکے۔ اس منڈیا میں آگ لگنا روئی کے ڈھیر میں آگ لگنا تھا۔ ہواچل رہی تھی۔ منڈیا کے چاروں طرف ایک ہاتھ کے فاصلہ پر پکی ہوئی فصل کے تختے لہرا رہے تھے۔ اندھیری رات میں بھی اس کا سنہرا رنگ کچھ کچھ جھلک رہا تھا۔ آگ کی ایک لپٹ سارے ہار کو جلا کر خاکستر کردے گی۔ سارا گاؤں تباہ ہوجائے گا اسی ہار کے ڈانڈے پر آس پاس کے موضعوں کے ہار بھی ہیں وہ بھی جل اٹھیں گے۔ اوہ! شعلے بڑھتے جارہے ہیں۔ پیاگ نے اپلا اور چلم وہیں ٹیک دی اور کندھے پر لوہ بند لاٹھی رکھے ہوئے بے تحاشا منڈیا کی طرف دوڑا۔ مینڈوں سے جانے میں چکر تھا وہ کھیتوں میں سے ہو کر بھاگا جارہا تھا۔ ہر لمحہ شعلے بلند تر ہوتے جاتے تھے اور پیاگ کے قدم تیز تر۔ کوئی تیز گھوڑا بھی اس وقت اسے نہ پاسکتا۔ اسے خود اپنی تیزی پر حیرت ہو رہی تھی۔ جان پڑتا تھا پاؤں زمین پر پڑتے ہی نہیں۔ اس کی نظریں شعلوں پر تھیں۔ دائیں بائیں اسے اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ اس یکسوئی نے اسے مافوق البشر بنادیا تھا۔ نہ دم پھولا نہ پیروں میں تھکن ہوئی تین چار فرلانگ اس نے دومنٹ میں طے کیے اور منڈیا کے پاس جا پہنچا۔ وہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ شعلے شریر لڑکوں کی طرح ہنستے۔ دھکم دھکا کرتے کبھی دائیں طرف لپکتے کبھی بائیں طرف بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لپٹ اب کھیت تک پہنچی گویا

شعلے قصداً کیاریوں کی طرف بڑھتے اور ناکام ہوکر دوسری بار پھر دونے جوش سے لپکتے تھے۔ لاٹھی سے پیٹ کر آگ بجھانے کا موقعہ نہ تھا وہ صریح حماقت تھی پھر کیا ہو؟ فصل جل گئی تو پھر وہ منہ نہ دکھا سکے گا اور گاؤں میں کہرام مچ جائے گا۔ تباہی آجائے گی۔

دفعتاً اس نے لاٹھی سنبھال کر ایک چھلانگ ماری اور شعلوں کے اندر منڈیا کے دروازہ پر تھا۔ ایک ہی سیکنڈ میں ایک تختہ آتشیں معلق ہوا میں ایک سمت کو اُڑتا ہوا نظر آیا۔

پیاگ نے جلتی ہوئی منڈیا کو اپنی لاٹھی پر اُٹھا لیا تھا اور اس سے لیے ہوئے سب سے چوڑی منڈیر پر بھاگا چلا جارہا تھا۔ پھونس کی جلتی ہوئی دھجیاں اس کے اوپر گرتی جاتی تھیں پر اسے اس کا حس بھی نہ ہوتا تھا ایک بار ایک موٹھا الگ ہوکر اس کے ہاتھ پر گرا ادھر اُدھر کی کھال بھن گئی پر ہاتھوں میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ ہاتھ کا ہلنا کھیتی کا تباہ ہونا تھا۔ نادر کی جنبش ابرو میں بھی شاید اتنی تباہ کن قوت نہ تھی۔ اگر خوف تھا تو یہی کہ وہ بیچ کا حصہ جہاں اس نے لاٹھی ڈال کر منڈیا اُٹھائی تھی نہ جل جائے۔ ورنہ سوراخ کے بڑھتے ہی منڈیا اس کے اوپر آگرے گی۔ اور وہ اس مزار آتشیں کے نیچے دب جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی فصل بھی تباہ ہوجائے گی۔ اس لیے وہ خیال کے پرواز کے ساتھ اڑاجاتا تھا۔ 4 فرلانگ کی دوڑ ہے مگر آتشیں پیاگ کے سر پر اڑتی چلی جارہی ہے کس کے سر پر موت اس طرح کھیلی ہوگی۔ تیزرفتاری کے باعث شعلوں کا رخ پُشت کی طرف ہوگیا ہے اس کی قوت کا بیشتر حصہ ہوا کا مقابلہ کرنے میں صرف ہو رہا ہے ورنہ اب تک کب کا مرکزی حصہ جل گیا ہوتا اور پیاگ شعلوں کے نیچے دب جاتا۔

ایک فرلانگ طے ہوگیا۔ بس ایک فرلانگ کی اور کسر ہے۔

دیکھنا پیاگ! قوم ذرا بھی سست نہ ہوں۔ لاٹھی کے کندے پر شعلے پہنچے اور تمھاری زندگی کا خاتمہ ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی تمھیں گالیاں ملیں گی۔ تم نالہ ہائے سوزاں کی آگ میں جلتے رہوگے بس ایک منٹ اور! صرف دوکھیت رہ گئے ہیں آہ! منڈیا نیچے کھسک پڑی۔ کندا اس کے سوراخ کے پار ہوگیا۔ اب کوئی امید نہیں۔ شعلے

ایک ایک انچ نیچے کی طرف کھسکتے آرہے ہیں وہ آخری کھیت آپہنچا اب صرف دو سکینڈ کا اور معاملہ ہے۔ فتح کا دروازہ وہ سامنے بیس ہاتھ کے فاصلہ پر ہے۔ ادھر جنت ہے ادھر جہنم۔ وہ منڈیا کھسکتی ہوئی پیاگ کے سر پر آپہنچی وہ اب بھی اسے سر سے پھینک کر اپنی جان بچا سکتا ہے مگر کب تک؟ ایک سکینڈ میں وہ اس کی لاش پر ہوگی۔ اور شعلے اس کے جسم پر رقص کر رہے ہوں گے اور کیا عجب ہے فصل کا میدان بھی ان کا رقص گاہ بن جائے۔ یکایک رکمنی سامنے درخت کے نیچے سے بے تحاشا دوڑتی ہوئی نظر آئی اس نے فورا پیاگ کے سامنے آکر اس تختۂ سوزاں کو دونوں ہاتھوں پر لے لیا اور اسی وقت پیاگ بے ہوش زمین پر گر پڑا۔ رکمنی اس کاشانۂ سوزاں کو لئے ہوئے ایک ہی سکینڈ میں آخری کھیت کے ڈانڈے پر جا پہنچی مگر اتنی ہی دور میں اس کے ہاتھ جل گئے اور جلتی ہوئی جھونپڑی اس کے سر پر گر پڑی اور ایک لمحہ میں رکمنی شعلوں کا نوالہ بن گئی۔ کچھ دیر تک منڈیا کے نیچے جنبش ہوتی رہی پھر سکون ہوگیا۔ رکمنی اس مزار آتشیں میں دفن ہوگئی ذرا دیر کے بعد گاؤں کے آدمی جمع ہوگئے تو دیکھا پیاگ اس نیم سوختہ منڈیا کے سامنے سر جھکائے کھڑا آگ کو آنسوؤں سے بجھا رہاہے مگر اس کے اندر کی آگ کو کون بجھائے گا؟

(یہ افسانہ پہلی بار کلکتہ کے ہندی ماہنامہ 'وشال بھارت' کے جنوری 1928 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا آگنی سمادھی۔ یہ 'مان سروور' 5 میں شامل ہے۔ اردو میں 'پرخاک پروانہ' میں شامل ہے۔)

موٹے رام جی شاستری

پنڈیت موٹے رام جی شاستری کو کون نہیں جانتا؟ آپ ادھیکاریوں کا رخ دیکھ کر کام کرتے ہیں۔ سوادیشی آندولن کے دنوں میں آپ نے اس آندولن کا خوب وِرودھ کیا تھا۔ سوراجیہ آندولن کے دنوں میں بھی آپ نے ادھیکاریوں سے راج بھکتی کی سند حاصل کی تھی۔ مگر جب اتنی اچھل کود پر بھی ان کی تقدیر کی میٹھی نیند نہ ٹوٹی، اور اَدھیاپن کاریہ سے پنڈ نہ چھوٹا، تو انت میں آپ نے ایک نئی تدبیر سوچی۔ گھر میں جاکر دھرم پتنی جی سے بولے۔ ان بوڑھے طوطوں کو رٹاتے رٹاتے میری کھوپڑی پچی ہوئی جاتی ہے۔ اتنے دنوں وِدّیا دان دینے کا کیا پھل ملا جو اور آگے کچھ ملنے کی آشا کروں؟

دھرم پتنی نے چنتت ہو کر کہا۔ بھوجنوں کا بھی تو کوئی سہارا چاہیے؟

موٹے رام : تمھیں جب دیکھو، پیٹ ہی کی فکر پڑی رہتی ہے۔ کوئی ایسا وِرلا ہی دن جاتا ہوگا کہ نمتْرن نہ ملتے ہوں، اور چاہے کوئی نندا ہی کرے، پر میں پروسا لیے بنا نہیں آتا ہوں۔ کیا آج ہی سب یجمان مرے جاتے ہیں؟ مگر جنم بھر پیٹ ہی جلایا تو کیا کیا۔ سنسار کا کچھ سکھ بھی تو بھوگنا چاہیے۔ میں نے وِیدھ بننے کا نشچیہ کیا ہے۔

استری نے آشچریہ سے کہا۔ ویدھ کیسے بنوگے۔ کچھ ویدھکی پڑھی بھی ہے؟

موٹے : ویدھک پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سنسار میں وِدھا کا اتنا مہتو نہیں جتنا بدھی کا۔ دو چار سیدھے سادھے لٹکے ہیں، بس اور کچھ نہیں ہے۔ آج ہی اپنے نام کے آگے بھشگا چاریہ بڑھالوں گا۔ کون پوچھنے آتا ہے تم بھشگا چاریہ ہو یا نہیں۔ کسی کو کیا غرض پڑی ہے جو میری پریکشھا لیتا پھرے۔ ایک موٹا سا سائن بورڈ بنوالوں گا۔ اس پر یہ شبد لکھے ہوں گے۔ یہاں استری پروشوں کے گپت روگوں کی چکتسا وشیش روپ سے کی جاتی ہے۔ دوچار پیسے کا ہڑ بہیڑ آنولہ کوٹ چھان کر رکھ لوں گا۔ بس اس کام کے لیے اتنا سامان پریاپت ہے۔

ہاں، سماچار پتروں میں وگیاپن دوں گا۔ نوٹس بٹواؤں گا۔ اس میں لنکا، مدراس، رنگون، کراچی آدی دُور ستھ ستھانوں کے بجنوں کی چٹھیاں درج کی جائیں گی۔ یہ میرے چکتسا کوشل کے ساکشی ہوں گے۔ جنتا کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس بات کا پتا لگاتی پھرے کہ ان استھانوں میں ان ناموں کے منشیہ رہتے بھی ہیں یا نہیں۔ پھر دیکھو ویدھک کیسی چلتی ہے۔

استری: لیکن بنا جانے بوجھے دوا دوگے، تو فائدہ کیا کرے گی؟

موٹے: فائدہ نہ کرے گی، میری بلا سے۔ ویدھ کا کام دوا دینا ہے، وہ مرتیو کو پراست کرنے کا ٹھیکا نہیں لیتا۔ اور پھر جتنے آدمی بیمار پڑتے ہیں۔ سبھی تو نہیں مرجاتے۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ جنھیں کوئی اَوشدھی نہیں دی جاتی وے وِکار شانت ہوجانے پر آپ ہی اچھے ہوجاتے ہیں۔ ویدھوں کو بنا مانگے لیش ملتا ہے۔ پانچ روگیوں میں ایک بھی اچھا ہو گیا تو اس کا لیش مجھے اوشیہ ہی ملے گا۔ شیش جو چار مر گئے۔ وے میری نندا کرنے تھوڑے ہی آویں گے۔ میں نے بہت وچار کر کے دیکھ لیا، اس سے اچھا کوئی کام نہیں ہے۔ لیکھ لکھنا مجھے آتا ہی ہے۔ کوِتّ بنا ہی لیتا ہوں۔ پتروں میں آیوروید مہتو پر دو چار لیکھ لکھ دوں گا۔ ان میں جہاں تہاں دو چار کوِتّ بھی جوڑ دوں گا اور لکھوں گا بھی ذرا چٹ پٹی بھاشا میں۔ پھر دیکھو کتنے الو پھنستے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں اتنے دنوں کیوں بوڑھے طوطے ہی رٹا رہا ہوں۔ میں نگر کے سپھل ویدوں کی چالوں کا اولوکن کرتا رہا ہوں اور اتنے دنوں کے بعد مجھے ان کی سپھلتا کے مول منتر کا گیان ہوا ہے۔ ایشور نے چاہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہوگی۔

استری نے اپنے من اُلّاس کو دباتے ہوئے کہا: میں اس عمر میں بھلا کیا گہنے پہنوں گی، نہ اب وہ ابھیلاشا ہی ہے، پر یہ تو بتاؤ کہ تمھیں دوائیں بنانی بھی تو نہیں آتیں۔ کیسے بناؤ گے۔ رس کیسے بنیں گے، دواؤں کو پہچانتے بھی تو نہیں ہو؟

موٹے: پر یہ تم واستو میں بڑی مورکھ ہو۔ ارے ویدھوں کے لیے ان باتوں میں سے ایک کی بھی آوشیکتا نہیں۔ ویدھ کی چٹکی کی راکھ ہی رس ہے، بھسم ہے،

رسائین ہے۔ بس آوشیکتا ہے کچھ ٹھاٹ باٹ کی۔ ایک بڑا سا کمرہ چاہیے۔ اس میں ایک دری ہو، تاکھوں پر دس پانچ شیشیاں بوتلیں ہوں۔ اس کے سوا اور کوئی چیز درکار نہیں، اور سب کچھ بدھی آپ ہی آپ کرلیتی ہے۔ میرے ساہتیہ مسرت لیکھوں کا بڑا پربھاؤ پڑے گا۔ تم دیکھ لینا، النکاروں کا مجھے کتنا گیان ہے، یہ تو تم جانتی ہی ہو۔ آج اس بھومنڈل پر مجھے ایسا کوئی نہیں دیکھتا جو النکاروں کے وشے میں مجھ سے پیش پاسکے۔ آخر ان دنوں گھاس تو نہیں کھودی ہے۔ دس پانچ آدمی تو کوی چرچا کے ناطے ہی میرے یہاں آیا جایا کریں گے۔ بس وہی میرے دلال ہوں گے۔ انھیں کی معرفت میرے پاس روگی آویں گے۔ میں آیوروید گیان کے بل پر نہیں، نایکا گیان کے بل پر دھڑلے سے ویدھک کروں گا۔ تم دیکھتی تو جاؤ۔

استری نے اوشواس کے بھاؤ سے کہا: مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ وِدھیا تھی بھی تمھارے ہاتھ سے نہ جائیں۔ نہ ادھر کے رہو نہ ادھر کے۔ تمھارے بھاگیہ میں تو لڑکے پڑھانا لکھا ہے، اور چاروں اور سے ٹھوکر کھاکر پھر تمھیں وہی طوطے رٹانے پڑیں گے۔

موٹے : تمھیں میری یوگیتا پر وشواس کیوں نہیں آتا؟

استری : اس لیے کہ تم وہاں بھی دھورتتا کروگے۔ میں تمھاری دھورتتا سے چڑھتی ہوں۔ تم جو کچھ نہیں ہو اور نہیں ہو سکتے وہ کیوں بننا چاہتے ہو؟ تم لیڈر نہ بن سکے، نہ بن سکے، سر پٹک کر رہ گئے۔ تمھاری دھورتتا ہی پھلی بھوت ہوتی ہے اور اسی سے مجھے چڑھ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھلے آدمی بن کر رہو۔ نش کپٹ جیون ویتیت کرو۔ مگر تم میری بات کب سنتے ہو؟

موٹے : آخر میرا نایکا گیان کب کام آوے گا؟

استری : کسی رئیس کے مصاحبی کیوں نہیں کر لیتے؟ جہاں دو چار سندر کوت سنا دوگے وہ خوش ہو جائے گا اور کچھ نہ کچھ دے ہی مرے گا۔ ویدھک کا ڈھونگ کیوں رچتے ہو۔

موٹے : مجھے ایسے ایسے گر معلوم ہیں جو ویدھوں کے باپ دادوں کو بھی نہ معلوم

ہوں گے۔ اور سبھی ویدھ ایک ایک دو دو روپے پر مارے مارے پھرتے ہیں، میں اپنی فیس پانچ روپے رکھوں گا۔ اس پر سواری کا کرایہ الگ، لوگ یہیں سمجھیں گے کہ یہ کوئی بڑے ویدھ ہیں۔ نہیں تو اتنی فیس کیوں ہوتی؟ استری کو اب کی کچھ وشواس آیا۔ بولی۔ اتنی دیر میں تم نے ایک بات مطلب کی کہی ہے۔ مگر یہ سمجھ لو۔ یہاں تمھارا رنگ نہ جمے گا۔ کسی دوسرے شہر کو چلنا پڑے گا۔

موٹے : (ہنس کر) کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا۔ لکھنؤ میں اڈا جمے گا اپنا۔ سال بھر میں وہ دھاک باندھ دوں کہ سارے ویدھ گرد ہو جائیں۔ مجھے اور بھی کتنے ہی منتر آتے ہیں۔ میں روگی کو دو تین بار دیکھے بنا اس کی چکتسا ہی نہ کروں گا۔ کہوں گا۔ میں جب تک روگی کی پراکرتی کو بھلی بھانتی پہچان نہ لوں، اس کی دوا نہیں کر سکتا۔ بولو کیسی رہے گی؟ استری کی باچھے کھل گئیں، بولی۔ اب میں تمھیں مان گئی۔ اوشیہ چلے گی تمھاری ویدھکی۔ اب مجھے کوئی سندیہہ نہیں رہا۔ مگر غریبوں کے ساتھ یہ منتر نہ چلانا نہیں تو دھوکھا کھاؤ گے۔

(2)

سال بھر گذر گیا۔

بھشگا چاریہ پنڈت موٹے رام جی شاستری کی لکھنؤ میں دھوم مچ گئی۔ النکاروں کا گیان تو انھیں تھا ہی کچھ گا بجا بھی لیتے تھے۔ اس پر گپت روگوں کے وشیشگیہ رسکوں کے بھاگیہ جاگے۔ پنڈت جی انھیں کوِت سناتے، ہنساتے اور بل کارک اوشدھیاں کھلاتے، اور وہ رئیسوں میں، جنھیں پشٹی کارک اوشدھیاں کی وشیش چاہ رہتی ہے۔ ان کی تعریفوں کے پل باندھتے۔ سال ہی بھر میں ویدھ جی کا وہ رنگ جما، کہ باید و شاید۔ گپت روگوں کے چکتسک لکھنؤ میں ایک ماتر وہی تھے۔ گپت روپ سے چکتسا بھی کرتے۔ ولاشی ودھوا رانیوں اور شوقین ادور درشی رئیسوں میں آپ کی خوب پوجا ہونے لگی۔ کسی کو اپنے سامنے سمجھتے ہی نہ تھے۔

مگر استری انھیں برابر سمجھایا کرتی کہ رانیوں کے جھمیلے میں نہ پھنسو۔ نہیں ایک دن پچھتاؤ گے۔ مگر بھاوی تو ہو کر ہی رہتی ہے، کوئی لاکھ سمجھائے بجھائے۔

پنڈت جی کے اپاسکوں میں بڑہل کی رانی بھی تھیں۔ راجہ صاحب کا سورگ واس ہو چکا تھا۔ رانی صاحبہ نہ جانے کس جیرن روگ میں گرست تھیں۔ پنڈت جی ان کے یہاں دن میں پانچ پانچ بار جاتے۔ رانی صاحبہ انھیں ایک چھن کے لیے بھی اپنے پاس سے ہٹنے نہ دینا چاہتی تھی۔ پنڈت جی کے پہنچنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو بے چین ہو جاتیں۔ ایک موٹر نتیہ ان کے دوار پر کھڑی رہتی تھی۔ اب پنڈت جی نے خوب کچل بدلی تھی۔ تنذیب کے اچکن پہنتے۔ بنارسی صافہ باندھتے اور پمپ جوتا ڈالتے تھے۔ مترگن بھی ان کے ساتھ موٹر پر بیٹھ کر دندنایا کرتے تھے۔ کئی متروں کو رانی صاحبہ کے دربار میں نوکر رکھا دیا۔ رانی صاحبہ بھلا اپنے مسیحا کی بات کیسے ٹالتی۔

مگر چرخِ جفاکار اور ہی شڑیتر رچ رہا تھا۔ ایک دن پنڈت جی، رانی صاحبہ کی گوری گوری کلائی پر ایک ہاتھ رکھے نبض دیکھ رہے تھے۔ اور دوسرے ہاتھ سے ان کے ہردے کی گتی کی پرکشھا کر رہے تھے کہ اتنے میں کئی آدمی سوٹے لیے ہوئے کمرے میں گھس آئے اور پنڈت جی پر ٹوٹ پڑے۔ رانی نے بھاگ کر دوسرے کمرے کی شرن لی اور کیواڑ بند کر لیے۔ پنڈت جی پر بے بھاؤ پڑنے لگی۔ یوں تو پنڈت جی دم خم کے آدمی تھے، ایک گپتی سدئیو ساتھ رکھتے تھے۔ پر جب دھوکے میں کئی آدمیوں نے دھر دبایا تو کیا کرتے؟ کبھی اس کا پیر پکڑتے، کبھی اس کا ہائے ہائے کا شبد نیرنتر منھ سے نکل رہا تھا پر ان بے رحموں کو ان پر ذرا بھی دیا نہ آتی تھی۔ ایک آدمی نے ایک لات جما کر کہا۔ اس دُشٹ کی ناک کاٹ لو۔

دوسرا بولا: اس کے منھ میں کالکھ اور چونا لگا کر چھوڑ دو۔

تیسرا بولا: کیوں ویدھ جی مہاراج بولو کیا منظور ہے؟ ناک کٹواؤ گے یا منھ میں کالکھ لگواؤ گے؟

پنڈت ہائے ہائے مر گیا اور جو چاہے کرو، مگر ناک نہ کاٹو۔

ایک: اب تو پھر ادھر نہ آوے گا؟

پنڈت: بھول کر بھی نہیں، سرکار، ہائے مر گیا۔

دوسرا: آج ہی لکھنؤ سے رفوریٹ ہو جاؤ نہیں تو برا ہوگا۔

پنڈت: سرکار، میں آج ہی چلا جاؤں گا۔ جنیو کی شپتھ (حلف) کھا کر کہتا ہوں آپ

یہاں میری صورت نہ دیکھیں گے۔

تیسرا: اچھا بھائی، سب کوئی اسے پانچ پانچ لاتیں لگا کر چھوڑ دو۔

پنڈت: ارے سرکار، مر جاؤں گا دیا کرو۔

چوتھا: تم جیسے پاکھنڈیوں کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ ہاں تو شروع ہو۔ پنچ لتی پڑنے لگی۔ دھما دھم کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا نگاڑے پر چوٹ پڑ رہی ہے۔ ہر دھماکے کے بعد ایک بار ہائے کی آواز نکل آتی تھی۔ مانو اس کی پرتی دھونی ہو۔ پنچ لتی پوجا سماپت ہوجانے پر لوگوں نے موٹے رام جی کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور موٹر پر بیٹھا کر گھر بھیج دیا۔ چلتے چلتے چتاؤنی دے دی کہ پراتہ کال سے پہلے بھاگ کھڑے ہونا، نہیں تو اور ہی علاج کیا جائے گا۔

(3)

موٹے رام جی لنگڑاتے، کراہتے، لکڑی ٹیکتے گھر میں گئے اور دھم سے چار پائی پر گر پڑے۔ استری نے گھبرا کر پوچھا۔ کیسا جی ہے؟ ارے تمھارا کیا حال ہے؟ ہائے ہائے یہ تمھارا چہرہ کیسا ہو گیاہے۔

موٹے: ہائے بھگوان مر گیا۔

استری: کہاں درد ہے؟ اسی مارے کہتی تھی بہت ربڑی نہ کھاؤ۔ لونَ بھاسکر لے آؤں؟

موٹے: ہائے دُشٹوں نے مار ڈالا۔ اسی چانڈالنی کے کارن میری درگتی ہوئی۔ مارتے مارتے سبوں نے بھرکس نکال لیا۔

استری: تو یہ کہو کہ پٹ کر آئے ہو۔ ہاں پٹے تو ہو۔ اچھا ہوا۔ ہو تم لاتوں ہی کے دیوتا۔ کہتی تھی کہ رانی کے یہاں مت آیا جایا کرو۔ مگر تم کب سنتے تھے۔

موٹے: ہائے ہائے رانڈ، تجھے بھی اسی دم کوسنے کی سوجھی۔ میرا تو برا حال ہے اور تو کوس رہی ہے۔ کسی سے کہہ دے ٹھیلا ویلا لاوے راتوں رات لکھنؤ سے بھاگ جانا ہے۔ نہیں تو سویرے پران نہ بچے گی۔

استری: نہیں، ابھی تمھارا پیٹ نہیں بھرا۔ ابھی کچھ دن اور یہاں کی ہوا کھاؤ۔ کیسے مزے کے لڑکے پڑھاتے تھے ہاں۔ نہیں تو ویدھ بننے کی سوجھی۔ بہت اچھا

ہوا۔ اب عمر بھر نہ بھولو گے۔ رانی کہاں تھی کہ تم پٹتے رہے اور اس نے تمھاری رکشھا نہ کی؟

پنڈت : ہائے ہائے، وہ چڑیل تو بھاگ گئی۔ اسی کے کارن، کیا جانتا تھا کہ یہ حال ہوگا۔ نہیں تو اس کی چکتسا ہی کیوں کرتا؟

استری : ہو تم تقدیر کے کھوٹے۔ کیسی ویدھکی چل گئی تھی۔ مگر تمھاری کرتوتوں نے ستیاناش مار دیا۔ آخر پھر وہی پڑھونی کرنا پڑی۔ ہو تقدیر کے کھوٹے۔

پراتہ کال موٹے رام جی کے دوار پر ٹھیلا کھڑا تھا اور اس پر اسباب لد رہا تھا۔ متروں میں ایک بھی نظر نہ آتا تھا۔ پنڈت جی بڑے کراہ رہے تھے۔ اور استری سامان لدوا رہی تھی۔

(یہ افسانہ ہندی میں 'مادھوری' جنوری 1928 میں شائع ہوا۔ ہندی مجموعہ 'گپت دھن' 1 میں شامل ہے۔ اردو میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس افسانے کو لے کر ایک صاحب (سالک رام شاستری) نے عزت ہتک کا دعویٰ کیا تھا۔ دعویٰ خارج ہوا اور دوبارہ مئی 1928 میں 'مادھوری' میں شائع ہوا۔)

منتر

(1)

شام کا وقت تھا ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جا رہے تھے، موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ دو کہار ڈولی لیے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا نحیف آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ڈولی مطب کے سامنے آکر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازہ پر آکر اندر جھانکا، ایسی صاف ستھری زمین پر اسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چلا نہ دوڑے۔

ڈاکٹر صاحب نے چق کے اندر سے گرج کر کہا، "کون ہے کیا چاہتا ہے؟"

بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "ہجور بڑا گریب آدمی ہوں۔ میرا لڑکا کئی دن سے...

ڈاکٹر نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ کل سویرے آؤ۔ سویرے۔ ہم اس وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔

بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر زمین پر سر رکھ دیا اور بولا۔ دہائی ہے سرکار کی، ہجور لڑکا مر جائے گا۔ چاردن سے آنکھیں...

ڈاکٹر نے کلائی پر نظر ڈالی، چھ بجنے میں صرف 10 منٹ باقی تھے۔ گولف اسٹک ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے، کل سویرے آؤ، ہم کھیلنے جاتا ہے۔

بوڑھے نے پگڑی اتار کر چوکھٹ پر رکھ دی اور رو کر بولا، ہجور ایک نگاہ دیکھ لیں، لڑکا ہاتھ سے چلا جائے گا۔ سات لڑکوں میں یہی ایک بچ رہا ہے ہجور۔ ہم دونوں آدمی رورو کر مر جائیں گے۔

ڈاکٹر نے چلمن اٹھائی اور موٹر کی طرف چلے، بوڑھا پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا دوڑا۔ سرکار بڑا دھرم ہوگا، ہجور دیا کیجیے۔ مگر ڈاکٹر صاحب مطلق مخاطب نہ ہوئے۔ موٹر پر بیٹھ کر بولے۔ کہہ دیا کل سویرے آؤ۔

موٹر چلی گئی، بوڑھا کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ دنیا میں ایسے

انسان بھی ہوتے ہیں، شانہ اسے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔ پھر اس نے کہاروں سے ڈولی اٹھانے کو کہا۔ یہ غریب چاروں طرف سے مایوس ہو کر چڈھا کے پاس آیا تھا، ان کی بڑی تعریف سنی تھی، یہاں سے جواب پا کر پھر وہ اور ڈاکٹر کے پاس نہ گیا، قسمت ٹھونک لی۔ اسی رات کو اس کا سات سال کا ہنستا کھیلتا بچہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بوڑھے ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ زندگی کا یہی ایک سہارا تھا، اسی بچہ کا منہ دیکھ کر دونوں جیتے تھے، اب دنیا ان کے لیے تاریک ہو گئی!

(2)

کئی سال گذر گئے، ڈاکٹر چڈھا کی ثروت اور شہرت ماہ نو کی طرح بڑھتی گئی، اور صحت تو ان کی بے مثال تھی۔ یہ ان کی پابندی اوقات کا نتیجہ تھا کہ پچاس سال کے سن میں بھی ان کی چستی وجفاکشی جوانوں کو شرمندہ کرتی تھی، اکثر لوگ صحت کے قواعد کی پابندی اس وقت کرتے ہیں جب صحت زائل ہو چکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر چڈھا علاج اور انسداد کے راز کو خوب سمجھتے تھے۔ ورنہ ڈاکٹر ہی کیوں ہوتے۔ تعیّن اولاد بھی انھیں قواعد میں تھا۔ ان کے صرف دو لڑکے ہوئے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ تیسری اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ شریمتی چڈھا کی صحت میں بھی کسی قسم کا ضعف نہ تھا۔ دونوں لڑکے صحت اور زندہ دلی کے پتلے تھے۔ لڑکی کی تو شادی ہو چکی تھی، لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا۔ سبزہ آغاز نوجوان تھا، مردانہ حسن کا اعجاز، ذہانت کا پتلا، تحریر وتقریر میں یونیورسٹی کا مایۂ ناز۔ چہرہ سے نور برستا تھا۔ ہر ایک دائرہ کا مرکز نگاہ، خوش گلو، خلیق، منکسر، آج اس کی بیسویں سالگرہ تھی۔

رات کا وقت تھا، ہری ہری گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، شہر کے رؤسا اور حکام ایک طرف، کالج کے طلبا دوسری طرف بیٹھے ہوئے دعوت کھا رہے تھے۔ بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قائم بنا ہوا تھا۔ تفریح کے سامان بھی جمع تھے، ایک چھوٹے سے فارس کھیلنے کی تیاری کی گئی تھی۔ فارس خود نوجوان چڈھا کی تصنیف تھی، وہی خاص ایکٹر بھی تھا، وہ اس وقت ایک ریشمی کرتہ پہنے، ننگے پاؤں، دوستوں کی خاطر ومدارات میں مصروف تھا۔ کوئی پکارتا چڈھا ذرا ادھر آنا، کوئی ادھر سے پکارتا، چڈھا کیا ادھر ہی رہو گے؟

یکایک ایک حسینہ نے آکر کہا۔ کیوں کیلاش، تمھارے سانپ کہاں ہیں، ذرا مجھے بھی دکھادو۔

چڈھا نے ٹالتے ہوئے کہا، اس وقت معاف کرو مرنالنی، کل دکھا دوں گا۔

مرنالنی نے ایک انداز سے ماتھا سکوڑ کر کہا، جی نہیں تمھیں دکھانا پڑے گا، میں نہیں ماننے کی، تم یوں ہی روز کل کل کرتے رہتے ہو۔

مرنالنی اور کیلاش دونوں ہم جماعت تھے، اور ایک دوسرے پر فدا، کیلاش کو سانپوں کو نچانے اور کھلانے کا شوق تھا۔ طرح طرح کے سانپ پال رکھے تھے، ان کے عادات وخواص کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ سانپوں پر تھوڑے دن ہوئے انھوں نے یونیورسٹی کلب میں ایک نہایت دلچسپ تقریر کی تھی، اور سانپوں کو نچا کر دکھایا تھا ایک بوڑھے سپیرے سے اس نے یہ فن سیکھا تھا، سانپوں کی کتنی ہی جڑی بوٹیاں اس نے جمع کر رکھی تھیں۔ مرنالنی کا اصرار بے موقع تھا۔ سانپوں کے کمرہ میں بہت ہجوم ہو جائے گا۔ اس لیے وہ ٹال رہا تھا، اور شاید مرنالنی مان بھی جاتی، مگر دوستوں کو چین کہاں؟ ایک صاحب بولے، دکھا کیوں نہیں دیتے بھئی، ایک ذرا سی بات کے لیے اتنا ٹال مٹول کر رہے ہو، مرنالنی ہر گز نہ ماننا، دیکھوں یہ حضرت کیسے نہیں دکھاتے۔ دوسرے صاحب بولے۔ مس مرنالنی اس قدر سیدھی اور بھولی ہیں جبھی آپ اتنا مزاج کرتے ہیں، دوسری ہوتی تو اسی بات پر بگڑ کھڑی ہوتی۔ تیسرے صاب نے فرمایا اجی بولنا چھوڑ دیتی، صورت نہ دیکھتی، اس پر آپ کو دعوئ ہے کہ مس مرنالنی کے لیے جان حاضر ہے۔

مرنالنی نے ان شہدوں کی طرف تمسخر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا، آپ لوگ میری وکالت نہ کریں، میں اس وقت نہیں دیکھنا چاہتی، چلو چھٹی ہوئی۔

اس پر دوستوں نے قہقہہ لگایا، ایک صاحب بولے، دیکھنا تو آپ سب چاہیں لیکن کوئی دکھائے بھی۔

کیلاش کو مرنالنی کے بشرے سے معلوم ہوا کہ اس وقت اس کا انکار ناگوار گذرا۔ جوں ہی دعوت ختم ہوئی اور گانا شروع ہوا اس نے مرنالنی اور چند احباب کو سانپوں کے دربے کے سامنے لے جا کر مہور بجانا شروع کیا۔ پھر ہر ایک خانے کو

کھول کھول کر ایک ایک سانپ نکالنے لگا۔ واہ! کیا کمال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کیڑے اس کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں۔ کسی کو ہاتھوں میں اٹھالیا، کسی کو گردن میں ڈال لیا، کسی کو ماتھے کے گرد لپیٹ لیا، مرنالنی بار بار منع کرتی تھی، انھیں گردن میں نہ ڈالو۔ دور ہی سے دکھادو۔ بس ذرا نچا دو۔ کیلاش کی گردن میں سانپوں کو لپٹتے دیکھ کر اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ افسوس کر رہی تھی کہ میں نے ناحق انھیں چھیڑا۔ مگر کیلاش ایک نہ سنتا تھا۔ معشوقہ کے روبرو اپنے کمال کے اظہار کا ایسا موقع پا کر کون چوکتا ہے۔

ایک صاحب بولے: دانت تو توڑ ہی ڈالے ہوں گے۔

کیلاش نے ہنس کر کہا، جی نہیں بندہ نواز دانت توڑنا مداریوں کا کام ہے۔ کسی کے دانت نہیں توڑے گئے۔ کہیے تو دکھادوں۔

یہ کہہ کر اس نے ایک کالے سانپ کو پکڑ لیا اور بولا۔ میرے پاس اس سے بڑا اور زہریلا دوسرا جانور نہیں ہے اگر کسی کو کاٹ لے تو آناً فاناً آدمی مر جائے، اس کا کوئی علاج نہیں، دکھادوں اس کے دانت!

مرنالنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، نہیں، نہیں کیلاش۔ ایشور کے لیے اسے چھوڑ دو۔ تمھارے پیروں پڑتی ہوں۔

اس پر ایک دوسرے مہربان بولے، مجھے یقین تو نہیں آتا، مگر چونکہ تم کہتے ہو اس لیے مان لیتا ہوں۔

کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑ کر کہا۔ نہیں صاحب آپ آنکھوں سے دیکھ لیجیے تب مانئے۔ دانت توڑ کر قبضہ میں کیا تو مجھ میں اور مداریوں میں فرق ہی کیا رہا۔ سانپ بڑا سمجھدار ہوتا ہے، اگر اسے یقین ہو جائے کہ اس آدمی سے مجھے کوئی گزند نہ پہونچے گا تو وہ اسے ہرگز نہ کاٹے گا، دانت اس کا آلۂ مانعت ہے۔

مرنالنی نے دیکھا کیلاش پر اس وقت جنون سوار ہے تو اس نے یہ تماشا ختم کرنے کو کہا اور بولی اب یہاں سے چلو، دیکھو باہر گانا شروع ہوگیا۔ آج میں بھی کوئی چیز سناؤں گی۔ یہ کہہ کر اس نے کیلاش کا کندھا پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا اور کمرہ سے چلی گئی۔ مگر کیلاش معترضوں کو خاموش کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے سانپ کی

گردن پکڑ کر اتنے زور سے دبائی کہ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ جسم کی ساری رگیں تن گئیں۔ سانپ نے اب تک اس کے ہاتھوں اس قسم کا بے رحمانہ برتاؤ نہ دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ اسے شاید یہ خیال ہوا کہ یہ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اپنی محافظت کے لیے آمادہ ہوگیا، کیلاش نے اس کی گردن دبا کر اس کا منھ کھول دیا اور اس کے دانت دکھاتے ہوئے بولا۔ جن صاحبوں کو شبہ ہو آکر دیکھ لیں، آیا یقین؟ یا اب بھی شک ہے؟

دوستوں نے قریب آکر اس کے دانت دیکھے اور کیلاش کے کمال کا اعتراف کرنے لگے۔ عینی شہادت کے سامنے شبہ کی گنجائش کہاں، ان کا اطمینان کر کے کیلاش نے سانپ کی گردن ڈھیلی کر دی اور اسے زمین پر رکھنا چاہا مگر وہ کالا گیہوں غضبناک ہو رہا تھا، گردن نرم پڑتے ہی اس نے سر اٹھا کر کیلاش کی انگلی میں زور سے کاٹا اور وہاں سے بھاگا، انگلی سے ٹپ ٹپ خون ٹپکنے لگا۔ کیلاش نے فوراً زور سے انگلی دبالی اور اپنے کمرہ کی طرف دوڑا۔ اس کی میز کی دراز میں ایک جڑی رکھی ہوئی تھی جس کے استعمال سے قاتل زہر بھی رد ہو جاتا تھا۔ دوستوں میں ہل چل پڑ گئی۔ ڈاکٹر صاحب بدحواس ہو کر دوڑے، وہ جڑی بوٹی کے قائل نہ تھے، انگلی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتے تھے۔ پر کیلاش کو جڑی پر کامل اعتقاد تھا، فوراً جڑی پیسی گئی اور انگلی پر اس کا لیپ کیا گیا۔ کیلاش تو مطمئن ہو کر باقی سانپوں کو دربے میں بند کرنے لگا، مگر ڈاکٹر صاحب اور دوسرے احباب پریشان تھے۔ مرنالنی پیانو چھوڑ کر دوڑی آئی تھی وہ بار بار ڈاکٹر صاحب سے کہتی آپ نشتر لگا دیجیے۔ مگر ڈاکٹر صاحب تذبذب کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ مشکل سے پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ کیلاش کو سر میں چکر سا محسوس ہوا اور دیکھتے دیکھتے اس کے چہرہ کا رنگ زرد پڑنے لگا، مگر ابھی تک وہ ضبط کیے کھڑا تھا اور سب سے کہتا تھا آپ لوگ اندیشہ نہ کریں میں بالکل اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب خاموش کھڑے تھے پر کیلاش کے چہرہ کا اڑتا ہوا رنگ دیکھ کر ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا، وہ جلدی سے مطب میں آگئے اور کئی چیزیں ایک گلاس میں ملا کر لائے۔ کیلاش نے ایک بے غرضانہ انداز سے گلاس لے لیا اور منہ میں لگانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا

اور ہاتھ سے پنکھا جھلنے کا اشارہ کیا۔ میز کا پنکھا لگا دیا گیا اور تیز ہوا چلنے لگی، مرنالنی نے دوڑ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی، کیلاش کیسی طبیعت ہے؟ کیلاش نے ہاتھ اوپر اٹھا دیا، پھر منہ سے کچھ نہ بول سکا۔

مسز چڈھا نے بگڑ کر شوہر سے کہا۔ کھڑے منہ کیا تاک رہے ہو، کوئی چیز دیتے کیوں نہیں؟

مرنالنی نے کہا۔ ماں دیکھیے، ان کا چہرہ کیسا ہوا جاتا ہے۔

چڈھا نے پچھتا کر کہا۔ کیا بتلاؤں، میں اس کی باتوں میں آگیا، اب نشتر سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

یہ کہتے ہوئے انھیں کچھ خیال آگیا، پھر دوڑے ہوئے مطب میں گئے۔ اور کوئی مرکب بنا کر لائے۔ بڑی مشکل سے کیلاش کا منہ کھولا گیا اور دوا ڈالی گئی۔ مگر زہر اتنا قاتل تھا کہ دو بارہ لہر نہ آئی، دوا کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آدھہ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ کیلاش کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، چہرہ سفید ہوگیا، نبض کا کہیں پتہ نہیں، موت کی ساری علامتیں نمودار ہوگئیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ مرنالنی ایک طرف سر پیٹنے لگی۔ ماں الگ پچھاڑیں کھانے لگی ارر ڈاکٹر چڈھا تو ایسے بدحواس ہو گئے کہ اگر دوستوں نے نہ پکڑ لیا ہوتا تو شاید اپنے گلے پر نشتر چلا لیتے۔

ایک صاحب بولے، کوئی منتر جھاڑنے والا مل جائے تو ممکن ہے اب بھی جان بچ جائے۔

دوسرے صاحب نے فرمایا۔ ارے صاحب قبر سے نکلی ہوئی لاشیں زندہ ہوگئی ہیں، ایسے ایسے باکمال پڑے ہوئے ہیں۔

چڈھا نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا، کہ اس کی باتوں میں آگیا۔ نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ بار بار سمجھاتا رہا کہ بیٹا سانپ نہ پالو، جان کا خطرہ ہے۔ مگر میری کون سنتا تھا۔ بلائیے کسی جھاڑنے والے کو بلائیے میرا سب کچھ لے لے۔ میں اپنی ساری جائداد اس کے پیروں پر رکھ دوں گا۔ لنگوٹی باندھ کر گھر سے نکل جاؤں گا۔ مگر میرا کیلاش میرا لخت جگر اُٹھ بیٹھے۔ ایشور کے لیے بلائیے مجھ پر رحم کیجیے۔

بنگلہ سے کچھ دور پر کئی گوالے رہتے تھے ان میں سے ایک سانپ کا منتر جانتا تھا۔ اس نے آکر کئی بار منتر پڑھا کئی بار کیلاش کے کان میں چلّایا، پھر پچاسوں گھڑے پانی اس کے اوپر ڈلوائے۔ پر بازیافت کی کوئی علامت نہ دیکھ کر مایوس چلا گیا۔ ایک دو منتر والے اور بھی آئے ان سبھوں نے بھی منتر پڑھے، دوائیں پلائیں، سنگھائیں، نہلایا، شور مچایا مگر کوئی نتیجہ نہ دیکھ کر رخصت ہوگئے۔ چوتھے نے آکر کیلاش کی صورت دیکھتے ہی کہا۔ اب میں کیا منتر پڑھوں سرکار، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

ظالم! یہ کیوں نہیں کہتا کہ جو کچھ نہ ہونا تھا ہو چکا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ ماں باپ نے بیٹے کا سہرا کہاں دیکھا۔ مرنالنی کی آغوش محبت میں بیٹھنا کہاں نصیب ہوا۔ زندگی کے وہ سنہرے خواب جن سے زندگی نو بہار ہو جاتی تھی کیا پریشان نہیں ہو گئے۔ تمناؤں کی زرنگار جھیلوں میں لطف سیر اٹھاتے ہوئے کیا ان کا بجرا غرقاب نہیں ہوگیا۔ جو ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ جو کچھ نہ ہونا تھا وہ البتہ ہو گیا۔

وہی نورانی سبزہ زار تھا۔ وہی سنہری چاندنی ایک نغمۂ خاموش کی طرح منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ وہی مجمع احباب تھا وہی تفریح کے سامان تھے۔ مگر اب ان پر تارے ماتم کرتے تھے۔ اور شبنم آنسو بہاتی تھی۔ بارات وہی تھی، پر دولہا رخصت ہو گیا تھا۔

(3)

ایک چھوٹے سے کچے مکان میں ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا انگیٹھی کے سامنے بیٹھے جاڑے کی رات کاٹ رہے تھے۔ انگیٹھی میں آگ نہ تھی۔ صرف من کو بہلانے کا ایک سامان تھا۔ زمین پر پڑی ہوئی پوال اور دو تار تار کمل خوش آیند نیند کے ضامن نہ ہو سکتے تھے۔ انگیٹھی میں کم سے کم گرم راکھ تو تھی۔ دونوں خاموش تھے، دونوں صبر کے پتلے اور صبر بھی کیسا؟ بے عذر، ان کی زبان پر نہ زمانہ کا شکوہ تھا۔ نہ مرنے والوں کا ذکر غم! ان کا سارا وقت مضاف حیات میں صرف ہوتا تھا۔ موت دروازہ پر کھڑی دستک دے رہی تھی۔ باتوں کی کہاں فرصت، فردا ہی نہ ہو تو غم کس کا۔

بڑھیا نے بڑی دیر کے بعد پوچھا کل کے لیے سن تو ہے ہی نہیں، کیا ہوگا؟

جا کر جھگڑو ساہ سے اُدھار لاؤں گا۔

اس نے پہلے کے پیسے تو ابھی دیے ہی نہیں ادھار نہ دے گا۔

نہ دے گا نہ سہی، گھاس تو کہیں نہیں گئی ہے۔ دوپہر تک کیا دو آنہ کی بھی نہ چھیل سکوں گا۔ اور کیا کرنا ہے۔

اتنے میں ایک آدمی نے دروازہ پر آواز دی۔ بھگت کیا سوگئے کیا؟ ذرا کواڑ کھولو۔ میں ہوں منگلی۔

بھگت نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ منگلی نے کوٹھری میں آکر کہا۔ کچھ سنا چڈھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا؟

بھگت نے چونک کر سر اٹھایا چڈھا بابو کے لڑکے کو؟ وہی چڈھا بابو ہیں نہ جو بنگلے میں رہتے ہیں، پورب طرف۔

منگلی نے کہاں ہاں ہاں وہی۔ نامی آدمی ہیں چاروں اور ہلا مچا ہوا ہے۔ جاتے ہو وہاں؟ آدمی بن جاؤ گے!

بوڑھے نے بے رحمانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ میں نہیں جاتا میری بلا جائے۔ وہی چڈھا ہیں کھوب(خوب) جانتا ہوں، آدمی نہیں کسائی (قصائی) ہے آج آٹھ سال ہوئے......

بڑھیا نے تصحیح کی، نواں لگا ہے۔

بوڑھا۔ ہاں نواں سال ہے، میں پنا کو لے کر دکھانے گیا تھا۔ کھیلنے جا رہے تھے۔ پیروں پر گر پڑا کہ ایک نجر (نظر) دیکھ لیجیے مگر اس نے بات تک نہ سنی۔ بھگوان بیٹھے سن رہے تھے۔ اب معلوم ہوگا کہ بیٹے کا گم کیسا ہوتا ہے۔ کئی لڑکے ہیں؟

منگلی : نہیں جی یہی تو ایک لڑکا ہے۔ سنا ہے سب لوگوں نے جواب دے دیا۔ گنگو گوالا، مدو بہنا منے مصر سب ہار کر چلے آئے۔

بوڑھا : بھگوان بڑا کارساج ہے۔ ارے تم سے کیا کہوں، اس کے پیروں پر گر کر رویا۔ اس کے پیروں پر پگڑی اتار کر رکھ دی۔ مگر اسے جرا(ذرا) بھی دیا نہ آئی۔ میں تو اس کے دروجے(دروازے) پر ہوتا تب بھی بات نہ پوچھتا، ایسے لوگوں کی یہی سجا(سزا) ہے۔

منگلی : تو نہ جاؤ گے؟ ہم نے تو سنا تھا تم سے کہہ دیا۔

بوڑھا: بہت اچھا کیا۔ سن کر کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا، آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ تم جاؤ، آج چین کی نیند سوؤں گا (بڑھیا سے) جرا تماکو لے لے۔ ایک چلم اور پیوں گا۔ اب معلوم ہوگا لالہ کو، ساری صاحبی بھول جائے گی، ہمارا کیا بگڑا، کچھ لڑکے کے مر جانے سے راج تو نہیں چلا گیا۔ تمھارا تو راج سونا ہو جائے گا۔ اسی لڑکے کے واسطے سب کا گلا دبا دبا کر دھن جوڑا تھا نہ، اب کیا کروگے؟

منگلی چلا گیا، بھگت نے چلم اٹھائی اور پڑوس کے حلوائی کی بھٹی سے آگ رکھ لایا، پھر کواڑ بند کر کے اطمینان سے چلم پینے لگا۔

بڑھیا نے کہا۔ اتنی رات گئے جاڑے پالے میں بھیجنے آیا تھا، موئے کو شرم بھی نہ آئی۔

بوڑھا: رات نہیں دوپہر بھی ہوتی تو میں نہیں جاتا، اس کی سواری دروازے پر آتی تو بھی نہ جاتا۔ بھول نہیں گیا ہوں، پنا کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اس نرموہی نے ایک نجر بھی تو نہیں دیکھا۔ کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ نہ بچے گا؟ کھوب جانتا تھا، وہ بھگوان نہیں تھا کہ اس کے ایک نجر دیکھ لینے سے امرت برس جاتا۔ نہیں، کھالی من کی دوڑ تھی۔ جرا تسکین ہو جاتی۔ بس اسی لیے اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ اب کسی دن پھر جاؤں گا اور کہوں گا۔ کیوں صاحب! کہیے کیا رنگ ہے؟ دنیا مجھے برا کہے گی۔ کہے، کوئی پروا نہیں۔ چھوٹے آدمیوں میں تو سب عیب ہوتے ہی ہیں۔ بڑوں میں کوئی عیب نہیں ہوتا، وہ دیوتا ہوتے ہیں......

اتنی سال کی عمر میں بھگت کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ ایسے سانحے کی خبر سن کر بھی وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ماگھ پوس کی اندھیری رات، جیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور لو، ساون بھادوں کے موسلادھار مینہ، کسی کی اس نے کبھی پرواہ نہ کی۔ وہ فوراً گھر سے نکل پڑتا تھا۔ بے منت، بے غرض، معاوضہ کا خیال کبھی دل میں آیا ہی نہیں، نہ کبھی کسی نے کچھ دیا ہی۔ یہ معاوضہ کا کام ہی نہ تھا۔ جان کا کیا معاوضہ۔ یہ ایک کار ثواب تھا۔ اسے جو وڈیا آتی تھی اس کا لازمی استعمال۔ سیکڑوں مایوسوں کو اس کے منتروں نے زندگی عطا کر دی تھی، پر آج وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ اپنے

کانوں سے یہ خبر سن کر بھی اطمینان سے سونے کی کوشش کر رہا ہے۔
بڑھیا نے کمبل اوڑھ کر لیٹتے ہوئے کہا۔ تما کو کے ڈھائی پیسے ہوگئے۔ آج دیتی ہی نہ تھی۔
بھگت نے کپی بجھائی اور کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا۔ بعد ازاں لیٹ گیا، یہ خبر اس کے جگر پر بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے، جیسے سارے کپڑے گیلے ہو گئے ہیں، یا پیروں میں کیچڑ لگا ہوا ہے جیسے کوئی اس کے دل کے اندر بیٹھا ہوا اسے گھر سے نکلنے کے لیے تحریک کر رہا ہے۔ بڑھیا ذرا دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بوڑھے بولتے بولتے سو جاتے ہیں اور چوہے کا رینگنا سن کر جاگ اٹھتے ہیں۔ بھگت کو جب اطمینان ہوگیا کہ بڑھیا سو گئی ہے تو وہ اٹھا، اپنی لکڑی ٹٹول کر اٹھائی اور دھیرے سے کواڑ کھولے۔
بڑھیا چونک پڑی، بولی۔ کہاں جاتے ہو؟
'کہیں نہیں' دیکھتا تھا کتنی رات گئی ہے۔
ابھی بہت رات ہے، سو جاؤ۔
'نیند نہیں آتی"
"نیند کاہے کو آئے گی، من تو چڈھا بابو کے گھر پر لگا ہوا ہے۔'
چڈھا بابو نے میرے ساتھ ایسی کون سی نیکی کر دی ہے جو وہاں جاؤں۔ وہ آکر پیروں پڑیں تب بھی نہ جاؤں۔
مانو چاہے نہ مانو، پر تم اٹھے اسی ارادہ سے تھے۔
نہیں ری، ایسا پاگل نہیں ہوں کہ جو مجھے کانٹے بوئے اس کے لیے پھول بوتا پھروں۔
بڑھیا پھر سو گئی، بھگت نے کواڑ لگا دیے اور پھر آکر بیٹھا، مگر اس کے دل کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو رات کو کسی اجنبی کی آہٹ پاکر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکنا نہیں چھوڑتا۔ زور سے چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غراتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اسے اپنی پوری طاقت سے روک رہا تھا پر اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اڑے ہوئے پتے کی طرح اس بدنصیب نوجوان کی

طرف اڑا جارہا تھا جو اس وقت مر رہا تھا اور جس کے لیے ایک ایک لمحہ کی دیر بازیافت کے امکان کو اور دور ٹال رہی تھی۔

اس نے پھر کواڑ کھولے۔ اتنے آہستہ سے کہ بڑھیا کو خبر نہ ہوئی۔ باہر نکل آیا، اسی وقت محلّہ کا چوکیدار گشت لگا رہا تھا۔ بولا، کیسے اٹھے بھگت آج تو بڑی سردی ہے کہیں جارہے ہو کیا؟

بھگت نے کہا، نہیں جی جاؤں گا کہاں۔ دیکھتا تھا کہ ابھی کتنی رات ہے، بھلا کئے بجے ہوں گے؟

ایک بجا ہوگا اور کیا، ابھی تھانے سے آرہا تھا تو چڈھا کے بنگلے پر بڑی بھیڑ لگی تھی ان کے لڑکے کا حال تو تم نے سنا ہوگا۔ کالے نے چھو لیا ہے، چاہے مر بھی گیا ہو، تم چلے جاؤ تو سائت (شاید) بچ جائے۔ سنا دس ہجار (ہزار) تک دینے کو تیار ہیں۔ نہ دس ہجار دیں گے دس سو تو دیں گے۔

میں تو نہ جاؤں گا چاہے وہ دس لاکھ بھی دیں، مجھے دس ہجار لے کر کرنا ہی کیا ہے، کل کو مر جاؤں گا تو کون بھوگے گا۔ میں تو ان کے درواجے پر ہوتا تب بھی نہ جاتا، ایسے بیدردوں کی سجا یہی ہے۔

چوکیدار چلا گیا۔ بھگت نے آگے پیر بڑھائے، جیسے کسی مخمور آدمی کا اپنے فعلوں پر قابو نہیں ہوتا۔ وہ کہتا کچھ ہے زبان سے نکلتا کچھ ہے۔ وہ اپنی دانست میں پاؤں سنبھال کر رکھتا ہے پر وہ لغزش کرتے ہیں وہی حالت بھگت کی تھی۔ نفس انتقام پر تلا ہوا تھا پر عمل پر اس کا قابو نہ تھا۔ جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی وہ ارادہ کرنے پر بھی تلوار نہیں چلا سکتا اس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔

دو میل کا راستہ تھا۔ بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا چلا جاتا ادراک ثانی اولیٰ پر حاوی تھا۔ اولیٰ روکتا تھا، ثانی ٹھیلتا تھا۔ آدھا راستہ طے ہو جانے پر یکایک بھگت رک گیا۔ نفس نے قوت عمل پر فتح پائی۔ ارے! میں اتنی دور چلا آیا! ااس جاڑے پالے میں مجھے مرنے کی ضرورت کیا تھی۔ آرام سے پڑا کیوں نہ رہا نہ نیند آتی دوچار بھجن ہی گاتا۔ ناحق اتنی دور دوڑا، چڈھا کا لڑکا رہے یا جائے، میری بلا سے مجھے کیا کرنا ہے۔ دنیا میں ہزاروں مرتے ہیں ہزاروں جیتے ہیں۔ مجھے کسی کے مرنے جینے سے مطلب۔

جس نے میرے ساتھ ذرا بھی سلوک نہیں کیا۔ اس کے ساتھ میں کیوں سلوک کروں؟

مگر نفس کی یہ فتح عارضی تھی۔ وہ ادراک ثانی جو اسے اتنی دور لایا تھا ایک دوسری ہی صورت میں نمودار ہوا جو نفس سے بہت متشابہ تھا۔

میں وہاں کچھ سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ ذرا دیکھوں گا، لوگ کیا کرتے ہیں۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا پیٹنا دیکھوں گا۔ کس طرح سر پیٹتے ہیں کس طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں۔ ذرا دیکھوں گا بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں یا صبر کر جاتے ہیں۔ وہ لوگ تو وِدوان ہوتے ہیں۔ من میں سمجھ کر رہ جاتے ہوں گے۔

اس طرح نفس کو دھوکا دیتا ہوا۔ شیطان کو بہکاتا ہوا وہ چلا جارہا تھا کہ دو آدمی راستہ سے گزرے۔ دونوں ڈاکٹر چڈھا ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک نے کہا چڈھا بابو کا گھر اجڑ گیا۔ دوسرا بولا کسل بھی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا۔ بھگت کی چال اور بھی تیز ہوگئی۔ ضعف کے مارے قدم نہ اٹھتے تھے۔ مگر ہمت ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ سر کا حصہ اتنا آگے بڑھا جاتا تھا گویا اب منہ کے بل گر پڑے گا۔ اس طرح کوئی بیس منٹ چلا ہوگا کہ ڈاکٹر صاب کا بنگلہ نظر آیا۔ بجلی کی بتیاں روشن تھیں۔ مگر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نالہ وُشیون کی صدائیں بھی نہ سنائی دیتی تھیں۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں دیر تو نہیں ہوگئی۔ وہ دوڑنے لگا۔ اپنی عمر میں وہ اتنا تیز کبھی نہ دوڑا تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا گویا اس کے پیچھے موت دوڑی آرہی ہے۔

(4)

کیلاش بے جان پڑا ہوا تھا۔ جسم ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت باقی نہ تھی۔ مگر کوئی بلند آواز سے نہ روتا تھا۔ گریۂ خاموش ڈوبنے والی امید کی آخری شعاع تھی۔

یکا یک بھگت نے برآمدہ میں پہونچ کر پکارا۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کوئی مریض آیا ہوگا۔ کسی اور وقت انھوں نے اس آدمی کو دتکار دیا ہوتا۔ رات کے وقت وہ کسی مریض کو نہ دیکھتے تھے۔ مگر آج وہ فوراً گھر میں سے نکل آئے اور رقت آمیز انداز سے بولے۔ کیا ہے بھئی، آج تو ہمارے اوپر ایسی مصیبت آپڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں

بنتا۔ پھر کبھی آنا۔

بھگت نے کہا۔ سب حال سن چکا ہوں بابو صاحب۔ اسی لیے تو آیا ہوں۔ جرا میں بھی دیکھ لوں چھوٹے بھیا کہاں ہیں۔ بھگوان بڑا کارساج ہے۔ کون جانے اب بھی اسے دیا آجائے۔

ڈاکٹر چڈھا نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ اچھی بات ہے چلو دیکھ لو۔ تین چار گھنٹے ہوگئے ہیں۔ ہم تو نراش ہوگئے۔

بھگت نے اندر جاکر ایک منٹ تک لاش کو دیکھا تب مسکرا کر بولا ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے بابو جی واہ! نارائن چاہیں گے تو آدھ گھنٹہ میں بابوجی آٹھ بیٹھیں گے۔ جرا کہاروں سے کہیئے پانی تو بھریں۔

بوڑھے کا لہجہ اتنا یقین انگیز تھاکہ ڈاکٹر صاحب کو کچھ امید پیدا ہوگئی۔ بولے، بوڑھے بابا بس یہی سمجھ لیجیے کہ ہم سب عمر بھر آپ کے غلام بنے رہیں گے۔ اس لڑکے پر ہم اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔

مسز چڈھا نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ دادا یہی ہماری جنم بھر کی کمائی ہے بس اور کیا کہوں۔

بوڑھے بھگت کے پاس ایک ایسی جڑی تھی کہ سانپ کیسا ہی زہریلاہو اس کا زہر زائل ہوجاتا تھا۔ اس جڑی کے ساتھ ہی وہ ایک منتر بھی پڑھتا تھا۔ اس منتر میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ پہلے ہی دم میں مارگزیدہ کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ بھگت کو اپنے ردِ زہر کی طاقت پر پورا اعتماد تھا۔ آج تک اسے کبھی ناکامی نہ ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اس قسم کی خبر پاتے ہی اضطراری طور پر گھر سے نکل پڑتا تھا۔ وہ آدھ گھنٹہ تک کھڑا منتر پڑھتا رہا۔ ایک بار منتر ختم ہوجانے پر وہ کیلاش کو جڑی سنگھا دیتا تھا۔ ادھر کہار لوگ کیلاش کے سر پر پانی انڈیلتے چلے جاتے تھے۔ دوبجتے بجتے کیلاش نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھا۔

بھگت نے پوچھا۔ بابو یہاں کسی کو پہچانتے ہو؟

کیلاش نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا۔ ہاں صاحب۔ سب کو پہچانتا ہوں۔ وہ پاپا ہیں یہ ماماہیں۔ وہ مرنالنی ہیں۔

مسز چڈھا بھگت کے پیروں پر گر پڑیں۔ ڈاکٹر چڈھا دوڑ کر کیلاش کے گلے سے لپٹ گئے۔ چاروں طرف سے احباب نے مبارک باد دینا شروع کیا۔ بھیتر باہر ہلچل مچ گئی۔ کمرہ میں دوستوں کا ایسا ہجوم ہوا کہ تل رکھنے کی بھی جگہ نہ رہی۔ ہر شخص بھگت کے درشنوں کا مشتاق تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لپک کر اپنی سیف کھولا اور گنیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی نکال لائے۔ وہ اسے بھگت کے پیروں پر رکھ دینا چاہتے تھے۔ مگر جب تھیلی لے کر کمرہ میں پہنچے تو بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف بھگت کی تلاش ہونے لگی۔ کہاں گئے۔ کہاں گئے ابھی تو یہیں کھڑے تھے۔ بھیتر باہر سب جگہ چھان ڈالی گئی مگر بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

مسز چڈھا نے کہا کوئی دیوتا تھا۔

احباب نے کہاں ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

پھر جشن شروع ہوا۔ نغمہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور باجے بجنے لگے۔

(یہ افسانہ کانپور کے اردو ماہنامہ 'زمانہ' کے فروری 1928 اور 'وشال بھارت' کے مارچ 1928 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اردو میں 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔ ہندی میں 'مان سروور' 5 میں شامل ہے۔)

موٹے رام جی شاستری کا نیراشیہ

(1)

جس طرح لوگ نائی کو ٹھاکر، چمار کو چودھری اور مہتر کو جمعدار کہتے ہیں اسی طرح گھسیٹے پرچون والے کو لوگ سیٹھ کہا کرتے تھے۔ گھسیٹے خود تو کریا اچھر (لفظ) بھینس برابر تھا پر انیہ بزرگھر پتاؤں کی بھانتی اسے بھی اپنے لڑکے کو ودیا سے النکرت کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ کئی مہینوں کے کٹھن محنت کے بعد اس نے سو تک گنتی سکھا دی تھی، پر ورن مالا سکھانے کے لیے تو کسی گرو جی کا ہونا ضروری تھا۔ کرپنتا کے کارن وہ کئی مہینوں سے اسی سمسیا کو ٹالتا آتا تھا، پر آج اس نے پاٹی پوجا کرنے کا نشچے کرلیا۔ سائت پہلے ہی پوچھ رکھی تھی۔ سیٹھانی سے بولا۔ ''پجائی تو ایک روپیہ سے کم نہ لگے گی۔''

سیٹھانی : ''ایک روپیہ کیوں لگے گی، کوئی لوٹ پڑی ہے؟ تین اچھر بتا دینے کا ایک روپیہ۔ کس پنڈت کے پاس جاؤگے؟''

سیٹھ : میرے من میں تو موٹے رام جچے ہوئے ہیں۔ اس طرح تو اور بھی کئی پنڈت ہیں پر موٹے رام کی بات اور ہے۔''

سیٹھانی : ''تو ان کے لیے روپیہ کا کیا کام ہے؟ بھر پیٹ لڈو کھلا دینا۔''

سیٹھ : ''تو کیا لڈو چار روپے سے کم کھائیں گے؟ اس طرح تو ایک ہی روپیہ میں پنڈ چھوٹ جائے گا۔''

رائے پکی ہوگئی۔ سیٹھانی نے بالک کو نہلایا۔ کپڑے پہنائے ہاتھوں میں سونے کے چوڑے، کانوں میں بالیاں۔ پاؤں میں چاندی کی کڑے، ماتھے پر کاجل کی ٹیکہ لگا دیا۔ اُدھر سیٹھ جی نے کرتا ڈاٹا، پگڑی باندھی اور سوکھے ہوئے جوتوں کو پانی سے نرم کر کے ان میں پاؤں ٹھونس دیا۔ بالک نے انھیں جوتے پہنتے دیکھا تو مچل پڑا کہ مجھے بھی جوتے لا دو۔ ایک روپے کا پرشن تو سامنے تھا ہی اس پر یہ نئی ضد۔ سیٹھ جی کو کرودھ آگیا۔ بالک کو تمانچے لگائے اور گھسیٹتا ہوا گرو دھام کی اُور لے چلا۔

(2)

دیوتاؤں کی اپاسنا کبھی نشپھل نہیں جاتی، پھر پنڈت موٹے رام جی کی منو کامنا کیوں نہ پوری ہوتی۔ ان کی پہنچ تو دیوتاؤں تک ہی نہیں، ان کی دیویوں تک تھی۔ کبھی سائت وچارنے، کبھی کبھی ورش پھل بنانے کے لیے، کبھی جاپچوں کو ملانے کے لیے، کبھی درگا پاٹھ کرنے کے لیے گھروں میں ان کا بلاوا ہوتا تھا اور یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ پنڈت جی راسک جیو تھے یا نہیں، اس کی استھولتا رسکتا کے انوکول نہ تھی، پر سونا دیوی ایسے اوسروں پر بہت پرسن نہ ہوتی تھیں۔ اور پنڈت جی کو چتاونی دے دیا کرتی تھیں کہ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھالتے رہنا۔ پنڈت جی اتنے مدھور بھاشی، اتنے پرسنّ مکھ تھے اور رمنیوں کو پرسنّ کرنے کے لیے اتنے منتر جانتے تھے کہ ان کے سامنے اور کسی پنڈت کی دال نہ گلتی تھی۔ انھی کارنوں سے پنڈت جی ایک پاٹھ شالا میں 30 روپیہ ماسک کے ادھیاپک ہوگئے تھے۔

لیکن ادھیاپک ہو جانے پر موٹے رام جی کو ایک نیا انوبھو ہوا۔ اب چھوٹے موٹے نیوتوں کو سویکار کرتے انھیں سنکوچ ہوتا تھا۔ جیوں ہی وہ شالا پہنچتے، انھیں سارے شہر کی رپورٹ ملنے لگتی۔ کہاں وِدّیارمبھ ہے کہاں شرادّھ ہے کہاں وِواہ ہے۔ پنڈت جی اپنے سُوپتروں کو پرتی بدھی بنا کر من کو سمجھا لیتے تھے۔ یہ سمان اور یہ پد انھیں بڑے مہنگے داموں میں ملا تھا۔ اس لیے وہ کبھی کبھی استری سے جھنجھلا کر کہتے ”میں یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔ یہ نوکری ہے یا کٹھور دنڈ؟ اس طرح روٹی دال کھانا پڑا تو دو چار سال میں پران پکھیرو ہی اڑ جائیں گے۔ ابھی سے کچھ جھٹک چلا ہوں۔“ لیکن سونا دیوی انھیں اونچ نیچ سجھا کر شانت کرتی رہتی تھیں۔ بے چارے موٹے رام اب سوادشٹ پدارتھوں کی چرچا سن کر ہی من کو سنتشٹ کر لیتے تھے۔ آنسو کیول اس لیے پنچھ جاتے تھے کہ یہاں پنڈت جی کو کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ اونچی کلاس کے ودیارتھی نیچی کلاس والوں کو پڑھا دیتے تھے۔ پنڈت جی کا کام کیول سرو چیہ شرینی کے ایک ودیارتھی کو پڑھانا تھا اور وہ وِدّیارتھی پنڈت جی کو بہت کم کشٹ دیتا تھا۔

گھسیٹا جب پتر کو کندھے پر لیے شالا پہنچے تو پنڈت جی مسند لگائے، گدی پر لیٹے ہوئے شِشیوں سے اپنی گدگدی دیہہ میں مکیاں لگوا رہے تھے۔ ایک یُوک ان کے

تلوے سہلا رہا تھا۔ دو کھڑے پنکھا جھل رہے تھے اور ایک لڑکا ان کے سر میں تیل ڈال رہا تھا۔ پنڈت جی لیٹے لیٹے کاویہ ساہتیہ پر لیکچر دے رہے تھے۔ جس بھانتی سواد میں شٹ رس ہیں، اسی بھانتی کاویہ میں نورس ہیں۔ سواد کے رسوں میں جیسے مشٹ رس سرو پردھان ہے، اسی بھانتی کاویہ کے نو رسوں میں شرنگار سرو شریشٹھ ہے۔ جس طرح مشٹھ رس کے انتر گت انیکوں پدارتھ ہیں، اسی بھانتی شرنگار رس کے انتر گت انیکوں نایکائیں ہیں اور جس بھانتی مشٹھ پدارتھوں میں موتی چور کے لڈو سروتم ہیں، اسی بھانتی نائکاؤں میں مگدھا سرو پردھکان ہے۔ میں مگدھا پُرمگدھ ہوں۔''۔ سہسا گھسیٹے نے بھیتر آکر پنڈت جی کو ساشٹانگ دنڈوت کی۔

موٹے : ''آشیرواد، آشیرواد! کہو کیسے چلے سیٹھ ! یہ کیا چھوٹے سیٹھ ہیں؟''

گھسیٹے : ''ہاں مہاراج، آپ کا غلام ہے۔ اس کی پاٹی پجانا چاہتا ہوں۔''

موٹے : ''ہاں۔ ہاں، اوشیہ پجاؤ۔ ودیا سے اُتم کوئی وستو نہیں۔

گھسیٹے : ''تبھی تو آپ کی سرن آیا ہوں، مہاراج! ایسی کرپا کیجیے کہ چار اچھر پڑھ جائے۔

موٹے : ''گرو جنوں کی دیا چاہیے کیول کچھ خرچ کرنا پڑے گا۔''

گھسیٹے : ''خرچ کرنے کو تو میں تیار ہوں مہاراج۔''

موٹے : ''ہاں۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ چنتامنی جی، یہاں تک کشٹ کیجیے۔ یہ سیٹھ گھسیٹے مل جی ہیں۔ ان کے سپوتر کا وِدّیارمبھ ہوگا۔ اس شبھ اوسر پر یہ گروجنوں کا ستکار کرنا چاہتے ہیں۔''

چنتا : ''اہو بھاگیہ! دھنیہ ہے، دھنیہ ہے! ایسی ہی پُن آتماؤں سے تو سرشٹی تھمی ہوئی ہے۔ نہیں تو یہ پرتھوی کب کی رساتل چلی گئی ہوتی۔ تو سیٹھ جی، کتنے براہمنوں کو جمایئے گا؟

موٹے : ''سیٹھ جی آپ ویرتھ یہ پرشن کرتے ہیں۔ مجھ سے سمھاشن کیجیے، دوادش کی سنکھیا بہت کی منگل ہے۔''

چنتا : ''سمجھ گیے سیٹھ جی ! بارہ مہاتماؤں کے جمانے کا پربندھ کیجیے۔''

موٹے : ''آپ ساگری کا انومان کیجیے، سیٹھ جی لکشمی پتر ہیں۔ کوئی دس سیر امیرتی

پریاپت ہوں گی۔

چنتا : "دس سیر، اتنی تو میرے کو اکیلے..........."

موٹے : متروں، مٹھیا بھاشن ورجت ہے۔ اچھا کلاقند کتنا چاہیے؟"

چنتا : "مجھے تو بولنے ہی نہیں دیتے۔"

موٹے : "نہیں نہیں! اس وشے میں آپ اپنے وچار سمپورن سوا دھینتا سے پرکٹ کر سکتے ہیں۔"

چنتا : "من بھر کلا قند رکھیے۔"

موٹے : (ہنس کر) "نہیں نہیں، ہمیں اپنے یجمان پر اتنا گرو بھار نہ ڈالنا چاہیے۔ دس سیر کلاقند بھی رکھ لیجیے۔"

چنتا : "تو پھر تم میرے سے کیوں پوچھتے ہو؟ نہ معلوم تمھارا کیا سوبھاؤ ہے کہ جب کوئی آکھیٹ پھنستا ہے، تو تم اسے..........."

موٹے : "بیرتھ پرجولت نہ ہو متروں! ایسے دشکر کاریوں کا سمپادن کرنے کے لیے بڑے انو بھو کی آوشیکتا ہے۔ موتی چور کے لڈو کتنے ہوں؟"

چنتا : "میں کچھ نہیں جانتا۔"

موٹے : "روشٹ نہ ہو متروں! شپتھ کھا کر کہتا ہوں اب کی تمھاری پرستاوت ماترا ہی سویکار کروں گا۔"

چنتا : "تو سیر بھر رکھ لو۔"

موٹے : "مہان مورکھ ہو متروں، اس دیو درلبھ پدارتھ کا یہ اپمان تم جیسے سہ ہردے پُروش کو شوبھا نہیں دیتا۔ اسے بیس سیر رکھ لو۔"

اس طرح آپس میں ایک تخمینہ بنا کر موٹے رام نے سیٹھ جی کو سب بیورا بتا دیا۔ ایک ایک روپیہ دکچھنا کا پرستاؤ بھی کیا۔ بے چارے گھسیٹے نے یہ تخمینہ سنا تو چکر میں آگیا۔ اسے تو ایک ہی روپیہ اکھر رہا تھا۔ بولا "میری تو اتنی سامرتھ نہیں ہے۔"

موٹے : "ایسا نہ کہو لکشمی پُتر ایسا نہ کہو، بھگوان نے تمھیں سب کچھ دیا ہے۔ تمھارا بالک بڑا بھاگوان ہے۔ کل کا نام کرے گا تو سب مورتیاں آٹھ بجتے بجتے پہنچ جائیں گی۔"

گھسیٹے : "مہاراج میں تو بہت..."

موٹے : "ہاں ہاں پرسنیہ ہونے کی تو بات ہی ہے۔ وپروں اور ودوانوں کے چرن جہاں جاتے ہیں۔ وہ ستھان سورگ تلیہ ہو جاتا ہے۔

گھسیٹے : مہاراج مجھ سے تو کچھ کہتے نہیں بنتا آپ نے میری دوکان تو دیکھی ہے۔ بکری بٹا بھی آج کل مندا ہے۔

موٹے : اس نیک کام سے تمھارا سب دکھ درد دور ہو جائے گا وپر سیوا ہی کلپ ورکش ہے۔ جلد ہی انتظام کرنا، ہمیں دیر نہ ہوگا۔

بے چارہ گھسیٹے پھر کچھ نہ کہنے پایا، کیوں کہ موٹے رام جی اپنے خیال میں اسے کافی طور پر تیار کر کے پھر کاویہ، ساہتیہ، پرو کپتر تا دینے لگے۔

(3)

نیت سے پر جب سب لوگ بھوجن کرنے چلے تو مارے آنند کے پھولے نہ سماتے تھے۔ بارہ کی سنکھیا پوری کرنے کے لیے پانچ وِدّیار تھیوں کو پاٹھ شالا سے لے لیا۔ صلاح ہوئی کہ وید منتر گاتے ہوئے گھسیٹے کے گھر چلیں۔ شاشتری جی نے وِدّھیار تھیوں کو اس وِشے میں اتنا ابھیست کر دیا کہ جو لوگ شالے آ جاتے وہ سنگیت سن کر ہی مست ہو جاتے تھے۔ پھر انھیں اس شالا سے بھگتی ہو جاتی تھی۔ اسی چال سے شاشتری جی نے اچھی کھیاتی پراپت کی تھی۔ اس وقت بھی وِدّیار تھوں کا سنگیت سن کر کھڑے ہو ہو کر دیکھنے لگے۔ ایک درشک نے کہا"شاشتری جی کے دم کا جلوس ہے"۔

دوسرا بولا، "کیا بات ہے، جب سے شاشتری جی آئے پاٹھ شالا کے بھاگ جاگ گئے۔

نُکّڑ کے نزدیک پہنچ کر موٹے رام نے چنتا منی سے کہا، دیکھو، کچھ پرکاش ہے سامنے!"

چنتا منی : "مجھے تو کوئی پرکاش نہیں دیکھتا۔"

موٹے : "ہے کیوں نہیں۔ تمھیں سوجھتا ہی نہیں۔ گیس کا ہنڈا جل رہا ہے۔ کچھ بات چیت سنائی دیتی ہے نا؟"

چنتا : ”کیا جانے مجھے تو سناٹا سا معلوم ہوتا ہے۔“

موٹے : ”تمھارا سر! مجھے تو آدمیوں کی بول چال صاف سنائی دیتی ہے۔ لو پہنچ ہی گئے۔ جی چاہتا ہے دوڑ کر اندر چلا جاؤں۔ جس طرح فراق کا مارا ہوا عاشق اپنی معشوقہ کے نزدیک پہنچتے ہی بے قرار ہو جاتا ہے اسی طرح میرا دل بھی بے قرار ہو رہا ہے۔ مگر یہ بات کیا ہے؟ یہاں تو سچ مچ سناٹا ہے۔ شاید گھر ہوگا۔

چنتا : ”دوار کھٹکھٹاؤں؟ مگر یہاں تو تالا پڑا ہوا ہے۔“

موٹے رام نے پڑوس کے دکاندار سے پوچھا تو اس نے کہا، ”سانجھ تک تو گھر ہی میں تھے۔ اس بکھت کی نہیں جانتے۔ دیکھیے، ہوں گے گھر ہی میں۔“

پنڈت موٹے رام نے اتنے زور سے کواڑ کھٹکھٹائے کہ سارا گھر ہل اٹھا، مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔

الگو نے کہا ”تالا توڑ ڈالوں۔“

موٹے : ”نہیں نہیں تالا نہ توڑو۔ ممکن ہے سامان لینے بازار گیا ہو۔“

دونوں پنڈت دروازے کی چوکھٹ پر جا بیٹھے دوسرے وِدّیارتھی ادھر ادھر ٹہلنے لگے مگر اس طرح راہ دیکھتے دیکھتے پورا ایک گھنٹہ ہوگیا تو چنتا منی نے جھنجھلا کر کہا۔

”مجھے تو معلوم ہوتا ہے، دُشٹ نے دھوکہ دیا ہے۔“

موٹے : ”ہاں اب تو مجھے بھی سندیہہ ہوتا ہے۔“

چنتا : ”اس سمے دُشٹ مل جاتا تو گردن دبا لیتا۔ دُھورت! ابے او گھسیٹے بے! نکل باہر! کہاں منہ چھپائے بیٹھا ہے؟“

اس پر پانچوں وِدّیارتھیوں نے چلا چلا کر گھسیٹے کو گستاخ، پاپی، چنڈال کہنا شروع کیا۔

الگو : ”سسر کے منہ میں کالکھ لگی ہوئی ہے۔“

چنتا : ”ایشور کرے، اس کا سروناش ہو جائے۔“

بھوانی : ”مرے گا تو اس کا جنم چھچھوندر کا ہوگا۔“

الگو : ”گدھا ہوگا سسر، رینکتا پھرے گا۔“

موٹے رام چپ بیٹھے تھے۔ مارے غصے، شرم، اور حیا کے ان کا سر نیچے جھکا ہوا

تھا۔ آخر میں وہ دھیرے سے اٹھے اور بولے، "تو اب چلنا چاہیے۔"

الگو : "کہیے تو اس گھر میں آگ لگا دوں؟"

بھوانی : "پتھر پھینکا جائے۔"

موٹے : نہیں بچہ، یہ براہمنوں کا کرتویہ نہیں۔ اس کی سچا کا دنڈ اسے بھگوان دیں گے۔ ہم نے چھما کیا۔

یہ کہتے کہتے شاشتری جی کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے،اپنے جیون میں وہ کبھی اتنے بے عزت نہ ہوئے تھے۔

چنتا منی نے سمجھایا۔ "بھیا آپ خواہ مخواہ دل چھوٹا کر رہے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ ہم لوگوں کو سمجھائیں،سو آپ ہی رونے لگے۔ ایشور نے جو نصیب میں لکھا ہے وہ تو پورا ہو کر ہی رہے گا۔ لیکن دیکھ لیجیے گا اس کی کسر جلد ہی نکل جائے گی۔"

موٹے رام نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، "کیا کسر نکل جائے گی دوست! یہ زخم کبھی نہ بھرے گا۔ ہم لوگ بھی کتنے ابھاگے ہیں کہ بھوجن کے لیے دوسروں کا منہ تاکتے ہیں! اس وقت ایسا جی چاہتا ہے کہ چاہے مر جاؤں لیکن پاٹھ شالے کی صورت نہ دیکھوں۔ جو پوروشارتھ (مردانگی) پرانی اپنے سے اچّھا نوشار بھوجبھی نہ پراپت کر سکے، اس کا جیون نرر تھک ہے۔ میں نے حکام کی جتنی خوشامد کی، رئیسوں کا جتنا لیش گایا، اس کی آدھی لگن سے کوئی اور کام کرتا تو آج آدمی بن گیا ہوتا۔ آج اس دھورت گھسیٹے نے میری آنکھیں کھول دیں۔"

چنتا : دیکھو آج سونا بھابی کیا کہتی ہیں۔"

موٹے : میرے تو ابھی سے پاؤں تھرتھرا رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو کہیں منہ دکھانے یوگیہ نہیں رہا۔ سونا جینا نہ چھوڑے گی۔

(پہلی اشاعت ہندی میں "سمالوچک" (ہندی پتریکا) مارچ، اپریل 1928 میں شائع ہوئی۔ پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ کھنڈ 1 میں شامل ہے۔)

نادان دوست

(1)

کیشو کے گھر میں ایک کارنس کے اوپر ایک چڑیا نے انڈے دیے تھے۔ کیشو اور اس کی بہن شیاما دونوں بڑے غور سے چڑیا کو وہاں آتے جاتے دیکھا کرتے۔ سویرے دونوں آنکھیں ملتے کارنس کے سامنے پہنچ جاتے اور چڑا اور چڑیا دونوں کو وہاں بیٹھا پاتے ان کو دیکھنے میں دونوں بچوں کو نہ معلوم کیا مزہ ملتا تھا۔ دودھ اور جلیبی کی بھی سدھ نہ رہتی تھی۔ دونوں کے دل میں طرح طرح کے سوال اُٹھتے۔ انڈے کتنے بڑے ہوں گے؟ کس رنگ کے ہوں گے؟ کتنے ہوں گے۔ کیا کھاتے ہوں گے۔ ان میں سے بچے کس طرح نکل آئیں گے۔ بچوں کے پر کیسے نکلیں گے۔ گھونسلا کیسا ہے۔ لیکن ان باتوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ نہ اماں کو گھر کے کام دھندوں سے فرصت تھی۔ نہ بابو جی کو پڑھنے لکھنے سے۔ دونوں بچے آپس میں ہی سوال جواب کر کے اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے۔

شیاما کہتی۔ "کیوں بھیا! بچے نکل کر پھر سے اُڑ جائیں گے؟"

کیشو : عالمانہ غرور سے کہتا۔ نہیں رہی پگلی۔ پہلے پر نکلیں گے۔ بغیر پروں کے بچارے کیسے اُڑیں گے۔"

شیاما : "بچوں کو کیا کھلائے گی بچاری؟"

کیشو اس پیچیدہ سوال کا جواب کچھ نہ دے سکتا تھا۔

اس طرح تین چار دن گزر گئے۔ دونوں بچوں کی خواہش تحقیق دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ انڈوں کو دیکھنے کے لیے وہ بیتاب ہو اُٹھتے تھے۔ انھوں نے قیاس کیا:

"اب ضرور بچے نکل آئے ہوں گے"۔ بچوں کے چارے کا سوال اب ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ چڑیا بچاری اپنا دانہ کہاں پائے گی کہ سارے بچوں کا پیٹ بھرے۔ غریب بچے بھوک کے مارے چوں چوں کر کے مر جائیں گے۔

اس مصیبت کا اندازہ کر کے دونوں گھبرا اُٹھے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ کارنس

پر تھوڑا سادانہ رکھ دیا جائے۔ شیاما خوش ہو کر بولی۔ ”تب تو چڑیوں کو چارے کے لیے کہیں آنا جانا نہ پڑے گا؟

کیشو : ”نہیں، تب کیوں جائیں گی۔ “

شیاما : کیوں بھیا! بچوں کو دھوپ نہ لگتی ہوگی؟“

کیشو کا دھیان اس تکلیف کی طرف نہ گیا تھا۔ بولا۔ ”ضرور تکلیف ہو رہی ہوگی؟ کیا پیاس کے مارے تڑپتے ہوں گے اوپر سایہ بھی تو کوئی نہیں۔

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ گھونسلے کے اوپر کپڑے کی چھت بنا دینی چاہیے۔ پانی کی پیالی اور تھوڑے سے چاول رکھ دینے کی تجویز بھی منظور ہو گئی۔

دونوں بچے بڑے شوق سے کام کرنے لگے۔ شیاما ماتا کی آنکھ بچا کر مٹکے سے چاول نکال لائی۔ کیشو نے پتھر کی پیالی کا تیل چپکے سے زمین پر گرادیا۔ اور اسے خوب صاف کر کے اس میں پانی بھرا۔ “

اب چاندنی کے لیے کپڑا کہاں سے آئے۔ پھر اوپر بغیر چھڑیوں کے کپڑا ٹھہرے گا کیسے اور چھڑیاں کھڑی ہوں گی کیسے؟

کیشو بڑی دیر تک اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ آخرکار اس نے یہ مشکل بھی حل کر لی۔ شیاما سے بولا۔ ”جاکر کوڑا پھینکنے والی ٹوکری اٹھالاؤ۔ اماں جی کو مت دکھانا۔ “

شیاما : ”وہ تو بیچ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس میں سے دھوپ نہ جائے گی؟

کیشو نے جھنجلا کر کہا۔ ”تو ٹوکری تو لا۔ میں اس کا سوراخ بند کرنے کی کوئی حکمت نکالوں گا۔

شیاما دوڑ کر ٹوکری اٹھا لائی۔ کیشو نے اس کے سوراخ میں تھوڑا سا کاغذ ٹھونس دیا اور تب ٹوکری کو ایک ٹہنی سے لگا کر بولا:

”دیکھ! ایسے ہی گھونسلے پر اس کی آڑ کر دوں گا۔ تب کیسے دھوپ جائے گی؟“

شیاما نے دل میں سوچا ”بھیا کتنے چالاک ہیں!“

(2)

گرمی کے دن تھے۔ بابوجی دفتر گئے ہوئے تھے۔ ماتا دونوں بچوں کو کمرے میں سلا کر خود سو گئی تھی۔ لیکن بچوں کی آنکھوں میں آج نیند کہاں! اماں جی کو بہلانے

کے لیے دونوں دم روکے آنکھیں بند کیے موقعہ کا انتظار کر رہے تھے جوں ہی معلوم ہوا کہ اماں جی اچھی طرح سو گئیں۔ دونوں چپکے سے اٹھے اور بہت آہستہ سے دروازے کی چٹکنی کھول کر باہر نکل آئے۔ انڈوں کی حفاظت کی تیاریاں ہونے لگیں۔

کیشو کمرے سے ایک سٹول اٹھا لایا۔ لیکن جب اس سے کام نہ چلا تو نہانے کی چوکی لا کر سٹول کے نیچے رکھی اور ڈرتے ڈرتے سٹول پر چڑھا۔

شیاما دونوں ہاتھوں سے سٹول پکڑے ہوئے تھی۔ سٹول کی چاروں ٹانگیں برابر نہ ہونے کے باعث جس طرف زیادہ دباؤ پاتا تھا۔ ذرا سا ہل جاتا تھا۔ اس وقت کیشو کو کس قدر تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔ یہ اسی کا دل جانتا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے کارنس پکڑ لیتا اور شیاما کو دبی آواز سے ڈانٹتا۔ "اچھی طرح پکڑ۔ ورنہ اتر کر بہت ماروں گا۔" مگر بچاری شیاما کا دل تو اوپر کارنس پر تھا۔ باربار اس کا دھیان ادھر چلا جاتا اور ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے۔

کیشو نے جوں ہی کارنس پر ہاتھ رکھا دونوں چڑیاں اڑ گئیں۔ کیشو نے دیکھا کہ کارنس پر تھوڑے تنکے بچھے ہوئے ہیں اور اس پر تین انڈے پڑے ہیں جیسے گھونسلے اس نے درختوں پر دیکھے تھے۔ ایسا کوئی گھونسلا نہیں ہے۔

شیاما نے نیچے سے پوچھا۔ "کَے بچے ہیں بھیا۔"

کیشو : "تین انڈے ہیں ابھی بچے نہیں نکلے"

شیاما : ذرا ہمیں دکھا دو۔ بھیا کتنے بڑے ہیں؟

کیشو : "دکھا دوں گا۔ پہلے ذرا چیتھڑے لے آ نیچے بچھادوں۔ بچارے انڈے تنکوں پر پڑے ہیں۔"

شیاما دوڑ کر اپنی پرانی دھوتی پھاڑ کر ایک ٹکڑا لائی۔ کیشو نے جھک کر کپڑا لے لیا۔ اس کے کئی تہ کر کے اس نے ایک گدی بنائی اور اسے تنکوں پر بچھا کر تینوں انڈے آہستہ سے اس پر رکھ دیئے۔

شیاما نے پھر کہا۔ "ہم کو بھی دکھا دو بھیا؟"

کیشو : "دکھا دوں گا پہلے ذرا وہ ٹوکری تو دے دو اوپر سایہ کردوں۔"

شیاما نے ٹوکری نیچے سے تھمادی اور بولی: "اب تم اتر آؤ میں بھی تو دیکھوں۔"

کشیو نے ٹوکری کو ایک ٹہنی سے ٹکا کر کہا۔ ”جا! دانہ اور پانی کی پیالی لے آ میں اتر آؤں تو تجھے دکھاؤں گا۔“

شیاما پیالی اور چاول بھی لائی۔

کیشو نے ٹوکری کے نیچے دونوں چیزیں رکھ دیں اور آہستہ سے اتر آیا۔

شیاما نے گڑگڑاکر ”اب ہم کو بھی چڑھا دو بھیا۔“

کیشو : تو گر پڑے گی۔“

شیاما : ”نہ گروں گی بھیا۔ تم نیچے سے پکڑے رہنا۔

کیشو : ”نہ بھیا کہیں تو گر گرا پڑے تو اماں جی میری چٹنی ہی کر ڈالیں۔ کہیں کہ تو نے ہی چڑھایا تھا۔ کیا کرے گی دیکھ کر؟ اب انڈے بڑے آرام سے ہیں۔ جب بچے نکلیں گے تو ان کو پالیں گے۔“

دونوں پرندے بار بار کارنس پر آتے تھے اور بغیر بیٹھے ہی اڑ جاتے تھے۔ کیشو نے سوچا ہم لوگوں کے ڈر سے نہیں بیٹھتے۔ سٹول اٹھا کر کمرے میں رکھ آیا۔ چوکی جہاں کی تھی وہاں رکھ دی۔“

شیاما نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ تم نے مجھے نہیں دکھایا۔ میں اماں جی سے کہہ دوں گی۔“

کیشو : ”اماں جی سے کہے گی تو بہت ماروں گا۔ کہے دیتا ہوں۔“

شیاما : ”تو تم نے مجھے دکھایا کیوں نہیں؟“

کیشو : اور گر پڑتی تو چار سر نہ ہو جاتے؟

شیام : ہو جاتے ہو جاتے۔ دیکھ لینا میں کہہ دوں گی۔“

اتنے میں کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ماتا نے دھوپ سے آنکھوں کو بچاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں باہر کب نکل آئے؟ میں نے کہا تھا کہ دوپہر کو نہ نکلنا؟ کس نے کواڑ کھولا۔“

کواڑ کیشو نے کھولا تھا لیکن شیاما نے ماتا سے یہ بات نہیں کہی اسے خوف ہوا کہ بھیا پٹ جائیں گے۔ کیشو دل میں کانپ رہا تھا کہ کہیں شیاما کہہ نہ دے۔ انڈے نہ دکھائے تھے۔ اس سے اب اس کو شیاما پر اعتبار نہ تھا۔ شیاما صرف محبت کے مارے

چپ تھی اس قصور میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے۔ اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ شاید دونوں ہی باتیں تھیں۔

ماتا نے دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پھر کمرے میں بند کر دیا۔ اور آپ آہستہ آہستہ انھیں پنکھا جھلنے لگی۔ ابھی صرف دو بجے تھے۔ باہر تیز لو چل رہی تھی۔ اب دونوں بچوں کو نیند آگئی تھی۔

(3)

چار بجے یکایک شیاما کی نیند کھلی کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ وہ دوڑی ہوئی کارنس کے پاس آئی۔ اور اوپر کی طرف تاکنے لگی۔ ٹوکری کا پتہ نہ تھا۔ اتفاقاً اس کی نگاہ نیچے گئی اور وہ الٹے پاؤں دوڑتی ہوئی کمرے میں جاکر زور سے بولی۔

"بھیا! انڈے تو نیچے پڑے ہیں بچے اڑ گئے!"

کیشو گھبرا کر اٹھا اور دوڑا ہوا باہر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ تینوں انڈے نیچے ٹوٹے پڑے ہیں اور ان سے کوئی چونے کی سی چیز باہر نکل آئی ہے۔ پانی کی پیالی بھی ایک طرف ٹوٹی پڑی ہے۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ سہی ہوئی آنکھوں سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

شیاما نے پوچھا۔ "بچے کہاں اڑ گئے بھیا!"

کیشو نے افسوسناک لہجہ میں کہا۔ "انڈے تو پھوٹ گئے۔"

"اور بچے کہاں گئے؟"

کیشو : تیرے سر میں۔ دیکھتی نہیں ہے انڈوں میں سے اجلا اجلا پانی نکل آیا ہے۔ وہی تو دو چار دن میں بچے بن جاتے!"

ماتا نے سوئی ہاتھ میں لیے ہوئے پوچھا۔ "تم دونوں وہاں دھوپ میں کیا کر رہے ہو۔"

شیاما نے کہا۔ "اماں جی چڑیا کے انڈے ٹوٹے پڑے ہیں۔"

ماتا نے آکر ٹوٹے ہوئے انڈوں کو دیکھا اور غصہ سے بولی۔ "تم لوگوں نے انڈوں کو چھوا ہوگا؟"

اب تو شیاما کو بھیا پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اسی نے شاید انڈوں کو اس طرح

رکھ دیا کہ وہ نیچے گر پڑے۔ اس کی اسے سزا ملنی چاہیے بولی:
"انھوں نے انڈوں کو چھیڑا تھا اماں جی"
ماتا نے کیشو سے پوچھا۔ "کیوں رہے؟" کیشو بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔
ماتا: تو وہاں پہنچا کیسے؟
شیاما: "چوکی پر سٹول رکھ کر چڑھے تھے اماں جی۔"
کیشو: "تو سٹول تھامے نہیں کھڑی تھی؟"
شیاما: "تم ہی نے تو کہا تھا۔"
ماتا: تو اتنا بڑا ہوا۔ تجھے ابھی اتنا بھی نہیں معلوم کہ چھونے سے چڑیوں کے انڈے گندے ہو جاتے ہیں۔ چڑیا پھر انھیں نہیں سیتی۔"
شیاما نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "تو کیا چڑیا نے انڈے گرا دیے ہیں۔ اماں جی؟"
ماتا: اور کیا کرتی۔ کیشو کے سر اس کا پاپ پڑے گا۔ ہا! ہا! ہا تین جانیں لے لیں دُشٹ نے۔"
کیشو رونی صورت بنا کر بولا:
"میں نے تو صرف انڈوں کو گدی پر رکھ دیا تھا اماں جی!"
ماتا کو ہنسی آگئی۔
مگر کیشو کو کئی دنوں تک اپنی غلطی پر افسوس ہوتا رہا۔ انڈوں کی حفاظت کرنے کے زعم میں اس نے ان کا ستیاناس کر ڈالا۔ اسے یاد کر کے وہ کبھی کبھی رو پڑتا تھا۔
دونوں چڑیاں وہاں پھر نہ دکھائی دیں۔

(یہ افسانہ اپریل 1928 میں پہلی بار 'خاک پروانہ' میں شائع ہوا۔ ہندی میں یہ گپت دھن نمبر 2 میں شامل ہے۔)

دو سکھیاں

(1)

لکھنؤ یکم جولائی 1925

پیاری بہن......!

جب سے یہاں آئی ہوں تمھاری یاد ستاتی رہتی ہے۔ کاش تم کچھ دنوں کے لیے یہاں چلی آتیں تو کتنی بہار رہتی۔ ! میں تمھیں اپنے 'ونود' سے ملاتی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے؟ کیا تمھارے ماں باپ اتنی آزادی بھی نہ دیں گے؟ مجھے تو بہت بڑا تعجب ہے کہ بیڑیاں پہن کر تم کیوں کر رہ سکتی ہو؟ میں تو ایک گھنٹے بھر بھی اس طرح نہیں رہ سکتی۔ ایشور کا شکر کرتی ہوں۔ کہ میرے پتا جی پرانی لکیر کے فقیر نہیں۔ وہ اس نئی تہذیب کے حامی و دلدادہ ہیں۔ جس نے نسوانی زندگی کو سورگ بنا دیا ہے۔ ورنہ میں تو کہیں کی بھی نہ رہتی۔

ونود حال ہی میں انگلینڈ سے واپس آئے ہیں۔ اور زندگی کا سفر شروع کرنے سے پیشتر ایک بار دنیا کا سفر کرنا چاہتے ہیں۔ یورپ کا بیشتر حصہ تو وہ دیکھ چکے ہیں۔ مگر امریکہ، آسٹریلیا اور ایشیا کی سیر کے بغیر انھیں چین نہیں۔ بالخصوص وسط ایشیا اور چین کی سیاحت کے تو نہایت دلدادہ ہیں۔ جن امور پر یورپین سیاح خاموش ہیں۔ انھیں پر روشنی ڈالنا ان کا خاص مقصد ہے۔ چندا میں سچ کہتی ہوں۔ ایسا ذی فہم اور جامع شخص اب تک میری نگاہوں سے نہیں گزرا۔ میں تو ان کی گفتگو سن کر دنگ رہ جاتی ہوں۔ کوئی ایسا موضوع نظر نہیں آتا۔ جس پر انھیں عبور نہ حاصل ہو۔ یا جس پر وہ اظہار خیال نہ فرماسکتے ہوں۔ وہ محض کتابی علم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں تجربات کی وسعت، نوعیت، اور ندرت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کا خاصہ ہے۔ آزادی کے وہ پجاری ہیں۔ ایسے شخص کی بیوی بن کر ایسی کون عورت ہے جو اپنی خوش قسمتی پر نازاں نہ ہو۔

بہن! تم سے کیا کہوں کہ انھیں صبح اپنے بنگلہ کی طرف آتے دیکھ کر میرے

دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔ !یہ ان پر نثار ہونے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ وہ میری آتما میں بس گئے ہیں۔ میں نے اپنے شوہر کا تصور جو دل میں کیا تھا۔ اس میں اور ان میں رتی بھر بھی فرق نہیں۔ مجھے دن رات یہی خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں مجھ میں ان کو کوئی کمی نہ نظر آجائے۔ جن مضامین سے انھیں رغبت ہے۔ ان کا مطالعہ میں آدھی آدھی رات تک کیا کرتی ہوں۔ ایسی محنت میں نے کبھی نہ کی تھی۔ کنگھی چوٹی کی جانب کبھی اس قدر میری توجہ نہ تھی۔ لطائف کا میں نے کبھی اس دلچسپی سے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اگر اتنا سب کچھ کرنے پر بھی میں ان کا دل نہ پاسکی۔ تو بہن! میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ دل پھٹ جائے گا۔ اور دنیا میرے لیے سونی ہو جائے گی۔

کبھی کبھی محبت کے ساتھ ہی دل میں رقابت کا جذبہ بھی بیدار ہو اٹھتا ہے۔ انھیں میرے بنگلہ کی جانب آتے ہوئے دیکھ کر جب میری پڑوسن 'کسم' اپنے برآمدے میں آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ تو میری طبیعت یہی چاہتی ہے کہ اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں۔ کل تو ظلم ہی ہوگیا۔ ونود نے اسے دیکھتے ہی ہیٹ اتار لی۔ چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ وہ نصیبوں جلی آوارہ مزاج کسم بھی دانت نکالنے لگی۔ ایشور تمام باتیں دے مگر جھوٹا غرور نہ دے۔ چڑیلوں کی سی تو آپ کی صورت ہے۔ مگر اپنے کو اپسرا سمجھتی ہیں۔ آپ شاعرہ ہیں اور کئی اخبارات ورسائل میں آپ کا کلام بھی شائع ہوتا ہے۔ بس آپ زمین پر پاؤں نہیں رکھتیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے ونود پر سے میری عقیدت اٹھ گئی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ چل کر کسم کا منہ نوچ لوں۔ خیریت یہ ہوئی کہ دونوں میں بات چیت نہ ہوئی۔ مگر جب ونود آکر بیٹھے۔ تو آدھ گھنٹے تک میں ان سے نہ بول سکی۔ جیسے ان کے الفاظ میں وہ جادو ہی نہ تھا۔ بذلہ سنجیوں میں وہ رس ہی نہ تھا۔ اس وقت سے اب تک میرے دل کی بے چینی نہیں گئی۔ تمام رات مجھے نیند نہیں آئی۔ آنکھوں کے سامنے بار بار وہی نظارہ آتا تھا۔ کسم کو شرمندہ کرنے کے لیے کتنے منصوبے باندھ چکی ہوں۔

چندا! مجھے آج تک یہ نہ معلوم تھا کہ میرا دل اس قدرع کمزور ہے۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ ونود مجھے کم ظرف اور پست خیال سمجھیں گے تو میں ان سے صاف

صاف اپنے خیالات کا اظہار کردیتی۔ میں تمام تر ان کی ہو کر انھیں ہر پہلو سے اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا کا سب سے حسین نوجوان میرے سامنے آجائے تو میں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گی۔ پھر ونود کے دل میں میرے متعلق یہ خیال اور جذبہ کیوں نہیں؟

چندا! پیاری بہن!! ایک ہفتہ کے لیے آجا۔ تجھ سے ملنے کے لیے دل بے چین ہو رہا ہے۔ اس وقت مجھے تیری ہمدردی اور مشورہ کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ یہ میری زندگی کا سب سے نازک موقع ہے۔ انھیں دس پانچ دنوں میں یا تو پارس ہو جاؤں گی یا مٹی۔ لو سات 7 بج گئے اور ابھی بال تک نہیں بنائے۔ ونود کے آنے کا وقت ہو گیاہے۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ کہیں آج پھر بدنصیب کسم اپنے برآمدہ میں نہ کھڑی ہو۔ ابھی سے دل کانپ رہا ہے۔ کل تو یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا تھا۔ کہ یوں ہی ہنس دی ہوگی لیکن اگر آج بھی وہی نظارہ سامنے آیا تو اتنی آسانی سے دل کو نہ سمجھا سکوں گی۔

(تمھاری پدما)

(2)

گورکھپور۔ 5 جولائی 1925

پیاری پدما!

بھلا ایک عرصہ بعد تمھیں میری یاد تو آئی۔ میں نے تو سمجھا تھا شاید تم نے پرلوک یاترا کر لی۔ یہ اسی بے دردی کی سزا ہے جو کسم تمھیں دے رہی ہے۔ 15 اپریل کو کالج بند ہوا اور یکم جولائی کو آپ خط لکھتی ہیں۔ پورے ڈھائی مہینے بعد! وہ بھی کسم کی مہربانی سے! جس کسم کو تم کوس رہی ہو۔ اسے میں دعا دے رہی ہوں۔ اگروہ بلائے ناگہانی کی طرح تمھارے راستہ میں نہ آکھڑی ہوتی تو تمھیں میری یاد کیوں آتی۔ ؟ ونود کی تم نے جو تصویر کھینچی ہے۔ وہ نہایت دلکش ہے۔ اور میں ایشور سے دعا مانگ رہی ہوں کہ وہ دن جلد لائے۔ جب میں ان سے بہنوئی کے رشتہ سے ملوں۔ مگر دیکھنا کہیں ''سول میرج'' نہ کر لینا۔ شادی ہندو احکامات کے بموجب ہی ہو۔ ہاں تمھیں اختیار ہے کہ جو سینکڑوں بیہودہ لغویات اور بیہودگیاں ہیں۔ ان کو نکال ڈالو۔

ایک قابل اور تعلیم یافتہ۔ سنسکرت دان پنڈت کو ضرور بلانا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بات بات پر ٹکے نکلوائے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ دیکھتا رہے کہ سب کچھ شاستروں کے احکامات کے بموجب ہو رہا ہے یا نہیں۔

اچھا۔ اب مجھ سے پوچھو کہ اتنے دنوں خاموش کیوں رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے خاندان میں ہی اس عرصہ میں پانچ شادیاں ہوئیں۔ براتوں کا تانتا لگا رہا۔ ایسا شاید ہی کوئی دن گیا ہو کہ سو 100 مہمانوں سے کم رہے ہوں اور جب برات آجاتی تھی۔ تب تو ان کی تعداد پانچ پانچ سو تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ پانچوں لڑکیاں مجھ سے چھوٹی ہیں۔ اور میرا بس چلتا، تو ابھی تین چار سال تک نہ بولتی۔ لیکن میری سنتا کون؟ اور غور کرنے پر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کا لڑکیوں کی شادی کے لیے جلدی کرنا نامناسب نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اگر والدین بے وقت ہی مرجائیں تو لڑکی کی شادی کون کرے۔ بھائیوں کا کیا بھروسہ؟ اگر باپ نے کافی دولت چھوڑی ہے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن جیسا عام طور پر ہوتا ہے کہ باپ قرضہ چھوڑ گئے۔ تو بہن بھائیوں پر بار ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی دیگر کتنے ہی ہندو رسوم کی مانند ہے۔ جب تک ہماری مالی حالت نہ درست ہوگی۔ یہ رسم بھی نہ مٹے گی۔

اب میرے 'بلیدان' کی باری ہے۔ آج کے پندرھویں دن یہ گھر میرے لیے بدیس ہو جائے گا۔ دوچار مہینہ کے لیے آؤں گی تو مہمان کی طرح۔ میرے 'ونود' بنارسی ہیں۔ ابھی قانون پڑھ رہے ہیں۔ ان کے والد نامی وکیل ہیں۔ سنتی ہوں کئی گاؤں ہیں۔ کئی مکان ہیں۔ اچھی عزت ہے۔ میں نے ابھی تک برکو نہیں دیکھا۔ پتا جی نے مجھ سے دریافت کرایا تھا کہ اگر خواہش ہو تو برکو بلادوں۔ لیکن میں نے کہہ دیا۔ کوئی ضرورت نہیں، کون گھر میں بہو بنے۔ تقدیر ہی کا سودا ہے۔ نہ پتا جی ہی کسی کے دل میں گھس سکتے ہیں نہ میں ہی۔ اگر دو ایک بار دیکھ ہی لیتی یا ملاقات ہی کرلیتی تو کیا ہم دونوں ایک دوسرے کو پرکھ لیتے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم ایک دوسرے کا رنگ روپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس بات کا مجھے پورا پورا یقین ہے کہ پتا جی مجھ سے کم محتاط اور اہل نظر نہیں ہیں۔ ممکن ہے میرے دونوں بڑے بہنوئی حسن کے پتلے نہ ہوں۔ مگر کوئی نازنین ان سے نفرت نہیں کر سکتی۔

میری بہنیں ان کے ساتھ نہایت لطف سے زندگی بسر کر رہی ہیں۔ پھر پتا جی میرے ہی ساتھ کیوں بے انصافی کریں گے۔ یہ بھی مانتی ہوں کہ ہمارے سماج میں کچھ لوگوں کی زندگی خوشگوار نہیں ہے۔ لیکن دنیا میں ایسا کون سا سماج ہے جس میں دکھی خاندان نہ ہو۔ اور پھر ہمیشہ مردوں کا ہی قصور نہیں ہوتا۔ زیادہ تر عورتیں ہی زہر کی گانٹھ ہوتی ہیں۔ میں تو شادی کو خدمت اور ایثار کا برت سمجھتی ہوں۔ اور اسی نام سے اس کو موسوم کرتی ہوں۔ ہاں میں تمھیں ونود سے چھیننا نہیں چاہتی۔ لیکن اگر 20 جولائی تک تم دو دن کے لیے آسکو۔ تو مجھے جلا لو۔ جوں جوں اس برت کا دن قریب آرہا ہے۔ مجھے ایک نا معلوم خوف لاحق ہو رہا ہے۔ مگر تم خود بیمار ہو میری دوا کیا کروگی...... بہن! ضرور آنا۔

(تمھاری چندا)

(3)

منصوری 5 اگست 1925

پیاری چندا۔ !

سینکڑوں باتیں لکھنی ہیں۔ کس تمہید سے شروع کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ سب سے پیشتر تمھاری شادی کے موقعہ پر نہ پہنچ سکنے کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ میں آنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں! اور پیاری چندا کی شادی پر نہ آؤں۔ مگر اس کے عین تین دن پیشتر ونود نے اپنے آپ کو مجھ پر نثار کر کے مجھے ایسا مفتون کر دیا کہ پھر مجھے کسی بات کی یاد نہ رہی۔ آہ! وہ محبت کے بحر عمیق سے نکلنے ہوئے جذبات ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میں کھڑی تھی۔ اورونود میرے سامنے گھٹنے ٹیکے عرض التجا اور شوق کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔ ایسا موقعہ زندگی میں ایک ہی بار آتا ہے۔ صرف ایک بار۔ مگر اس کی دلکش اور پر لطف یاد کسی بہشتی نغمہ کی مانند زندگی کے تار تار میں گونجتی رہتی ہے۔ تم اس لازوال خوشی کا احساس نہ کر سکوگی۔ ہاں! میں رونے لگی۔ نہیں کہہ سکتی کہ دل میں کیا کیا خیالات آئے۔ مگر میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا۔ شاید یہی مسرت کی حد ہے۔ میں کچھ کچھ مایوس ہوچلی تھی۔ تین چار دن سے ونود کو آتے جاتے کسم سے باتیں کرتے دیکھتی تھی۔

کسم روزانہ نئے نئے زیورات سے ملبوس و مرصع رہتی تھی اور کیا کہوں۔ ایک دن ونود نے کسم کی ایک نظم مجھے سنائی اور ایک ایک لفظ پر سر دھنتے رہے۔ میں بھی غرور سے خاموش رہی۔ سوچا جب یہ اس چڑیل پر بری طرح لٹوہورہے ہیں۔ تو مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ ان کے لیے اپنا سر کھپاؤں۔ دوسرے دن جب وہ صبح آئے تو میں نے کہلا دیا کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ جب انھوں نے مجھ سے ملنے کے لیے اصرار کیا تو مجبوراً مجھے کمرے میں آنا پڑا۔ دل میں تہیہ کرکے آئی تھی کہ صاف کہہ دوں گی اب آپ نہ آیا کیجیے۔ میں آپ کے ناقابل ہوں۔ میں شاعرہ نہیں۔ شیریں سخن نہیں... ایک مطول تقریر کا مواد خیالات کی صورت میں جمع ہوگیا تھا۔ مگر جب کمرے میں پہنچی اور ونود کی تشنہ کام نگاہیں، جذبات آلود خدوخال دیکھے تو ازخود رفتہ ہوگئی۔ اس حالت و کیفیت کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی۔ ونود نے مجھے بیٹھنے بھی نہ دیا۔ میرے سامنے دو زانو ہوکر فرش پر بیٹھ گئے۔ اور ان کے نشاط انگیز الفاظ میرے دل میں ایک پر لطف ترنم پیدا کرنے لگے۔

ایک ہفتہ تیاری میں کٹ گیا۔ پاپا اور ماما پھولے نہ سماتے تھے۔ اور سب سے زیادہ خوش تھی کسم۔ وہی کسم جس کی صورت سے مجھے نفرت تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس پر شک کرکے اس کے ساتھ نہایت ہی بے انصافی کی۔ اس کا دل صاف ہے۔ اس میں نہ رشک ہے نہ حسد۔ خدمت ہی اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس کے بغیر یہ سات دن کیوں کر کٹتے؟ میں تو کچھ کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ کسم پر میں نے اپنا تمام بار چھوڑ دیا تھا۔ زیورات کا انتخاب۔ لباس کے رنگ اور قطع وبرید میں اس کو کمال ہے۔ آٹھویں دن جب اس نے مجھے دلہن بنایا تو میں اپنا حسن دیکھ کر متحیر ہوگئی۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی اس قدر حسین نہ سمجھا تھا۔ غرور سے میری آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔

اسی دن شام کو ونود اور میں دو مختلف ندیوں کی مانند سنگم پر مل کر ایک ہوگئے۔ سیر و تفریح کی تیاریاں پیشتر سے ہی ہوچکی تھیں۔ علی الصباح ہم منصوری کو روانہ ہوگئے۔ کسم پہنچانے کے لیے اسٹیشن تک آئی۔ اور رخصت ہوتے وقت بہت روئی۔ اسے ساتھ لے چلنا چاہتی تھی۔ مگر نہ معلوم کیوں وہ راضی نہ ہوئی۔

منصوری نہایت دلکش جگہ ہے۔ کالے کالے متوالے بادل پہاڑیوں پر محصور سے نظر آتے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا امید کی لہروں کی مانند دل کو طراوت پہنچارہی ہے۔ مگر مجھے ایسا یقین ہے کہ ونود کے ساتھ میں کسی سنسان جنگل میں اتنے ہی سکھ سے رہتی۔ انھیں پاکر اب مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔ بہن!تم اس مسرت سے لبریز زندگی کا خیال بھی نہ کرسکوگی۔ صبح ہوئی ناشتہ آیا۔ ہم دونوں نے ناشتہ کیا۔ گھوڑے تیار ہیں۔ نو بجتے بجتے سیر کرنے نکل گئے۔ کسی چشمہ یا جھرنے کے کنارے جا بیٹھے۔ وہاں پانی کی روانی کا نغمہ سن رہے ہیں یا کسی پتھر کی شلا پر بیٹھے ہوئے بادلوں کی بھاگ دوڑ کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ گیارہ بجتے بجتے لوٹے۔ کھانا تیار ملا۔ کھاپی کر میں پیانو پر بیٹھی۔ ونود کو موسیقی سے محبت ہے۔ خود بہت اچھا گاتے ہیں۔ جب میں گانے لگتی ہوں تو ان پر وہ وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ جھومنے لگ جاتے ہیں۔ تیسرے پہر ہم گھنٹہ بھر تک آرام کرنے کے بعد کھیلنے یا کوئی کھیل دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد تھیٹر دیکھتے ہیں اور وہاں سے لوٹ کر سوجاتے ہیں۔ نہ ساس کی گھڑکیاں ہیں۔ نہ نند کی کانا پھوسی نہ جیٹھانی کے طعنے۔ پر اس سکھ میں بھی مجھے کبھی کبھی ایک شک سا ہوتا ہے۔ پھول میں کوئی کانٹا تو نہیں چھپا ہوا ہے؟ روشنی کے بطن میں تاریکی تو نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا شک کیوں پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوپانچ بج گئے۔ ونود تیار ہیں۔ آج ٹینس کا میچ دیکھنے جانا ہے۔ میں بھی جلدی سے تیار ہوجاؤں۔ باقی باتیں پھر لکھوں گی۔

ہاں! ایک بات تو بھولی ہی جارہی ہے۔ اپنی شادی کا حال لکھنا۔ پتی دیو کیسے ہیں؟ رنگ روپ کیسا ہے؟ سسرال گئیں یا ابھی میکہ میں ہی ہو۔ اگر سسرال گئی ہو تو وہاں کے تجربات ضرور لکھنا۔ تمھاری خوب نمائش ہوئی ہوگی۔ گھر خاندان اور محلّہ کی عورتوں نے گھونگٹ اٹھا اٹھا کر خوب منہ دیکھا ہوگا۔ خوب امتحانات ہوئے ہوں گے۔ تمام باتیں بالتفصیل لکھنا۔ دیکھوں پھر کب ملاقات ہوتی ہے۔

(تمھاری پدما)

(4)

گورکھپور۔ یکم ستمبر 1925

پیاری پدما!

تمھارا خط دیکھ کر دل کو بہت تسکین ہوئی۔ تمھارے نہ آنے سے ہی میں سمجھ گئی تھی۔ کہ ونود بابو تمھیں ہر لے گئے۔ مگر خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ تم منصوری پہنچ گئی ہوگی۔ اب اس عیش وعشرت میں تمھیں غریب چندا کی یاد کیوں آنے لگی۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا ہے کہ شادی کے نئے اور پرانے آدرش میں کیا فرق ہے۔ تم نے اپنی پسند سے کام لیا۔ سکھی ہو۔ میں لوک لاج کی لونڈی بنی رہی۔ نصیبوں کو رو رہی ہوں۔ :

اچھا! اب میری بیتی سنو:۔ جہیز کے بکھیڑے سے تو کچھ مطلب نہیں۔ والد صاحب نے نہایت فراخ طبیعت پائی ہے۔ خوب دل کھول کر دیا ہوگا۔ مگر دروازے پر برات آتے ہی میرا امتحان شروع ہوگیا۔ بَر کو دیکھنے کی کیسی زبردست خواہش تھی۔ مگر کیوں کر دیکھتی۔ خاندان کی ناک نہ کٹ جاتی۔ دروازہ پر برات آئی۔ تمام لوگ دولہا کو گھیرے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا چھت پر سے دیکھوں۔ چھت پر گئی۔ مگر وہاں بھی کچھ نہ دکھائی دیا۔ ہاں! اس قصور پر اماں جی کی گھڑکیاں سننی پڑیں۔ میری جو بات ان لوگوں کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا الزام میری تعلیم پر ہوتا ہے۔ بیچارے والد صاحب میرے ساتھ نہایت ہمدردی کا اظہار فرماتے ہیں۔ مگر کس کس کا منہ پکڑیں۔ دروازہ چارتویوں گزرا۔ اب بھانوروں کی تیاری ہونے لگی۔ جنوا سے سے کپڑے اور زیورات کا ڈال آیا۔ بہن! کیا لکھوں۔ گھر کے تمام لوگ، برادری اور رشتہ داروں کی عورتیں اس پر اس طرح ٹوٹیں جیسے ان لوگوں نے کچھ دیکھاہی نہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ کنٹھا تو لائے ہی نہیں۔ کوئی ہار کے نام کو روتاہے۔ اماں جی تو سچ مچ رونے لگیں۔ گویا میں کنوئیں میں ڈال دی گئی۔ دل کھول کر صلواتیں سنائی جانے لگیں۔ مگر میں نے زیورات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہاں! جب کوئی ور کے متعلق کوئی بات کرتا تھا۔ تو میں غور سے سننے لگ جاتی تھی۔ معلوم ہوا کہ دبلے پتلے آدمی ہیں۔ رنگ سانولا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ ہنس مکھ ہیں۔ ان خبروں سے درشن کی

خواہش اور بھی بڑھتی جاتی تھی۔ جوں جوں بھانوروں کی ساعت قریب آتی جاتی تھی۔ میرا دل بے چین ہوتا جاتا تھا۔ گو میں نے ان کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ مگر دل ان کی جانب کچھ اس قدر کھینچتا تھا کہ کیا کہوں۔ دل میں ایک ایسے عجیب و غریب محبت کا جوار اٹھ رہا تھا کہ اس لطف کا مزہ کچھ دل ہی جانتا ہے۔ اس وقت اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کے دشمنوں کو کچھ ہوگیا ہے۔ تو میں باؤلی ہوجاتی۔ ابھی تک میں ان سے متعارف نہیں ہوئی۔ ان کی آواز تک سے بھی یہ بدنصیب کان ناآشنا ہیں۔ لیکن دنیائے حسن کے بہترین مجسمہ میں بھی میرے لیے کوئی کشش نہیں۔ اب وہی میرے سب کچھ ہیں۔

آدھی رات کے بعد بھانور ہوئی۔ سامنے ہون کنڈ تھا۔ دونوں جانب برہمن بیٹھے ہوئے تھے۔ چراغ جل رہا تھا۔ گل دیوتا کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ ویدمنتروں کا پاٹھ ہورہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ فی الحقیقت دیوتا براجمان ہیں۔ اگنی۔ وایو۔ دیپک۔ نکشتر سب کے سب مجھے اس وقت دیوتا کی نورانیت سے منور نظر آتے تھے۔ اس نورانیت کا احساس مجھے پہلی بار ہوا۔ جب میں نے اگنی دیوتا کے سامنے سر جھکایا تو یہ محض رسم کی پابندی نہ تھی۔ بلکہ میں اگنی دیوتا کو مجسم اپنے روبرو بہشتی نورانیت سے منور دیکھ رہی تھی۔ آخر بھانوریں بھی ختم ہوگئیں۔ لیکن پتی دیو کے درشن نہ ہوئے۔

اب آخری اُمید یہ تھی کہ صبح جب وہ کلیوا کے لیے بلائے جائیں گے اس وقت دیکھوں گی۔ اس وقت ان کے سر پر سہرانہ ہوگا۔ سکھیوں کے ساتھ میں بھی جابیٹھوں گی۔ اور خوب جی بھر کر دیکھوں گی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ قسمت آڑ میں کھڑی ہنس رہی ہے۔ صبح دیکھتی ہوں کہ جنواسے کے خیمے اُکھڑ رہے ہیں۔ بات کچھ نہ تھی۔ براتیوں کے ناشتہ کے لیے جو سامان بھیجا گیا تھا۔ وہ کافی نہ تھا۔ شاید گھی بھی خراب تھا۔ میرے پتاجی کو تو تم جانتی ہی ہو۔ کبھی کسی سے دبے نہیں۔ جہاں رہے شیر بن کر رہے بولے! "جاتے ہیں تو جانے دو۔ منانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لڑکی والوں کا دھرم ہے براتیوں کی خاطر تواضع کرنا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دھمکی اور رعب سے کام لیا جائے۔ گویا کسی آفیسر کا پڑاؤ پڑا تھا۔ اگر وہ اپنے لڑکے کی شادی

کر سکتے ہیں تو میں بھی اپنی لڑکی کی شادی کر سکتا ہوں۔

برات چلی گئی اور میں پتی دیو کے درشن نہ کر سکی۔ تمام شہر میں ہلچل مچ گئی۔ مخالفین کو مضحکہ آرائی کا موقعہ مل گیا۔ والد صاحب نے بہت سا سامان جمع کر لیا تھا۔ وہ سب خراب ہوگیا۔ گھر میں جسے دیکھو وہ میری سسرال والوں کو لعنت ملامت کرتا ہے۔ اُجڈ ہیں، لالچی ہیں، بدمعاش ہیں، مجھے ذرا بھی برا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن شوہر کے خلاف میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ ایک دن اماں جی بولیں۔ لڑکا بھی بے سمجھ ہے۔ دودھ پیتا بچہ نہیں۔ قانون پڑھتا ہے۔ ڈاڑھی مونچھیں آگئی ہیں۔ اسے اپنے باپ کو سمجھانا چاہیے تھا کہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ مگر وہ بھیگی بلی بنا رہا۔ میں دل ہی دل میں تلملا اٹھی۔ کچھ بولی تو نہیں۔ پر اماں جی کو معلوم ضرور ہوگیا کہ اس معاملہ میں ان سے متفق نہیں ہوں۔

بہن! میں تمھیں سے دریافت کرتی ہوں۔ جو حالت درپیش تھی۔ ایسی حالت میں ان کا کیا دھرم تھا۔ ؟ اگر وہ اپنے والد اور دیگر لواحقین کا کہنا نہ مانتے تو ان کی کتنی بڑی بے عزتی ہوتی۔ اس وقت انھوں نے وہی کیا جو ان کو کرنا چاہئے تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ کسی قدر معاملہ ٹھنڈا پڑنے پر وہ ضرور آئیں گے۔ میں ابھی سے ان کا راستہ دیکھنے لگی ہوں۔ چھٹی رسان خطوط لاتا ہے تو دل میں دھڑکن ہونے لگتی ہے۔ شاید ان خطوط میں ان کا بھی کوئی خط ہو۔ بار بار سوچتی ہوں۔ کیوں نہ میں ہی ایک خط لکھوں۔ مگر شرم وحجاب مانع ہوجاتے ہیں۔ لیکن اگر دس پانچ دن ان کا خط نہ آیا۔ یا وہ نہ آئے تو حجاب غرور کی شکل اختیار کرے گا۔ کیا تم انھیں ایک خط نہیں لکھ سکتیں۔ سب کھیل بن جائے۔ کیا میری اتنی خاطر بھی نہ کروگی۔ مگر ایشور کے لیے کہیں اس خط میں یہ نہ لکھ دینا کہ چندا نے یہ درخواست کی ہے۔ معاف کرنا۔ ایسی فاش غلطی کی تمھاری جانب سے امید کرکے میں تمھارے ساتھ بے انصافی کر رہی ہوں۔ مگر میں سمجھدار تھی ہی کب۔ ؟

(تمھاری چندا)

(5)

منصوری 20 ستمبر 1929

پیاری چندا!

جس دن تمھارا خط ملا تھا۔ اس کے دوسرے دن ہی میں نے بنارس خط لکھ دیا تھا۔ اس کا جواب بھی آگیا۔ شاید بابو جی نے تمھیں خط لکھا ہو۔ کچھ پرانے خیال کے آدمی ہیں۔ میری تو ان سے ایک دن بھی نہ نبھتی تم سے نبھ جائے گی۔ اگر میرے شوہر نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہوتا۔ بلا وجہ مجھ سے روٹھے ہوتے تو میں زندگی بھر ان کی صورت نہ دیکھتی۔ اگر کبھی آتے بھی تو کتوں کی مانند دھتکار دیتی۔ مرد پر سب سے زیادہ حق اس کی بیوی کا ہے۔ ماں باپ کو خوش کرنے کے لیے وہ بیوی کو ذلیل نہیں کر سکتا۔ تمھاری سسرال والوں نے نہایت نفرت آمیز سلوک کیا۔ پرانے خیال والوں کا غضب کا کلیجہ ہے۔ جو ایسی باتیں برداشت کرتے ہیں۔ اب اس رسم و رواج کے کرشمے دیکھو۔ جس کی تعریف میں تمھاری زبان نہیں تھکتی تھی۔ وہ دیوار بالکل کھوکھلی اور بوسیدہ ہوچکی ہے۔ ٹیپ ٹاپ سے کام نہ چلے گا۔ اس کی جگہ از سر نو دیوار بنانے کی ضرورت ہے۔

اچھا ! اب میری بھی رام کہانی سن لو۔ مجھے ایسا شک ہو رہاہے کہ ونود نے میرے ساتھ دغا کی۔ ان کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں۔ جتنا میرا خیال تھا۔ صرف مجھے ٹھگنے کے لیے یہ سوانگ بھرا تھا۔ موٹر مانگے کی تھی۔ بنگلہ کا کرایہ ابھی تک نہیں دیا گیا۔ فرنیچر کرایہ کا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے فی الواقعہ مجھے دھوکا نہیں دیا۔ کبھی اپنی دولت کی ڈینگ نہیں ماری۔ لیکن طرز معاشرت کو ایسا بنا لینا کہ دوسروں کو خواہ مخواہ تمول کا دھوکا ہو۔ ایک قسم کا دھوکا ہی ہے۔ یہ سانگ اس لیے بنایا گیا تھا کہ کوئی شکار پھنس جائے۔ اب دیکھتی ہوں کہ ونود مجھ سے اپنی اصلی حالت چھپانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ اور اپنے خطوط مجھے نہیں دیکھنے دیتے۔ کوئی ملنے آتاہے تو وہ چونک پڑتے ہیں اور گھبرائی ہوئی آواز میں بیرا سے پوچھتے ہیں کہ "کون ہے"۔ ؟ تم جانتی ہو۔ میں دولت کی لونڈی نہیں۔ میں تو صرف صاف دل چاہتی ہوں۔ جس میں کام کرنے کا مادہ استقلال اور عزم صادق ہے۔ وہ آج نہیں تو کل ضرور دولت مند ہوگا۔

میں اس فریب سے جلتی ہوں۔ اگر ونود مجھ سے اپنی دقتوں کا اظہار کردیں تو میں ان کے ساتھ ہمدردی کروں گی۔ ان کی مشکلات دور کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ مجھ سے اس طرح پردہ کرکے یہ میری ہمدردی اور یکجہتی سے ہی ہاتھ نہیں دھوتے بلکہ میرے دل میں بد گمانی کا بیج بوتے ہیں۔ یہ فکر میرے لیے سوہان روح ہے۔ اگر انھوں نے اپنی حالت کا صاف صاف مجھ سے ذکر کردیا ہوتا تو میں منصوری کیوں آتی۔ ؟ لکھنؤ میں ایسی گرمی نہیں پڑتی کہ انسان پاگل ہوجائے ان ہزاروں روپوں پر کیوں پانی پڑتا۔ ؟ سب سے زیادہ اہم تر مسئلہ روزمرہ کے اخراجات کا ہے۔ کئی جگہ درخواستیں بھیج رکھی ہیں۔ انھیں کے جواب کا انتظار کررہے ہیں۔ غالبًا اس ماہ کے آخر تک کوئی جگہ مل جائے۔ پہلے تین چار سو ملیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کر کام چلے گا۔؟ ڈیڑھ سو تو پاپا میرے کالج کا خرچ دیتے تھے۔ اگر دس پانچ مہینہ جگہ نہیں ملی۔ تو یہ کیا کریں گے۔ ؟ یہ فکر اور کلیجہ چھلنی کیے دیتا ہے۔ مشکل یہی ہے کہ ونود مجھ سے پردہ رکھتے ہیں۔ اگر ہم دونوں بیٹھ کر مشورہ کر لیتے تو تمام گتھیاں سلجھ جاتیں۔ مگر شاید یہ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے۔ شاید ان کا خیال ہے کہ میں محض ریشمی گڑیا ہوں۔ جسے گونا گوں لباس، زیورات و خشبویات سے مرصع کرنا ہی کافی ہے۔ تھیٹر میں کوئی نیا تماشہ ہونے والا ہوتا ہے تو دوڑے ہوئے آکر خبر دیتے ہیں۔ کہیں کوئی جلسہ ہو، کھیل ہو، سیر کا موقع ہو، اس کی اطلاع مجھے بلا تامل دی جاتی ہے اور نہایت ہی خوشی کے ساتھ۔ گویا میں دن رات کھیل کود اور عیش جیش میں محو اور خوش رہنا چاہتی ہوں۔ گویا میرے دل میں متانت وسنجیدگی کا گزر نہیں۔ یہ سراسر میری تذلیل ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے تمام حقوق پاکر خوش ہوسکتی ہوں۔ بس اس وقت اسی قدر کافی ہے۔ باقی پھر لکھوں گی۔ تم اپنے حالات سے مطلع کرنا۔ مجھے اپنے لیے جس قدر فکر ہے۔ اس سے کم تمھارے لیے نہیں ہے۔ دیکھیں ہم دونوں کی کشتی کس کنارے لگتی ہے۔ تم اپنی دیسی پانچ ہزار برس کی بوسیدہ و قدیم کشتی پر بیٹھی ہو۔ میں نئے تیز رفتار موٹر بوٹ پر۔ موقع کوشش اور سائنس۔ تمام میرے ساتھ ہیں۔ لیکن اگر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو میں اسی موٹر بوٹ پر ڈوبوں گی۔ سال میں لاکھوں آدمی ریل سے کٹ کر مرجاتے ہیں۔ مگر کوئی بیل گاڑی

پر سفر نہیں کرتا۔ ریل کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بس

(تمھاری پدما)

(6)

گورکھپور۔ 25 ستمبر 1925

پیاری پدما۔ !

کل تمھارا خط ملا۔ آج جواب لکھ رہی ہوں۔ ایک تم ہو کہ مہینوں خاموش رہتی ہو۔ اس معاملہ میں تمھیں مجھ سے سبق لینا چاہیے۔ ونود بابو پر تم بلا وجہ تہمت لگاتی ہو۔ تم نے پہلے ہی کیوں نہ ان کی مالی حالت کی تصدیق کی۔ ؟ صرف ایک خوبصورت۔ رنگین مزاج۔ اپٹوڈیٹ۔ شیریں بیان نوجوان دیکھا۔ اور پھول اٹھیں۔ اب بھی تمھارا ہی قصور ہے۔ تم اپنے طرز عمل۔ طرزمعاشرت سے ثابت کردو کہ تم میں متانت اور سنجیدگی کا جوہر بھی ہے۔ پھر دیکھوں کہ ونود بابو کیونکر تم سے پردہ رکھتے ہیں۔ اور بہن! یہ تو انسانی فطرت ہے۔ ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اسے بڑا سمجھیں۔ اس سوانگ کو آخیر تک نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جو اس کوشش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اسی کی زندگی مبارک و کامیاب سمجھی جاتی ہے۔ جس زمانہ میں دولت ہی سب کچھ ہو، عزت، شہرت، نیک نامی حتیٰ کہ علم بھی دولت سے خریدا جاسکے۔ اس زمانہ میں سانگ بھرنا لازمی بات ہو جاتی ہے۔ حقوق قابلیت کا منہ تکتے ہیں۔ یہی سمجھ لو کہ ان دونوں میں پھول پھل کا تعلق ہے۔ قابلیت کا پھول لگا اور حقوق کا پھل آیا۔

اس گیان اُپدیش کے بعد اب تمھاری دلی شکریہ اد کرتی ہوں۔ تم نے پتی دیو کے نام جو خط لکھا تھا اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ اس کے پانچویں دن بعد ہی شوہر کا خط مجھے ملا۔ بہن اس خط کو پاکر مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔ اس کا اندازہ تم کر سکتی ہو۔ معلوم ہوتا تھا اندھے کو آنکھیں مل گئی ہیں۔ کبھی کوٹھے پر جاتی تھی، کبھی نیچے آتی تھی۔ سارے گھر میں کھلبلی پڑ گئی۔ تمھیں وہ خط نہایت مایوس کن معلوم دیتا۔ میرے لیے وہ سنجیون منتر تھا۔ چراغ اُمید تھا۔ پرمیشور نے براتیوں کی زیادتی پر اظہار افسوس کیا تھا۔ مگر بزرگوں کے سامنے وہ کیونکرزبان کھول سکتے تھے۔ پھر ہمارے گھر والوں

نے بھی تو براتیوں کی جیسی خاطر و تواضع کرنی چاہئے تھی ویسی نہیں کی۔ آخر میں لکھا تھا۔ ''پیاری! تم سے ملنے کا میں کس قدر مشتاق ہوں۔ الفاظ میں اس کا خاکہ کھینچنا دشوار ہے۔ تمھاری خیالی شکل ہر وقت نگاہوں کے روبرو رہتی ہے۔ مگر خاندانی وضعداری کا پاس میرا فرض اولین ہے۔ جب تک ماں باپ کا رخ نہ پاؤں آنہیں سکتا۔ تمھارے ہجر میں خواہ میری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔ مگر والدین کے حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتا۔ ہاں ایک بات کا مستحکم عہد کرچکا ہوں کہ اِدھر کی دنیا اُدھر کی ہوجائے۔ نالائق اور ناخلف کہلاؤں۔ گھر چھورنا پڑے۔ مگر اپنی دوسری شادی نہ کروں گا۔ مگر جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے معاملہ اتنا طول نہ کھینچے گا۔ یہ لوگ تھوڑے دنوں میں نرم پڑ جائیں گے۔ اور اس وقت میں آؤں گا۔ اور اپنی دل کی مالکہ کو سر آنکھوں پر بٹھا کر لاؤں گا۔''

بس اب میں مطمئن ہوں، بہن! مجھے اور کچھ نہ چاہئے۔ شوہر کی مجھ پر اتنی مہربانی ہے۔ اس سے زیادہ وہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ پریتم تمھاری چندا ہمیشہ تمھاری رہے گی۔ تمہں خوش رکھنا ہی اس کا دھرم ہے۔ وہ جب تک جیتی رہے گی۔ تمہارے پاک چرنوں میں لپٹی رہے گی۔ اسے مت بھولنا۔

بہن آنکھوں میں آنسو بھرے آتے ہیں۔ اب نہیں لکھا جاتا۔ جواب جلد دینا۔

(تمھاری چندا)

(7)

دہلی 15/ دسمبر 1926

پیاری بہن!

تجھ سے باربار معافی مانگتی ہوں۔ پیروں پڑتی ہوں۔ میرے خط نہ لکھنے کا باعث کوتاہ قلمی نہ تھی۔ نہ سیر سپاٹے کی دھن تھی۔ روز سوچتی تھی کہ آج لکھوں گی مگر کوئی نہ کوئی ایسی مصروفیت لاحق ہوجاتی اور کسی ایسی مشکل کا سامنا ہوتا کہ دل پریشان ہو اٹھتا تھا۔ اور منہ لپیٹ کر پڑرہتی تھی۔ تم مجھے اب دیکھو تو شاید پہچان نہ سکو۔ منصوری سے دہلی آئے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا۔ یہاں ونود کو تین سو روپے کی ایک جگہ مل گئی ہے۔ پورا مہینہ بازاروں کی خاک چھاننے میں گیا۔ ونود نے مجھے کامل

آزادی دے رکھی ہے۔ میں جوچاہوں کروں۔ ان سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ میرے مہمان ہیں۔ گرہستی کا تمام بار مجھ پر ڈال کر وہ بے فکر ہوگئے ہیں۔ ایسا بے فکر آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ نہ حاضری کا خیال نہ ڈنر کا۔ بلایا تو آگئے ورنہ بیٹھے ہیں۔ نوکروں سے بات چیت کرنے کی تو انھوں نے قسم کھا لی ہے۔ انھیں ڈانٹ ڈپٹ کروں تو میں۔ نکالوں تو میں۔ ان سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ وہ میرے انتظام پر تنقیدی نگاہ ڈالیں عیب نکالیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جب میں بازار سے کوئی چیزلاؤں تو وہ بتائیں۔ کہ میں ٹھگی گئی۔ یاسستالائی۔ میں چاہتی ہوں۔ مہینہ کے خرچ کا بجٹ بناتے ہوئے میرے ان کے درمیان خوب بحث ہو۔ مگر ان ارمانوں میں سے ایک بھی پورا نہیں ہوتا۔ میں نہیں سمجھتی اس طرح کوئی عورت کہاں تک انتظام خانہ داری میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ ونود کے اس ایثار نے میرے نج کی ضرورتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اپنے شوق کی چیز کو خرید کر لاتے ہوئے برا معلوم ہوتا ہے۔ کم از کم مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ میں جانتی ہوں کہ میں اپنے لیے کوئی چیزلاؤں تو وہ ناراض نہ ہوں گے۔ بلکہ خوش ہوگے۔ لیکن میراجی چاہتا ہے۔ میرے شوق اور زیب و زینت کی اشیاء وہ خود لا کر دیں۔ ان سے لینے میں جو سکھ ہے وہ جاکر لانے میں نہیں۔ پتاجی اب بھی مجھے سوروپے ماہوار دیتے ہیں۔ ان روپوں کو میں اپنی ضرورتوں پر خرچ کر سکتی ہوں۔ لیکن نہ معلوم کیوں مجھے خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں ونود یہ نہ سمجھیں کہ میں ان کے روپے خرچ کیے ڈالتی ہوں۔ جو شخص کسی بات پر ناراض نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی بات پر خوش بھی نہیں ہوسکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کس بات سے خوش اور کس بات سے ناراض ہوتے ہیں۔ میری حالت تو اس شخص کی سی ہے۔ جو بغیر راستہ جانے ہوئے ادھر اُدھر بھٹکتا پھرے۔ تمھیں یاد ہوگا۔ کہ ہم دونوں حساب کا کوئی سوال نکالنے کے بعد کتنی بے چینی سے اس کا جواب دیکھتے تھے۔ جب ہمارا جواب کتاب کے جواب سے مل جاتا تھا۔ تو کتنی دلی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ سمجھتی تھیں کہ محنت سپھل ہوئی۔ جن حساب کی کتابوں میں سوالات کے جواب نہ درج ہوتے تھے۔ ان سوالات کے حل کرنے کی ہماری خواہش ہی نہ ہوتی تھی۔ خیال آتا تھا کہ محنت برباد جائے گی۔ میں روزانہ سوالات نکالتی ہوں پر نہیں جانتی کہ

جواب صحیح نکلا ہے یا غلط؟ ذرا غور تو کرو کہ میرے دل کی کیا حالت ہوگی۔ ؟

تقریباً ایک ہفتہ ہوا۔ لکھنؤ کی مس رگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ لکھنؤ میں لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ اور میرے گھر بہت آتی جاتی ہیں۔ جہاں کسی کے سر میں خفیف سی شکایت ہوئی۔ مس رگ بلائی گئیں۔ جب پاپا میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے تو انھوں نے مس رگ کو پڑھایا تھا۔ اس کا احسان وہ اب تک مانتی ہیں۔ یہاں انھیں دیکھ کر ان کی دعوت نہ کرنا حد درجہ کی نامہمان نوازی ہوتی۔ مس رگ نے دعوت منظور کرلی۔ اس دن مجھے جتنی دقت کا احساس ہوا اس کا تذکرہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے کبھی انگریزوں کے ساتھ میز پر نہیں کھایا۔ ان کی کھانے پینے کی تہذیب سے قطعی ناواقف تھی۔ میرا یہ خیال تھا کہ ونود مجھے تمام باتیں بتلادیں گے۔ وہ برسوں انگریزوں کے ساتھ انگلینڈ میں رہ چکے ہیں۔ میں نے انھیں مس رگ کے آنے کی اطلاع بھی دے دی۔ مگر جیسے ان ذات شریف نے سنا ہی نہیں۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کرلیا کہ میں ان سے کچھ نہ پوچھوں گی۔ یہی نہ ہوگا کہ مس رگ ہنسیں گی۔ بلا سے۔ باربار اپنے اوپر جھنجھلاتی تھی کہ کیوں مس رگ کو نیوتا بیٹھی۔ پڑوس کے بنگلوں میں ہمارے جیسے کئی خاندان رہتے ہیں۔ ان سے مشورہ لے سکتی تھی۔ مگر یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ لوگ مجھے غیر مہذب تصور کریں گے۔ اپنی بے چارگی پر کچھ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ بالآخر مایوس ہوکر عقل سے کام لینا شروع کیا۔ دوسرے دن مس رگ آئیں۔ دعوت شروع ہوئی۔ میں دیکھتی تھی کہ ونود بار بار جھینپتے تھے۔ اور مس رگ بار بار ناک سکوڑتی تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آداب کی پابندی نہیں ہورہی ہے۔ میں شرم کے مارے مری جاتی تھی۔ بارے کسی طرح مشکل آسان ہوئی اور بلا سر سے ٹلی۔ میں نے کان پکڑے کہ اب کسی انگریز کی دعوت نہ کروں گی۔ اس دن سے دیکھ رہی ہوں کہ ونود مجھ سے کچھ کھنچے ہوئے ہیں۔ میں بھی نہیں بول رہی ہوں۔ وہ شاید سمجھتے ہیں کہ میری وجہ سے ان کا خاکہ اڑا۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ سچ کہتی ہوں چندا! گرہست کے ان جھنجھٹوں میں پڑ کر مجھے اب کسی سے ہنسنے بولنے کا موقع بھی نہیں ملتا! ادھر مہینوں سے کسی نئی کتاب کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔ ان کی بھی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اب سینما یا تھیٹر کا نام تک نہیں لیتے۔

ہاں! میں چلوں تو وہ تیار ہو جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ تجویز ان کی جانب سے ہو۔ میں صرف تعمیل حکم کروں۔ شاید اب وہ پہلے کی عادتیں چھوڑ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے آپ میں خانہ داری کے انتظام کی قابلیت نہ دیکھ کر انھوں نے تمام بار مجھ پر ڈال دیا ہے۔ منصوری میں گھر کا تمام انتظام وہی کرتے تھے۔ دو ڈھائی مہینہ میں پندرہ سو خرچ کیے۔ کہاں سے لائے یہ میں اب تک نہیں جانتی۔ پاس تو شاید ہی کچھ رہا ہو ممکن ہے کہ کسی دوست سے لے لیا ہو۔ تین سو روپیہ ماہوار کی آمدنی میں تھیئٹر اور سنیما کا ذکر ہی کیا۔ پچاس تو مکان ہی کے نکل جاتے ہیں۔ میں اس جنجال سے تنگ آگئی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ ونود سے کہہ دوں کہ یہ ٹھیلہ میرے چلائے نہ چلے گا۔ آپ تو دو ڈھائی گھنٹے یونیورسٹی میں کام کر کے چین کریں۔ خوب ٹینس کھیلیں۔ خوب ناول پڑھیں۔ خوب سوئیں۔ میں صبح سے آدھی رات تک گھر کے جھنجھٹوں میں الجھی رہوں۔ کئی بار چھیڑنے کا ارادہ کیا۔ دل میں ٹھان کر ان کے پاس گئی بھی۔ لیکن ان کی قربت میری ساری کدورتوں کو دور کر دیتی ہے۔ ان کا شگفتہ چہرۂ زیبا۔ ان کی بادۂ شباب سے سرمست آنکھیں۔ ان کی شیریں بیانی مجھ پر ایک جادو کر دیتی ہے اور میں مسحور ہو جاتی ہوں۔ ان کی ایک ہم آغوشی میری تمام کلفتوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ان میں اتنا حسن۔ اتنی شیریں گفتاری اور اتنا بانکپن نہ ہوتا تو شاید میں ان سے لڑ جھگڑ لیتی۔ اپنی مشکلات کا اظہار کر سکتی۔ اس حالت میں انھوں نے مجھے بھیڑ بنا لیا ہے۔ مگر اس مایا جال کو توڑنے کا موقع تلاش کر رہی ہوں۔ ایک طرح پر تو میں اپنی خودداری کھو چکی ہوں۔ میں کیوں ہر بات میں کسی کی ناراضگی سے ڈرتی رہتی ہوں۔ مجھ میں یہ جذبہ کیوں نہیں آتا کہ جو کچھ میں کر رہی ہوں وہ ٹھیک ہے میں کسی کا منہ کیوں دیکھا کرتی ہوں؟ اپنی اس کمزوری پر مجھے اقتدار حاصل کرنا ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ اب اس وقت رخصت چاہتی ہوں۔ اپنے یہاں کے حالات لکھنا، جی لگا ہے۔ ؟

(تمھاری پدما)

(8)

بنارس

پیاری پدما۔ !

تمھارا خط پڑھ کر مجھے کچھ دکھ ہوا۔ کچھ ہنسی آئی۔ کچھ غصہ آیا۔ تم کیا چاہتی ہو؟ یہ تمھیں خود معلوم نہیں۔ تم نے آئیڈیل شوہر پایا ہے۔ توہمت سے دل کو بے چین نہ کرو۔ تم آزادی کی خواستگار تھیں۔ وہ تمھیں مل گئی۔ دو آدمیوں کے لیے تین سو (300) کم نہیں ہوتے۔ اس پر ابھی تمھارے پاپا بھی سو روپے دیے جاتے ہیں۔ اب اور کیا چاہیے؟ مجھے خوف ہے کہ تمھارا دل پریشان اور منتشر ہوگیا ہے۔ میرے پاس تمھارے لیے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں۔

میں 15 تاریخ کو بنارس آگئی۔ پتی دیو خود ہی مجھے رخصت کرانے گئے تھے۔ گھر سے چلتے ہوئے بہت روئی۔ پہلے میں سمجھی تھی کہ لڑکیاں جھوٹ موٹ رویا کرتی ہیں۔ پھر میرے لیے تو والدین کی جدائی کوئی نئی بات نہ تھی۔ گرمی، دسہرہ اور بڑے دن کی چھٹیوں کے بعد چھ برس سے اس جدائی کو محسوس کر رہی تھی۔ کبھی آنکھوں میں آنسو نہ آئے تھے۔ سہیلیوں سے ملنے کی خوشی ہوتی تھی۔ مگر اس بار تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی اندر سے دل کو کھینچے لیتا ہے۔ اماں جی کے گلے سے لپٹ کر تو میں اس قدر روئی کہ مجھے غش آگیا۔ بابو جی کے پیروں پر لوٹ کر رونے کی خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ ہائے! وہ رونے کی خوشی! اس وقت بابو.جی کے چرنوں سے لپٹ کر رونے کے لیے میں اپنی جان تک دے دیتی۔ یہی رونا آتا تھا کہ میں نے ان کے لیے کچھ نہ کیا۔ میری پرورش اور پرداخت میں انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ میں جنم کی مریضہ ہوں۔ روز ہی بیمار رہتی تھی۔ اماں جی رات رات بھر مجھے گود میں لیے ہی بیٹھی رہتی تھیں۔ بابو.جی کے کندھوں پر چڑھ کر اچھلنے کودنے کی یاد مجھے اب بھی آتی ہے۔ انھوں نے کبھی مجھے کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ جہاں کبھی میرے سر میں درد ہوا۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے تھے۔ دس برس کی عمر تک تو یوں کٹے۔ چھ سال دہرہ دون میں گزرے۔ اور جب اس قابل ہوئی کہ ان کی کچھ خدمت کروں۔ تو اس طرح پر جھاڑ کر الگ ہوگئی۔ کل آٹھ مہینے تک ان کے چرنوں کی سیوا کر سکی۔

اور انھیں آٹھ مہینوں کو زندگی کا ماحصل سمجھتی ہوں۔ ایشور سے یہی دعا ہے کہ میرا جنم پھر اسی گود میں ہو۔ اور پھر اسی بے مثل پدری محبت کا لطف اٹھاؤں۔

شام کے وقت گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ میں زنانہ درجہ میں تھی اور لوگ دوسرے کمرے میں تھے۔ اس وقت یکایک مجھے پتی دیو کو دیکھنے کی زبردست خواہش ہوئی۔ تسکین، تشفی، ہمدردی اور پناہ کے لیے دل بے چین ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی قیدی کالے پانی جا رہا ہو۔

گھنٹہ بھر بعد ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ میں کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور کسی نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کمرے میں ایک عورت بھی نہ تھی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو ایک مرد۔ فوراً منہ چھپا لیا اور بولی۔ آپ کون ہیں؟ یہ زنانہ کمرہ ہے۔ مردانے کمرے میں جائیے۔

مرد نے کھڑے کھڑے کہا۔ میں تو اسی کمرہ میں بیٹھوں گا۔ مردانہ کمرہ میں بھیڑ بہت ہے۔

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ نہیں آپ اس میں نہیں بیٹھ سکتے۔

"میں تو بیٹھوں گا۔"

"آپ کو نکلنا پڑے گا۔ فوراً چلے جائیے ورنہ میں زنجیر کھینچ لوں گی۔"

"آخر میں بھی آدمی ہوں جانور نہیں ہوں۔ اتنی جگہ پڑی ہے۔ آپ کا اس میں کیا ہرج ہے؟"

گاڑی نے سیٹی دے دی۔ میں اور بھی گھبرا کر بولی۔ آپ نکلتے ہیں یا میں زنجیر کھینچوں؟

مردنے مسکرا کر کہاں۔ آپ نہایت غصہ ور معلوم ہوتی ہیں۔ ایک غریب شخص پر آپ کو ذرا بھی ترس نہیں آتا۔

گاڑی چل دی۔ فرط غصہ اور شرم سے مجھے پسینہ آگیا۔ فوراً دروازہ کھول کر بولی... اچھی بات ہے۔ آپ بیٹھیے میں جاتی ہوں۔

بہن! سچ کہتی ہوں۔ مجھے اس وقت قطعی خوف نہ تھا۔ جانتی تھی۔ گرتے ہی مر جاؤں گی۔ پر ایک اجنبی کے ساتھ تنہا بیٹھنے سے مر جانا اچھا تھا۔ میں نے ایک پیر لٹکایا

ہی تھا کہ اس شخص نے میری بانہہ پکڑ لی اور اندر کھینچتا ہوا بولا۔

اب تک تو مجھے آپ نے کالے پانی بھیجنے کا سامان کر دیا تھا۔ یہاں کوئی اور تو نہیں ہے؟ پھر آپ اس قدر کیوں گھبراتی ہیں؟ بیٹھئے۔ ذرا ہنسئے بولیے۔ اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ اتنی دیر تک تو نظر عنایت سے محروم نہ کیجیے۔ آپ کو دیکھ کر دل بے اختیار کھنچا جا رہا ہے۔ کیوں ایک غریب کا خون سر پر لیجیے گا۔

میں جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ تمام جسم کانپنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس وقت اگر میرے پاس کوئی چھری یا کٹار ہوتی تو میں ضرور اسے نکال لیتی۔ اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتی۔ مگر اس حالت میں غصہ سے ہونٹ چبانے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ ؟ آخر جھلانا فضول سمجھ کر ضبط کرنے کی کوشش کر کے بولی۔ آپ کون ہیں۔ ؟

اس نے بیباکی سے کہا۔ تمھارے پریم کا بھکاری۔

اگر آپ میرے عاشق ہیں۔ تو کم از کم اتنی بات مانئے کہ اگلے اسٹیشن پر اتر جایئے۔ مجھے بدنام کر کے آپ کچھ نہ پائیں گے۔ اتنا کرم کیجیے۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر یہ بات کہی۔ میرا گلا بھر آیا تھا۔ اس شخص نے دروازہ کی طرف جاکر کہا۔ اگر آپ کا یہی حکم ہے تو لیجیے جاتا ہوں۔ یاد رکھئے گا۔

اس نے دروازہ کھول کر ایک پاؤں آگے بڑھایا۔ مجھے معلوم ہوا۔ وہ کودنے جا رہا ہے۔ بہن! نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوگئی۔ میں نے بجلی کی طرح لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اور اپنی طرف زور سے کھینچ لیا۔

اس نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ کیوں کھینچ لیا۔ میں تو جارہا تھا۔

"اگلا اسٹیشن آنے دیجیے۔"

جب آپ بھگا ہی رہی ہیں تو جس قدر جلد بھاگ سکوں اتنا ہی اچھا ہے۔

"میں یہ کب کہتی ہوں کہ آپ چلتی گاڑی سے کود پڑیئے۔"

"اگر مجھ پر نظر عنایت ہے تو ذرا ایک بار اپنا دیدار دکھا دیجیے۔"

"اگر آپ کی بیوی سے کوئی دوسرا شخص ایسی باتیں کرتا تو آپ کو کیسا معلوم ہوتا؟"

مرد نے بھویں چڑھا کر غضبناک لہجہ میں کہا۔ میں اس کا خون پی جاتا۔
میں نے بلا جھجک کہا تو پھر آپ کے ساتھ میرے شوہر کیا سلوک کریں گے۔ یہ بھی آپ سمجھتے ہوں گے۔
پیاری! تم اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہو۔ تمھیں شوہر کی مدد کی ضرورت ہی نہیں۔ اب آؤ۔ میرے گلے سے لگ جاؤ۔ میں ہی تمھارا خوش نصیب شوہر ہوں۔
میرا دل اچھل پڑا۔ ایک بار منہ سے نکلا...... آ...... آپ......!! اور میں دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ایک ساتھ لمبا گھونگٹ کھینچ لیا۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔
شوہر نے کہا۔ 'اب یہ شرم اور پردہ کیسا؟'
میں نے کہا۔ آپ بڑا چھل کرتے ہیں۔ اتنی دیر تک رلانے میں کیا مزہ آیا؟
"اتنی دیر میں میں نے تمھیں جتنا پہچان لیا۔ اتنا گھر کے اندر شاید برسوں میں بھی نہ پہچان سکتا۔ کیا تم گاڑی سے سچ مچ کود پڑتیں؟"
"ضرور"
"بڑی خیریت ہوئی۔ مگر یہ مذاق بہت دنوں یاد رہے گا۔ "
میرے شوہر کا قد اوسط۔ رنگ سانولا، چہرہ پر چیچک کے داغ اور دبلے پتلے آدمی ہیں۔ میں نے ان سے کہیں خوبصورت شخص دیکھے ہیں۔ پر میرا دل اندر ہی اندر کس قدر خوشی کا احساس کر رہا تھا۔ کتنی روحانی آسودگی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا ذکر بیان سے باہر ہے۔
"میں نے پوچھا۔ "گاڑی کب تک پہنچے گی؟"
"شام کو پہنچ جائیں گے۔ "
میں نے دیکھا۔ شوہر کا چہرہ کچھ اداس ہوگیا ہے۔ وہ دس منٹ تک باہر کی طرف خاموش بیٹھے ہوئے تاکتے رہے۔ میں نے صرف باتوں میں لگانے کے لیے ہی یہ غیر ضروری سوال کیا تھا۔ لیکن جب وہ قطعی خاموش ہو رہے۔ تو میں نے پھر نہیں چھیڑا۔ پاندان کھول کر پان بنانے لگی۔
یکایک انھوں نے کہا۔ چندا ایک بات کہوں۔ ؟
میں نے کہا۔ "ہاں! ہاں! شوق سے کہیے۔ "

انھوں نے سر جھکا کر شرماتے ہوئے کہا۔ اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ تم اس قدر حسین ہو تو میں تم سے کبھی شادی نہ کرتا۔ اب تمھیں دیکھ کر مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ میں نے تمھارے ساتھ بے انصافی کی ہے میں کسی طرح تمھارے قابل نہ تھا۔

میں نے پان کا بیڑا انھیں دیتے ہوئے کہا۔ ایسی باتیں نہ کیجیے۔ آپ میرے سب کچھ ہیں۔ میں آپ کی داسی بن کر اپنے آپ کو دھنیہ سمجھتی ہوں۔

دوسرا اسٹیشن آگیا۔ گاڑی رکی۔ شوہر چلے گئے۔ جب جب گاڑی رکتی تھی۔ وہ آکر دوچار باتیں کر جاتے تھے۔ شام کو ہم لوگ بنارس پہنچ گئے۔ مکان ایک گلی میں ہے۔ اور میرے گھر سے بہت چھوٹا ہے۔ ان چند دنوں میں یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ساس جی کا مزاج کچھ خشک سا ہے۔ لیکن ابھی کسی کے بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ پھر لکھوں گی۔ مجھے اس کا فکر نہیں کہ گھر کیسا ہے؟ مالی حالت کیسی ہے؟ ساس سسر کیسے ہیں؟

میری خواہش ہے کہ یہاں سب کے سب مجھ سے خوش رہیں۔ پتی دیو کو مجھ سے محبت ہے۔ یہ میرے لیے کافی ہے۔ مجھے اور کسی بات کی پرواہ نہیں۔ تمھارے بہنوئی جی کا میرے پاس برابر آنا ساس جی کو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتی ہیں کہیں یہ سر نہ چڑھ جائے۔ یہ نا مہربانی ان کی مجھ پر کیوں ہے نہیں کہہ سکتی۔ پر اتنا جانتی ہوں کہ اگر وہ اس بات سے ناراض ہوتی ہیں تو ہماری بھلائی کے لیے۔ وہ ایسی کوئی بات کیوں کریں گی۔ جس میں ہمارا فائدہ نہ ہو۔ اپنی اولاد کی بدخواہ کوئی ماں نہیں ہوسکتی۔ مجھ میں ہی کوئی برائی انھیں نظر آتی ہوگی۔ دو چار دن میں آپ ہی معلوم ہو جائے گی۔ اپنے یہاں کے حالات لکھنا۔ جواب کی امید ایک مہینہ سے پیشتر تو ہے نہیں۔ یوں تمھاری خوشی۔

(تمھاری چندا)

(9)

دہلی یکم جنوری 1926

پیاری بہن!

تمھاری پہلی ملاقات کا حیرت انگیز بیان پڑھ کر دل کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ مجھے

تمھارے اوپر حسد ہو رہا ہے۔ میں نے سمجھا تھا۔ تمھیں مجھ پر حسد ہوگا۔ لیکن پانسہ الٹا ہو گیا۔ تمھیں ہر چہار طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ میں جدھر نظر ڈالتی ہوں۔ خشک ریت اور اکھنڈ ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ خیر اب کچھ میرے حالات سنو۔!

ونود کا یہ فلسفہ اب ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ کچھ عجیب وغریب شخص ہیں۔ گھر میں آگ لگے۔ پتھر پڑے۔ ان کی بلا سے انھیں مجھ پر ذرا بھی ترس نہیں آتا۔ میں صبح سے شام تک گھر کے جھنجھٹوں میں کڑھا کروں۔ انھیں کچھ پرواہ نہیں۔ ایسا بے درد شخص کبھی نہیں دیکھا تھا انھیں تو کسی جنگل میں تپسیا کرنی چاہئے تھی۔ ابھی تو خیر دو ہی آدمی ہیں۔ لیکن کہیں بال بچے ہوگئے۔ تب تو میں بے موت مر جاؤں گی۔ ایشور نہ کرے کہ میں اس سخت مصیبت کا شکار ہوں۔

چندا! مجھے اب دل سے یہ لگن ہے کہ کسی طرح ان کی یہ سادھی توڑ دوں۔ مگر کوئی تدبیر ٹھیک نہیں پڑتی۔ ایک دن میں نے ان کے کمرے کے لیمپ کا بلب توڑ دیا۔ کمرہ اندھیرا پڑا رہا۔ آپ سیر کر کے آئے تو کمرے میں اندھیرا دیکھا۔ مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہہ دیا کہ بلب ٹوٹ گیا ہے۔ آپ کھانا کھا کر سیدھے میرے کمرے میں آکر لیٹ گئے۔ اور ناولوں کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نہ معلوم وہ باقاعدگی کہاں چلی گئی۔ تمام دن گزر گیا۔ آپ کو بلب لگوانے کی کوئی فکر نہیں۔ آخر مجھ کو ہی بازار سے لانا پڑا۔

ایک دن میں نے جھنجھلا کر رسوئیے کو نکال دیا۔ سوچا۔ جب لالہ جی رات بھر بھوکے سوئیں گے۔ تب آنکھیں کھلیں گی۔ مگر اس بھلے آدمی نے پوچھا تک نہیں۔ چائے نہ ملی۔ کچھ پرواہ نہیں۔ ٹھیک دس بجے آپ نے کپڑے پہنے۔ ایک بار رسوئی خانہ کی جانب جا کر دیکھا۔ سناٹا تھا۔ بس چل دیے۔ انھیں اتنا تو کہنا چاہئے۔ مہاراج کہاں گئے۔ کیوں گئے؟ اب کیا انتظام ہوگا؟ کون کھانا پکائے گا۔ کم از کم اتنا تو مجھ سے کہہ سکتے تھے کہ اگر تم نہیں پکا سکتیں تو بازار ہی سے کچھ منگا لو۔

جب چلے گئے تو مجھے سخت رنج ہوا۔ رائل ہوٹل سے کھانا منگوایا اور نوکر کے ہاتھ کالج بھیج دیا۔ پر خود بھوکی ہی رہی۔ دن بھر بھوک کے مارے برا حال تھا۔ سر

میں درد ہونے لگا۔ آپ کالج سے آئے اور مجھے پڑے دیکھا تو ایسے پریشان ہوئے گویا میں سخت بیمار ہوں۔ اسی وقت ایک ڈاکٹر بھیجا۔ ڈاکٹر آئے۔ آنکھ دیکھی، زبان دیکھی، حرارت دیکھی، لگانے کی دوا الگ دی۔ پینے کی الگ۔ آدمی دوا لینے گیا۔ لوٹا تو بارہ روپے کا بل بھی تھا۔ مجھے ان باتوں پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ کہاں بھاگ کر چلی جاؤں۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ کرسی ڈال کر میری چارپائی کے پاس بیٹھ گئے۔ اور دم دم بھر پر دریافت کرنے لگے۔ کیسی طبیعت ہے۔ درد کچھ کم ہوا۔ یہاں بھوک کی شدت سے آنتیں شور مچا رہی تھیں۔ دوا ہاتھ سے چھوئی تک نہیں۔ آخر جھک مار کر میں نے پھر نوکر سے کھانا منگایا۔ پھر چال الٹی پڑی۔ میں ڈری کہ کہیں صبح پھر یہ حضرت ڈاکٹر کو نہ بلا بیٹھیں۔ اس لیے صبح ہوتے ہی ہار کر پھر گھر کے کام دھندے میں لگی۔ اسی وقت ایک دوسرا مہاراج بلایا۔ اپنے پرانے رسوئیے کو بے قصور نکال کر بطور سزا ایک کاٹھ کے الّو کو رکھنا پڑا۔ جو معمولی روٹیاں بھی نہیں پکا سکتا تھا۔ دونوں وقت دو گھنٹے اس رسوئیے کو سکھانے میں لگ جاتے ہیں۔ اسے اپنے کھانا پکانے پر اس قدر غرور ہے کہ میں خواہ کتنا ہی بک جھک کیوں نہ کروں۔ مگر وہ اپنی من مانی کرتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بیچ بیچ میں مسکرانے بھی لگتا ہے۔ گویا زبان حال سے کہتا ہے کہ تم ان باتوں کو کیا جانو۔ چپ چاپ بیٹھی دیکھتی جاؤ۔ جلانے چلی تھی ونود کو اور خود جل گئی۔ روپے جو خرچ ہوئے۔ وہ تو ہوئے ہی۔ ایک اور جنجال میں پھنس گئی۔ میں خوب جانتی ہوں کہ ونود کا ڈاکٹر کو بلانا۔ میرے پاس بیٹھے رہنا صرف دکھاوا تھا۔ ان کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ نہ تھی۔ دل میں ذرا بھی بے چینی نہ تھی۔

چندا! مجھے معاف کرنا۔ میں نہیں جانتی کہ ایسے شخص کے پالے پڑ کر تمھاری کیا حالت ہوتی؟ پر میرے لیے اس حالت میں رہنا ناقابل برداشت ہے۔ آگے جو حال میں سنانے والی ہوں۔ اسے سن کر تم ناک بھوؤں سکوڑو گی۔ مجھے کوسوگی، کلنکنی، کہوگی۔ جو چاہو کہو مجھے پرواہ نہیں۔ آج چار دن ہوئے میں نے "تریاچرتر" کا ایک نیا تماشہ کیا۔ ہم دونوں سینما دیکھنے گئے تھے۔ وہاں میرے پاس ہی ایک بنگالی بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ ونود سینما میں اس طرح بیٹھے ہیں۔ گویا عالم استغراق میں ہیں۔ نہ بولنا نہ چالنا۔ فلم اس قدر خوبصورت تھا۔ ایکٹنگ اتنا باکمال اور زندگی بخش کہ میرے منہ سے

بار بار آفرین و مرحبا کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ بنگالی بابو کو بھی بڑا لطف آرہا تھا۔ ہم دونوں اس فلم پر تنقید کرنے لگے۔ وہ فلم کے جذبات پر ایسی تنقید کرتا تھا کہ دل بے خود ہوا جاتا تھا۔ فلم سے زیادہ لطف مجھے اس کی گفتگو میں آرہا تھا۔

بہن ! سچ کہتی ہوں۔ شکل وصورت کے لحاظ سے وہ ونّود کے تلوؤں کی برابری بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر صرف ونّود کے جلانے کے لیے میں اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے سمجھا کوئی شکار پھنس گیا۔ انٹرول میں جب وہ باہر جانے لگا تو میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر ونّود اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہے۔

میں نے کہا۔ باہر چلتے ہو۔ 'میری تو بیٹھے بیٹھے کمر دکھ گئی۔'

ونود بولے۔ 'ہاں ہاں چلو۔ ادھر ادھر ٹہل آئیں۔'

میں نے لاپرواہی سے کہا۔ اگر تمھارا جی نہیں چاہتا۔ تو نہ چلو، میں مجبور نہیں کرتی۔

ونود پھر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "اچھی بات ہے۔"

میں باہر آئی تو بنگالی بابو نے پوچھا۔ کیا آپ یہیں کی رہنے والی ہیں۔ ؟

"میرے شوہر یہاں یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔"

"اچھا یہ آپ کے شوہر ہیں۔ عجیب شخص ہیں۔"

"آپ کو تو شاید میں نے یہاں پہلی ہی دفعہ دیکھا ہے۔"

"ہاں میرا مکان تو بنگال میں ہے۔ کنچن پور کے مہاراجہ کا پرائیویٹ سکریٹری ہوں۔ مہاراجہ صاحب وائسرائے سے ملنے آئے ہیں۔

"تو ابھی دو چار دن رہیے گا؟"

"جی ہاں ! امید تو کرتا ہوں۔ رہوں تو سال بھر رہ جاؤں۔ جاؤں تو دوسری گاڑی سے چلا جاؤں۔ ہمارے مہاراجہ صاحب کا کچھ ٹھیک پتہ نہیں۔ یوں نہایت خلیق اور ملنسار شخص ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

یہ باتیں کرتے کرتے ہم ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ بابو نے چائے اور ٹوسٹ لیا۔ اور میں نے صرف چائے لی۔

"تو اسی وقت آپ کا مہاراجہ صاحب سے تعارف کرادوں۔ آپ کو تعجب ہوگا

کہ صاحب تاج تخت میں بھی اتنی انکساری ہو سکتی ہے۔ ان کی باتیں سن کر آپ مسحور ہو جائیں گی۔"

میں نے آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر کہا۔ جی نہیں پھر کسی دن پر رکھئے۔ آپ سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔ لیجیے اتنی باتیں ہو گئیں اور آپ کا نام تک نہ پوچھا۔

بابو نے اپنا نام بھون موہن داس گپتا بتایا۔ میں نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

میں نے شرارت کے انداز سے پوچھا۔ کیا آپ کی اہلیہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں؟

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ میں ابھی کنوارا ہی ہوں۔ اور شاید کنوارا ہی رہوں۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ اچھا تو آپ بھی عورتوں سے بھاگنے والے اشخاص میں سے ہیں۔

"جی ہاں! میں ان بدنصیبوں میں ہوں۔ جو ایک بار مایوس ہو کر پھر اس کا امتحان نہیں کرتے۔ حسن کی تو دنیا میں کمی نہیں۔ مگر حسن اور صفات کی یک جہتی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جس نازنین سے مجھ کو محبت تھی۔ وہ آج ایک نہایت دولت مند وکیل کی بیوی ہے۔ میں غریب تھا۔ اس کی سزا مجھے یہ ملی کہ تمام زندگی نہ بھولے گی۔ سال بھر تک جس کی اپاسنا کی جب اس نے مجھے دولت پر قربان کر دیا۔ تو اب اور کیا امید رکھوں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ آپ بہت جلد ہمت ہار گئے۔

بھون نے سامنے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے آج تک کوئی ایسا دلاور شخص نہیں دیکھا۔ جسے عورتوں سے شکست فاش نہ ملی ہو۔ یہ دل پر چوٹ کرتی ہیں اور دل ایک ہی گہری چوٹ برداشت کر سکتا ہے۔ جس نازنین نے میری محبت کو حقیر سمجھ کر پیروں سے کچل دیا۔ اسے میں دکھانا چاہتا ہوں کہ میری آنکھوں میں دولت کتنی حقیر شے ہے۔ یہی میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔ میں اپنی زندگی کو اسی دن مبارک اور کامیاب سمجھوں گا۔ جب بملا کے مکان کے سامنے میرا بلند وبالا......

عظیم الشان محل ہوگا۔ اور اس کا شوہر مجھ سے ملنے میں اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔

میں نے نہایت متانت وسنجیدگی سے کہا۔ یہ تو کوئی بہت بلند وبالا آدرش

نہیں۔ آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ بملا نے صرف دھن و دولت کے لیے آپ کو چھوڑا۔ ممکن ہے اس کے کچھ اور اسباب ہوں۔ ماں باپ نے اس پر دباؤ ڈالا ہو۔ یا اپنے ہی میں اس کو کوئی نقص نظر آیا ہو۔ جس سے آپ کی زندگی دکھ سے بھر جاتی۔ آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ جس محبت سے محروم ہو کر آپ اس قدر دکھی ہوئے ہیں۔ اسی محبت سی محروم ہو کر وہ سکھی ہوئی ہوگی۔ ممکن تھا کوئی دولتمند بیوی پاکر آپ بھی پھسل جاتے۔

بھون نے زوردے کر کہا۔ یہ غیر ممکن ہے۔ ناممکن ہے۔ میں اس کے لیے دنیا کا تاج و تخت قربان کر دیتا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ہاں اس وقت آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ مگر ایسے امتحان میں پڑ کر آپ کی کیا حالت ہوتی؟ اسے آپ یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتے۔ سپاہی کی بہادری کا ثبوت اس کی تلوار ہے۔ اس کی زبان نہیں۔ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھیے کہ آپ کو اس امتحان میں نہیں پڑنا پڑا۔ وہ محبت محبت نہیں جو انتقام کی آڑ لے۔ محبت کی ابتدا کشادہ دلی ہے اور انتہا بھی۔ ممکن ہے آپ کو اب بھی کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو بملا کی طرف سے آپ کو نرم کردے۔

بھون خیال میں غوطہ زن ہوگئے۔ ایک منٹ کے بعد انھوں نے سر اٹھایا اور بولے۔ مسز ونود! آپ نے مجھے آج ایسی بات سمجھادی جو آج تک میرے خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ میرے دل میں کبھی اس امر کا احساس بھی نہیں ہوا۔ میں اتنا لاپرواہ کیوں ہوگیا۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ اگر محبت کے بلند و بالا نصیب العین کا کسی کو احساس ہے اور کوئی اسے بخوبی نبھا سکتا ہے تو وہ صرف صنف نازک۔ مرد و محبت کے واسطے کوئی قربانی نہیں کرسکتا۔ وہ محبت کو خود غرضی اور خواہشات سے علیٰحدہ نہیں کر سکتا۔ اب میری زندگی راحت و اطمینان کا شانہ بن جائے گی۔ آپ نے مجھے جو سبق دیا ہے۔ اس کے عوض آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے بھون یک بیک چونک پڑے اور بولے۔ ”اُف میں کتنا بیوقوف ہوں۔ تمام نکات و رموز سمجھ میں آگئے۔ کوئی بات مخفی نہیں۔ آہ میں نے بملا کے ساتھ سخت بے انصافی کی۔ میری آنکھوں پر قطعی پردہ پڑگیا تھا۔ بملا! مجھے معاف کردو۔

بھون دیر تک اسی طرح گریہ و زاری کرتے رہے۔ بار بار میرا شکریہ ادا کرتے تھے اور اپنی بیوقوفی پر کف افسوس ملتے تھے۔ اس کشمکش میں ہمیں معلوم تک نہ ہوا کہ کب گھنٹی بجی اور کب کھیل شروع ہوگیا۔ یکایک ونود کمرے میں داخل ہوئے۔ میں چونک پڑی۔ میں نے ان کی جانب دیکھا۔ کسی جذبہ کا پتہ نہ تھا۔ بولے پدما! اب تک تم یہاں ہی ہو۔ کھیل شروع ہوئے تو دیر ہوئی۔ میں چاروں طرف تمھیں تلاش کر رہا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ کھیل شروع ہوگیا؟ گھنٹی کی آواز تو سنائی ہی نہ دی۔

بھون بھی اُٹھے۔ ہم پھر آکر تماشہ دیکھنے لگے۔ اگر ونود نے اس وقت مجھے دوچار چبھتی ہوئی باتیں کہہ دی ہوتیں۔ ان کی آنکھوں میں غصہ کی جھلک دکھائی دیتی، تو میرا بے چین دل سنبھل جاتا۔ تسکین ہو جاتی۔ لیکن ان کے سکون کامل نے مجھے اور بھی بے چین کردیا۔ بہن! میں چاہتی ہوں وہ مجھ پر حکومت کریں۔ میں ان کی سنگدلی، ان کے ظلم اور ان کے اقتدار کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان کی محبت، عیش و عشرت اور اعتقاد کے لطف سے شاد کام ہوچکی۔ اس سے میری روح کو تسکین نہیں ہوتی۔ تم اس باپ کو کیا کہوگی۔ جو اپنے لڑکے کو اچھا کھلائے، اچھا پہنائے۔ لیکن اس کی تعلیم وتربیت کی کوئی فکر نہ کرے۔ وہ جس رستہ جائے۔ جانے دے۔ جو کچھ کرے وہ کرنے دے۔ کبھی اسے سخت آنکھوں سے بھی نہ دیکھے ایسا لڑکا یقیناً آوارہ ہو جائے گا۔ میرا بھی وہی حال ہوا جاتا ہے۔ یہ کمی میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اس بھلے آدمی نے یہاں تک نہ پوچھا کہ بھون کون ہیں۔ بھون نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ اس کا شوہر اس کی قطعی پرواہ نہیں کرتا۔ ونود خود آزاد رہنا چاہتے ہیں اور مجھے بھی آزاد چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ وہ میرے کسی کام میں مداخلت سے کام نہیں لیتے۔ اسی طرح چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کے کسی کام میں دخل نہ دوں۔ میں اس آزادی کو دونوں کے لیے زہر سمجھتی ہوں۔ دنیا میں آزادی کی کچھ قیمت ہو۔ گھر میں تو بندش ہی بار آور ہوتی ہے۔ میں جس طرح اپنے ایک زیور کو اپنا سمجھتی ہوں۔ اسی طرح ونود کو بھی اپنا سمجھنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھ سے دریافت کیے بغیر ونود اسے کسی کو دے دیں تو میں لڑپڑوں گی۔

میں چاہتی ہوں۔ اسی طرح ان پر میرا قبضہ ہو اور اپنے اُوپر بھی ان کو اسی طرح قابض دیکھنا چاہتی ہوں۔ انھیں میری ایک ایک بات پر نظر رکھنی چاہیے۔ میں کس سے ملتی ہوں۔ کہاں جاتی ہوں۔ کیا پڑھتی ہو۔ کس طرح زندگی بسر کرتی ہوں۔ ان تمام باتوں پر ان کی سخت نظر ہونی چاہئے۔ جب وہ میری پرواہ نہیں کرتے تو میں ان کی پرواہ کیوں کروں۔ اس کشمکش میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہوتے جارہے ہیں اور کیا کہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کن دوستوں کو روز خط لکھتے ہیں۔ انھوں نے بھی مجھ سے کبھی نہیں پوچھا۔ خیر میں لکھ رہی تھی۔ کیا کہنے لگی۔

ونود نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں پھر بھون سے فلم کے متعلق گفتگو کرنے لگی۔

جب کھیل ختم ہوگیا اور ہم لوگ باہر آئے اور تانگہ طے کرنے لگے۔ تو بھون نے کہا۔ میں آپ کو اپنی کار میں پہنچادوں گا۔

ہم نے کوئی عذر نہیں کیا۔ ہمارے مکان کا پتہ دریافت کرکے بھون نے کار چلادی۔ راستہ میں میں نے بھون سے کہا" کل دوپہر کو میرے یہاں کھانا کھایئے گا" بھون نے قبول کرلیا۔

بھون تو ہمیں پہنچا کر چلے گئے۔ پر میرا دل بہت دیر تک انھیں میں لگا رہا۔ ان دو تین گھنٹوں میں بھون کو میں جتنا سمجھی۔ اتنا ونود کو آج تک نہیں سمجھی۔ میں نے اپنے دل کی جتنی باتیں اس سے کہہ دیں۔ اتنی ونود سے آج تک نہیں کہیں۔ بھون ان لوگوں میں سے ہے جو کسی غیر مرد کو میری طرف بری نگاہیں ڈالتے دیکھ کر اس کی جان کے درپے ہوجائے گا۔ اسی طرح مجھے کسی شخص سے ہنستے دیکھ کر میرا خون پی لے گا اور ضرورت پڑنے پر میرے لیے آگ میں کود پڑے گا۔ ایسی مردانہ فطرت میرے دل کو تسخیر کر سکتی ہے۔ صرف میرے ہی دل پر نہیں۔ بلکہ تمام صنفِ نازک ایسے ہی شخص پر جان دیتی ہے۔ وہ کمزور ہے۔ اسی لیے طاقت ور کی تلاش کرتی ہے۔

بہن! تم گھبرا گئی ہوگی خط بہت طویل ہوگیا۔ مگر اس بات کو ختم کیے بغیر رہاجاتا۔ میں نے صبح سے ہی بھون کی دعوت کی تیاریاں شروع کردیں۔ رسوئیا تو

کاٹھ کا الو ہے۔ تمام کام اپنے ہاتھوں سے سر انجام دیا۔ کھانا پکانے میں ایسا لطف اس سے پیشتر مجھے کبھی نہیں حاصل ہوا تھا۔ :

ٹھیک وقت پر بھون کی کار آپہنچی۔ وہ اترے اور سیدھے میرے کمرے میں آئے۔ دوچار باتیں ہوئیں ڈنر ٹیبل پر پہنچے۔ ونود بھی کھانا کھانے آئے۔ میں نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ مجھے ایسا احساس ہوا۔ جیسے ونود نے بھون کی جانب سے کچھ روکھا پن ظاہر کیا۔ انھیں روؤسا اور راجگان سے کچھ چڑ ہے۔ جب راجاؤں سے چڑ ہے تو ان کے پھوؤں سے کیوں نہ ہوتی؟ وہ سمجھتے ہیں ان روؤسا کے دربار میں خوشامدی نکمے بے اصول اور انسانیت سے خالی لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ جن کا اس کے سوا اور کوئی کام نہیں کہ اپنے رئیس کی ہر جائز وناجائز خواہش پوری کریں اور رعایا کا گلا کاٹ کر اپنا گھر بھریں۔ کھانا کھاتے وقت گفتگو کا سلسلہ رفتہ رفتہ شادی اور محبت جیسے اہم مسئلہ پر آپہنچا۔

ونود نے کہا۔ میں موجودہ طریق شادی کو پسند نہیں کرتا۔ یہ رواج اس وقت جاری ہوا تھا۔ جب انسان تہذیب کی ابتدائی حالت میں تھا۔ اب دنیا اس سے کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ مگر شادی کی رسم ورواج میں رتی بھر بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ طریق زمانہ موجودہ کے لیے موزوں نہیں۔

بھون نے کہا آخر آپ کو اس میں کیا نقص دکھائی دیتا ہے؟

ونود نے کسی قدر غور وخوض کے بعد کہا۔ اس میں سب سے بڑا ایک یہ عیب ہے کہ یہ ایک مجلسی سوال کو دھرم کی صورت دے دیتا ہے۔

''اور دوسرا''؟

''دوسرا یہ کہ یہ لوگوں کی آزادی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ یہ استری برت اور پتی برت کا سانگ بھر کر ہماری روح کو مقید کر دیتا ہے۔ ہماری عقلی نشو و نما میں جتنی رکاوٹ اس رواج نے ڈالی ہے۔ دنیا کے کسی انقلاب سے نہیں ہوئی۔ اس نے کتنے ہی لایعنی نصب العین ہمارے سامنے رکھ دیئے اور آج تک ہم اسی بوسیدہ شرمناک، حیوانی لکیروں کو پیٹتے چلے آتے ہیں۔ برت صرف ایک بے معنی بندھن کا نام ہے۔ اتنا عظیم الشان نام دے کر ہم نے اس قید کو دھرم کی شکل دے دی ہے۔ مرد کیوں چاہتا ہے

کہ عورت اس کو اپنا ایشور اور اپنا سب کچھ تصور کرے۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کا کفیل ہے۔ کیا عورت کا فرض صرف مرد کی جائداد کے لیے وارث پیدا کرنا ہے۔ اس جائداد کے لیے جس پر ہندونیتی، وید، شاستر، کے بموجب شوہر کی وفات کے بعد اس کا کوئی حق نہیں رہتا۔ سماج کا یہ سارا نظام جائداد کی حفاظت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ اس نے دولت کو مقدم اور شخصیت کو موخر کر دیا ہے۔ ہمارے ہی نطفہ سے پیدا شدہ اولاد ہماری جائداد سے گلچھرّے اڑائے۔ ان خیالات میں کتنی خود غرضی، غلامی مضمر ہے۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس قید میں جکڑی ہوئی سماج کی اولاد اگر آج گھر میں، ملک میں، دنیا میں اپنی خود غرضی کی خاطر خون کی ندیاں بہا رہی ہے تو تعجب کیا ہے۔ میں اس طریق شادی کو ہی تمام برائیوں کی جڑ سمجھتا ہوں۔

بھون متحیر ہوگیا۔ میں خود دنگ رہ گئی۔ ونود نے اس مضمون پر مجھ سے کبھی اتنی باالتفصیل گفتگو نہ کی تھی۔ ۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ مساوات کے حامی ہیں۔ دو ایک بار اس مضمون پر ان سے بحث بھی کر چکی ہوں۔ پر موجودہ طریق شادی کے وہ اس قدر خلاف ہیں۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ بھون کے بشرہ سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے ایسے فلسفہ آمیز خیالات کی بو بھی نہیں پائی۔ ذرا دیر بعد بولے۔

"پروفیسر صاحب! آپ نے تو مجھے ایک بڑے چکر میں ڈال دیا۔ آخر آپ اس رواج کی جگہ کوئی اور رسم رکھنا چاہتے ہیں یا شادی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ جس طرح حیوانات آپس میں ملتے ہیں۔ وہی ہمیں بھی کرنا چاہیے۔"

ونود نے فوراً جواب دیا۔ بہت کچھ حیوانات میں سب کے دل یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے ہیں جو جوڑے کے انتخاب میں کوئی خاص خیال نہیں رکھتے۔ کچھ ایسے ہیں جو ایک بار بچے پیدا کرنے کے بعد علیحدہ ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو زندگی بھر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ کتنی ہی مختلف جماعتیں ہیں۔ میں اسی جماعت کو افضل سمجھتا ہوں جو تمام زندگی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ مگر اپنی مرضی سے ان کے یہاں کوئی قید نہیں۔ کوئی سزا نہیں۔ دونوں اپنے اپنے چارہ دانہ کا فکر کرتے ہیں۔ دونوں مل کر رہنے کی جگہ بناتے ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی تیسرا نر یا مادہ آہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ ان میں سے ایک مر جاتا ہے تو

دوسرا مرتے دم تک بالکل پھٹیل رہتا ہے۔ یہ اندھیر انسانی قوم میں ہے کہ جہاں عورت نے کسی دوسرے مرد سے ہنس کر بات کی اور اس کے شوہر کے سینہ پر سانپ لوٹنے لگا۔ خون خرابہ کے منصوبے سوچے جانے لگے۔ اگر مرد نے کسی دوسری عورت کی طرف اشتیاق کی نگاہوں سے دیکھا۔ تو بیوی کے تیوروں پر فوراً بل آگیا۔ شوہر کی جان لینے پر آمادہ ہوگئی۔ یہ سب کیا ہے؟ ایسا سماج کس منہ سے تہذیب کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

بھون نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ اتنا آسان کام نہ ہوگا یا تو مرد ایسی بیوی کا خواستگار ہوگا۔ جو اولاد کی پرورش خود ہی کر سکتی ہو یا اسے یک مشت تمام رقم ادا کرنا ہوگی۔

پھر ہنس کر کہا۔ آپ اپنے کو کس جماعت میں رکھیں گے؟

ونود اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ تھا بھی بے تکا سوال۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ میں عورت اور مرد دونوں کے لیے پوری آزادی کا حامی ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ میرا دل کسی نوخیز کی جانب مائل ہو اور وہ بھی مجھے چاہے۔ مگر سماج اور نیتی کے خوف سے اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکوں۔ میں اسے پاپ نہیں سمجھتا۔

بھون ابھی کچھ جواب نہ دینے پائے تھے کہ ونود اٹھ کھڑے ہوئے کالج کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ فوراً کپڑے پہنے اور چل دیے۔ ہم دونوں دیوان خانہ میں آکر بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔

بھون نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ سنا۔ کہاں جاکر تان ٹوٹی۔ "

میں نے شرم سے سر جھکا لیا۔ کیا جواب دیتی۔ ونود کی آخری بات نے میرے دل پر سخت چوٹ پہنچائی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ونود نے صرف مجھے ستانے کے لیے شادی پر یہ اعتراض گڑھا ہے۔ وہ مجھ سے اپنا دامن چھڑا لینا چاہتے ہیں۔ وہ کسی اور عورت کی تاک میں ہیں۔ مجھ سے ان کا جی بھر گیا ہے۔ اس خیال سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اگر میں تنہا ہوتی تو کبھی نہ روتی۔ مگر بھون کے سامنے اپنے آپ پر قادر نہ رہ سکی۔ بھون نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ ناحق اس قدر غم کرتی ہیں۔ مسٹر ونود خواہ آپ کی قدر نہ کریں۔ مگر دنیا میں

کم از کم ایک ایسی ہستی بھی ہے۔ جو آپ کے اشارہ پر جان تک نثار کر سکتی ہے۔ آپ جیسا گراں بہا رتن پا کر دنیا میں کون ایسا شخص ہے جو اپنی قسمت پر نازاں نہ ہوگا۔ آپ قطعی اس کا فکر نہ کریں۔"

مجھے بھون کی یہ بات سخت ناگوار معلوم ہوئی۔ غصہ سے میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ یہ مکار میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مجھے تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اپنی بدقسمتی پر بار بار رونا آتا تھا۔ ابھی شادی ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا اور میری یہ حالت ہوگئی کہ دوسروں کو مجھے بہکانے اور مجھ پر اپنا جادو چلانے کا حوصلہ ہو رہا ہے۔ جس وقت میں نے ونود کو دیکھا تھا۔ اس وقت مجھے کس قدر روحانی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ میں نے کسی عقیدت سے اپنا مایۂ دل ان کے قدموں میں نذر کیا تھا۔ مگر کیا خبر تھی کہ اس قدر جلد میں ان کی نظروں سے گر جاؤں گی اور مجھے خانہ خراب سمجھ کر یہ بدمعاش مجھ پر ڈورے ڈالیں گے۔

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے معافی کی خواستگار ہوں۔ ذرا آرام کرنے دیجیے۔"

"ہاں، ہاں! آپ آرام کریں میں بیٹھا رہوں گا۔"

"جی نہیں۔ اب آپ مہربانی فرما کر تشریف لے جائیں۔ اس طرح مجھے آرام نہ ملے گا۔"

بہت اچھا۔ آپ آرام کریں۔ میں شام کو آکر دیکھ جاؤں گا۔"

جی نہیں۔ آپ کو تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔

اچھا تو میں کل آؤں گا۔ شاید راجہ صاحب بھی تشریف لائیں۔

نہیں آپ لوگ میرے پیغام کا انتظار کریں۔ بغیر بلائے نہ آیئے گا۔

یہ کہہ کر میں اپنی خواب گاہ کی طرف چلی۔ بھون دم بھر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر چپ چاپ چلا گیا۔

بہن! اسے گئے ہوئے دو دن ہوگئے ہیں۔ اس وقت سے میں کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ بھون دو تین بار آچکا ہے۔ مگر میں نے اسے ملنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ اب شاید اسے پھر آنے کا حوصلہ نہ ہوگا۔ ایشور نے بڑے نازک موقعہ پر عقل

بخشی۔ ورنہ میں اب تک اپنا ستیاناس کر چکی ہوتی۔ ونود عام طور پر میرے پاس ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن ان سے بات چیت کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ جو مرد نفس پرستی کو شاستروں کے احکامات سے ثابت کر سکتا ہے۔ جس کی نگاہوں میں شادی جیسے مقدس بندھن کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ جو نہ میرا ہو سکتا ہے اور نہ مجھے اپنا بنا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ مجھ جیسی خود پرور عورت کا کتنے دنوں تک نباہ ہوگا۔

بس اب رخصت ہوتی ہوں۔ بہن! معاف کرنا۔ میں نے تمھارا قیمتی وقت لیا ہے۔ مگر اتنا سمجھ لو کہ میں تمھارے رحم کی نہیں۔ بلکہ ہمدردی کی خواہاں ہوں۔

(تمھاری پدما)

(10)

بنارس۔ 5 جنوری 1926

پیاری بہن!

تمھارا خط پڑھ کر مجھے احساس ہوا۔ جیسے کوئی ناول پڑھ کر اٹھی ہوں۔ اگر تم ناول لکھو تو مجھے یقین ہے کہ اس کی دھوم مچ جائے۔ تم آپ اس کی ہیروئن بن جانا۔ مجھے تو یہی تعجب ہے کہ تم ایسی ایسی باتیں کہاں سے سیکھ گئیں۔ اس بنگالی کے ساتھ تنہا بیٹھی ہوئی تم کیوں کر گفتگو کرتی رہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں تو کبھی نہ کر سکتی۔ تم ونود کو جلانا چاہتی ہو۔ ان کے دل کو پریشان کرنا چاہتی ہو۔ ہائے اس غریب کے ساتھ تم کس قدر بے انصافی کر رہی ہو۔ تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ ونود تم سے بے اعتنائی کر رہے ہیں؟ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ انھیں کوئی دلی تکلیف پریشان کیے رہتی ہے۔ انھیں کوئی ایسا فکر لاحق ہے کہ زندگی کے معمولی امور میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ممکن ہے ان کا دماغ فلسفہ کے کسی مشکل مسئلہ کی عقدہ کشائی میں منہمک ہو۔ کوئی مضمون لکھ رہے ہوں یا کسی کتاب کی تصنیف میں مصروف ہوں کون کہہ سکتا ہے ؟ تم جیسی حسین بیوی پاکر بھی اگر کوئی شخص متفکر رہے تو سمجھ لو۔ اس کے دل پر کوئی بہت برا بوجھ ہے۔ ان کو تمھاری ہمدردی کی ضرورت ہے۔ تم ان کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہو۔ مگر تم تو انھیں کو قصوروار ٹھہراتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ونود سے ایک دن کیوں دل کھول کر باتیں نہیں کر لیتیں۔ شک

کو جس قدر جلد ممکن ہو۔ دل سے نکال دینا چاہیے۔ شک وہ چوٹ ہے کہ اگر اس کا علاج جلد نہ ہو تو ناسور پڑ جاتا ہے اور پھر اچھا نہیں ہوتا۔ دو چار دن کے لیے یہاں کیوں نہیں چلی آتیں۔ ممکن ہے تو یہ کہو کہ تو خود کیوں نہیں آجاتی۔ اس لیے ایک بات بتا دیتی ہوں کہ میں آزاد نہیں ہوں۔ ساس سسُر کی اجازت کے بغیر میں کوئی کام نہیں کر سکتی۔ مگر تم آزاد ہو اور تمھارے لیے کوئی بندھن نہیں ہے۔

بہن! آج کل میری زندگی میں خوشی و رنج دونوں عجیب طور پر مل رہے ہیں۔ اکیلے ہوتی ہوں تو روتی ہوں۔ آنند آجاتے ہیں تو ہنستی ہوں۔ جی چاہتا ہے وہ ہر وقت میرے نگاہوں کے سامنے بیٹھے رہیں۔ لیکن رات کے بارہ بجے سے پیشتر ان کے درشن نہیں ہوتے۔ ایک دن دوپہر کو آگئے تھے۔ اس پر ساس جی نے اس بری طرح خبر لی کہ کوئی بچے کو کیا ڈانٹے گا۔ مجھے ایسا خوف ہو رہا ہے کہ ساس جی کو مجھ سے کچھ چڑ سی ہے۔ بہن! میں انھیں حتیٰ المقدور خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ جو کام کبھی نہ کیے تھے ان کے لیے کرتی ہوں۔ ان کے نہانے کے لیے پانی گرم کرتی ہوں۔ ان کی پوجا کے لیے چوکی بچھاتی ہوں۔ جب نہا لیتی ہیں تو ان کی دھوتی صاف کرتی ہوں۔ لیٹتی ہیں تو پیر دباتی ہوں۔ سو جاتی ہیں تو پنکھا جھلتی ہوں۔ وہ میری ماتا ہیں۔ میں ان کی کچھ خدمت کر سکوں۔ اس سے زیادہ میری خوش قسمتی اور کیا ہوگی؟ میں صرف اس قدر چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے ہنس کر بولیں۔ مگر نہ معلوم کیوں وہ مجھے بات بات پر کوسا کرتی ہیں؟ میں جانتی ہوں۔ قصور میرا ہی ہے۔ ہاں! مجھے معلوم نہیں وہ کیا ہے۔ اگر میرا یہی قصور ہے کہ اپنی دونوں نندوں سے خوبصورت کیوں ہوں۔ پڑھی لکھی کیوں ہوں۔ آنند مجھے اتنا کیوں چاہتے ہیں؟ تو بہن! یہ میرے بس کی بات نہیں۔ شاید ساس جی کا میرے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر آنند ماتا جی سے کچھ کھنچے رہتے ہیں۔ ساس جی کو یہ دھوکا ہوتا ہوگا کہ میں ہی آنند کو سکھاتی پڑھاتی ہوں۔ شاید وہ پچھتاتی ہیں کہ کیوں مجھے بہو بنایا۔ انھیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں میں ان کے بیٹے کو ان سے چھین نہ لوں۔ دو ایک بار مجھے جادو گرنی کہہ چکی ہیں۔ دونوں نند بھی بلا وجہ ہی مجھ سے جلتی رہتی ہیں۔ بڑی نند جی تو بیوہ ہو گئی ہیں۔ ان کا جلنا سمجھ میں آتا ہے لیکن چھوٹی نند جی تو ابھی نوخیز ہیں۔ ان کا جلنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں

ان کی جگہ ہوتی تو اپنی بھاوج سے کچھ سیکھنے پڑھنے کی کوشش کرتی اور ان کے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ مگر اس چھوکری کو میری بے حرمتی ہی کرنے میں مزہ آتا ہے۔ میں جانتی ہوں تھوڑے دنوں میں دونوں نندیں شرمسار ہوں گی۔ ہاں! ابھی وہ مجھ سے بھڑکتی ہیں۔ میں خود تو اپنی طرف سے انھیں ناخوش ہونے کا کوئی موقعہ نہیں دیتی۔

مگر حسن کو کیا کروں۔ کیا خبر تھی کہ ایک دن اس حسن کی بدولت میں قصور وار ٹھہرائی جاؤں گی۔ بہن! میں سچ کہتی ہوں کہ جب سے یہاں آئی ہوں ایک طرح پر سنگار کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میلی کچیلی ہی بیٹھی رہتی ہوں۔ صرف اس خوف سے کہ کہیں کوئی میرے پڑھنے لکھنے پر ناک بھوں نہ سیکڑے۔ کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتی۔ گھر سے کتابوں کا ایک انبار ساتھ لائی تھی۔ ان میں کتنی ہی کتابیں نہایت اچھی ہیں۔ انھیں پڑھنے کے لیے بار بار جی چاہتا ہے۔ مگر ڈرتی ہوں کہ کہیں کوئی طعنہ نہ دے بیٹھے۔ دونوں نندیں مجھے دیکھتی رہتی ہیں کہ یہ کیا کرتی ہے۔ کیسے بیٹھتی ہے۔ کیسے بولتی ہے۔ گویا دو، دو جاسوس میرے پیچھے لگا دیے ہیں۔ ان دونوں عورتوں کو میری بدگوئی میں کیوں اتنا مزہ آتا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتی۔ شاید آج کل انھیں اس کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ غصہ تو ایسا آتا ہے کہ ایک بار جھڑک دوں۔ لیکن دل کو سمجھا کر روک لیتی ہوں۔ یہ حالت بہت دنوں نہیں رہے گی۔ کسی نئے آدمی سے جھجکنا فطرتی ہے۔ بالخصوص جب وہ نیا شخص تعلیم اور معاشرت میں ہم سے اختلاف رکھتا ہو۔ اگر مجھ کو ہی کسی فرانسیسی لیڈی کے ساتھ رہنا پڑے تو شاید میں بھی اس کی ہر ایک بات پر تبصرہ کرتی رہوں۔ یہ کاشی باسی پوجا پاٹ کے بڑے پابند ہیں۔ ساس جی تو روز گنگا نہانے جاتی ہیں۔ بڑی نند جی بھی ان کے ساتھ جاتی ہیں۔ میں نے کبھی پوجا نہیں کی۔ یاد ہے کہ ہم تم دونوں پوجا کرنے والوں کو کتنا بنایا کرتی تھیں۔ اگر میں بھی ان کی تقلید کا دم بھرتی تو شاید وہ خوش ہوتیں۔ مگر مجھے تو کوئی ایسا احساس نہیں ہوا۔ پوجا کرنے والیاں بھی اسی طرح دوسروں کی غیبت کرتی ہیں۔ اسی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ پھر کسی پجارن اور غیر پجارن میں کیا فرق ہے۔ مگر اب مجھے پوجا سے کچھ کچھ رغبت ہوتی جا رہی ہے۔ میرے سسر جی کے والد نے ایک چھوٹا سا ٹھاکر دوارہ بنوادیا تھا۔ وہ میرے مکان کے عین سامنے ہے۔ اکثر ساس جی کے ساتھ میں وہاں جاتی

ہوں۔ اور اب یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ ان عظیم الشان مورتیوں کے درشن سے مجھے اپنے دل کے اندرونی حصہ میں نورانیت کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن حسین ہونے کی سزا کا خاتمہ یہیں تک نہیں ہے۔ نندیں اگر میرے حسن کو دیکھ کر جلتی ہیں تو یہ فطرتی ہے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ یہ سزا مجھے اس طرف سے بھی مل رہی ہے جس طرف سے اس کا قطعی امکان نہ ہونا چاہیے۔ میرے آنند بابو بھی اس کی سزا دے رہے ہیں۔ ہاں ان کا قانون سزا کچھ انوکھا ہے۔ وہ میرے پاس بلاناغہ کوئی نہ کوئی سوغات لاتے رہتے ہیں۔ جتنی دیر میرے پاس رہتے ہیں۔ ان کے دل میں یہ شک ہوتا رہتا ہے کہ مجھے ان کا رہنا اچھا نہیں لگتا وہ سمجھتے ہیں کہ میں ان سے جو پریم کرتی ہوں وہ صرف دکھاوا ہے۔ وہ میرے سامنے کچھ اس طرح دبے دبائے اورسمٹے سمٹائے رہتے ہیں کہ میں شرم کے مارے مر جاتی ہوں۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی حسین عورت کو بدصورت مرد سے محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ شاید وہ دل میں پچھتاتے ہیں کہ کیوں مجھ سے شادی کی۔ شاید وہ اپنے آپ سے نفرت کرتے ہیں اگر وہ مجھے کبھی روتے دیکھ لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں۔ میں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں کوئی خط لکھتے دیکھتے ہیں تو یہی سمجھتے ہیں کہ میں ان کی بدصورتی کا رونا رو رہی ہوں۔

بہن! کیا کہوں۔ یہ حسن میری جان کا عذاب ہو گیا۔ آنند کے دل سے یہ شک اور خوف نکالنے اور انھیں اپنی جانب سے اطمینان دلانے کے لیے مجھے ایسی ایسی باتیں کرنی پڑتی ہیں جن پر مجھے نفرت ہوتی ہے اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو برہما سے کہتی مجھے بدصورت ہی بنانا، بڑی مشکل میں پڑی ہوں۔ اگر ساس جی کی خدمت نہیں کرتی۔ بڑی نند کی دلجوئی نہیں کرتی تو ان کی نظروں سے گرتی ہوں۔ اگر آ.نند بابو کو ناامید کرتی ہوں تو یہ خوف ہے کہ کہیں میری جانب سے مایوس نہ ہوجائیں۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتی ہوں۔ بہن! تم سے کیا پردہ رکھنا ہے۔ مجھے آنند بابو سے اتنی ہی محبت ہے جو کسی عورت کو مرد سے ہو سکتی ہے۔ ان کی جگہ اگر اب اندر دیوتا بھی سامنے آجائیں تو میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں مگر انھیں کیوں کر یقین دلاؤں۔ میں دیکھتی ہو وہ کسی نہ کسی حیلہ سے بار بار گھر آتے ہیں۔ اور دبی ہوئی للچائی ہوئی نظروں سے میرے کمرے کے دروازہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ جی چاہتا ہے۔

جاکر ان کا ہاتھ پکڑ لوں اور اپنے کمرے میں کھینچ لاؤں مگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو چھاتی پیٹنے لگے گی۔ اور سب سے بڑا خوف یہ غالب رہتا ہے کہ کہیں آنند اسے بھی تریاچرتر ہی نہ سمجھ بیٹھیں۔ ابھی ان کی آمدنی بہت کم ہے۔ لیکن تحفہ تحائف میں روز دوچار روپے اڑا دیتے ہیں۔ اگر محبت کے تحفہ کے طور پر وہ ایک پائی کی بھی چیز دیں۔ تو میں اسے سر آنکھوں سے قبول کروں مگر وہ ٹیکس کی طرح پر دیتے ہیں۔ گویا انھیں ایشور نے ڈنڈ دیا ہے۔ اب مجھے بھی محبت کا سانگ بھرنا پڑے گا۔ حالانکہ میں محبت کا دکھاوا پسند نہیں کرتی اور مجھے اس سے چڑ ہے تمھیں یاد ہوگا میں نے ایک بار کہا تھا کہ محبت یا تو اندر ہی رہے گی یا باہر ہی رہے گی یکساں طور پر وہ اندر و باہر دونوں جگہ نہیں رہ سکتی۔ سانگ آوارہ مزاج عورتوں کے لیے ہے۔ گھریلو عورتیں تو محبت کا خزانہ اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہیں۔

بہن! خط بہت طویل ہوگیا۔ پڑھتے پڑھتے اکتا گئی ہوگی۔ میں بھی لکھتے لکھتے تھک گئی۔ اب باقی باتیں کل لکھوں گی۔ پرسوں اس خط کو تمھارے پاس بھیجوں گی۔

بہن! معاف کرنا۔ کل خط لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ رات کو ایک ایسی بات ہوگئی جس سے دل بے چین ہو اٹھا۔ بڑی مشکلوں سے یہ تھوڑا سا وقت نکال سکی ہوں۔ میں نے ابھی تک آنند سے گھر کے کسی شخص کی شکایت نہیں کی تھی۔ اگر ساس جی نے کوئی بات کہہ دی یا نندجی نے کوئی طعنہ دے دیا تو اسے ان کے کانوں تک کیوں پہنچاؤں۔ سوا اس کے اور کیا ہوگا کہ گھر میں فساد برپا ہوجائے گا۔ انھیں ذرا ذرا سی باتوں کے پیٹ میں نہ رکھنے سے گھر بگڑتے ہیں۔ آپس میں کدورت بڑھتی ہے مگر اتفاق کی بات۔ کل بلاوجہ ہی میرے منہ سے ایک بات نکل گئی جس کے لیے میں اب بھی اپنے آپ کو کوس رہی ہوں۔ اور ایشور سے مناتی ہوں کہ وہ آگے نہ بڑھے۔ بات یہ ہوئی کہ کل آنند بابو بہت دیر کر کے میرے پاس آئے۔ میں ان کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ یکایک ساس جی نے آکر پوچھا... ابھی تک بجلی جل رہی ہے؟ اگر وہ رات بھر نہ آئیں تو تم رات بھر بجلی جلاتی رہوگی؟

میں نے اسی وقت بتی بجھا دی۔ آنند بابو تھوڑی دیر میں ہی آگئے تو کمرہ اندھیرا پڑا تھا۔ نہ معلوم اس وقت میری عقل پر کہاں کے پتھر پڑ گئے تھے۔ اگر میں نے ان

کی اہٹ پاتے ہی بتی جلا دی ہوتی تو کچھ نہ ہوتا مگر میں اندھیرے میں پڑی رہی۔ انھوں نے پوچھا کیا سوگئیں؟ یہ اندھیرا کیوں پڑا ہوا ہے؟

ہائے! اگر اس وقت بھی میں نے کہہ دیا ہوتا کہ میں نے ابھی بتی بجھائی ہے۔ تو بات بن جاتی۔ مگر میرے منہ سے نکل گیا کہ ساس جی کا حکم ہے بتی بجھا دو۔ میں نے بجھادی۔ تم رات بھر نہ آؤ تو کیا رات بھر بتی جلتی رہے۔

"تو اب جلا دو۔ اندھیرے میں کچھ نہیں سجھائی دیتا"

"میں نے تو بٹن کو ہاتھ سے چھونے کی قسم کھائی ہے۔ جب ضرورت پڑے گی موم بتی جلا لیا کروں گی۔ کون مفت میں گھڑکیاں برداشت کرے۔"

آنند نے بجلی کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ "میں نے قسم کھا لی ہے کہ رات بھر بجلی جلے گی۔ خواہ کسی کو برا معلوم ہو یا بھلا۔ سب کچھ دیکھتا ہوں۔ اندھا نہیں ہوں۔ دوسری بہو آکر اتنی خدمت کرے گی تو دیکھوں گا۔ تم قسمت کی کھوٹی ہو کہ ایسے آدمیوں کے پالے پڑی ہو۔ اگر کسی دوسری ساس کی تم اتنی خدمت کرتیں۔ تو وہ تمھیں پان کی طرح پھیرا کرتی۔ ہاتھوں پر لیے رہتی۔ مگر یہاں تو چاہے کوئی کسی کے لیے جان ہی کیوں نہ دے دے۔ کسی کے منہ سے سیدھی بات بھی نکلے گی۔"

مجھے اپنی غلطی صاف معلوم ہوگئی۔ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے خیال سے بولی۔ غلطی تو میری ہی تھی کہ بے فائدہ آدھی رات تک بتی جلائے بیٹھی رہی۔ اماں جی نے گل کرنے کے لیے کہا تو کیا برا کیا۔ مجھے سمجھانا اور اچھی نصیحت دینا ان کا دھرم ہے۔ میرا دھرم یہی ہے کہ حتی المقدور ان کی خدمت کروں اور ان کی بات کو گرہ باندھوں۔

آنند دم بھر تک دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔ زاں بعد بولے: مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اب اس گھر میں میرا گذر نہ ہوگا تم نہیں کہتیں مگر میں سب کچھ سنتا رہتا ہوں سب سمجھتا ہوں تمھیں میرے پاپوں کا پرائشچت کرنا پڑ رہا ہے۔ میں کل ہی اماں جی سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ اگر یہی سلوک ہے تو اپنا گھر لو میں اپنے لیے کوئی دوسرا رستہ نکال لوں۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں کہیں ایسا غضب بھی نہ

کرنا۔ میرے منہ میں آگ لگے کہ کہاں سے کہاں بتی کا ذکر لے بیٹھی۔ میں تمھارے
پاؤں چھو کر کہتی ہوں مجھے نہ ساس جی سے کوئی شکایت ہے نہ نند جی سے۔ دونوں مجھ
سے بڑی ہیں۔ میری ماں کے برابر ہیں۔ اگر کوئی سخت بات بھی کہہ دیں تو مجھے صبر
کرنا چاہیے تم ان سے کچھ نہ کہنا۔ ورنہ مجھے بڑا دکھ ہوگا۔

آنند نے روندھی ہوئی آواز سے کہا۔ تمھاری جیسی بہو پا کر بھی اماں جی کا کلیجہ
نہیں پسیجتا۔ اب کیا کوئی سورگ کی دیوی گھر میں آتی۔ تم ڈرو مت۔ میں خواہ مخواہ نہ
لڑوں گا۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ذرا اپنے مزاج کو قابو میں رکھیں۔ آج اگر میں
دو چار سو روپے گھر میں لاتا ہوتا تو کوئی چوں تک نہ کرتا کچھ کما کر نہیں لاتا۔ یہ
اسی کی سزا ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے شادی کرنے کا کوئی حق ہی نہ تھا مجھ جیسا کم عقل
شخص جو ایک کوڑی بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے ساتھ کسی نازنین کو بحر مصیبت
میں غرق کرنے کا کیا حق تھا؟ بہن جی کو نہ معلوم کیا سوجھی ہے کہ تمھارے پیچھے
پڑی رہتی ہیں۔ سسرال کا صفایا کردیا۔ اب یہاں بھی آگ لگانے پر تلی ہوئی ہے۔
صرف والد صاحب کا لحاظ کرتا ہوں۔ ورنہ ایک دن میں ٹھیک کر دیتا۔

بہن! اس وقت تو میں نے انھیں کسی طرح ٹھیک کیا۔ مگر نہیں کہہ سکتی کہ وہ
کب ابل پڑیں۔ میرے لیے وہ تمام دنیا سے لڑائی مول لے لیں گے۔ میں جن حالات
میں ہوں ان کا تم اندازہ کر سکتی ہو۔ مجھ پر کتنی ہی مار پڑے۔ مجھے رونا نہ چاہیے۔
زبان تک کو جنبش نہ ہونی چاہیے۔ میں روئی اور گھر تباہ ہوا۔ آنند پھر کبھی نہ سنیں
گے کچھ نہ دیکھیں گے۔ شاید اس تدبیر سے وہ اپنے خیال میں میرے دل میں اپنے
پریم کا اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آج مجھے علم ہوا کہ یہ کس قدر غصہ ور ہیں۔ اگر میں
نے ذرا سا بھی اشتعال دے دیا ہوتا تو رات ہی کو وہ ساس جی کے سر پر جا پہنچتے۔
کتنی ہی عورتیں اسی غرور میں اپنے آپ کو بھول جاتی ہیں۔ بہن! اگر ایشور نے چاہا تو
میں کبھی نہ بھولوں گی۔ مجھے اس بات کا خوف نہیں ہے کہ آنند الگ گھر بنالیں گے تو
کیوں کر گذارہ ہوگا۔ میں ان کے ساتھ سب کچھ جھیل سکتی ہوں۔ مگر گھر تو تباہ ہو
جائے گا۔

بس پیاری پدما! آج صرف اسی قدر۔ خط کا جواب جلد دینا

(تمھاری چندا)

(11)

دہلی 5 فروری 1926

پیاری چندا!

کیا لکھوں... مجھ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہائے!... وہ چلے گئے۔ میرے ونود کا تین دن سے پتہ نہیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر بغیر کچھ کہے سنے چلے گئے۔ ابھی تک روئی نہیں۔ جو لوگ پوچھنے آتے ہیں۔ ان سے بہانہ کر دیتی ہوں کہ دو چار دن میں آجائیں گے ایک کام سے بنارس گئے ہیں۔ مگر جب روؤں گی تو یہ جسم آنسوؤں میں ڈوب جائے گا۔ اسی غم میں جان گھل گھل کر بہہ جائے گی۔ ہائے! اس چھلیے نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ حسب معمول اٹھا۔ کھانا کھایا۔ کالج گیا۔ وقت مقررہ پر لوٹا مجھ سے ہنسا بولا۔ دونوں نے ناشتہ کیا پھر وہ روزانہ اخبار پڑھنے لگے۔ میں ٹینس کھیلنے چلی گئی۔ ادھر کچھ دنوں سے انھیں ٹینس کھیلنے کاشوق کم ہوگیاتھا۔ میں تنہا ہی جاتی تھی۔ لوٹی تو روز کی طرح انھیں برآمدے میں ٹہلتے اور سگار پیتے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ حسب معمول میرا اُوور کوٹ لائے اور میرے اوپر ڈال دیا۔ برآمدے سے نیچے اتر کر کھلے میدان میں ہم ٹہلنے گئے۔ مگر وہ زیادہ بولے نہیں۔ کسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ جب زیادہ شبنم پڑنے لگی تو ہم دونوں پھر اندر چلے آئے۔ اسی وقت وہ بنگالی لیڈی آگئیں۔ جن سے میں نے بین سیکھنی شروع کی ہے۔ ونود بھی میرے ساتھ ہی بیٹھے رہے۔ انھیں فن نغمہ سے کس قدر انس ہے۔ یہ میں تمھیں پہلے ہی لکھ چکی ہوں۔ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ ان کے چلے جانے کے بعد ہم نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا۔ پھر میں اپنے کمرے میں لیٹنے کے لیے آئی۔ روز کی طرح وہ اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے چلے گئے۔ میں جلد ہی سو گئی۔ لیکن جب وہ کمرے میں آئے تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نیند میں کتنی ہی بے خبر کیوں نہ ہوں۔ ان کی آہٹ پاتے ہی چونک پڑتی ہوں۔ میں نے دیکھا۔ وہ اپنا ہرا شال اوڑھے کھڑے ہیں۔ ہاتھ بڑھا کربولی آؤ کھڑے کیوں ہو؟ اور پھر سو گئی۔ بس پیاری بہن! وہی ونود کے آخری درشن تھے۔

نہیں کہہ سکتی وہ پلنگ پر لیٹے یا نہیں۔ نہ معلوم ان آنکھوں میں کون سی قیامت کی نیند سمائی ہوئی تھی۔ صبح اٹھی تو ونود کو نہ پایا۔ میں ان سے پہلے اٹھتی ہوں۔ وہ پڑے رہتے ہیں۔ آج وہ پلنگ پر نہ تھے۔ شال بھی نہ تھا۔ میں نے سمجھا شاید اپنے کمرے میں چلے گئے ہوں۔ غسل خانہ میں چلی گئی۔ آدھ گھنٹہ میں باہر آئی۔ پھر بھی وہ نہ دکھائی دیے۔ ان کے کمرے میں گئی۔ وہاں بھی نہ تھے۔ تعجب ہوا اتنے سویرے کہاں چلے گئے۔ ناگہاں کھونٹی پر نظر گئی۔ کپڑے نہ تھے۔ کسی سے ملنے چلے گئے۔ یا نہانے سے پیشتر ہی سیر کرنے گئے ہیں کم از کم مجھ سے کہہ تو دیتے۔ جان تو عذاب میں نہ پڑتی۔ غصہ آیا یہ حضرت مجھے لونڈی سمجھتے ہیں......

حاضری کا وقت آیا۔ بیرا میز پر چائے رکھ گیا۔ ونود کے انتظار میں چائے ٹھنڈی ہوگئی۔ میں بار بار جھنجھلاتی تھی۔ کبھی اندر جاتی۔ کبھی باہر آتی۔ ٹھان لی تھی کہ آج آتے ہی اس بری طرح لتاڑوں گی کہ وہ بھی یاد کریں گے۔ کہہ دوں گی آپ اپنا گھر لیجیے آپ کو اپنا گھر مبارک رہے۔ میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ اس طرح تو روٹیاں وہاں بھی مل جائیں گی۔ سردی کے دنوں میں نو بجتے دیر ہی کیا لگتی ہے؟ جھلائی ہوئی ان کے کمرے میں گئی کہ ایک خط لکھ کر میز پر رکھ دوں۔ صاف صاف لکھ دوں کہ اگر اس طرح رہنا ہے تو آپ رہیے۔ میں نہیں رہ سکتی۔ جتنا میں طرح دیتی جاتی ہوں۔ اتنا ہی تم چڑھاتے ہو۔ بہن! اس غصہ میں جذبات کی ندی سی اندر ہی اندر موجزن تھی۔ اگر لکھنے بیٹھتی تو صفحے کے صفحے لکھ ڈالتی۔ لیکن آہ! میں تو بھاگ جانے کی دھمکی ہی دے رہی تھی۔ وہ پہلے ہی بھاگ چکے تھے۔ جوں ہی میز پر بیٹھی مجھے پیڈ میں ان کا ایک خط ملا۔ فوراً اسے نکال کر سر سری نگاہیں ڈالیں۔ ہاتھ کانپنے لگے ایسا معلوم ہوا جیسے تمام کمرہ حرکت میں ہے۔ ایک جگر دوز آہ کھینچ کر کوچ پر گر پڑی۔ خط یہ تھا۔

”پیاری۔ ! نو مہینے ہوئے جب مجھے پہلی بار تمھارے درشنوں کا فخر حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو مبارک سمجھا تھا۔ آج تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ تاہم میں اپنے کو مبارک سمجھتا ہوں مجھے اپنے جانے کا ذرا بھی دکھ نہیں ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ تم خوش ہوگی جب تم میرے ساتھ سکھی نہیں رہ سکیں۔ تو میں

زبردستی کیوں پڑا رہوں اس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اور تم علیحدہ ہو جائیں۔ میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔ تم بھی جیسی ہو ویسی ہی رہو گی۔ پھر سکھ کی زندگی کا امکان کیا ہے؟ میں شادی کو روحانی خوشی کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ عورت و مرد کے تعلقات کا اگر کوئی مطلب ہے تو یہی ہے انسان کی اولاد بغیر شادی کے بھی زندہ رہے گی۔ اور شاید اس سے بہتر شکل میں۔ خواہشات بھی بغیر شادی کے پوری ہو سکتی ہیں۔ انتظام خانہ داری کے لیے شادی کی ضرورت نہیں۔ ضروریات زندگی ایک اہم مسئلہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر جسے ایشور نے دو ہاتھ دیئے ہیں۔ وہ کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا ہے۔ شادی کا مقصد صرف یہی ہے کہ شوہر و بیوی ایک دوسرے کی روحانی ترقی میں مددگار ہوں۔ جہاں محبت ہو۔ وہی شادی ہے۔ اور محبت ہی روحانی ترقی کا اصلی ذریعہ ہے۔ جب محبت نہ رہی تو شادی بھی بے کار ہے۔ بغیر محبت کے شادی کرنا بے معنی ہے۔

جس وقت میں نے تمھیں پہلی بار دیکھا تھا تو تم مجھے محبت کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئی تھیں۔ تم میں حسن تھا، سلیقہ تھا، علم تھا، پریم تھا، چستی و چالاکی تھی، امنگ تھی، میں لٹو ہوگیا۔ اس وقت میری اندھی آنکھوں کو یہ نہ سوجھا کہ جہاں تم میں اس قدر ہنر ہے۔ وہاں شوخی بھی ہے۔ جو ان تمام ہنروں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ تم شوخ ہو۔ غضب کی شوخ۔ اس وقت مجھے یہ نہ سوجھا تھا۔ تم بعینہ اسی طرح ہو جیسی تمھاری دوسری بہنیں ہوتی ہے۔ نہ کم نہ زیادہ میں نے تم کو آزاد بنانا چاہا تھا۔ کیونکہ میری سمجھ میں اپنی پوری بلندی تک پہنچنے کے لیے انسان کو اسی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ تمام دنیا میں مردوں کے خلاف کیوں ایک شور عظیم برپا ہے؟ اسی لیے کہ ہم نے عورتوں کی آزادی چھین لی ہے۔ اور انھیں اپنی خواہشات کی لونڈی بنا رکھا ہے۔ میں نے تمھیں آزاد کر دیا۔ میں تمھارے اوپر اپنا کوئی حق نہیں مانتا۔ تم خود مختار ہو۔ جب تک میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ اپنی خوشی سے رہتی ہو۔ مجھے کوئی فکر نہ تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے۔ تم اپنی مرضی سے نہیں بلکہ فرض کے بندھن کی وجہ سے رہتی ہو۔ دو چار دن پیشتر ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے۔ اس لیے اب میں تمھارے سکھ کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں کہیں بھاگ کر نہیں جا رہا ہوں۔ صرف تمھارے راستہ سے ہٹا جا رہا ہوں۔ اور اتنی دور جا رہا ہوں کہ تمھیں

میری طرف سے پوری بے فکری ہو جائے۔ اگر میرے بغیر تمھاری زندگی زیادہ خوبصورت اور شاندار ہو سکتی ہے تو میں تمھیں جبراً نہیں رکھنا چاہتا۔ اگر میں سمجھتا کہ تم میرے سکھ کے راستہ میں رکاوٹ ہو رہی ہو۔ تو میں نے تم سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا۔ میں دھرم اور اصول کا ڈھونگ نہیں مانتا۔ صرف روحانی تسکین چاہتا ہوں۔ اپنے لیے بھی تمھارے لیے بھی زندگی کا مقصد یہی ہے۔ قیمت یہی ہے میں نے ڈیسک میں اپنے صیغہ کے آفیسر کے نام ایک خط لکھ کر رکھ دیا ہے۔ وہ اس کے پاس بھیج دینا۔ روپے کی فکر نہ کرنا۔ میرے حساب میں ابھی روپے ہیں۔ جو کئی مہینے تک تمھارے اخراجات کے لیے کافی ہوں گے اور اس وقت تک ملتے ہیں گے۔ جب تک تم لینا چاہوگی۔ یہ میں سمجھتا ہوں میں نے اپنے جذبات کا صاف صاف اظہار کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ صاف صاف کچھ کہنا میں نہیں چاہتا۔ جس وقت تمھاری خواہش مجھ سے ملنے کی ہو بینک سے میرا پتہ دریافت کر لینا۔ مگر دوچار مہینہ دو چار سال بعد تمھیں میری یاد آئے۔ تم سمجھو کہ میرے ساتھ سکھی رہ سکتی ہو۔ تو مجھے صرف دو لفظ لکھ کر ڈال دینا۔ میں فوراً آجاؤں گا۔ کیونکہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں تمھارے ساتھ میری زندگی کے جتنے دن گزرے ہیں وہ میرے لیے فردوسِ خواب کے دن ہوں گے۔ جب تک زندہ رہوں گا۔ زندگی کی ان تمام خوشیوں کو یاد رکھوں گا۔ آہ اتنی دیر تک دل کو روک رکھنے کے باوجود بھی آنکھوں سے ایک بوند آنسو گر ہی پڑا۔ معاف کرنا میں نے تمھیں "شوخ" کہا ہے۔ مگر وہ کون ہے جس میں شوخی نہیں۔ جانتا ہوں کہ تم نے مجھے اپنے دل سے نکال کر پھینک دیا ہے۔ تاہم اس ایک گھنٹہ کے درمیان کتنی ہی بار تمھیں دیکھ آیا ہوں۔ لیکن ان باتوں کا تذکرہ کر کے میں تمھارے جذبہ رحم کو فزوں تر کرنا نہیں چاہتا۔ تم نے وہی کیا جس کا تمھیں حق حاصل تھا۔ اور رہے گا شوہر اور بیوی میں وہی محبت چاہتا ہوں۔ جو دو آزاد اشخاص میں ہوتی ہے۔ وہ محبت نہیں۔ جس کی بنیاد غلامی اور پابندی ہے۔

بس اب اور کچھ نہ لکھوں گا۔ تم کو ایک چتاونی دینے کی خواہش ہورہی ہے۔ پر دوں گا نہیں کیونکہ تم اپنا برا بھلا خود سمجھ سکتی ہو۔ تم نے مشورہ دینے کا حق مجھ سے چھین لیا ہے۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دنیا میں محبت کا سانگ بھرنے والے

شہدوں کی کمی نہیں ہے۔ ان سے بچ کر رہنا۔ ایشور سے یہی پرارتھنا کرتا ہوں کہ تم جہاں رہو خوش رہو۔ اگر کبھی تمھیں میری ضرورت پڑے۔ تو یاد کرنا۔ تمھاری ایک تصویر لیے جاتا ہوں۔ معاف کرنا۔ کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں۔ ہائے! جی چاہتا ہے۔ ایک بار پھر دیکھ آؤں۔ مگر نہیں جاؤں گا۔

(تمھارا ٹھکرایا ہوا ونود)

بہن! یہ خط پڑھ کر میرے دل کی جو حالت ہوئی۔ اس کا اندازہ تم کرسکتی ہو۔ روئی تو نہیں۔ پر دل بیٹھا جاتا تھا۔ بار بار جی چاہتا تھا کہ زہر کھاکر سورہوں۔ دس بجنے میں اب تھوڑی ہی دیر تھی۔ میں فوراً کالج گئی اور ونود کا خط دیا۔ یہ ایک مدراسی شخص ہیں۔ مجھے نہایت احترام سے بٹھایا اور خط پڑھ کر بولے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں گئے اور کب تک آئیں گے۔ اس میں صرف ایک مہینہ کی رخصت طلب کی ہے۔ میں نے بہانہ کیا... کہ وہ ایک ضرری کام سے بنارس گئے ہیں اور مایوس واپس آئی۔ میری روح اپنی ہزاروں زبان سے مجھے لعنت ملامت کررہی تھی۔ کمرے میں ان کی تصویر کے سامنے گھٹنے ٹیک کر میں نے جتنے پر تاسف الفاظ میں معافی مانگی ہے۔ اگر یہ کسی طرح ان کے گوش گزار ہوتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ ان کو میری جانب سے کس قدر غلط فہمی ہوئی۔ اس وقت سے اب تک میں نے کچھ نہیں کھایا۔ اور نہ ایک منٹ سوئی۔ ونود میرا خواب وخور بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اور اگر اس طرح دس پانچ دنوں تک ان کی خبر نہ ملی تو جان بھی چلی جائے گی۔ آج میں بینک تک گئی تھی۔ پر یہ دریافت کرنے کی ہمت نہ پڑی کہ ونود کا کوئی خط آیا یا نہیں۔ وہ لوگ کیا سوچتے کہ یہ ان کی بیوی ہوکر ہم سے دریافت کرنے آئی ہے۔

بہن! اگر ونود نہ آئے تو کیا ہوگا۔ ؟ میں سمجھتی تھی۔ وہ میری جانب سے لاپرواہیں۔ میری پروا نہیں کرتے۔ مجھ سے اپنے دل کی باتیں چھپاتے ہیں۔ اب معلوم ہوا۔ میں کیسی خوفناک غلطی کاشکار ہو رہی تھی۔ اگر میں یہ جانتی کہ ان کا دل اس قدر نازک ہے۔ تو اس دن کیوں بھون کو منہ لگاتی۔ میں اس بدنصیب کا منہ تک نہ دیکھتی۔ اس وقت اگر دیکھ پاؤں تو شاید گولی ماردوں۔ ذرا تم ونود کا خط بھی پڑھو۔ بہن! خود ہی مجھے آزاد بناتے تھے۔ اگر میں نے ذرا دیر تک بھون سے بات چیت کرلی تو وہ

اس قدر ناراض کیوں ہوئے۔ ؟ مجھے ان کے اس عارفانہ سکون سے چڑ ہوتی تھی۔ مگر فی الحقیقت ان کے دل میں اس ذراسی بات نے جتنی بے اطمینانی پیدا کردی۔ شاید مجھ میں نہ کر سکتی۔ اگر میں کسی نازنین کی جانب ان کی توجہ کا رخ دیکھتی تو شاید منہ پھلا لیتی۔ طعنہ دیتی۔ خود روتی۔ انھیں رلاتی۔ پر اس قدر جلد بھاگ نہ جاتی۔ مردوں کا گھر چھوڑ کر بھاگنا تو آج تک نہیں سنا۔ عورتیں ہی گھر چھوڑ کر میکے بھاگتی ہیں۔ یا کہیں ڈوبنے جاتی ہیں یا خودکشی کرتی ہیں۔ مرد بے فکری سے بیٹھے ہوئے مونچھوں پر تاؤں دیا کرتے ہیں۔ مگر یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ مرد ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ اس حسرت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ محبت کی اس گہرائی کو کون پہنچ سکتا ہے۔ اگر میں اس وقت ونود کے چرنوں پر پڑے پڑے مر جاؤں تو سمجھوں کہ مجھے سورگ مل گیا۔ بس اس کے سوا مجھے اور کوئی خواہش نہیں ہے۔ اس لا انتہا محبت نے مجھے آسودہ کردیا۔ ونود مجھ سے بھاگے تو مگر بھاگ نہ سکے۔ وہ میرے دل سے، خیال سے اتنے کبھی قریب نہ تھے۔ میں تو اب بھی انھیں اپنے سامنے بیٹھا دیکھ رہی ہوں۔ میرے سامنے فلاسفر بننے چلے تھے۔ اب وہ فلسفہ کی گہرائیاں کہاں گئیں؟ یوں اپنے کو دھوکا دیتے ہو۔ یوں اپنی آتما کو کچلتے ہو۔ اس دفعہ تو بھاگ گئے۔ لیکن پھر بھاگوگے تو دیکھوں گی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ایسے ہوشیار بہروپیے ہو۔ اب میں نے سمجھا اور شاید تمھاری عمیق فلسفہ پسند طبیعت کی سمجھ میں بھی آگیا ہوگا کہ محبت جس قدر سچی اور جس قدر دلی ہوتی ہے۔ اسی قدر نازک بھی ہوتی ہے۔ وہ آفات و مصائب کے بحر بیکراں میں تھپیڑے کھا سکتی ہے۔ پر لاپروائی کا ایک وار بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ بہن! بات عجیب ہے۔ لیکن سچی ہے۔ میں اس وقت اپنے دل کے اندرونی حصوں میں جتنی اُمنگوں اور جتنی خوشیوں کا احساس کر رہی ہوں۔ یاد نہیں آتا کہ ونود کے سینہ سے لپٹ کر بھی کبھی ایسی خوشی نصیب ہوئی ہو۔ اس وقت درمیان میں ایک پردہ تھا۔ اب کوئی پردہ نہیں رہا۔ میں ان کو موجودہ طریق محبت کی کسوٹی پر کسنا چاہتی تھی۔ آج کل یہ فیشن ہوگیا ہے کہ جب شوہر گھر آئے۔ تو بیوی کے لیے تحفہ بھی ضرور لائے۔ مرد رات دن بیوی کے لیے زیور بنوانے۔ کپڑے سلوانے، بیل فیتے، لیس وغیرہ خرید نے میں مست رہے۔ پھر بیوی کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ

آئیڈیل شوہر ہے۔ اس کی محبت میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ لیکن اس عورت کی موت کے تیسرے مہینے وہ نئی شادی رچاتا ہے۔ بیوی کے ساتھ اپنی محبت کو بھی چتا میں جلا آتا ہے۔ پھر وہی تماشے اس نئے کھلونے کے ساتھ ہونے لگتے ہیں اور وہی لیلا شروع ہے۔ میں نے یہی محبت دیکھی تھی اور اسی کسوٹی پر ونود کو کس رہی تھی۔ کتنی بے عقل ہوں! چھچھورے پن کو محبت سمجھ بیٹھی تھی۔ کتنی عورتیں واقف ہیں۔ کہ زیادہ تر ایسے ہی زیور، کپڑے اور ہنسنے بولنے میں مست رہنے والے لوگ نااہل ہوتے ہیں۔ اپنی نااہلیت کو چھپانے کی خاطر یہ سانگ بھرتے رہتے ہیں۔ کتے کو خاموش رکھنے کے لیے اس کے سامنے ہڈی کے ٹکرے پھینک دیتے ہیں۔ بے چاری عورتیں اپنا سب کچھ دے کر کھلونے پاتی ہیں اور انھیں میں سرمست رہتی ہیں۔ میں ونود کو اسی کانٹے پر تول رہی تھی۔ ہیرے کو ساگ کے ترازو پر رکھے دیتی تھی۔ میں جانتی ہوں یقین کلّی ہے اور وہ اٹل ہے کہ ونود کی نظر کبھی دوسری عورت پر نہیں پڑ سکتی ان کے لیے میں ہوں۔ بہن! فرط غرور اور محبت سے میرا سینہ پھول اٹھا ہے۔ اتنی بڑی عظمت اتنی بڑی محفوظ سلطنت اور کس عورت کے مقدر میں ہے۔ ؟ مجھے تو شک ہے۔ اور اس پر بھی میں غیر مطمئن تھی۔ یہ نہ جانتی تھی کہ بالائے سطح پر بلبلے تیرتے ہیں۔ موتی سمندر کے عمق میں ہی ہوتے ہیں۔ ہائے! میری اس جہالت کے باعث میرے پیارے ونود کو کتنی روحانی تکلیف ہو رہی ہے۔ میری زندگی کے دیوتا اور سرمایۂ حیات نہ معلوم کہاں مارے مارے پھرتے ہوں گے۔ ! میری نسبت ان کے دل میں نہ معلوم کیسے کیسے شکوک پیدا ہوتے ہوں گے۔ پیارے ! تم نے میرے ساتھ کچھ کم بے انصافی نہیں کی۔ اگر میں نے تمھیں بے درد سمجھا تو تم نے تو اس سے مجھے کہیں بدتر سمجھا...... کیا اب بھی پیٹ نہیں بھرا تم نے مجھے اس قدر گئی گزری سمجھ لیا کہ اس بدنصیب بھون...... میں ایسے ایسے ایک لاکھ بھونوں کو تمھارے قدموں پر بھینٹ کر سکتی ہوں۔ مجھے تو دنیا میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جس پر میری نظر اٹھ سکے۔ شاید وہ نوبت آتی تو تم اور میں دو میں سے ایک بھی اس دنیا میں نہ ہوتے۔

بہن! میں نے ونود کو بلانے، کھینچ لانے اور پکڑ لانے کی ایک ترکیب سوچی ہے۔ کیا کہوں پہلے ہی دن یہ ترکیب کیوں نہ سوجھی۔ ونود کو روزانہ اخبارات کا مطالعہ

کیے بغیر چین نہیں آتا اور وہ کون سے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ میں جانتی ہوں۔ کل کے اخبار میں یہ خبر شائع ہوگی۔ ''پدما مر رہی ہے۔'' اور پرسوں ونود یہاں پہنچ جائیں گے۔ کسی طرح رک ہی نہیں سکتے۔ پھر خوب نوک جھونک ہوگی۔

اب کچھ تمھاری متعلق۔ کیا تمھاری بڑھیا سچ مچ تم سے اس لیے جلتی ہے کہ تم خوبصورت ہو اور پڑھی لکھی ہو۔ خوب! اور تمھارے آنند بھی عجیب وغریب شخص معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ مرد کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو۔ مگر اس کی نگاہ ہمیشہ حوروں پر جا کر ہی ٹھہرتی ہے پھر آنند بابو تم سے کیوں بھڑکتے ہیں؟ ذرا غور سے دیکھنا۔ کہیں رادھا اور کرشن کے درمیان کوئی کبجا تو نہیں ہے۔ اگر ساس جی یوں ہی ناک میں دم کرتی رہیں۔ تو میں تو تمھیں یہی مشورہ دوں گی کہ اپنی جھونپڑی الگ بنا لو۔ مگر جانتی ہوں تم میری یہ صلاح نہ مانوگی۔ کسی طرح نہ مانو گی۔ اس صبر آزما طبیعت پر میں تمھیں مبارک باد دیتی ہوں۔ خط جلد لکھنا۔ مگر شاید تمھارا خط آنے سے قبل ہی میرا دوسرا خط بھی مل جائے۔

(تمھاری پدما)

(12)

بنارس 12 فروری 1926

پیاری پدما!

کئی دن تک تمھارے خط کا انتظار کرنے کے بعد آج یہ خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے ونود بابو گھر آگئے ہوں گے۔ اگر وہ ابھی تک نہ آئے ہوں اور تم رو رو کر آنکھیں پھوڑے ڈالتی ہو تو یقیناً مجھے ذرا بھی کوفت نہ ہوگا۔ تم نے ان کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے۔ اس کی سزا یہی ہونی چاہئے۔ مجھے تم سے قطعی ہمدردی نہیں تم گرہستی ہو کر جو نامعقول کھیل کھیلنے چلی تھیں۔ وہ محبت فردوش عورتوں کو زیب دیتا ہے۔ مجھے تو خوشی اس وقت حاصل ہوتی۔ جب ونود تمھارا گلا دبا کر ان خیالات کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیتے۔ تو خواہ مجھ سے خفا ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ لیکن میں یہ کہنے سے کبھی دریغ نہ کروں گی کہ تم ونود کے قابل ہو ہی نہیں۔ میرے خیال میں شاید تم اس شوہر سے خوش ہو سکتی ہو جو آئے دن محبت کے نئے نئے مشاغل تلاش کر

کے تمھیں جلایا کرتا۔ غالبًا تم نے انگریزی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ صنف نازک رنگین مزاج شخص پر ہی جان دیتی ہیں اور اسی مطالعہ سے تمھارا دماغ پھر گیا ہے۔ تمھیں نت نیا مشغلہ درکار ہے جس کے بغیر تم اپنی زندگی کو بے مصرف سمجھتی ہو۔ تم دراصل بھارت ورش کی شوہر پرست دیوی نہیں۔ بلکہ یورپ کی عیش پسند نازنین ہو۔ مجھے تم پر رحم آتا ہے تم نے اب تک حسن کو ہی کشش کا باعث تصور کر رکھا ہے۔ حسن میں کشش ہے یہ تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن ایسی کشش کا نام موہ ہے۔ ٹھہرنے والی نہیں۔ صرف دھوکے کی ٹٹی ہے۔ محبت کا ایک ہی اصلی گر ہے اور وہ خدمت ہے یہ مت سمجھ لو کہ جو شخص تمھارے گرد وپیش بھونرے کے مانند منڈلایا کرتا ہے اس کی یہ حسن پرستی بہت دنوں تک قائم رہ سکتی ہے۔ محبت کا بیج حسن پر مبنی ہے۔ لیکن اس کو بر آور بنانا خدمت کا کام ہے۔ مجھ کو قطعی یقین نہیں آتا کہ تھکے ہوئے ونود کو باہر سے آنے پر پسینہ سے تر بتر دیکھ کر تم نے کبھی پنکھا بھی جھلا ہوگا۔ شاید ٹیبل فین لگانے کی بات بھی تمھیں نہ سوجھی ہوگی... سچ کہنا میری پیشن گوئی درست ہے یا نہیں۔ بتاؤ تم نے کبھی ان کے پاؤں بھی دبائے ہیں۔ کبھی ان کے سر میں تیل بھی ڈالا ہے۔ تم کہوگی یہ خدمت گاروں کا کام ہے۔ لیڈیاں یہ مرض نہیں پالتیں۔ دراصل تم نے اس اتھاہ مسرت کو محسوس کیا ہی نہیں۔ تم ونود کو اپنا بنا لینا تو چاہتی ہو۔ لیکن اس کا عمل نہیں کرتیں۔ نفس پرست عورت مایۂ تفریح ہو سکتی ہے دل کی مالکہ نہیں بن سکتی۔ انسان کے گلے سے لپٹی ہوئی بھی وہ اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔ میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ حسن پرستی انسان کی فطرت ہے۔ لیکن حسن سے دل کی پیاس نہیں بجھتی۔ حسن سے روحانی تسکین نہیں ہوتی۔ مگر میں تو تمھیں اپدیش کرنے بیٹھ گئی۔ حالانکہ تم مجھ سے دو چار مہینے بڑی ہوگی۔ بہن ! معاف کرنا یہ نصیحت نہیں۔ یہ باتیں ہم تم سبھی جانتی ہیں۔ صرف کبھی کبھی بھول جاتی ہیں۔ میں نے محض تمھیں یاد دلایا ہے۔

اچھا اب میری رام کہانی سنو۔ ! اس ایک مہینے میں یہاں بڑے بڑے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ یہ تو میں پیشتر ہی ذکر کر چکی ہوں کہ اماں جی اور آنند بابو میں کچھ کھٹ پٹ ہونے لگی تھی وہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہتی تھی۔ دن میں دو

ایک بار ماں بیٹے میں دو دو چونچیں ہو جاتی تھیں۔ ایک دن میری چھوٹی نند جی میرے کمرے سے ایک کتاب اٹھا کر لے گئیں۔ انھیں مطالعہ کا مرض ہے میں نے کمرے میں کتاب نہ دیکھی تو ان سے پوچھا۔ اس ذرا سی بات پر وہ بھلی مانس بگڑ گئیں اور کہنے لگیں تم تو مجھے چوری لگاتی ہو۔ اماں نے بھی ان کی ہی حمایت کی اور مجھے خوب سنائیں۔ اتفاق کی بات اماں جی ابھی مجھے کوس ہی رہی تھیں کہ آنند بابو مکان میں آگئے۔ اماں جی انھیں دیکھتے ہی زور زور سے چلانے لگیں۔ بہو کی اس قدر جرأت ! اسے تو نے سر چڑھا رکھا ہے اور کوئی بات نہیں کتاب کیا اس کے باوا کی تھی۔ لڑکی اٹھا لائی تو اس نے کون سا گناہ کر دیا۔ ذرا بھی صبر نہ ہو سکتا۔ دوڑی ہوئی اس کے سر پر جا پہنچی اور اس کے ہاتھوں سے کتاب چھیننے لگی۔ بہن میں خود یہ اقبال کرتی ہوں کہ مجھے محض کتاب کے لیے اس قدر جلد بازی نہ کرنی چاہیئے تھی۔ نند جی پڑھ لینے پر خود ہی دے جاتیں۔ نہ بھی دیتیں تو اس کتاب کے نہ پڑھنے سے میرا ہرج ہی کون سا ہو جاتا۔ لیکن شامت اعمال ان کے ہاتھوں سے کتاب چھیننے لگی۔ اگر اسی سلسلہ میں آنند بابو مجھے ڈانٹ بتاتے تو مجھے ذرا بھی دکھ نہ ہوتا۔ مگر انھوں نے اس کے برعکس میری ہی حمایت کی اور تیوریاں چڑھا کر بولے کسی کی چیز کوئی بلا پوچھے لائے ہی کیوں۔

اتنا سنا ہی تھا کہ اماں جی کے سر پر بھوت سا سوار ہو گیا۔ آنند بابو بھی بیچ بیچ میں پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی روتی رہی کہ کہاں سے کہاں میں نے کتاب مانگی۔ نہ اماں جی نے ہی کھانا کھایا نہ آنند بابو نے ہی اور میرا تو بار بار یہی جی چاہتا تھا کہ زہر کھالوں۔ رات کو جب اماں جی لیٹیں تو میں حسب معمول ان کے پاؤں دبانے گئی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے دھتکار دیا۔ لیکن میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ پیتانے کی جانب تو تھی ہی اماں جی نے جو پاؤں سے دھکیلا تو میں چارپائی سے نیچے گر پڑی۔ زمین پر کئی کٹوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں ان ہی کٹوریں پر گر پڑی تو پیٹھ پر اور کمر میں چوٹ آگئی۔ میں چلانا نہ چاہتی تھی۔ لیکن نہ معلوم کس طرح میری زبان سے چیخ نکل گئی۔ آنند بابو اپنے کمرے میں آگئے تھے۔ میری چیخ سن کر دوڑ پڑے۔ اور اماں جی کے دروازہ پر آکر بولے۔ اماں کیا اسے مارے ہی ڈالتی ہو۔

قصوروار تو میں ہوں۔ اس کی جان کیوں لے رہی ہو۔ یہ کہتے ہوئے وہ کمرہ میں داخل ہو گئے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی کھینچ کر لے گئے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اپنا ہاتھ چھڑا لوں۔ لیکن آنند نے نہ چھوڑا۔ دراصل ان کا اس طرح ہم لوگوں کے بیچ میں کود پڑنا مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ نہ آجاتے تو میں نے رودھو کر اماں جی کو منا ہی لیا ہوتا۔ میرے گر پڑنے پر ان کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو چلا تھا۔ آنند کا آجانا غضب ہوگیا۔ اماں جی کمرے کے باہر نکل آئیں اور منہ چڑھا کر بولیں۔ ہاں دیکھو مرہم پٹی کردو۔ کہیں کچھ ٹوٹ پھوٹ نہ گیا ہو۔

آنند نے صحن میں رک کر کہا۔ ''کیا تم چاہتی ہو کہ کسی کو مار ڈالو اور میں کچھ نہ بولوں۔ ''

''ہاں میں تو ڈائن ہوں۔ آدمیوں کو مارڈالنا ہی تو میرا کام ہے تعجب ہے کہ میں نے تمھیں بھی کیوں نہ مار ڈالا۔ ''

'' تو اب کیوں پچھتا رہی ہو۔ دھیلے کی سنکھیا میں تو کام چل سکتا ہے۔ ''

''اگر تمھیں اس طرح عورت کو سر چڑھا رکھنا ہے تو کہیں اور لے جا کر رکھو۔ اس گھر میں تمھارا گزارہ اب نہ ہو سکے گا۔

''میں خود اسی فکر میں ہوں۔ تمھارے کہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ''

''میں بھی سمجھ لوگی کہ میں نے لڑکا ہی نہیں جنا۔ ''

''میں بھی سمجھ لوں گا کہ میری ماتا مر گئی۔ ''

میں آنند کا ہاتھ پکڑ کر زور سے کھینچ رہی تھی کہ انھیں وہاں سے ہٹا لے جاؤں لیکن وہ بار بار میرا ہاتھ جھٹک دیتے تھے۔ آخر کار جب اماں جی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تو وہ بھی اپنے کمرے میں چلے آئے۔ اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

میں نے کہا۔ '' تمھیں یہ کیا سوجھی؟''

آنند نے زمین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ '' اماں جی نے آج نوٹس دے دیا۔''

''تم خود ہی الجھ پڑے وہ بے چاری تو بولی ہی نہیں۔ ''

''میں ہی الجھ پڑا؟''

''اور کیا میں نے تو تم سے شکایت نہ کی تھی۔ ''

آنند : پکڑ نہ لیتا تو اماں نے تمھیں ادھ مرا کر دیا ہوتا۔ تم ان کے غصے سے واقف نہیں ہو۔ "

"یہ تمھارا محض وہم ہے۔ انھوں نے مجھے قطعی نہیں مارا۔ وہ اپنا پاؤں چھڑا رہی تھیں۔ میں پٹی پر بیٹھی تھی۔ ذرا سا دھکا کھا کر گر پڑی اماں جی مجھے اٹھانے ہی جا رہی تھی کہ تم پہنچ گئے۔ "

"نانی کے آگے ننہال کی تعریف نہ کرو۔ میں اماں کو خوب جانتا ہوں۔ میں کل ہی مکان تبدیل کرلوں گا۔ کہیں نہ کہیں ملازمت مل ہی جائے گی۔ یہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ میں ان کی روٹیوں پر پڑا ہوں۔ اسی وجہ سے یہ دماغ ہے۔ " میں جس قدر انھیں سمجھاتی تھی۔ وہ اسی قدر تیز ہوتے جا رہے تھے۔ آخر کار میں نے جھنجھلا کر کہہ دیا تو تم تن تنہا جا کر دوسرے مکان میں رہو میں نہ جاؤں گی۔ مجھے یہیں پڑے رہنے دو۔

آنند نے میری جانب سخت نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ یہیں "لاتیں کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ "

"ہاں مجھے تو یہیں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ "

تو تم ہی کھاؤ میں نہیں کھانا چاہتا یہی فائدہ کیا تھوڑا ہے کہ تمھاری بے عزتی آنکھوں سے نہ دیکھوں گا۔ نہ دیکھوں گا نہ تکلیف ہوگی۔ "

"جدا رہنے لگو گے دنیا کیا کہے گی؟"

"اس کی پرواہ نہیں دُنیا اندھی ہے۔ "

"لوگ یہی کہیں گے کہ عورت نے یہ کرشمہ دکھایا ہے۔ "

"اس کی بھی پرواہ نہیں۔ محض اس خوف سے اپنی زندگی کو ہمیشہ کے لیے تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ "

میں نے روکر کہا۔ " تم مجھے چھوڑدوگے۔ تمھیں میری ذرا بھی محبت نہیں ہے۔ "

بہن! اور کوئی وقت ہوتا تو ان محبت سے بھرپور الفاظ نے نہ معلوم کیا کردیا ہوتا۔ ایسے ہی اشتیاق انگیز الفاظ پر ریاستیں تباہ ہوجاتی ہیں۔ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔

صنف نازک کے پاس اس سے بڑھ کر دوسرا اور کوئی پیکان نہیں۔ میں نے آنند کے گلے میں اپنی دونوں باہیں ڈال دی تھیں۔ اور ان کے شانے پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ لیکن اس وقت آنند بابو اس قدر سنگدل بن گئے کہ یہ جادو بھی ان پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ جس ماتا نے جنم دیا۔ اس کے متعلق اس قدر غصہ! ہم اپنی ماتا کی ایک کڑی بات نہیں سہ سکتے! اس غرور اور خود داری کا کہیں ٹھکانا بھی ہے۔ یہی وہ آرزوئیں ہیں۔ جن پر ماتا نے اپنی زندگی کے سارے آرام قربان کر دیئے تھے۔ دن کا چین اور رات کی نیند اپنے اوپر حرام کردی تھی۔ بیٹے پر ماں کا اس قدر استحقاق بھی نہیں!

آنند نے اسی طرح کرخت لہجہ میں کہا۔ اگر محبت کے یہی معنی ہیں کہ اس گھر میں تمھاری اہانت کراؤں تو میں ایسی محبت سے بے بہرہ ہوں۔

علی الصباح وہ بیدار ہوکر باہر جاتے ہوئے مجھ سے بولے۔ میں جاکر مکان کا انتظام کیے آتا ہوں ٹانگہ بھی لیتا آؤں گا۔ تیار رہنا۔ میں نے دروازہ روک کر کہا۔ کیا ابھی تک غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔

غصہ کی بات نہیں۔ صرف دوسروں کے سر سے اپنا بار ہٹا لینے میں ہی بہتری ہے۔

یہ کام اچھا نہیں کر رہے ہو۔ سوچ تو لو کہ ماتاجی کو کتنی تکلیف ہوگی۔ سسر جی سے بھی تم نے کچھ پوچھا۔ ؟

ان سے پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کرتا دھرتا جو کچھ ہیں۔ وہ اماں ہیں۔ دادا جی تو نرے مٹی کے کھلونے ہیں۔

"گھر کے مالک تو ہیں۔"

تمھیں چلنا ہے یا نہیں صاف کہو۔"

"میں تو ابھی نہ جاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے لات کھاؤ۔"

میں کچھ نہیں بولی آنند نے لحہ بھر کے بعد پھر کہا۔ تمھارے پاس کچھ روپے ہوں تو مجھے دے دو۔ میرے پاس روپے تھے۔ لیکن میں نے انکار کردیا۔ میں نے سمجھا شاید اسی کشمکش میں پڑ کر وہ نہ جائیں۔ لیکن انھوں نے تو مصمم ارادہ کرلیا تھا جھنجھلا کر

بولے اچھی بات ہے۔ تمھارے روپوں کے بغیر بھی میرا کام چل جائے گا۔ تمھیں یہ عالی شان محل یہ عشرت کدہ یہ نوکر چاکر یہ ٹھاٹھ باٹھ مبارک ہو۔ میرے ساتھ کیوں فاقہ کشی کروگی۔ وہاں یہ راحت و آرام کہاں۔ میری محبت کی قیمت ہی کیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔ بہن کیا کہوں۔ اس وقت اپنی بے بسی پر کتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ جاکر اماں جی کے قدموں پر گر پڑی اور رو رو کر آنند بابو کے چلے جانے کا ذکر کیا۔ لیکن ماتا جی کا دل ذرا بھی نہ پسیجا۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ ماتا بھی اس قدر سنگ دل ہوسکتی ہے۔ پھر آنند بابوکا دل کیوں نہ سخت ہو۔ آخر اپنی ماتا ہی کے بیٹے تو ہیں۔ ماتاجی نے بے رحمی سے کہا۔ "تم اس کے ساتھ کیوں نہ چلی گئیں۔ جب وہ کہتا تھا تو چلا جانا تھا کیا معلوم میں تمھیں کسی روز زہر دے دوں"۔ میں نے گڑ گڑا کر کہا۔ "ماتاجی! انھیں بلوا لیجیے۔ آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ ورنہ کہیں چلے جائیں گے۔" اماں‌جی اسی طرح بے رحمی سے بولیں۔ جائے چاہے رہے۔ یہ میرا کون ہے؟ اب تو جو کچھ ہو۔ تم ہو۔ میں کس شمار میں ہوں۔ آج ذرا سی بات پر وہ اس قدر جھلا رہا ہے۔ اور میری اماں‌جی نے مجھے سینکڑوں ہی بار پیٹا ہوگا۔ میں بھی چھوکری نہ تھی تمھاری ہی عمر کی تھی۔ پر مجال نہ تھی کہ تمھارے دادا جی سے کسی کے سامنے بول سکتی۔ کچا ہی کھا جاتیں۔ مار کھا کر رات بھر روتی رہتی تھی۔ لیکن اس طرح گھر چھوڑ کر کوئی نہ بھاگتا تھا۔ آج کل کے لونڈے ہی محبت کرنا جانتے ہیں۔ ہم بھی محبت کرتے تھے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ ماں باپ، چھوٹے بڑے کسی کو بھی کچھ نہ سمجھیں۔ یہ کہتی ہوئی ماتا جی پوجا کرنے چلی گئیں۔ میں اپنے کمرے میں آکر اپنی حرماں نصیبوں پر رونے لگی۔ رہ رہ کر یہی فکر دامن گیر ہورہا تھا کہ آنند کسی طرف کی راہ نہ لے لیں۔ بار بار دل مسوسا سا جارہا تھا۔ کہ روپے دے کیوں نہ دیئے۔ بچارے ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہوں گے۔ ابھی تک منہ بھی نہیں دھویا ناشتہ بھی نہیں کیا۔ وقت پر ناشتہ نہ کریں گے تو انھیں نزلہ ہوجائے گا اور انھیں زکام ہوجاتا ہے۔ تو حرارت بھی ہو جاتی ہے، کہاری سے کہا۔ ذرا جاکر دیکھ تو بابوجی کمرے میں ہیں۔ اس نے آکر دیکھا تو کہا کہ کمرے میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کھونٹی پر کپڑے بھی نہیں۔

میں نے پوچھا۔ کیا اور بھی کبھی اس طرح اماں جی پر ناراض ہوئے تھے۔ کہاری

بولی۔ "بہو! کبھی نہیں۔ ایسا سیدھا لڑکا دیکھا ہی نہیں۔ یہ اماں کے سامنے کبھی سر ہی نہیں اٹھاتے تھے۔ آج پھر کیوں چلے گئے۔"

مجھے یقین واثق تھا کہ دوپہر کو کھانے کے وقت وہ ضرور آجائیں گے۔ لیکن دوپہر تو درکنار، شام بھی آگئی اور ان کا پتہ تک نہیں۔ تمام رات جاگتی رہی۔ دروازے کی جانب کان لگے ہوئے تھے لیکن رات بھی بدستور گزر گئی۔ بہن! تین دن گزر گئے۔ اس وقت تم مجھے دیکھتیں تو پہچان نہ سکتیں۔ روتے روتے آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ ان تین دنوں میں پل بھر کے لیے بھی آنکھ نہ جھپکی۔ بھوک پیاس کا تو ذکر ہی کیا۔ پانی تک نہ پیا۔ پیاس ہی نہ لگتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے قالب میں جان ہی نہیں۔ تمام گھر ماتم کدہ سا بنا ہوا تھا۔ اماں جی دونوں وقت کھانا کھاتے جاتی تھی۔ لیکن منہ جھوٹا کر کے چلی آتی تھیں۔ دونوں نندوں کے ہنسی مذاق سب کچھ عنقا ہوگئے تھے۔ چھوٹی نند جی تو مجھ سے اپنا قصور معاف کرانے آئیں۔ چوتھے روز صبح رسوئیے نے آکر مجھ سے کہا۔ بابو جی تو مجھے وشاسو میدھ گھاٹ پر ملے تھے۔ میں انھیں دیکھتے ہی لپک کر ان کے پاس جا پہنچا اور بولا۔ "بھیا گھر کیوں نہیں چلتے۔ سب لوگ گھبرائے ہوئے ہیں۔ بہو جی نے تین دن سے پانی تک نہیں پیا۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔" یہ سن کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے "بہو جی نے دانا پانی کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ جاکر کہہ دینا جس آرام کے لیے اس گھر کو نہ چھوڑ سکیں۔ اس سے اس قدر جلد جی بھر گیا۔"

اماں جی اسی وقت صحن میں آگئیں۔ مہاراج کی باتوں کی بھنک ان کے کان میں پڑگئی۔ بولیں کیا ہے۔ ؟ اللو کیا آنند ملا تھا۔ ؟

مہاراج : "ہاں بڑی بہو ابھی گھاٹ پر ملے تھے۔ میں نے کہا گھر کیوں نہیں چلتے۔ تو بولے اس گھر میں میرا کون بیٹھا ہوا ہے۔"

اماں : "کہا نہیں اور کوئی نہیں ہے تو بیوی تو ہے۔ اس کی جان کے دشمن کیوں بنے ہو۔؟"

مہاراج : "بڑی بہو میں نے بہت سمجھایا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے؟"

اماں : "کرتا کیا ہے۔؟"

مہاراج : "یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔ لیکن چہرہ بہت اترا ہوا تھا۔"

اماں : "جوں جوں تم بوڑھے ہوتے جاتے ہو۔ شاید سٹھیائے جاتے ہو۔ اس قدر تو پوچھ لیا ہوتا کہاں رہتے ہو۔ کہاں کھاتے پیتے ہو۔ تمھیں چاہئے تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور کھینچ کر لے آتے۔ مگر تم نمک حراموں کو اپنے حلوے مانڈے سے مطلب۔ چاہے کوئی مرے یا جئے۔ دونوں وقت بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتے ہو اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہو۔ تمھیں اس کی کیا پرواہ ہے کہ گھر میں دوسرا کوئی کھاتا ہے یا نہیں۔ میں تو پروانہ کرتی۔ میرا دھرم پالنا پوسنا تھا۔ پال پوس دیا۔ جہاں جی چاہے جائے۔ آئے یا نہ آئے لیکن اس بہو کو کیا کروں۔ جو رو رو کر جان دیئے ڈالتی ہے۔ تمھیں ایشور نے آنکھیں دی ہیں۔ اس کی حالت دیکھ رہے ہو۔ کیا زبان سے اتنا بھی نہ پھوٹا کہ بہو دانہ پانی سب کچھ چھوڑ بیٹھی ہے۔"

مہاراج : "بہو جی! نارائن جانتے ہیں میں نے انھیں بہت سمجھایا مگر وہ تو جیسے بھاگے جا رہے تھے میں کیا کرتا۔"

ماں : سمجھایا ہے اپنا سر! تم سمجھاتے اور وہ یوں ہی چلے جاتے۔ کیا تمام لچھے دار باتیں مجھ ہی سے کرنے کو ہیں۔ اس بہو کو کیا کہوں۔ میرے شوہر نے مجھ سے اس قدر بے التفاتی کی ہوتی تو میں اس کی صورت نہ دیکھتی پر اس پر اس نے نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔ ایسے اداسیوں کو تو آوارہ مزاج عورت چاہئے۔ جو انھیں ٹھگنی کا ناچ نچائے۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد کہار نے آکر کہا۔ "بابو جی آئے ہیں اور کمرے میں بیٹھے ہیں۔" میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ جا کر پکڑ لاؤں لیکن اماں جی کا دل سچ مچ پتھر ہے۔ بولیں جا کر کہہ دے۔ وہاں اُن کا کون بیٹھا ہوا ہے۔ جو وہاں بیٹھتے ہیں میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا اماں جی انھیں اندر بلوا لیجیے۔ کہیں پھر نہ چلے جائیں۔

اماں : "یہاں اس کا کون بیٹھا ہوا ہے جو آئے گا۔ میں تو اندر قدم نہ رکھنے دوں گی۔"

اماں جی تو بگڑ رہی تھیں۔ ادھر چھوٹی نند جی جا کر آنند بابو کو بلا لائیں۔ سچ

بچ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جیسے مہینوں کا مریض ہو۔ نند جی انھیں اس طرح کھینچے لاتی تھی جیسے کوئی لڑکی سسرال جا رہی ہو۔ اماں جی نے مسکرا کر کہا۔ "اسے یہاں کیوں لائی ہو۔ اس کا یہاں کون بیٹھا ہوا ہے آنند سر جھکائے مجرم کی مانند کھڑے تھے۔ زبان نہ کھلتی تھی۔

اماں نے پوچھا۔ "چار دن کہاں تھے؟"

"کہیں نہیں۔ یہیں تو تھا۔"

"خوب چین سے رہے ہوں گے۔"

"جی ہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔"

"وہ تو صورت سے ہی ظاہر ہے۔"

نند جی ناشتہ کے لیے مٹھائی لائیں۔ آنند بابو مٹھائی کھاتے اس طرح جھینپ رہے تھے۔ جیسے سسرال آئے ہوں۔ پھر ماتا جی انھیں لیے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہاں نصف گھنٹے تک ماں بیٹے میں باتیں ہوتی رہیں۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔ لیکن صاف کچھ نہ سنائی دیتا تھا۔ ہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی ماتا جی رو رہی تھیں۔ اور کبھی آنند۔ ماتا جی جب پوجا کر کے نکلیں تو ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ آنند وہاں سے نکلے تو سیدھے میرے کمرے میں آئے۔ میں انھیں آتے دیکھ جھٹ پٹ منہ ڈھانپ چارپائی پر پڑی رہی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے مجھے چارپائی پر لیٹے دیکھا۔ میرے قریب آکر ایک مرتبہ آہستہ سے پکارا اور لوٹ پڑے۔ مجھے جگانے تک کی ہمت نہ ہوئی مجھے جو تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کا باعث وہ اپنے آپ کو تصور کر کے دل ہی دل میں از حد بے چین ہو رہے تھے میں نے خیال کیا تھا۔ وہ مجھے اٹھائیں گے۔ میں غمزہ و عشوہ کروں گی۔ وہ منائیں گے۔ لیکن تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ انھیں لوٹتے دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں ہک بکا کر اٹھ بیٹھی اور چارپائی سے نیچے اترنے لگی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے پاؤں لڑکھڑائے ایسا معلوم ہوا گویا میں گری جا رہی ہوں۔ یکا یک آنند نے پیچھے پھر کر مجھے سنبھال لیا اور بولے۔ لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔ میں کرسی پر بیٹھا جاتا ہوں۔ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ "میں تو بہت اچھی طرح ہوں آپ نے کیسے تکلیف کی۔"

"پہلے تم کچھ کھا لو۔ پھر میں باتیں کروں گا۔"

"میرے کھانے کی آپ کو فکر کیا ہے۔ آپ تو سیر سپاٹے کیجیے۔"

"جیسے سیر سپاٹے میں نے کیے ہیں۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مگر باتیں پیچھے کروں گا۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھالو۔ چار دن سے پانی تک منہ میں نہیں ڈالا... رام... رام۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ چار روز سے میں نے پانی منہ میں نہیں ڈالا۔ جب آپ کو میری پرواہ نہ تھی۔ تو میں دانہ پانی کیوں چھوڑتی۔"

"یہ تو صورت ہی کہے دیتی ہے پھول سے...... مرجھا گئے۔"

"ذرا جا کر آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھئے۔"

"میں پہلے ہی کون سا بہت خوبصورت تھا۔ ٹھونٹھ کو پانی ملے تو کیا اور نہ ملے تو کیا؟ میں نہ جانتا تھا کہ تم برت رکھنا شروع کردوگی۔ ورنہ ایشور جانتا ہے۔ اماں مار مار کر بھگاتیں تو بھی نہ جاتا۔"

میں نے شکوہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "تو کیا تم سچ مچ یہی سمجھتے تھے کہ میں یہاں صرف آرام کے خیال سے رہ گئی۔"

آنند نے جلدی سے اپنی غلطی محسوس کر لی۔ بولے نہیں نہیں پیاری میں اتنا خردماغ نہیں ہوں۔ لیکن میں یہ مطلق نہیں سمجھا تھا کہ تم بالکل ہی دانہ پانی چھوڑ دوگی۔ بڑی خیریت ہوئی کہ مجھے مہاراج مل گیا۔ ورنہ تم جان ہی دے دیتیں۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ کروں گا۔ کان پکڑتا ہوں۔ اماں جی۔ تمھاری تعریف کر کے رو رہی تھیں۔

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تب تو میری ریاضت بار آور ہوئی۔"

"تھوڑا سا دودھ پی لو تو بات چیت کروں۔ جانے کتنی ہی باتیں کرنی ہیں۔"

"پی لوں گی ایسی جلدی کیا ہے۔"

"جب تک تم کچھ نہ کھا لوگی میں یہی سمجھوں گا کہ تم نے میرا قصور معاف نہیں کیا۔"

"میں کھانا دیر میں کھاؤں گی۔ پہلے تم عہد کرو کہ آئندہ اس طرح نہ جاؤ گے۔"

"میں صدق دل سے یہ عہد کرتا ہوں۔"

بہن! تین دن یہ تکلیف گوارا کرنی پڑی لیکن مجھے اس کا مطلق غم نہیں۔ ان تین دنوں کے برت نے دلوں میں جو صفائی کردی۔ وہ کسی دیگر طریق سے کبھی نہ ہوتی۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ ہماری زندگی نہایت اطمینان سے بسر ہوگی۔

اپنے حالات جلد اور بہت جلد تحریر کرنا۔

(تمھاری چندا)

(13)

دلی 2 فروری 1926

پیاری بہن!

تمھارا خط پڑھ کر مجھے تمھارے اوپر رحم آگیا۔ تم خواہ مجھے کتنا ہی برا کہو۔ لیکن میں اپنی یہ بے عزتی وخرابی کسی طرح نہ برداشت کرسکتی یا تو میں اپنی جان دے دیتی۔ یا اس ساس کا منہ نہ دیکھتی۔ تمھاری سادہ لوحی، تمھاری متانت وسنجیدگی۔ تمھاری ساس پرستی تمھیں مبارک ہو۔ میں تو فوراً آنند کے ساتھ چلی جاتی اور خواہ بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑتی۔ پر اس گھر میں قدم نہ رکھتی۔ مجھے تمھارے اوپر رحم نہیں آتا غصہ آتا ہے۔ اس لیے کہ تم میں خودداری نہیں ہے۔ تم جیسی عورتوں نے ہی ساس اور شوہروں کا دماغ آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ جہنم میں جائے ایسا گھر جہاں اپنی عزت نہیں۔ میں تو ان داموں پتی پریم بھی لینے کے لیے تیار نہیں۔ تمھیں انیسویں صدی میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اس وقت تمھارے اوصاف کی قدر ہوتی۔ اس آزادی اور عورتوں کے راج میں تم صرف عہد گذشتہ کی تاریخ ہو۔ یہ سیتا اور دمینتی کا زمانہ نہیں۔ مردوں نے بہت دنوں راج کیا اب عورتوں کا راج ہوگا۔ مگر لو زیادہ نہ کوسوں گی۔

اب میرا حال سنو! میں نے سوچا تھا۔ اخبارات میں اپنی بیماری کا تذکرہ شائع کرادوں گی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ یہ خبر شائع ہوتے ہی احباب کا تانتا لگ جائے گا۔ کوئی مزاج پرسی کے لیے آئے گا کوئی دیکھنے آئے گا۔ پھر میں کوئی رانی تو ہوں نہیں کہ جس کی بیماری کا بلیٹن شائع کیا جائے۔ نہ معلوم لوگوں کے دل میں کیسے کیسے خیالات پیدا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ دن بھر میرے دل کی

کیا حالت رہی نہیں لکھ سکتی کبھی جی میں آتا زہر کھالوں کبھی سوچتی کہیں بھاگ جاؤں ونود کے متعلق طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ اب مجھے ایسی کتنی ہی باتیں یاد آنے لگیں۔ جب میں نے ونود کے ساتھ لاپروائی کا اظہار کیا تھا۔ میں ان سے سب کچھ لینا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ آٹھ پہر بھونرے کی طرح میرے گردوپیش منڈلاتے رہیں۔ پروانہ کی مانند مجھ پر فدا ہوتے رہیں۔ انھیں کتابوں اور اخبارات کے مطالعہ میں محو دیکھ کر میں جھنجھلا اٹھتی تھی۔ میرے وقت کا زیادہ حصہ اپنے ہی بناؤ سنگار میں صرف ہوتا تھا۔ ان کا خیال ہی نہ آتا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ خدمت کی عظمت حسن سے کہیں زیادہ ہے حسن دل کو کھینچ سکتا ہے مگر روح کو مسرت دینے والی کوئی دوسری ہی شے ہے۔

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں صبح کے وقت میکے جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ یہ گھر کاٹے کھاتا تھا۔ یکا یک چھٹی رساں نے مجھے ایک خط لا کر دیا میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لیا۔ پر لفافہ پر ونود کی چشم آشنا تحریر نہ تھی۔ کسی عورت کا خط معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں قطعی اس خط سے ناآشنا تھی۔ فوراً کھولا اور نیچے کی طرف دیکھا۔ تو چونک پڑی یہ کسم کا خط تھا۔ ایک ہی سانس میں تمام خط پڑھ لیا لکھا تھا۔

"بہن! ونود بابو تین دن یہاں رہ کر بمبئی چلے گئے۔ شاید ولایت جانا چاہتے ہیں۔ تین چار دن بمبئی رہیں گے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ دلی واپس کردوں۔ لیکن وہ کسی طرح نہ راضی ہوئے تم انھیں مندرجہ ذیل پتہ سے تار دے دو۔ میں نے ان سے یہ پتہ پوچھ لیا تھا۔ انھوں نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ اس پتہ کو پوشیدہ رکھنا لیکن تم سے کیا پردہ؟ تم فوراً تار دے دو۔ شاید رک جائیں یہ بات کیا ہوئی۔ مجھ سے تو ہر چند دریافت کرنے کے باوجود ونود نے کچھ نہیں بتایا۔ ہاں وہ بہت دکھی تھے ایسے شخص کو بھی تم اپنا نہ بنا سکیں مجھے سب سے زیادہ تعجب اس بات کا ہے۔ لیکن مجھے پہلے ہی سے یہ خوف تھا حسن اور غرور میں چراغ اور روشنی کا تعلق ہے۔ غرور حسن کا نور ہے...!

میں نے خط رکھ دیا۔ اور اسی وقت ونود کے نام تار بھیج دیا کہ سخت بیمار ہوں۔

فوراً آؤ۔ مجھے امید تھی کہ ونود بذریعہ تار مطلع کریں گے۔ لیکن تمام دن گزر گیا اور کوئی جواب نہ آیا۔ بنگلے کے سامنے سے کوئی سائیکل نکلتی تو میں فوراً اس کی طرف تاکنے لگ جاتی تھی کہ شاید تار کا چپراسی ہو۔ رات کو بھی میں تار کا انتظار کرتی رہی پھر میں نے اپنے دل کو اس طرح سمجھایا کہ ونود آرہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے تار بھیجنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

اب میرے دل میں پھر بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ ونود کسم کے پاس کیوں گئے؟ کہیں کسم سے انھیں محبت تو نہیں ہے۔ کہیں اسی محبت کی وجہ سے تو وہ مجھ سے بدگمان نہیں ہوگئے کسم مجھ سے کوئی چال تو نہیں کر رہی ہے۔ اسے ونود کو اپنے گھر ٹھہرانے کا حق ہی کیا تھا۔ اس خیال سے میرا دل کھنچ اٹھا۔ کسم پر غصہ آنے لگا ضرور دونوں میں بہت دنوں سے خط وکتابت ہو رہی ہوگی۔ میں نے پھر کسم کا خط پڑھا اور اس بار اس کے ہر لفظ میں میرے لیے کچھ سوچنے کا سامان موجود تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ کسم کو خط لکھوں اور خوب کوسوں۔ آدھا خط لکھ بھی ڈالا لیکن اسے چاک کر دیا اسی وقت ونود کو ایک خط لکھا۔ تم سے کبھی ملاقات ہوگی تو وہ خط دکھاؤں گی۔ جو کچھ منہ میں آیا بک ڈالا۔ لیکن اس خط کی بھی وہی حالت ہوئی جو کسم کے خط کی ہوئی تھی۔ لکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کسی سودازدہ دل کی بکواس ہے۔ میرے دل میں یہی بات گھر کرتی جاتی ہے کہ وہ کسم کے پاس ہیں وہی ساحرہ ان پر جادو چلا رہی ہے۔ یہ دن بھی گزر گیا چٹھی رساں کئی بار آیا لیکن میں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ چندا میں نہیں کہہ سکتی میرا دل کس قدر تلملا رہا تھا۔ اگر اس وقت مجھے کسم مل جاتی تو نہ معلوم میں کیا کر ڈالتی۔

رات کو لیٹے لیٹے خیال آیا کہیں وہ یورپ نہ چلے گئے ہوں۔ دل بے چین ہو اٹھا۔ سر میں ایسا چکر آنے لگا۔ گویا پانی میں ڈوبی جاتی ہوں۔ اگر وہ یورپ چلے گئے تو پھر کوئی امید نہیں۔ اسی وقت اٹھی اور گھڑی پر نظر ڈالی دو بجے تھے نوکر کو جگایا اور تار گھر جا پہنچی۔ بابو جی کرسی پر لیٹے لیٹے سو رہے تھے بڑی مشکل سے ان کی نیند کھلی میں نے رسیدی تار دیا جب بابو جی تار دے چکے تو میں نے پوچھا اس کا جواب کب تک آئے گا۔

بابو جی نے کہا... یہ سوال کسی جوتشی سے کیجیے۔ کون کہہ سکتا ہے وہ کب جواب دیں۔ تار کا چپراسی زبردستی تو ان سے جواب نہیں لکھا سکتا۔ اگر کوئی اور سبب نہ ہو تو 8-9 بجے تک جواب آجانا چاہیے۔

پریشانی اور گھبراہٹ میں انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔ اس بیہودہ سوال کے بعد مجھے خود بھی ندامت کا احساس ہوا۔ بابو جی نے اپنے دل میں مجھے کس قدر جاہل خیال کیا ہوگا۔ خیر! میں وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ اور تمھیں یقین نہ آئے گا۔ نو بجے تک وہیں بیٹھی رہی۔ سوچو کتنے گھنٹے ہوئے پورے 7 گھنٹے...... سینکڑوں شخص آئے اور گئے لیکن میں وہیں جمی بیٹھی رہی۔ جب تار کی ڈبی کھڑکتی میرے دل میں دھڑکن ہونے لگتی۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں بابو جی جھلا نہ اٹھیں کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ جب دفتر کی گھڑی میں نو بجے تو میں نے ڈرتے، ڈرتے بابو سے پوچھا۔ ''کیا ابھی تک جواب نہیں آیا؟''

بابو نے کہا۔ ''آپ تو یہیں بیٹھی ہیں۔ جواب آتا تو کیا میں کھا جاتا۔ ''

میں نے بے حیائی سے پوچھا تو کیا اب نہ آئے گا؟ بابو نے منہ پھیر کر کہا... اور دوچار گھنٹے بیٹھی رہیئے۔ ''

بہن! یہ فقرے تیر کی مانند چبھے۔ آنکھیں بھر آئیں لیکن پھر بھی میں وہاں سے نہ ٹلی۔ اب تک بھی امید باقی تھی کہ شاید جواب آتا ہو جب دو گھنٹے اور گزر گئے تو میں مایوس ہوگئی۔ ہائے ونود نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں گھر چلی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ راستہ نہ سوجھتا تھا۔

یکایک پیچھے سے موٹر کی آواز کانوں میں آئی۔ میں راستہ سے ہٹ گئی۔ اس وقت دل میں بڑی خواہش ہو رہی تھی کہ اس کے نیچے لیٹ کر اپنے تمام دکھوں کا خاتمہ کردوں۔ آنکھیں پونچھ کر موٹر کی طرف دیکھا بھون بیٹھا ہوا تھا اور اس کی بغل میں کسم تھی۔ ایسا معلوم ہوا گویا آگ کے شعلے تمام بدن میں سرایت کر گئے۔ میں ان دونوں کی نگاہوں سے بچنا چاہتی تھی۔ لیکن موٹر رک گئی۔ اور کسم اتر کر میرے گلے سے لپٹ گئی۔ بھون اس طرح چپ چاپ موٹر میں بیٹھا رہا گویا مجھے جانتا ہی نہیں۔ بے رحم، مکار۔ !!

کسم نے پوچھا۔ ''بہن! میں تو تمھارے پاس جا رہی تھی کیا وہاں سے کوئی خبر آئی؟

میں نے بات ٹالنے کی خاطر کہا۔ ''تم کب آئیں؟''

بھون کے سامنے میں اپنی مصیبت کی داستان نہ کہنا چاہتی تھی۔

کسم نے کہا۔ ''آؤ کار میں بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ اگر موقع ملے تو ذرا آجانا۔''

کسم نے مجھ سے کوئی اصرار نہیں کیا۔ کار میں بیٹھ کر چل دی۔ میں کھڑی تاکتی رہ گئی۔ یہ وہی کسم ہے یا کوئی اور؟ کتنا زبردست فرق ہوگیا ہے۔

میں گھر چلی تو سوچنے لگی بھون سے اس کی جان پہچان کیوں کر ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ونود نے اسے میرا پتہ لینے کے لیے بھیجا ہو۔ کہیں بھون سے کچھ میرے متعلق تو دریافت کرنے نہیں آئی۔

میں گھر پہنچ کر بیٹھی ہی تھی کہ کسم آپہنچی۔ اس بار وہ موٹر میں تنہا نہ تھی ونود بیٹھے ہوئے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں دوڑ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیتی اور موٹر سے اتار لاتی لیکن میں جگہ سے ہلی تک نہیں۔ مورتی کی طرح اچل بیٹھی رہی۔ میری خوددار طبیعت اپنی فطرت کے اظہار میں بے چین ہو اٹھی۔ کسم نے ونود کو اتارا۔ ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے لے آئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ونود کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ اور وہ اس قدر کمزور ہو گئے ہیں کہ اپنے سہارے کھڑے بھی نہیں رہ سکتے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیوں تمھارا کیا حال ہے؟''

کسم نے کہا۔ ''حال بعد میں دریافت کرنا ذرا جلدی سے پلنگ بچھا دو اور تھوڑا سا دودھ منگالو۔''

میں نے فوراً چارپائی بچھائی۔ اور ونود کو اس پر لٹا دیا۔ دودھ پہلے ہی سے موجود تھا اس وقت کسم میری مالکہ بنی ہوئی تھی۔

بہن چندا! میں اُس وقت اس کے اشارے پر ناچ رہی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ کسم پر ونود کا جتنا وشواس ہے۔ وہ مجھ پر نہیں۔ میں اس وقت اس قابل

ہوں ہی نہیں۔ میرا دل سینکڑوں سوالات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن کسم دم بھر کے لیے بھی ونود کے پاس نہ ٹلتی تھی۔ میں اتنی جاہل ہوں کہ موقع ملنے پر اس حالت میں بھی ونود سے سوالات کا تانتا باندھ دیتی۔

ونود کو جب نیند آگئی تو میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کسم سے پوچھا۔ بہن! انھیں کیا شکایت ہے؟ میں نے تار بھیجا۔ اُس کا جواب نہیں آیا۔ رات کے دو بجے ایک ضروری اور جوابی تار بھیجا۔ دس بجے تک تار گھر میں بیٹھی ہوئی جواب کا راستہ دیکھتی رہی۔ وہیں سے واپس آرہی تھی جب تم راستہ میں ملیں یہ تمھیں کہاں مل گئے؟

کسم میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور بولی۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ بھون کا کیا معاملہ تھا دیکھو صاف کہنا۔

میں نے رک کر کہا...... کسم! تم یہ سوال کر کے میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو۔ تمھیں خود سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس میں سوائے لغویت کے اور کوئی بات نہیں ہے۔ ونود کو صرف شک ہوگیا ہے۔

"بلا کسی سبب کے؟"

"ہاں! میری سمجھ میں تو کوئی سبب نہ تھا۔"

"میں اسے نہیں مانتی یہ کیوں نہیں کہتیں کہ ونود کو جلانے چڑھانے اور جگانے کے لیے تم نے یہ سانگ رچا تھا۔"

کسم کی اُپج پر متحیر ہو کر میں نے کہا۔ "وہ محض مذاق تھا۔"

"تمھارے لیے مذاق تھا۔ ونود کے لیے موت کا سامان ہے۔ تم نے اتنے دنوں تک ان کے ساتھ رہ کر بھی انھیں نہیں سمجھا تمھیں اپنے بناؤ سنگار کے آگے انھیں سمجھنے کی فرصت کہاں؟ شاید تم یہ سمجھتی ہو کہ تمھاری یہ موہنی صورت ہی سب کچھ ہے۔ میں کہتی ہوں اس کی قیمت دوچار مہینوں کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ دائم و قائم شے کچھ اور ہی ہے۔

میں نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "ونود کو مجھ سے پوچھنا تو چاہئے تھا۔"

کسم نے مسکرا کر کہا۔ "یہی تو وہ نہیں کر سکتے۔ تم سے ایسی باتیں دریافت کرنا ان کے لیے ناممکن ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں۔ جو عورت کی نگاہوں سے گر کر

زندہ نہیں رہ سکتے۔ عورت ہو یا مرد۔ کسی کے لیے بھی وہ کسی قسم کا کوئی بندھن نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہر شخص کے لیے پوری آزادی کے حامی ہیں۔ دل اور خواہش کے سوا اور کوئی بندھن قبول نہیں کرتے۔ اس مضمون پر مجھ سے ان سے خوب بات چیت ہوئی ہے۔ خیر میرا پتہ انھیں معلوم تھا ہی۔ وہ یہاں سے سیدھے میرے پاس پہنچے۔ میں تاڑ گئی کہ آپس میں کھٹ پٹ ہوئی ہے۔ مجھے تمھیں پر شک ہوا۔

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟" "مجھ پر تمھیں کیوں شک ہوا؟"

"اس لیے کہ میں تمھیں پہلے دیکھ چکی تھی۔"

"اب تو تمھیں مجھ پر شک نہیں ہے۔"

"نہیں۔ مگر اس کی وجہ تمھاری جدوجہد نہیں۔ میں اس وقت نہایت صاف گوئی سے کام لے رہی ہوں۔ اس کے لیے معاف کرنا۔"

"تم سمجھتی ہو کہ مجھے ونود سے محبت نہیں ہے۔"

نہیں۔ ونود سے تمھیں جتنی محبت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تم اپنے آپ کو پیار کرتی ہو۔ کم از کم دس دن پیشتر یہی بات تھی۔ ورنہ یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ونود یہاں سے سیدھے میرے پاس گئے اور دو تین دن تک رہ کر بمبئی چلے گئے۔ میں نے ہر چند دریافت کیا مگر انھوں نے کچھ نہیں بتایا۔ وہاں انھوں نے ایک دن زہر کھالیا۔"

میرے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

بمبئی پہنچتے ہی انھوں نے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ اس میں یہاں کے تفصیلی حالات درج تھے اور آخیر میں لکھا تھا۔ میں اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ اب میرے لیے موت کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

میں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

"میں یہ خط پا کر گھبرا گئی۔ اور اسی وقت بمبئی روانہ ہو گئی۔ جب وہاں پہنچی تو ونود کو قریب المرگ پایا زندگی کی کوئی امید نہیں تھی۔ میرے ایک رشتہ دار وہاں ڈاکٹر ہیں۔ انھیں بلا کر دکھایا تو بولے کہ انھوں نے زہر کھا لیا ہے فوراً دوائی دی گئی۔ تین دن تک ڈاکٹر صاحب نے نہ دن کو دن سمجھا اور نہ رات کو رات اور میں تو دم بھر کے لیے بھی ونود کے پاس سے نہیں ہٹی۔ بارے تیسرے دن ان کی آنکھیں

کھلیں تمھارا پہلا تار مجھے ملا تھا۔ اس کا جواب دینے کی کسے فرصت تھی۔ تین دن اور بمبئی رہنا پڑا۔ ونود اس قدر کمزور ہوگئے تھے کہ اتنا لمبا سفر کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ چوتھے دن جب میں نے ان سے یہاں آنے کے لیے کہا۔ تو بولے میں اب وہاں نہ جاؤں گا۔ جب میں نے بہت سمجھایا تو اس شرط پر راضی ہوئے کہ میں پہلے آکر یہاں کی حالت دیکھ جاؤں۔

میرے منہ سے نکلا۔ ''ہائے رام! میں اس قدر بدنصیب ہوں۔ ''

''بہن! بدنصیب نہیں ہو۔ صرف اتنی بات ہے کہ تم نے ونود کو نہ سمجھا تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ میں تنہا آؤں پر میں نے اس نازک حالت میں انھیں وہاں چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ پرسوں ہم دونوں وہاں سے چلے یہاں پہنچ کر ونود تو ویٹنگ روم میں ٹھہر گئے۔ میں پوچھتی ہوئی بھون کے پاس پہنچی۔ بھون کو میں نے اس قدر پھٹکارا کہ وہ رو دیا۔ اس نے مجھ سے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تم نے اسے بری طرح دھتکار دیا ہے۔ آنکھوں کا برا آدمی ہے۔ پر دل کا برا نہیں۔ جب اُدھر اسے اطمینان ہوگیا اور راستہ میں تم سے ملاقات ہونے پر جب بہر طور میرا شک رفع ہوگیا۔ تو میں ونود کو تمھارے پاس لائی۔ اب تمھاری شے تمھیں سونپتی ہوں مجھے امید ہے کہ اس وحشت ناک واقعہ نے تمھیں اس قدر ہوشیار کردیا ہوگا کہ پھر ایسی نوبت نہ آئے گی۔ ایثار وقربانی سیکھو۔ بھول جاؤ کہ تم حسین ہو۔ مسرت سے زندگی بسر کرنے کا یہی اصلی گُر ہے۔ میں ڈینگ نہیں مارتی لیکن اگر چاہوں تو آج تم سے ونود کو چھین سکتی ہوں گو حسن میں میں تمھارے تلوؤں کے برابر نہیں۔ حسن کے ساتھ اگر تم اپنے آپ میں خدمت گزاری کا مادہ بھی پیدا کرو سکو تو تم دیوی ہو جاؤگی اور دنیا کی کوئی طاقت تمھیں پسپا نہ کر سکے گی۔

میں کسم کے پیروں پر گر پڑی اور روتی ہوئی بولی۔ بہن! تم نے میرے ساتھ جو احسان کیا ہے اس کے لیے مرتے دم تک تمھاری ممنون رہوں گی۔ اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی تو آج نہ معلوم کیا حالت ہوتی؟

بہن! کسم کل چلی جائے گی۔ مجھے تو اب وہ دیوی معلوم ہوتی ہے جی چاہتا ہے اس کے پاؤں دھو دھو کر پیوں۔ اس کے ہاتھوں مجھے ونود ہی نہیں ملے ہیں۔ خدمت

گزاری کا حقیقی نصب العین اور صنف نازک کے حقیقی فرائض کا علم بھی حاصل ہوا ہے۔ آج سے میری زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے جس میں عیش وعشرت کی نہیں بلکہ خلوص وخدمت کی کثرت ہوگی۔

(تمھاری پدما)

(یہ طویل افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ 'مادھوری' کے فروری 1926 سے لے کر مئی 1928 کے شماروں میں شائع ہوا۔ یہ 'مان سرودر' 4 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔

آنسوؤں کی ہولی

ناموں کے بگاڑنے کا رواج نہ جانے کب چلا اور کہاں شروع ہوا، کوئی اس عالم گیر مرض کا پتہ لگائے تو تاریخی دنیا میں ضرور ہی اپنا نام چھوڑ جاوے۔ پنڈت جی کا نام تو شری بلاس تھا مگر احباب انھیں سِلبِل کہا کرتے تھے، ناموں کا اثر عادت واطوار پر بھی کچھ نہ کچھ پڑتا جاتا ہے، بے چارے سلبل واقعی سلبل تھے۔ دفتر جارہے تھے، مگر پاجامے کا آزار بند نیچے لٹک رہا ہے، سر پر فلٹ ٹوپی ہے مگر لمبی سی چوٹی پیچھے جھانک رہی ہے۔ اچکن بہت عمدہ ہے، کپڑا فیشن کے مطابق، سلائی بڑھیا، مگر ذرا نیچی ہو گئی ہے۔ نہ جانے انھیں تیوہاروں سے کیا چڑھ تھی، دیوالی گزر جاتی مگر وہ بھلا مانس کوڑی ہاتھ میں نہ لیتا، اور ہولی کا دن تو ان کے سخت امتحان کا دن تھا، تین روز تک وہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے، گھر میں ہی سیاہ کپڑے پہنے بیٹھے رہتے تھے، یار لوگ ٹوہ میں رہتے تھے کہ بچہ کہیں پھنس جاویں مگر گھر میں گھس کر تو فوجداری نہیں کی جاتی۔ ایک آدھ مرتبہ پھنسے بھی مگر منت سماجت کرکے بے داغ نکل گئے۔

مگر اب کے مسئلہ مشکل ہوگیا تھا، شاستروں کے مطابق پچیس برس تک برہمچاری رہنے کے بعد انھوں نے اپنا بیاہ کیا تھا۔ برہمچریہ کی پختگی میں جو تھوڑی بہت کسر تھی وہ تین برس کے گونہ والی مدت نے پوری کر دی اگرچہ بیوی کی جانب سے انھیں کوئی اندیشہ نہ تھا، وہ عورتوں کے سر چڑھانے کے حامی نہ تھے، اس معاملے میں انھیں وہی اپنا پرانا طریقہ پسند تھا۔ بیوی کو جب سختی سے ڈانٹ دیا تو اس کی مجال ہے کہ رنگ کو ہاتھ لگائے۔ مصیبت یہ تھی کہ سسرال کے لوگ بھی ہولی منانے کے لیے آنے والے تھے۔ پرانی کہاوت ہے کہ "بہن اندر تو بھائی سکندر" ان سکندروں کے حملہ سے بچنے کی انھیں کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی، احباب تو مکان میں نہ جا سکتے تھے مگر سکندروں کو کون روک سکتا ہے؟ بیوی نے آنکھ پھاڑ کر کہا۔ اے بھیا، کیا سچ مچ گھر میں رنگ نہ لاؤ گے؟

سِلبِل نے تیوریاں بدل کر کہا۔ بس میں نے ایک مرتبہ کہہ دیا اور بات دہرانا

مجھے پسند نہیں، گھر میں رنگ نہیں آئے گا اور نہ کوئی رنگ چھوٹے گا۔ مجھے کپڑوں پر لال چھینٹے دیکھ کر متلی ہونے لگتی ہے۔ ہمارے گھر میں ایسی ہی ہولی ہوتی ہے۔

بیوی نے سر جھکا کر کہا۔ تو نہ لانا رنگ ونگ، مجھے رنگ لے کر کیا کرنا ہے جب تمھیں رنگ نہ چھوؤگے تو میں کیسے چھو سکتی ہوں؟

سلبل نے خوش ہو کر کہا۔ بیشک یہی وفاداری کا دھرم ہے۔

"لیکن بھیّا تو آنے والے ہیں، وہ کیوں مانیں گے۔"

"ان کے لیے بھی میں نے ایک تدبیر سوچ لی ہے، اسے کامیاب بنانا تمھارا کام ہے، میں بیمار بن جاؤں گا، ایک چادر اوڑھ کر لیٹ رہوں گا، تم کہنا کہ انھیں بخار آگیا، بس چلو چھٹی ہوئی"

بیوی نے آنکھیں نچا کر کہا۔ اے نوج، کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو؟ بخار جائے مدعی کے گھر، یہاں آئے تو منہ جھلس دوں نگوڑے کا۔

"تو پھر دوسری تدبیر بھی کیا ہے"

"تم اوپر والی چھوٹی کوٹھری میں چھپ رہنا، میں کہہ دوں گی کہ انھیں نے جلاب لیا ہے، باہر نکلیں گے تو ہوا لگ جائے گی۔"

پنڈت جی کھل اٹھے۔ "بس بس" یہ سب سے اچھا ہے۔

(2)

ہولی کا دن ہے۔ باہر واویلا مچا ہوا ہے، زمانہ قدیم میں عبیر اور گلال کے سوا اور کوئی رنگ نہ چلتا تھا، اب نیلا، ہرا، سیاہ، سبھی رنگوں کا میل ہوگیا اور اس اتحاد سے بچنا آدمیوں کے لیے تو ممکن نہیں ہاں دیوتا بچیں تو بچیں۔ سلبل کے دونوں سالے محلہ بھر کی عورتوں مردوں، بوڑھوں، بچوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے، انھوں نے بھی ایک ہنڈا رنگ گھول رکھا تھا، سکندری حملے کر رہے تھے، باہر کے دیوان خانہ کے فرش دیواریں، حتیٰ کہ تصویریں بھی رنگ گئی تھیں، گھر میں بھی یہی حال تھا، محلہ کی نندیں بھلا کب ماننے والی تھیں؟ پرنالہ تک رنگین ہوگیا تھا۔

بڑے سالے نے پوچھا۔ کیوں ری چمپا، کیا واقعی ان کی طبیعت درست نہیں؟ کھانا کھانے بھی نہ آئے۔

چمپا نے سر جھکا کر کہا۔ ہاں بھیا، رات ہی سے کچھ پیٹ میں درد ہونے لگا، ڈاکٹر نے ہوا میں نکلنے کو منع کر دیا ہے۔ ذرا دیر بعد چھوٹے سالے نے کہا۔ کیوں جی جی، کیا بھیا صاحب نیچے نہ آویں گے؟ایسی بھی کیا بیماری ہے، کہو تو اوپر جاکر دیکھ آؤں۔

چمپا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، نہیں نہیں، اوپر مت جائیو، وہ رنگ ونگ نہ کھیلیں گے، ڈاکٹر نے ہوا میں نکلنے کو منع کر دیا ہے۔

دونوں بھائی ہاتھ مل کر رہ گئے!

دفعتاً چھوٹے بھائی کو ایک بات سوجھی، جیجا کے کپڑوں کے ساتھ کیوں نہ ہولی کھیلیں؟ وہ تو بیمار نہیں ہیں، بڑے بھائی کے دل میں بھی یہ بات سما گئی۔ بہن بے چاری اب کیا کرتی؟ سکندروں نے کنجیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں اور سلبل کے سارے کپڑے نکال کر رنگ ڈالے، رومال تک کورا نہ چھوڑا، جب چمپا نے ان کپڑوں کو صحن میں الگنی پر خشک ہونے کے لیے ڈال دیا تو ایسا معلوم ہوا، گویا کسی رنگریز نے کپڑے رنگے ہوں۔ سلبل اوپر بیٹھے بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے مگر زبان نہ کھولتے تھے، سینہ پر سانپ سا لوٹ رہا تھا۔ سارے کپڑے خراب ہوگئے۔ دفتر جانے کو بھی کچھ نہ بچا، ان پاجیوں کو میرے کپڑوں سے نہ جانے کیا عداوت تھی۔

گھر میں انواع و اقسام کے لذیذ کھانے بن رہے تھے۔ محلّہ کی ایک برہمنی کے ساتھ چمپا بھی لگی ہوئی تھی، دونوں بھائی اور کئی دیگر اصحاب صحن میں کھانا کھانے بیٹھے تو بڑے سالے نے چمپا سے پوچھا۔ "کچھ ان کے لیے بھی کھچڑی وچڑی بنائی ہے، پوریاں تو بے چارے آج نہ کھا سکیں گے۔

چمپا نے کہا۔ ابھی تو نہیں بنائی، اب بنا لوں گی۔

"واہ ری تیری عقل؟ ابھی تک تجھے یہ فکر نہیں کہ وہ بے چارے کھائیں گے کیا، تو تو اتنی لا پرواہ بھی نہ تھی، جا نکال لا جلدی چاول اور مونگ کی دال"

لیجیے کھچڑی پکنے لگی، ادھر دوستوں نے کھانا کھانا شروع کیا۔ سلبل اوپر بیٹھے اپنے نصیبے کو رو رہے تھے، انھیں اس ساری مصیبت کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا تھا،

شادی؟ چمپا نہ آتی تو یہ سالے کیوں آتے، کپڑے کیوں خراب ہوتے، ہولی کے دن مونگ کی کھچڑی کیوں کھانے کو ملتی؟

مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے؟ جتنی دیر میں لوگوں نے کھانا کھایا اتنی دیر میں کھچڑی تیار ہوگئی۔ بڑے سالے نے خود چمپا کو اوپر بھیجا کہ کھچڑی کی تھالی اوپر دے آوے۔ سیلبل نے تھالی کی طرف غصّے بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ اسے میرے سامنے سے ہٹا لے جا۔

"کیا آج فاقہ ہی کروگے؟"

"تمھاری یہی مرضی ہے تو یہی سہی"

"میں نے کیا کیا، سویرے سے کام میں لگی ہوئی ہوں، بھیا نے خود ہی کھچڑی پکوائی اور مجھے یہاں بھیجا۔ "

"ہاں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ میں گھر کا مالک نہیں، سکندروں نے اس پر قبضہ جما لیا، مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم چاہتیں تو اور لوگوں کے پہلے ہی میرے پاس تھالی نہ پہنچ جاتی، میں اسے پتی برت دھرم کے خلاف سمجھتا ہوں اور کیا کہوں؟"

"تم دیکھ رہے تھے کہ دونوں سر پر سوار تھے۔"

"اچھا مذاق ہے کہ اور لوگ سموسے اور خستے اُڑائیں اور مجھے مونگ کی کھچڑی دی جاوے، واہ ری تقدیر!"

تم اس کے دو چار لقمے کھالو، مجھے جیوں ہی موقع ملے اور دوسری بلاس تھالی لادوں گی۔"

"سارے کپڑے رنگوا ڈالے، اب دفتر کیسے جاؤں گا؟ یہ دل لگی مجھے ذرا بھی نہیں بھائی، میں اسے بدمعاشی کہتا ہوں، تم نے صندوق کی کنجی کیوں دے دی، کیا میں اتنا پوچھ سکتا ہوں؟"

"زبردستی چھین لی، تم نے سنا نہیں، کرتی کیا؟"

"اچھا جو ہوا سو ہوا، یہ تھالی لے جاؤ، دھرم سمجھنا تو دوسری بلاس تھالی لانا، نہیں آج فاقہ ہی سہی۔ "

یکایک پیروں کی آہٹ پاکر سلبل نے سامنے دیکھا تو دونوں سالے چلے آرہے تھے، انھیں دیکھتے ہی بے چارے نے منہ بنا لیا، چادر سے منہ ڈھک لیا اور کراہنے لگے۔

بڑے سالے نے کہا۔ کہیے کیسی طبیعت ہے؟ تھوڑی سی کھچڑی کھا لیجیے۔ سلبل نے منہ بنا کر کہا۔ ابھی تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔

"نہیں، فاقہ کرنا تو مضر ہوگا، کھچڑی کھا لیجیے۔"

بے چارے سلبل نے دل میں ان دونوں شیطانوں کو خوب کوسا اور زہر کی طرح کھچڑی حلق سے نیچے اتاری، آج ہولی کے دن کھچڑی ہی قسمت میں لکھی تھی، جب تک ساری کھچڑی ختم نہ ہوگئی، دونوں وہاں اڑے رہے۔ گویا جیل کے حکام کسی فاقہ کرنے والے قیدی کو جبراً کھانا کھلا رہے ہوں۔ بے چارے کو ٹھونس کر کھچڑی کو زہر مار کرنا پڑا، پکوانوں کی گنجائش ہی نہ رہی۔

(3)

دس بجے رات کو چمپا بڑھیا کھانوں کا تھال لیے شوہر کے پاس پہنچی حضرت دل ہی دل میں جھنجھلا رہے تھے، بھائیوں کے سامنے میری پرواہ کون کرتا ہے، نہ جانے کہاں سے یہ شیطان پھٹ پڑے، تمام دن فاقہ کرایا۔ اور ابھی تک کھانے کا پتہ نہیں، آخر چمپا کو تھالی لاتے دیکھ کر کچھ غصہ ٹھنڈا ہوا بولے۔ ابھی تو بہت سویرا ہے، دو ایک گھنٹے کے بعد کیوں نہ لائیں؟

چمپا نے سامنے تھال رکھ کر کہا۔ تم تو نہ ہاری مانتے ہو نہ جیتی۔ اب آخر یہ دو مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کی آؤ بھگت نہ کروں۔ تو بھی کام نہیں چلتا، تمھیں کو بُرا معلوم ہوگا، کون روز آویں گے۔

"ایشور نہ کرے کہ روز آویں، یہاں تو ایک ہی دن میں کام تمام ہوگیا۔"

تھال کے لذیذ اور خوشبودار کھانوں کو دیکھ کر دفعتاً پنڈت جی کے چہرے پر دلآویز تبسم کی لہر دوڑ گئی، ایک ایک چیز کھاتے تھے اور چمپا کو سراہتے تھے۔ سچ کہتا ہوں چمپا، میں نے ایسی چیز کبھی نہیں کھائی تھی، حلوائی کمبخت کیا بنائے گا۔ جی چاہتا

ہے کہ کچھ انعام دوں۔

"تم مجھے بنا رہے ہو، کیا کروں جیسا بنانا آتا ہے، بنا لاتی ہوں۔"

"نہیں جی سچ کہہ رہا ہوں، میری تو روح تک آسودہ ہوگئی، آج مجھے معلوم ہوا کہ غذا کا تعلق پیٹ سے اس قدر نہیں جتنا روح سے ہے، بتلاؤ کیا انعام دوں؟"

"جو مانگوں گی وہ دوگے"

"دوں گا، جنیؤ کی قسم کھا کر کہتا ہوں"

"نہ دو تو میری بات جائے۔"

کہتا ہوں تو بھئی !اب کیسے کہوں؟کیا لکھا پڑھی کردوں؟"

"اچھا تو مانگتی ہوں، مجھے اپنے ساتھ ہولی کھیلنے دو۔"

پنڈت جی کا رنگ فق ہوگیا۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ ہولی کھیلنے دوں! میں تو ہولی کھیلتا ہی نہیں، کبھی نہیں کھیلا، ہولی کھیلنا ہوتا تو گھر میں چھپ کر ہی کیوں بیٹھتا؟

"اوروں کے ساتھ نہ کھیلو مگر میرے ساتھ تو کھیلنا پڑے گا۔"

یہ میرے اصول کے خلاف ہے، جس چیز کو اپنے گھر میں جائز سمجھوں اسکین الفاظ کی رو سے باہر ناجائز سمجھوں؟سوچو!

چمپا نے سر نیچا کر کے کہا۔ "گھرمیں ایسی کتنی باتیں جائز سمجھتے ہو، جنھیں گھر کے باہر کرنا ناجائز ہی نہیں بلکہ گناہ ہے۔"

پنڈت جی جھینپ کر بولے۔ "اچھا بھئی تم جیتیں میں ہارا، اب میں تم سے یہی دان مانگتا ہوں..."

"پہلے میرا انعام دے دو، پھر سے دان مانگنا" یہ کہتے ہوئے چمپا نے رنگ کا لوٹا اٹھا لیا اور پنڈت جی کو سراپا تر کر دیا۔ جب تک وہ اٹھ بھاگیں اس نے مٹھی بھر گلال لے کر ان کے سارے منہ میں لپیٹ دیا۔

پنڈت جی رونی صورت بنا کر بولے، ابھی اور کچھ کسر باقی ہو تو وہ بھی پوری کر لو، میں نہ جانتا تھا کہ تم میری آستین کا سانپ بنوگی۔ اب اور کچھ مانگ باقی نہیں رہا۔"

چمپا نے شوہر کے چہرے پر نظر ڈالی تو اُس پر دلی رنج کا گہرا اثر نمایاں تھا، پچھتا کر بولی۔ کیا تم سچ مچ برا مان گئے؟ میں تو سمجھتی کہ تم صرف مجھے چڑھا رہے ہو۔

شری بلاس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، نہیں چمپا، مجھے برا نہیں لگا، ہاں، تم نے مجھے اس فرض کی یاد دلائی جسے میں اپنی بزدلی کے سبب بھولا بیٹھا ہوا تھا، وہ سامنے جو تصویر دیکھتی ہو۔ میرے دلی دوست منہر ناتھ کی ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں، تم سے کیا کہوں کہ کتنا باںداق کتنا طبیعت دار اور کتنا جری شخص تھا، ملک کی حالت دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہوتا رہتا تھا، 20-19 برس کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے مگر وہ اسی عمر میں اپنی زندگی کا مقصد تجویز کر چکا تھا، خدمت کرنے کا موقع پا کر وہ اس کو اس طرح پکڑتا تھا گویا دولت ہو، استغنا پیدائشی تھا، ہوس تو اسے چھو تک نہ گئی تھی، ہمارے اور دوست سیر و تفریح کرتے تھے۔ مگر اس کا راستہ سب سے جدا تھا۔ راستی پر جان دینے کو تیار، کہیں بے انصافی دیکھی اور تیور بدل گئے، کہیں اخباروں میں ظلم و تشدد کی خبریں پڑھیں اور چہرہ تمتما اٹھتا۔ ایسا تو میں نے آدمی ہی نہیں دیکھا، ایشور نے بے وقت ہی بلا لیا ورنہ وہ انسانوں میں ایک برگزیدہ شخص ہوتا۔ کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنے کو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا، عورت کی اتنی عزت و توقیر کوئی کیا کرے گا؟ عورت اس کے لیے پرستش و عقیدت کی چیز تھی !پانچ سال ہوئے، یہی ہولی کا دن تھا، میں بھنگ کے نشہ میں چور، سر سے پیر تک رنگ میں نہایا ہوا، اس کو گانا سننے کے لیے بلانے گیا، دیکھا کہ وہ کپڑے پہنے ہوئے کہیں جانے کو تیار تھے پوچھا کہاں جا رہے ہو"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم اچھے وقت پر آگئے ورنہ مجھے جانا پڑتا، ایک اناتھ بوڑھیا مر گئی ہے، کوئی اسے کندھا دینے والا نہیں ملتا۔ کوئی کسی دوست سے ملنے گیا ہوا ہے۔ کوئی نشہ میں چور پڑا ہے۔ کوئی احباب کی دعوت کر رہا ہے اور کوئی رقص و سرور کی محفل سجائے بیٹھا ہے، کوئی لاش اٹھانے والا نہیں ! برہمن، چھتری اس چمارن کی لاش کو کیسے چھوئیں گے، ان کا دھرم بھرشٹ ہوتا ہے، کوئی تیار نہیں ہوتا، بڑی مشکل سے کہار ملے ہیں، ایک میں ہوں۔ اب چوتھے آدمی کی کمی ہے سو

ایشور نے تمھیں بھیج دیا۔ چلو چلیں۔

ہائے اگر میں جانتا کہ یہ پیارے منہر کا آخری حکم ہے تو آج میرے دل کو اتنا رنج نہ ہوتا، میرے گھر پر کئی دوست آئے ہوئے تھے، گانا ہو رہا تھا، اس وقت لاش اٹھا کر دریا تک لے جانا مجھے ناگوار تھا، بولا۔" اس وقت تو بھئی میں نہ جا سکوں گا۔ گھر پر مہمان جمع ہیں، میں تو تمھیں بلانے آیا تھا۔"

منہر نے میری طرف حقارت سے دیکھ کہا۔ "اچھی بات ہے۔ تم جاؤ میں اور کسی کو ڈھونڈ لوں گا۔ مگر مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی! تم نے بھی وہی کیا جو تم سے پیشتر اور لوگوں نے کیا تھا، کوئی نئی بات نہیں، اگر ہم لوگ اپنے فرض کو بھول نہ گئے ہوتے تو آج یہ حالت ہی کیوں ہوتی؟ ایسی ہولی پر لعنت ہے! تیوہار تماشا دیکھنے، عمدہ، عمدہ چیزیں کھانے اور بڑھیا بڑھیا پوشاکیں پہننے کا نام نہیں ہے، یہ برت ہے، تپسیا ہے، اپنے بھائیوں سے محبت و ہمدردی جتانا ہی تیوہاروں کا خاص مقصد ہے۔

"کپڑے سرخ کرنے سے پہلے خون کو سرخ بنالو، سفید خون پر یہ سُرخی زیب نہیں دیتی۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا، مجھے اس وقت یہ نصیحت بہت بُری معلوم ہوئی اگر میرے دل میں وہ خدمتی جذبہ نہ تھا تو اس کو مجھے اس طرح لعنت ملامت کرنے کا کوئی حق نہ تھا، خیر، گھر چلا آیا مگر وہ باتیں میرے کانوں میں برابر گونجتی رہیں۔ ہولی کا سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ ایک مہینہ تک ہم دونوں سے ملاقات نہ ہوئی۔ کالج امتحان کی تیاری کے لیے بند ہوگیا تھا، اس لیے کالج میں بھی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کب اور کیسے بیمار پڑا اور کب اپنے گھر گیا، دفعتاً ایک روز مجھے اس کا ایک خط ملا، ہائے اس خط کو پڑھ کر آج بھی چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔

شری بلاس ایک لمحہ تک گلا بھر آنے کے سبب نہ بول سکے، پھر بولے۔ کسی روز تمھیں دکھاؤں گا، لکھا تھا کہ مجھ سے آخری مرتبہ مل جاؤ، اب شاید اس زندگی میں ملاقات نہ ہو۔ خط میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس کا مکان میرٹھ کے ضلع میں تھا دوسری گاڑی جانے میں نصف گھنٹہ باقی تھا، میں فوراً روانہ ہوگیا، مگر اسے دیکھنا نصیب

میں نہ تھا۔ میرے پہنچنے کے قبل ہی وہ وفات پا چکا تھا۔ چمپا! اس کے بعد میں نے ہولی نہیں کھیلی، ہولی ہی نہیں اور سبھی تیوہار چھوڑ دیے۔ ایشور نے شاید مجھے کام کی طاقت نہیں دی۔ اب بہت چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ سے کسی طرح کا خدمتی کام لے خود آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن پیچھے چلنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر کوئی مجھ سے کام لینے والا بھی نہیں؟ لیکن آج یہ رنگ ڈال کر تم نے مجھے اس لعنت کی یاد دلادی، ایشور مجھے ایسی توفیق دے کہ میں دل ہی میں نہیں بلکہ عمل میں من ہرن بنوں۔

یہ کہتے ہوئے شری بلاس نے طشتری سے گلال اٹھایا اور اس تصویر پر چھڑک کر اسے پر نام کیا۔

(یہ افسانہ کلکتہ کے 'متوالا' مئی 1928 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ 'مان سرودر' 5 میں شامل ہے۔ اردو میں 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔)

پسنہاری کا کنواں

بستر مرگ پر پڑی گومتی نے چودھری وِنایک سنگھ سے کہا۔ "چودھری میری زندگی کی یہ لالسا تھی۔"

چودھری نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "اس کی کچھ چنتا نہ کرو کاکی۔ تمھاری لالسا بھگوان پوری کریں گے۔ میں آج ہی سے مزدوروں کو بلا کر کام پر لگائے دیتا ہوں۔ دیو نے چاہا تو تم اپنے کنویں کا پانی پیوگی۔ تم نے تو گنا ہوگا کتنے روپے ہیں؟

گومتی نے ایک پل آنکھیں بند کر کے بکھری ہوئی یادداشت کو یکجا کر کے کہا۔ بھیا میں کیا جانوں کتنے روپے ہیں۔ جو کچھ ہیں۔ وہ اسی ہانڈی میں ہیں۔ اتنا کرنا کہ اتنے ہی میں کام چل جائے۔ کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھروگے۔

چودھری نے بند ہانڈی کو اٹھا کر ہاتھوں سے تولتے ہوئے کہا۔ "ایسا تو کریں گے ہی کاکی کون دینے والا ہے۔ ایک چٹکی بھیک تو کسی کے گھر سے نکلتی نہیں۔ کنواں بنوانے کے لیے کون دیتاہے۔ دھنیہ ہو تم کو کہ اپنی عمر بھر کی کمائی اس دھرم کاج کے لیے دے دی۔"

گومتی نے فخر سے کہا۔ "بھیا تم تو بہت چھوٹے تھے۔ تمھارے کاکا مرے تو میرے ہاتھ میں ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ دن دن بھر بھوکی رہتی۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب ان کی بیماری پر اٹھ گیا۔ وہ بھگوان کے بڑے بھگت تھے۔ اس لیے انھیں بھگوان نے جلدی سے اپنے پاس بلالیا۔ اس دن سے آج تک تم دیکھ رہے ہو کہ کس طرح دن کاٹ رہی ہوں۔ میں نے ایک رات میں من بھراناج پیسا ہے۔ بیٹا دیکھنے والے تعجب کرتے تھے۔ نہ جانے اتنی طاقت مجھ میں کہاں سے آجاتی تھی۔ بس یہی تمنا رہی کہ ان کے نام پر گاؤں میں ایک چھوٹا سا کنواں بن جاتا۔ نام تو چلنا چاہیے اسی لیے تو آدمی بیٹے بیٹی کو روتا ہے۔

اس طرح چودھری وِنایک سنگھ کو وصیت کر کے اسی رات کو بڑھیا گومتی پرلوک سدھاری۔ مرتے وقت آخری الفاظ جو اس کے منہ سے نکلے تھے وہی

"کنواں بنوانے میں دیر مت کرنا۔ " اس کے پاس دولت ہے۔ یہ تو لوگوں کو اندازہ تھا لیکن دو ہزار ہے اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ بڑھیا اپنی دولت کو عیب کی طرح چھپاتی تھی۔ چودھری وِنایک سنگھ گاؤں کا مکھیا اور نیت کا صاف آدمی تھا۔ اس لیے بڑھیا نے اسے یہ آخری حکم دیا تھا۔

چودھری نے بڑھیا کے کریا کرم میں بہت روپے خرچ نہیں کیے۔ جوں ہی ان سنسکاروں سے چھٹی ملی۔ وہ اپنے بیٹے ہرناتھ سنگھ کو بلا کر اینٹ، چونا، پتھر کا تخمینہ کرنے لگا۔ اناج کا کاروبار کرتا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ بیٹھا سنتا رہا پھر بولا۔ "ابھی دو چار مہینے کنواں نہ بنے تو کوئی بڑا ہرج ہے کیا؟"

چودھری نے "ہوں" کر کے کہا۔ "ہرج تو کچھ نہیں لیکن دیر کرنے کا کام ہی کیا ہے۔ " روپے اس نے دے ہی دیے ہیں۔ ہمیں تو مفت میں ناموری ملے گی۔ گومتی نے مرتے مرتے جلد کنواں بنوانے کو کہا تھا۔ "

ہرناتھ بولا۔ "ہاں۔ کہا تو تھا، لیکن آج کل بازار اچھا ہے۔ تین ہزار کا اناج بھر لیا جائے۔ تو اگہن پوس تک سوایا ہو جائے گا۔ میں آپ کو کچھ سود دے دوں گا۔ "

چودھری کا دل شک اور خوف کی وجہ سے کش مکش میں پھنس گیا۔ دو ہزار کے کہیں ڈھائی ہزار ہوگئے تو کیا کہنا، کچھ بیل بوٹے بنوادوں گا۔ لیکن خوف تھا کہ کہیں گھاٹا ہو گیا تو؟ اس شک کو وہ چھپا نہ سکے۔ بولے۔ "جو کہیں گھاٹا ہوگیا تو "؟

ہرناتھ نے تڑپ کر کہا۔ "گھاٹا کیوں ہو جائے گا؟ کوئی بات ہے۔ "

"مان لو گھاٹا ہوگیا تو"؟

ہرناتھ نے مشتعل ہو کر کہا۔ "یہ کہو کہ تم روپیہ نہیں دینا چاہتے ہو۔ بڑے دھرماتما بنے ہو۔ "

دوسرے بزرگوں کی طرح چودھری بھی بیٹے سے ڈرتے تھے۔ دبے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں یہ کب کہتا ہوں کہ روپیہ نہیں دوں گا۔ لیکن پرایا دھن ہے سوچ سمجھ کر ہی تو اس میں ہاتھ لگانا چاہیے۔ بیوپار کا حال کون جانتا ہے۔ کہیں بھاؤ اور زیادہ گر جائے تو؟ اناج میں گھن ہی لگ جائے، کوئی مدعی گھر میں آگ لگا دے۔ سب باتیں سوچ لو اچھی طرح۔ "

ہرناتھ نے طنز سے کہا۔ "اس طرح سوچنا ہے تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ کوئی چور ہی اٹھالے جائے یا بنی بنائی دیوار بیٹھ جائے۔ یہ باتیں تو ہوتی ہی ہیں۔"

چودھری کے پاس اب اور کوئی دلیل نہیں تھی۔ کمزور سپاہی نے تال تو ٹھونکی اکھاڑے میں اتر بھی پڑا۔ تلوار کی چمک دیکھتے ہی ہاتھ پھول گئے۔ بغلیں جھانک کر چودھری نے کہا

"تو کتنا لوگے"

ہرناتھ ہوشیار جنگجو کی طرح دشمن کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر بپھر کر بولا۔ "سب کا سب دیجیے سو پچاس لے کر کیا کھلواڑ کرنا ہے۔"

چودھری راضی ہوگئے۔ گومتی کو انھیں روپیہ دیتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ دنیا برائی کرے گی۔ اس کا امکان بھی نہیں تھا۔ ہرناتھ نے اناج بھرا۔ اناج کے بوروں کا ڈھیر لگ گیا۔ آرام کی میٹھی نیند سونے والے چودھری اب ساری رات چوروں کی رکھوالی کرتے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی چوہیا بوروں میں گھس جائے۔ چودھری اس طرح جھپٹتے کہ بلی بھی ہار مان جاتی اس طرح چھ مہینے گذر گئے۔ اناج بکا۔ پورے پانچ سو روپے کا منافع ہوا۔

ہرناتھ نے کہا۔ "اس میں پچاس روپیہ آپ لے لیں۔"

چودھری نے جھلا کر کہا۔ "پچاس روپیہ کیا خیرات لے لوں۔ کسی مہاجن سے اتنے روپے لیے ہوتے تو کم سے کم دو سو روپیہ سود کے ہوتے۔"

ہرناتھ نے بات کو زیادہ نہیں بڑھایا۔ ایک سو پچاس روپے چودھری کو دے دیتے۔ چودھری کی آتما اتنی خوش کبھی نہیں ہوئی تھی۔ رات کو وہ اپنی کوٹھری میں سونے گیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ بڑھیا گومتی کھڑی مسکرا رہی ہے۔ چودھری کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا وہ نیند میں نہ تھا۔ کوئی نشہ نہ کھایا تھا۔ گومتی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہاں اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک عجیب تازگی تھی۔

کئی سال گذر گئے چودھری برابر اسی فکر میں رہتے کہ ہرناتھ سے روپیہ نکال لوں۔ لیکن ہرناتھ ہمیشہ ہی حیلے حوالے کرتا رہتا تھا۔ وہ سال میں تھوڑا سا سود دے دیتا تھا۔ مگر مول کے لیے ہزاروں باتیں بناتا تھا۔ کبھی لہنے کا رونا تھا کبھی چکتے کا۔ ہاں

کاروبار بڑھتا جاتا تھا۔ آخر کار ایک دن چودھری نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ تمھارا کام چلے یا ڈوبے مجھے پرواہ نہیں۔ اس مہینے میں تمھیں ضرور روپے چکانے پڑیں گے۔ ہرناتھ نے بہت اڑن گھائیاں بتائیں چودھری اپنے ارادے پر جمے رہے۔

ہرناتھ نے جھنجھلا کر کہا۔ "کہتا ہوں کہ دو مہینے اور ٹھہریئے مال فروخت ہوتے ہی میں روپے دے دوں گا۔"

چودھری نے سختی سے کہا۔ "تمھارا مال کبھی نہ بکے گا اور نہ کبھی تمھارے دو مہینے پورے ہوں گے۔ میں آج روپیہ لوں گا۔"

ہرناتھ اسی وقت غصے میں بھرا ہوا اٹھا اور دو ہزار روپیہ لاکر چودھری کے سامنے پٹک دیا۔

چودھری نے کچھ جھینپ کر کہا۔ "روپے تو تمھارے پاس تھے۔"

"تو کیا باتوں سے روزگار ہوتا ہے۔"

"تم اس وقت مجھے پانچ سو روپے دے دو۔ باقی دو مہینے میں دے دینا۔ سب آج ہی تو خرچ نہیں ہو جائیں گے۔"

ہرناتھ نے تاؤ کھاکر کہا۔ "آپ چاہے خرچ کیجیے یا جمع کیجیے مجھے ان روپیوں سے کام نہیں۔ دنیا میں کیا مہاجن مر گئے ہیں۔ جو آپ کی دھونس سہوں۔"

چودھری نے روپے اٹھا کر ایک طاق پر رکھ دیے۔ کنویں کی داغ بیل ڈالنے کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

ہرناتھ نے روپے لوٹا تو دیے تھے۔ مگر من میں کچھ اور منصوبہ باندھ رہا تھا۔ آدھی رات کو جب گھر میں سناٹا چھا گیا۔ تو ہرناتھ چودھری کی کوٹھری کی چول کھسکا کر اندر گھسا۔ چودھری بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ ہرناتھ نے چاہا کہ دونوں تھیلیاں اٹھا کر باہر نکل جاؤں۔ لیکن جوں ہی ہاتھ بڑھایا اسے اپنے سامنے گومتی کھڑی دکھائی دی۔ وہ دونوں تھیلیوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھی۔ ہرناتھ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

پھر یہ سوچ کر کے شاید مجھے دھوکا ہو رہا ہے۔ اس نے پھر ہاتھ بڑھایا، پر اب کی وہ مورتی اتنی ڈراؤنی ہو گئی کہ ہرناتھ ایک پل بھی وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ بھاگا پر

برآمدے میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ہرناتھ نے چاروں طرف سے روپے وصول کر کے بیوپاریوں کو دینے کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چودھری نے آنکھیں دکھائیں تو وہی روپیہ لاکر پٹک دیا۔ دل میں اسی وقت سوچ لیا تھا کہ رات کو روپے اڑا لاؤں گا۔ جھوٹ موٹ چور کا غل مچاؤں گا تو میری طرح شک بھی نہ ہوگا۔ پر جب یہ پیش بندی ٹھیک نہ اتری تو اس پر بیوپاریوں کے تقاضے ہونے لگے۔ وعدوں پر لوگوں کو کہاں تک ٹالتا جتنے بہانے ہو سکتے تھے۔ سب کیے۔ آخر یہ نوبت آگئی کہ لوگ نالش کرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ ایک نے تو تین سو روپے کی نالش بھی کردی۔ بیچارے چودھری بڑی مشکل میں پھنسے۔

دکان پر ہرناتھ بیٹھتا تھا۔ چودھری کو اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ پر اس کی جو ساکھ تھی۔ وہ چودھری کی وجہ سے تھی۔ لوگ چودھری کو کھرا اور لین دین کا صاف آدمی سمجھتے تھے۔ حالانکہ اب بھی ان سے کوئی تقاضا نہیں کرتا تھا۔ پر وہ سب سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ مگر انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کنویں کے روپے نہ چھوؤں گا۔ چاہے کچھ بھی آپڑے۔

رات کو ایک بیوپاری کے مسلمان چپراسی نے چودھری کے دروازے پر جاکر ہزاروں گالیاں سنائیں چودھری کو بار بار غصہ آیا تھا کہ چل کر اس کی مونچھ اکھاڑ لوں، پر دل کو سمجھایا۔ ہم سے مطلب ہی کیا ہے۔ بیٹے کا قرض ادا کرنا باپ کا فرض نہیں ہے۔

جب کھانا کھانے گئے تو بیوی نے کہا۔ "یہ سب کیا جھگڑا کر رکھا ہے"؟

چودھری نے کمزور لہجے میں کہا۔ "میں نے کر رکھا ہے؟"

"اور کس نے؟ بچہ قسم کھاتا ہے کہ میرے پاس صرف تھوڑا سا مال ہے۔ روپے تو سب تم نے مانگ لیے"

چودھری: مانگ نہ لیتا تو کیا کرتا۔ حلوائی کی دکان پر دادا کا فاتحہ پڑھنا مجھے پسند نہیں ہے۔

استری: یہ ناک کٹائی اچھی لگتی ہے۔

چودھری: تو میرا کیا بس ہے بھائی۔ کبھی کنواں بنے گا کہ نہیں، پانچ سال ہوگئے۔

استری: اس وقت اس نے کچھ نہیں کھایا۔ پہلی جون بھی منہ جھوٹا کر کے اٹھ

گیا تھا۔

چودھری : تم نے سمجھا کر کھلایا نہیں۔ دانہ پانی چھوڑ دینے سے تو روپے نہیں ملیں گے۔

استری : تم کیوں نہیں جا کر سمجھا دیتے۔

چودھری : مجھے تو وہ اس وقت بیری سمجھ رہا ہوگا۔

استری : میں روپیہ لے جاکر بچہ کو دے آتی ہوں۔ ہاتھ میں جب روپے آجائیں تو کنواں بنوا دینا۔

چودھری : نہیں، نہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ میں اتنا بڑا دھوکا نہ کرسکوں گا چاہے گھر مٹی میں مل جائے۔

لیکن استری نے ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا وہ لپک کر اندر گئی اور تھیلیوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی کہ ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا سارا جسم ستار کی طرح کانپنے لگا۔

چودھری نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا، تمھیں چکر تو نہیں آرہا۔"

عورت نے طاق کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ وہ ...... وہ چڑیل وہاں کھڑی ہے۔

چودھری نے طاق کی طرف دیکھ کر کہا۔ کون چڑیل؟ مجھے تو وہاں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

استری : میرا تو کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس بڑھیا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔

چودھری : یہ سب وہم ہے۔ بڑھیا کو مرے ہوئے پانچ سال ہوگئے۔ کیا اب تک وہ یہاں بیٹھی ہے۔

استری : میں نے صاف دیکھا وہی تھی بچہ کہتا تھا کہ اس نے رات تھیلیوں پر ہاتھ رکھے دیکھا تھا۔

چودھری: وہ رات کو میری کوٹھری میں کب آیا؟

استری : تم سے کچھ روپیوں کے بارے میں ہی کہنے آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بھاگا۔

چودھری : اچھا پھر تم اندر جاؤ میں دیکھ رہا ہوں۔

استری نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "نا بابا۔ اب میں اس کمرے میں قدم نہ رکھوں گی۔"

چودھری : اچھا میں جاکر دیکھتا ہوں۔

چودھری نے کوٹھری میں جاکر دونوں تھیلیاں طاق پر سے اٹھالیں۔ کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔ گومتی کی چھایا کا کہیں نام تک نہیں تھا۔ استری دروازے پر کھڑی جھانک رہی تھی۔ چودھری نے آکر فخر سے کہا۔

" مجھے تو کہیں کچھ نہ دکھائی دیا۔ وہاں ہوتی تو کہاں چلی جاتی۔ "

استری : کیا جانے تمھیں کیوں نہیں دکھائی دی۔ تم پر مہربان تھی، اسی لیے ہٹ گئی ہوگی۔

چودھری : تمھیں وہم تھا اور کچھ نہیں۔

استری : بچہ کو بلا کر پچھوائے دیتی ہوں۔

چودھری : کھڑا تو ہوں جا کر دیکھ کیوں نہیں آتی۔

استری کی کچھ ہمت بندھی۔ اس نے طاق کے پاس جا کر ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا اور زور سے چلا کر بھاگی اور آنگن میں آکر دم لیا۔

چودھری بھی اس کے ساتھ آنگن میں آگیا اور حیرت سے بولا۔ کیا تھا؟ کیا بیکار میں بھاگی چلی آئی۔ مجھے تو کچھ نہ دکھائی دیا۔

استری نے ہانپتے ہوئے کہا۔ چلو ہٹو۔ اب تک تو تم نے میری جان ہی لے لی تھی نہ جانے تمھاری آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے۔ کھڑی تو ہے وہ ڈائین۔

اتنے میں ہرناتھ بھی وہاں آگیا۔ ماتا کو آنگن میں پڑے دیکھ کر بولا۔ "کیا ہے اماں کیسا جی ہے۔"

استری : وہ چڑیل آج دوبارہ دکھائی دی۔ بیٹا میں نے کہا لاؤ تمھیں روپے دے دوں جب ہاتھ میں آجائیں گے تو کنواں بنوا دیا جائے گا۔ لیکن جیوں ہی تھیلیوں پر ہاتھ رکھا۔ اس چڑیل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پران نکل گئے۔

ہرناتھ نے کہا: "کسی اچھے اوجھا کو بلانا چاہیے جو اسے مار بھگائے گا۔

چودھری : کیا رات کو تمھیں بھی دکھائی دی تھی۔

ہرناتھ : ہاں، میں، تمھارے پاس ایک معاملے میں صلاح کرنے آیا تھا۔ جیوں ہی اندر قدم رکھا۔ وہ چڑیل طاق کے پاس کھڑی دکھائی دی، میں بدحواس ہو کر بھاگا۔

چودھری : اچھا پھر تو جاؤ۔

استری : کون؟ اب تو میں نہ جانے دوں چاہے کوئی لاکھ روپیہ ہی کیوں نہ دے۔

ہرناتھ : میں آپ نہ جاؤں گا۔

چودھری : مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات کیا ہے؟

ہرناتھ : کیا جانے آپ سے ڈرتی ہوگی۔ آج کسی اوجھا کو بلانا چاہیے۔

چودھری : کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا ماجرا ہے۔ کیا ہوا بیجو پانڈے کی ڈگری کا؟

ہرناتھ ان دنوں چودھری سے اتنا جلتا تھا کہ اپنی دکان کے بارے میں کوئی بات بھی ان سے نہ کہتا۔ آنگن کی طرف تاکتا ہوا جیسے ہوا سے بولا۔ ''جو ہونا ہوگا وہ ہوگا۔ میری جان کے سوا اور کوئی کیا لے لے گا۔ جو کھا گیا ہوں وہ تو اگل نہیں سکتا۔

چودھری : کہیں اس نے ڈگری جاری کرادی تو۔

ہرناتھ : تو کیا دکان میں چار پانچ سو کا مال ہے وہ نیلام ہو جائے گا۔

چودھری : کاروبار تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔

ہرناتھ : اب کاروبار کے نام کو کہاں تک روتا رہوں۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ کنواں بنوانے کی اتنی جلدی ہے تو یہ کام چھیڑتا ہی کیوں۔ روٹی دال تو پہلے بھی مل جاتی تھی۔ بہت ہوگا دو چار مہینے حوالات میں رہنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

ماتا نے کہا : جو تمھیں حوالات میں لے جائے اس کا منھ جھلس دوں۔ ہمارے جتے جی تم حوالات میں جاؤگے۔

ہرناتھ نے فلاسفر بن کر کہا۔ ''من باپ جنم کے ساتھی ہوتے ہیں۔ کسی کے کرم کے ساتھی نہیں ہوتے۔''

چودھری کو بیٹے سے بڑی محبت تھی۔ مگر انھیں شک تھا کہ ہرناتھ روپے ہضم کرنے کے لیے ٹال مٹول کر رہا ہے۔ اسی لیے انھوں نے تقاضا کر کے روپے وصول کر لیے تھے۔ اب انھیں احساس ہوا کہ ہرناتھ کی جان سچ مچ مصیبت میں ہے۔ سوچا

اگر لڑکے کو حوالات ہوگئی یا دکان پر قرقی آگئی تو خاندان کی عزت دھول میں مل جائے گی۔ کیا ہرج ہے۔ اگر گومتی کے روپے دے دوں۔ آخر دکان چلتی ہی ہے۔ کبھی نہ کبھی تو روپے ہاتھ میں آہی جائیں گے۔

یکایک کسی نے باہر سے پکارا۔ ''ہرناتھ سنگھ''

ہرناتھ سنگھ کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

چودھری نے پوچھا ''کون ہے؟''

''قرقی کرنے والا امین۔''

''کیا دکان قرق کرنے آیا ہے۔''

''ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔''

''کتنے روپے کی ڈگری ہے؟''

''بارہ سو روپے کی''

''قرقی کرنے والا امین کچھ لے دے کے نہ ٹلے گا۔''

''ٹل تو جاتا پر مہاجن بھی تو اس کے ساتھ ہوگا۔ اسے جو کچھ لینا ہے ادھر سے لے چکا ہوگا۔''

''نہ ہو۔ بارہ سو روپے گومتی کے روپیوں میں سے دے دو۔''

''اس کے روپے کون چھوئے گا۔ نہ جانے گھر پر کیا آفت آئے۔''

''اس کے روپے کوئی ہضم تھوڑے ہی کیے لیتا ہے چلو میں دے دوں۔''

چودھری کو اس وقت ڈر ہوا کہیں وہ مجھے بھی دکھائی نہ دے لیکن ان کا شک بے بنیاد تھا۔ انھوں نے ایک تھیلی سے بارہ سو روپے نکالے اور دوسری تھیلی میں رکھ کر ہرناتھ کو دے دیے۔ شام تک ان دو ہزار روپیوں میں سے ایک روپیہ بھی نہ بچا۔

بارہ سال گزر گئے۔ نہ چودھری اب اس دنیا میں ہے۔ اور نہ ہرناتھ۔ چودھری جب تک زندہ رہے انھیں کنواں بنوانے کی فکر بنی رہی۔ یہاں تک کہ مرتے دم بھی ان کی زبان پر کنویں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ لیکن دکان میں ہمیشہ روپیوں کی کمی رہی۔ چودھری کے مرتے ہی سارا کاروبار چوپٹ ہوگیا۔ ہرناتھ نے ایک آنہ روپے کے منافع سے مطمئن نہ ہو کر دگنے تگنے منافع پر ہاتھ مارا جوا کھیلنا شروع کیا۔ سال بھر بھی

گزرنے نہ پایا تھا کہ دکان بند ہو گئی۔ گہنے پاتے برتن بھانڈ سے سب مٹی میں مل گئے۔

چودھری کی موت کے ٹھیک سال بھر بعد ہرناتھ نے بھی اس نفع نقصان کی دنیا سے کوچ کیا۔ ماتا کی زندگی کا اب کوئی سہارا نہ رہا۔ بیمار پڑی پر دوا دارو نہ ہو سکی۔ تین چار مہینے تک طرح طرح کے دکھ جھیل کر وہ بھی چل بسی۔ اب صرف بہو تھی اور وہ بھی حاملہ۔ اس بیچاری کے لیے اب کوئی سہارا نہیں تھا۔ ایسی حالت میں مزدوری بھی نہ کر سکتی تھی۔ پڑوسیوں کے کپڑے سی کر اس نے کسی طرح پانچ چھے مہینے کاٹے۔ تیرے لڑکا ہوگا۔ ساری علامات لڑکے کی تھیں۔ یہی ایک زندگی کا سہارا تھا۔ جب لڑکی ہوئی تو وہ سہارا بھی جاتا رہا۔

ماں نے اپنا دل اتنا سخت کر لیا کہ نومولود بچے کو چھاتی بھی نہ لگاتی تھی۔ پڑوسیوں کے بہت سمجھانے بجھانے پر چھاتی سے لگایا۔ پر اس کی چھاتی میں دودھ کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ اس وقت بدنصیب ماں کے دل میں رحم اور ممتا کا ایک زلزلہ سا آگیا۔ اگر کسی طریقے سے اس کے سینے کی آخر بوند دودھ بن جاتی تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی۔

بچی کی یہ بھولی، معصوم قابل رحم اور پیاری صورت دیکھ کر ماں کا دل جیسے ہزاروں آنکھوں سے رونے لگا۔ اس کے دل کی ساری نیک خواہشات، ساری آشیرواد، ساری محبت جیسے اس کی آنکھوں سے نکل کر اس بچی کو اس طرح شرابور کر دیتے تھے جیسے چاند کی ٹھنڈی روشنی پھولوں کو نہلا دیتی ہے۔ پر اس بچی کی قسمت میں ماں کی محبت کے سکھ نہیں تھے۔ ماں نے کچھ اپنا خون، کچھ اوپر کا دودھ پلا کر اسے زندہ رکھا مگر اس کی حالت دن بدن پتلی ہوتی جاتی تھی۔

ایک دن لوگوں نے آکر دیکھا تو وہ زمین پر پڑی ہوئی تھی اور بچی اس کی چھاتی سے چپٹی ہوئی اس کے پستان کو چوس رہی تھی۔ دکھ اور غریبی کے مارے ہوئے جسم میں خون کہاں جس سے دودھ بنتا۔

وہی بچی پڑوسیوں کے رحم و کرم سے پل کر ایک دن گھاس کھودتی ہوئی اس مقام پر پہنچی جہاں بڑھیا گومتی کا گھر تھا۔ چھپر کب کے زمین میں مل چکے تھے۔ صرف جہاں تہاں دیواریں کھڑی تھیں۔ لڑکی نے جانے کیا سوچ کر کھرپی سے گڈھا

کھودنا شروع کیا۔ دوپہر سے شام تک وہ گڈھا کھودتی رہی۔ نہ کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی۔ نہ کوئی خوف تھا نہ ڈر۔ اندھیرا ہوگیا پر وہ جیوں کی تیوں بیٹھی گڈھا کھودتی رہی۔ اس وقت کسان لوگ بھول کر بھی ادھر نہیں آتے تھے۔ یہ لڑکی بے خوف بیٹھی زمین سے مٹی نکال رہی تھی۔ جب اندھیرا ہوگیا تو چلی گئی۔

دوسرے دن وہ بڑے سویرے اٹھی اور اتنی گھاس کھودی جتنی وہ کبھی دن بھر میں بھی نہیں کھودتی تھی۔ دوپہر کے بعد وہ اپنی کھانچی اور کھرپی لیے ہوئے پھر اسی جگہ پر پہنچی پر وہ آج اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ دو بچے اور بھی تھے۔ تینوں وہاں شام تک کنواں کھودتے رہے۔ لڑکی گڈھے کے اندر کھودتی تھی اور دونوں بچے مٹی نکال نکال کر پھینکتے تھے۔

تیسرے دن دو اور لڑکے بھی اس کھیل میں مل گئے۔ شام تک کھیل ہوتا رہا۔ آج گڈھا دو ہاتھ گہرا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیوں میں اس عجیب کھیل نے بے مثال حوصلہ بھر دیا تھا۔

چوتھے دن اور بھی کئی بچے آملے۔ صلاح ہوئی کون اندر جائے۔ کون مٹی اٹھائے۔ گڈھا اب چار ہاتھ گہرا ہو گیا تھا۔ پر ابھی تک بچوں کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ ایک دن رات کو ایک کسان اپنی کھوئی ہوئی بھینس ڈھونڈتا ہوا اس کھنڈر میں آپہنچا۔ اندر مٹی کا اونچا ڈھیر، ایک بڑا سا گڈھا اور ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ دیکھا تو ڈر کر بھاگا۔

اوروں نے بھی آکے دیکھا۔ کئی آدمی تھے۔ کوئی ڈر نہ تھا۔ قریب جاکر دیکھا تو بچی بیٹھی تھی۔

ایک آدمی نے پوچھا۔ "ارے کیا تو نے یہ گڈھا کھودا ہے؟"

بچی نے کہا، "ہاں"

"گڈھا کھود کر کیا کرے گی؟"

"یہاں کنواں بناؤں گی"

"کنواں کیسے بنائے گی۔ "

"جیسے اتنا کھودا ہے ویسے ہی اور کھود لوں گی۔ گاؤں کے سب لڑکے کھیلنے آتے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے تو اپنی جان دے گی اور اپنے ساتھ اور لڑکوں کو بھی مارے گی، خبردار جو کل سے گڈھا کھودا۔"

دوسرے دن اور لڑکے نہ آئے۔ لڑکی بھی دن بھر مزدوری کرتی رہی لیکن شام کے وقت وہاں پھر چراغ جلا اور پھر وہ کھرپی ہاتھ میں لیے ہوئے وہاں بیٹھی دکھائی دی۔ گاؤں والوں نے اسے مارا پیٹا۔ کوٹھری میں بند کیا پر وہ موقع پاتے ہی وہاں جا پہنچی۔

گاؤں کے لوگ عام طور پر عقیدت مند ہوتے ہیں۔ لڑکی کے اس روحانی لگاؤ نے آخر ان میں بھی لگاؤ پیدا کیا۔ کنواں کھدنے لگا۔

ادھر کنواں کھد رہا تھا ادھر وہ بچی مٹی سے اینٹیں بناتی تھی۔ اس کھیل میں سارے گاؤں کے لڑکے شریک ہوتے تھے۔ اجالی راتوں میں جب سب لوگ سو جاتے تھے تب بھی وہ اینٹیں تھاپتی دکھائی دے جاتی۔ نہ جانے اتنی لگن اس میں کہاں سے آگئی تھی۔ سات سال کی یہ لڑکی عقل اور بات چیت میں اپنی تگنی عمر والوں کے کان کاٹتی تھی۔

آخر ایک دن وہ بھی آیا کہ کنواں بن گیا اور اس کی پکی جگت بھی تیار ہو گئی اس دن بچی اسی جگت پر سوئی۔ آج اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ گاتی تھی، چہکتی تھی۔

صبح کے وقت اس جگت پر صرف اس کی لاش ملی۔ اس دن سے لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ وہی بڑھیا گومتی تھی اور اس کنویں کا نام "پسنہاری کا کنواں" پڑ گیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے جون 1928 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرودر 5 میں شامل ہے۔)

سہاگ کا جنازہ

(1)

ممالک متوسط کے ایک پہاڑی گانوں میں ایک چھوٹے سے مکان کی چھت پر ایک نوجوان گویا شام کے سکوت میں محو ہوابیٹھا تھا، سامنے چاند کی مدھم روشنی میں اودی رنگ والی پہاڑیوں کا سلسلہ لا محدودیت کے خواب کی طرح متین، پر اسرار، نغمہ خیز اور دل کش معلوم ہوتا تھا، ان پہاڑوں کے نیچے آب رواں کی ایک رو پہلی لکیر ایسی معلوم ہوتی تھی گویا ان پہاڑوں کا کل نغمہ، کل متانت اور کل اسرار اسی سفید روانی میں خوش رو کیا ہو، نوجوان کی وضع سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی حالت بہت امیرانہ نہیں ہے، ہاں اس کے چہرے پر جلال و ذہانت کے آثار نمایاں تھے، اس کی آنکھوں پر عینک نہ تھی نہ مونچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ نہ بال سنوارے ہوئے تھے۔ نہ کلائی پر گھڑی تھی حتیٰ کہ جیب میں فاؤنٹین قلم بھی نہ تھا یا تو وہ اصولوں کادلداہ تھا یا تصنع کا دشمن تھا۔

نوجوان خیالات میں غرق اسی پہاڑیوں کے سلسلہ کی طرف خاموشی سے دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً بادل کی گرج سے بھی زیادہ مہیب آواز سنائی دی۔ چشمہ کا نغمہ شیریں اس خوفناک شور میں ڈوب گیا ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس آواز نے پہاڑوں کو بھی ہلا دیا ہے۔ گویا پہاڑوں میں کوئی زبردست لڑائی چھڑ گئی ہے یہ ریل گاڑی تھی جو ندی پر کے پل سے چلی آ رہی تھی۔

ایک نوجوان عورت کمرہ سے نکل کر چھت پر آئی اوربولی آج ابھی سے گاڑی آ گئی اسے بھی آج ہی بیر نکالنا تھا۔

نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، پیاری، میرا جی چاہتا ہے کہ کہیں نہ جاؤں، میں نے طے کرلیا، میں نے تمھاری خاطر سے ہاں کہہ دیا تھا مگر اب جانے کو دل نہیں چاہتا، تین سال کیسے گزریں گے؟ عورت نے پر درد لہجے میں کہا۔ تین سال کی جدائی کے بعد پھر تو تمام عمر کوئی خلل واقع نہ ہوگا! ایک مرتبہ جو ارادہ کرلیا ہے اسے

پورا ہی کر ڈالو۔ بے انتہا خوشی کی اُمید میں ساری مصیبتیں جھیل لوں گی۔

یہ کہتی ہوئی حسینہ ناشتہ لانے کے حیلہ سے پھر اندر چلی گئی، آنسوؤں کا ابال اس کے قابو سے باہر ہوگیا، ان دونوں کی ازدواجی زندگی کی یہ پہلی سال گرہ تھی، نوجوان بمبئی کالج سے ایم اے کی ڈگری لے کر ناگپور کے ایک کالج میں پروفیسر ہوگیا تھا، عصر جدید کے نئے ازدواجی زندگی اور معاشرتی انقلاب نے ذرا بھی ڈانوا ڈول نہ کیا تھا۔ قدیم رواجوں سے ایسی زبردست محبت شاید بڈھوں کو بھی کم ہوگی، پروفیسر ہو جانے پر اس کے والدین نے اس حسینہ سے اس کی شادی کر دی تھی، رواج کے مطابق ہی اس آنکھ مچولی کے کھیل میں انھیں محبت کا انمول رتن مل گیا، کیشو چھٹیوں میں یہاں پہلی گاڑی سے آتا اور آخری گاڑی سے جاتا۔ یہ دو چار روز خواب شیریں کی طرح نبٹ جاتے تھے، دونوں بچوں کی طرح رورو کر جدا ہوتے، اس بالا خانہ پر کھڑی ہو کر وہ اس کو دیکھا کرتی جب تک بیدرد پہاڑیاں اسے آڑ میں نہ کرلیتیں، مگر ابھی سال بھی نہ پورا ہونے پایا تھا کہ مفارقت نے اپنی سازشیں شروع کر دیں، کیشو کو پردیس میں جاکر اپنی تعلیم پوری کرنے کے لیے ایک وظیفہ مل گیا، دوستوں نے مبارکباد دی، کس کے ایسے نصیب ہیں جسے بلا طلب اپنی ترقیوں کا ایسا نادر موقع ہاتھ لگے۔ کیشو بہت خوش نہ تھا، وہ اسی حیص بیص میں پڑا اپنے مکان آیا والدین اور دیگر رشتہ داروں نے اس سیاحت کی زبردست مخالفت کی۔ شہر میں جتنی مبارکبادیاں ملی تھیں، یہاں اس سے کہیں زیادہ رکاوٹیں پیش آئیں لیکن سُبھدرا کے بڑے بڑے منصوبوں کی حد نہ تھی، وہ شاید کیشوکو اندر آسن پر بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے سامنے اس وقت بھی وہی شوہر کی اطاعت کا معیار ہوتا تھا، وہ اس وقت بھی اس کے سر میں تیل ڈالے گی، اس کی دھوتی دھوئے گی، اس کے پیر دبائے گی، اور اس کو پنکھے جھلے گی، عقیدت مند کی بلند ترین تمناؤں کا تعلق اس کی عقیدت کی چیز ہی سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے سونے کا مندر بنائے گا، اس کے سنگھاسن کو جواہرات سے سجائے گا۔ بہشت سے پھول لاکر اسی کی نذر کرے گا۔ مگر وہ خود ویسا ہی عقیدت شعار رہے گا جٹاؤں کے بجائے مکٹ کی یا لنگوٹی کے بجائے پیتامبر کی ہوس اسے کبھی نہیں ستاتی۔ سُبھدرا نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک کیشو سے ولایت جانے کا وعدہ نہ کرا لیا،

والدین نے اسے کلنکی اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ مگر بالآخر وہ بھی راضی ہوگئے۔ سب تیاریاں ہوگئیں اسٹیشن قریب ہی تھا، وہاں گاڑی دیر تک کھڑی رہتی ہے، اسٹیشن کے قریبی گاؤں کے باشندوں کے لیے گاڑی کی آمد، دشمن چڑھائی نہیں، بلکہ دوست کی آمد ہے۔ گاڑی آگئی، سُبھدرا ناشتہ تیار کرکے شوہر کو ہاتھ دھلانے آئی تھی، اس وقت کیشو کے محبت بھرے اعتراض نے اسے ایک لمحہ کے لیے متزلزل کر دیا۔ ہائے کون جانتا ہے کہ تین سال میں کیا ہو جاوے، دل میں ایک جوش پیدا ہوا، کہہ دوں "پیارے نہ جاؤ تھوڑا ہی کھائیں گے۔ موٹا ہی پہنیں گے رو رو کر دن تو نہ کٹیں گے۔" کبھی کیشو کے آنے میں ایک آدھ مہینہ لگ جاتا تھا تو وہ بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں، پھر یہ کمبخت تین سال کیسے گزریں گے لیکن اس نے نہایت سختی سے ان مایوسی بھرے خیالات کو ٹھکرا دیا اور کانپتے ہوئے لہجہ میں بولی۔ جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے، جب تین سال کی مدت کا اندازہ کرتی ہوں تو ایک کلپ سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب ولایت میں تمھاری عزت و شہرت کا خیال کرتی ہوں تو یہ تین سال تین دن کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ تم تو جہاز پر پہنچتے ہی مجھے بھول جاؤ گے۔ نئے نئے منظر تمھاری دلکشی کے لیے آ موجود ہوں گے۔ یوروپ جاکر عالموں کی صحبت میں تمھیں گھر کی یاد بھی نہ آئے گی۔ مجھے تو رونے کے سوا اور کوئی دھندا نہیں ہے۔ یہی محبت کی یادداشتیں میری زندگی کا سہارا ہوں گی۔ لیکن کیا کروں، زندگی کو آرام سے بسر کرنے کی خواہشیں تو ضبط نہیں ہوتیں۔ پھر جس جدائی کا انجام زندگی کے سارے لوازمات کو اپنے ساتھ لائے گا وہ در اصل تپسیا (ریاضت) ہے تپسیا کے بغیر تو "بردان" نہیں ملتا۔

کیشو کو بھی اب معلوم ہوا کہ عارضی محبت کے جوش میں اپنی قسمت بنانے کا ایسا نادر موقع ہاتھ سے جانے دینا محض نادانی ہے، کھڑے ہو کر بولے "تم بہت رونا دھونا نہیں ورنہ میرا جی نہ لگے گا" سبھدرا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر سینہ سے لگاتے ہوئے ان کے چہرے کی طرف اشک آلود نگاہوں سے دیکھا اور بولی "خط برابر بھیجتے رہنا" ضرور بھیجوں گا، ہفتہ وار لکھوں گا۔

سبھدرا نے آنسوؤں میں مسکراتے ہوئے کہا، دیکھنا، ولایتی مسوں کے جال میں نہ

پھنس جانا۔

کیشو پھر پلنگ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ یہ شک ہے تو لو میں جاؤں گا ہی نہیں۔

سبھدرا نے اس کے گلے میں ہاتھوں کو حمائل کر کے پر اعتماد نگاہوں سے دیکھا اور بولی، میں دل لگی کر رہی تھی، "اگر اندر لوک کی اپسرا بھی آ جاوے تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو۔ برہما جی نے ایسی دوسری ہستی پیدا ہی نہیں کی۔"

درمیان میں کوئی چھٹی مل سکے تو ایک بار چلے آنا۔

"نہیں پیاری، درمیان میں شاید چھٹی نہ ملے گی، مگر جو میں نے سنا کہ تم رو رو کر گھلی جاتی ہو، کھانا پینا ترک کر دیا ہے، تو میں ضرور چلا آؤں گا۔ یہ پھول ذرا بھی کمھلانے نہ پاویں"۔

دونوں گلے مل کر جدا ہوگئے، باہر رشتہ داروں اور دوستوں کا ایک مجمع موجود تھا، کیشو نے بڑوں کے پیر چھوئے، چھوٹوں کو گلے لگایا اور اسٹیشن کی طرف چلا، سب لوگ اسٹیشن پر پہنچنے گئے، ایک لمحہ میں گاڑی مسافروں کو لے کر چل دی۔

ادھر کیشو گاڑی میں بیٹھاہوا پہاڑیوں کی بہار دیکھ رہا تھا، ادھر سبھدرا زمین پر پڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔

(2)

دن گذرنے لگے اسی طرح جیسے بیماری کے دن گزرتے ہیں، دن پہاڑ رات کالی بلا، رات بھر مناتے گزرتی تھی کہ کسی طرح سویرا ہو۔ سویرا ہوتا تو منانے لگتی کہ جلد شام ہو، مائکے گئی کہ وہاں جی بہلے گا۔ دس پانچ روز تک مقام کی تبدیلی کا کچھ اثر ہوا، پھر اس سے بد تر حالت ہوئی، بھاگ کر خسرال چلی آئی، مریض کروٹ بدل کر آرام محسوس کرتا ہے۔

پہلے پانچ چھ ماہ تک تو کیشو کے خطوط پندرھویں روز برابر ملتے رہے ان میں رنج و فراق کا ذکر کم اورنئے نئے مناظر کا تذکرہ زیادہ ہوتا تھا مگر سبھدرا مطمئن تھی خطوط آتے ہیں وہ خوش ہیں خیریت سے ہیں اس کے لیے یہی کافی تھا، اس کے خلاف وہ خط لکھتی تو درد فراق کے ذکر کے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا، کبھی کبھی دل بے چین ہو جاتا تو پچھتائی کہ ناحق جانے دیا۔ کہیں ایک روز مرجاؤں تو ان کے درشن

پسنہاری کا کنواں

بستر مرگ پر پڑی گومتی نے چودھری وناایک سنگھ سے کہا۔ "چودھری میری زندگی کی یہ لالسا تھی۔"

چودھری نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "اس کی کچھ چنتا نہ کرو کاکی۔ تمھاری لالسا بھگوان پوری کریں گے۔ میں آج ہی سے مزدوروں کو بلا کر کام پر لگائے دیتا ہوں۔ دیو نے چاہا تو تم اپنے کنویں کا پانی پیوگی۔ تم نے تو گنا ہوگا کتنے روپے ہیں؟

گومتی نے ایک پل آنکھیں بند کر کے بکھری ہوئی یادداشت کو یکجا کر کے کہا۔ بھیا میں کیا جانوں کتنے روپے ہیں۔ جو کچھ ہیں۔ وہ اسی ہانڈی میں ہیں۔ اتنا کرنا کہ اتنے ہی میں کام چل جائے۔ کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھروگے۔

چودھری نے بند ہانڈی کو اٹھا کر ہاتھوں سے تولتے ہوئے کہا۔ "ایسا تو کریں گے ہی کاکی کون دینے والا ہے۔ ایک چٹکی بھیک تو کسی کے گھر سے نکلتی نہیں۔ کنواں بنوانے کے لیے کون دیتاہے۔ دھنیہ ہوتم کو کہ اپنی عمر بھر کی کمائی اس دھرم کا ج کے لیے دے دی۔"

گومتی نے فخر سے کہا۔ "بھیا تم تو بہت چھوٹے تھے۔ تمھارے کاکا مرے تو میرے ہاتھ میں ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ دن دن بھر بھوکی رہتی۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب ان کی بیماری پر اٹھ گیا۔ وہ بھگوان کے بڑے بھگت تھے۔ اس لیے انھیں بھگوان نے جلدی سے اپنے پاس بلالیا۔ اس دن سے آج تک تم دیکھ رہے ہو کہ کس طرح دن کاٹ رہی ہوں۔ میں نے ایک رات میں من بھراناج پیسا ہے۔ بیٹا دیکھنے والے تعجب کرتے تھے۔ نہ جانے اتنی طاقت مجھ میں کہاں سے آجاتی تھی۔ بس یہی تمنا رہی کہ ان کے نام پر گاؤں میں ایک چھوٹا سا کنواں بن جاتا۔ نام تو چلنا چاہیے اسی لیے تو آدمی بیٹے بیٹی کو روتا ہے۔

اس طرح چودھری وناایک سنگھ کو وصیت کر کے اسی رات کو بڑھیا گومتی پرلوک سدھاری۔ مرتے وقت آخری الفاظ جو اس کے منھ سے نکلے تھے وہی

"کنواں بنوانے میں دیر مت کرنا۔ " اس کے پاس دولت ہے۔ یہ تو لوگوں کو اندازہ تھا لیکن دو ہزار ہے اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ بڑھیا اپنی دولت کو عیب کی طرح چھپاتی تھی۔ چودھری ونایک سنگھ گاؤں کا مکھیا اور نیت کا صاف آدمی تھا۔ اس لیے بڑھیا نے اسے یہ آخری حکم دیا تھا۔

چودھری نے بڑھیا کے کریا کرم میں بہت روپے خرچ نہیں کیے۔ جوں ہی ان سنسکاروں سے چھٹی ملی۔ وہ اپنے بیٹے ہرناتھ سنگھ کو بلا کر اینٹ، چونا، پتھر کا تخمینہ کرنے لگا۔ اناج کا کاروبار کرتا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ بیٹھا سنتا رہا پھر بولا۔ "ابھی دو چار مہینے کنواں نہ بنے تو کوئی بڑا ہرج ہے کیا؟"

چودھری نے "ہوں" کر کے کہا۔ "ہرج تو کچھ نہیں لیکن دیر کرنے کا کام ہی کیا ہے۔ " روپے اس نے دے ہی دیے ہیں۔ ہمیں تو مفت میں ناموری ملے گی۔ گومتی نے مرتے مرتے جلد کنواں بنوانے کو کہا تھا۔ "

ہرناتھ بولا۔ "ہاں۔ کہا تو تھا، لیکن آج کل بازار اچھا ہے۔ تین ہزار کا اناج بھر لیا جائے۔ تو اگہن پوس تک سوایا ہو جائے گا۔ میں آپ کو کچھ سود دے دوں گا۔ "

چودھری کا دل شک اور خوف کی وجہ سے کش مکش میں پھنس گیا۔ دو ہزار کے کہیں ڈھائی ہزار ہوگئے تو کیا کہنا، کچھ بیل بوٹے بنوادوں گا۔ لیکن خوف تھا کہ کہیں گھاٹا ہو گیا تو؟ اس شک کو وہ چھپا نہ سکے۔ بولے۔ "جو کہیں گھاٹا ہو گیا تو "؟

ہرناتھ نے تڑپ کر کہا۔ "گھاٹا کیوں ہو جائے گا؟ کوئی بات ہے۔ "

"مان لو گھاٹا ہو گیا تو"؟

ہرناتھ نے مشتعل ہو کر کہا۔ "یہ کہو کہ تم روپیہ نہیں دینا چاہتے ہو۔ بڑے دھرماتما بنے ہو۔ "

دوسرے بزرگوں کی طرح چودھری بھی بیٹے سے ڈرتے تھے۔ دبے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں یہ کب کہتا ہوں کہ روپیہ نہیں دوں گا۔ لیکن پرایا دھن ہے سوچ سمجھ کر ہی تو اس میں ہاتھ لگانا چاہیے۔ بیوپار کا حال کون جانتا ہے۔ کہیں بھاؤ اور زیادہ گر جائے تو؟ اناج میں گھن ہی لگ جائے، کوئی مدعی گھر میں آگ لگا دے۔ سب باتیں سوچ لو اچھی طرح۔ "

ہرناتھ نے طنز سے کہا۔ " اس طرح سوچنا ہے تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ کوئی چور ہی اٹھالے جائے یا بنی بنائی دیوار بیٹھ جائے۔ یہ باتیں تو ہوتی ہی ہیں۔ "

چودھری کے پاس اب اور کوئی دلیل نہیں تھی۔ کمزور سپاہی نے تال تو ٹھونکی اکھاڑے میں اتر بھی پڑا۔ تلوار کی چمک دیکھتے ہی ہاتھ پھول گئے۔ بغلیں جھانک کر چودھری نے کہا

"تو کتنا لوگے"

ہرناتھ ہوشیار جنگجو کی طرح دشمن کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر بپھر کر بولا۔ "سب کا سب دیجیے سو پچاس لے کر کیا کھلواڑ کرنا ہے۔ "

چودھری راضی ہوگئے۔ گومتی کو انھیں روپیہ دیتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ دنیا برائی کرے گی۔ اس کا امکان بھی نہیں تھا۔ ہرناتھ نے اناج بھرا۔ اناج کے بوروں کا ڈھیر لگ گیا۔ آرام کی میٹھی نیند سونے والے چودھری اب ساری رات چوروں کی رکھوالی کرتے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی چوہیا بوروں میں گھس جائے۔ چودھری اس طرح جھپٹتے کہ بلی بھی ہار مان جاتی اس طرح چھ مہینے گذر گئے۔ اناج بکا۔ پورے پانچ سو روپے کا منافع ہوا۔

ہرناتھ نے کہا۔ " اس میں پچاس روپیہ آپ لے لیں۔ "

چودھری نے جھلا کر کہا۔ " پچاس روپیہ کیا خیرات لے لوں۔ کسی مہاجن سے اتنے روپے لیے ہوتے تو کم سے کم دو سو روپیہ سود کے ہوتے۔ "

ہرناتھ نے بات کو زیادہ نہیں بڑھایا۔ ایک سو پچاس روپے چودھری کو دے دیے۔ چودھری کی آتما اتنی خوش کبھی نہیں ہوئی تھی۔ رات کو وہ اپنی کوٹھری میں سونے گیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ بڑھیا گومتی کھڑی مسکرا رہی ہے۔ چودھری کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا وہ نیند میں نہ تھا۔ کوئی نشہ نہ کھایا تھا۔ گومتی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہاں اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک عجیب تازگی تھی۔

کئی سال گذر گئے چودھری برابر اسی فکر میں رہتے کہ ہرناتھ سے روپیہ نکال لوں۔ لیکن ہرناتھ ہمیشہ ہی حیلے حوالے کرتا رہتا تھا۔ وہ سال میں تھوڑا سا سود دے دیتا تھا۔ مگر مول کے لیے ہزاروں باتیں بناتا تھا۔ کبھی لہنے کا رونا تھا کبھی چکتے کا۔ ہاں

کاروبار بڑھتا جاتا تھا۔ آخر کار ایک دن چودھری نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ تمھارا کام چلے یا ڈوبے مجھے پرواہ نہیں۔ اس مہینے میں تمھیں ضرور روپے چکانے پڑیں گے۔ ہرناتھ نے بہت اڑن گھائیاں بتائیں چودھری اپنے ارادے پر جمے رہے۔

ہرناتھ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''کہتا ہوں کہ دو مہینے اور ٹھہریئے مال فروخت ہوتے ہی میں روپے دے دوں گا۔ ''

چودھری نے سختی سے کہا۔ ''تمھارا مال کبھی نہ بکے گا اور نہ کبھی تمھارے دو مہینے پورے ہوں گے۔ میں آج روپیہ لوں گا۔ ''

ہرناتھ اسی وقت غصے میں بھرا ہوا اٹھا اور دو ہزار روپیہ لاکر چودھری کے سامنے پٹک دیا۔

چودھری نے کچھ جھینپ کر کہا۔ ''روپے تو تمھارے پاس تھے۔ ''

''تو کیا باتوں سے روزگار ہوتا ہے۔ ''

''تم اس وقت مجھے پانچ سو روپے دے دو۔ باقی دو مہینے میں دے دینا۔ سب آج ہی تو خرچ نہیں ہوجائیں گے۔ ''

ہرناتھ نے تاؤ کھاکر کہا۔ ''آپ چاہے خرچ کیجیے یا جمع کیجیے مجھے ان روپیوں سے کام نہیں۔ دنیا میں کیا مہاجن مر گئے ہیں۔ جو آپ کی دھونس سہوں۔''

چودھری نے روپے اٹھا کر ایک طاق پر رکھ دیے۔ کنویں کی داغ بیل ڈالنے کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

ہرناتھ نے روپے لوٹا تو دیے تھے۔ مگر من میں کچھ اور منصوبہ باندھ رہا تھا۔ آدھی رات کو جب گھر میں سناٹا چھا گیا۔ تو ہرناتھ چودھری کی کوٹھری کی چول کھِسکا کر اندر گھسا۔ چودھری بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ ہرناتھ نے چاہا کہ دونوں تھیلیاں اٹھا کر باہر نکل جاؤں۔ لیکن جوں ہی ہاتھ بڑھایا اسے اپنے سامنے گومتی کھڑی دکھائی دی۔ وہ دونوں تھیلیوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھی۔ ہرناتھ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

پھر یہ سوچ کر کے شاید مجھے دھوکا ہورہاہے۔ اس نے پھر ہاتھ بڑھایا، پر اب کی وہ مورتی اتنی ڈراؤنی ہو گئی کہ ہرناتھ ایک پل بھی وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ بھاگا پر

برآمدے میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ہرناتھ نے چاروں طرف سے روپے وصول کر کے بیوپاریوں کو دینے کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چودھری نے آنکھیں دکھائیں تو وہی روپیہ لاکر پٹک دیا۔ دل میں اسی وقت سوچ لیا تھا کہ رات کو روپے اڑا لاؤں گا۔ جھوٹ موٹ چور کا غل مچاؤں گا تو میری طرح شک بھی نہ ہوگا۔ پر جب یہ پیش بندی ٹھیک نہ اتری تو اس پر بیوپاریوں کے تقاضے ہونے لگے۔ وعدوں پر لوگوں کو کہاں تک ٹالتا جتنے بہانے ہو سکتے تھے۔ سب کیے۔ آخر یہ نوبت آگئی کہ لوگ نالش کرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ ایک نے تو تین سو روپے کی نالش بھی کردی۔ بیچارے چودھری بڑی مشکل میں پھنسے۔

دکان پر ہرناتھ بیٹھتا تھا۔ چودھری کو اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ پر اس کی جو ساکھ تھی۔ وہ چودھری کی وجہ سے تھی۔ لوگ چودھری کو کھرا اور لین دین کا صاف آدمی سمجھتے تھے۔ حالانکہ اب بھی ان سے کوئی تقاضا نہیں کرتا تھا۔ پر وہ سب سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ مگر انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کنویں کے روپے نہ چھوؤں گا۔ چاہے کچھ بھی آپڑے۔

رات کو ایک بیوپاری کے مسلمان چپراسی نے چودھری کے دروازے پر جاکر ہزاروں گالیاں سنائیں چودھری کو بار بار غصہ آیا تھا کہ چل کر اس کی مونچھ اکھاڑ لوں، پر دل کو سمجھایا۔ ہم سے مطلب ہی کیا ہے۔ بیٹے کا قرض ادا کرنا باپ کا فرض نہیں ہے۔

جب کھانا کھانے گئے تو بیوی نے کہا۔ "یہ سب کیا جھگڑا کر رکھا ہے"؟

چودھری نے کمزور لہجے میں کہا۔ "میں نے کر رکھا ہے؟"

"اور کس نے؟ بچہ قسم کھاتا ہے کہ میرے پاس صرف تھوڑا سا مال ہے۔ روپے تو سب تم نے مانگ لیے"

چودھری : مانگ نہ لیتا تو کیا کرتا۔ حلوائی کی دکان پر دادا کا فاتحہ پڑھنا مجھے پسند نہیں ہے۔

استری : یہ ناک کٹائی اچھی لگتی ہے۔

چودھری : تو میرا کیا بس ہے بھائی۔ کبھی کنواں بنے گا کہ نہیں، پانچ سال ہوگئے۔

استری : اس وقت اس نے کچھ نہیں کھایا۔ پہلی جون بھی منہ جھوٹا کر کے اٹھ

گیا تھا۔

چودھری: تم نے سمجھا کر کھلایا نہیں۔ دانہ پانی چھوڑ دینے سے تو روپے نہیں ملیں گے۔

استری: تم کیوں نہیں جا کر سمجھا دیتے۔

چودھری: مجھے تو وہ اس وقت بیری سمجھ رہا ہوگا۔

استری: میں روپیہ لے جاکر بچہ کو دے آتی ہوں۔ ہاتھ میں جب روپے آجائیں تو کنواں بنوا دینا۔

چودھری: نہیں، نہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ میں اتنا بڑا دھوکا نہ کرسکوں گا چاہے گھر مٹی میں مل جائے۔

لیکن استری نے ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا وہ لپک کر اندر گئی اور تھیلیوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی کہ ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا سارا جسم ستار کی طرح کانپنے لگا۔

چودھری نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا، تمھیں چکر تو نہیں آرہا۔"

عورت نے طاق کی طر ف خوف زدہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ وہ ...... وہ چڑیل وہاں کھڑی ہے۔

چودھری نے طاق کی طرف دیکھ کر کہا۔ کون چڑیل؟ مجھے تو وہاں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

استری: میرا تو کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس بڑھیا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔

چودھری: یہ سب وہم ہے۔ بڑھیا کو مرے ہوئے پانچ سال ہوگئے۔ کیا اب تک وہ یہاں بیٹھی ہے۔

استری: میں نے صاف دیکھا وہی تھی بچہ کہتا تھا کہ اس نے رات تھیلیوں پر ہاتھ رکھے دیکھا تھا۔

چودھری: وہ رات کو میری کوٹھری میں کب آیا؟

استری: تم سے کچھ روپیوں کے بارے میں ہی کہنے آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بھاگا۔

چودھری: اچھا پھر تم اندر جاؤ میں دیکھ رہا ہوں۔

استری نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "نا بابا۔ اب میں اس کمرے میں قدم نہ رکھوں گی۔"

چودھری: اچھا میں جاکر دیکھتا ہوں۔

چودھری نے کوٹھری میں جاکر دونوں تھیلیاں طاق پر سے اٹھالیں۔ کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔ گومتی کی چھایا کا کہیں نام تک نہیں تھا۔ استری دروازے پر کھڑی جھانک رہی تھی۔ چودھری نے آکر فخر سے کہا۔

" مجھے تو کہیں کچھ نہ دکھائی دیا۔ وہاں ہوتی تو کہاں چلی جاتی۔"

استری: کیا جانے تمھیں کیوں نہیں دکھائی دی۔ تم پر مہربان تھی، اسی لیے ہٹ گئی ہو گی۔

چودھری: تمھیں وہم تھا اور کچھ نہیں۔

استری: بچہ کو بلا کر پچھوائے دیتی ہوں۔

چودھری: کھڑا تو ہوں جا کر دیکھ کیوں نہیں آتی۔

استری کی کچھ ہمت بندھی۔ اس نے طاق کے پاس جا کر ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا اور زور سے چلا کر بھاگی اور آنگن میں آکر دم لیا۔

چودھری بھی اس کے ساتھ آنگن میں آگیا اور حیرت سے بولا۔ کیا تھا؟ کیا بیکار میں بھاگی چلی آئی۔ مجھے تو کچھ نہ دکھائی دیا۔

استری نے ہانپتے ہوئے کہا۔ چلو ہٹو۔ اب تک تو تم نے میری جان ہی لے لی تھی نہ جانے تمھاری آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے۔ کھڑی تو ہے وہ ڈائین۔

اتنے میں ہرناتھ بھی وہاں آگیا۔ ماتا کو آنگن میں پڑے دیکھ کر بولا۔ "کیا ہے اماں کیسا جی ہے۔"

استری: وہ چڑیل آج دوبارہ دکھائی دی۔ بیٹا میں نے کہا لاؤ تمھیں روپے دے دوں جب ہاتھ میں آجائیں گے تو کنواں بنوا دیا جائے گا۔ لیکن جیوں ہی تھیلیوں پر ہاتھ رکھا۔ اس چڑیل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پران نکل گئے۔

ہرناتھ نے کہا: "کسی اچھے اوجھا کو بلانا چاہیے جو اسے مار بھگائے گا۔

چودھری: کیا رات کو تمھیں بھی دکھائی دی تھی۔

ہرناتھ : ہاں، میں، تمھارے پاس ایک معاملے میں صلاح کرنے آیا تھا۔ جیوں ہی اندر
قدم رکھا۔ وہ چڑیل طاق کے پاس کھڑی دکھائی دی، میں بدحواس ہو کر بھاگا۔

چودھری : اچھا پھر تو جاؤ۔

استری : کون؟ اب تو میں نہ جانے دوں چاہے کوئی لاکھ روپیہ ہی کیوں نہ دے۔

ہرناتھ : میں آپ نہ جاؤں گا۔

چودھری : مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات کیا ہے؟

ہرناتھ : کیا جانے آپ سے ڈرتی ہوگی۔ آج کسی اوجھا کو بلانا چاہیے۔

چودھری : کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا ماجرا ہے۔ کیا ہوا بیجو پانڈے کی ڈگری کا؟

ہرناتھ ان دنوں چودھری سے اتنا جلتا تھا کہ اپنی دکان کے بارے میں کوئی بات بھی ان سے نہ کہتا۔ آنگن کی طرف تاکتا ہوا جیسے ہوا سے بولا۔ ''جو ہونا ہوگا وہ ہوگا۔ میری جان کے سوا اور کوئی کیا لے لے گا۔ جو کھا گیا ہوں وہ تو اگل نہیں سکتا۔

چودھری : کہیں اس نے ڈگری جاری کرادی تو۔

ہرناتھ : تو کیا دکان میں چار پانچ سو کا مال ہے وہ نیلام ہو جائے گا۔

چودھری : کاروبار تو سب چوپٹ ہوجائے گا۔

ہرناتھ : اب کاروبار کے نام کو کہاں تک روتا رہوں۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ
کنواں بنوانے کی اتنی جلدی ہے تو یہ کام چھیڑتا ہی کیوں۔ روٹی دال تو پہلے
بھی مل جاتی تھی۔ بہت ہوگا دو چار مہینے حوالات میں رہنا پڑے گا۔ اس کے
علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

ماتا نے کہا : جو تمھیں حوالات میں لے جائے اس کا منھ جھلس دوں۔ ہمارے جتے
جی تم حوالات میں جاؤگے۔

ہرناتھ نے فلاسفر بن کر کہا۔ ''ماں باپ جنم کے ساتھی ہوتے ہیں۔ کسی کے کرم کے ساتھی نہیں ہوتے۔''

چودھری کو بیٹے سے بڑی محبت تھی۔ مگر انھیں شک تھا کہ ہرناتھ روپے ہضم کرنے کے لیے ٹال مٹول کر رہا ہے۔ اسی لیے انھوں نے تقاضا کر کے روپے وصول کر لیے تھے۔ اب انھیں احساس ہوا کہ ہرناتھ کی جان سچ مچ مصیبت میں ہے۔ سوچا

اگر لڑکے کو حوالات ہوگئی یا دکان پر قرقی آگئی تو خاندان کی عزت دھول میں مل جائے گی۔ کیا ہرج ہے۔ اگر گومتی کے روپے دے دوں۔ آخر دکان چلتی ہی ہے۔ کبھی نہ کبھی تو روپے ہاتھ میں آہی جائیں گے۔

یکایک کسی نے باہر سے پکارا۔ ''ہرناتھ سنگھ''

ہرناتھ سنگھ کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

چودھری نے پوچھا ''کون ہے؟''

''قرقی کرنے والا امین۔''

''کیا دکان قرق کرنے آیا ہے۔''

''ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔''

''کتنے روپے کی ڈگری ہے؟''

''بارہ سو روپے کی''

''قرقی کرنے والا امین کچھ لے دے کے نہ ٹلے گا۔''

''ٹل تو جاتا پر مہاجن بھی تو اس کے ساتھ ہوگا۔ اسے جو کچھ لینا ہے ادھر سے لے چکا ہوگا۔''

''نہ ہو۔ بارہ سو روپے گومتی کے روپیوں میں سے دے دو۔''

''اس کے روپے کوں چھوئے گا۔ نہ جانے گھر پر کیا آفت آئے۔''

''اس کے روپے کوئی ہضم تھوڑے ہی کیے لیتا ہے چلو میں دے دوں۔''

چودھری کو اس وقت ڈر ہوا کہیں وہ مجھے بھی دکھائی نہ دے لیکن ان کا شک بے بنیاد تھا۔ انھوں نے ایک تھیلی سے بارہ سو روپے نکالے اور دوسری تھیلی میں رکھ کر ہرناتھ کو دے دیے۔ شام تک ان دو ہزار روپیوں میں سے ایک روپیہ بھی نہ بچا۔

بارہ سال گزر گئے۔ نہ چودھری اب اس دنیا میں ہے۔ اور نہ ہرناتھ۔ چودھری جب تک زندہ رہے انھیں کنواں بنوانے کی فکر بنی رہی۔ یہاں تک کہ مرتے دم بھی ان کی زبان پر کنویں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ لیکن دکان میں ہمیشہ روپیوں کی کمی رہی۔ چودھری کے مرتے ہی سارا کاروبار چوپٹ ہوگیا۔ ہرناتھ نے ایک آنہ روپے کے منافع سے مطمئن نہ ہو کر دگنے تگنے منافع پر ہاتھ مارا جوا کھیلنا شروع کیا۔ سال بھر بھی

گزرنے نہ پایا تھا کہ دکان بند ہو گئی۔ گہنے پاتے برتن بھانڈ سے سب مٹی میں مل گئے۔

چودھری کی موت کے ٹھیک سال بھر بعد ہرناتھ نے بھی اس نفع نقصان کی دنیا سے کوچ کیا۔ ماتا کی زندگی کا اب کوئی سہارا نہ رہا۔ بیمار پڑی پر دوا دارو نہ ہو سکی۔ تین چار مہینے تک طرح طرح کے دکھ جھیل کر وہ بھی چل بسی۔ اب صرف بہو تھی اور وہ بھی حاملہ۔ اس بیچاری کے لیے اب کوئی سہارا نہیں تھا۔ ایسی حالت میں مزدوری بھی نہ کر سکتی تھی۔ پڑوسیوں کے کپڑے سی کر اس نے کسی طرح پانچ چھے مہینے کاٹے۔ تیرے لڑکا ہوگا۔ ساری علامات لڑکے کی تھیں۔ یہی ایک زندگی کا سہارا تھا۔ جب لڑکی ہوئی تو وہ سہارا بھی جاتا رہا۔

ماں نے اپنا دل اتنا سخت کر لیا کہ نومولود بچے کو چھاتی بھی نہ لگاتی تھی۔ پڑوسیوں کے بہت سمجھانے بجھانے پر چھاتی سے لگایا۔ پر اس کی چھاتی میں دودھ کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ اس وقت بدنصیب ماں کے دل میں رحم اور ممتا کا ایک زلزلہ سا آگیا۔ اگر کسی طریقے سے اس کے [illegible] کی آخر بوند دودھ بن جاتی تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی۔

بچی کی یہ بھولی، معصوم قابل رحم اور پیاری صورت دیکھ کر ماں کا دل جیسے ہزاروں آنکھوں سے رونے لگا۔ اس کے دل کی ساری نیک خواہشات، ساری آشیرواد، ساری محبت جیسے اس کی آنکھوں سے نکل کر اس بچی کو اس طرح شرابور کردیتے تھے جیسے چاند کی ٹھنڈی روشنی پھولوں کو نہلا دیتی ہے۔ پر اس بچی کی قسمت میں ماں کی محبت کے سکھ نہیں تھے۔ ماں نے کچھ اپنا خون، کچھ اوپر کا دودھ پلا کر اسے زندہ رکھا مگر اس کی حالت دن بدن پتلی ہوتی جاتی تھی۔

ایک دن لوگوں نے آکر دیکھا تو وہ زمین پر پڑی ہوئی تھی اور بچی اس کی چھاتی سے چپٹی ہوئی اس کے پستان کو چوس رہی تھی۔ دکھ اور غریبی کے مارے ہوئے جسم میں خون کہاں جس سے دودھ بنتا۔

وہی بچی پڑوسیوں کے رحم و کرم سے پل کر ایک دن گھاس کھودتی ہوئی اس مقام پر پہنچی جہاں بڑھیا گومتی کا گھر تھا۔ چھپر کب کے زمین میں مل چکے تھے۔ صرف جہاں تہاں دیواریں کھڑی تھیں۔ لڑکی نے جانے کیا سوچ کر کھرپی سے گڈھا

کھودنا شروع کیا۔ دوپہر سے شام تک وہ گڈھا کھودتی رہی۔ نہ کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی۔ نہ کوئی خوف تھا نہ ڈر۔ اندھیرا ہوگیا پر وہ جیوں کی تیوں بیٹھی گڈھا کھودتی رہی۔ اس وقت کسان لوگ بھول کر بھی ادھر نہیں آتے تھے۔ یہ لڑکی بے خوف بیٹھی زمین سے مٹی نکال رہی تھی۔ جب اندھیرا ہوگیا تو چلی گئی۔

دوسرے دن وہ بڑے سویرے اٹھی اور اتنی گھاس کھودی جتنی وہ کبھی دن بھر میں بھی نہیں کھودتی تھی۔ دوپہر کے بعد وہ اپنی کھانچی اور کھرپی لیے ہوئے پھر اسی جگہ پر پہنچی پر وہ آج اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ دو بچے اور بھی تھے۔ تینوں وہاں شام تک کنواں کھودتے رہے۔ لڑکی گڈھے کے اندر کھودتی تھی اور دونوں بچے مٹی نکال نکال کر پھینکتے تھے۔

تیسرے دن دو اور لڑکے بھی اِس کھیل میں مل گئے۔ شام تک کھیل ہوتا رہا۔ آج گڈھا دو ہاتھ گہرا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیوں میں اس عجیب کھیل نے بے مثال حوصلہ بھر دیا تھا۔

چوتھے دن اور بھی کئی بچے آملے۔ صلاح ہوئی کون اندر جائے۔ کون مٹی اٹھائے۔ گڈھا اب چار ہاتھ گہرا ہو گیا تھا۔ پر ابھی تک بچوں کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ ایک دن رات کو ایک کسان اپنی کھوئی ہوئی بھینس ڈھونڈتا ہوا اس کھنڈر میں آپہنچا۔ اندر مٹی کا اونچا ڈھیر، ایک بڑا سا گڈھا اور ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ دیکھا تو ڈر کر بھاگا۔

اوروں نے بھی آکے دیکھا۔ کئی آدمی تھے۔ کوئی ڈر نہ تھا۔ قریب جاکر دیکھا تو بچی بیٹھی تھی۔

ایک آدمی نے پوچھا۔ "ارے کیا تو نے یہ گڈھا کھودا ہے؟"

بچی نے کہا، "ہاں"

"گڈھا کھود کر کیا کرے گی؟"

"یہاں کنواں بناؤں گی"

"کنواں کیسے بنائے گی۔"

"جیسے اتنا کھودا ہے ویسے ہی اور کھود لوں گی۔ گاؤں کے سب لڑکے کھیلنے آتے ہیں۔"

”معلوم ہوتا ہے تو اپنی جان دے گی اور اپنے ساتھ اور لڑکوں کو بھی مارے گی، خبردار جو کل سے گڈھا کھودا۔“

دوسرے دن اور لڑکے نہ آئے۔ لڑکی بھی دن بھر مزدوری کرتی رہی لیکن شام کے وقت وہاں پھر چراغ جلا اور پھر وہ کھرپی ہاتھ میں لیے ہوئے وہاں بیٹھی دکھائی دی۔ گاؤں والوں نے اسے مارا پیٹا۔ کوٹھری میں بند کیا پر وہ موقع پاتے ہی وہاں جا پہنچی۔

گاؤں کے لوگ عام طور پر عقیدت مند ہوتے ہیں۔ لڑکی کے اس روحانی لگاؤ نے آخر ان میں بھی لگاؤ پیدا کیا۔ کنواں کھدنے لگا۔

ادھر کنواں کھد رہا تھا ادھر وہ بچی مٹی سے اینٹیں بناتی تھی۔ اس کھیل میں سارے گاؤں کے لڑکے شریک ہوتے تھے۔ اجالی راتوں میں جب سب لوگ سو جاتے تھے تب بھی وہ اینٹیں تھاپتی دکھائی دے جاتی۔ نہ جانے اتنی لگن اس میں کہاں سے آگئی تھی۔ سات سال کی یہ لڑکی عقل اور بات چیت میں اپنی تگنی عمر والوں کے کان کاٹتی تھی۔

آخر ایک دن وہ بھی آیا کہ کنواں بن گیا اور اس کی پکی جگت بھی تیار ہوگئی اس دن بچی اسی جگت پر سوئی۔ آج اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ گاتی تھی، چہکتی تھی۔

صبح کے وقت اس جگت پر صرف اس کی لاش ملی۔ اس دن سے لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ وہی بڑھیا گومتی تھی اور اس کنویں کا نام ”پنہاری کا کنواں“ پڑگیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے جون 1928 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرودر 5 میں شامل ہے۔)

سہاگ کا جنازہ

(1)

ممالک متوسط کے ایک پہاڑی گانوں میں ایک چھوٹے سے مکان کی چھت پر ایک نوجوان گویا شام کے سکوت میں محو ہوا سا بیٹھا تھا، سامنے چاند کی مدھم روشنی میں اودی رنگ والی پہاڑیوں کا سلسلہ لا محدودیت کے خواب کی طرح متین، پر اسرار، نغمہ خیز اور دل کش معلوم ہوتا تھا، ان پہاڑوں کے نیچے آب رواں کی ایک رو پہلی لکیر ایسی معلوم ہوتی تھی گویا ان پہاڑوں کا کل نغمہ، کل متانت اور کل اسرار اسی سفید روانی میں خوش رو کیا ہو، نوجوان کی وضع سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی حالت بہت امیرانہ نہیں ہے، ہاں اس کے چہرے پر جلال و ذہانت کے آثار نمایاں تھے، اس کی آنکھوں پر عینک نہ تھی نہ موچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ نہ بال سنوارے ہوئے تھے۔ نہ کلائی پر گھڑی تھی حتیٰ کہ جیب میں فاؤنٹین قلم بھی نہ تھا یا تو وہ اصولوں کا دلدادہ تھا یا تصنع کا دشمن تھا۔

نوجوان خیالات میں غرق اسی پہاڑیوں کے سلسلہ کی طرف خاموشی سے دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً بادل کی گرج سے بھی زیادہ مہیب آواز سنائی دی۔ چشمہ کا نغمہ شیریں اس خوفناک شور میں ڈوب گیا ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس آواز نے پہاڑوں کو بھی ہلا دیا ہے۔ گویا پہاڑوں میں کوئی زبردست لڑائی چھڑ گئی ہے یہ ریل گاڑی تھی جو ندی پر کے پل سے چلی آ رہی تھی۔

ایک نوجوان عورت کمرہ سے نکل کر چھت پر آئی اور بولی آج ابھی سے گاڑی آ گئی اسے بھی آج ہی بیر نکالنا تھا۔

نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، پیاری، میرا جی چاہتا ہے کہ کہیں نہ جاؤں، میں نے طے کرلیا، میں نے تمھاری خاطر سے ہاں کہہ دیا تھا مگر اب جانے کو دل نہیں چاہتا، تین سال کیسے گزریں گے؟ عورت نے پر درد لہجے میں کہا۔ تین سال کی جدائی کے بعد پھر تو تمام عمر کوئی خلل واقع نہ ہوگا! ایک مرتبہ جو ارادہ کرلیا ہے اسے

پورا ہی کر ڈالو۔ بے انتہا خوشی کی اُمید میں ساری مصیبتیں جھیل لوں گی۔

یہ کہتی ہوئی حسینہ ناشتہ لانے کے حیلہ سے پھر اندر چلی گئی، آنسوؤں کا ابال اس کے قابو سے باہر ہوگیا، ان دونوں کی ازدواجی زندگی کی یہ پہلی سال گرہ تھی، نوجوان بمبئی کالج سے ایم اے کی ڈگری لے کر ناگپور کے ایک کالج میں پروفیسر ہوگیا تھا، عصر جدید کے نئے ازدواجی زندگی اور معاشرتی انقلاب نے ذرا بھی ڈانوا ڈول نہ کیا تھا۔ قدیم رواجوں سے ایسی زبردست محبت شاید بڈھوں کو بھی کم ہوگی، پروفیسر ہو جانے پر اس کے والدین نے اس حسینہ سے اس کی شادی کر دی تھی، رواج کے مطابق ہی اس آنکھ مچولی کے کھیل میں انھیں محبت کا انمول رتن مل گیا، کیشو چھٹیوں میں یہاں پہلی گاڑی سے آتا اور آخری گاڑی سے جاتا۔ یہ دو چار روز خواب شیریں کی طرح نبٹ جاتے تھے، دونوں بچوں کی طرح رورو کر جدا ہوتے، اس بالا خانہ پر کھڑی ہو کر وہ اس کو دیکھا کرتی جب تک بیدرد پہاڑیاں اسے آڑ میں نہ کرلیتیں، مگر ابھی سال بھی نہ پورا ہو نے پایا تھا کہ مفارقت نے اپنی سازشیں شروع کر دیں، کیشو کو پردیس میں جاکر اپنی تعلیم پوری کر نے کے لیے ایک وظیفہ مل گیا، دوستوں نے مبارکباد دی، کس کے ایسے نصیب ہیں جسے بلا طلب اپنی ترقیوں کا ایسا نادر موقع ہاتھ لگے۔ کیشو بہت خوش نہ تھا، وہ اسی حیض بیض میں پڑا اپنے مکان آیا والدین اور دیگر رشتہ داروں نے اس سیاحت کی زبردست مخالفت کی۔ شہر میں جتنی مبارکبادیاں ملی تھیں، یہاں اس سے کہیں زیادہ رکاوٹیں پیش آئیں لیکن سُبھدار کے بڑے بڑے منصوبوں کی حد نہ تھی، وہ شاید کیشو کو اندر آسن پر بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے سامنے اس وقت بھی وہی شوہر کی اطاعت کا معیار ہوتا تھا، وہ اس وقت بھی اس کے سر میں تیل ڈالے گی، اس کی دھوتی دھوئے گی، اس کے پیر دبائے گی، اور اس کو پنکھے جھلے گی، عقیدت مند کی بلند ترین تمناؤں کا تعلق اس کی عقیدت کی چیز ہی سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے سونے کا مندر بنائے گا، اس کے سنگھاسن کو جواہرات سے سجائے گا۔ بہشت سے پھول لاکر اسی کی نذر کرے گا۔ مگر وہ خود ویسا ہی عقیدت شعار رہے گا جٹاؤں کے بجائے مکٹ کی یا لنگوٹی کے بجائے پیتامبر کی ہوس اسے کبھی نہیں ستاتی۔ سُبھدرا نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک کیشو سے ولایت جانے کا وعدہ نہ کرا لیا،

والدین نے اسے کلنکی اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ مگر بالآخر وہ بھی راضی ہوگئے۔ سب تیاریاں ہوگئیں اسٹیشن قریب ہی تھا، وہاں گاڑی دیر تک کھڑی رہتی ہے، اسٹیشن کے قریبی گاؤں کے باشندوں کے لیے گاڑی کی آمد، دشمن چڑھائی نہیں، بلکہ دوست کی آمد ہے۔ گاڑی آگئی، سُبھدرا ناشتہ تیار کر کے شوہر کو ہاتھ دھلانے آئی تھی، اس وقت کیشو کے محبت بھرے اعتراض نے اسے ایک لمحہ کے لیے متزلزل کر دیا۔ ہائے کون جانتا ہے کہ تین سال میں کیا ہو جاوے، دل میں ایک جوش پیدا ہوا، کہہ دوں ''پیارے نہ جاؤ تھوڑا ہی کھائیں گے۔ موٹا ہی پہنیں گے رو رو کر دن تو نہ کٹیں گے۔'' کبھی کیشو کے آنے میں ایک آدھ مہینہ لگ جاتا تھا تو وہ بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں، پھر یہ کمبخت تین سال کیسے گزریں گے لیکن اس نے نہایت سختی سے ان مایوسی بھرے خیالات کو ٹھکرا دیا اور کانپتے ہوئے لہجہ میں بولی۔ جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے، جب تین سال کی مدت کا اندازہ کرتی ہوں تو ایک کلپ سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب ولایت میں تمھاری عزت و شہرت کا خیال کرتی ہوں تو یہ تین سال تین دن کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ تم تو جہاز پر پہنچتے ہی مجھے بھول جاؤ گے۔ نئے نئے منظر تمھاری دلکشی کے لیے آ موجود ہوں گے۔ یوروپ جاکر عالموں کی صحبت میں تمھیں گھر کی یاد بھی نہ آئے گی۔ مجھے تو رونے کے سوا اور کوئی دھندا نہیں ہے۔ یہی محبت کی یادداشتیں میری زندگی کا سہارا ہوں گی۔ لیکن کیا کروں، زندگی کو آرام سے بسر کرنے کی خواہشیں تو ضبط نہیں ہوتیں۔ پھر جس جدائی کا انجام زندگی کے سارے لوازمات کو اپنے ساتھ لائے گا وہ در اصل تپسّیا (ریاضت) ہے تپسّیا کے بغیر تو ''بردان'' نہیں ملتا۔

کیشو کو بھی اب معلوم ہوا کہ عارضی محبت کے جوش میں اپنی قسمت بنانے کا ایسا نادر موقع ہاتھ سے جانے دینا محض نادانی ہے، کھڑے ہو کر بولے ''تم بہت رونا دھونا نہیں ورنہ میرا جی نہ لگے گا'' سبھدرا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر سینہ سے لگاتے ہوئے ان کے چہرے کی طرف اشک آلود نگاہوں سے دیکھا اور بولی ''خط برابر بھیجتے رہنا'' ضرور بھیجوں گا، ہفتہ وار لکھوں گا۔

سبھدرا نے آنسوؤں میں مسکراتے ہوئے کہا، دیکھنا، ولایتی مِسوں کے جال میں نہ

پھنس جانا۔

کیشو پھر پلنگ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ یہ شک ہے تو لو میں جاؤں گا ہی نہیں۔

سبھدرا نے اس کے گلے میں ہاتھوں کو حمائل کر کے پر اعتماد نگاہوں سے دیکھا اور بولی، میں دل لگی کر رہی تھی، "اگر اندر لوک کی اپسرا بھی آ جاوے تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو۔ برہما جی نے ایسی دوسری ہستی پیدا ہی نہیں کی۔"

درمیان میں کوئی چھٹی مل سکے تو ایک بار چلے آنا۔

"نہیں پیاری، درمیان میں شاید چھٹی نہ ملے گی، مگر جو میں نے سنا کہ تم رو رو کر گھلی جاتی ہو، کھانا پینا ترک کر دیا ہے، تو میں ضرور چلا آؤں گا۔ یہ پھول ذرا بھی کمھلانے نہ پاویں"۔

دونوں گلے مل کر جدا ہوگئے، باہر رشتہ داروں اور دوستوں کا ایک مجمع موجود تھا، کیشو نے بڑوں کے پیر چھوئے، چھوٹوں کو گلے لگایا اور اسٹیشن کی طرف چلا، سب لوگ اسٹیشن پر پہنچنے گئے، ایک لمحہ میں گاڑی مسافروں کو لے کر چل دی۔

ادھر کیشو گاڑی میں بیٹھاہوا پہاڑیوں کی بہار دیکھ رہا تھا، ادھر سبھدرا زمین پر پڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔

(2)

دن گذرنے لگے اسی طرح جیسے بیماری کے دن گزرتے ہیں، دن پہاڑ رات کالی بلا، رات بھر مناتے گزرتی تھی کہ کسی طرح سویرا ہو۔ سویرا ہوتا تو منانے لگتی کہ جلد شام ہو، مائکے گئی کہ وہاں جی بہلے گا۔ دس پانچ روز تک مقام کی تبدیلی کا کچھ اثر ہوا، پھر اس سے بد تر حالت ہوئی، بھاگ کر خسرال چلی آئی، مریض کروٹ بدل کر آرام محسوس کرتا ہے۔

پہلے پانچ چھ ماہ تک تو کیشو کے خطوط پندرھویں روز برابر ملتے رہے ان میں رنج و فراق کا ذکر کم اورنئے نئے مناظر کا تذکرہ زیادہ ہوتا تھا مگر سبھدرا مطمئن تھی خطوط آتے ہیں وہ خوش ہیں خیریت سے ہیں اس کے لیے یہی کافی تھا، اس کے خلاف وہ خط لکھتی تو درد فراق کے ذکر کے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا، کبھی کبھی دل بے چین ہو جاتا تو پچھتاتی کہ ناحق جانے دیا۔ کہیں ایک روز مرجاؤں تو ان کے درشن

بھی نہ ہوں۔

لیکن چھٹے ماہ سے خطوط میں بھی دیر ہونے لگی، کئی مہینوں تک تو مہینہ میں ایک خط آتا رہا، پھر وہ بھی بند ہوگیا، سُھدرا کے چار چھ خط جاتے تو ایک خط آتا وہ بھی بے دلی سے لکھا ہوتا، کثرت کار اور عدیم الفرصتی کے شکووں سے بھرا ہوا ایسا بھی جملہ نہیں جس سے دل کی تسکین ہو جو دل کے ناسور پر پھاہے کا کام دے، ہائے ابتداء سے انتہا تک پیاری لفظ کا نام نہیں، سھدرا بے قرار ہوگئی، اس نے یورپ جانے کا ارادہ کرلیا۔ وہ ساری تکالیف برداشت کرے گی، سر پر جو پڑے گی اسے جھیل لے گی، کیشو کو آنکھوں سے دیکھتی تو رہے گی، وہ اس بات کو ان سے پوشیدہ رکھے گی، ان کے مشکلات میں اضافہ نہ کرے گی، ان سے بولے گی بھی نہیں، صرف انھیں کبھی کبھی آنکھ بھر کر دیکھ لے گی، یہی اس کے سکون دل کے لیے کافی ہوگا، اسے کیا معلوم تھا کہ اب اس کا وہ کیشو اس کا نہیں رہا وہ اب ایک دوسری ہی حسینہ کی محبت کا بھکاری ہے۔

سھدرا کئی دنوں تک اس تجویز پر غور کرتی رہی، اسے کسی طرح کا خوف نہ ہوتا تھا، اخبارات کے پڑھتے رہنے سے اسے بحری مسافت کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے خسر اور خوش دامن کے سامنے اپنے ارادہ کا اظہار کیا، ان لوگوں نے بہت سمجھایا، روکنے کی بہت کوشش کی، مگر اس نے اپنی ضد نہ چھوڑی آخر جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ کسی طرح نہیں مانتی تو اجازت دے دی۔ مائکے والے بھی سمجھا بجھا کر تھک گئے۔ کچھ روپے اس نے خود جمع کر رکھے تھے، کچھ خسرال میں ملے۔ ماں باپ نے بھی مدد کی، راستہ کے خرچ کی فکر نہ رہی، انگلستان پہنچ کر وہ کیا کرے گی۔ اس کے متعلق اس نے ابھی کچھ طے نہ کیا تھا، اتنا جانتی تھی کہ محنت کر نے والوں کو کہیں بھی روٹیوں کی کمی نہیں رہتی۔

رخصت ہوتے وقت ساس اورسسر دونوں اسٹیشن تک آئے جب گاڑی نے سیٹی دی تو سبھدار نے ہاتھ جوڑ کر کہا میری روانگی کا حال وہاں کو نہ لکھئے گا ورنہ انھیں تردد ہوگا اور پڑھنے میں ان کا جی نہ لگے گا۔

خسر نے تشفی کی، گاڑی روانہ ہوگئی۔

(3)

لندن کے اس حصے میں جہاں دولت مندی کے وقت میں بھی افلاس کا دور دورہ ہے، اوپر کے ایک چھوٹے کمرہ میں سمدرا کرسی پر بیٹھی ہے اس کو یہاں آئے آج ایک مہینہ ہوگیا ہے۔ سفر کے قبل اس کے دل میں جتنے وسوسے تھے وہ سبھی دور ہوتے جارہے تھے، بمبئی کے بندرگاہ میں جہاز پر جگہ پانے کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہوگیا، وہی ایک عورت نہ تھی جو یورپ جا رہی تھی بلکہ پانچ چھ عورتیں اور بھی اسی جہاز سے جا رہی تھیں، سمدرا کو نہ جگہ ملنے میں کوئی دقت ہوئی اور نہ راستہ میں، یہاں پہنچ کر ان عورتوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ کوئی کسی کالج میں چلی گئی، دو تین اپنے شوہروں کے پاس چلی گئیں جو یہاں پیشتر سے مقیم تھے، سمدرا نے اسی محلے میں یہ کمرہ لے لیا رزق کا مسئلہ بھی اس کے لیے بہت مشکل نہ رہا جن عورتوں کے ساتھ وہ آئی تھی ان میں سے کئی ذی عہدہ اصحاب کی بیویاں تھیں، کئی اچھے اچھے انگریزی خاندان سے ان کا ربط ضبط تھا، سمدرا کو دو عورتوں کو ہندوستانی گانا اور ہندی زبان سکھلانے کا کام مل گیا، بقیہ وقت میں وہ کئی ہندوستانی خاتون کے کپڑے سینے کا کام کرلیتی ہے۔ کیشو کی قیام گاہ یہاں سے نزدیک ہے، اسی لیے سمدرا نے اس محلّہ کو پسند کیا ہے کل کیشو اسے دکھائی دیا تھا آہ، اس کو "بس" سے اترتے دیکھ کر اس کا دل بے قرار ہوگیا تھا، بس دل میں یہی آتا تھا کہ دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ جائے اور کہے کیوں جی، تم یہاں آتے ہی بدل گئے، یاد ہے کہ تم نے روانگی کے وقت کیا کیا وعدے کیے تھے، اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا، اس وقت سے اب تک اس پر ایک قسم کا نشہ سا طاری ہے، وہ ان کے اتنا قریب ہے، چاہے تو روزانھیں دیکھ سکتی ہے۔ ان کی باتیں سن سکتی ہے، ہاں انھیں چھو تک سکتی ہے۔ اب وہ اس سے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ ان کے خطوط کی اب اس کو کیا پرواہ ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ممکن ہے کہ وہ ان کے ہوٹل کے ملازمین سے جو چاہے گی دریافت کر سکے گی۔

شام ہوگئی تھی، دھوئیں میں برقی لالٹینیں روندھی آنکھوں کی طرح بے نور سی ہورہی تھیں، گلی میں عورت مرد سیر کرنے چلے جا رہے تھے، سمدرا سوچنے لگی، ان لوگوں کو تفریحی مشاغل سے کتنی دلچسپی ہے گویا کسی کو فکر ہی نہیں، سبھی خوشحال ہیں

جبھی یکسوئی سے سارا کام کر سکتے ہیں جس وقت جو کام کرتے ہیں، دل لگا کر کرتے ہیں، کھیلنے کا شوق بھی ہے، ایک ہم ہیں کہ نہ ہنستے نہ روتے ہیں... بت بنے بیٹھے رہتے ہیں، زندہ دلی کا کہیں نام نہیں! کام تو تمام دن کرتے ہیں، مرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی، مگر دراصل وقت کا چوتھائی حصہ بھی کام میں نہیں صَرف کرتے، صرف کام کرنے کا بہانہ کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم بے جان ہوگئی ہے۔

دفعتاً اس نے کیشو کو جاتے دیکھا، ہاں، کیشو ہی تھا! وہ کرسی سے اٹھ کر برآمدے میں آگئی، بڑی خواہش ہوئی کہ جاکر ان کے گلے سے لپٹ جائے اس نے اگر قصور بھی کیا ہے تو انھیں کی وجہ سے تو! اگر وہ برابر خطوط روانہ کرتے جاتے تو وہ یہاں کیوں آتی۔

لیکن کیشو کے ساتھ یہ کمسن عورت کون ہے؟ ارے، کیشو اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے، دونوں مسکر مسکرا کر باتیں کرتے چلے جاتے ہیں، یہ عورت کون ہے؟

سبھدرا نے غور سے دیکھا، عورت سانولے رنگ کی تھی، وہ ہندوستانی تھی اس کی پوشش بھی ہندوستانی تھی اس سے زیادہ سبھدرا کو اورکچھ نہ دکھائی دیا اس نے فوراً جوتے پہنے دروازہ بند کیا اور ایک لمحہ میں گلی میں پہنچ گئی۔ کیشو اب نظر نہ آتا تھا مگر وہ جس طرف گیا تھا اسی طرف وہ نہایت تیزی سے قدم اٹھائے چلی جاتی تھی، یہ عورت کون ہے؟وہ ان دونوں کی باتیں سننا چاہتی تھی، عورت کو دیکھنا بھی چاہتی تھی، اس کے قدم اتنی تیزی سے اٹھ رہے تھے گویا دوڑ رہی ہو، مگر اتنا جلد وہ دونوں غائب ہوگئے شاید دونوں کسی "بس" میں جا بیٹھے۔

اب وہ گلی کو طے کر کے ایک چوڑی سڑک پر آ پہنچی تھی، دونوں طرف بڑی بڑی جگمگاتی ہوئی دوکانیں تھیں جن میں دنیا بھر کی مجسم آسائشیں گھمنڈ سے پھولی بیٹھیں تھی، قدم قدم پر ہوٹل تھے، سبھدرا دونوں طرف غور سے دیکھتی اور قدم قدم پر اشتباہ کے سبب مچلتی ہوئی کتنی دور نکل گئی، اس کی اسے کچھ خبر نہ تھی۔

پھر اس نے سوچا یوں کہاں تک چلی جاؤں گی، کون جانے، کدھر گئے؟ جاکر پھر اپنے بر آمدے سے دیکھوں، آخر ادھر سے گئے ہیں تو ادھر ہی سے لوٹیں گے بھی، یہ خیال آتے ہی وہ پلٹ پڑی اور اسی طرح دوڑتی ہوئی اپنی قیام گاہ کی طرف

چلی، جب وہاں پہنچی تو بارہ بج گئے تھے اور اتنی دیر اسے چلتے ہی گزری ایک لمحہ بھی اس نے کہیں آرام نہ کیا۔

وہ اوپر پہنچی تو مکان مالکہ نے کہا تمھارے لیے بڑی دیر سے کھانا رکھا ہوا ہے۔

سمدرا نے کھانا اپنے کمرے میں منگایا مگر کھانے کا ہوش کسے تھا؟ وہ اسی برآمدے میں اس طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی، جدھر کو کیشو گیا تھا۔

ایک بج گیا، دو بج گئے، پھر بھی کیشو نہیں لوٹا، اس نے دل میں کہا وہ کسی دوسرے راستے سے چلے گئے، میرا یہاں کھڑا رہنا بیکار ہے، چلوں اب سو رہوں، مگر پھر خیال آ گیا کہ کہیں چلے نہ آرہے ہوں۔

معلوم نہیں، اسے کب نیند آ گئی۔

(4)

دوسرے روز بھی علی الصباح سمدرا اپنے کام پر جانے کو تیار ہو رہی تھی کہ نو جوان عورت ریشمی ساری پہنے آ کر کھڑی ہوگئی اور مسکرا کر بولی۔ معاف کیجیے گا میں نے بڑے سویرے آپ کو تکلیف دی، آپ تو کہیں جانے کو تیار معلوم ہوتی ہیں۔

سمدرا نے ایک کرسی بڑھاتے ہوئے کہا 'ہاں' ایک کام سے باہر جا رہی تھی، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔

یہ کہہ کر سمدرا نے اس نوخیز کو سر سے پیر تک اس نقادانہ نظر سے دیکھا جس سے صرف عورتیں دیکھ سکتی ہیں، حسن کے کسی اصول سے بھی اسے خوبصورت نہ کہا جا سکتا تھا اس کا رنگ سانولا، منہ کسی قدر چوڑا، ناک کچھ چپٹی، قد بھی چھوٹا، اور بدن بھی کسی قدر موٹا تھا، آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی، مگر ان کل وجوہ کے ہوتے ہوئے بھی اس میں کچھ ایسی بات تھی جو آنکھوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے تھی، اس کی آواز اتنی شیریں، اور اتنی باقاعدہ اور اتنی عاجزانہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی دیوی کی دعا ہو اس کے ہر عضو سے جلال نمایاں تھا، سمدرا اس کے مقابلہ میں سُبک اور ہیچ معلوم ہوتی تھی۔

عورت نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، اگر میں بھولتی ہوں تو مجھے معاف فرمائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کچھ کپڑے بھی سینی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں

سینے کی مشین موجود ہے۔
سھدرا : میں دو خاتونوں کو زبان کی تعلیم دینے جایا کرتی ہوں، بقیہ وقت میں کچھ سلائی بھی کرلیتی ہوں، آپ کپڑے لائی ہیں؟
عورت : ”نہیں، ابھی کپڑے نہیں لائی، یہ کہہ کر اس نے حیا سے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا، بات یہ ہے کہ میری شادی ہونے جارہی ہے۔ میں اپنی پوشاک بالکل ہندوستانی رکھنا چاہتی ہوں، شادی بھی ویدوں کے مطابق ہوگی۔ ایسے کپڑے یہاں آپ ہی تیار کر سکتی ہیں۔

سھدرا نے ہنس کر کہا، میں ایسے موقع پر آپ کے کپڑے تیار کرکے اپنے کو دھنیہ سمجھوں گی، وہ مبارک ساعت کب ہے۔

عورت نے شرماتے ہوئے کہا وہ تو کہتے ہیں کہ اسی ہفتہ میں ہو جاوے مگر میں انھیں ٹالتی جاتی ہوں میں نے تو چاہا تھا کہ ہندوستان واپس جانے پر شادی ہوتی مگر وہ اس قدر بے صبر ہو رہے ہیں کہ کچھ کہتے نہیں بنتا۔ ابھی تو میں نے یہی کہہ کر ٹالا ہے کہ میرے کپڑے سل رہے ہیں۔

سھدرا۔ تو میں آپ کے جوڑے بہت جلدی دے دوں گی۔

عورت نے ہنس کر کہا میں تو چاہتی تھی کہ آپ مہینوں لگا دیتیں۔

سھدرا : واہ میں اس نیک کام میں کیوں خلل ڈالنے لگی،

اسی ہفتہ میں آپ کے کپڑے دے دوں گی اور ان سے اس کا انعام لوں گی۔

عورت کھلکھلا کر ہنس پڑی، کمرے میں نور کی لہر دوڑ گئیں، بولی اس کے لیے تو انعام وہ دیں گے۔ بڑی خوشی سے دیں گے اور تمھارے ممنون ہوں گے۔ میں نے تو عہد کیا تھا کہ بیاہ کی بندشوں میں پڑوں گی ہی نہیں مگر انھوں نے میری عہد شکنی کرا دی، اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ محبت کی بیڑیاں کتنی مسرت افزاہوتی ہیں، تم تو ابھی حال ہی میں یہاں آئی ہو، تمھارے شوہر بھی ساتھ ہوں گے۔

سھدرا نے حیلہ کیا، بولی، وہ اس وقت جرمنی میں ہیں، موسیقی سے انھیں بہت رغبت ہے اسی فن کے ماہر بننے کی غرض سے وہ وہاں گئے ہیں۔ تم بھی کچھ گانا جانتی ہو؟

''بہت تھوڑا،'' کیشو کو گانے سے بڑی رغبت ہے۔

کیشو کا نام سن کر سھدرا کو ایسا معلوم ہوا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو وہ چونک پڑی۔

عورت نے پوچھا، آپ چونک کیوں پڑیں کیا کیشو کو جانتی ہو؟

سھدرا نے بات بنا کر کہا، نہیں، میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا، وہ یہاں کیا کرتے ہیں؟

سھدرا کو خیال آیا کہ کیا کیشو کسی دوسرے شخص کا نام نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اس نے یہ سوال کیا، جواب پر اس کی زندگی کا فیصلہ تھا۔

عورت نے جواب دیا وہ یہاں کالج میں پڑھتے ہیں، ہند کی سرکار نے انھیں بھیجاہے۔ ابھی سال بھی آئے نہیں ہوا۔ تم دیکھ کر خوش ہوگی، شوکت و ذہانت کا مجسمہ سمجھ لو۔ یہاں کے بڑے بڑے پروفیسر ان کی عزت کرتے ہیں۔ ایسی عمدہ تقریر تومیں نے کسی اور کی زبان سے سنی ہی نہیں، ان کی زندگی معیارانہ ہے۔ مجھ سے انھیں کیوں محبت ہوگئی، مجھے خود اس پر حیرت ہے، مجھ میں نہ حسن ہے نہ ملاحت، یہ محض میری خوش قسمتی ہے۔ تومیں شام کو کپڑے لے کر آؤں گی؟

سھدرا نے دل میں اٹھتے ہوئے جوش کو روک کر کہا، اچھی بات ہے جب وہ چلی گئی تو سھدرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، ایسا معلوم ہو تا تھا گویا بدن میں خون نہیں ہے گیا جان نکل گئی ہے، وہ کتنی بیکس، کتنی کمزور ہے، اس کا احساس اس کو آج ہوا، ایسا معلوم ہوا گویا دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ اب اس کا جینا بے فائدہ ہے اس کے لیے اب زندگی میں رونے کے سوا اور کیا ہے۔ اس کے سارے حواس باطل سے ہوگئے تھے گویا وہ کسی بلند درخت سے گر پڑی ہو، ہائے یہ اس کی محبت و عقیدت کاصلہ ہے اس نے کتنا اصرار کر کے کیشو کو یہاں بھیجا تھا۔ اسی لیے کہ یہاں آتے ہی وہ اس کا ستیا ناس کردیں۔

پرانی باتیں یاد آنے لگیں، کیشو کی وہ محبت بھری آنکھیں سامنے آگئیں، وہ معصوم اور متبسم صورت آنکھوں کے سامنے آ گئی، اس کا ذرا سر بھی درد کرنے لگتا تو کتنا بے قرار ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب اسے فصلی بخار آگیا تھا تو کیشو کتنا گھبرا کر

پندرہ روز کی چھٹی لے کر گھر پہنچ گیا تھا اور اس کے سرہانے بیٹھا ہوا رات رات بھر پنکھا جھلتا رہتا تھا وہی کیشو اب اس سے اتنی جلدی اکتا گیا! اس کے لیے سبھدرا نے کون سی بات اٹھا رکھی؟ وہ تو اس کو اپنی زندگی کا سہارا، اپنی روح کا سرمایہ، اپنا سب کچھ سمجھتی تھی نہیں، کیشو کا قصور نہیں، سارا قصور اسی کا ہے اسی نے اپنی میٹھی باتوں سے اس کے دل کو مسخر کرلیا تھا۔ اس کی علمیت ذہانت اور قادرالکلامی ہی نے ان کے دل پر فتح حاصل کی ہے، ہائے اس نے کتنی بار کیشو سے کہا تھا مجھے بھی پڑھایا کرو مگر انھوں نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ تم جیسی ہو مجھے ویسی ہی پسند ہو۔ میں تمھیں پڑھا کر تمھاری قدرتی سادگی کو نہیں مٹانا چاہتا۔ کیشو نے اس کے ساتھ کتنی بڑے بے انصافی کی ہے، مگر یہ ان کی خطا نہیں، اس مست شباب چھوکری کا کرتوت ہے۔

سبھدرا کو اس رنج و حسد کے غلبہ میں اپنے کام پر جانے کا خیال نہ رہا وہ کمرے میں اس طرح ٹہلنے لگی گویا کسی نے اس کو وہاں جبراً بند کر دیا ہو۔ کبھی دو مٹھیاں بندھ جاتیں۔ کبھی دانت پیسنے لگتی اور کبھی ہونٹ چباتی، جنون کی سی حالت ہوگئی، جیوں جیوں کیشو کے اس بیدردانہ سلوک کا خیال کرتی، ان کی تکالیف کو یاد کرتی جو اس نے اس کے لیے جھیلی تھیں، اس کا دل انتقام لینے کے لیے بے چین... ہوتا جاتا تھا، اگر کوئی بات ہوئی ہوتی، کسی باہمی کدورت کا شائبہ ہوتا تو اسے رنج نہ ہوتا، یہ تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی ہنستے ہنستے یکایک گلے پر چڑھ بیٹھے، اگر وہ ان کے قابل نہ تھی تو انھوں نے اس سے شادی ہی کیوں کی تھی؟ شادی کے بعد بھی اس کو کیوں نہ ٹھکرا دیا؟ کیوں محبت کا بیج بویا تھا، اور آج جب وہ بیج پودے کی شکل میں لہرانے لگا، اس کی جڑیں اس کے دل کی رگ و ریشہ میں سرایت کر گئیں، اس کا کل خون اس کا تمامی ایثار اسے سینچنے اور اس کی حفاظت کرنے میں لگا دیا گیا، تو وہ آج اس کو اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہیں؟ کیا بلا اس کے دل کے ٹکرے ٹکرے ہوئے وہ پودا اکھڑ جاوے گا؟

دفعتاً اسے ایک بات یاد آگئی تشدد آمیز ضبط سے اس کا چہرہ اور بھی روکھا ہوگیا۔ کیشو نے اپنی شادی کی بات اس عورت سے پوشیدہ رکھی ہوگی۔ سبھدرا اس واقعہ کو طشت ازبام کر کے کیشو کے سارے منصوبے خاک میں ملادے گی۔ اسے اپنے

پر غصہ آیا کہ عورت کا پتہ کیوں نہ دریافت کرلیا، اسے ایک خط لکھ کر کیشو کی کم ظرفی، خود غرضی اور بزدلی کا پردہ فاش کر دیتی اس کی علمیت، ذہانت اور شہرت کو خاک میں ملا دیتی، خیر شام کے وقت تو وہ کپڑے لے کر آوے گی ہی اس وقت اس سے سارا کچا چٹھا بیان کر دوں گی۔

(5)

سھدرا تمام دن اس عورت کا انتظار کرتی رہی، کبھی برآمدے میں جاکر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی، کبھی سڑک پر دیکھتی، مگراس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دل میں جھنجھلاتی تھی کہ اس نے کیوں نہ اسی وقت سارااماجرا کہہ سنایا۔

کیشو کا پتہ اسے معلوم تھا، اس مکان اور گلی کا نمبر تک یاد تھا۔ جہاں سے وہ اس کو خط لکھا کرتا تھا، جیوں جیوں دن ڈھلنے لگا اور اس عورت کے آنے میں دیر ہونے لگی، اس کے دل میں ایک لہر سی اٹھنے لگی کہ جاکر کیشو کو لعنت ملامت کرے، اس کا سارا نشہ اتار دے، کہے "تم اتنے خوفناک ظالم ہو، اتنے بڑے مکار ہو، یہ مجھے معلوم نہ تھا، تم یہاں پڑھنے کے لیے آئے تھے، تمھاری ساری علمیت کا یہی نتیجہ ہے، تم ایک عورت کو جس نے تم پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اس طرح دھوکا دے سکتے ہو، تم میں کیا انسانیت نام کو بھی نہیں رہ گئی؟ آخر تم نے میرے لیے کیا سوچا ہے؟میں عمر بھر تمھارے نام کو روتی رہوں؟" لیکن خودداری کا خیال ہر مرتبہ اسے روک لیتا، نہیں جس نے اس کے ساتھ ایسا فریب کیا ہے اس کی اتنی بے عزتی کی ہے، اس کے پاس وہ نہ جاوے گی، وہ اسے دیکھ کر اپنے آنسوؤں کو روک سکے گی یا نہیں، اس میں اسے شبہ تھا اورکیشو کے سامنے وہ رونا نہ چاہتی تھی، اگروہ اس سے نفرت کرتا ہے تو وہ بھی اس سے نفرت کرے گی۔ شام بھی ہوگئی مگر وہ عورت نہ آئی بتیاں بھی جل گئیں مگر اس کا پتہ نہ تھا۔

یکایک اسے اپنے کمرہ کے دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی وہ کود کر باہر نکل آئی، نوجوان عورت کپڑوں کا ایک بنڈل لیے سامنے کھڑی تھی، سھدرا کو دیکھتے ہی بولی، معاف فرمایئے گا مجھے آنے میں دیر ہوگئی بات یہ ہے کہ کیشو کسی بڑے ضروری کام سے جرمنی جانا ہے۔ وہاں انھیں ایک ماہ سے زیادہ لگ جائے گا۔ وہ

چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ جاؤں، مجھ سے انھیں اپنا مضمون لکھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ برلن کے کتب خانے چھاننے پڑیں گے۔ میں نے بھی اسے منظور کر لیا، کیشو کی خواہش ہے کہ جرمنی جانے کے قبل ہمارا بیاہ ہو جاوے۔ کل شام کے وقت سنسکار ہو جائے گا۔ اب یہ کپڑے مجھے جرمنی سے لوٹ آنے پر دیجیے گا۔ شادی کے موقعہ پر ہم معمولی کپڑے پہن لیں گے اور کیا کرتی؟ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کیشو کا جرمنی جانالازمی امر ہے۔

سبھدرا نے کپڑوں کو میز پر رکھ کر کہا، آپ کو دھوکا دیا گیا ہے۔

عورت نے گھبرا کر پوچھا، دھوکا! کیسا دھوکا؟ میں بالکل نہیں سمجھتی تمھارامطلب کیا ہے؟

سبھدرا نے لحاظ کے پردے کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کیشو تمھیں دھوکا دے کر تم سے شادی کر ناچاہتا ہے۔

"کیشو ایسا آدمی نہیں ہے جو کسی کو دھوکا دے، کیا تم کیشو کو جانتی ہو؟"

"کیشو نے تم سے اپنے بارے میں سب کچھ کہہ دیا ہے؟"

"سب کچھ"

"کوئی بات نہیں چھپائی؟"

"میرا تو خیال ہے کہ انھوں نے ایک بات بھی نہیں چھپائی۔

"تمھیں معلوم ہے کہ اس کی شادی ہو چکی ہے؟"

عورت کے چہرے کا رنگ کچھ فق سا ہوگیا، اس کی گردن شرم سے جھک گئی، رکتی ہوئی بولی۔ "ہاں۔ انھوں نے مجھ سے... یہ بات کہی تھی۔"

سبھدرا شکست کھا گئی، نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "یہ جانتے ہوئے بھی تم کیشو سے شادی کرنے پر تیار ہو؟"

عورت نے غرور سے دیکھ کر کہا..........تم نے کیشو کو دیکھا ہے؟

"نہیں میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"پھر تم انھیں کیسے جانتی ہو؟"

میرے ایک دوست نے مجھے یہ بات کہی ہے، وہ کیشو کو جانتا ہے۔

اگر تم ایک بار کیشو کو دیکھ لیتیں، ایک بار ان سے باتیں کر لیتیں، تو مجھ سے یہ سوال نہ کرتیں، ایک نہیں، اگر انھوں نے ایک سو شادیاں کرلی ہوتیں تو بھی میں انکار نہ کرتی، انھیں دیکھ کر پھر میری آنکھ کسی اور کی جانب اٹھتی ہی نہیں، اگر ان سے شادی نہ کروں تو پھر مجھے تمام عمر دوشیزہ ہی رہنا پڑے گا۔ جس وقت وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری روح پھول کی طرح شگفتہ ہوتی جارہی ہے۔ مجھے اس میں روشنی اور شگفتگی کا مجسم احساس ہوتا ہے، دنیا چاہے جتنی ہنسے، چاہے جتنی مذمت کرے میں کیشو کو اب نہیں چھوڑ سکتی، ان کی شادی ہو چکی ہے، یہ سچ ہے مگر اس عورت سے اس کادل کبھی نہیں ملا، در اصل ان کی شادی ابھی نہیں ہوئی۔ وہ کوئی معمولی کم پڑھی لکھی لڑکی ہے تمھیں سوچو کہ کیشو جیسا عالم اور فراخ دل اور طبیعت دار شخص ایسی لڑکی کے ساتھ کیوں کر خوش رہ سکتا ہے، تمھیں کل میری شادی میں شرکت کرنی ہوگی۔ سبھدرا کا چہرہ تمتماتا جا رہا تھا، کیشو نے اس کو اتنے سیاہ رنگ میں رنگا ہے۔ یہ سوچ کر اس کا خون ابل رہا تھا، جی میں آتا تھا کہ اسی وقت اس کو دتکار دوں مگر اس کے دل میں کچھ اور ہی خیالات آنے لگے تھے۔ اس نے متانت مگر بے پروائی کے لہجہ میں پوچھا، کیشو نے کچھ اس عورت کے بارے میں نہیں کہا؟وہ اب کیا کرے گی؟کیسے رہے گی؟

عورت نے فوراً جواب دیا گھر پہنچنے پر وہ اس سے صرف یہی کہہ دیں گے کہ ہم اورتم اب زن و مرد نہیں رہ سکتے۔ اس کی پرورش کا بندوبست اس کی مرضی کے مطابق کر دیا جاوے گا۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتے ہیں؟ہندو شاستروں کے مطابق ازدواجی رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا مگر صرف بیوی کو کلیتاً آزاد کر دینے کے خیال سے وہ عیسائی یا مسلمان ہونے کے لیے بھی تیار ہیں، وہ تو ابھی اس کو اسی مضمون کا ایک خط لکھنے جا رہے تھے مگر میں نے روک دیا، مجھے اس ابھاگن پر بڑا ترس آتا ہے میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ اگراس کی مرضی ہو تو وہ بھی ہمارے ساتھ رہے۔ میں اسے اپنی بڑی بہن سمجھوں گی مگر کیشو اس سے متفق نہیں ہوتے۔

سبھدرا نے طنز سے کہا۔ روٹی کپڑا دینے کو تیار ہی ہیں، عورت کو اس کے سوا اور کیا چاہیے؟

اس عورت نے طنز کی کچھ پرواہ نہ کر کے کہا، تو مجھے واپسی پر کپڑے تیار ملیں گے نہ؟

سھدرا : ہاں، مل جائیں گے۔

عورت : کل تم شام کے وقت آؤ گی؟

سھدرا : نہیں افسوس کہ مجھے فرصت نہیں ملی۔

عورت نے کچھ نہ کہا، وہ چلی گئی۔

(6)

سھدرا کتنا ہی چاہتی تھیں کہ اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرے مگر دل میں گویا آگ سی جل رہی تھی کیشو کے لیے وہ اپنی جان کی قیمت نہ سمجھتی وہی کیشو اسے پیروں سے ٹھکرارہا ہے۔ یہ صدمہ اتنا ناگہانی، اتنا سخت تھاکہ اس کی ساری جسی نزاکت مفلوج ہوگئی اس کا ایک ایک عضو انتقام کے لیے تڑپنے لگا اگر یہی مسئلہ اس کے برعکس ہوتا تو کیا سھدرا کے گلے پر چھری نہ پھر گئی ہوتی۔ کیشواس کے خون کا پیاسا نہ ہوجاتا؟ کیا مرد ہو جانے سے ہی سبھی باتیں قابل عفو اورعورت ہو جانے ہی سے سبھی باتیں نا قابل عفو ہو جاتی ہیں؟ نہیں اس فیصلہ کو سھدرا کا باغی کا دل اس وقت قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اور عورتوں کے بلند معیار کی پرواہ نہیں ہے، ان عورتوں میں خودداری کا مادہ نہ ہوگا وہ مردوں کی پیروں کی جوتیاں بن کر رہنے ہی میں اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں گی۔ سھدرا خودداری کے جذبہ سے اس قدر بے بہرہ نہیں، وہ اپنے جیتے جی یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اس کا شوہر اس کی زندگی کو تباہ و برباد کر کے چین کی بانسری بجائے دنیا اسے ہتیارن اور ڈائن کہے گی تو کہے، اسے پرواہ نہیں۔ رہ رہ کر اس کے دل میں خوفناک تحریک ہوتی تھی کہ اس وقت اس کے پاس چلی جاوے...
اور اس کے قبل کہ وہ اس نوجوان عورت کی محبت سے لطف اندوز ہو، اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے، وہ کیشو کی بیدردی کو یاد کرکے اپنے دل کو متحرک کرتی تھی، کیا وہ اتنی کمزور ہے؟ کیا اس میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے اگر اسی وقت کوئی بدمعاش اس کے گھر میں گھس آوے تو کیا یہ اس کا مقابلہ نہ کرے گی؟ آخر اپنی حفاظت ہی کے لیے ہی تو اس نے یہ پستول لے رکھی ہے کیشو نے اس کی آبروریزی ہی کی ہے اس کا

اظہار محبت صرف فریب تھا، وہ صرف اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لیے اس کے ساتھ محبت کا سوانگ بھرتا تھا۔ پھر اسے ہلاک کر ڈالنا کیا اس کا فرض نہیں؟...

اس آخری خیال سے سھدرا کو وہ تحریک ملی جو اس کے خوفناک ارادہ کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھی یہی وہ حالت ہے جب عورت مرد کے خون کی پیاسی ہو جاتی ہے۔

اس نے کھونٹی سے لٹکی ہوئی پستول کو اتار لیا اور غور سے دیکھنے لگی، گویا اسے کبھی دیکھا نہ تھا، کل شام کے وقت جب آریہ سماج کے مندر میں کیشو اور اس کی معشوقہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے اسی وقت وہ اس کی گولی سے کیشو کے عشقیہ تماشوں کا خاتمہ کر دے گی، پھر دوسری گولی اپنی چھاتی میں مار لے گی۔ کیا وہ اپنی نفرت خیز زندگی کو رو رو کر گزارے گی۔

(7)

شام کا وقت تھا، آریہ سماج کے مندر کے صحن میں دلہا، دلہن اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، بیاہ کی رسم ادا ہو رہی تھی، اسی وقت سھدرا پہنچی اور برآمدے جاکر ایک ستون کی آڑ میں اس طرح کھڑی ہوگئی کہ کیشو کا منہ اس کے سامنے تھا اس کی آنکھوں میں وہ منظر کھنچ گیا جب آج سے تین سو سال قبل اس نے اس طرح کیشو کو منڈپ میں بیٹھے ہوئے پردہ سے دیکھا تھا اس وقت اس کا دل کتنا پر شوق ہو رہا تھا، دل میں گدی گدی سی ہو رہی تھی، کتنی زبردست محبت تھی، کتنی بے حد تمنائیں تھیں، گویا زندگی کی صبح کا جلوہ ہو رہا ہے زندگی نغمہ شیریں کی طرح مست خیز تھی، مستقبل خواب افق کی طرح دلکش، کیا یہ وہی کیشو ہے؟ سھدرا کو ایسا وہم ہوا گویا یہ کیشو نہیں ہے، ہاں یہ وہ کیشو نہیں تھا، یہ اسی کی شکل اور اسی نام کا کوئی دوسرا شخص تھا۔ اب اس کی مسکراہٹ میں، اس کی آنکھوں میں، اس کے کلام میں، اس کے دل کو کھینچنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اسی طرح ساکت کھڑی ہے گویاکوئی ناآشنا شخص ہو، اب تک کیشو کا سا خوبصورت، بارونق، خوش خلق، اور بامروت شخص دنیامیں نہ تھا۔ مگر اب سھدراکو ایسا معلوم ہوا کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں اور کیشو میں کوئی فرق نہیں ہے وہ ناد حسد جس میں وہ جلی جا رہی تھی وہ

خیالی انتقام جو اسے یہاں تک لایا تھا، گویا ایک دم نابود ہو گیا ترک تشدد سے بھی زیادہ ضرر رساں ہوتا ہے۔ سبھدرا کے انتقامی ارادہ میں ایک طرح کا انس تھا، اس کا کیشو، اس کے دل و جان کا مالک اور کسی کا نہیں ہو سکتا، مگر اب وہ انس نہیں ہے، کیشو اس کا نہیں۔ اب پرواہ نہیں کہ اس پر کس کا قبضہ ہوتا ہے۔

شادی کی رسم ادا ہوگئی دوستوں نے مبارکباد دی، سہیلیوں نے تہنیت کے گانے گائے، پھر لوگ میزوں پر جا بیٹھے، دعوت ہوئی رات کے بارہ بج گئے مگر سبھدرا وہیں بت بنی کھڑی رہی، گویا کوئی عجیب خواب دیکھ رہی ہو، ہاں، اب اسے اپنے دل میں ایک قسم کے خلا کا احساس ہو رہا تھا، گویا کوئی بستی اجڑ گئی ہو، گویا کوئی نغمہ بند ہو گیا ہو، کوئی چراغ بجھ گیا ہو۔

جب لوگ مندر سے نکلے تو وہ بھی نکل آئی مگر اس کو کوئی راستہ نہ سوجھتا تھا، جاتی ہوئی سڑکیں اسے بھولی سی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کل دنیا ہی تبدیل ہو گئی تھی، وہ ساری رات سڑکوں پر بھٹکتی پھری، گھر کا کہیں پتہ نہیں۔ کل کی کل دکانیں بند ہو گئیں، سڑکوں پر سناٹا چھا گیا۔ پھر بھی وہ اپنا گھر ڈھونڈتی ہوئی چلی جا رہی تھی، ہائے کیا اسی طرح اس کو زندگی کے راستہ میں بھی بھٹکنا پڑے گا؟

دفعتاً ایک پولیس مین نے پکارا، میڈم، تم کہاں جا رہی ہو؟

سبھدرا نے ٹھٹھک کر کہا، کہیں نہیں؟

"تمھارا مکان کہاں ہے؟"

"میرا مکان؟"

ہاں تمھارا مکان کہاں ہے؟ تمھیں بڑی دیر سے اِدھر اُدھر بھٹکتے دیکھ رہا ہوں، کس سڑک میں رہتی ہو؟"

سبھدرا کو اس سڑک کا نام تک یاد نہ تھا!

"تمھیں اپنی سڑک کا نام تک یاد نہیں؟"

"بھول گئی یاد نہیں آتا۔"

دفعتاً اس کی نگاہ سامنے سائن بورڈ کی طرف اٹھی، آہ یہی تو اس کی سڑک ہے، اس نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا سامنے ہی اس کی وہی قیام گاہ تھی اور اسی گلی میں،

اپنے ہی مکان کے سامنے نہ جانے کتنی دیر سے وہ چکر لگا رہی تھی۔

(8)

ابھی بڑا سویرا ہی تھا کہ وہ نوجوان عورت سبھدرا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس کے کپڑے سی رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان کپڑوں میں لگا ہوا تھا۔ کوئی حسینہ اس قدر یکسو ہو کر اپنا سنگار بھی نہ کرتی ہوگی۔ نہ جانے وہ کون سا انعام لینا چاہتی تھی۔ اس کو نو وارد کے خبر بھی نہ ہوئی۔

اس عورت نے پوچھا۔ تم کل مندر میں بھی نہیں آئیں؟

سبھدرا نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا کسی شاعر کا تخیل مجسم ہو کر کھڑا ہے۔ اس کا حسن بے داغ تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے عشق و محبت کا اظہار ہو رہا تھا سبھدرا دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ گویا اس کی چھوٹی بہن آگئی ہو اور بولی۔ ''ہاں گئی تو تھی۔''

'میں نے تمھیں نہیں دیکھا۔''

''ہاں، میں علیحدہ تھی۔''

''کیشو کو دیکھا؟''

''ہاں دیکھا۔''

''آہستہ کیوں بولیں، میں نے کچھ جھوٹ کہا تھا؟

سبھدرا نے ہمدردی سے مسکرا کر کہا۔ میں نے تمھاری آنکھوں سے نہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مجھے تو وہ تمھارے قابل نہیں معلوم ہوئے۔ تمھیں ٹھگ لیا۔

حسینہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔ واہ میں۔ سمجھتی ہوں کہ میں نے انھیں ٹھگ لیا ہے۔

سبھدرا نے متانت سے کہا۔ ایک مرتبہ کپڑوں اور زیوروں سے مزین ہو کر اپنا جمال آئینے میں دیکھو تو معلوم ہو۔

''تب کیا میں کچھ اور ہو جاؤں گی؟''

''اپنے کمرہ سے فرش، پردے، تصویریں، ہانڈیاں، گملے وغیرہ نکال کر دیکھ لو کہ کمرہ کی رونق وہی رہتی ہے۔؟

حسینہ نے سر ہلا کر کہا۔ ٹھیک کہتی ہو۔ مگر گہنے کہاں سے لاؤں؟ نہ جانے

ابھی کتنی کتنے دنوں میں بننے کی نوبت آوے۔

''میں تمھیں اپنے گہنے پہناؤں گی۔''

''تمھارے پاس گہنے ہیں؟''

''بہت، دیکھو میں ابھی لاکر تمھیں پہناتی ہوں۔''

حسینہ نے زبان سے تو بہت ''نہیں نہیں'' کہا۔ مگر دل میں خوش ہو رہی تھی۔ سبھدرا نے اپنے سارے گہنے اسے پہنا دیے۔ اپنے پاس ایک چھلا بھی نہ رکھا۔ اس عورت کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اسے اس ہیئت ہی میں نکلتے شرم تو آتی تھی مگراس کی صورت چمک اٹھی تھی۔ اس میں شبہ نہ تھا اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ گویا کسی فرقت زدہ کو اپنے معشوق کا پیغام ملا۔ دل میں گدگدی ہونے لگی۔ وہ اس قدر حسین ہے۔ اُسے اس کا خیال بھی نہ تھا۔

کہیں کیشو اس شکل میں اسے دیکھ لیتے، یہ خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی مگر کہے کیسے؟ تھوڑی دیر بعد شرم سے سر جھکا کر بولی۔ کیشو مجھ کو اس شکل میں دیکھ کر بہت ہنسیں گے۔

سبھدرا: ہنسیں گے نہیں۔ بلائیں لیں گے۔ آنکھیں کھل جائیں گی۔ تم آج اس روپ میں ان کے پاس جانا۔

عورت نے متحیر ہو کر کہا۔ سچ !آپ اس کی اجازت دیتی ہیں۔

سبھدرا نے کہا۔ ''بڑی خوشی سے۔''

''تمھیں شبہ نہ ہوگا؟''

''بالکل نہیں۔''

''اور جو میں دو چار روز پہنے رہوں؟''

''تم دو چار مہینے پہنے رہو آخر یہاں پڑے ہی تو ہیں۔''

''تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''نہیں مجھے فرصت نہیں ہے۔''

اچھا۔ تو میرے گھر کا پتہ نوٹ کر لو۔

''ہاں۔ لکھ دو۔ شاید کبھی آؤں۔''

ایک لمحہ میں عورت وہاں سے چلی گئی، سمدرا اپنی کھڑکی پر کھڑی اس کو اس طرح خوش ہو کر دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کی چھوٹی بہن ہو۔ اس کے دل میں بغض و حسد کا نام بھی نہ تھا۔

مشکل سے ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ حسینہ واپس آکر بولی۔ سمدرا معاف کرنا۔ میں تمھارا بہت وقت خراب کر رہی ہوں۔ کیشو باہر کھڑے ہیں۔ بلالوں۔"

ایک لمحہ کے لیے صرف ایک لمحہ کے لیے سمدرا کچھ گھبرا گئی اس نے جلدی سے اٹھ کر میز پر پڑی ہوئی چیزوں کو اِدھر اُدھر ہٹا دیا۔ کپڑے قرینے سے رکھ دیئے۔ اپنے الجھے ہوئے بال ٹھیک کرلیے، پھر بے پروائی سے مسکرا کر بولی۔ انھیں تم نے کیوں تکلیف دی۔ جاؤ۔ بلالو۔

ایک منٹ میں کیشو نے کمرے میں قدم رکھا اور چونک کر پیچھے ہٹ گیا، گویا پیر جل گیا ہو۔ منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ سمدرا سنجیدہ اور ساکت اپنی جگہ پر کھڑی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر بولی۔ گویا کسی اجنبی سے بول رہی ہو۔

آیئے مسٹر کیشو، میں آپ کو ایسی خلیق، ایسی حسین اور ایسی قابل بیوی پانے پر مبارک باد دیتی ہوں۔

کیشو کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ مجرم سا بنا کھڑا تھا۔ ندامت اور پشیمانی سے اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ یہ بات ایک روز ہونے والی تھی ضرور۔ مگر اس طرح دفعتاً سمدرا سے اس کی ملاقات ہوگی۔ اس کا خیال اسے خواب میں بھی نہ تھا۔ سمدرا سے وہ یہ بات کیسے کہے گا۔ اس کو اس نے خوب سوچ لیا تھا۔ اس کے اعتراضوں کے جوابات بھی سوچ لیے تھے۔ خط کے الفاظ تک دل نشین کر لیے تھے۔ یہ ساری تیاریاں رکھی رہ گئیں اور سمدرا اسے دو چار ہونے کی نوبت آگئی اور سمدرا سے دیکھ کر ذرا بھی نہیں چونکی۔ اس کے چہرے پر تعجب یا پریشانی یا رنج کی کوئی علامت نہ دکھائی دی۔ اس نے کیشو سے اسی طرح گفتگو کی گویا وہ کوئی شخص اجنبی ہو۔ یہ یہاں کب آئی، کیسے آئی، کیوں آئی، کس طرح گذر بسر کرتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات پوچھنے کے لیے کیشو کا دل بے قرار ہو اٹھا۔ اس نے سوچا تھا کہ سمدرا اسے لعنت ملامت کرے گی۔ زہر کھانے کی دھکی دے گی۔ بیدرد،

بے مروت، بے وفا اور نہ جانے کیا کیا کہے گی۔ اس ساری مصیبتوں کے لیے وہ تیار تھا۔ مگر اس اتفاقی ملاقات اس متکبرانہ بے رخی کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ وہ محبت کی دیوی سبھدرا اس قدر سنگدل۔ اس قدر بے رحم ہوگئی ہے۔ ضرور اسے ساری باتیں پیشتر ہی معلوم ہو چکی ہیں۔ زبردست ترین حملہ یہ تھا کہ اس نے اپنے سارے گہنے اتنی فیاضی سے دے ڈالے اور کون جانے کہ واپس بھی نہ لینا چاہتی ہو۔ وہ مغلوب، افسردہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جواب میں ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔

حسینہ نے ممنونیت کا اظہار کرنے کے لہجہ میں کہا۔ ان کے پتی دیو (شوہر)اس وقت جرمنی ہیں۔

کیشو نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا مگر کچھ نہ بول سکا۔

حسینہ نے پھر کہا۔ بیچاری موسیقی کے سبق پڑھا کر اور کچھ کپڑے سی کر اپنا گزر بسر کرتی ہے۔ وہ حضرت یہاں آ جاتے تو میں ان کی خوش نصیبی پر مبارک باد دیتی۔

کیشو اس پر بھی کچھ نہ بول سکا مگر سبھدرا نے مسکرا کر کہا۔ وہ مجھ سے روٹھے ہوئے ہیں۔ مبارک باد سے اور بھلا ناخوش ہوتے۔

حسینہ نے حیرت سے کہا۔ تم انھیں کی محبت کے سبب یہاں آئیں۔ اپنا گھر بار چھوڑا یہاں محنت مزدوری کر کے گزر بسر کر رہی ہو۔ پھر بھی وہ تم سے روٹھے ہوئے ہیں۔ تعجب ہے۔

سبھدرا نے اسی طرح خندہ روئی سے کہا، مرد کی فطرت ہی تعجب کی چیز ہے۔ خواہ مسٹر کیشو اسے نہ مانیں۔

حسینہ نے پھر کیشو کی طرف تحریک آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ مگر کیشو اسی طرح اداس بیٹھا رہا۔ اس کے دل پر یہ نیا صدمہ تھا۔ حسینہ نے اسے خاموش دیکھ کر اس کی جانب سے صفائی دی۔ کیشو، عورت اور مرد دونوں ہی کو مساوی حقوق دینا چاہتے ہیں۔

کیشو ڈوب رہا تھا تنکے کا سہارا پاکر اس کی ہمت بندھ گئی۔ بولا بیاہ صرف ایک طرح کا سمجھوتہ ہے۔ طرفین کو اختیار ہے کہ جب چاہیں اسے قائم نہ رکھیں۔

حسینہ نے تائید کی۔ مہذب دنیا میں یہ تحریک زوروں سے جاری ہے۔

سبھدرا نے کہا۔ کسی سمجھوتہ کو توڑنے کے لیے کوئی سبب بھی تو ہونا چاہیے۔

کیشو نے جذبات کی لاٹھی کا سہارا لے کر کہا۔ جب اس کا احساس ہو جائے کہ ہم اس بندش سے آزاد ہو کر زیادہ خوش و خرم رہ سکتے ہیں۔ تو یہی ایک سبب کافی ہے۔ عورت کو اگر معلوم ہو جاوے کہ وہ دوسرے مرد کے ساتھ۔

سبھدرا نے بات کاٹ کر کہا۔ معاف کیجیے۔ مسٹر کیشو، مجھ میں اتنی عقل نہیں ہے کہ اس مسئلہ پر آپ سے بحث کروں۔ اعلیٰ سمجھوتہ وہی ہے جو تمام عمر قائم رہے۔ میں ہندوستان کی بات نہیں کہتی۔ وہاں تو عورت مرد کی لونڈی ہے۔ میں انگلستان کی کہتی ہوں یہاں بھی کتنی عورتوں سے میری بات چیت ہوئی ہے۔ وہ طلاق کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتیں۔ بیاہ کا بلند ترین معیار اس کی پاکیزگی اور پائیداری ہے۔ مردوں نے ہمیشہ اس اصول کو توڑا ہے اور عورتوں نے اسے نباہا ہے۔ اب مردوں کا ظلم عورتوں کو کدھر لے جاوے گا۔ نہیں کہہ سکتی۔

اس سنجیدہ اور بر جستہ گفتگو نے بحث کا خاتمہ کر دیا۔ سبھدرا نے چائے منگوائی۔ تینوں نے پیا۔ کیشو، پوچھنا چاہتا تھا کہ ابھی آپ یہاں کتنے دنوں تک رہیں گی۔ لیکن نہ پوچھ سکا۔ وہ یہاں پندرہ منٹ اور رہا لیکن خیالات میں بالکل ڈوبا ہوا۔ مگر جاتے وقت اس سے نہ رہا گیا۔ پوچھ ہی بیٹھا۔ ابھی آپ یہاں اور کتنے روز رہیں گی؟

سبھدرا نے زمیں کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ کہہ نہیں سکتی۔

"کوئی ضرورت ہو تو مجھے یاد کیجیے گا۔"

اس تشفی کے لیے آپ کا شکریہ۔

کیشو تمام دن بے چین رہا۔ سبھدرا اس کی آنکھوں میں پھرتی رہی۔ سبھدرا کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اب اُسے اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ اس کی محبت میں سبھدرا یہاں آئی تھی۔ سارا ماجرا اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس زبردست ایثار کا اندازہ کرکے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہاں سبھدرا نے کیا کیا تکالیف برداشت کی ہوں گی۔ کیسی کیسی مصیبتیں جھیلی ہوں گی۔ یہ سب اسی کے لیے! وہ اسی پر بار نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ اسی لیے تو اس نے اپنی آمد کی اطلاع تک اسے نہ دی۔ اگر اس کو پیشتر سے معلوم ہوتا کہ سبھدرا یہاں آگئی ہے تو شاید اس عورت کی طرف اتنی کشش ہی نہ ہوتی۔ چوکیدار کے سامنے چور کو گھر میں گھسنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ سبھدرا

کو دیکھ کر اس کی فرض شناسی کی قوت بیدار ہوگی۔ اس کے قدموں پر گر کر اس سے معافی مانگنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو اٹھا۔ وہ اس کی زبان سے سارا ماجرا سنے گا یہ خاموشی بے رخی اس کے لیے ناقابل بر داشت تھی۔ دن تو کیشو نے کسی طرح گزارا مگر جیوں ہی رات کو دس بجے۔ وہ سبھدرا سے ملنے چلا۔ نئی بیوی نے پوچھا کہاں جاتے ہو؟

کیشو نے جوتے کا فیتہ باندھتے ہوئے کہا۔ ذرا ایک پروفیسر سے ملنا ہے۔ اس وقت ملنے کا وعدہ کر چکاہوں۔

''تو جلد آنا۔''

''بہت جلد آؤں گا۔''

کیشو گھر سے نکلا تو اس کے دل میں کتنے ہی خیالات موجزن ہونے لگے۔ کہیں سبھدرا ملنے سے انکار کردے تو !نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی تنگ دل نہیں ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں کچھ نہ کہے۔ اسے تسکین دینے کے لیے اس نے ایک مرض کی بات سوچ لی۔ میں ایسا بیمار تھا کہ زندگی کی امید نہ تھی۔ ارملا نے ایسی تن دہی سے اس کی تیمار داری کی اس کو اس سے محبت ہوگئی۔ مرض کا سبھدرا پر جو اثر پڑے گا۔ اس بارے میں کیشو کو کوئی شبہ نہ تھا۔ سارے حالات سے واقف ہونے پر وہ اس کو معاف کر دے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا وہ دونوں کے ساتھ یکساں محبت کر سکتا ہے؟سبھدرا کو دیکھ لینے کے بعد ارملا کو شاید اس کے ساتھ دینے میں اعتراض نہ ہو۔ اعتراض ہو ہی کیسے سکتا ہے؟اس سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔ ہاں یہ دیکھنا ہے کہ سبھدرا بھی اسے منظور کرتی ہے یا نہیں۔ اس نے جس بے رخی کا اظہار کیا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے تو اس کے مان جانے میں شبہ ہی معلوم پڑتا ہے مگر وہ اسے مناوے گا، اس سے منت سماجت کرے گا۔ اس کے پیروں پڑے گا۔ اور بالآخر اسے منا کرہی چھوڑے گا۔ سبھدرا کے عشق و محبت کا نیا ثبوت پاکر وہ گویا ایک گہری نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ سبھدرا کے لیے اس کے دل میں جو جگہ تھی۔ وہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ ارملا اس مقام پر اپنا اقتدار نہیں قائم کر سکی اب اسے معلوم ہوا کہ ارملا سے اس کی محبت محض ایسی ہوس تھی۔ جو لذیذ اشیاء کو

دیکھ کر ہی پیدا ہوتی ہے۔ وہ بچی اشتہا نہ تھی اب پھر اس کو اسی سادہ معمولی غذا کی خواہش ہو رہی تھی۔ عیش پسند ارملا کبھی اتنا ایثار کر سکتی تھی اس میں اسے شبہ تھا۔

سمھدرا کے مکان کے قریب پہنچ کر کیشو کا دل کچھ ہچکنے لگا۔ مگر اس نے دل مضبوط کر کے زینہ پر قدم رکھا۔ اورایک لمحہ میں کمرہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ مگر دروازہ بند تھا۔ اندر بھی تاریکی تھی۔ ضرور ہی وہ کہیں گئی ہے۔ آتی ہی ہو گی۔ جب تک اس نے بر آمدے میں ٹہلنے کا ارادہ کرلیا۔

یکایک مکان کی مالکہ آتی ہوئی نظر پڑی۔ کیشو نے بڑھ کر پوچھا۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ یہ لیڈی کہاں گئی ہے؟

مالکہ نے اس کو سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔ وہ تو آج یہاں سے چلی گئی۔

کیشو نے گھبرا کر پوچھا.........چلی گئیں کہاں چلی گئیں؟

یہ تو مجھ سے کچھ نہیں بتایا۔

کب گئی۔؟

وہ تو دو پہر ہی کو چلی گئیں۔

اپنا اسباب لے کر گئیں۔

اسباب کس کے لیے چھوڑ جاتیں؟ ہاں ایک چھوٹا سا پیکٹ اپنی ایک سہیلی کے لے چھوڑ گئی ہیں جس پر مسز کیشو لکھا ہوا ہے مجھ سے کہا تھا کہ اگر وہ آجاویں تو انھیں دے دینا ورنہ ڈاک سے بھیج دینا۔

کیشو کو اپنا دل اس طرح بیٹھتا ہوا معلوم ہوا جیسے آفتاب غروب ہوتا ہے۔ ایک گہری سانس لے کر بولا......................آپ مجھے وہ پیکٹ دکھا سکتی ہیں؟کیشو میرا ہی نام ہے۔

مالکہ نے مسکرا کر کہا مسز کیشو کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟

تو پھر میں انھیں بلالاؤں۔

ہاں مناسب تو یہی ہے۔

بہت دور جانا پڑے گا۔

کیشو کچھ ٹھٹھکتا ہوا زینہ کی طرف چلا تو مالکہ نے پھر کہا۔ میں سمجھتی ہوں کہ

آپ اسے لیے ہی جائیں۔ نا حق آپ کو کیوں دوڑاؤں۔ مگر کل میرے پاس ایک رسید بھیج دیجئے گا۔ شاید اس کی ضرورت پڑے۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک چھوٹا سا پیکٹ لا کر کیشو کو دے دیا۔ کیشو پیکٹ کو لے کر اس طرح بھاگا جیسے کوئی چور بھاگا جا رہا ہو۔ اس پیکٹ میں کیا ہے۔ یہ جاننے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ اسے اتنی تاخیر بھی ناگوار تھی کہ اپنے مکان میں جا کر اسے کھولے۔ قریب ہی ایک پارک تھا۔ وہاں جاکر اس نے برقی لیمپ کی روشنی میں اس پیکٹ کو کھول ڈالا۔ اس وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا۔ گویا کسی عزیز کی علالت کی خبر کے بعد تار ملا ہو۔

پیکٹ کا کھلنا تھا کہ کیشو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس میں ایک زرد رنگ کی ساڑی تھی۔ ایک چھوٹی سی سیندور کی ڈبی اور ایک کیشو کی عکسی تصویر۔ ساتھ ہی ایک لفافہ بھی تھا۔ کیشو نے اسے کھول کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا:

''بہن! میں جاتی ہوں۔ یہ میرے سہاگ کا جنازہ ہے اسے دریائے ٹیمس میں بہا دینا۔ تمھیں لوگوں کے ہاتھوں یہ آخری سنسکار بھی ہو جاوے تو اچھا۔

''تمھاری سبھدرا۔''

کیشو خستہ دل سا اس خط کو ہاتھ میں لیے ہوئے وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔ اور زارو قطار رونے لگا۔

(یہ اقتباس پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہ نامہ 'مادھوری' کے جولائی 1928 کے شمارے میں شائع ہوا عنوان 'سہاگ کا منتر' مان سرورر 5 میں شامل ہے۔ اردو میں 'پریم چالیسی' میں شائع ہوا ہے۔)

داروغہ کی سرگذشت

(1)

کل شام کو ایک ضرورت سے تانگے پر بیٹھا ہوا چوک جا رہا تھا کہ راستے میں ایک اور حضرت تانگے پر آبیٹھے۔ تانگے والا انھیں بٹھانا تو نہ چاہتا تھا پر انکار بھی نہ کرسکتا تھا۔ پولیس کے آدمی سے جھگڑا کون مول لے۔ یہ صاحب کسی تھانہ کے داروغہ تھے۔ایک چالانی مقدمہ کی پیروی کرنے صدر آئے ہوئے تھے۔ میری عادت ہے کہ پولیس والوں سے بہت کم بولتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو مجھے ان کی صورت سے نفرت ہے۔ ان کے ہاتھوں ہمہ شما کو کیسی کیسی ذلتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں اس کا مجھے کئی بار تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ میں ذرا سا کھسک گیا اور منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یکایک داروغہ جی نے گل فشانی کی۔ جناب یہ عام شکایت ہے کہ پولیس والے بہت رشوت لیتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ پولیس والوں کو رشوت لینے کے لیے کتنا مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر پولیس والے رشوت لینا بند کر دیں تو میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ جو بڑی بڑی پگڑیوں والے موٹے رئیس نظر آتے ہیں۔ سب کے سب جیل خانے کے اندر بیٹھے دکھائی دیں۔ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ جناب تھیلیاں گلے لگائی جاتی ہیں۔ حلفاً کہتا ہوں۔ اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں۔ ہم ہزار انکار کریں پر چاروں طرف سے ایسے دباؤ پڑتے ہیں کہ مجبور ہو کر لینا ہی پڑتی ہے۔

میں نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ جو کام روپے لے کر کیا جاتا وہی کام بغیر روپے لیے بھی تو کیا جاسکتا ہے۔

داروغہ جی نے ہنس کر فرمایا۔ یہ تو گناہ بے لذت ہوگا۔ بندہ پرور حلفاً کہتا ہوں۔ پولیس کا آدمی فرشتہ نہیں ہوتا۔ اور میرا خیال ہے کہ کوئی انسان بھی اتنا بے لوث نہیں ہوسکتا۔

میں ابھی کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک میاں صاحب لمبی اچکن پہنے ترکی ٹوپی سر پر رکھے تانگے کے سامنے سے نکلے۔ داروغہ جی نے انھیں دیکھتے ہی جھک کر

سلام کیا اور شاید مزاج پرسی کرنی چاہتے تھے کہ اس بھلے آدمی نے سلام کا جواب گالیوں سے دینا شروع کیا۔ جب تانگا کئی قدم آگے نکل گیا تو وہ ایک پتھر لے کر ہمارے پیچھے دوڑا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو تیز کیا۔ ان میاں صاحب نے بھی قدم تیز کیے اور پتھر پھینک ہی دیا۔ میرا سر بال بال بچا۔ اس نے دوسرا پتھر اٹھایا۔ مگر خیریت ہوئی وہ ہمارے سامنے آگرا۔ تیسرا پتھر اتنے زور سے آیا کہ داروغہ جی کے گھٹنے میں بڑی چوٹ آئی پر اتنی دیر میں تانگا اتنی دور نکل آیا تھا کہ ہم پتھروں کی زد سے باہر ہو گئے تھے۔ شاید میاں صاحب بھی تھک گئے ہوں۔ ان کے ہاتھ میں اب بھی پتھر اور زبان پر گالیاں تھیں۔ جب تک وہ آدمی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا ہم اسے پتھر اٹھائے دیکھتے رہے۔

جب خطرہ کا اندیشہ نہ رہا تو میں نے داروغہ جی سے پوچھا یہ کون آدمی ہے صاحب؟ کوئی پاگل تو نہیں ہے؟

داروغہ جی نے گھٹنے کو سہلاتے ہوئے کہا۔ پاگل نہیں ہے صاحب۔ حلفاً کہتاہوں۔ میرا پرانا دشمن ہے میں نے سمجھا تھا ظالم پرانا قصہ بھول گیا ہوگا۔ ورنہ مجھے کیا پڑی تھی کہ سلام کرنے جاتا۔

میں نے کہا۔ ”آپ نے اسے کسی مقدمہ میں سزا دلوائی ہوگی۔“

”بڑی لمبی داستان ہے جناب! بس اتنا ہی سمجھ لیجیے کہ اس کا بس چلے تو مجھے سموچا ہی نگل جائے۔ حلف سے کہتا ہوں۔“

”آپ تو آتش شوق کو اور بھی تیز کر رہے ہیں۔ اب تو وہ داستان سنے بغیر تسکین نہیں ہوتی۔“

داروغہ جی نے پہلو بدل کر کہا۔ اچھی بات سنیے:۔

کئی سال گزرے میں صدر ہی میں تعینات تھا۔ بے فکری کے دن تھے۔ تازہ خون۔ ایک معشوق سے آنکھ لڑ گئی۔ آمد و رفت شرع ہوئی۔ اب بھی جب اس حسینہ کی یاد آتی ہے تو آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ بازاری حسینوں میں اتنی حیا، اتنی وفا، اتنی مروت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دو سال اس کے ساتھ اتنے لطف سے گزرے کہ آج بھی ان دنوں کو یاد کر کے روتا ہوں۔ مگر قصہ کو بڑھاؤں کیوں، ورنہ

ختم نہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ دو سال کے بعد میرے تبادلہ کا حکم ہوگیا۔ اس وقت دل کو جتنا صدمہ ہوا عرض نہیں کرسکتا۔ حلفاً کہتا ہوں یہی جی چاہتا تھا کہ خود کشی کر لوں یا نوکری سے مستعفی ہوجاؤں۔ اس حسینہ نے یہ خبر سنی تو اس کی جان سی نکل گئی۔ سفر کی تیاریوں کے لیے مجھے تین دل ملے تھے۔ یہ تین دن میں نے منصوبے باندھنے میں کاٹے۔ اس وقت مجھے تجربہ ہوا کہ عورتوں کو عقل سے خالی سمجھنے میں ہم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ میرے منصوبے شیخ چلی کے سے تھے۔ کلکتہ بھاگ چلیں۔ وہاں کوئی دوکان کر لیں۔ یا کسی دیہات میں کھیتی باڑی کر کے زندگی بسر کریں۔ لیکن وہ یہی جواب دیتی کہ ابھی وہاں جاکر اپنا کام کرو۔ جب مکان کا بندوبست ہوجائے تو مجھے بلا لینا دوڑی چلی آؤں گی۔

آخر جدائی کی منحوس گھڑی آئی۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ اب جان نہ بچے گی۔ کوئی پہلو سے دل کو نکالے لیتا تھا۔ گاڑی کا وقت نکلا جاتا تھا اور میں اس کے پاس سے اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ مگر میں قصے کو طول دینے لگا۔ مختصر یہ کہ میں اسے دو تین دن میں بلانے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ پر افسوس! وہ دو تین دن کبھی ختم نہ ہوئے۔ پہلے دس پانچ روز تو افسروں سے ملنے اور علاقہ کی دیکھ بھال میں گذرے۔ اسی اثناء میں گھر سے خط آگیا کہ تمھاری شادی طے ہوگئی ہے۔ رخصت لے کر چلے آؤ۔ شادی کی خوشی میں اس وفا کی دیوی کی مجھے یاد بھی نہ رہی۔ شادی کر کے مہینہ بھر بعد لوٹا تو اہلیہ ساتھ تھی، رہی سہی یاد دبھی جاتی رہی۔ ایک مہینہ بعد اس حسینہ نے ایک خط بھیجا۔ پر میں نے اس کا جواب نہ دیا۔ ڈرتا رہتا تھا کہیں ایک دن وہ لدی پھندی آکر سر پر سوار نہ ہوجائے۔ پھر تو بیوی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہوں گا۔

سال بھر کے بعد مجھے ایک ضرورت سے صدر آنا پڑا۔ اس وقت مجھے اس حسینہ کی یاد آئی۔ سوچا ذرا چل کر دیکھنا چاہیے۔ کس حالت میں ہے۔ فوراً اپنی خاموشی اور اتنے دنوں تک نہ آنے کا جواب سوچا اور اس کے دروازہ پر جا پہنچا۔ دروازہ صاف ستھرا۔ مکان کی حالت بھی پہلے سے اچھی تھی۔ دل میں خوش ہوا کہ اس کی حالت اتنی خراب نہیں ہے جتنی میں نے سمجھی تھی اور خراب کیوں ہونے لگی۔ مجھ جیسے آدمی کیا دنیا میں اور نہیں ہیں؟ میں نے دروازہ پر آواز دی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

بھیتر سے آواز آئی، کون ہے؟

کوئی جواب نہ ملا۔ آواز اسی حسینہ کی تھی۔ اس میں شک نہ تھا۔ پھر دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ابھی شاید اس کی خفگی دور نہیں ہوئی۔ پھر کواڑ کھٹکھٹائے اور باہر ہی کھڑے کھڑے اپنی مصیبتوں کی داستان سنانے لگا۔ سخت بیمار تھا جینے کی امید نہ تھی۔ دوسری زندگی پائی۔ وغیرہ وغیرہ۔ کوئی پندرہ منٹ میں دروازہ کھلا۔ حسینہ نے مجھے اشارہ سے اندر بلایا اور چٹ کواڑ بند کر لیے۔

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں یہاں سے جاکر میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ بس یہی سمجھ لو کہ مر کر اٹھا ہوں۔

حسینہ نے بے اعتباری کے انداز سے کہا معافی کس بات کی؟ تم سے میرا نکاح توہوا نہ تھا۔ دل کہیں اور لگ گیا تو میری یاد کیوں آتی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ جیسا اور لوگ کرتے ہیں۔ ویسا تم نے بھی کیا۔ یہاں سب لوگ تفریح کے لیے آتے ہیں۔ شرط وفا نبھانے کوئی نہیں آتا۔ تمھارے لیے یہی کیا کم ہے کہ اتنے دنوں...!

"کچھ نہ پوچھو۔ ایک مرض ہو تو بتاؤں کس طرح زندہ ہوگیا۔"

حسینہ نے مسکرا کر کہا۔ "دنیا میں کوئی ایسی بیماری بھی ہے جس میں آدمی موٹا تازہ ہوجاتا ہے۔ شاید گھلتے گھلتے یہ توند نکل آئی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، پہلے سے دوگنے ہو گئے ہو۔"

میں نے نادم ہو کر کہا۔ "یہ سب بلغم کا فساد ہے۔ بھلا موٹا کیا ہوتا۔ ادھر کا پانی نہایت بلغمی ہے۔ تم نے تو میری یاد بھلا ہی دی۔"

حسینہ نے اب کی بار میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور بولی "خط کا جواب تک نہ دیا۔ الٹے مجھی کو الزام دیتے ہو۔ کتنے ہی آدمیوں سے مجھے سابقہ پڑا۔ لیکن مجھے چرکا دیا تو تم نے، تم سب سے بڑے مکار، حیلہ ساز نکلے بیوی لائے، شادی رچائی اور مجھے خبر تک نہ دی۔ تمھاری تو صورت سے مجھے نفرت ہو گئی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میری شادی ہوگئی۔"

اس نے رکھائی سے کہا۔ "یہ پوچھ کر کیا کروگے۔ جھوٹ تو نہیں کہتی۔ بے وفا

ختم نہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ دو سال کے بعد میرے تبادلہ کا حکم ہوگیا۔ اس وقت دل کو جتنا صدمہ ہوا عرض نہیں کرسکتا۔ حلفاً کہتا ہوں یہی جی چاہتا تھا کہ خودکشی کرلوں یا نوکری سے مستعفی ہوجاؤں۔ اس حسینہ نے یہ خبر سنی تو اس کی جان سی نکل گئی۔ سفر کی تیاریوں کے لیے مجھے تین دن ملے تھے۔ یہ تین دن میں نے منصوبے باندھنے میں کاٹے۔ اس وقت مجھے تجربہ ہوا کہ عورتوں کو عقل سے خالی سمجھنے میں ہم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ میرے منصوبے شیخ چلی کے سے تھے۔ کلکتہ بھاگ چلیں۔ وہاں کوئی دوکان کرلیں۔ یا کسی دیہات میں کھیتی باڑی کر کے زندگی بسر کریں۔ لیکن وہ یہی جواب دیتی کہ ابھی وہاں جاکر اپنا کام کرو۔ جب مکان کا بندوبست ہوجائے تو مجھے بلا لینا دوڑی چلی آؤں گی۔

آخر جدائی کی منحوس گھڑی آئی۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ اب جان نہ بچے گی۔ کوئی پہلو سے دل کو نکالے لیتا تھا۔ گاڑی کا وقت نکلا جاتا تھا اور میں اس کے پاس سے اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ مگر میں قصے کو طول دینے لگا۔ مختصر یہ کہ میں اسے دو تین دن میں بلانے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ پر افسوس! وہ دو تین دن کبھی ختم نہ ہوئے۔ پہلے دس پانچ روز تو افسروں سے ملنے اور علاقہ کی دیکھ بھال میں گذرے۔ اسی اثناء میں گھر سے خط آگیا کہ تمھاری شادی طے ہوگئی ہے۔ رخصت لے کر چلے آؤ۔ شادی کی خوشی میں اس وفا کی دیوی کی مجھے یاد بھی نہ رہی۔ شادی کر کے مہینہ بھر بعد لوٹا تو اہلیہ ساتھ تھی، رہی سہی یاد بھی جاتی رہی۔ ایک مہینہ بعد اس حسینہ نے ایک خط بھیجا۔ پر میں نے اس کا جواب نہ دیا۔ ڈرتا رہتا تھا کہیں ایک دن وہ لدی پھندی آکر سر پر سوار نہ ہوجائے۔ پھر تو بیوی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہوں گا۔

سال بھر کے بعد مجھے ایک ضرورت سے صدر آنا پڑا۔ اس وقت مجھے اس حسینہ کی یاد آئی۔ سوچا ذرا چل کر دیکھنا چاہیے۔ کس حالت میں ہے۔ فوراً اپنی خاموشی اور اتنے دنوں تک نہ آنے کا جواب سوچا اور اس کے دروازہ پر جا پہنچا۔ دروازہ صاف ستھرا۔ مکان کی حالت بھی پہلے سے اچھی تھی۔ دل میں خوش ہوا کہ اس کی حالت اتنی خراب نہیں ہے جتنی میں نے سمجھی تھی اور خراب کیوں ہونے لگی۔ مجھ جیسے آدمی کیا دنیا میں اور نہیں ہیں؟ میں نے دروازہ پر آواز دی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

بھیتر سے آواز آئی، کون ہے؟

کوئی جواب نہ ملا۔ آواز اسی حسینہ کی تھی۔ اس میں شک نہ تھا۔ پھر دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ابھی شاید اس کی خفگی دور نہیں ہوئی۔ پھر کواڑ کھٹکھٹائے اور باہر ہی کھڑے کھڑے اپنی مصیبتوں کی داستان سنانے لگا۔ سخت بیمار تھا جینے کی امید نہ تھی۔ دوسری زندگی پائی۔ وغیرہ وغیرہ۔ کوئی پندرہ منٹ میں دروازہ کھلا۔ حسینہ نے مجھے اشارہ سے اندر بلایا اور چٹ کواڑ بند کر لیے۔

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں یہاں سے جاکر میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ بس یہی سمجھ لو کہ مر کر اٹھا ہوں۔

حسینہ نے بے اعتباری کے انداز سے کہا معافی کس بات کی ؟ تم سے میرا نکاح توہوا نہ تھا۔ دل کہیں اور لگ گیا تو میری یاد کیوں آتی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ جیسا اور لوگ کرتے ہیں۔ ویسا تم نے بھی کیا۔ یہاں سب لوگ تفریح کے لیے آتے ہیں۔ شرط وفا نبھانے کوئی نہیں آتا۔ تمھارے لیے یہی کیا کم ہے کہ اتنے دنوں...!

"کچھ نہ پوچھو۔ ایک مرض ہو تو بتاؤں کسی طرح زندہ ہوگیا۔"

حسینہ نے مسکرا کر کہا۔ "دنیا میں کوئی ایسی بیماری بھی ہے جس میں آدمی موٹا تازہ ہوجاتا ہے۔ شاید گھلتے گھلتے یہ توند نکل آئی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، پہلے سے دوگنے ہو گئے ہو۔"

میں نے نادم ہو کر کہا۔ "یہ سب بلغم کا فساد ہے۔ بھلا موٹاکیا ہوتا۔ ادھر کا پانی نہایت بلغمی ہے۔ تم نے تو میری یاد بھلا ہی دی۔"

حسینہ نے اب کی بار میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور بولی "خط کا جواب تک نہ دیا۔ الٹے مجھی کو الزام دیتے ہو۔ کتنے ہی آدمیوں سے مجھے سابقہ پڑا۔ لیکن مجھے چرکا دیا تو تم نے، تم سب سے بڑے مکار، حیلہ ساز نکلے بیوی لائے، شادی رچائی اور مجھے خبر تک نہ دی۔ تمھاری تو صورت سے مجھے نفرت ہو گئی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میری شادی ہوگئی۔"

اس نے رکھائی سے کہا۔ "یہ پوچھ کر کیا کروگے۔ جھوٹ تو نہیں کہتی۔ بے وفا

بہت دیکھے لیکن تم سب کے استاد نکلے تمھاری آواز سن کر جی میں تو آیا کہ دھتکار دوں لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اپنے دروازہ پر کسی کو کیا ذلیل کروں۔"

میں نے اپنا خاکی کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ جوتے اتار ڈالے اور چارپائی پر دراز ہو کر بولا۔ "لیلیٰ دیکھو اتنی بے رحمی سے نہ پیش آؤ۔ میں تو اپنی خطاؤں کو خود تسلیم کرتا ہوں اور اسی لیے تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ ذرا اپنے نازک ہاتھوں سے ایک پان تو کھلا دو۔

لیلیٰ پاندان کھول کر بنانے لگی کہ یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ کون شیطان آپہونچا۔"؟

لیلیٰ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "یہ میرے شوہر ہیں۔ تمھاری طرف سے جب مایوس ہوگئی تو میں نے ان سے نکاح کر لیا۔"

میں نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ "تو تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ میں الٹے پاؤں لوٹ جاتا۔ یہ نوبت کیوں آتی، نہ جانے کب کی کسر نکالی۔

لیلیٰ نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ "میں کیا جانتی تھی کہ وہ آج اتنی جلد آپہنچیں گے۔ روز تو پہر رات گئے آتے تھے۔ پھر تم اتنی دور سے آئے تھے تمھاری کچھ خاطر بھی تو کرنی تھی۔"

"یہ اچھی خاطر کی بتاؤ اب میں جاؤں کہاں؟

"میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آرہا ہے۔"

میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ "یا اللہ کس عذاب میں جان پھنسی۔"

اتنے میں اس شیطان نے پھر کواڑ کھٹکھٹائے۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ دروازہ توڑ ڈالے گا۔ لیلیٰ کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک رنگ جاتا تھا۔ بیچاری کھڑی کانپ رہی تھی۔ بس زبان سے یہی الفاظ نکل رہے تھے۔ "یا اللہ رحم کر۔"

باہر سے آواز آئی۔ "ارے کیا تم سر شام ہی سے سو گئیں؟ ابھی تو سات بجے ہیں۔ کہیں سانپ تو نہیں سونگھ گیا۔ خدا جانتا ہے اب اور دیر کی تو کواڑ توڑ ڈالوں گا۔"

میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "خدا کے لیے میرے چھپنے کی کوئی جگہ بتاؤ پیچھے کی

طرف تو کوئی دروازہ نہیں ہے۔"

"نہ"

"سنڈاس تو ہوگی؟"

"سب سے پہلے وہ سنڈاس ہی میں جائیں گے۔"

"اچھا وہ سامنے کوٹھری کیسی ہے۔"

"ہاں ہے تو لیکن کوٹھری کھول کر دیکھی تو"؟

"کیا بہت ڈبل آدمی ہے۔"

"تم جیسے دو کو بغل میں دبالے"

"تو کھول دو کوٹھری وہ جوں ہی اندر جائے گا میں کترا کر نکل بھاگوں گا۔"

حسینہ نے کوٹھری کھول دی۔ میں اندر جا گھسا۔ دروازہ بند ہو گیا۔"

مجھے اندر بند کر کے حسینہ نے صدر دروازہ کھولا اور بولی۔ کیوں کواڑ توڑے ڈالتے ہو۔ آتو رہی ہوں۔"

میں نے کوٹھری کے کواڑوں کی دراز سے دیکھا آدمی کیا، پورا دیو تھا۔ اندر آتے ہی بولا۔ تم سر شام سے سو گئی تھیں"؟

"ہاں ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔"

"مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تم کسی سے باتیں کر رہی ہو۔"

"وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں"

"میں نے صاف سنا۔ کوئی نہ کوئی تھا ضرور، تم نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔"

"انھیں باتوں پر تم سے میرا جی جلتا ہے۔ سارا گھر تو پڑا ہے۔ دیکھ کیوں نہیں لیتے۔"

"دیکھوں گا تو میں ضرور ہی۔ لیکن تم سے سیدھے سے پوچھتا ہوں بتلادو کون تھا۔"

حسینہ نے کنجیوں کا گچھا پھینک کر کہا۔ "اگر کوئی تھا تو گھر ہی میں ہوگا۔ لو سب جگہ دیکھ آؤ۔ کوئی سوئی تو ہے نہیں کہ میں نے کہیں چھپا دیا ہو۔"

وہ ملعون اس چکمے میں نہ آیا۔ شاید پہلے بھی ایسا چرکا کھا چکا تھا۔ کنجیوں کا گچھا

اٹھا کر سب سے پہلے میری کوٹھری کے دروازہ پر آیا اور کواڑ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ پر اس گچھے میں اس قفل کی کنجی نہ تھی۔ بولا اس کوٹھری کی کنجی کہاں ہے؟

حسینہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "ارے تو کیا اس میں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ وہ کوٹھری تو لکڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔"

"تم کنجی دے دو نہ۔"

"تم بھی کبھی کبھی دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہو۔ اندھیرے میں کوئی سانپ بچھو بیٹھا ہو تو، نابھیا میں اس کی کنجی نہ دوں گی۔"

"بلا سے سانپ نکل آوے گا۔ اچھا ہی ہو نکل آئے۔ اس بے حیا زندگی سے تو موت ہی اچھی۔"

حسینہ نے ادھر ادھر کنجی کو تلاش کر کے کہا۔ "نہ جانے اس کی کنجی کہاں رکھ دی خیال نہیں آتا۔"

"اس کوٹھری میں تو میں نے اور کبھی قفل پڑا نہیں دیکھا۔"

"میں تو روز قفل ڈالتی ہوں۔ تمھاری نگاہ نہ پڑی ہوگی۔"

"تو تم کنجی نہ دوگی۔"

"کہتی تو ہوں کہ اس وقت نہیں مل رہی ہے۔"

"کہے دیتا ہوں کچا ہی کھا جاؤں گا۔"

اب تک تو میں کسی طرح ضبط کئے کھڑا رہا۔ بار بار اپنے اوپر غصہ آرہا تھا۔ یہاں کیوں آیا۔ کہیں یہ ملعون، مردود طیش میں آکر مار ہی نہ ڈالے۔ میرے ہاتھ میں کوئی چھری بھی نہیں۔ یا خدا اب تو ہی مالک ہے۔ دم روکے کھڑا تھا۔ ایک پل کا بھی موقع ملے تو نو دو گیارہ ہو جاؤں۔ مگر جب اس مردود نے کواڑوں کو دھم دھمانا شروع کیا۔ تب تو روح ہی فنا ہو گئی۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کسی کونے میں چھپنے کی جگہ ہے یا نہیں۔ کواڑ کی درازوں سے کچھ روشنی اندر آرہی تھی۔ اوپر جو نگاہ اٹھائی تو ایک مچان سا دکھائی دیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ چاہتا تھا کہ اچک کر اوپر چڑھ جاؤں۔ مگر غضب خدا کا! ادھر بھی ایک صاحب جلوہ افروز تھے۔ انھیں دیکھ کر اس ہیئت کذائی میں بھی میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ یہ حضرت اچکن پہنے گھڑی

لگائے ایک خوبصورت صافا باندھے اکڑوں بیٹھے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے لیے دروازہ کھولنے میں لیلیٰ نے اتنی دیر کیوں کی تھی۔ ابھی ان حضرت کو دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازہ پر موسل کی چوٹیں پڑنے لگیں۔ بوسیدہ کواڑ تو تھے ہی۔ اس وقت چار دھاکوں میں نیچے آرہے۔ اور وہ شقی لالٹین لیے کمرہ میں گھسا۔ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور میری گردن پکڑ کر بولا۔ ''اچھا یہاں تو ایک سانڈ گھسا بیٹھا ہے۔ جبھی کنجی گم ہو گئی تھی۔ آیئے آپ کی کچھ خاطر کروں۔ ایسے مہمان روز کہاں ملتے ہیں۔

یہ کہہ کر اس نے میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اتنے زور سے باہر کی طرف پھینکا کہ میں آنگن میں اوندھے منہ جا گرا۔ اس شیطان کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہونٹھ میرا خون چوسنے کے لیے پھڑک رہے ہیں۔ میں ابھی زمین سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ قصائی ایک بڑا تیز چھرا لیے میری گردن پر آپہنچا۔ مگر جناب ہوں پولیس کا آدمی۔ اس وقت مجھے ایک ایسی چال سوجھ گئی۔ جس نے صاف جان بچا دی۔ ورنہ آج آپ سے باتیں نہ کرتا ہوتا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''ہجور میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں تو میر صاحب کے ساتھ آیا تھا۔''

اس نے گرج کر پوچھا۔ ''کون میر صاحب؟''

میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''وہی جو مچان کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں تو ہجور کا گلام ہوں۔ مالک کے ساتھ چلا آیا تھا۔''

''اچھا تو کوئی میر صاحب مچان کے اوپر بھی تشریف رکھتے ہیں؟ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کوٹھری میں جاکر مچان کو دیکھا۔ وہ حضرت سمٹے سمٹائے بھیگی بلی بنے بیٹھے تھے۔ چہرہ ایسا زرد پڑ گیا تھا۔ گویا کوئی لاش بے جان ہو۔ ان پر نظر پڑنا تھا کہ اس ظالم نے میر صاحب کا ایک ہاتھ پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ آپ دھم سے نیچے آرہے ہیں۔ ان کا ٹھاٹھ دیکھ کر اب اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ میں ان کا خدمت گار تھا۔ میری برہنہ پائی اس وقت معجزہ کر گئی۔ میر صاحب کی صورت دیکھ کر رحم کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آتی تھی۔ بیچارے عطر میں بسے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ بھی تھا۔ اس میدان کے شہسوار اور اس بحر ناہموار کے غواص معلوم ہوتے تھے۔ پر اس وقت ان کی وہی حالت تھی جو چوہے کی بلی کے پنجے میں ہوتی ہے۔

اس نے پوچھا۔ "تو کون ہے"؟

میر صاحب نے ہچکتے ہوئے کہا۔ "جناب میں... جی میرا مکان... یہ آدمی جھوٹا ہے۔ یہ میرا نوکر نہیں ہے۔"

"تم اس آدمی کو جہنم میں ڈالو۔ تم یہاں کیا کرنے آئے تھے"

"جی یہی آدمی مجھے دھوکا دے کر یہاں لایا تھا۔"

"یہ کیوں نہیں کہتا کہ نفس کھینچ کر لایا تھا۔ دوسروں پر الزام کیوں رکھتا ہے۔ سور لے تو بھی کیا کہے گا کہ کس سے سابقہ پڑا تھا۔

یہ کہہ کر اس نے اسی تیز چھری سے میر صاحب کی ناک کاٹ لی۔ میں موقع پاکر بے تحاشا بھاگا۔ لیکن ہائے ہائے کی آواز کئی قدم تک برابر میرے کان میں آتی رہی۔ اس کے بعد ان دونوں میں کیسی چھنی۔ ان کے اوپر کیا آفت آئی اس کی مجھے خبر نہیں۔ میں تب سے بیسیوں بار صدر آچکا ہوں۔ پر ادھر بھول کر بھی نہیں گیا۔ یہ پتھر پھینکنے والے حضرت وہی میر صاحب ہیں۔ جن کی ناک کٹی تھی۔ آج نہ جانے کہاں سے نکل پڑے۔ میری شامت آئی تھی کہ انھیں سلام کر بیٹھا۔ آپ نے شاید ان کی ناک کی طرف دھیان نہیں دیا۔

مجھے اب خیال آیا کہ اس آدمی کی ناک چپٹی ضرور تھی۔ داروغہ جی نے شاید سمجھا ہو کہ میں ان کی ذکاوت اور فراست کی داد دوں گا۔ مگر جب میں نے کہا۔" آپ نے اس غریب کو بُرا چرکا دیا تو وہ کچھ مایوس ہو کر بولے۔ "اور کرتا ہی کیا۔"

"آپ دونوں مل کر کیا اس آدمی کو نہ دبا لیتے۔"

"ضرور دبا لیتے، مگر چور کا دل آدھا۔ اس وقت اپنی اپنی پڑی تھی۔ مقابلہ کرنے کی کسے سوجھتی۔ کہیں اس دم چھلے میں دھر لیا جاتا تو آبرو الگ جاتی۔ نوکری سے الگ ہاتھ دھوتا۔"

چوک آگیا اور ہم دونوں اپنی اپنی راہ چل دیئے۔

(یہ قصہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے اگست 1928 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسرودر 4 میں شامل ہے۔ وہاں عنوان ہے داروغہ جی۔ اردو میں 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔)

سمپادک موٹے رام جی شاستری

(1)

پنڈت چنتا منی جب کئی مہینوں کے بعد تیرتھ یاترا کر کے لوٹے، تو اپنے پرم متر پنڈت موٹے رام جی شاستری سے ملنے چلے۔ اس لمبی یاترا میں انھیں کتنے ہی وچتر انوبھو ہوئے تھے، کتنے ہی نئی نئی باتیں دیکھی اور سنی تھیں۔ ان سبھوں کو وہ نمک مرچ لگا کر پنڈت جی سے بیان کرنے کے لیے، آتر ہو رہے تھے۔ لپکے ہوئے پنڈت موٹے رام جی کے گھر پہنچے اور اندر قدم رکھنا چاہتے تھے کہ ایک چپراسی نے للکارا ''کون اندر جارہا ہے۔ باہر کھڑے رہو۔ اندر کیا کام ہے؟

چنتا منی نے وسمت ہو کر پوچھا۔

موٹے رام جی کا گھر یہی ہے نا؛

سپاہی : ہم یہ کچھ نہیں جانتے، ویوستھاپک جی کی آگیاں ہے کہ کوئی اندر نہ جانے پاویں

چنتامنی : ویوستھاپک جی کون ہیں؟ ہے تو یہ موٹے رام ہی کا گھر؟

سپاہی : یہ سب ہم کچھ نہیں جانتے۔ ویوستھاپک جی کی آگیا ہے۔

چنتامنی : کچھ معلوم تو ہو، ویوستھاپک جی کون ہیں؟

سپاہی : ویوستھاپک جی ویوستھاپک جی ہیں اور کون ہیں۔

چنتامنی نے چکت ہو کر مکان کو اوپر سے نیچے تک دیکھا کہ کہیں ان سے کوئی بھول تو نہیں ہوئی۔ تو انھیں دوار کے سامنے ایک بڑا سا سائین بورڈ نظر آیا۔ اس پر لکھا تھا، سونا کاریالیہ۔ متر سے ملنے کی اُت سکتا میں ان کی نگاہ پہلے اس بورڈ پر نہ پڑی تھی۔ پوچھا، یہ کوئی کاریالیہ ہے کیا؟

سپاہی : تمھاری آنکھیں نہیں ہیں کیا؟

چنتامنی : تم اتنا رعب کیوں جماتے ہو؟ کیا ہمیں کوئی بھکشک سمجھا ہے؟ اگر موٹے رام جی کا یہی گھر ہو تو جا کر کہو پنڈت چنتا منی جی ان سے ملنے آئے ہیں۔

دھونس دوسروں پر جمانا۔

سپاہی : کارڈ لاؤ۔

چنتا منی : کیسا کارڈ؟

سپاہی : ویوستھا یک جی بنا کارڈ دیکھے کسی سے نہیں ملتے۔

چنتا منی : تم ہمارا نام تو بتاؤ جاکر۔

سپاہی : ایسے کیا نام بتاؤں؟ مجھ پر بگڑنے لگیں تب؟

چنتا منی نے جب دیکھا کہ سپاہی کی خوشامد سے کام نہ چلے گا، تو دوار پر کھڑے ہو کر زور زور سے پکارنے لگے۔ موٹے رام او موٹے رام۔

سپاہی نے چنتا منی کا ہاتھ پکڑ کر ہٹاتے ہوئے کہا۔ یہاں چلانے کا حکم نہیں ہے۔

چنتا منی کی کرودھ اگنی بھڑک اُٹھی۔ وہ اس سپاہی کو اپنے برہم تیج کا سوروپ دکھانا ہی چاہتے تھے کہ پنڈت موٹے رام جی اندر سے نکل آئے اور چنتا منی کو دیکھ کر بولے، ارے تم ہو چنتا منی۔ کارڈ کیوں نہ بھجوا دیا۔ تم نے سائین بورڈتو دیکھا ہوگا۔ میں سونا، نامی پتریکا کا سمپادک ہوں۔ آؤ، اندر آؤ۔ میں بنا کارڈ دیکھے کسی سے نہیں ملتا، لیکن تم اپنے پرانے متر ہو، تمھارے لیے کوئی روک ٹوک نہیں۔

چنتامنی اندر داخل ہوئے تو کچھ اور ہی چھٹا دیکھی۔ جس کوٹھری میں سونا بیٹھتی تھی، وہاں اب میزاور کرسیاں تھی۔ رسوئی کے کمرے میں پتروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ برآمدوں میں کرم چاری لوگ بیٹھے ہوئے بڑے بڑے رجسٹر لکھ رہے تھے۔ جب دونوں آدمی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو موٹے رام جی نے کہا، تم جب تیرتھ یاترا کرنے چلے گئے تو میں نے ایک پتریکا نکال لی۔

چنتا منی : اچھا تو سونا، پتریکا کانام ہے۔ تمھیں اس کا سمپادن کرتے ہو۔

موٹے رام : جب سے میں نے یہ پتریکا نکالی ہے۔ ہندی سنسار میں ہل چل پڑ گئی ہے ابھی اسے نکالے تین مہینے بھی پورے نہیں ہوئے، لیکن گراہک سنکھیا 25 ہزار سے اوپر ہو گئی۔ دھڑا دھڑ آڈر چلے آرہے ہیں۔ ڈاک خانے والوں نے کرمچاریوں کی سنکھیا بڑھا دی ہے۔

چنتا منی : جھوٹ بولتے ہو۔ سراسر جھوٹ سولہ آنے جھوٹ۔ 25 ہزار۔ ایشور سے بھی نہیں ڈرتے۔ بھلا 2500 کہتے تو ایک بات بھی تھی۔ جھوٹ بھی بولنے بیٹھے تو بولنا نہ آیا۔ موٹے رام نے ہنس کر کہا۔ یہی اور لوگ بھی کہتے ہیں۔ جو سنتا ہے دنگ رہ جاتا ہے۔ پر یہاں تو سچا کام کرتے ہیں جس کا جی چاہے رجسٹر دیکھ لے۔ 25 ہزار گراہک نہ نکلے۔ تو جو چور کی سزا وہ میری اور ابھی تو آرمبھ ہے اگر سال بھر میں ایک لاکھ تک سنکھیا نہ پہنچادوں تو موٹے رام نہیں۔ گراہکوں کی یہاں کمی نہیں ہے، کمی ہے کام کرنے والوں کی۔ سچے ڈھنگ سے کام کرنے والا چاہیے۔ پھر دیکھو، کیسے گراہک نہیں آتے۔ یہ سب کچھ وگیاپن کا کھیل ہے۔ دکھاؤں رجسٹر۔

چنتامنی : رجسٹر میں کوئی کاروائی کرلی ہوگی۔ فرضی نام لکھ لیے ہوں گے۔ بیچ میں کئی کئی نمبر چھوڑ گئے ہوں گے۔ میں اتنا مان سکتا ہوں کہ تم بڑے کاریہ کوشل ہو۔ میں تو اس کا چوتھائی بھی نہ کرسکتا۔ لیکن 25 ہزار کی سنکھیا۔ نہیں مل سکتی۔ تمھیں اتنے روپے کہاں سے مل گئے؟

موٹے رام : روپے نہ کہو۔ سب ایشور کی دیا ہے۔ یہی تو ایک ایسا سادھن ہے جس کے بنا ایک کوڑی گھر کی لگائے۔ تم ایک بہت بڑا ویوسائے کھڑا کر سکتے ہو۔ بس ذرا ڈھنگ چاہیے۔ کوڑی گھر سے لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کاغذ والے سے ادھار کاغذ لے لیا۔ پریس والوں سے ادھار چھپائی کرالی۔ بس بیڑا پار۔ روپے ملے، تو پریس اور کاغذ کو دو، نہیں تو کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھے رہو۔ کوئی تم سے کیا لے لے گا؟

چنتامنی : کاغذ والے اور پریس والے ادھار کیسے دیتے ہیں۔

موٹے رام : (ہنس کر) یہ دوسری وِدّیا ہے جو ایشور کی دین ہے۔ یہ پڑھنے سے نہیں آتی، نہ رٹنے سے کنٹھ ہوتی ہے۔ اسے پورجنم کا سنسکار ہی کہہ سکتے ہو۔

کاغذ والے سیٹھ سدھی لال کو جانتے ہی ہو کئی بار اس کے یہاں ہم تم اچھاپور بھوجن کر چکے ہیں۔ بھگت جیو ہے۔ اس سے کاغذ لیا۔ مانگنے کی دیر تھی۔ 500 سو کا کاغذ ٹھیلے پر لدوا دیا۔ چھاپہ خانہ ابھی اپنا نہیں ہے۔ ایک دوسرے چھاپہ خانے میں چھپوا

لیتا ہوں۔ پورے دو درجن ایجنٹ رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ نگروں اور گراموں میں جاجا کر میری پتریکا کا پرچار کرتے ہیں۔ کرمچاریوں کے ساتھ میرا نیم بڑا کٹھور ہے۔ انھیں ٹال بازی اتھوا کام چوری کرتے دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں۔ میری دیہہ میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ یہی جی چاہتا ہے کہ انھیں کچا ہی چبا جاؤں۔ نمک بھی نہ مانگوں۔ کتنے ہی تو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس میں بھی میرا ہی لابھ رہا۔ ان کا ویتن نہ دینا پڑا۔ کتنوں کو پیٹ چکا ہوں۔ مجھے دیکھ کر سب تھر تھر کانپتے ہیں۔ ابھی دس پانچ ایجنٹوں کی اور اوشیکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنے دوچار متروں کو رکھ دو۔ اچھا فائدہ ہے۔

چنتا منی : میرے متروں میں ایسے بہت کم ہیں جو تمھاری اس انیتی کو سہن کر سکیں۔ ادھر تم نے گھونسا تانا اور ادھر وہ تمھیں لے پڑیں گے۔ مگر یہ تو بتاؤ، تم پتریکا کا سمپادن کیسے کر لیتے ہو؟

موٹے رام : سمپادن کیسے کر لیتا ہوں بدھی سے اور کیسے؟

چنتا منی : تمھاری بدھی تو بہت تیور کبھی نہ تھی۔

موٹے رام : تم میری بدھی کی تیورتا کا انومان کیا خاک کروگے۔ جو آدمی بنا گانٹھ کی کھنجھی کوڑی خرچ کیے اتنا بڑا کاریالیہ کھول دے، اتنی بڑی پتریکا کا سمپادک ہوجائے، جس کا نام سمست دیش میں پھیل جائے، اس کے بدھیمان ہونے میں تم جیسے گدھوں کے سوا اور کسے سندیہہ ہوسکتا ہے۔

چنتا منی : یہ تو کائیاں پن ہے۔ میں ایسے بدھی نہیں کہتا۔

موٹے رام : اوہو۔ تم چاہے کائیاں پن کہو۔ چاہے جھانسے بازی کہو۔ چاہے دھورتتا (ٹھگی) کہو، پر میرے کوش میں اس کا نام بدھی ہے۔ کوئی کتنا ہی دھر ندھر ودوان اپنا لیکھ بھیجے۔ میں اس سے کچھ نہ کچھ سن شودھن اوشیہ کروں گا۔ دو چار جگہ لال قلم پھیر ہی دیتا ہوں۔ اس سے وِدّوانوں پر آتنک جم جاتا ہے۔ دو تین انوادک رکھ چھوڑے ہیں۔ وے بنگلا، گجراتی آدی بھاشاؤں کے لیکھ اور ٹپٹریاں انوواد کر لیتے ہیں۔ انھیں میں اپنے سمکپادکیہ وچاروں میں دیتا ہوں۔ ان پر لیکھک کا نام تو ہوتا نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاستری جی ہی

نے لکھا ہے۔ کسے اتنا اوکاش ہے کہ میرے لیکھوں کی چھان بین کرتا پھرے۔
میں نے بہت دنوں کے بعد سانسارک سپھلتا کا مول منتر کھوج پایا ہے، مگر تم
سے نہ بتاؤں گا۔

چنتامنی : کیوں متر، ہمیں سے یہ پردہ؟ میں نے تمھیں سدیو اپنا گرو مانا ہے اور اب
بھی اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ اور تم مجھی سے ایسی کر پڑتا کرتے ہو۔

موٹے رام : اچھا وچن دو کہ تم پتریکا کے 100 گراہک بنا لاؤ گے۔

چنتامنی : تمھاری آگیاں میں نے کبھی ٹالی ہے؟

موٹے رام : اچھا تو سنو، وہ مول منتر ہے ڈینگ مارنا۔ ایسے ڈینگ مارو کہ دوسرے
پربھاوت ہو جائیں۔ کوئی کتنا ہی اوشواس پرکٹ کرے۔ کتنی ہی ہنسی اڑاوے۔
کچھ پرواہ مت کرنا۔ تمھارے چلے جانے کے بعد وہ اپنے من میں سوچے گا کہ
اگر اتنے روپے میں ایک آنہ بھی ستیہ کہا ہے تب بھی کچھ کم نہیں۔ بس
زمین اور آسمان کے قلابے ملا دو۔ گراہک سنکھیا کبھی ایک لاکھ سے کم نہ بتلاؤ
خوب زور شور سے کہو کہ ہم نے پاشچاتیہ وِدوانوں سے لیکھ منگوانے کا آیوجن
کیا ہے۔ اپنے چتروں اور لیکھوں کو ادیوتیہ سدھ کرو، پھر دیکھو، گراہک کیسے
نہیں پنجے میں آتا۔ تم ذرا بھی جھجھکے اور کام بگڑا۔ ذرا دیر کے لیے اپنے کو
بھول جاؤ اور یہ سمجھو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ اکشرشہ ہے۔ تم نے
میری پتریکا دیکھی نہیں، اس میں سماج سدھار پر بڑے سوتنتر لیکھ رہتے ہیں۔

چنتامنی : سماج سدھار پر۔ پر تم سماج سدھارک کب سے ہوئے؟ تم تو بازار کی
پوریاں تک نہیں کھاتے۔

موٹے رام : اجی، یہ نہ پوچھو میں کیا کھاتا ہوں۔ اور کیسے رہتا ہوں اس کمرے میں
آکر میں سماج کا کٹر سدھارک ہو جاتا ہوں۔ اور گھر میں جاکر سدھار کا کٹر
شترو بنا۔ اس دورنگی چال کے سپھلتا کہاں۔ تم کو آشچریہ ہوگا میں نے ودھوا
وواہ کا سمرتھن کیا ہے۔ اچھوت اُدّھار کا بھی بیڑا اٹھایا ہے۔ اور سدھی کا بگل
بجایا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان سدھاروں سے ہندو سماج رساتل کی اور جارہا
ہے پر کروں کیا۔ کسی طرح بال بچوں کا پالن پوسن تو کرنا ہے۔

چنتا منی : یار تم بڑے دھورت ہو مان گیا تمھاری کھوپڑی کو۔

موٹے رام : اجی ابھی دیکھتے تو جاؤ۔ اب کی وگیاپن دوں گا کہ ہماری پتریکا کے بارہوں آنکیہ وشیشانک ہوں گے۔ سنسار کے بڑے سے بڑے پروشوں کو ان کا سمپادک لکھ دوں گا۔ کسی انک کا سمپادن ڈاکٹر ٹیگور کریں گے، کسی انک کا شری مان ڈاکٹر اقبال تھا کسی انک کا شنکر آچاریہ، کسی کا مسولینی، کسی کا قیصر، کسی کا لارڈ جارج۔

پھر دیکھو اس وگیاپن کی کیسی دھوم مچتی ہے۔

چنتامنی : اور یدی ان مہانو بھاؤں نے اپنا نام دینا سویکار نہ کیا تو؟

موٹے رام : یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ وے سویکار نہ کریں گے لیکن اس جھانسے میں آکر جو آدمی پتریکا کا گراہک بن جائے گا۔ وہ ہم سے اپنے روپے تو لوٹانے نہ آوے گا۔ دوسرے سال پھر کوئی ایسا ہی شگوفہ کھلا دوں گا۔

(2)

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھی کہ بھیتر سے سونا دیوی چھم چھم کرتی ہوئی نکل آئی۔ ان کے مکھ منڈل پر آج ایسی لونائی جھلک رہی تھی کہ چنتا منی جی چکت ہو گئے۔ سونا نے چنتا منی کو دیکھتے ہی کہا ارے لالا، بہت دنن ماسدھی لین ہو۔ اس کوؤ بھلائے دتے ہیں۔

چنتامنی : کیا کروں بھابھی جی ذرا تیرتھ کرنے چلا گیا تھا۔ کچھ پرلوک کی فکر بھی تو کرنی چاہیے۔

سونا : ارے ابھے تمھار عمرے کا ہے۔ جون لاگیو پرلوک کی فکر کریں۔ ابھی تو پچاسوں کی پور نہیں بھایو۔ ہمارے بھیا کا آج کل یہ نئی سنک سوار بھئی ہے کتنا سمجھایا ہے کہ اپھر پھنڈ میں نہ پرو، بھگوان جون بھاگ میں لکھے ہوئی تون آپوئی گھر بیٹھ مل جائی، مدُای اِی کیہ کی سُنت ہیں۔ انھوں پانچوں سوگاہکی پتر پکا کے ناہیں بھئے۔ تون چلائے لاگے کہ ہم رے تو پچیس ہزار گاہکی ہوئے گئے۔

موٹے رام : تمھیں یہاں کس نے بلایا جو ڈائین کی طرح سر پر سوار ہو گئیں۔ جاؤ اندر۔

چنتامنی : کیا ابھی پانچ سو گراہک بھی نہیں ہوئے؟ یہ تو مجھ سے بھی پچیس ہزار کہہ رہے تھے۔

سونا : ان کا بکے دیو۔ جھوٹائی ما تو ان کے پیران بست ہے۔

موٹے رام : تم یہاں سے جاؤگی یا نہیں؟

سونا : ناہیں۔ دیکھی کا کریت ہو۔ ہم سے اِی جبرجستی نہ چلے پائی، سمجھی راکھیو۔ سنسار کا ٹھگا کرو۔ ٹھگ کہوں کا۔ ہم کا آنکھی دکھاوت ہے۔ آنکھی پھوڑ دے ہوں۔ آج کرودھ ماں بھری بیٹھی ہوں۔ تمہیکا لاج نہیں آوت کہ اپنی پتریکا میں رانڈن کے وِواہ کی بات لکھت ہے۔ بیٹھی تو ہے ایک ٹھورانڈ بہنیا۔ کاہے ناہیں اوہی کا وِواہ کر ڈارت ہے۔ کہاں ہیں تو رے پچیس ہجار گاہکی۔ دیکھوں نقلی رجسٹر بنائے کے سب کا دکھاوت پھرت ہیں۔ لالہ تم سے اِلہے گن کاؤ کہی۔ اب اِی داروپیے لاگ۔

چنتامنی : ارے سچ رام رام

موٹے رام : میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔

سونا : رام جانے۔ دارو پیت ہے بوتلن داروپی ڈارت ہے۔ چورون کی تروں انگریزی دوکان میں جات ہے اور جیب میں بوتل رکھ کے بھاگت ہے۔ اصل چور کہت ہے کہ اِکہے پیئے سے بدھیہ باڑھت ہے۔ بھوجن پچت ہے مزہ آوت ہے۔ تورے مزہ ماں لوکا لاگے۔ بدھی رانڈ کہاں لو باڑھی کا۔ مُدار ہو جائی۔ اے ہی کے مارے ناک ماں دم ہوئی رہا ہے۔

چنتامنی : یہ تمھیں کیا سوجھی متر بھنگ تو چڑھاتے ہی تھے۔ کیا اتنا نشہ کم تھا؟

موٹے رام : آجی بکنے دو اس کو۔ اس کی بدھی تو گھاس کھانے گئی ہے۔

سونا : آب چپے رہو، ناہیں۔ تمھارا سب کی کرتوت کھول کے دھر دے ہوں۔ لالہ بھگوان کے گھر اے ہی کی نہ جانے کون درگت ہوئی۔ ای تون پرائی مہرین پر ڈورا ڈارت پھرت ہے۔ رانی کے ہواں کیس ماری پری رہی، پراہی آنکھی نہ کھلی نہ کھلی ای سمپادک بنا پھرت ہے سماج کا سودھارت ہے، سب کا راہ دکھاوت ہے۔ اُپدیش کرت ہے اور آپن ای ہوال۔ کاغذ والے کے پانچ سو

روپیہ مونڈ پر سوار ہے۔ چھاپا خانہ والا گھر کھودے ڈارت ہے، پر اسے ہی کا
اپنے راگ رنگ سوجھی ہے فکرن کے مارے میں مری جات ہوں۔

چنتا منی : یہ بات تو نہیں ہے بھابھی جی۔ ایسا نمک تو کبھی نہ دیکھا تھا۔

سونا : (ترچھی چتون سے دیکھ کر) تین تین ٹھور تو گھر ما بیٹھی ہے۔ ان کے نمک
دیکھ کے جیوں بھر گواکا؟ کہے دیت ہوں، ہم نہ لاگیو، ناہیں ایک کے سو
سنہیوں، آؤ تم کا ان مسرچند کی جھائی دکھائی۔ اصلی رجسٹر دوسری کوٹھری ماں
چورائے کے راکھے ہیں جہیا کوؤ دیکھی نہ لے۔ آؤ۔

چنتامنی تو یہ چاہتے ہی تھے چٹ اٹھ کھڑے ہوئے لیکن شاستری جی بھی غافل
نہ تھے انھوں نے لپک کر چنتا منی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بے چارے چنتامنی آفت میں
پھنس گئے۔ ایک اور سونا ان کے ہاتھ کو پوری شکتی سے اپنی اور کھینچ رہی ہے۔
دوسری اور موٹے رام جی پورا زور لگا رہے ہے۔ چنتا منی کو ایسا جان پڑا کہ دونوں
ہاتھ ہی اکھڑے جاتے ہیں زور زور سے چلانے لگے۔

سونا : اچھا لالا تم ان کاخوب کس کے پکڑے رہیو۔ ہم رجسٹر لیے آہت ہے چھوڑ یونہ
دونوں متر زمین پر پڑے ہوئے اپنی اپنی بانی کی ویرتا دکھا رہے تھے اور سونا
گرہکوں کا رجسٹر لیے چنتا منی کو دکھا رہی تھی۔ چنتا منی نے دیکھا۔ 480 اتم سنکھیا تھی
بولے، کیوں متر ہم سے اڑتے تھے کہو تو اسی بات پر گردن ناپوں؟

موٹے رام : یہ استری میرے پوروجنموں کا سنچت پاپ ہے۔ بس کچھ نہیں۔ اب
ہماری لاج تمھارے ہاتھ ہے۔ کسی سے کہنا مت۔

چنتامنی : نہیں متر کیا میں ایسا مورکھ ہوں لیکن ایک بات آوشیہ کہوں گا پتریکا پر
میرا نام بھی ڈالنا پڑے گا۔ ہم اور تم دونوں سمپادک ہوں گے تم اپنا نام چاہے
اوپر ہی رکھ یہ میرا نام بھی نیچے دو۔ بولو، سویکار ہے؟

موٹے رام نے گمبھیر بھاؤ سے کہا۔ ہاں سویکار ہے۔

یہ کہتی ہوئی وہ تو کوٹھری میں گئی ادھر دونوں متروں میں مل یدھ ہونے لگا۔

موٹے رام : ہڈی توڑ ڈالوں گا۔

چنتامنی : کھود کے گاڑ دوں گا

موٹے رام : پیس ڈالوں گا۔

چنتا منی : چٹنی بنا دوں اگ۔

موٹے رام : پیٹ پھاڑدوں گا۔

چنتا منی : ناک توڑ دوں گا۔

(یہ افسانہ ہندی ماہنامہ مادھوری اگست ستمبر 1928 میں شائع ہوا۔ ہندی کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ ابھی تک اردو میں شائع نہیں ہوا۔ پریم چند کے اپراپیہ ساہتیہ میں شامل ہے۔)

خودی

منی جس وقت دلدار نگر میں آئی۔ اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ ماں باپ دونوں نہ معلوم مر گئے یا کہیں پردیس چلے گئے تھے۔ منی صرف اتنا جانتی تھی کہ کبھی ایک دیوی اسے کھلایا کرتی تھی اور ایک دیوتا اسے کندھے پر لے کر کھیتوں کی سیر کرایا کرتا تھا۔ پر وہ ان باتوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتی تھی۔ گویا اس نے خواب دیکھا ہو خواب تھا یا واقعہ اس کا اسے علم نہ تھا۔ جب کوئی پوچھتا تیرے ماں باپ کہاں گئے؟ تو وہ بے چاری کوئی جواب دینے کے بجائے رونے لگتی اور یوں ہی سوالوں کو ٹالنے کے لیے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر کہتی۔ اوپر کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی وہاں۔ اس اوپر۔ اور وہاں سے اس کا مطلب کیا تھا یہ کسی کو معلوم نہ ہوتا۔ شاید منی کو یہ خود ہی معلوم نہ تھا۔ بس ایک دن لوگوں نے اسے ایک پیڑ کے نیچے کھیلتے دیکھا اور اس سے زیادہ اس کی بابت کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔

لڑکی کی صورت بہت پیاری تھی جو اسے دیکھتا موہ جاتا۔ اسے کھانے پینے کی کچھ فکر نہ رہتی تھی۔ جب کوئی بلا کر کچھ دیتا۔ وہیں کھالیتی اور پھر کھیلنے لگتی۔ شکل و صورت سے وہ کسی اچھے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ غریب سے غریب گھر میں بھی اس کے کھانے کو دو لقمے اور سونے کے ایک ٹاٹ کے ٹکڑے کی کمی نہ تھی۔ وہ سب کی تھی۔ اس کا کوئی نہ تھا۔

اس طرح کچھ دن بیت گئے۔ منی اب کچھ کام کرنے کے قابل ہوگئی۔ کوئی کہتا ذرا جاکے تالاب سے یہ کپڑے تو دھولا۔ منی بے عذر دھونے کو چلی جاتی۔ لیکن راستے میں کوئی اسے بلا کر کہتا۔ بیٹی! کنویں سے دو گھڑے پانی تو کھینچ لا تو وہ کپڑے وہیں رکھ گھڑے لے کر کنویں کی طرف چل دیتی۔ کنویں پر کوئی کہہ دیتا۔ ذرا کھیت سے جاکر تھوڑا سا ساگ تو لے آ اور منی گھڑے وہیں رکھ کر ساگ لینے چلی جاتی۔ پانی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی عورت اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی۔ کنویں پر جاکر دیکھتی ہے تو گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ مُنی کو گالیاں دیتی ہوئی کہتی۔ آج سے اس

کل موہی کو کچھ کھانے کو نہ دوں گی۔ کپڑے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی عورت اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی اور غصہ میں تالاب کی طرف جاتی تو راستہ میں کپڑے پڑے ہوئے ملتے۔ تب وہ بھی اسے گالیاں دے کر کہتی۔ آج سے اسے کچھ کھانے کو نہ دوں گی اس طرح منی کو کبھی کبھی کچھ کھانے کو نہ ملتا اور تب اسے بچپن یاد آیا۔ جب وہ کچھ کام نہ کرتی تھی اور لوگ اس سے بلا کر کھانا کھلا دیتے تھے۔ وہ سوچتی کس کا کام نہ کروں جسے جواب دوں وہی ناراض ہو جائے گا۔ میرا اپنا کون ہے؟ میں تو سب کی ہوں۔ اس غریب کو یہ نہ معلوم تھا کہ جو سب کا ہوتا ہے وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ وہ دن کتنے اچھے تھے جب اسے کھانے پینے کی اور کسی کی خوشی یا خوشی کی پرواہ نہ تھی۔ بخت سیاہ میں بھی بچپن کا وہ زمانہ چین کا تھا۔

کچھ دن اور گذرے منی جوان ہو گئی۔ اب تک وہ عورتوں کی تھی۔ اب مردوں کی ہوگئی۔ وہ سارے گاؤں کی معشوقہ تھی پر کوئی اس کا محبوب نہ تھا۔ سب اس سے کہتے تھے میں تم پر مرتا ہوں۔ تمھارے فراق میں تارے گنتا ہوں۔ تم میرے دل وجان کی مراد ہو پر اس کا سچا محبوب کون ہے؟ اس کی اسے خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی اس سے یہ نہ کہتا تھا کہ تو میری رنج و غم کی شریک ہو جا۔ سب اس سے اپنا خانۂ دل آباد کرنا چاہتے تھے۔ سب اس کی نگاہ پر ایک تبسم زیر لب پر قربان ہوجانا چاہتے تھے۔ پر کوئی اس کی بانہہ پکڑنے والا اس کی لاج رکھنے والا نہ تھا وہ سب کی تھی۔ اس کی محبت کے دروازے سب پر کھلے ہوئے تھے پر کوئی اس پر اپنا قفل نہ ڈالتا تھا جس سے معلوم ہوتا کہ یہ اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔

وہ بھولی بھالی لڑکی جو ایک دن نہ جانے کہاں سے بھٹک کر آگئی تھی۔ اب اس گاؤں کی ملکہ تھی۔ جب وہ اپنا فراخ سینہ ابھار کر غرور حسن سے گردن اٹھائے نزاکت سے لچکتی ہوئی چلتی تو منچلے نوجوان دل تھام کر رہ جاتے اس کے پیروں تلے آنکھیں بچھاتے۔ کون تھا جو اس کے اشارے پر اپنی جان نہ نثار نہ کردیتا۔ وہ یتیم لڑکی جسے کبھی گڑیاں کھیلنے کو نہ ملیں اب دلوں سے کھیلتی تھی۔ کسی کو مارتی تھی۔ کسی کو جلاتی تھی۔ کسی کو ٹھکراتی تھی۔ کسی کو تھپکیاں دیتی تھی۔ کسی سے روٹھتی تھی۔ کسی کو مناتی تھی۔ اس کھیل میں اسے سفاکانہ مزا آتا تھا۔ اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ پہلے وہ سب کی

تھی۔ کوئی اس کا نہ تھا۔ اب سب اس کے تھے۔ وہ کسی کی نہ تھی۔ اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ کہیں نہ ملتی تھی۔ کسی میں وہ ہمت نہ تھی جو اس سے کہتا۔ آج سے تو میری ہے اس پر دل نثار کرنے والے بہتیرے تھے۔ سچا رفیق ایک بھی نہ تھا۔ اصل میں وہ ان آشفتہ سروں کو حقیر سمجھتی تھی۔ کوئی اس کی محبت کے قابل نہ تھا۔ ایسے پست ہمتوں کو وہ کھلونوں سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتی تھی۔ جس کا مارنا اور جلانا ایک دلچسپ مشغلہ سے زیادہ نہیں۔

جس وقت کوئی نوجوان مٹھائیوں کے خوان اور پھولوں کے ہار لیے اس کے سامنے آکر کھڑا ہوجاتا تو اس کا جی چاہتا منہ نوچ لوں۔ اسے وہ چیزیں زہر ہلا ہل سی لگتیں۔ ان کی جگہ وہ روکھی روٹیاں چاہتی تھی۔ سچی محبت میں ڈوبی ہوئی زیوروں اور اشرفیوں کے انبار اسے بچھو کے ڈنک سے لگتے۔ ان کی جگہ وہ سچی تہ دل سے نکلی ہوئی باتیں چاہتی تھی۔ جن میں الفت کی بو اور خلوص کا نغمہ ہو۔ اسے رہنے کو محل ملتے تھے۔ پہننے کو ریشم۔ کھانے کو غذائے لطیف۔ پر وہ ان چیزوں کی طالب نہ تھی۔ وہ طالب تھی پھوس کے جھونپڑے، موٹے چھوٹے گاڑھے اور روکھے سوکھے کھانے کی۔ اسے اثبات روح سوز سے نفی روح پرور کہیں زیادہ مرغوب تھی۔ فضا کے مقابلہ میں کنج قفس کہیں زیادہ مطلوب۔

(2)

ایک دن ایک پردیسی گاؤں میں آنکلا۔ بہت ہی کمزور خستہ حال آدمی تھا۔ ایک پیڑ کے نیچے ستو کھا کر لیٹا ہوا تھا۔ دفعتاً مُنی اوپر سے جانکلی۔ مسافر کو دیکھ کر بولی۔ کہاں جاؤگے؟

مسافر نے بے رخی جواب دیا۔ جہنم۔

منی نے مسکرا کر کہا۔ کیوں کیا دینا میں جگہ نہیں۔

اوروں کے لیے ہوگی میرے لیے نہیں۔

دل پر کوئی چوٹ لگی ہے؟

مسافر نے زہر خندہ کرکے کہا اور بدنصیبوں کی تقدیر میں کیا ہے؟ رونا دھونا اور ڈوب مرنا۔ یہی ان کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ پہلی دو منزلیں تو طے کر چکا اب تیسری

منزل اور باقی ہے کوئی دن وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ ایشور نے چاہا تو بہت جلد!

یہ ایک چوٹ کھائے دل کے الفاظ تھے۔ ضرور اس کے پہلو میں دل ہے ورنہ غیرت کہاں سے آتی۔ منی بہت دنوں سے دل کی تلاش کررہی تھی۔ بولی کہیں اور وفا کی تلاش کیوں نہیں کرتے؟

مسافر نے مایوسانہ انداز میں جواب دیا۔ ''میری تقدیر میں نہیں۔ ورنہ میرا کیا بنا بنایا آشیانہ آجڑ جاتا۔ دولت میرے پاس نہیں۔ حسن میرے پاس نہیں۔پھر وفا کی دیوی مجھ پر کیوں مہربان ہونے لگی؟ پہلے سمجھتا تھا وفا دل کے بدلے ملتی ہے اب معلوم ہوا اور جنسوں کی طرح وہ بھی زور جواہر سے خریدی جاسکتی ہے۔

منی کو معلوم ہوا میری نظروں نے دھوکا کھایا تھا مسافر سیہ فام نہیں صرف سانولا تھا۔ اس کے خط وخال بھی اسے دلاویز معلوم ہوئے۔ بولی نہیں۔ یہ بات نہیں۔ تمھارا پہلا خیال صحیح تھا۔

یہ کہہ کر منی چلی گئی۔ اس کے دل کے جذبات اس کی قوت ضبط سے باہر ہورہے تھے۔ مسافر کسی خیال میں محو ہوگیا وہ اس حسینہ کی باتوں پر غور کررہا تھا۔ کیا سچ مچ یہاں وفا ملے گی؟ کیا یہاں بھی تقدیر فریب نہ دے گی؟

مسافرنے رات اسی گاؤں میں کاٹی۔ وہ دوسرے دن بھی نہ گیا۔ تیسرے دن اس نے ایک پھونس کا ایک جھونپڑا کیا۔ منی نے پوچھا یہ جھونپڑا کس کے لیے بناتے ہو؟

مسافر نے کہا۔ جس سے وفا کی اُمید ہے۔

چلے تو نہ جاؤ گے؟

جھونپڑا تو رہے گا؟

خالی گھر میں بھوت رہتے ہیں؟

اپنے پیارے کا بھوت بھی پیارا ہوتا ہے۔

دوسرے دن منی اس جھونپڑے میں رہنے لگی۔ لوگوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ منی اس جھونپڑی میں نہیں رہ سکتی۔ وہ اس بھولے مسافر کو ضرور دغا دے گی یہ عام خیال تھا لیکن منی پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ نہ کبھی اتنی حسین نظر آئی تھی نہ اتنی خوش اسے ایک ایسا انسان مل گیا تھا۔ جس کے پہلو میں دل تھا۔

(3)

لیکن مسافر کو دوسرے دن یہ فکر پیدا ہوئی۔ کہیں یہاں بھی وہی روزسیاہ نہ دیکھنا پڑے حسن میں وفا کہاں؟ اسے یاد آیا۔ پہلے بھی اس قسم کی باتیں ہوئی تھیں ایسے ہی عہدوپیان ہوئے تھے۔ مگر ان کچے دھاگوں کو ٹوٹتے کتنی دیر لگی؟ دودھاگے کیا پھر نہ ٹوٹ جائیں گے؟ اس مرہم سے بھی اس کے جگر کا زخم نہ بھرا۔ تیسرے دن وہ تمام دن مغموم اور متفکر بیٹھا رہا اور چوتھے دن وہ لا پتہ ہوگیا۔ اس کی یادگار صرف اس کی پھوس کی جھونپڑی رہ گئی۔

منی دن بھر اس کی راہ دیکھتی رہی اسے اُمید یہ تھی کہ وہ ضرو آئیں گے لیکن مہینوں گزر گئے اور مسافر نہ لوٹا۔ کوئی خط بھی نہ آیا لیکن منی کو اُمید تھی وہ ضرور آئیں گے۔

سال گزر گیا۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں نکلیں۔ پھول کھلے۔ پھل لگے۔ کالی گھٹائیں آئیں بجلی چمکی یہاں تک کہ [illegible]ما بھی گزر گیا اور مسافر نہ لوٹا۔ مگر منی کو اب بھی اس کے آنے کی امید تھی۔ وہ ذرا بھی متفکر نہ تھی۔ ذرا بھی خائف نہ تھی۔ وہ دن بھر مزدوری کرتی اور شام کو جھونپڑے میں پڑرہتی لیکن وہ جھونپڑا اب تک محفوظ قلعہ تھا جہاں آشفتہ سروں کا بھی پائے نگاہ لنگ ہوجاتا تھا۔

ایک دن وہ سر پر لکڑی کا گٹھا لیے چلی آتی تھی۔ ایک رسیا نے چھیڑخانی کی منی کیوں اپنے نازک جسم کے ساتھ یہ ستم کرتی ہو؟ تمھاری ایک نگاہ کرم پر اس لکڑی کے برابر سونا صدقے کر سکتا ہوں۔

منی نے روح شکن حقارت کے ساتھ کہا۔ تمھارا سونا تمھیں مبارک ہو۔ یہاں اپنی محنت کا بھروسہ ہے۔

کیوں اتنا اتراتی ہو۔ اب وہ لوٹ کر نہ آئے گا۔

منی نے اپنے جھونپڑے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ وہ گیا کہاں جو لوٹ کر آئے گا۔ میرا ہوکر پھر وہ کہاں جا سکتا ہے؟ وہ میرے سینہ میں بیٹھا ہوا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک عاشق تن نے کہا۔ تمھارے لیے میرا محل حاضر ہے اس ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں کیا پڑی ہو؟

منی نے غرور کے ساتھ کہا اس جھونپڑے پر ایک لاکھ محل نثار ہیں یہاں میں نے وہ چیز پائی ہے جو اور کہیں نہیں ملی تھی اور نہ مل سکتی ہے یہ جھونپڑا نہیں ہے میرے پیارے کا دل ہے۔

اس جھونپڑے میں منی نے ستر سال کاٹے۔ مرنے کے دن تک اسے مسافر کے لوٹنے کی اُمید تھی۔ اس کی آخری نگاہیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کے خریداروں میں کچھ تو مرگئے۔ کچھ زندہ ہیں۔ مگر جس دن سے وہ ایک کی ہوگئی۔ اسی دن سے اس کے چہرہ پر وہ نورانی جلوہ نمودار ہوا۔ جس کی طرف تاکتے ہی نگاہ ہوس بے نور ہوجاتی تھی۔ خودی جب بیدار ہوجاتی ہے تودل کی کمزوریاں اس کے قریب آتے ڈرتی ہیں۔

(یہ افسانہ پہلی بار 'خاک پروانہ' تمبر 1928 میں شائع ہوا۔ ہندی میں اسے گپت دھن 2 میں شامل کیا گیا ہے۔)

بوہنی

(1)

اس دن جب میرے مکان کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ایک پانوں کی دکان کھلی تو میں باغ باغ ہو اُٹھا۔ ادھر ایک فرلانگ تک پان کی کوئی دکان نہ تھی۔ اور مجھے سڑک کے موڑ تک کئی چکر کرنے پڑتے تھے۔ کبھی وہاں کئی کئی منٹ تک دکان کے سامنے کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ چوراہہ ہے۔ گاہکوں کا ہردم ہجوم رہتا ہے۔ یہ انتظار کی زحمت بہت ناگوار گزرتی تھی۔ پان کی لت مجھے کب پڑی اور کیسے پڑی، یہ تو اب یاد نہیں آتا۔ لیکن اگر کوئی بنا بنا کر گلوریاں دیتا جاوے تو شاید میں کبھی انکار نہ کروں۔ آمدنی کا بڑا حصہ نہیں تو چھوٹا حصہ ضرور پانوں کی نذر ہوجاتا ہے۔ کئی بار ارادہ کیا کہ ایک پاندان خریدلوں۔ لیکن پاندان خریدنا کوئی خالہ جی کا گھر تو نہیں ہے۔ اور پھر میرے لیے تو ہاتھی خریدنے سے کسی طرح کم نہیں۔ اور بالفرض جان پر کھیل کر ایک بار خرید بھی لوں تو پاندان کوئی پری کی تھیلی تو نہیں کہ ادھر خواہش ہوئی اور گلوریاں نکل پڑیں۔ بازار سے پان لانا۔ دن میں پانچ بار پھیرنا۔ پانی سے ترکرنا۔ سڑے ہوئے ٹکڑوں کو تراش کر الگ کرنا۔ کیا کوئی آسان کام ہے میں نے بڑے گھروں کی عورتوں کو ہمیشہ پاندان کی دیکھ بھال اور انصرام و اہتمام ہی میں مصروف پایا ہے۔ اتنا درد سر اٹھانے کی صلاحیت ہوتی تو آج میں بھی آدمی ہوتا اور اگر کسی طرح یہ مشکل بھی حل ہوجائے تو چھالیا کون کاٹے؟ یہاں تو سروتے کی صورت دیکھتے ہی لرزہ آتا ہے۔ جب کبھی ضرورت ناگہانی لاحق ہوئی ہے تو سل پر بٹے سے توڑلیا کرتا ہوں۔ لیکن سروتے سے کام لوں یہ غیر ممکن ہے۔مجھے تو کسی کو چھالیا کاٹتے دیکھ کر اتنی ہی حیرت ہوتی ہے جتنی کسی کو تلوار کی دھار پر ناچتے دیکھ کر۔ اور بفرض محال یہ عقدہ بھی حل ہوجائے تو آخری منزل کون فتح کرے کتھے اور چونے کا ہموزن کرنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ کم سے کم مجھے تو اس کا سلیقہ نہیں۔ جب اس معاملہ میں وہ لوگ روز غلطیاں کرتے ہیں جو اس فن میں مشاق اور ماہر ہیں، تو بھلا میں کس شمار وقطار میں

ہوں۔ تمولی نے اگر چونا زیادہ کردیا تو کتھا اور لے لیا۔ اس پر اُسے ایک ڈانٹ بھی بتائی۔ آنسو پُنچھ گئے۔ مصیبت کا سامنا تو اس وقت ہوتا ہے۔ جب کسی دوست کے گھر جائے۔ پان اندر سے آیا تو بجز اس کے کہ جان کر مکھی نگلیں۔ عمداً زہر کا گھونٹ حلق کے نیچے اُتاریں اور چارہ ہی کیا ہے۔ شکایت نہیں کر سکتے۔ تہذیب مانع ہوتی ہے۔ کبھی کبھی پان منہ میں ڈالتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبان پر کوئی چنگاری پڑگئی۔ حلق سے سینہ تک کسی نے پارہ گرم دیا۔ مگر گھٹ کر رہ جانا پڑتا ہے۔ اس حد تک اندازہ میں غلطی ہوجائے۔ یہ تو قرین قیاس نہیں۔ میں لاکھ اناڑی ہوں۔ لیکن کبھی اس کثرت سے چونا نہیں ڈالتا۔ ہاں دوچار چھالے پڑجاتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں، یہی اندرون خانہ کے قہر کا اظہار ہے۔ آخر وہ آپ کی زیادتیوں اور بے عنوانیوں کا وِپُرٹسٹ کیوں کر کریں۔ مقاطعہ خاموشی سے آپ راضی نہیں ہوتے۔ اور اسلحہ ان کے ہاتھ میں ہے نہیں۔ کمان ابرو اور نیزۂ مژگاں اور تفنگ تبسم اس وقت قطعاً اثر نہیں کرتے۔ جب آپ آنکھیں لال کیے آستینیں سمیٹے اس لیے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں کہ ناشتہ اور پہلے کیوں نہیں تیار ہوا۔ سالن میں نمک اور پان میں چونا زیادہ کرنے کے سوا انتقام کا ان کے ہاتھ میں اور کیا ذریعہ رہ جاتا ہے۔

خیر، تین چار دن کے بعد ایک دن میں صبح کے وقت تمبولن کی دکان پر گیا تو اس نے میری فرمائش کی تعمیل میں زیادہ مستعدی نہ ظاہر کی۔ ایک منٹ تک تو پان پھیرتی رہی پھر اندر چلی گئی اور کوئی مسالہ لیے ہوئے نکلی۔ میں دل میں خوش ہوا کہ آج بڑے اہتمام سے گلوریاں بنارہی ہے۔ مگر اب بھی وہ سڑک کی طرف منتظر نگاہوں سے تاک رہی تھی۔ گویا دکان کے سامنے کوئی گاہک ہی نہیں اور گاہک بھی کیسا؟ جو اس کا ہمسایہ ہے اور دن میں بیسیوں ہی بار آتا ہے۔ تب تو میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔ میں کتنی دیر سے کھڑا ہوں کچھ اس کی بھی خبر ہے؟

تمبولن نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ہاں بابوجی آپ کو دیر تو بہت ہوئی۔ لیکن ایک منٹ اور ٹھہر جایئے۔ برا نہ مانیئے گا بابوجی! آپ کے ہاتھ کی بوہنی اچھی نہیں ہے کل آپ کی بوہنی ہوئی تھی۔ دن بھر میں کُل چھ آنے کی بکری ہوئی۔ پرسوں بھی آپ ہی کی بوہنی ہوئی تھی آٹھ آنے کے پیسے دکان میں آئے تھے۔ اس کے پہلے دو

دن پنڈت جی کی بہنی ہوئی تھی۔ دوپہر تک ڈھائی روپے آگئے تھے۔ کبھی کسی کا ہاتھ نہیں اچھا ہوتا بابو جی۔!

مجھے گولی سی لگی۔ مجھے اپنی خوش نصیبی کا دعویٰ نہیں ہے۔ مجھ سے بدنصیب دنیا میں کم ہوں گے۔ اس اقلیم کا اگر میں بادشاہ نہیں تو کوئی اعلیٰ منصب دار ضرور ہوں۔ لیکن یہ میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ نحوست کا داغ برداشت کرلوں۔ کوئی مجھ سے بہنی نہ کرائے۔ لوگ صبح کو میرا منہ دیکھنا شگون سمجھیں یہ تو طوق لعنت ہے۔

میں پان تو لے لیا۔ لیکن دل میں پکار عہد کرلیا کہ اس نحوست کے داغ کو مٹا کر ہی چھوڑوں گا۔ ابھی اپنے کمرہ میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ میرے ایک دوست آگئے۔ بازار سبزی ترکاری لینے جارہے تھے۔ میں نے ان سے اپنی تمبولن کی خوب تعریف کی۔ وہ حضرت ذرا حسن پرست تھے اور ظریف بھی۔ میری طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے، اس وقت تو بھئی میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور نہ ابھی پانوں ہی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا، پیسے مجھ سے لے لو۔

''ہاں یہ منظور ہے۔ مگر کبھی تقاضا مت کرنا۔''

''یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔''

''تو کیا مفت میں کسی کے منظور نظر بننا چاہتے ہو؟''

مجبور ہو کر ان حضرت کو ایک ڈھولی پان کے دام دیئے۔ اسی طرح جو مجھ سے ملنے آیا۔ اس سے میں نے اپنی تمبولن کا بکھان کیا۔ احباب نے میری خوب ہنسی اُڑائی، مجھ پر خوب پھبتیاں کسیں۔ مجھے چھپے رستم، بھگت جی، اور جانے کیا کیا لقب عطا ہوئے لیکن میں نے ساری آفتیں ہنس کر ٹالیں۔ یہ داغ مٹانے کی مجھے دھن سوار ہوگئی تھی۔

دوسرے دن جب میں تمبولن کی دکان پر گیا تو اس نے فوراً پان بنائے اور مجھے دیتی ہوئی بولی۔ بابو جی کل تو آپ کی بہنی بہت اچھی ہوئی۔ کوئی ساڑھے تین روپے آئے۔ اب روز بہنی کرا دیا کرو۔

(2)

تین چار دن متواتر میں نے دوستوں سے سفارشیں کیں۔ تمبولن کا قصیدہ پڑھا اور اپنی گرہ سے پیسے خرچ کرکے سرخروئی حاصل کی۔ لیکن اتنے ہی دنوں میں میرے

خزانہ میں قابل محسوس کمی واقع ہوگئی۔ یہ سوانگ اب زیادہ مدت تک نہ چل سکتا تھا۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کچھ دنوں اس کی دوکان سے پان لینا چھوڑ دوں۔ جب میری بہنی ہی نہ ہوگی، تو مجھے اس کی بکری کی کیا فکر ہوگی۔ دوسرے دن ہاتھ منہ دھو کر میں نے ایک الائچی کھالی اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ لیکن آدھ گھنٹہ مشکل سے گزرا ہوگا کہ کسی کی آہٹ ملی۔ آنکھ اوپر کو اٹھاتا ہوں تو تمبولن گلوریاں لیے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ مجھے اس وقت اس کا آنا نہایت شاق گزرا۔ لیکن اتنی بے مروتی بھی تو نہ ہو سکتی تھی کہ دھتکار دوں۔ بولا تم نے ناحق تکلیف کی میں تو آہی رہا تھا۔

تمبولن نے میرے ہاتھ میں گلوریاں رکھ کر کہا۔ ''آپ کو دیر ہوئی تو میں نے کہا۔ میں ہی چل کر بہنی کر آؤں، دکان پر گاہک کھڑے ہیں۔ مگر کسی کی بہنی نہیں کی۔

کیا کرتا۔ گلوریاں کھائیں اور بہنی کرائی جس فکر سے نجات چاہتا تھا۔ وہ پھر تسمہ پا کی طرح گردن پر چمٹی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا میرے احباب دو چار دن تک اس کے ہاں پان کھائیں گے تو آپ ہی اس سے مانوس ہو جائیں گے اور میری سفارش کی ضرورت نہ رہے گی۔ مگر تمبولن شاید پانوں کے ساتھ اپنے حسن کا بھی کچھ مول کرتی تھی۔ اس لیے ایک بار جو اس کی دکان پر گیا دو بارہ نہ گیا۔ دو ایک رنگین مزاج نوجوان ابھی تک آتے تھے۔ وہ لوگ ایک ہی ہنسی میں پان اور دیدار حسن کا لطف اٹھا کر چلتے بنے تھے۔ آج مجھے اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے پھر پورے ڈیڑھ روپے خرچ کرنے پڑے، بدھیا بیٹھ گئی۔

دوسرے دن میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مگر جب تمبولن نے نیچے سے چیخنا چلانا اور کھٹکھٹانا شروع کیا تو مجبوراً دروازہ کھولنا پڑا۔ آنکھیں ملتا ہوا نیچے گیا جس سے معلوم ہو کہ آج نیند آگئی تھی پھر بہنی کرانی پڑی اور پھر وہی بلا سر پر سوار ہوئی۔ شام تک دو روپے کا صفایا ہوگیا۔ آخر اس بلائے عظیم سے نجات پانے کی یہی ایک تدبیر رہ گئی کہ وہ گھر چھوڑدوں۔

(3)

میں نے وہاں سے دو میل پر ایک غیر معروف محلّہ میں ایک مکان ٹھیک کیا۔ اور راتوں رات اسباب اٹھوا کر وہاں جا پہنچا۔ وہ گھر چھوڑ کر میں جتنا خوش ہوا۔ شاید

قیدی جیل خانہ سے نکل کر بھی اتنا خوش نہ ہوتا ہوگا۔ رات کو خوب گہری نیند سویا۔ سویرا ہوا تو مجھے اس طائر کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ جس کے پر کھل گئے ہوں۔ بہ اطمینان سگریٹ پیا منہ ہاتھ دھویا۔ پھر اپنا سامان قرینہ سے رکھنے لگا۔ کھانے کے لیے کسی ہوٹل کی بھی فکر تھی۔ مگر اس بلاوہمت شکن پر فتح پاکر مجھے جو مسرت ہو رہی تھی۔ اس کے مقابلہ میں ان فکروں کا کوئی شمار نہ تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر نیچے اترا۔ آج کی ہوا میں بھی آزادی کا نشہ تھا۔ ہر ایک چیز مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خوش خوش ایک دکان پر جاکر پان کھائے اور زینہ پر چڑھ ہی رہا تھا کہ دیکھا وہ تمبولن چپکی چلی آرہی ہے۔ کچھ نہ پوچھو اس وقت دل پر کیا گزری۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ اپنا اور اس کا دونوں کا سر پھوڑ لوں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایسی خوش ہوئی جیسے کوئی دھوبی اپنا کھویا گدھا پا گیا ہو اور میری سراسیمگی کا اندازہ بس اُسی گدھے کی دماغی حالت سے کر لو۔ اس نے دور ہی سے کہا واہ بابوجی واہ! آپ ایسا بھاگے کہ کہیں کو پتہ بھی نہ لگا۔ اُسی محلے میں ایک سے ایک اچھے گھر کھالی ہیں مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کو اس گھر میں تکلیف تھی۔ نہیں تو میرے پچھواڑے ہی ایک بڑے آرام کا مکان تھا۔ میں آپ کو یہاں نہ رہنے دوں گی۔ جس طرح ہو سکے گا۔ آپ کو اٹھا لے جاؤں گی۔ آپ اس گھر کا کیا کرایہ دیتے ہیں"؟

میں نے رونی صورت بنا کر کہا دس روپے۔

میں نے سوچا تھا کہ کرایہ اتنا کم بتاؤں جس میں یہ دلیل اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس گھر کا کرایہ بیس روپے ہے۔ دس روپے میں تو شاید مرنے کو بھی جگہ نہ ملے گی۔ مگر تمبولن پر اس چکمہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بولی، اس ذرا سے گھر کے دس روپے! آپ آٹھ ہی دیجیے گا اور گھر اس سے اچھا نہ ہو تو جب جی چاہے چھوڑ دیجیے گا۔ چلیے میں اس گھر کی کنجی لیتی آئی ہوں۔ اسی وقت آپ کو دکھا دوں۔

میں نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ آج ہی تو اس گھر میں آیا ہوں۔ آج ہی چھوڑ کیسے سکتا ہوں۔ پیشگی کرایہ دے چکا ہوں۔

تمبولن نے دلربایانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ دس ہی روپے تو دیے ہیں۔ آپ کے لیے دس روپے کون بڑی بات ہے۔ یہی سمجھ لیجیے کہ آپ نہ چلے تو میں اجڑ جاؤں

گی۔ ایسی اچھی بہنی وہاں اور کسی کی نہیں ہے۔ آپ نہ چلیں گے تو میں ہی اپنی دکان یہاں اٹھا لاؤں گی۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ یہ اچھی مصیبت گلے پڑی۔ کہیں سچ مچ یہ چڑیل اپنی دکان نہ اٹھا لائے۔ میرے جی میں تو آیا کہ ایک پھٹکار بتاؤں۔ پر زبان اتنی بے مروت نہ ہو سکی۔ بولا میرا کچھ ٹھیک نہیں۔ کب تک رہوں۔ کب تک نہ رہوں۔ آج ہی تبادلہ ہو جائے تو بھاگنا پڑے۔ تم نہ ان اِدھر کی رہو نہ اُدھر کی۔ اس نے حسرتناک لہجہ میں کہا۔ آپ چلے جائیں گے تو میں بھی چلی جاؤں گی۔ ابھی آج تو آپ جاتے نہیں۔

"میرا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو میں روز یہاں آکر بہنی کرا لیا کروں گی۔"

"اتنی دور روز آؤ گی؟"

"ہاں چلی آؤں گی، دو میل تو نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ کی بہنی تو ہو جائے گی۔ یہ لیجیے گلوریاں لائی ہوں بہنی تو کرا دیجیے۔"

میں نے گلوریاں لیں، پیسے دیئے اور ایک نیم غشی کی حالت میں اوپر چارپائی پر لیٹ گیا۔

اب میری عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ اس مصیبت سے کیوں کر گلوخلاصی ہو۔ تب سے اسی فکر میں پڑا ہوا ہوں۔ کوئی راہ مفر نظر نہیں آتی۔ سرخرو بھی رہنا چاہتا ہوں۔ بے مروتی بھی نہیں کرنی چاہتا اور اس مصیبت سے نجات بھی پانا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی صاحب میری قابل رحم حالت پر مجھے کوئی ایسی تدبیر بتلادیں تو زندگی بھر ان کا ممنون رہوں گا۔

(یہ افسانہ پہلی بار الہ آباد کے ہندی اخبار 'بھارت' کے 7 اکتوبر 1928 کے شمارے میں شائع ہوا۔ گپت دھن نمبر 2 میں شامل ہے۔ اَپراپت ساہتیہ میں بھی شامل ہے۔ اردو میں یہ 'پریم چالیسی' میں شائع ہوا۔)

ابھیلاشا

کل پڑوس میں بڑی ہلچل مچی۔ ایک پان والا اپنی استری کو مار رہا تھا۔ وہ بے چاری بیٹھی رو رہی تھی، پر اس نردئی کو اس پر لیش ماتر بھی دیا نہ آتی تھی۔ آخر استری کو بھی کرودھ آگیا۔ اس نے کھڑے ہوکر کہا۔ بس اب مارو گے، تو ٹھیک نہ ہوگا۔ آج سے میرا تم سے کوئی سمبندھ نہیں۔ میں بھیکھ مانگوں گی، پر تیرے گھر نہ آؤں گی۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی ایک پرانی ساڑی اٹھائی اور گھر سے نکل پڑی۔ پروش کاٹھ کے الو کی طرح کھڑا دیکھتا رہا۔ استری کچھ دور چل کر پھر لوٹی اور دوکان کی صندوقچی کھول کر کچھ پیسے نکالے۔ شاید ابھی تک اسے ممتا تھی۔ پر اس نردئی نے ترنت اس کا ہاتھ پکڑ کر پیسے چھین لیے۔ ہائے ری ہردے ہینتا! ابلا استری کے پرتی پروش کا یہ اتیاچار! ایک دن اسی استری پر اس نے پران دیے ہوں گے، اس کا منھ جوہتا رہاہوگا۔ پر آج اتنا نشٹھر ہوگیا ہے۔ مانو کبھی پہچان ہی نہیں۔ استری نے پیسے رکھ دیے اور بنا کہے سنے چلی گئی۔ کون جانے کہاں! میں اپنے کمرے کی کھڑی سے گھنٹوں دیکھتی رہی کہ شاید وہ پھر لوٹے یا شاید پان والا ہی اسے منانے جائے۔ پر دو میں سے ایک بات بھی نہ ہوئی۔ آج مجھے استری کی سچی دشا کا پہلی بار گیان ہوا۔ یہ دوکان دونوں کی تھی۔ پروش تو مٹر گشتی کیا کرتا تھا۔ استری رات دن بیٹھی ستی ہوتی تھی۔ دس گیارہ بجے رات تک میں اسے دوکان پر بیٹھی دیکھتی تھی۔ پراتہ کال نیند کھلتی تب بھی اسے بیٹھی پاتی۔ نوچ کھسوٹ کاٹ پیٹ جتنا پروش کرتا تھا، اس سے کچھ ادھک ہی استری کرتی تھی۔ پر پروش سب کچھ ہے، استری کچھ نہیں۔ پروش جب چاہے اسے نکال باہر کر سکتا ہے۔

اس سمسّیا پر میرا چت اتنا اشانت ہو گیا کہ نیند آنکھوں سے بھاگ گئی۔ بارہ بج گئے بیٹھی رہی۔ آکاش پر نرمل چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ نشاناتھ اپنے رتن جٹل سنگھاسن پر گرو سے پھولے بیٹھے تھے۔ بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دھیرے دھیرے چندرما کے سمیپ آتے تھے اور پھر وکرت روپ میں پرتھک ہو جاتے تھے، مانو شویت وسنا سندریاں اس کے ہاتھوں دلت اور اپمانت ہوکر رودن کرتی ہوئی، چلی جارہی ہوں۔

اس کلپنا نے مجھے اتنا وِکل کیا کہ میں نے کھڑکی بند کردی اور پلنگ پر آبیٹھی۔ میرے پریتم ندرا (نیند) میں مگن تھے۔ ان کا تیج مے مکھ منڈل اس سمے مجھے کچھ چندرما سے ہی ملتا جلتا معلوم ہوا۔ وہی سہاس چھوی تھی جس سے میرے نیتر ترپت ہو جاتے تھے۔ وہی وشال وکھش تھا۔ جس پر سر رکھ کر میں اپنے انت استھل میں ایک کومل مدھر کنپن کا انوبھو کرتی تھی۔ وہی سدرڑھ باہیں تھیں، جو مرے گلے میں پڑ جاتی تھیں تو میرے ہردے میں آنند کی ہلوریں سی اٹھنے لگتی تھیں۔ پر آج کتنے دن ہوئے، میں نے اس مکھ پر ہنسی کی اُجول ریکھا نہیں دیکھی، نہ دیکھنے کو چت ویاکل ہی ہوا۔ کتنے دن ہوئے، میں نے اس وِکھش پر سر نہیں رکھا اور نہ وہ باہیں میرے گلے میں پڑی۔ کیوں؟ کیا میں کچھ اور ہو گئی، یا پتی دیو ہی کچھ اور ہو گئے۔

ابھی کچھ بہت دن بھی تو نہیں بیتے، کل پانچ سال ہوئے ہیں۔ کل پانچ سال، جب پتی دیو نے وکست نیتروں اور للائت ادھروں سے میرا سواگت کیا تھا۔ میں لجا سے گردن جھکائے ہوئے تھی۔ ہردے میں کتنی پربل اُت کنٹھا ہو رہی تھی کہ ان کی مکھ چھوی دیکھ لوں، پر لجاوش سر نہ اٹھا سکتی۔ آخر ایک بار میں نے ہمت کر کے آنکھیں اٹھائی اور یدیپی درشٹی آدھے راستے سے ہی لوٹ آئی، تو بھی اس اردھ درشن سے مجھے جو آنند ملا کیا اسے کبھی بھول سکتی ہوں۔ وہ چتر اب بھی میرے ہردے پٹ پر کھنچا ہواہے۔ جب کبھی اس کا اسمرن آجاتا ہے۔ ہردے پلکت ہو اٹھتا ہے۔ اس آنند اسمرتی میں اب بھی وہی گدگدی، وہی سنسنی ہے۔ لیکن اب رات دن اس چھوی کے درشن کرتی ہوں۔ اوشا کال، پراتہ کال، مدھیا کال، سندھیا کال، نشا کال آٹھوں پہر اس کو دیکھتی ہوں، پر ہردے میں گدگدی نہیں ہوتی۔ وہ میرے سامنے کھڑے مجھ سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ میں کروشیے کی اور دیکھتی رہتی ہوں۔ جب وہ گھر سے نکلتے تھے، تو میں دوار پر آکر کھڑی ہو جاتی تھی اور جب وہ پیچھے پھر کر مسکرادیتے تھے تو مجھے مانو سورگ کا راجیہ مل جاتا تھا۔ میں تیسرے پہر کوٹھے پر چڑھ جاتی تھی اور ان کے آنے کی باٹ جوہنے لگتی تھی۔ ان کو دور سے آتے دیکھ کر میں انمت سی ہوکر نیچے آتی اور دُوار پر جا کر ان کا ابھیوادن کرتی۔ پر اب مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کب جاتے اور کب آتے ہیں۔ جب باہر کا دوار بند ہوجاتا ہے تو سمجھ جاتی ہوں کہ وہ

چلے گئے، جب دوار کھلنے کی آواز آتی ہے تو سمجھ جاتی ہوں کہ آگئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ہی کچھ اور ہوگئی یا پتی دیو ہی کچھ اور ہوگئے۔

وہ گھر میں بہت نہ آتے تھے۔ جب ان کی آواز کانوں میں آجاتی تو میری دیہہ میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں، چھوٹے چھوٹے کاموں کو بھی میں انورکت، مگدھ نیتروں سے دیکھا کرتی تھی۔ وہ جب چھوٹے لالہ کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے تھے، جب ٹامی کا سر تھپتھپا کر اسے لٹا دیتے تھے، جب بوڑھی بھکتن کو چڑھا کر باہر بھاگ جاتے تھے، جب بالٹیوں میں پانی بھر بھر پودوں کو سینچتے تھے، تب یہ آنکھیں اُسی اُور لگی رہتی تھیں۔ پر اب وہ سارے دن گھر میں رہتے ہیں، میرے سامنے ہنستے ہیں، بولتے ہیں، مجھے خبر بھی نہیں ہوتی۔ نہ جانے کیوں؟

تب کسی دن انھوں نے پھولوں کا ایک گلدستہ میرے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔ اور مسکرائے تھے۔ وہ پرانے کا اپہار پاکر میں پھولی نہ سمائی تھی۔ کیول تھوڑے سے پھول اور پتیاں تھی، پر انھیں دیکھنے سے میری آنکھیں کسی بھانتی ترپت ہی نہ ہوتی تھیں۔ کچھ دیر ہاتھ میں لیے رہی، پھر اپنی میز پر پھول دان میں رکھ دیا۔ کوئی کام کرتی ہوتی، تو بار بار اگر اس گل دستے کو دیکھتی جاتی۔ کتنی بار اسے آنکھوں سے لگایا۔ کتنی بار اسے چوما، کوئی ایک لاکھ روپے بھی دیتا تو اسے نہ دیتی۔ اس کی ایک ایک پنکھڑی میرے لیے ایک ایک رتن تھی۔ جب وہ مرجھا گیاتو میں نے اسے اٹھا کر اپنے بکس میں رکھ دیا تھا۔ تب سے انھوں نے مجھے ہزاروں چیزیں اپہار میں دی ہیں۔ ایک سے ایک رتن جٹل آبھوشن ہیں، ایک سے ایک بہومولیہ وستر ہیں اور گل دستے تو پرایہ نتیہ ہی لاتے ہیں لیکن ان چیزوں کو پاکروہ الاس نہیں ہوتا۔ میں ان چیزوں کو پہن کر آئینے میں اپنا روپ دیکھتی ہوں اور گرو سے پھول اٹھتی ہوں۔ اپنی ہمجولیوں کو دکھا کر اپنا گورو اور ان کی ایرشیا بڑھاتی ہوں۔ بس۔

ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں، انھوں نے مجھے وہ چندر ہار دیا ہے۔ جو اسے دیکھتا ہے موہت ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس کی بناوٹ اور سجاوٹ پر مگدھ ہوں۔ میں نے اپنا صندوق کھولا اور گل دستے کو نکال لائی۔ آہ۔ اسے ہاتھ میں لیتے ہی میری ایک ایک نس میں بجلی دوڑ گئی۔ ہردے کے سارے تار کنپت ہوگئے۔ وہ سوکھی ہوئی

پنکھڑیاں جو اب پیلے رنگ کی ہوگئی تھی بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے سوکھے مرجھائے ہوئے مکھوں کے اسکھوٹ کنپت انوراگ میں ڈوبے شبد سائیں سائیں کرکے نکلتے ہوئے جان پڑتے تھے۔ کنتو وہ رتن جٹل کانتی سے دمکتا ہوا ہارسورن اور پتھروں کا ایک سموہ تھا، جن میں پران نہ تھے۔ سنکیانہ تھی، مرم نہ تھا۔ میں نے پھر گل دستے کو چوما کنٹھ سے لگایا آردر نیتروں سے کھینچا اور پھر صندوق میں رکھ آئی۔ آبھوشنوں سے بھرا ہوا صندوق بھی اس ایک اسرتی چنھ کے سامنے تچھ تھا۔ یہ کیا رہسیہ تھا؟

پھر مجھے ان کے پرانے پتر کی یاد آگئی۔ اسے انھوں نے کالج سے میرے پاس بھیجا تھا۔ اسے پڑھ کر میرے ہردے میں جو آنند ہوا تھا، جو طوفان اٹھا تھا آنکھوں سے جو ندی بہی تھی کیا اسے کبھی بھول سکتی ہوں۔ اس پتر کو میں نے اپنے سہاگ کی پٹاری میں رکھ دیا تھا۔ اس سے اس پتر کو پڑھنے کی پر بل اچھا ہوئی۔ میں نے پٹاری سے وہ پتر نکالا۔ اسے اسپرش کرتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ ہردے میں دھڑکن ہونے لگی۔ میں کتنی دیر اسے ہاتھ میں لیے کھڑی رہی کہہ نہیں سکتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں وہی ہو گئی ہوں، جو پتر پاتے سمے تھی۔ اس پتر میں کیا پریم کے کوپتی سے اڈگار تھے؟ کیا پریم کی ساہتیک وویچنا تھی۔ کیا ویوگ ویتھا کا کرن کرندن تھا؟ اس میں تو پریم کا ایک شبد بھی نہ تھا۔ لکھا تھا۔ کامنی تم نے آٹھ دنوں سے کوئی پتر نہیں لکھا۔ کیوں نہیں لکھا؟ اگر تم مجھے پتر نہ لکھوں گی تو میں ہولی کی چھٹیوں میں گھر نہ آؤں گا۔ اتنا سمجھ لو۔ آخر تم سارے دن کیا کیا کرتی ہو۔ میرے اپنیاسوں کی الماری کھول لی ہے کیا؟ آپ نے میری الماری کیوں کھولی؟ سمجھتی ہوگی میں پتر نہ لکھوں گی تو بچا خوب روئیں گے اور حیران ہوں گے یہاں اس کی پرواہ نہیں، نو بجے رات کو سوتا ہوں تو آٹھ بجے اٹھتا ہوں۔ کوئی چنتا ہے، تو یہی کہ فیل نہ ہو جاؤں۔ اگر فیل ہوا تو تم جانو گی۔

کتناسرل، بھولے بھولے ہردے سے نکلا ہوا، نشکپٹ مان پورن آگرہ اور آتنک سے پتر بھرا ہوا تھا، اس کا سرا اتردائتیوا میرے ہی اوپر تھا۔ ایسی دھمکی کیا اب بھی وہ مجھے دے سکتے ہیں؟ کبھی نہیں۔ ایسی دھمکی وہی دے سکتا ہے جو نہ مل سکنے کی ویتھا کو جانتا ہو۔ اس کا انوبھو کرتا ہو۔ پتی دیو اب جانتے ہیں، اس دھمکی کا مجھ پر کوئی اثر نہ

ہوگا۔ میں ہنسوں گی اور آرام سے سوؤں گی، کیونکہ میں جانتی ہوں، وہ اوشیہ آئیں گے، اور ان کے لیے ٹھکانا ہی کہاں ہے؟ جاہی کہاں سکتے ہیں؟ تب سے انھوں نے میرے پاس کتنے پتر لکھے ہیں۔ دو دن کو بھی باہر جاتے ہیں، تو ضرور ایک پتر بھیجتے ہیں اور جب دس پانچ دن کو جاتے ہیں، تو نتیہ پرتی ایک پتر آتا ہے۔ پتروں میں پریم کے چنے ہوئے شبد، چنے ہوئے واکیہ، چنے ہوئے سنبودھن بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں انھیں پڑھتی ہوں اور ٹھنڈی سانس لے کر رکھ دیتی ہوں۔ ہائے۔ وہ ہردے کہاں گیا؟ پریم میں ان نرجیو بھاؤ شونیہ کرترم شبدوں میں وہ اکھلتا کہاں ہے؟ وہ رس کہاں ہے، وہ انماد کہاں ہے، وہ کرودھ کہاں ہے؟ وہ جھنجھلاہٹ کہاں ہے؟ ان میں میرا من کوئی وستو کھوجتا ہے کوئی آگیات اویکت، لکشھت، وستو۔ پر وہ نہیں ملتی۔ ان میں سوگندھ بھری ہوتی ہے، پتروں کے کاغذ آرٹ پیپر کو مات کرتے ہیں، پر ان کا یہ سارا بناؤ سنوار کسی گت یونا نائکا کے بناؤ سنگھار کے سدرش ہی لگتا ہے کبھی کبھی تو میں پتروں کو کھولتی بھی نہیں۔ میں جانتی ہوں، ان میں کیا لکھا ہوگا۔

انھیں دنوں کی بات ہے، میں نے تیجے کا ورت کیا تھا۔ میں نے دیوی کے سمکھ سر جھکا کر وندنا کی تھی۔ دیوی، میں تم سے کیول ایک وردان مانگتی ہوں۔ ہم دونوں پرانیوں میں کبھی وچھید نہ ہو،اور مجھے کوئی ابھی لاشا نہیں، میں سنسار کی اور وستو نہیں چاہتی۔ تب سے چار سال ہوگئے ہیں۔ اور ہم میں ایک دن کے لیے بھی وچھید نہیں ہوا۔ میں نے تو کیول ایک وردان مانگا تھا۔ دیوی نے وردانوں کا بھنڈار ہی مجھے سونپ دیا۔ پر آج مجھے دیوی کے درشن ہوں، تو میں کہوں تم اپنے سارے وردان لے لو، میں ان میں سے ایک بھی نہیں چاہتی۔ میں پھر وہی دن دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب ہردے میں پریم کی ابھی لاشا تھی۔ تم نے سب کچھ دے کر مجھے اس اَتُل سکھ سے وَنچت کردیا، جو ابھی لاشا میں تھا، میں اب کی دیوی سے وہ دن دکھانے کی پرارتھنا کروں، جب میں کسی نرجن، جل تٹ اور سگھن ون میں اپنے پریتم کو ڈھونڈتی پھروں۔ ندی کی لہروں سے کہوں۔ میرے پریتم کو تم نے دیکھا ہے؟ ورکھشوں سے پوچھوں، مرے پریتم کہاں گئے؟ کیا وہ سکھ مجھے کبھی پراپت نہ ہوگا؟ اسی سے مند، شیتل، پون چلنے لگی۔ میں کھڑکی سے باہر سر نکالے کھڑی تھی۔ پَون کے جھونکے سے

مرے کیش کی لٹیں بکھرنے لگیں۔ مجھے ایسا آبھاس ہوا، مانو میرے پریتم وایو کے ان اُچھ٘واسوں میں ہیں۔ پھر میں نے آکاش کی اُور دیکھا۔ چاند کی کرنیں چاندی کے جگمگاتے تاروں کی بھانتی آنکھوں سے آنکھ مچونی سی کھیل رہی تھیں۔ آنکھیں بند کرتے سے سامنے آجاتیں، پر آنکھیں کھولتے ہی ادرشیہ ہوجاتی تھیں۔ مجھے اس سے ایسا آبھاس ہوا کہ میرے پریتم انھیں جگمگاتے تارے پر بیٹھے آکاش سے اتر رہے ہیں۔ اسی سے کسی نے گایا۔

انوکھے سے نیہی کے تیاگ
نرالے پیڑا کے سنسار!
کہاں ہوتے ہو انتر دھان
لٹا کر کے سونے سا پیار!

یہ پد میرے مرم ستھل کو تیر کی بھانتی چھیدتا ہوا کہاں چلا گیا، نہیں جانتی۔ میرے روئیں کھڑے ہوگئے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پریتم کو میرے ہردے سے نکالے لیے جاتا ہے۔ میں زور سے چلا پڑی۔ اسی سے پتی دیو کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ میرے پاس آکر بولے۔ کیا ابھی تم چلائی تھیں؟ ارے۔ تم رو رہی ہو؟ کیا بات ہے؟ کوئی سوپن تو نہیں دیکھا؟ میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ روؤں نہ، تو کیا ہنسوں، سوامی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ کیوں، رونے کو کوئی کارن ہے، یا یوں ہی رونا چاہتی ہو؟

کیا میرے رونے کا کارن تم نہیں جانتے؟
میں تمھارے دل کی بات کیسے جان سکتا ہوں؟
تم نے جاننے کی چیشٹا کبھی کی ہے؟
مجھے اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ تمھارے رونے کا کوئی کارن ہو سکتا ہے۔
تم نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ کیا تم بھی ایسی بات کہہ سکتے ہو؟
سوامی نے وسمیہ میں پڑ کر کہا۔ تم تو پہیلیاں بجھواتی ہو؟
کیوں، کیا تم کبھی نہیں روتے؟
میں کیوں رونے لگا۔

تمھیں اب کوئی ابھی لاشا نہیں ہے؟

میری سب سے بڑی ابھی لاشا پوری ہوگئی۔ اب میں اور کچھ نہیں چاہتا۔

یہ کہتے ہوئے پتی دیو مسکرائے اور مجھے گلے سے لپٹا لینے کو بڑھے۔

ان کی یہ ہردے ہنتا اس سمیہ مجھے بہت بری لگی۔ میں نے انھیں ہاتھوں سے پیچھے ہٹا کر کہا۔ میں اس سوانگ کو پریم نہیں سمجھتی۔ جو کبھی رو نہیں سکتا وہ پریم نہیں کر سکتا۔ رودن اور پریم دونوں ایک ہی سروت سے نکلتے ہیں۔

اسی سے پھر اسی گانے کی دھونی سنائی دی

انوکھے سے نیہی کے تیاگ

نرالے پیڑا کے سنسار

کہاں ہوتے ہو انتر دھان

لٹا کر کے سونے کا پیار

پتی دیو کی وہ مسکراہٹ لپت ہوگئی۔ میں نے انھیں ایک بار کانپتے دیکھا۔ ایسا جان پڑا۔ انھیں رومانچ ہو رہا ہے۔ سہسا ان کا داہنا ہاتھ اٹھ کر ان کی چھاتی تک گیا۔ انھوں نے لمبی سانس لی اور ان کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں نکل کر گالوں پر آگئی۔ ترنت میں نے روتے ہوئے ان کی چھاتی پر سر رکھ دیا اور پریم سکھ کا انوبھو کیا۔ جس کے لیے کتنے دنوں سے میرا ہردے تڑپ رہا تھا۔ آج پھر مجھے پتی دیو کا ہردے دھڑکتا ہوا سنائی دیا، آج ان کے اسپرش میں پھر اسھورتی کا گیان ہوا۔ ابھی تک اس پد کے شبد میرے ہردے میں گونج رہے تھے۔

کہاں ہوتے ہو انتر دھان

لٹا کر کے سونے سا پیار

(یہ افسانہ ہندی میں 'مادھوری' نومبر 1928 میں پہلی بار شائع ہوا۔ مان سروور4 میں شامل ہے۔ اردو میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔)

خونی

(1)

مایا اپنے تین منزلہ مکان کی چھت پر کھڑی سڑک کی اُور آتنک اور چنتت نیتروں سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ وہ اب تک آئے کیوں نہیں؟ کہاں دیر لگائی؟ اسی گاڑی سے تو آنے کو لکھا تھا۔ گاڑی تو کب کی آگئی۔ اسٹیشن سے مسافر چلے آرہے ہیں۔ اس وقت اور کوئی تو گاڑی بھی نہیں آتی۔ پھر کیا آج نہ آویں گے؟ نہیں، جھوٹے وعدے کرنے کی تو ان کی عادت نہیں ہے۔ شاید اسباب اتروانے میں دیر ہوگئی ہو یا یار دوست اسٹیشن ہی پر بدھائیاں دینے پہنچ گئے ہوں گے۔ ان سے فرصت ملے گی، تب تو گھر کی سدھ آئے گی۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو سیدھے گھر آتی۔ متروں سے کہہ دیتی، آپ لوگ اس سے چھما کریں، گھر پر ملیے گا، پر دوستوں میں ان کی تو جان بستی ہے۔

مسٹر ویاس لکھنؤ کے ایک جوان، پر ادیمان بیرسٹروں میں ہے۔ تین مہینے سے وہ ایک راج نیتک ابھی یوگ کی پیروی کرنے کے لیے سرکار کی اور سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مایا کو لکھا تھا، وجے ہوگئی۔ پہلی تاریخ کو میں شام کی میل سے اوشیہ پہنچوں گا۔ آج وہی شام ہے۔ مایا نے آج سارا دن تیاریوں میں کاٹا، سارا مکان دھلوایا، کمروں کے سجاوٹ کے سامان صاف کرائے، موٹر دھلوائی، نانا پرکار کے بھوجن بنوائے۔ یہ تین مہینے اس نے تپسیا کر کے کاٹے تھے، پر جس کے لیے ساری تیاریاں کی، اس کا پتہ نہیں۔

اس کی چھوٹی بچی تیلوتما آکر اس کے پیروں سے چپٹ گئی اور بولی اماں بابو جی کب آئیں گے؟

مایا نے اسے گود میں اٹھا لیا اور سڑک کی اُور تاکتی ہوئی بولی، آتے ہی ہوں گے، بٹی۔ گاڑی تو کب کی آگئی۔"

تیلوتما نے ماتا کی گردن میں باہیں ڈال کر کہا، میرے لیے اچھی اچھی گڑیاں

لاتے ہوں گے۔ اُو ہو۔

مایا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نراشا اب کرودھ کا روپ دھارن کرتی جاتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ جس طرح یہ مہاشے مجھے دق کر رہے ہیں، اسی طرح میں بھی انھیں دق کروں گی۔ گھنٹے بھر تو بولوں گی ہی نہیں۔ آکر اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں تک آتے پیر کی مہندی چھوٹی جاتی ہے۔ کچھ نہیں، انھیں مجھ کو جلانے میں مزہ آتا ہے۔

ان کی یہ پرانی عادت ہے۔ اپنے من کو کیا کروں؟ نہیں، اچھا تو یہی ہوتی ہے جیسے وہ مجھ سے اداسین رہتے ہیں۔ ویسے ہی میں بھی ان کی بات نہ پوچھوں۔

سہسا ایک چوکی دار نے آکر کہا۔ بھوجی لاہور سے تار آیا ہے۔

مایا بھیتر ہی بھیتر جل اٹھی۔ ایسا جان پڑا جیسے کسی نے ہردے کو کچل دیا ہو۔ فوراً وچار ہوا۔ اس کے سِوا اور کیا لکھا ہوگا کہ اس گاڑی سے نہ آسکوں گا؟ تار دے دینا کون مشکل ہے؟ میں بھی کیوں نہ تار دے دوں کہ میں ایک مہینے کے لیے میکے جارہی ہوں۔

ورکت بھاؤ سے چوکی دار کی اور دیکھ کر مایا نے کہا، تار لے جاکر کمرے میں میز پر رکھ دو۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے لفافہ لے لیا اور کھولا ہی تھا کہ کاغذ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ لکھا تھا۔ مسٹر ویاس کو کسی بدمعاش نے دس بجے رات کو مار ڈالا۔

(2)

کئی مہینے گذر گئے، پر خونی کا اب تک کہیں پتہ نہیں۔ خفیہ پولیس کے کئی پرانے آدمی اس کا سوراغ لگانے کے لیے نیوکت ہیں۔ خونی کا پتہ دینے والے کو بیس ہزار روپے کا انعام دیے جانے کا وگیاپن دیا جاچکا ہے۔ پر سارے پریاس نشپھل ہو رہے ہیں۔ جس ہوٹل میں مسٹر ویاس ٹھہرے تھے۔ اسی میں ایک مہینے سے مایا ٹھہری ہوئی ہے۔ اس کمرے سے اسے پریم ہو گیاہے۔ اس کی صورت اتنی بدل گئی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی، پر اس پر دینتایا ویدنا کی جگہ، انماد کی پرچنڈتا جھلک رہی ہے۔ اس کی

مست آنکھوں میں اب خون کی پیاس ہے اور پرتی کار کی جوالا۔ یہی اس کے جیون کا دھیہ، اس کی سب سے بڑی ابھیلاشا ہے۔ جس پشاچ نے اس کا سروناش کر دیا، اسے اپنے سامنے تڑپتے دیکھ کر ہی اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ پولیس سام، دام، دنڈ، بھید سے کام لے رہی ہے، کنتو مایا نے اپنے ابھیشٹ کی سدّھی کے لیے ایک اور ہی سادھنا کا آشریہ لیا ہے۔ مسٹر ویاس کو پریت ودھیا کا شوق تھا۔ ان کی صحبت میں مایا کو بھی کچھ ابھیاس ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کے لیے یہ منورجن کا وشے تھا۔ پر اب یہی اس کا ایشٹ ہو گیا تھا۔ وہ نتیہ پرتی تیلوتما پر اس کا ابھیاس کرتی تھی۔ وہ اس دن کا انتظار کر رہی تھی، جب وہ اپنے پتی کی آتما کا آواہن کر کے اس سے گھاتک کا سوراغ لگا سکے گی۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ مایا نے کمرے میں اندھیرا کر لیا تھا اور تیلوتما پر پریوگ کر رہی تھی۔ سہسا اسے کمرے میں کسی بجھتے ہوئے دیپک کے انتم آلوک کے سادرش کسی وستو کے اُوترت ہونے کا ابھیاس ہوا۔ مایا نے پوچھا، آپ کون ہیں؟

تیلوتما نے ہنس کر کہا، کیا اتنا جلد بھول گئی؟ میں تمھارا من موہن ہوں۔"

" آپ خوب آئے؟ میں آپ سے آپ کے ہتیارے کا نام پوچھنا چاہتی ہوں۔"

" اس کا نام ہے ایشور داس۔"

کہاں رہتا ہے؟"

" شاہجہاں پور"

مایا نے محلے کا نام، مکان کا نمبر، روپ، رنگ، سب کچھ وستار سے پوچھ کر ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا۔ ایک چھن بھر تیلوتما انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ جب کمرے میں پھر پرکاش ہوا تو مایا کا مکھ منڈل وجے کے اُلاس سے پردیپت ہو اٹھا تھا۔ اسی رات کو مایا شاہجہاں پور کے لیے روانہ ہو گئی۔

(3)

مایا کی ایک بہن شاہجہاں پور میں رہتی تھی۔ ایشور داس کا پتہ لگانے میں کوئی

کٹھنائی نہ ہوئی۔ مایا کو بھے تھا کہ کہیں پریتاتما بتلائی ہوئی باتیں متھیا نہ ہوں اس لیے
جب اسے ایشور داس کا گھر ملا تو اس کا ہردے انند مشرت بھے سے کانپ اٹھا۔ کلپنا
جگت کی بات سمکھ آگئی۔ اب اس کر تبیہ کو پورا کرنا پڑے گا۔ جو پر تیکھش ہو کر اور
بھی کٹھور ہو گیا ہے۔

مایا نے ایشور داس کے گھر کے پاس ہی ایک گھر کرایے پر لے لیا ہے۔ تیلوتما
اکثر کھیلتی ہوئی ایشور داس کے پاس چلی جاتی ہے۔ ایشور داس اوواہت ہے۔ تیلوتما کو
دیکھتا ہے تو گود میں اٹھا لیتا ہے اور کھلانے لگتا ہے۔ خونی کے جتنے لکھشن آتما نے
بتلائے تھے وہ سب موجود ہیں۔ وہی پہناوا ہے، وہی روپ رنگ ہے، وہی مدرا ہے،
وہی بات چیت کرنے کا ڈھنگ ہے۔ لیکن مایا کو کبھی کبھی سندھیہ ہونے لگتا ہے کہ
کہیں اسے بھرم نہ ہو رہاہو۔ ایشورداس اتنا سجّن، اتنا ہنس مکھ، اتنا نرم، اتنی خدمت
کرنے والا آدمی ہے کہ اس کے ہاتھوں کسی کا مارا جانا اسمبھو سا معلوم ہو تاہے۔

ایک بار یتلوتما کو تھوڑا بجور ہو آیا۔ پھر معلوم ہوا میعادی بخار ہے۔ ان دس بارہ
دنوں میں ایشور داس نے جتنی دوڑ دھوپ کی، اتنی شاید خود بیرسٹر صاحب بھی نہ
کر سکتے۔ تیلوتما رات کو بہت بے چین ہو جاتی تھی، ہاتھ پاؤں پٹکتی، بک جھک کرتی۔
تب مایا گھبرا جاتی کہ کہیں بچی کو سرسام نہ ہو رہا ہو۔ اس سمے وہاں ایشور داس کے سوا
اور کون تھا۔ جو آڑے پر کام آتا؟ کبھی کبھی تو مایا بدحواس ہو کر خود دوڑی ہوئی جاتی
اور اسے بلالاتی۔ اس کی آواز سنتے ہی ایشور داس بھاگا چلا آتا اور یا تو اسی وقت وید
کے پاس جاتا یا تیلوتما کو گود میں اٹھا کر ٹہلانے لے جاتا۔

مایا کو اب ایشور داس سے کوئی پردا نہ تھا، کوئی جھجھک نہ تھی۔ ایسے دیا کے پتلے
بھی کیا کسی کا خون کر سکتے ہیں؟ مایا کا سندھیہ دن دن بڑھتا جاتا تھا جب تک اسے
نشچت روپ سے نہ ثابت ہوجائے گا کہ یہی خونی ہے، وہ کیول سندھیہ پر اسے پران
دنڈ نہ دے گی دے ہی نہیں سکتی۔

ایک دن تیلوتما کی طبیعت کچھ اچھی تھی۔ وہ ذرا سا دودھ پی کر سو گئی تھی
ایشور داس اس کے پاس ہی ایک موڑے پر بیٹھا ہوا اسے پنکھا جھل رہا تھا اور مایا کھڑی

اس کے منہ کی اور دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی جھنجھلا رہا تھا کہ ایشور داس سے کیوں اس کی جان پہچان ہوئی۔ آج اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہی خونی ہے، تو بھی کیا وہ اس کے اپکاروں کو بھول جائے گی؟ اس پر اس کے ہاتھ اٹھ سکیں گے؟

اس نے سشنک نیتروں سے ایشورداس کی اور دیکھا۔ وہ موڑے پر لیٹا لیٹا جھپکیاں لے رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ سے پنکھا چھوٹ کر گر پڑا، اس کا سر ایک اور جھک گیا اور اس کی ناک سے خراٹے کی آواز آنے لگی۔ مایا کو اس سے ایشور داس کی صورت دیکھ کر بھے سا لگا۔ نیند کی گود میں سکھ اور وشرام کا انوبھو کر کے آدمی کا چہرا، کچھ کھل جاتا ہے، لیکن ایشور داس کا چہرا کٹھور، اونڈ ہو گیا تھا۔

سہسا وہ برّا اٹھا، ہائے ہائے مارو مت، میں سب کچھ بتلادوں گا۔ سب کچھ

ایک منٹ تک اس کی صورت ایسی بگڑی رہی، مانو وہ کٹھور ویدنا سہہ رہا ہو۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھایا، مانو اپنے کو کسی کے وار سے بچا رہا ہو، اور برّانے لگا' ہاں وہ سڑک پر کھڑے تھے۔ رات کے دس بجے تھے۔ میں نے پیچھے سے جاکر مارومت مارومت، کہتا تو ہوں۔ جاکر انھیں گرا دیا"۔

یہ کہتے کہتے ایشور داس چونک پڑا، اس کی آنکھیں کھل گئی۔ اس نے انگڑائی لے کر کہا۔ کیا میں سوگیا تھا۔ مایا کی آنکھوں جوالا نکل رہی تھی۔ وہ کچھ نہ بولی ایشور داس نے کہا" بڑا بُرا خواب دیکھا"

مایا نے مانو قبر کے اندر سے کہا" آپ بہت تھک گئے ہیں۔ جاکر لیٹ رہیے"

ایشور : ہاں، آج سارا دن دوڑنا پڑا تھک گیا ہوں۔ کوئی ضرورت ہو تو پکار لیجیے گا۔"

ایشور داس جانے لگا تو مایا نے کہا، " آج یہیں نہ لیٹ رہیے مجھے بھی کچھ سردی لگ رہی ہے۔ شاید جور آجائے۔"

ایشور " اچھی بات ہے یہیں لیٹ رہوں گا کئی راتیں جاگنے سے آپ بھی تھک گئی ہیں۔ آپ نشچنت ہو کر سوجائیں مجھے کوئی ضرورت ہوگی تو پکار لوں گا۔"

(4)

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ایشور داس گہری نیند میں تھا اور مایا پستول لیے وچار

میں مگن کھڑی تھی۔ اس نے سمیپ آکر ایشور داس کو دھیان سے دیکھا۔ وہ غافل پڑا ہوا تھا۔ اس نے اندر جاکر پستول اٹھا لیا اور پھر باہر کے کمرے میں آئی۔ وہ ایسا نشانہ لگانا چاہتی تھی کہ وار خالی ہی نہ جائے پر اس کی ساری دیہہ کانپ رہی تھی۔ کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مانو سارا آسمان چکر کھا رہا ہے۔ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ وہاں اس کے سیوا اور کوئی نہ تھا۔ یہ جان کر بھی وہ ششنک نیتروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، مانو دیواروں کے بھی آنکھیں ہیں۔

سہسا اسے ایسا جان پڑا کہ اس کے پتی دیو سامنے کھڑے اس کی اور ترسکار کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ اب کیا کھڑی کانپ رہی ہو؟ اس سے اچھا اور کون موقع آئے گا؟ مایا نے ہونٹو کو دانتوں کو نیچے دبا لیا اور ایشور داس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

مگر ایشور داس کی آنکھیں کھل گئی تھی مایا کی آہٹ پاکر وہ چونکا اور سر اٹھا کر دیکھا تو خون سرد ہوگیا۔ مایا پستول کی نالی اس کی طرف کیے اسے ہنسا۔ بھاؤ سے دیکھ رہی ہے۔

وہ چار پائی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور گھبرا کر بولا کیا ہے۔ بہن یہ پستول کیوں؟

مایا نے کٹھور سور میں کہا، تم نے میرے پتی کو قتل کیا ہے "

ایشور داس کا مکھ پیلا پڑگیا۔ بولا میں نے ؟

"ہاں تم نے تمھیں نے لاہور میں میرے پتی کو مارا، جب وہ ایک مقدمے کی پیروی کرنے لاہور گئے تھے۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟ میرے پتی کی آتما نے سُویم تمھارا پتہ بتایا ہے

" توتم مسٹر ویاس کی پتنی ہو"

" ہاں میں ہی ان کی ابھاگنی پتنی ہوں اور تم میرا سہاگ لوٹنے والے ہو۔

تم نے میرے اوپر بڑے احسان کیے ہیں۔ میں انھیں نہ بھولوگی، لیکن احسانوں سے میرے دل کی آگ نہیں بجھ سکتی یہ تمھارے خون ہی سے بجھے گی"

ایشور داس ایک چھن تک شانت کھڑا رہا۔ پھر دین بھاؤ سے دیکھ کر" اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو لیجیے یہ سر حاضر ہے۔ اگر میرے خون سے آپ کے دل کی آگ بجھ جائے تو میں سوئم اسے آپ کے چرنوں پر گرا دوں گا۔ لیکن جس بھانتی آپ مجھے مارنا اپنا دھرم سمجھ رہی ہے اسی طرح میں نے بھی مسٹر ویاس کو مارنا اپنا دھرم سمجھا تھا۔ آپ کو معلوم ہے وہ ایک سرکاری مقدمے کی پیروی کرنے لاہور گئے ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے جس طرح پولیس کو جھوٹی گواہیاں بنانے میں مدد کی جس نردیتا سے بے کس اور بے بس یوکو کا سروناش کیا جس کوٹلتا سے نیتی اور نیائے کا گلا گھونٹا، اسے دیکھ کر میرا دل قابو سے باہر ہوگیا۔ میرے سر پر خون سوار ہوگیا۔ ان دنوں عدالت میں تماشا دیکھنے والوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ سبھی عدالت میں مسٹر ویاس کو گالیاں دیتے جاتے تھے۔ میں مقدمے کا رہسیہ خوب جانتا تھا، اس لیے مجھے گالیوں سے تسکین نہ ہو سکتی تھی۔ میں آپ سے کیا کہوں مسٹر ویاس جان بوجھ کر پولیس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے۔ وہ ان غریبوں کو اجلاس میں جس نردیتا سے ڈانٹتے تھے وہ سن کر میرے ہردے میں جوالا سی دہک اٹھتی تھی۔ آج کتنی ماتائیں اپنے لالوں کے لیے خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ کتنی دیویاں رنڈاپے کی آگ میں جل رہی ہیں۔ کیول اس لیے کہ مسٹر ویاس نے پولیس کے ہتھ کنڈوں کو سچا ثابت کردیا۔ پولیس کتنی ہی برائیاں کرے ہم پرواہ نہیں کرتے۔ اس کے سیوا پولیس سے ہم کوئی آشا ہی نہیں رکھتے۔ سرکار نے اس محکمے کو کھولا ہی اس لیے ہے کہ غریبوں کو تنگ کرے۔ جسے ذرا بھی سر اٹھا کر چلتے دیکھے کچل دے۔ مگر وکیلوں سے ہم نیائے کی آشا رکھتے ہیں۔ ہم ان کا آدر کرتے ہیں۔ انھیں اپنے سماج کا نیتا سمجھتے ہیں۔ جب ایسے آدمیوں کو ہم پولیس کی تالوں پر ناچتے دیکھتے ہیں تو یہی جی چاہتا ہے کہ ایسے دیش دروہیوں کا خون پی جائیں۔ میں مسٹر ویاس کا بڑا بھگت تھا۔ ایک بار میں ان کا واکھیان سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ مگر جب میں نے انھیں بے گناہوں کی گردن پر چھری پھرتے دیکھا تو مجھے ان سے گھرنا ہوگئی۔ بے چارے غریب ملزم رات رات بھر الٹے لٹکائے جاتے تھے۔ کیول اس لیے کہ جو اپرادھ انھوں نے کبھی نہیں کیا اسے سویکار کرلیں۔ ان کی ناک میں لال مرچ کا

دھواں ڈالا جاتا تھا۔ مسٹر ویاس یہ سارا اتیاچار کیول دیکھتے ہی نہ تھے بلکہ یہ سب کچھ انھیں کے اشارے سے ہوتا تھا۔"

مایا کھسانی ہوکر بولی، آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ انھوں نے لوگوں پر ایسے اتیاچار کیے؟

ایشورداس نے اچنبھت ہوکر کہا۔ وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہ تھی۔ لاہور کا بچہ بچہ جانتا ہے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے سوا میں اور کیا ثبوت دے سکتا ہوں کہ ان غریبوں کا اتنا ہی اپرادھ تھا کہ وہ بھارت کے سچے سیوک تھے۔ اپنا سارا سے سکشھا پرچار اور پروپ کار میں لگاتے تھے۔ خود ننگے جاتے تھے، پر غریبوں کو سختیوں سے بچاتے تھے۔ خود فاقے کرتے تھے۔ پر بھوکھوں کو کھلاتے تھے۔ یہی ان کا اپرادھ تھا۔ اسی اپرادھ کی سزا دلانے میں مسٹر ویاس پولیس کے داہنے ہاتھ بنے ہوئے تھے۔

مایا نے پستول زمین پر رکھ دیا اور سر جھکا کر سوچنے لگی۔ اس کا ناری ہردے اتیاچار کا یہ ورتانت سن کر کاتر ہو اٹھا۔ وہ جب کسی کوچ وان کو دیکھتی تھی کہ گھوڑے کو بے طرح پیٹ رہا ہے تو اسے کرودھ آتا تھا کہ کوچوان کو کوڑے لگوائے۔ کوئی پروش اپنی استری کو پیٹتا تھا تو یہ خبر سن کر اس کا چت اس استری کے لیے دکھی ہوجاتا تھا۔ لیکن جب اُسے معلوم ہو جاتا تھا کہ گھوڑا اڑیل ہے اور استری کلٹا تو اس کا کرودھ الٹ پڑتا تھا۔ یہی دشا اس سمے بھی اس کے من کی ہورہی تھی۔ ایشور داس نے پھر کہنا شروع کیا۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں آپ کے پستول سے ڈر کر مسٹر ویاس پر جھوٹے آکچھیپ کر رہا ہوں۔ میں نے کبھی جیون کی پرواہ نہیں کی۔ میرے کون رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے لیے موت سے ڈروں۔ اگر یہ ماجرا سن کر بھی آپ سمجھتی ہیں کہ میں نے مسٹر ویاس کے ساتھ انیائے کیا ہے تو پستول اٹھا کر اس جیون کا انت کر دیجیے۔ میں ذرا بھی نہ جھجکوں گا۔ پولیس کی آنکھوں میں تو میں خونی ہوں۔ لیکن میں پولیس کی پرواہ نہیں کرتا۔ جنتا کے آنکھوں میں میں بے قصور ہوں۔ اگر پولیس میرے خلاف کوئی گواہ چاہے تو نہیں پاسکتی۔ میں خود اپنے کو خونی نہیں سمجھتا۔ بس آپ ہی کے اوپر فیصلہ ہے۔ آپ کا فیصلہ اگر میرے خلاف ہے، تو میں آپ کے

سامنے یہی اسی پستول سے اپنا انت کرلوں گا،

یہ کہتے ہوئے ایشور داس نے زمین سے پستول اٹھا لیا اور اس کی نالی اپنی طرف پھیر کر مایا کی طرف دیکھنے لگا۔ مایا نے سر اٹھا کر نرمی سے کہا،" پستول رکھ دیجیے"
"میں اپنا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔"

"اس کا فیصلہ ایشور کریں گے۔ مجھے اب آپ سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں انھیں ایسا نہ سمجھتی تھی۔ آپ مجھے ان گھروں کا پتہ بتا دیجیے، جو میرے پتی کے ہاتھوں برباد ہوئے ہیں۔ شاید میں ان کے اتیا چار کا کچھ پرایشچت کرسکوں۔"

(یہ افسانہ بھارت الٰہ آباد ہفتہ وار میں نومبر 1928 میں شائع ہوا۔ اپراپیہ ساہتیہ میں شامل ہے۔)

جہاد

(1)

بہت پرانی بات ہے۔ ہندوؤں کا ایک قافلہ مغرب کے غیر مہماں نواز، مرتفع، سنگین علاقہ سے بھاگا چلا آرہا تھا۔ دوپہر کی دھوپ آگ سی برسا رہی تھی۔ مگر اس قافلہ کو دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ کچھ گرسنہ صورت بچے ہیں۔ کچھ خستہ حال بوڑھے۔ کچھ ژولیدہ مو لڑکیاں اور کچھ ہمت یاس کے پتلے جوان۔ یہ وہ خانماں برباد لوگ ہیں۔ جو اپنا سب کچھ ایمان پر صدقہ کر کے کسی ایسے ملجا کی تلاش میں سرگرم سفر ہیں۔ جہاں رام اور رحیم میں امتیاز نہ ہو۔ جہاں اختلاف زبان کفر نہ ہو،' جہاں عقائد کا فرق مخاصمت کی بنا نہ ہو۔ ہفتوں سے انھیں دانہ نصیب نہیں ہوا۔ جن کی جان ہتھیلیوں پر ہو۔ انھیں بھوک اور پیاس کہاں۔ جان کا خوف نہیں، خوف ہے بے عصمتی کا، بے حرمتی کا، تشدد کا۔ ہردم یہ خطرہ لگا ہوا ہے کہ پیچھے سے فدائیان جہاد کا کوئی غول نہ آرہا ہو۔ اس وقت بھی دو جوان بندوقیں کندھوں پر رکھے پیچھے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ ان میں ایک کشیدہ قامت، خوبرو، قوی الجثہ جوان ہے۔ جس کی آنکھوں سی خودداری اور غرور کی شعاعین نکل رہی ہیں۔ گویا اس کی ہر ایک حرکت پر آسمان کے دیوتا نعرہ تحسین کر رہے ہیں۔ دوسرا میانہ قد، اکہرے بدن کا کمرو آدمی ہے۔ جس کی صورت بیکسی کی تصویر ہے۔ گویا دنیا میں اس کے لیے کوئی امید نہیں۔ گویا وہ شمع صفت رو رو کر دن کاٹنے ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کا نام دھرم داس ہے۔ اس کا خزان چند۔

چلتے چلتے یہ لوگ ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچے جہاں ایک چھوٹا سا کنواں تھا۔ کنواں دیکھتے ہی ان کی ہمتیں مچل گئیں۔ آگے قدم نہ اُٹھے۔ تن بر تقدیر ہو کر لوگوں نے وہیں پڑاؤ کر دیا۔ ایک اُبھری ہوئی چٹان کے سایہ میں چھوٹی سی بستی آباد ہوگئی۔

دھرم داس نے بندوق کندھے سے اُتار کر ایک چٹان پر بیٹھتے ہوئے خزان چند سے کہا۔ تم نے اپنے لیے کیا طے کیا؟ کوئی لاکھ سوالاکھ کا اثاثہ ہوگا تمھارا؟

خزان چند نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ 'لاکھ سوالاکھ کا تو نہیں' ہاں پچاس ساٹھ ہزار کا ضرور تھا۔'

" تو اب کیا کروگے۔"؟

" جو کچھ سر پر آئے گی جھیلوں گا۔ دوچار رشتہ دار راولپنڈی میں ہیں۔ شاید وہ کچھ امداد کریں۔ تم نے کیا سوچا ہے۔"؟

" مجھے کیا غم! اپنے دونوں ہاتھ موجود ہیں۔ وہاں بھی انھیں کا سہارا تھا اور آگے بھی انھیں کا سہارا ہے۔"

اگر آج اور خیریت سے گزر جائے تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔"

"میں تو منا رہا ہوں کہ ایک آدھ شکار نظر آجائے۔ ایک درجن بھی آجائیں تو بھون کر رکھ دوں۔"

یکایک چٹانوں کی آڑ سے ایک نازنین ہاتھ میں لوٹا ڈور لے کر نکلی اور سامنے کنوئیں کی طرف چلی۔ حسن اس کے قدموں پر نثار ہو رہا تھا۔

دونوں نوجوان اس کی طرف بڑھے۔ خزان چند تو چند قدم چل کر رک گیا۔دھرم داس نے حسینہ کے ہاتھ سے لوٹا اور ڈور لے لیا اور خزان چند کی طرف فاتحانہ نگاہ سے دیکھتا ہوا کنوئیں کی طرف چلا۔ خزان چند نے پھر بندوق سنبھالی اور اپنی خفت مٹانے کے لیے آسمان کی طرف تاکنے لگا۔ اس طرح کی شکست اسے بار ہا مل چکی تھی۔ شاید وہ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ شیاما کا منظور نظر دھرم داس ہے۔ خزان چند کی ساری دولت دھرم داس کے مردانہ حسن کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ کنایۃً ہی نہیں علانیہ شیاما کئی بار خزان چند سے بے اعتنائی کر چکی تھی۔ مگر وہ بدنصیب مایوس ہو کر بھی نہ جانے کیوں اس پر نثار ہونے کو تیار رہتا تھا۔ تینوں ہی ایک بستی کے رہنے والے، ایک ساتھ کھیلنے والے تھے۔ شیاما یتیم تھی۔ اس کی خالہ نے اسے پالا تھا اور اب بھی خالہ ہی اس کی کفیل تھی۔ خالہ کی تمنا تھی کہ خزان چند اس کا داماد ہو۔ لڑکی کی زندگی فارغ البالی میں بسر ہو۔ زندگی کے آخری ایام میں اسے بھی ایک سہارا ہو۔ لیکن شیاما دھرم داس کی جانب مائل تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ جس خزان چند کو وہ پیروں سے ٹھکرا رہی ہے۔ وہی اس کی چھوٹی سی کشتی

کا ناخدا ہے۔ خزان چند ہی ضعیفہ کا منیم، خزانچی، وکیل، سب کچھ تھا اور یہ جانتے ہوئے کہ شیاما اسے اس زندگی میں نہیں مل سکتی۔ شاید اس کی دولت کا یہ صرف نہ ہوتا تو وہ اسے لٹا کر فقیر ہو جاتا۔

(2)

دھرم داس پانی لے کر لوٹ ہی رہا تھا کہ اسے پچھم کی جانب سے کئی سوار آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے گنا پانچ تھے۔ ان کی بندوقوں کی نالیاں دھوپ میں صاف چمک رہی تھیں۔ دھرم داس پانی لیے ہوئے دوڑا کہ کہیں راستہ ہی میں سواروں سے مٹھ بھیڑ نہ ہوجائے۔ لیکن کندھے پر بندوق اور ایک ہاتھ میں لوٹا ڈور لیے وہ بہت تیز نہ دوڑ سکتا تھا۔ فاصلہ دوسو گز سے زائد نہ تھا۔ راستہ میں پتھروں کے ڈھیر ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ خوف ہوتا تھا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کہیں پیر نہ پھسل جائے۔ ادھر سوار ہر لمحہ قریب تر ہوتے جاتے تھے۔ عربی گھوڑوں سے اس کا مقابلہ ہی کیا۔ اس پر منزلوں کا دھاوا مارے ہوئے۔ مشکل سے پچاس قدم چلا ہوگا کہ سوار اس کے سر پر آپہنچے اور اسے گھیر لیا۔ دھرم داس ہمت کا دھنی تھا۔ پر موت کو سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر گر پڑی۔ پانچوں اسی کے علاقہ کے محسودی تھے۔

ایک پٹھان نے کہا: اڑا دو سر مردود کا۔ دغا باز کافر!

دوسرا بولا نہیں نہیں... ٹھہرو... اگر یہ اس وقت بھی اسلام قبول کرلے تو ہم اسے معاف کر سکتے ہیں۔ کیوں دھرم داس، تمھیں اس دغا کی کیا سزا دی جائے؟ ہم نے تمھیں رات بھر کا وقت فیصلہ کرنے کے لیے دیا تھا۔ مگر تم رات ہی کو ہم سے دغا کر کے بھاگ نکلے۔ اس دغا کی سزا تو یہی ہے کہ تم اسی وقت واصل جہنم کر دیے جاؤ۔ لیکن ہم تمھیں پھر ایک موقع دیتے ہیں۔ یہ آخری موقع ہے۔ اگر تم نے اب بھی کفر ترک نہ کیا تو تمھیں دن کی روشنی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

دھرم داس نے ہچکچا کر جواب دیا۔ جس بات کو عقل نہیں تسلیم کرتی اسے کیوں کر...

پہلے سوار نے طیش میں آکر کہا۔ مذہب کو عقل سے کوئی تعلق نہیں۔!

تیسرا : کفر ہے! کفر ہے!

پہلا : اڑا دو سر مرُدود کا۔ دھواں اُس پار

دوسرا : ٹھہرو، ٹھہرو! مار ڈالنا مشکل نہیں۔ جلانا مشکل ہے۔ تمھارے اور ساتھی کہاں ہیں دھرم داس؟

دھرم داس : سب میرے ساتھ ہیں۔

دوسرا : کلام شریف کی قسم، اگر تم سب خدائے پاک اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ تو کوئی تمھیں تیز نگاہ سے دیکھ بھی نہ سکے گا۔

دھرم داس : آپ لوگ سوچنے کے لیے اور کچھ موقع نہ دیں گے؟

اس پر پانچوں سوار چلا اٹھے۔ نہیں نہیں۔ ...... ہم تمھیں نہ جانے دیں گے یہ آخری موقع ہے۔

اتنا کہتے کہتے پہلے سوار نے بندوق سنبھالی اور نال کو دھرم داس کے سینہ کی طرف کر کے بولا، بس بولو...... کیا منظور ہے؟

دھرم داس سر سے پانوں تک کانپ کر بولا۔ اگر میں اسلام قبول کرلوں تو میرے ساتھیوں کو تو کوئی تکلیف نہ دی جائے گی؟

دوسرا : اگر تم ضمانت کر و کہ وہ لوگ بھی اسلام قبول کر لیں گے۔

پہلا : ہم اس شرط کو نہیں مانتے۔ تمھارے ساتھیوں سے ہم خود نپٹ لیں گے۔ تم اپنی کہو۔ کیا چاہتے ہو؟ ہاں ...... یا ...... نہیں؟

دھرم داس نے زہر کا گھونٹ پی کر کہا۔ میں خدا پر ایمان لاتا ہوں۔

پانچوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔ الحمد للہ! الحمد للہ! اور باری باری سے دھرم داس سے بغل گیر ہوئے۔

(3)

شیاما دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ وہ دل میں پچھتا رہی تھی کہ میں نے انھیں کیوں پانی لانے کو بھیجا۔ اگر معلوم ہوتا کہ تقدیر یوں گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ تو وہ پیاسوں مر جاتی۔ پر دھرم داس کو نہ جانے دیتی۔ شیاما سے کچھ فاصلہ پر خزاں چند بھی کھڑا تھا۔ شیاما نے اس کی طرف نمناک آنکھوں سے دیکھ

کر کہا۔ اب ان کی جان بچتی نہیں نظر آتی۔

خزان چند : بندوق بھی ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔

شیاما : نہ جانے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ارے غضب! وہ ظالم ان کی طرف بندوق تان رہا ہے۔

خزان چند : ذرا اور قریب آجائیں تو میں بندوق چلاؤں۔ اتنی دور کی زد اس میں نہیں ہے۔

شیاما : ارے! دیکھو وہ سب انھیں گلے لگا رہے ہیں۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

"کہیں انھوں نے اسلام تو نہیں قبول کر لیا"؟

"شاید! یہ تو دھرم داس کی ذات سے بعید ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ ٹھیک یہی بات ہے۔ بندوق چلاؤ"

"دھرم داس بیچ میں ہیں۔ کہیں انھیں نہ لگ جائے۔"

"کوئی ہرج نہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ پہلا نشانہ دھرم داس ہی پر پڑے بے غیرت! بے شرم! جان کے لیے اپنا دھرم چھوڑ دیا۔ ایسی بے حیائی کی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر۔ کیا سوچتے ہو؟ کیا تمھارے ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے؟ لاؤ بندوق مجھے دے دو۔ میں اس بے غیرت کو اپنے ہاتھوں سے ماروں گی۔"

"مجھے تو یقین نہیں آتا کہ دھرم داس............

"تمھیں کبھی یقین نہ آئے گا۔ لاؤ بندوق مجھے دے دو۔ کھڑے تاکتے ہو۔ کیا وہ سر پر آجائیں گے تب بندوق چلاؤ گے؟ کیا تمھیں بھی یہی منظور ہے کہ اسلام پر ایمان لاکر جان بچاؤ۔ اچھی بات ہے۔ جاؤ۔ شیاما اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہے۔ مگر اسے اب منہ نہ دکھانا"

خزان چند نے بندوق چلائی۔ گولی ایک سوار کی پگڑی کو اڑاتی ہوئی نکل گئی۔ جہادیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ دوسری گولی آئی۔ وہ ایک گھوڑے کی چھاتی پر بیٹھ گئی۔ گھوڑا وہیں گر پڑا۔ جہادیوں نے پھر اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور آگے بڑھے۔ تیسری گولی آئی۔ ایک پٹھان لوٹ گیا۔ پر اس کے قبل کہ چوتھی گولی آئے۔ چاروں پٹھان

خزان چند کے سر پر پہنچ گئے اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

ایک سوار نے خزان چند کی طرف بندوق تان کر کہا۔ اُڑا دوں سر مردود کا۔ اس سے خون کا بدلہ لینا ہے۔

دوسرا : نہیں، نہیں۔ یہ دلیر آدمی ہے۔ خزان چند! تمھارے اوپر دغا، خون اور کفر، یہ تین الزام ہیں اور تمھیں قتل کر دینا عین ثواب ہے۔ لیکن ہم تمھیں ایک موقعہ اور دیتے ہیں۔ اور اگر تم اب بھی خدا اور رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ تم ہم تمھیں سینہ سے لگانے کو تیار ہیں۔ اس کے سوا تمھارے گناہوں کا اور کفارہ نہیں ہے۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔ بولو کیا منظور ہے؟

چاروں پٹھانوں نے کمروں سے تلواریں نکال لیں اور خزان چند کے سر پر تان دیں۔ گویا، نہیں، کا لفظ منہ سے نکلتے ہی اس کی گردن زمین پر تڑپ رہی ہوگی۔

خزان چند کے چہرہ پر ایک مردانہ شکوہ جلوہ افروز ہوگیا۔ اس کی آنکھیں شوق شہادت سے منور ہوگئیں۔ متین لہجہ میں بولا۔ تم ایک ہندو سے یہ سوال کر رہے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ جان کے خوف سے اس کے ایمان میں لغزش آجائے گی؟ ہندو کو اپنے معبود تک پہنچنے کے لیے کسی نبی، ولی یا پیغمبر کی ضرورت نہیں۔

چاروں پٹھانوں نے چلا کر کہا۔ کفر! کفر!۔!

خزان چند : اگر تم اسے کفر سمجھتے ہو تو سمجھو۔ میں اپنے کو تم سے زیادہ خدا پرست سمجھتا ہوں۔ میں اس مذہب کا پیرو ہوں۔ جس کی بنیاد آزادی عقل پر ہے۔ انسان میں عقل ہی نور حقیقی ہے۔ ہمارا ایمان ہماری عقل کا مطیع ہے۔

چاروں پٹھانوں کے منہ سے نکلا۔ کفر! کفر! اور چاروں تلواریں ایک ساتھ خزان چند کی گردن پر پڑ گئیں۔ لاش زمین پر پھڑکنے لگی۔ دھرم داس سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ دل میں خوش تھا کہ اب خزان چند کی ساری دولت میرے ہاتھ لگے گی۔ اور شیاما کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھاؤں۔ مگر تقدیر کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ شیاما جو اب تک ایک خود رفتگی کے عالم میں کھڑی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ جوں ہی خزان چند زمین پر گرا وہ ایک جنون کی حالت میں دوڑی اور اسے گود میں لے کر آنچل سے سیلاب خون کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے سارے کپڑے خون سے تر

ہوگئے۔ اس نے اس سے کہیں خوبصورت شلواریں پہنی تھیں۔ پر اس خون سے رنگی ہوئی شلوار کی شان ناقابلِ بیان تھی۔ بیل بوٹوں والی شلواریں اس کے حسن کو چمکاتی تھیں۔ یہ خون آلود شلوار اس کی رُوح کو منوّر کر رہی تھی۔

ایسا معلوم ہوا گویا خزان چند کی بجھتی ہوئی آنکھیں روشن ہوگئی ہیں۔ ان آنکھوں میں کتنی روحانیت، کتنی مسرت، کتنا ولولہ جھلک رہا تھا۔! زندگی میں جس نے پریم کی بھیک بھی نہ پائی۔ وہ مرنے پر لازوال دولت کا مالک بنا ہوا تھا۔

(4)

دھرم داس نے شیاما کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ شیاما ہوش میں آؤ۔ تمھارے سارے کپڑے خون سے تر ہوگئے ہیں۔ اب رونے سے کیا حاصل! یہہ لوگ ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں کوئی ایذا نہ پہنچائیں گے۔ ہم پھر گھر چلیں گے اور زندگی کے دن آرام سے بسر کریں گے۔

شیامانے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تمھیں اپنا گھر بہت پیارا ہے۔ تو جاؤ۔ میری فکر مت کرو۔ میں اب نہ جاؤں گی۔ ہاں اگر کچھ میری محبت باقی ہے تو ان لوگوں سے کہہ دو اسی تلوار سے میرا بھی خاتمہ کردیں۔

دھرم داس رقت آمیز لہجہ میں بولا۔ شیاما! یہ تم کیا کہتی ہو۔ تم بھول گئیں کہ ہمارے اور تمھارے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے خود خزان چند کی موت کا رنج ہے۔ مگر شُدنی کو کون ٹال سکتا تھا۔

شیاما: اگر یہ شدنی تھی تو یہ بھی شدنی ہے کہ میں ساری عمر اس پاک روح کی یاد میں بسر کروں۔ جس کی میں نے زندگی میں کبھی قدر نہ کی۔

یہ کہتے کہتے شیاما کا وفوراشک جواب تک نفرت اور حقارت کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ابل پڑا اور وہ خزان چند کے سرد اور بے حس ہاتھوں کو گلے میں ڈال کر رونے لگی۔

چاروں پٹھان کھڑے وفا اور ایثار کا یہ ایمان انگیز جلوہ دیکھ رہے تھے۔ آخران پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ ایک نے دھرم داس سے کہا۔ تم اس پارسا خاتون سے کہو۔ ہمارے ساتھ چلے۔ اس کا ہم دل سے احترام کریں گے۔ ہماری ذات سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

دھرم داس کے سینہ میں حسد کی آگ دہک رہی تھی۔ وہ حسینہ جسے وہ اپنی سمجھے بیٹھا تھا اس وقت اس کی صورت دیکھنے کی بھی روا دار نہ تھی۔ بولا، شیاما! تم چاہے اس لاش پر آنسوؤں کی ندی بہا دو پر یہ زندہ نہ ہوگی اور نہ خزان چند اب تمھاری دفا کی قدر کرسکتا ہے۔ یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ میں اور لوگوں کو بھی جاکر سمجھاتا ہوں۔ یہ خان لوگ ہماری حفاظت کا ذمہ لے رہے ہیں۔ہماری جائدادیں، مکانات، سب مل جائیں گے۔ خزان چند کی دولت کے مالک بھی ہمیں لوگ ہوں گے۔ اب دیر نہ کرو۔ رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں۔ شیاما نے دھرم داس کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر کہا اور اس واپسی کی قیمت کیا دینی ہوگی؟ وہی جو تم نے دی ہے۔ دھرم داس اس طنز کو نہ سمجھ سکا۔ بولا۔ میں نے تو کوئی قیمت نہیں دی۔ میرے پاس تھا ہی کیا۔

شیاما : یہ نہ کہو۔ تمھارے پاس وہ خزانہ تھا۔ جو تمھیں رشیوں نے عطا کیا تھا۔ جس کی حفاظت رگھو اور منو۔ رام اور کرشن، بدھ اور شنکر نے کی تھی۔ اس لاثانی ورثہ کو تم نے آج حقیر جان کے لیے کھو دیا۔ ایسی واپسی تم کو مبارک ہو۔ تم جاؤ۔ جن تلواروں نے بیر خزان چند کی زندگی کا فیصلہ کیا انھیں نے میری محبت کا بھی فیصلہ کر دیا۔ زندگی میں میں نے اس کے ساتھ جو بے وفائی اور بے اعتنائی کی۔ اب مرنے کے بعد اس کا کفارہ ادا کروں گی۔ وہ دھرم پر مرنے والا بیر تھا۔ دھرم کو بیچنے والا نا مرد نہیں۔ اگر تم میں اب بھی کچھ حمیت ہے تو اس لاش کی کریا کرم کرنے میں میری مدد کرو اور تمھارے آقاؤں کو یہ بھی گوارا نہ ہو تو جانے دو۔ میں سب کچھ کر لوں گی۔

دلیر پٹھانوں کے دل درد سے تڑپ اٹھے۔ انسانیت جذبہ جہاد پر غالب آئی۔ دیکھتے دیکھتے لکڑیوں کا انبار لگ گیا۔ دھرم داس خفت سے سر جھکائے بیٹھا تھا اور چاروں پٹھان لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ چتا تیار ہوگئی اور جن بے درد ہاتھوں نے خزان چند کی جان لی تھی۔ انھیں نے اس کی لاش کو چتا پر رکھا۔ شیاما نے آگ لگائی۔ شعلے ہوا میں بلند ہوگئے۔ گویا اگن دیوتا اپنی آتشیں زبانوں سے اس دھرم ویر کا جس گا رہے ہوں۔

(5)

پٹھانوں نے خزان چند کی ساری دولت لا کر شیاما کو دے دی۔ اس نے بہت انکار کیا۔ مگر کون سنتا تھا۔ شیاما نے وہیں دامن کوہ میں کنوئیں کے قریب ایک چھوٹا سا جھونپڑا کھڑا کر دیا اور حق وفا نبھانے لگی۔ اس کی خالہ تو اس کے ساتھ رہ گئی۔ اور سب لوگ واپس گئے۔ کیونکہ اب قبول اسلام کی شرط نہ تھی۔ خزان چند کی شہادت نے جذبۂ جہاد کو فرو کر دیا تھا۔ دھرم داس بھی وہیں رہنا چاہتا تھا۔ مگر پٹھانوں نے اسے نہ چھوڑا۔ ساتھ لے گئے۔ دوسرے دن مسجد میں ملاؤں کا ہجوم ہوا۔ لوگ دھرم داس کو اس کے گھر بُلانے گئے۔ مگر اس کا وہاں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف تلاش ہوئی۔ کہیں سراغ نہ ملا۔

سال بھر گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ شیاما اپنے جھونپڑے کے سامنے بیٹھی مستقبل کے شیریں خواب دیکھ رہی تھی۔ ماضی جاں گداز تھی۔ حال دل، دل شکن۔ ساری آرزوئیں مستقبل سے وابستہ تھیں اور مستقبل بھی وہ جس کا اس زندگی سے تعلق نہ تھا۔ آسمان پر سرخی چھائی ہوئی تھی اور سامنے کی پہاڑیاں سکوتِ زرّیں کے غلاف میں لپٹی ہوئی اس کے سنہرے مستقبل کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ درختوں کے برگ ہائے لرزاں سے کچھ اس طرح سرسراہٹ کی آواز نکل رہی تھی گویا کوئی روح ان کے غم میں بیٹھی ہوئی سسکیاں بھر رہی ہو۔

دفعتاً ایک خستہ حال، نیم برہنہ آدمی آکر جھونپڑے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ کتا زور سے بھونک اٹھا۔ شیاما نے چونک کر دیکھا۔ اور چلا اٹھی ......دھرم داس۔!

دھرم داس نے وہیں زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ہاں شیاما!...... میں بدنصیب دھرم داس ہی ہوں۔ سال بھر سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ مجھے گرفتار کرنے کے لیے انعام کا اعلان کر دیا گیاہے۔ اور سارا علاقہ میرے درپے ہے۔ اس زیست سے تنگ آگیا ہوں۔ پر موت بھی نہیں آتی۔

شیاما نے کوئی جواب نہ دیا۔ دھرم داس ایک لمحہ کے بعد پھر بے کسانہ انداز سے بولا کیوں شیاما، کیا ابھی تمھارا دل میری طرف سے صاف نہیں ہوا؟ تم نے میری خطا معاف نہیں کی؟

شیاما نے بے اعتنائی سے کہا۔ میں تمھارا مطلب نہیں سمجھی۔
میں اب بھی ہندو ہوں۔ میں نے اسلام نہیں قبول کیا ہے۔
''جانتی ہوں۔''
''یہ جان کر بھی تمھیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔''!

شیاما نے سخت نگاہوں سے دیکھا اور پر جوش انداز سے بولی۔ تمھیں مجھ سے ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی! میں اُس شہید کی بیاہتا ہوں۔ جس نے اپنے قوم کی لاج رکھی ہے۔ اپنے دھرم پر جان دی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ مر گیا؟ یہ تمھاری غلطی ہے وہ زندہ جاوید ہے! میں اس وقت بھی اس کا منور چہرہ دیکھ رہی ہوں۔ تم نے اپنی قوم کو بدنام کیا ہے۔ میرے سامنے سے دور ہو جاؤ۔

دھرم داس نے کچھ جواب نہ دیا۔ چپکے سے اٹھا۔ ایک لمبی سانس لی اور ایک طرف چل دیا۔

صبح شیاما پانی بھرنے جا رہی تھی تو اسے راستہ میں ایک لاش پڑی ہوئی نظر آئی۔ دوچار گدھ اس پر منڈلا رہے تھے۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ قریب جا کر دیکھا اور پہچان گئی۔

اس کی آنکھوں سے اشک کے کئی قطرے زمین پر گر پڑے۔ وہ کدورت جو کسی سرطان کی طرح اس کے دل پر مسلط تھی۔ جس نے اس کی زیست غم کو بھی نحیف بنا رکھا تھا۔ جس نے ماضی کو بھی نفرت سے ملوث کر رکھا تھا۔ وہ آج اس طرح مٹ گئی۔ جیسے برف پگھل جائے۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی مجموعہ 'پانچ پھول' 1929 میں شائع ہوا۔ مان سرودر 7 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'پریم چالیسی' میں شائع ہوا۔)

خانہ برباد

(1)

آج دس سال سے ضبط کر رہا ہوں۔ اپنے اس تنگ سینہ کے اندر ایک کرۂ نار چھپائے بیٹھا ہوں۔ دنیا میں کہیں خوشی ہوگی، کہیں سیر و تماشے ہوں گے۔ کہیں دلچسپیاں ہوں گی، میرے لیے تو اب آتش کدہ ہے اور کچھ نہیں۔ اس میں زندگی کی ساری آرزوئیں جل کر خاک ہوگئیں۔ دل کی جگہ اب ایک شعلہ ہے۔ جگر کی جگہ ایک مشت خاک! کس سے اپنی داستانِ درد کہوں۔ کہنے سے حاصل ہی کیا۔ اس کی دوا اب موت کے سوائے اور کچھ نہیں۔ کسی شاعر نے یہ مصرعہ کہہ کر میرے ہی جذبات دل کی ترجمانی کی ہے۔ مجھے تو موت ہی آتی شباب کے بدلے آہ کاش! موت آجاتی۔ جس کی قسمت میں رونا ہی لکھا ہو۔ اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔

میں نے پہلی بار تارا کو اس وقت دیکھا جب کہ میری عمر دس سال کی تھی۔ میرے والد آگرہ کے ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ لکھنؤ میں میرے ایک چچا رہتے تھے۔ جنھوں نے وکالت میں کافی دولت پیدا کی تھی۔ میں ان دنوں اپنے چچا ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ چچا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے میں ہی ان کا وارث تھا۔ چچا اور چچی دونوں مجھے اپنا لڑکا سمجھتے تھے۔ ہمارے چچا صاحب کے پڑوس میں ہماری برادری کے ایک بابو صاحب رہتے تھے۔ جو ریلوے کے محکمہ میں کسی اچھے عہدہ پر مامور تھے۔ دو ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے۔ نام تھا بابو کمبل چندر، تارا انھیں کی لڑکی تھی۔ تارا اس وقت پانچ سال کی ہوگی۔ ایام طفلی کا وہ دن آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جب تارا ایک فراق پہنے بالوں میں ایک گلاب کا پھول گوندھے ہوئے میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ کہہ نہیں سکتا۔ کیوں؟ میں اسے دیکھ کر کچھ جھینپ سا گیا۔ مجھے وہ دیو کنیا سی معلوم ہوئی۔ تارا اکثر میرے گھر آتی۔ اس کے گھر میں کھیلنے کی جگہ نہ تھی۔ چچا صاحب کے مکان کے سامنے وسیع میدان تھا۔ وہیں وہ کھیلا کرتی۔ رفتہ رفتہ میں بھی اس سے مانوس ہوگیا۔ میں جب سکول سے لوٹتا تو تارا دوڑ کر میرے ہاتھوں

سے کتابوں کا بستہ لے لیتی۔ جب سکول جانے کے لیے گاڑی پر بیٹھا تو وہ بھی آکر میرے ساتھ بیٹھ جاتی۔ ایک دن اس کے سامنے چچی نے چچا صاحب سے کہا۔ تارا کو میں اپنی بہو بناؤں گی۔ کیوں کرشنا تو تارا سے بیاہ کرے گا۔ میں مارے شرم کے باہر بھاگ گیا۔ لیکن اس دن سے اکثر چچا اور چچی دونوں ہمارے بیاہ کا مذاق کیا کرتے۔ ان موقعوں پر میں تو شرما کر باہر بھاگ جاتا تھا۔ مگر تارا خوش ہوجاتی تھی۔ دونوں خاندانوں میں اتنا ربط و ضبط تھا کہ اس کا ہوجانا کوئی غیر ممکن امر نہ تھا۔ تارا کے ماں باپ کو شاید یقین تھا کہ تارا سے میری شادی ہوگی۔ جب کبھی اس کے گھر جاتا تو میری آؤ بھگت ہوتی۔ تارا کی ماں اسے میرے ساتھ چھوڑ کر کسی بہانے سے ٹل جاتی تھیں کسی کو اب اس میں شک نہ تھا کہ تارا ہی اس گھر کی رانی ہوگی۔

ایک دن اس معصوم لڑکی نے ایک مٹی کا گھروندہ بنایا۔ میرے مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے اس کا گھروندہ تیار ہوا۔ اس میں کئی ننھے ننھے کمرے تھے۔ کچھ مٹی کے برتن تھے۔ ایک ذرا سی چارپائی تھی۔ میں نے جاکر دیکھا تو وہ دل و جان سے گھروندا بنانے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑ کر میرے پاس آئی اور بولی۔ کرشنا چلو ہم اپنا گھر دکھائیں۔ میں نے ابھی بنایا ہے۔

میں نے گھر دیکھا تو ہنس کر بولا۔ اس میں کون رہے گا تارا؟

تارا نے خجالت آمیز متانت سے کہا۔ ”کیوں، ہم اور تم کہاں رہیں گے۔ جب ہمارا اور تمھارا بیاہ ہو جاوے گا تو ہم لوگ اس گھر میں آکر رہیں گے۔ یہ دیکھو تمھاری بیٹھک ہے۔ تم یہیں بیٹھ کر پڑھوگے۔ دوسرا کمرہ میرا ہے۔ اس میں بیٹھ کر میں گڑیا کھیلوں گی؟“

میں نے مذاق کر کے کہا۔ ”کیا میں ساری عمر پڑھتا ہی رہوں گا اور تم ہمیشہ گڑیاں کھیلتی رہوگی؟“

تارا نے میری طرف اس انداز سے دیکھا۔ گویا وہ میری بات نہیں سمجھی۔ غریب جانتی تھی کہ زندگی کھیلنے اور ہنسنے کے لیے ہے۔ یہ نہ جانتی تھی کہ ایک دن ہوا کا ایک جھونکا آئے گا اور اس گھروندے کو اڑا کر لے جائے گا۔ اسی کے ساتھ ہم دنوں بھی کہیں سے کہیں جا اُڑیں گے۔

(2)

اس کے بعد میں اپنے والد کے پاس چلا آیا اور کئی سال پڑھتا رہا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا مجھے موافق نہ تھی یا میرے والد صاحب نے مجھے اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کے لیے یہ بہانہ کیا تھا۔ میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا۔ آگرہ میں، میں نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ لیکن چچا کے یہاں آمدو رفت جاری رہی۔ ہر ایک تعطیل میں لکھنو ضرور جاتا اور گرمیوں کی تعطیل تو میری پوری لکھنؤ ہی میں کٹتی تھی۔ میں بڑی بے صبری سے تعطیلوں کا انتظار کرتا تھا۔ اگر مجھے ایک دن بھی دیر ہوجاتی تو تارا کا خط آپہنچتا۔ بچپن کی اس بے لوث الفت میں اب شباب کی سرگرمیاں اور بے تابیاں تھیں۔ وہ دن کیا کبھی بھول سکتے ہیں، وہی شیریں یادگاریں، اب اس زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ہم دونوں راتوں کو نظر بچا کر ملتے اور خیالی قلعے بناتے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا نخواستہ ہماری نیتیں بد تھیں۔ ہرگز نہیں۔ ہمارے درمیان ایک بھی ایسا لفظ، ایسا اشارہ نہ آتا۔ جس پر ہمیں شرمندہ ہونا پڑے۔ یہ صرف وہ لحاظ تھا۔جو اس عمر میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ شادی ہوجانے پر تو دولہا اور دلہن کچھ دنوں تک بزرگوں کے سامنے ایک دوسرے سے باتیں کرتے شرماتے ہیں۔ ہاں جن کے مزاج میں انگریزی خو بو سرایت کرگئی ہے ان کی بات میں نہیں چلاتا۔ وہ تو بزرگوں کے سامنے بوسہ بازی تک کر سکتے ہیں۔ ہماری ملاقاتیں صرف لطف صحبت کے لیے ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں، ایک دوسرے کے قرب میں، ہمیں جو لطف بے انداز حاصل ہوتا تھا۔ اس کا اظہار ممکن نہیں۔ پھر عشق بازی کی گھاتوں کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں اپنی وفا اور خلوص محبت کا یقین دلانا ہوتا ہے۔ ہمارے درمیان تو رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ صرف رسم کی پابندی باقی تھی۔ وہ مجھے اپنا شوہر سمجھتی تھی۔ میں اسے اپنی بیوی سمجھتا تھا۔ ہم دونوں کبھی روٹھ بھی جاتے تھے اور کئی کئی دنوں تک بات چیت کرنے کی نوبت نہ آتی۔ ایسے موقع پر مصالحت کی تحریک ہمیشہ اسی کی طرف سے ہوتی تھی۔ میں زود رنج تھا۔ ذرا سی بات بھی مزاج کے خلاف ہوئی تو چیں بجبیں ہوجاتا، وہ خنداں پیشانی تھی۔ نہایت درجہ متحمل، لیکن اس کے ساتھ خوددار بھی انتہا درجہ کی۔

انٹرمیڈیٹ پاس ہوتے ہی مجھے فوج میں ملازمت مل گئی۔ والد صاحب کا فوجی حلقوں میں بہت رسوخ تھا۔ میں سارجنٹ ہو گیا اور حسن اتفاق سے لکھنؤ میں میری تعیناتی ہوگئی۔ منہ مانگی مراد بر آئی۔

مگر پیر چرخ رفتار تباہی کے سامان کر رہا تھا۔ میں تو اس خیال میں خوش تھا کہ اب کچھ دنوں میں تارا میری ہوگی۔ ادھر ایک دوسرا ہی گل کھلا، شہر کے ایک معتزز رئیس نے میری شادی کی تجویز کی اور آٹھ ہزار روپیہ نقد جہیز پیش کیا۔ چچا صاحب یہ غیر متوقعہ رقم سن کر باغ باغ ہوگئے۔ ان کے نزدیک آٹھ ہزار کی رقم کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ مگر اسی رقم کے لیے انھوں نے مدت دراز کے ارتباط اور یارانہ کو قربان کر دیا۔ انھیں سوچ کر جواب دینے کا وعدہ کرکے ٹالا اور تارا کے والد کو بلا کر ان سے کہا۔

آپ میرے پرانے دوست ہیں۔ اس لیے میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ ایک صاحب کرشنا کی شادی کے لیے مجھے آٹھ ہزار روپیہ دے رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ کچھ رعایت کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کم سے کم پانچ ہزار روپے دے دیں تو میں اس کی شادی تارا ہی سے کروں گا۔ ورنہ مجبوراً مجھے وہ تجویز قبول کرنی پڑے گی۔

تارا کے والد سکتے میں آگئے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنے دوستانہ خلوص اور یگانگت کے بعد جہیز کا سوال پیدا ہی نہ ہوگا۔ بولے آپ مذاق کر رہے ہیں یا سچ مچ مجھ سے جہیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔

چچاصاحب نے متانت سے کہا۔ اس میں مذاق کی تو کوئی بات نہیں۔ ابھی ابھی ایک صاحب آٹھ ہزار روپیہ پیش کر رہے تھے۔

بمل بابو نے فرمایا۔ یہ تو بابو صاحب آپ نے میرے سامنے ایک نیا مسئلہ پیش کر دیا ہے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ سوال آئے گا۔ ایشور نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ پانچ ہزار روپیہ میں آپ صاحب دولت نہ ہوجائیں گے۔ ہاں یہ رقم میرے امکان سے باہر ہے۔ سوچئے آپ ایک طے شدہ بات کو الٹ کر کتنی بڑی بے انصافی کر رہے ہیں۔ آج دس سال سے ہم کرشنا کو اپنا داماد سمجھتے آئے ہیں۔ آپ کی باتوں سے بھی بارہا اس کی تصدیق ہوچکی ہے۔ کرشنا اور

تارا میں جو محبت ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ایشور کے لیے چند ہزار روپوں کے لیے اتنی جانوں کا خون نہ کیجیے۔

چچا صاحب نے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "بمل بابو! مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اس معاملہ میں اور زیادہ نہیں دب سکتا۔"

بمل بابو نے ذرا تیز ہو کر کہا۔ آپ نے اب تک کبھی جہیز کا ذکر نہیں کیا؟

چچا صاحب : "مجھے یاد نہیں آتا۔ میں نے کبھی آپ سے اس معاملہ میں کسی قسم کا وعدہ کیا ہے۔

بمل : باقاعدہ طور پر ضرور کوئی بات ہمارے درمیان نہیں ہوئی۔ لیکن اشارتاً کتنی ہی بار یہ ذکر آچکا ہے۔

چچا صاحب : آپ میرا احسان نہیں مانتے کہ میں آپ کے ساتھ کتنی رعایت کر رہا ہوں۔

بمل : آپ میرا گلا گھونٹیں اور میں آپ کا احسان مانوں، اتنی فیاضی مجھ میں نہیں ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنے بڑے بندۂ زر ہیں۔ تو میں آپ سے کنارہ کش رہتا۔ میں آپ کو ایک شریف اور بامروت آدمی سمجھتا تھا۔ لیکن معلوم ہو گیا کہ آپ بھی کوڑیوں کے غلام ہیں۔ جس کی نگاہوں میں انسان کی کوئی وقعت نہیں۔ رونے اور ہمدردی کی کوئی وقعت نہیں، اسے میں شریف نہیں کہہ سکتا۔ آپ کو اختیار ہے۔ آپ کرشنا کی شادی جہاں چاہیں کریں۔ لیکن آپ کو کف افسوس نہ ملنا پڑے تو کہیے گا۔ تارا کی شادی تو کہیں نہ کہیں ہو ہی جائے گی اور ایشور نے چاہا تو کسی اچھے گھر ہوگی۔ اس کے لیے وروں کی کمی نہیں۔ ہاں اسے قلق ضرور ہوگا۔ لیکن خیر! آپ کو آٹھ ہزار مبارک ہوں۔"

چچا صاحب نے برانگیختہ ہو کر کہا۔ اگر آپ میرے گھر میں نہ ہوتے، تو ان بدزبانیوں کا جواب آپ کو دیتا۔

بمل نے چھڑی اٹھائی اور کمرہ سے باہر جاتے ہوئے کہا۔ آپ مجھے کیا جواب دیں گے۔ آپ جواب دینے کے قابل ہی نہیں ہیں۔

اسی دن جب میں شام کو پارک سے آیا اور جل پان کر کے بمل بابو کے گھر جانے لگا تو چچی نے کہا۔ ''کہاں جاتے ہو۔ بمل بابو سے اور تمھارے چچا جی سے آج ایک جھڑپ ہو گئی۔''

میں نے ٹھٹک کر حیرت کے ساتھ کہا۔ جھڑپ ہو گئی۔ کس بات پر ؟

چچی : یہی شادی بیاہ کی بات تھی۔ ایک رئیس تمھاری شادی کی بات چیت کر رہے ہیں۔ آٹھ ہزار روپیہ جہیز دیتے ہیں۔ تمھارے چچا جی نے بمل بابو سے کہا۔ آپ ہمارے پرانے ملاقاتی ہیں۔ آپ پانچ ہزار بھی دے دیں گے تو میں آپ ہی کے ہاں شادی کروں گا۔ اسی بات پر بگڑ گئے جو کچھ منہ میں آیا، بکتے رہے۔

میں ایک منٹ تک سکوت کے عالم میں رہنے کے بعد کہا۔ اچھی بات ہے۔ وہاں نہ جاؤں گا۔ پارک جارہا ہوں۔

چچی نے ہرچند روکا، پر میں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کوئی میرے دل میں بھالے چبھا رہا تھا۔ شاید گھر سے پارک تک جانے میں مجھے ایک منٹ سے زیادہ نہ لگا تھا۔ بار بار جی جھنجھلاتا تھا۔ چچا صاحب پر نہیں، بمل بابو پر بھی نہیں۔ والدہ صاحب پر بھی نہیں۔ صرف اپنے اوپر، کیوں مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ جا کر چچا صاحب سے کہہ دوں۔ کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو شادی نہیں کروں گا۔ میں کیوں اتنا کوتاہ سخن، اتنا بزدل، اتنا دبّو ہوں؟

اسی غصہ کے عالم میں میں نے والد صاحب کو ایک خط لکھا اور وہ ساری داستان مفصل بیان کر دی۔ یہ بھی لکھ دیا کہ میں اور کہیں شادی نہ کروں گا۔ خواہ مجھے آپ کا عتاب ہی کیوں نہ سہنا پڑے۔ اس روانی میں کیا جانے کیا لکھ گیا۔ اب یاد بھی نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ دس بارہ ورق کاغذ دس منٹ میں لکھ ڈالے تھے۔ کاش ممکن ہوتا تو میں یہ ساری داستان تار سے بھیجتا۔

تین دن میں نے جتنی بے صبری سے کاٹے۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جی ایسا اچاٹ ہو گیا تھا کہ کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ کبھی سوچتا کہ تارا ہمیں اپنے دل میں کتنا کمینہ سمجھ رہی ہوگی۔ کئی بار جی میں آیا۔ چل کر اس کے پیروں پر گر پڑوں اور

کہوں۔ دیوی! میرا قصور معاف کرو مجھے اپنی غلامی میں قبول کرو۔ چچا صاحب کی سخت گیری پر متعجب نہ ہونا۔ محض پانچ ہزار روپیہ کے لیے انھوں نے ہماری ساری زندگی کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔ افسوس!

تیسرے دن خط کا جواب آیا۔ رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی وہی جواب آیا۔ جس کا مجھے خدشہ تھا۔ لکھا تھا۔ بھائی صاحب میرے بزرگ ہیں۔ انھوں نے جو فیصلہ کیا ہے۔ اس کے خلاف ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکال سکتا اور تمھیں بھی ویسا ہی مناسب ہے کہ انھیں ناراض مت کرو۔

میں نے خط کو چاک کر کے پیروں سے کچل دیا اور اسی وقت بمل بابو کے گھر کی طرف چلا۔ کاش! اس وقت کوئی میرا راستہ روک لیتا تو میں ان کے دروازے تک پہنچ جاتا۔ مگر وہاں مزاحمت کرنے والا کون بیٹھا تھا۔ کچھ دور چل کر ہمت نے پھر جواب دے دیا۔ لوٹ آیا۔ کہہ نہیں سکتا۔ کیا سوچ کر لوٹا۔ چچا صاحب کی خفگی کا مجھے شمہ بھر خوف نہ تھا۔ میں ان کی ساری دولت کو ٹھکرا دینے کو تیار تھا۔ والد صاحب کی ناراضگی کا بھی خیال نہ تھا۔ خیال صرف یہ تھا کہ کون منہ لے کر جاؤں۔ آخر میں انھیں چچا کا بھتیجا ہی تو ہوں۔ بمل بابو مجھ سے مخاطب نہ ہوئے یا جاتے ہی جاتے مجھے دھتکار دیا تو میرے لیے ڈوب مرنے کے سوائے اور کیا رہ جائے گا۔ سب سے بڑا خوف یہ تھا کہ کہیں تارا مجھ سے ملنے سے انکار کر دے تو میری کیا حالت ہوگی۔ ہائے تارا! تغافل شعار تارا، نا موقع شناس تارا، اگر تو نے اس وقت مجھے تسکین کے دو کلمے لکھ بھیجے ہوتے تو آج یہ زندگی میرے لیے باغ و بہار ہوتی۔ تیری خموشی نے مجھے ہمیشہ کے لیے خانماں خراب کر دیا۔

(3)

تین دن پھر میں بنے انگاروں پر لوٹ لوٹ کر کٹے۔ مصمم ارادہ کر لیا کہ اب کسی سے نہ ملوں گا۔ سمجھ لوں گا میں دنیا میں یتیم پیدا ہوا۔ میرا کوئی نہیں۔ چچا صاحب کی تو صورت سے نفرت ہوگئی تھی۔ مگر تیسرے دن شام کو چچا صاحب کا ایک رقعہ پہنچا۔ مجھے بلایا تھا۔ جی میں آیا کہ لکھ دوں کہ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ سمجھ لیجیے کہ میں مر گیا مگر پھر ان کے احسانات اور ان کی محبت یاد آگئی۔ شام کو دل

میں اعلان جنگ کا جوش و خروش لیے ہوئے میں چچا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔
چچا صاحب نے مجھے سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔ کیا آج کل تمھاری طبیعت اچھی نہیں تھی۔ کیا؟ آج بابو سیتا رام تشریف لائے تھے۔ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ کل صبح کو موقہ ملے تو چلے آنا یا تمھیں لوٹنے کی جلدی نہ ہو تو اسی وقت بلا بھیجوں۔
میں سمجھ تو گیا کہ یہ بابو سیتا رام کون ہیں۔ لیکن تجاہل جتا کر بولا۔ بابو سیتا رام صاحب کون ہیں؟ مجھے تو ان سے کبھی نیاز حاصل نہیں ہوا۔
چچا صاحب نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ اجی یہ وہی صاحب ہیں جو تمھاری شادی کے لیے گھیرے ہوئے ہیں۔ شہر کے رئیس اور خاندانی آدمی ہیں۔ ان کی لڑکی بہت اچھی ہے۔ میں نے ہاں کر لیا ہے۔
میں نے غصہ کے ایک امنڈتے ہوئے سیلاب کو روک کر کہا۔ "آپ نے ناحق ہاں کیا۔ میں اپنی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"
چچا صاحب نے میری طرف قہر کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "کیوں؟"
میں نے اسی بے خوف لہجہ میں جواب دیا۔ "کہ اس لیے کہ میں اس معاملہ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔"
چچا صاحب نے میری طرف سے آنکھیں ہٹا لیں اور بولے۔ "آزادی کی قیمت دینی پڑے گی۔ یہ بھی جانتے ہو؟
میں نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔ بولا۔ "جی ہاں خوب جانتا ہوں"
"تو یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے۔"؟
"جی ہاں آخری"
"بہتر ہے"
یہ کہہ کر وہ اٹھے اور گھر میں چلے گئے۔ میں کمرہ کے باہر نکل آیا اور پارک کی طرف چلا۔ ساری زمین گردش کر رہی تھی۔ آسمان چکر کھا رہا تھا اور میرا جسم ہوا میں اڑا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ پیروں کے نیچے زمین ہی نہیں ہے۔
پارک میں پہنچ کر پلنگ پر لیٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

سویرے ہماری رجمنٹ کو ڈیرہ دُون جانے کا حکم ہوا مجھے آنکھیں سی مل گئیں۔ اب لکھنؤ کاٹے کھاتا تھا۔ اس کی درو دیوار سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ایک بار جی میں آیا کہ چل کر تارا سے مل لوں۔ اگر پھر وہی خیال مانع ہوا۔ ”کہیں وہ مخاطب نہ ہوئی تو۔؟“

میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ مجھے والد یا چچا کی امداد کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ ایک طرح سے انھوں نے مجھے خانہ بدر کر دیا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود تارا کو اپنا کیوں نہ کر سکا؟ کہہ نہیں سکتا۔ شاید میری اس بے سروسامانی میں بمل بابو ہی مجھ سے مخاطب نہ ہوں۔ ممکن تھا کچھ دنوں کے بعد میرے مفلوج حواس توازن پر آجاتے اور میں اپنے طریق کار کا تصفیہ کر لیتا۔ لیکن ڈیرہ دون پہنچے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ مجھے ایک خط ملا، پتہ دیکھا تو میرے ہاتھ کانپنے لگے اور سارے جسم پر رعشہ سا آگیا۔ شاید شیر کو سامنے کھڑا دیکھ کر بھی اتنا خائف نہ ہوتا۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ خط کھولوں۔ وہی تحریر تھی۔ جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں سرور سا چھا جاتا تھا۔ جسے بوسے دیتا تھا اور سینہ سے لگاتا تھا۔ مگر آج وہ کالے حروف کالی ناگنوں سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔ قیاس دوڑا رہا تھا کہ اس نے کیا لکھا ہوگا۔ مگر قیاس کی انتہائی پرواز بھی خط کے مضمون تک نہ پہنچ سکی۔ بڑی مشکلوں سے خط کھولا، تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ معلوم ہوا کسی نے لوہے کی سلاخ جگر میں چبھو دی۔ تارا کی شادی طے ہو گئی تھی۔ شادی ہونے میں اب صرف چوبیں گھنٹے باقی تھے۔ اس نے مجھ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگی تھی اور التجا کی تھی کہ مجھے بھلا مت دینا۔ خط کا آخری جملہ پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ لکھا تھا۔

”یہ آخری پیار لو،اب آج سے میرے اور تمھارے درمیان صرف انسانیت اور ہمدردی کا رشتہ ہے۔ اگر تمھیں کچھ اور سمجھوں تو اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ جسے شاید تم سب سے زیادہ ناپسند کروگے۔ بس اس سے زیادہ اب نہ لکھوں گی۔ بہت اچھا ہوا کہ تم یہاں سے چلے گئے۔ تم رہتے تو تمھیں بھی صدمہ ہوتا اور مجھے بھی۔ مگر پیارے اپنی اس ابھاگنی تارا کو بھول نہ جانا۔ تم سے یہی التجا ہے۔“

میں خط ہاتھ میں لیے ہوئے لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینہ پھٹ جائے گا۔ بھگوان! اب کیا کروں ۔ جب تک میں لکھنؤ پہنچوں گا۔ اس وقت تک بارات دروازہ پر آچکی ہوگی۔ لیکن تارا کو آخری بار دیکھنے کی خواہش کو میں کسی طرح نہ روک سکتا تھا۔ یہی اب زندگی کی آخری آرزو تھی۔ اس کے بعد پھر یہ دل انھی آرزوں کا مزار ہوگا۔ اور اس مزار پر آنسوؤں کے پھول چڑھائے جائیں گے۔

میں نے جاکر کمانڈنگ افسر سے کہا۔ مجھے ایک ضرورت لکھنؤ جانے کے لیے مجبور کررہی ہے۔ تین دن کی رخصت چاہتا ہوں۔"

افسر نے کہا۔ "چھٹی نہیں مل سکتی"

"میرا جانا ضروری ہے"

"تم نہیں جاسکتے"

"میں کسی طرح نہیں رک سکتا۔"

"تم کسی طرح نہیں جاسکتے"

میں نے اور زیادہ اصرار فضول سمجھا۔ وہاں سے چلا آیا اور شام کو سب کی نگاہ بچاکر سٹیشن پر آپہنچا۔ کورٹ مارشل کا اب مجھے مطلق خوف نہ تھا۔

(5)

جب میں لکھنؤ پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ جب خوب اندھرا ہوگیا تو میں اپنی قسمت کے ناٹک کا آخری منظر دیکھنے چلا۔ بارات دروازہ پر آگئی تھی۔ گیس کی روشنی ہو رہی تھی۔ براتی لوگ جمع تھے۔ ہمارے مکان کی چھت تارا کی چھت سے ملی ہوئی تھی۔ راستہ مردانہ کمرہ کی بغل سے تھا۔ چچا صاحب شاید کہیں سیر کرنے کو گئے ہوئے تھے۔ نوکر چاکر سب بارات کی بہار دیکھ رہے تھے۔ میں چپکے سے زینہ پر چڑھا اور چھت پر جا پہنچا۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ہائے! یہی وہ مقام ہے۔ جہاں ایک دن مئے الفت کے دور چلتے تھے۔ یہیں میں تارا کے ساتھ بیٹھ کر زندگی کے منصوبے باندھتا تھا اور محبت کی داستان کہتا تھا۔ اس زمین کا ایک ایک ذرہ میرے لیے متبرک تھا۔ مگر افسوس! آج میرے دل کی طرح وہ بھی ویران تھا۔ تاریک تھا۔ میں اسی زمین سے لپٹ کر خوب رویا۔ یہاں تک کہ میری

ہچکیاں بندھ گئیں۔ کاش! اس وقت تارا وہاں آجاتی تو میں اس کے قدموں پر سر رکھ کر ہمیشہ کے لیے سو جاتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تارا کی پاکیزہ روح میری حالت پر افسوس کر رہی ہے۔ آج بھی وہ یہاں ضرور آئی ہوگی۔ اس کے عنبریں زلفوں کی خوشبو زمین سے آرہی تھی۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور اس زمین کی خاک جمع کرنے لگا۔ دم کے دم میں میں نے ساری چھت صاف کر ڈالی اور اس خاک کو رومال میں باندھ گھنٹوں رویا۔ یہی مشتِ خاک میری محبت کا انعام ہے۔ یہی میری محبت کا حاصل ہے۔ یہی میری کشت الفت کی پیداوار ہے۔ ہائے ری ناکامی!

نیچے شادی کے رسوم ہو رہے تھے۔ ٹھیک آدھی رات کے وقت دلہن منڈپ کے تلے آئی۔ اب بھانوریں ہوں گی۔ میں چھت کے کنارے چلا آیا۔ اور وہ جگر خراش منظر دیکھنے لگا۔ بس یہی معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی جگر کے ٹکڑے کیے ڈالتا ہے۔ تعجب ہے کہ میرا سینہ کیوں نہ پھٹ گیا۔ کسی عزیز کی لاش کو چتا پر جلتے دیکھ کر بھی شاید اس سے زیادہ صدمہ نہ ہوتا ہو۔

بھانوریں ختم ہوگئیں تو میں کوٹھے سے اترا۔ اب کیا باقی تھا۔ چتا کی راکھ بھی پانی میں بہہ چکی تھی دل کو تھامے نیم جان، زینہ کے دروازے تک آیا۔ مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ اب کیا ہو۔ الٹے قدم لوٹا۔ اب تارا کے آنگن سے ہو کر جانے کے سوا دوسرا راستہ نہ تھا۔ میں نے سوچا۔ اس جمگھٹ میں مجھے کون پہچانتا ہے۔ نکل جاؤں گا۔ لیکن جوں ہی آنگن میں پہنچا کہ تارا کی ماں نے دیکھ لیا۔ چونک کر بولیں۔ کون! کرشن بابو۔ تم کب آئے؟ آؤ میرے کمرہ میں آؤ! تمھارے چچا صاحب کے خوف سے ہم نے تمھیں نوید نہ بھیجا۔ تارا صبح کو بدا ہوجائے گی۔ آؤ اس سے مل لو۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اور مجھے کشاں کشاں اپنے کمرہ میں لے گئیں۔ پھر پوچھا۔ ''اپنے گھر سے ہوتے آئے ہو نہ''؟

میں نے کہا''میرا گھر یہاں کہاں ہے''؟

''کیوں تمھارے چچا کا گھر نہیں ہے''

''ہاں چچا جی کا گھر ہے۔ میرا گھر اب کہیں نہیں ہے۔''

''تو کیا تم سیدھے اسٹیشن سے چلے آرہے ہو۔ تب تو کچھ کھایا بھی نہ ہوگا؟''

"مجھے تھوڑا سا زہر دے دیجیے۔ یہی میرے لیے سب سے اچھی دوا ہے۔"
بوڑھی عورت حیرت سے میرا منہ تاکنے لگی۔ تارا اور میرے درمیان کتنی محبت تھی۔ یہ وہ بیچاری کیا جانتی تھی۔
میں نے پھر اسی مایوسانہ انداز سے کہا۔ "میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ آپ لوگ میرے ساتھ یہ دغا کریں گی۔ اس کی مجھے خبر نہ تھی۔ خیر جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ چچا اور والد کی نظروں سے گر کر میں تارا کو شاید خوش نہ رکھ سکتا۔"
بوڑھی عورت نے شکوہ کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "تم ہم لوگوں کو اتنا خود غرض کیوں کہتے ہو، بیٹا!"
میں نے ملامت کی۔ "اب تک تو نہ سمجھتا تھا۔ لیکن واقعات نے ایسا کہنے پر مجبور کیا۔ میرے خون کا پیاسا دشمن بھی میرے اوپر اس سے زیادہ قاتلانہ وار نہ کر سکتا تھا۔ میرا خون آپ ہی کی گردن پر ہوگا"
"تمھارے چچا صاحب ہی نے تو ہمیں انکار کر دیا۔"
"آپ لوگوں نے مجھ سے بھی کچھ پوچھا۔ مجھ سے بھی کچھ کہا۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع بھی دیا۔ آپ نے تو ایسا رویہ اختیار کیا گویا آپ یہی چاہتے تھیں۔ مگر آپ سے شکایت کرنا فضول ہے۔ تارا خوش رہے میرے لیے غنیمت ہے۔"
تو بیٹا! تم نے بھی تو کچھ نہیں لکھا۔ اگر تم ایک پرزہ بھی لکھ دیتے تو ہمیں تسکین ہو جاتی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم تارا کو اتنا پیار کرتے ہو۔ ہم سے بھول ہوئی لیکن اس سے بڑی بھول تم سے ہوئی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ تارا کیوں روز ڈاکیہ کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ ابھی تین دن پہلے تک وہ برابر ڈاکیہ کو پوچھتی رہی۔ جب تمھارا کوئی خط نہیں آیا تب وہ نراس ہو گئی۔ بلادوں اسے ملنا چاہتے ہو؟"
میں نے چارپائی سے اٹھ کر کہا۔ "نہیں نہیں۔ اسے مت بلائیے۔ میں اب اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اسے دیکھ کر میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔"
یہ کہہ کر میں چل پڑا۔ تارا کی ماں نے کئی بار پکارا۔ مگر میں نے پیچھے پھر کر نہ دیکھا۔

یہ ہے میری محبت مایوس کی داستان۔ اسے آج دس سال گزر گئے۔ ان سالوں

میں میرے اوپر جو کچھ گزری وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کئی کئی دن مجھے بے آب و دانہ رہنا پڑا ہے۔ فوجی ملازمت سے تو کورٹ مارشل نے برخاست کر ہی دیا۔ اب آوارہ گردی کے سوا مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ اول تو کوئی کام ملتا ہی نہیں اور اگر مل گیا تو میں ٹکتا نہیں زندگی وبال ہو گئی ہے۔ کسی بات سے دلچسپی نہیں رہی۔ آدمی کی صورت سے دور بھاگتا ہوں۔

تارا خوش ہے۔ تین چار سال ہوئے۔ ایک بار میں اس کے گھر گیا تھا۔ اس کے شوہر نے بہت اصرار کر کے بلایا تھا۔ بہت قسمیں دلائی تھیں۔ مجبوراً گیا۔ وہ کلی اب کھل کر پھول ہوگئی ہے۔ تارا میرے سامنے آئی۔ اس کا شوہر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف تاک نہ سکا۔ اس نے میرے پیر چھوئے۔ میں نے پیر کھینچ لیے۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اگر تارا غمگین ہوتی۔ دل شکستہ ہوتی، تکلیف میں ہوتی تو میں اس پرنثار ہوجاتا۔ مگر خوش حال بے فکر، شگفتہ رو، بے نیاز تارا میری ہمدردی کی مستحق نہ تھی۔ میں اس خیال کو روک نہ سکا۔ کتنی بے وفائی، کتنی سردمہری۔

شام کو میں مغموم بیٹھا تھا۔ وہاں جانے پر افسوس کر رہا تھا کہ تارا کے شوہر میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور مسکرا کر بولے۔

"بابو جی! میں نے بہت افسوس کے ساتھ سنا ہے کہ تارا سے میری شادی ہوجانے کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ تارا جیسی عورت شاید دیوتاؤں کو بھی خود غرض بنا دیتی۔ لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ اگر میں جانتا کہ آپ کو اس سے اس درجہ عشق ہے تو میں ہرگز آپ کی راہ کا کانٹا نہ بنتا۔ افسوس یہی ہے کہ مجھے بہت پیچھے معلوم ہوا۔ آپ کی محبت کی داستان تارا مجھ سے کہہ چکی ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "تب تو آپ مجھ سے بدگمان ہوں گے۔"

اس نے جوش سے کہا۔ "اس کے برعکس میں آپ کا احسان مند ہوں۔ محبت کا اتنا پاکیزہ بے لوث اور اعلیٰ معیار اس کے روبرو رکھا۔ وہ آپ کو اب بھی اسی محبت سے یاد رکھتی ہے۔ شاید کوئی دن نہیں جاتا کہ آپ کا کوئی ذکر نہ کرتی ہو۔ یہ آپ ہی کی صحبت کا فیض ہے کہ وہ اس درجہ بے نفس، بے غرض اور شاکر ہے۔ اس کا دل محبت کا سرچشمہ ہے۔ آپ کی محبت کو وہ اپنی زندگی کی سب سے پیاری چیز سمجھتی ہے۔

آپ شاید سمجھتے ہوں کہ ان دنوں کی یاد کر کے اسے افسوس ہوتا ہوگا۔ مطلق نہیں۔ وہ دن اس کی زندگی کی سب سے شیریں یادگار ہیں۔ وہ کہتی ہے۔ میں نے کرشن کو تم میں پایا ہے اور میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ 'مادھوری' کے نومبر 1928 کے شمارے میں 'وڈروہی' کے عنوان سے شائع ہوا۔ 'مان سروور' 2 میں شامل ہے۔ عنوان ہے، وڈروہی۔ اردو میں 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔)

انو بھو

پریتم کو ایک ورش کی سزا ہوگئی اور اپرادھ کیول اتنا تھا کہ تین دن پہلے جیٹھ کی تپتی دوپہری میں انھوں نے راشٹ کے کئی سیوکوں کا شربت پان سے ست کار کیا تھا۔ میں اس وقت عدالت میں کھڑی تھی۔ کمرے کے باہر سارے نگر کی راج بھیتک چیتنا کسی بندی پشو کی بھانتی کھڑی چیتکار کر رہی تھی۔ میرے پران دھن ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے لائے گئے۔ چاروں اور سناٹا چھا گیا۔ میرے بھیتر ہاہا کار مچا ہوا تھا۔ مانو پران پگھلا جارہا ہو۔ آویش کی لہریں سی اٹھ اٹھ کر سمست شریر کو رومانچت کیے دیتی تھیں۔ اوہ اتنا گرو مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ عدالت، کرسی پر بیٹھا ہوا انگریز افسر، لال ذری دار پگڑیاں باندھے ہوئے پولیس کے کرمچاری سب میری آنکھوں میں تُچھیہ جان پڑتے تھے۔ بار بار جی میں آتا تھا، دوڑ کر جیون دھن کے چرنوں میں لپٹ جاؤں اور اسی دشا میں پران تیاگ دوں۔ کتنی شانت آوچلت، تیز اور سوابھیمان سے پردیپت مورتی تھی۔ گلانی، وشاد یا شوق کی چھایا ؎ا نہ تھی۔ نہیں ان ہونٹوں پر ایک اپھورتی سے بھری ہوئی منوہارنی اُوجسوی مسکان تھی۔ اس اپرادھ کے لیے ایک ورش کا کٹھن کاراواس۔ واہ رے نیائے۔ تیری بلی ہاری ہے۔ میں ایسے ہزار اپرادھ کرنے کو تیار تھی۔ پران ناتھ نے چلتے سے ایک بار میری اور دیکھا، کچھ مسکرائے پھر ان کی مدرا کٹھور ہوگئی۔ عدالت سے لوٹ کر میں نے پانچ روپے کی مٹھائی منگوائی اور سویم سیوکوں کو بلا کر کھلایا اور سندھیا سے میں پہلی بار کانگریس کے جلسے میں شریک ہوئی۔ شریک ہی نہیں ہوئی۔ منچ پر جا کر بولی اور ستیہ گرہ کی پرتگیاں لے لی۔ میری آتما میں اتنی شکتی کہاں سے آگئی۔ نہیں کہہ سکتی۔ سروسو لُٹ جانے کے بعد پھر کس کی شنکا اور کس کا ڈر۔ ودھاتا کا کٹھور سے کٹھور آگھات بھی اب میرا کیا اہت کر سکتا تھا؟

(2)

دوسرے دن میں نے دو تار دیے۔ ایک پتا جی کو دوسرا سسُر جی کو۔ سسر جی پنشن پاتے تھے۔ پتا جی جنگل کے محکمے میں اچھے پد پر تھے، پر سارا دن گذر گیا۔ تار کا

جواب ندارد۔ دوسرے دن بھی کوئی جواب نہیں۔ تیسرے دن دونوں مہاشیوں کے پتر آئے۔ دونوں جامے سے باہر تھے۔

سسر جی نے لکھا۔ آشا تھی۔ تم لوگ بڑھاپے میں میرا پالن کروگے۔ تم نے اس آشا پر پانی پھیر دیا۔ کیا اب چاہتی ہو میں بھکشا مانگوں۔ میں سرکار سے پنشن پاتا ہوں۔ تمھیں آشرے دے کر میں اپنی پنشن سے ہاتھ نہیں دھو سکتا۔ پتاجی کے شبد اتنے کٹھور نہ تھے۔ پر بھاؤ لگ بھگ ایسا ہی تھا۔ اسی سال انھیں گریڈ ملنے والا تھا۔ وہ مجھے بلائیں گے تو سمجھو ہے گریڈ سے وانچت ہونا پڑے۔ ہاں، وہ میری سہایتا موکھک روپ سے کرنے کو تیار رہتے۔ میں نے دونوں پتر پھاڑ کر پھینک دیے اور انھیں کوئی پتر نہ لکھا۔ ہاں سوارتھ تیری مایا کتنی پربل ہے۔ اپنا ہی پتا، کیول سوارتھ میں بادھا پڑنے کے بھے سے۔ لڑکی کی طرف سے اتنا نردے ہوجائے۔ اپنا سسر اپنی بہو کی اور سے اتنا اداسین ہوجائے۔ مگر ابھی میری عمر ہی کیا ہے ابھی توساری دنیا دیکھنے کو پڑی ہے۔

اب تک میں اپنے وشے میں نشچنت تھی لیکن اب یہ نئی چنتا سوار ہوئی۔ اس نرجن گھر میں نرادھار، نراشے کیسی رہوں گی۔ مگر جاؤں گی کہاں؟ اگر کوئی مرد ہوتی، تو کانگریس کے آشرم میں چلی جاتی یا کوئی مزدوری کر لیتی۔ میرے پیروں میں ناریتو کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھی۔ اپنی رکشھا کی اتنی چنتا نہ تھی، جیسی اپنے ناریتو کی رکشھا کی۔ اپنی جان کی فکر نہ تھی، پر ناریتو کی اور کسی کی آنکھ بھی نہ اٹھنی چاہیے۔

کسی کی آہٹ پاکر میں نے نیچے دیکھا۔ دو آدمی کھڑے تھے۔ جی میں آیا۔ پوچھوں تم کون ہو۔ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ مگر پھر خیال آیا، مجھے یہ پوچھنے کا کیا حق؟ عام راستہ ہے جس کا جی چاہے کھڑا ہو۔

پر مجھے کھٹکا ہوگیا۔ اس شنکا کو کسی طرح دل سے نہ نکال سکتی تھی۔ وہ ایک چنگاری کی بھانتی ہردے کے اندر سما گئی تھی۔

گرمی سے دیہہ پھونکی جاتی تھی۔ پر میں نے کمرے کا دوار بھیتر سے بند کر لیا۔ گھر میں ایک بڑا سا چاقو تھا۔ اسے نکال کر سرہانے رکھ لیا۔ وہ شنکا سامنے بیٹھی گھورتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

کسی نے پکارا۔ میرے روئیں کھڑے ہو گئے میں نے دوار سے کان لگایا۔ کوئی

میری کنڈی کھٹ کھٹا رہا تھا۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہی دونوں بدمعاش ہوں گے کیوں کنڈی کھٹ کھٹا رہے ہیں۔ مجھ سے کیا کام ہے؟ مجھے جھنجھلاہٹ آگئی۔ میں نے دوار کھولا اور چھجے پر کھڑی ہو کر زور سے بولی۔ کون کنڈی کھڑکھڑا رہا ہے؟

آواز سن کر میری شنکا شانت ہوگئی۔ کتنا ڈھارس ہوگیا۔ یہ بابو گیان چند تھے میرے پتی کے متروں میں ان سے زیادہ سجن دوسرا نہیں ہے۔ میں نے نیچے جاکر دوار کھول دیا۔ دیکھا تو ایک استری بھی تھیں۔ وہ مسز گیان چند تھیں۔ یہ مجھ سے بڑی تھیں پہلے پہل میرے گھر آئی تھیں۔ میں نے ان کے چرن اسپرش کیے۔ ہمارے وہاں مترتا مردوں ہی تک رہتی تھی۔ عورتوں تک نہیں جانے پاتی۔

دونوں جنے اوپر آئے۔ گیان بابو ایک اسکول میں ایک ماسٹر ہیں۔ بڑے ہی ادار، وِدْوان، نشکپٹ پر آج مجھے معلوم ہوا کہ ان کی پتھ پر درشیکا ان کی استری ہے۔ وہ دوہرے بدن کی پرتبھا شالی مہیلا تھیں۔ چہرے پر ایسا رعب تھا مانو کوئی رانی ہو۔ سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی۔ مکھ سندر نہ ہونے پر بھی آکرشک تھا۔ شاید میں انھیں کہیں اور دیکھتی، تو منہ پھیرلیتی، گرو کی سجیو پرتما تھیں، پر باہر جتنی کٹھور، بھیتر اتنی ہی دیالو۔

گھر کوئی پتر لکھا؟ یہ پرشن انھوں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کیا۔

میں نے کہا: ہاں لکھا تھا۔

کوئی لینے آرہا ہے۔

جی نہیں۔ نہ پتاجی اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ نہ سسر جی؟

تو پھر؟

پھر کیا، ابھی تو یہیں پڑی ہوں۔

تو میرے گھر کیوں نہیں چلتیں؟ اکیلے تو اس گھر میں میں نہ رہنے دوں گی؟

خفیہ کے دو آدمی اس وقت بھی ڈٹے ہوئے ہیں۔

میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ دونوں خفیہ کے آدمی ہوں گے۔

گیان بابو نے پتنی کی اور دیکھ کر، مانو اس کی آگیاں سے کہا۔ تو میں جاکر تانگا لاؤں؟

دیوی جی نے اس طرح دیکھا، مانو کہہ رہی ہوں، کیا ابھی تم یہیں کھڑے ہو؟

ماسٹر صاحب چپکے سے دوار کی اور چلے۔

ٹھہرو۔ دیوی جی بولی۔ کئے تانگے لاؤ گے

کئے۔ ماسٹر صاحب گھبرا گئے۔

ہاں کئے! ایک تانگے پر تین سواریاں ہی بیٹھیں گی۔ صندوق بچھاون، برتن، بھانے کیا میرے سر پر جائیں گے؟

تو دو لیتا آؤں گا۔ ماسٹر صاحب ڈرتے ڈرتے بولے ایک تانگے میں کتنا سامان بھر دوگے۔

تو تین لیتا آؤں؟

ارے تو جاؤ گے بھی۔ ذرا سی بات کے لیے گھنٹہ بھر لگا دیا۔

میں کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ گیان بابو چل دیے۔ میں نے سکچاتے ہوئے کہا۔ بہن، تمھیں میرے جانے سے کشٹ ہوگا اور ...

دیوی جی نے تیکھن سور میں کہا۔ ہاں ہوگا تو اوشیہ۔ تم دونوں جون میں دو تین پاؤ بھر آٹا کھاؤ گی۔ کمرے کے ایک کونے میں اڈا جما لوگی، سر میں آنے کا تیل ڈالوگی یہ کیا تھوڑا کشٹ ہے۔

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ آپ تو بنا رہی ہیں۔ دیوی جی نے سہردے بھاؤ سے میرا کاندھا پکڑ کر کہا۔ جب تمھارے بابو جی، لوٹ آویں، تو مجھے بھی اپنے گھر مہمان رکھ لینا۔ میرا گھاٹا پورا ہو جائے گا۔ اب تو راضی ہوئی۔ چلو اسباب باندھو، کھاٹ واٹ کل منگوا لیں گے۔

(3)

میں نے ایسی سہردے اُدار، میٹھی باتیں کرنے والی استری نہیں دیکھی۔ میں ان کی چھوٹی بہن ہوتی، تو بھی شاید اس سے اچھی طرح نہ رکھتی۔ چنتا یا کرودھ کو تو جیسے انھوں نے جیت لیا ہو۔ سدیو ان کے مکھ پر مدھر ونود کھلا کرتا تھا۔ کوئی لڑکا بالا نہ تھا۔ پر میں نے انھیں کبھی دکھی نہیں دیکھا۔ اوپر کے کام کے لیے لونڈا رکھ لیا تھا۔ بھیتر کا سارا کام خود کرتیں۔ اتنا کم کھا کر اور اتنی محنت کر کے وہ کیسے اتنی ہشٹ پشٹ

تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتی۔ وشرام تو جیسے ان کے بھاگیہ میں ہی نہیں لکھا تھا۔ جیٹھ کے دوپہری میں بھی نہ لیٹتی تھیں۔ ہاں مجھے کچھ نہ کرنے دیتیں، اس پر دیکھو کچھ کھلانے کو سر پر سوار۔ مجھے یہاں بس یہی ایک تکلیف تھی۔ مگر آٹھ ہی دن گذرے تھے کہ اک دن میں نے انھیں دونوں خفیوں کو نیچے بٹھا دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ ابھاگے یہاں بھی میرے پیچھے پڑے ہیں۔ میں نے ترنت بہن جی سے کہا۔ وہ دونوں بدمعاش یہاں بھی منڈرا رہے ہیں۔

انھوں نے حقارت سے کہا۔ کتے ہیں پھر نے دو۔

میں چنتت ہو کر بولی۔ کوئی سوانگ نہ کھڑا کریں۔

اسی بے پروائی سے بولی۔ بھونکنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟

میں نے کہا۔ کاٹ بھی سکتے ہیں۔

ہنس کر بولی۔ اس کے ڈر سے کوئی بھاگ تو نہیں جاتا نا۔

مگر میری دال میں مکھی پڑ گئی۔ بار بار چھجے پر جاکر انھیں ٹہلتے دیکھ آتی۔ یہ سب میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ آخر میں نوکر شاہی کا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔ میری سامرتھیہ ہی کیا ہے؟ کیا یہ سب اس طرح سے مجھے یہاں سے بھگانے پر تلے ہیں۔ اس سے انھیں کیا ملے گا؟ یہی تو کہ میں ماری ماری پھروں۔ کتنی نیچ طبعیت ہے؟

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ خفیہ نے پنڈ نہ چھوڑا۔ میرے پران سوکھتے جاتے تھے۔ ایسی دشا میں یہاں رہنا مجھے انوچت معلوم ہوتا تھا۔ پر دیوی جی سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔

ایک دن شام کو گیان بابو آئے، تو گھبرائے ہوئے تھے۔ میں برآمدے میں تھی۔ پرول جھیل رہی تھی۔ گیان بابو نے کمرے میں جاکر دیوی جی کو اشارے سے بلایا۔

دیوی جی نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ پہلے کپڑے وپڑے اتارو۔ منہ ہاتھ دھوؤ کچھ کھاؤ۔ پھر جو کہنا ہو، کہہ دینا۔

گیان بابو کو دھیریہ کہاں؟ پیٹ میں بات کی گندھ تک نہ پچتی تھی۔ آگرہ سے بلایا۔ تم سے اٹھا نہیں جاتا۔ میری جان آفت میں ہے۔

دیوی جی نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ تو کہتے کیوں نہیں، کیا کہنا ہے؟

یہاں آؤ۔

کیا یہاں کوئی اور بیٹھا ہوا ہے؟

میں وہاں سے چلی۔ بہن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں زور کرنے پر بھی نہ چھڑا سکی۔ گیان بابو میرے سامنے نہ کہنا چاہتے تھے۔ پر اتنا صبر بھی نہ تھا کہ ذرا دیر رک جاتے۔ بولے پرنسپل سے میری لڑائی ہو گئی۔

دیوی نے بناوٹی گمبھیرتا سے کہا۔ سچ تم نے اسے خوب پیٹا نا؟

تمھیں دل لگی سوجھتی ہے۔ یہاں نوکری جا رہی ہے، جب یہ ڈر تھا تو لڑے کیوں؟

میں تھوڑے ہی لڑا۔ اسی نے مجھے بلا کر ڈانٹا۔

بے قصور؟

اب تم سے کیا کہوں

پھر وہی پردا۔ میں کہہ چکی، یہ میری بہن ہے۔ میں اس سے کوئی پردا نہیں رکھنا چاہتی۔

اور جو انھیں کے بارے میں کوئی بات ہو تو؟

دیوی جی نے جیسے پہیلی بجھا کر کہا۔ اچھا سمجھ گئی۔ کچھ خفیہ کا جھگڑا ہوگا۔ پولیس نے تمھارے پرنسپل سے شکایت کی ہوگی۔

گیان بابو نے اتنی آسانی سے اپنی پہیلی بجھا جانا سیوکار نہ کیا۔

بولے۔ پولیس نے پرنسپل سے نہیں، حاکم ضلع سے کہا۔ اس نے پرنسپل کو بلا کر مجھ سے جواب طلب کرنے کا حکم دیا۔

دیوی نے انداز سے کہا۔ سمجھ گئی۔ پرنسپل نے تم سے کہا ہوگا کہ اس استری کو گھر سے نکال دو۔

'ہاں' یہی سمجھ لو،

تو تم نے کیا جواب دیا؟

ابھی کوئی جواب نہیں دیا وہاں کھڑے کیا کہتا۔

دیوی جی نے انھیں اڑے ہاتھوں لیا۔ جس پرشن کا ایک ہی جواب ہو اس میں سوچ وچار کیسا؟

گیان بابو ٹپٹا کر بولے۔ لیکن کچھ سوچنا تو ضروری تھا۔

دیوی جی کی تیوریاں بدل گئیں۔ آج میں نے پہلی بار ان کا یہ روپ دیکھا۔ بولی تم اس پرنسپل سے جاکر کہہ دو، میں اسے کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا اور نہ مانے تو استعفیٰ دے دو۔ ابھی جاؤ، لوٹ کر ہاتھ منھ دھونا۔

میں نے روکر کہا۔ بہن میرے لیے۔

دیوی نے ڈانٹ بتائی۔ تو چپ رہ۔ نہیں کان پکڑ لوں گی۔ تو کیوں بیچ میں کودتی ہے۔ رہیں گے تو ساتھ رہیں گے۔ مرے گے تو ساتھ مریں گے۔ اس مردوے کو میں کیا کہوں؟ آدھی عمر بیت گئی اور بات کرنا نہ آیا(پتی) سے کھڑے سوچ کیا رہے ہو، تمھیں ڈر لگتا ہو تو میں جاکر کہہ آؤں؟

گیان بابو نے کھسیا کر کہا۔ تو کل کہہ دوں گا، اس وقت کہاں ہوگا، کون جانے۔

(4)

رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ باپ اور سسُر جس کا منھ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس کا یہ آدر۔ راہ کی بھیکارن کا یہ سمّان۔ دیوی تو سچ مچ دیوی ہے۔

دوسرے دن گیان بابو چلے تو دیوی نے پھر کہا۔ فیصلہ کرکے گھر آنا۔ یہ نہ ہو کہ پھر سوچ کر جواب دینے کی ضرورت پڑے۔

گیان بابو کے چلے جانے کے بعد میں نے کہا۔ تم میرے ساتھ بڑا انیائے کررہی ہو بہن جی۔ میں یہ کبھی نہیں دیکھ سکتی کہ میرے کارن تمھیں یہ وپتی جھیلنی پڑے۔

دیوی نے ہاسیہ بھاؤ سے کہا۔ کہہ چکی یا کچھ اور کہنا ہے۔

کہہ چکی، مگر ابھی بہت کچھ کہوں گی،

اچھا بتا تیرے پریتم کیوں جیل گئے؟ اس لیے تو کہ سویم سیوکوں کا ستکار کیا تھا۔ سویم سیوک کون ہیں؟ یہ ہماری سینا کے ویر ہیں،جو ہماری لڑئیاں لڑ رہے ہیں۔ سویم سیوکوں کے بھی تو بال بچے ہوں گے، ماں باپ ہوں گے، وہ بھی تو کوئی کاروبار کرتے ہوں گے، پردیش کی لڑائی لڑنے کے لیے انھوں نے سب کچھ تیاگ دیا

ہے۔ ایسے ویروں کا ستکار کرنے کے لیے جو آدمی جیل میں ڈال دیا جائے، اس کی استری کے درشنوں سے بھی آتما پوتر ہوتی ہے۔ میں تجھ پر احسان نہیں کررہی ہوں تو مجھ پر احسان کر رہی ہے۔

میں اس دیا ساگر میں ڈبکیاں کھانے لگی۔ بولتی کیا۔

شام کو جب گیان بابو لوٹے، تو ان کے مکھ پر وجے کا آنند تھا۔

دیوی نے پوچھا۔ ہار کی جیت؟

گیان بابو نے اکڑ کر کہا۔ جیت۔ میں نے استعفیٰ دے دیا۔ تو چکر میں آگیا۔ اسی وقت حاکم ضلع کے پاس گیا۔ وہاں نہ جانے موٹر پر بیٹھ کر دونوں میں کیاباتیں ہوئی۔ لوٹ کر مجھ سے بولا۔ آپ پولٹیکل جلسوں میں تو نہیں جاتے۔

میں نے کہا۔ کبھی بھول کر بھی نہیں۔

کانگریس کے ممبر تو نہیں ہیں؟

میں نے کہا۔ ممبر کیا ممبر کا دوست بھی نہیں۔

کانگریس فنڈ میں چندا تو نہیں دیتے؟

میں نے کہا۔ کانی کوڑی بھی کبھی نہیں دیتا،

تو ہمیں آپ سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں آپ کا استعفیٰ واپس کرتا ہوں، دیوی جی نے مجھے گلے لگا لیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار 'مادھوری' نومبر 1928 میں شائع ہوا۔ ہندی میں 'مان سروور' نمبر 1 میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔)

حسن و شباب

(1)

حسن و شباب کی عارضی بہار کے بعد کوکلا اس خزاں کے ایام میں اس کارنامہ سیاہ کو آنسوؤں سے دھو رہی تھی۔ دور گزشتہ کی یاد آتے ہی اس کا دل بے چین ہو جاتا اور وہ غصہ ویاس کی حالت میں پکار اٹھتی۔ ہائے! میں دنیا میں پیدا ہی کیوں ہوئی؟ اس نے دادودہش سے ان سیاہ حروف کو مٹانے کی کوشش کی۔ اور ایام بہار کی بیشتر کمائی اس سعی ناکام میں صرف کر دی۔ پر دل کو تسکین نہ ہوئی۔ یہ حقیقت کھلی کہ اشک ندامت ہی سے وہ داغ سیاہ مٹ سکتے ہیں اور آج پندرہ سال کے بعد جب اس کے کانوں میں ایک حیات معصوم کے گریۂ اولیں کی صدا آئی۔ جب اس کے غار معصیت میں ایک سنہری روشنی کا جلوہ ہوا، اس کے خشک اور نیلے ہونٹوں پر ایک فطری وجدانی روحانی، دردناک تبسم کی جھلک دکھائی دی اور اس نے پارۂ جگر کو سینہ سے چمٹالیا۔ اسی وقت سے اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہوگیا۔ اس پارۂ گوشت نے کوہ حائل بن کر اس کی زندگی کا رخ پھیر دیا۔ وہ ہستی بے کس اس کے لیے پیغام حیات اور تلقین خاموش تھی۔ اس کی ہنستی ہوئی، شفاف، آنکھوں کی گہرائیوں میں معرفت کا دریا چھپا ہوا تھا۔ حسن فروش، فسوں ساز، عشوہ طراز کوکلا ایشور کی اپاسنا میں محو ہوگئی۔ وہ اب مشہود نہیں شاہد تھی۔ معشوق رعنا عاشق جانباز کی صورت میں نمودار ہوگیا۔

کوکلا نے اس بچی کا نام شردھا رکھا۔ اسی کے جنم نے تو اسے شردھا کی دولت عطا کی تھی۔ وہ اسے اپنی لڑکی نہیں، کسی دیوی کا اوتار سمجھتی تھی۔ اس کی بازاری ہمجولیاں اسے مبارک باد دینے آتیں۔ پر کوکلا بچی کو ان کی نظروں سے بچاتی۔ اسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ان کی حیا سوز نگاہیں بچی پر پڑیں۔ وہی اس کی زندگی کی کائنات، اس کی آرزوؤں کا مرکز، اور اس کے راہ حیات کی شمع تھی۔ وہ کبھی کبھی اسے گود میں لیے نگاہ حسرت سے دیکھ کر سوچتی کیا یہ پاکیزہ وجود بھی نفس کی ترغیبات کا شکار ہوگا؟ کیا

میری ساری کوشش رائگاں جائے گی؟ آہ کیا کوئی ایسی دوا نہیں ہے۔ جو خون کے اثر کو زائل کر دے؟ اس کی ساری جبیں سائیوں کا یہی مدعا تھا کہ ایشور اسے ترغیبات نفس سے محفوظ رکھے۔ وہ اپنے قول و فعل سے، خیال اور عمل سے۔ اس کے سامنے ایک بہترین مثال پیش کرے گی۔ شردھا اتنی معصوم، اتنی چونچال، اتنی ذہین، اتنی نکتہ رس تھی کہ کبھی کبھی کوکلا جذبۂ مادری سے مسرور ہو کر اپنی پیشانی کو اس کے تلووں سے رگڑتی اور روتی۔

(2)

سولہ سال گزرگئے۔ بھولی بھالی شردھا اب ایک متین، خود دار مادر پرست نازنین تھی۔ جسے دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ طلب اور جستجو کی دلدادہ، ساری دنیا سے متنفر، ہمجولیوں کے احتراز اور کنارہ کشی نے اسے حد درجہ مغرور بنا دیا تھا۔ اس کی نظروں میں تاہل خدائی قہر سے کم نہ تھا۔ کوکلا اگر کبھی اس کا ذکر کرتی تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ رخ روشن مکدر ہو جاتا۔ آنکھیں آبگوں ہو جاتیں۔ کوکلا خاموش ہو جاتی۔ دونوں کے معیار زندگی جدا تھے۔ کوکلا سماج کے دیوتا کی پجارن شردھا ایشور تک سے منکر۔ اسے کتابوں سے عشق تھا۔ وہاں احتراز نہ تھا۔ اجتناب نہ تھا۔ تحقیر نہ تھی۔ جن اہل کمال کے روبرو دنیا نے سر اطاعت خم کیا۔ وہ اپنے اوراق میں اس سے خلوص کے ساتھ ہم کلام ہوتے۔ وہاں اصل اور کم اصل کا امتیاز نہ تھا۔ ہر کس و ناکس کے لیے دعوت عام تھی۔ رحیم کے لفظوں میں اگر کوئی اسے خاطر سے بلا کر زہر دے دیتا تو وہ اسے قبول کر لیتی۔ بجائے اس کے کہ امرت کے لیے دست سوال پھیلائے۔

ایک دن کوکلا نے چشم پُر آب ہو کر کہا۔ کیوں منّی سچ بتانا تجھے یہ شرم تو آتی ہوگی کہ میں کیوں اس کی بیٹی ہوئی۔ اگر تو کسی شریف خاندان میں پیدا ہوئی ہوتی تو کیا اس وقت بھی تیرے دل میں یہ خیالات آتے تو دل میں مجھے ضرور کوستی ہوگی۔

شردھا ماں کا منہ تکنے لگی۔ اتنی عقیدت اس کے دل میں کبھی نہ پیدا ہوئی تھی۔ بولی۔ اماں آپ مجھ سے کیوں ایسا سوال کرتی ہیں؟ کیا میں نے آپ کی کبھی بے

ادبی کی ہے؟

کوکلا : نہیں بیٹی، تم جیسی نیک بخت لڑکی ایشور سب کو دے۔ مگر کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ تو ضرور میری بیٹی ہونے پر پچھتاتی ہوگی۔

شردھا : آپ کا یہ خیال غلط ہے اماں جی، میں ایشور سے کہتی ہوں کہ آپ کی جتنی عزت میرے دل میں ہے اتنی اور کسی کی نہیں۔ میں آپ کی بیٹی ہونا شرم کا نہیں، فخر کا باعث سمجھتی ہوں۔ انسان حالات کا غلام ہوتا ہے۔ آپ نے جن حالات میں پرورش پائی۔ ان کا آپ کے اوپر اثر پڑنا لازمی تھا۔

مگر آپ کے دل میں بدی کا شائبہ تک نہ تھا۔ بہاؤ کی طرف کشتی کو لے جانا آسان ہے۔ بہادر ملاح وہی ہے جو چڑھاؤ کی طرف کشتی کو لے جائے۔ میں جب آپ کے ایثار اور بے نفسی کا خیال کرتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔

کوکلا : تو پھر شادی کے نام سے کیوں چڑتی ہے؟

شردھا : میں بلا شادی کیے زندگی کو پار لگا سکتی ہوں ودیالیہ سے نکل کر کالج میں داخل ہو جاؤں گی اور دو تین سال میں ضرور اس قابل ہو جاؤں گی کہ آپ کے اور اپنے گذران کے لیے کسی کی دست نگر نہ ہوں۔ ڈاکٹر بن سکتی ہوں۔ وکالت کر سکتی ہوں۔ عورتوں کے لیے ابھی کافی گنجائش ہے۔ کوکلا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ تیرے دل میں اور کوئی خواہش نہیں ہے۔! محبت کے لیے تیرا دل کبھی نہیں تڑپتا؟

شردھا نے متین لہجہ میں کہا۔ اماں جی، محبت انسان کے دل کا ایک لازمی جزو ہے۔ میں تو خیال کرتی ہوں کہ محبت ہی انسان میں ایشور کی کیرتی ہے۔ جب کوئی ایسا آدمی ملے گا جو مجھ سے شادی کرنا اپنی ذلّت کا باعث نہ سمجھے گا تو میں جان ودل سے اس کی پرستش کروں گی۔ لیکن یہ میں ہرگز گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی سے رحم کی بھیک مانگوں۔ اگر کسی نے ترس کھا کر یا مصلحانہ جوش میں مجھ سے شادی کر بھی لی تو میں خوش نہ رہوں گی۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ شادی کا خیال ہی دل میں نہ لاؤں۔

(3)

انھیں دنوں مہلا منڈل کا ایک عام جلسہ ہوا۔ کالجوں کے نظر باز طلباء اتنی

کثرت سے آئے کہ وسیع ہال میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ رہی۔ شردھا بھی آکر عورتوں کی سب سے پچھلی قطار میں کھڑی ہوگئی۔ اسے یہ سب مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ آج تک کسی جلسہ میں شریک نہ ہوئی تھی۔

جلسہ شروع ہوا۔ صدر کی تقریر کے بعد تجویزیں پیش اور منظور ہونے لگیں۔ مگر یا تو مہلائیں اپنی لکھی ہوئی تقریریں بھول گئیں یا ان پر اس شاندار مجمع کا رعب طاری ہوگیا۔ کئی لیڈیاں آئیں اور دوچار جملے بول کر چلی گئیں۔ ناظرین کو مذاق اڑانے کا بہانہ ملا قہقہے پڑنے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں۔ ان کا یہ ناہمدردانہ، بے رحمانہ رویہ دیکھ کر شردھا کملا اٹھی۔ پلیٹ فارم پر آکر اس نے ایسی روانی سے اور ایسی پرجوش تقریر کی کہ دم زدن میں سارا شور وغل فرو ہوگیا اور مجمع پر کامل سکون طاری ہوگیا۔ لوگ ٹکٹکی باندھ کر شردھا کو دیکھنے لگے۔ اس کے انداز بیان پر لوگوں کو حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے حسن نے تقریر میں اور ہی تاثیر بھر دی تھی۔

جلسہ ختم ہوا۔ تو چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ ایک نے پوچھا۔ یہ کون عورت تھی بھئی؟

"اسی کوکلا طوائف کی لڑکی ہے۔"

جبھی یہ آواز اور صفائی ہے، کیوں نہ ہو، اس کی ماں بھی تو ستم ڈھاتی تھی جب سے اس نے گانا چھوڑا۔ شہر کی روح ہی غائب ہوگئی۔ اب یہ اپنی ماں کی جگہ لے گی۔

اس پر ایک سیاہ فام روح کھدر پوش نوجوان بولا۔ کیا خوب قدر دانی فرمائی ہے۔ جناب نے واہ!

آپ کو کیوں برا لگا۔ کچھ سانٹھ گانٹھ تو نہیں ہے۔!

سیاہ فام نوجوان نے تیز ہو کر کہا۔ آپ کو ایسی باتیں منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی؟

شرم کی بات کیا ہے اس میں، طوائف کی لڑکی اگر طوائف ہو تو تعجب کا کون سا موقعہ ہے۔

سیاہ فام نوجوان نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ آپ جیسے باریک فہم آدمیوں کے لیے تعجب کا موقعہ نہ ہوگا۔ مگر ہم جیسوں کے لیے تو ہے جس عورت کے دل

سے ایسے پاکیزہ خیالات نکل سکتے ہیں۔ وہ دیوی ہے۔ حسن فروش نہیں۔

شردھا اسی وقت جلسہ سے رخصت ہو رہی تھی۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑگئے۔ وہ اضطراری طور پر ذرا ٹھٹھک گئی۔ سیاہ فام نوجوان کی طرف احسان مندانہ نظروں سے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ لیکن راستہ بھر اس کے دل میں یہی الفاظ گونجتے رہے۔ لہجہ کتنا مردانہ تھا۔ الفاظ کتنے پاکیزہ! اب تک شردھا کی داد دینے والا دنیا میں اگر کوئی تھا تو وہ کوکلا تھی اور چاروں طرف اس کے اوصاف پر پردہ ڈالا جاتا تھا۔ چاروں طرف وہی ہمت شکن تغافل، وہی جگر خراش تحقیر، آج یہ غائبانہ داد پاکر شردھا کا دل داد طلب متوالا ہوگیا۔ رقص کرنے لگا۔ اس نوجوان کی صورت برابر آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی۔ دل میں سوال پیدا ہوتا۔ وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کیا پھر کبھی اس کے درشن ہوں گے۔

کالج جاتے وقت شردھا چاروں طرف تلاش نظریں ڈالتی، گھر پر چق کی آڑ میں کھڑی گھنٹوں سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھا کرتی۔ پر وہ نوجوان کبھی نظر نہ آتا۔

اسی اثنا میں مہلا منڈل کے ایک دوسرے جلسہ کا اعلان ہوا۔ ابھی چار دن باقی تھے۔ یہ چاروں دن شردھا نے اپنی تقریر کی تیاری میں صرف کیے۔ ایک ایک جملے کو بار بار پڑھتی۔ ایک ایک لفظ کی تلاش میں گھنٹوں محو خیال رہتی، اساتذہ کی تقریروں کا مطالعہ کرتی، جب پوری تقریر تیار ہوگئی تو اس نے کئی بار اپنے کمرہ کی تنہائی میں، کرسیوں اور تصویروں کو مخاطب کر کے اسے ادا کیا۔ فن تقریر کے سارے نکات مجتمع ہوگئے تھے۔ خاتمہ کو اپنی ہی زبان سے سن کر وہ بول اٹھی۔ اس میں کتنا نغمہ تھا، کتنی تاثیر، کتنی گہرائی، خیالات بتدریج ایک ایک مرصع جملے میں بلند تر ہوتے ہوئے ایک آخری یادگار جملے میں روحانیت کے معراج پر پہنچ گئے تھے۔ اسی دن جلسہ تھا۔ شردھا دل میں امید وبیم کا ایک طوفان محسوس کرتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ ہال بھرا ہوا پہلے دن سے بھی زیادہ۔ شردھا کو دیکھتے ہی تالیوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور شور مچ گیا۔ آپ اپنی تقریر شروع کیجیے۔

شردھا نے بینچ پر آکر ایک اڑتی ہوئی نگاہ سے مجمع کو دیکھا۔ وہ سیاہ فام نوجوان جگہ نہ ملنے کے باعث آخری صف میں کھڑا تھا۔ شردھا کے دل میں گدگدی سی

ہونے لگی۔ اس نے کانپتے ہوئے لہجہ میں تقریر شروع کی۔ اس کی نظروں میں سارا ہال پتلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اگر کوئی انسان تھا تو وہی سیاہ فام نوجوان جو آخری صف میں کھڑا تھا۔ اس کا روئے سخن اسی کی طرف تھا۔ وہ اسی سے اپنی تقریر کی داد طلب کر رہی تھی۔ مغنّی بھری ہوئی محفل کی اتنی پرواہ نہیں کرتا جتنی ایک جوہر شناس کی۔

آدھ گھنٹہ تک شردھا کے منہ سے نغمہ اور گل کی بارش ہوتی رہی۔ حقوق نسواں کی ایسی پر زور، پر تاثیر وکالت بہت کم سننے میں آئی تھی۔

(4)

شردھا جب جلسہ ختم ہوجانے پر گھر چلی تواس نے دیکھا کہ وہ سیاہ فام نوجوان اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ شردھا کو یہ تو معلوم تھا کہ اس کی تقریر ناظرین نے بہت پسند کی۔ مگر اس نوجوان کا فیصلہ سننے کا آج اسے موقعہ نہ ملاتھا۔ اس نے اپنی رفتار سُست کر دی۔ اور ایک لحہ بھر میں وہ نوجوان اس کے قریب آگیا۔ دونوں کئی قدم خاموش چلتے رہے۔ آخر نوجوان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ آج تو آپ نے کمال کر دیا۔ شردھا نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ یہ آپ کی قدردانی ہے۔
نوجوان : میں کس قابل ہوں۔ ساری مجلس سر دھن رہی تھی۔

"دولت خانہ یہیں ہے۔"

"غریب الوطن ہوں۔ یہاں ایم۔ اے۔ میں پڑھ رہا ہوں۔ یہ اونچ نیچ کا بھوت نہ جانے کب تک ہمارے سر پر سوار رہے گا۔ بدقسمتی سے میں بھی انھیں لوگوں میں ہوں جنھیں نیچ کہا جاتا ہے۔ چمار ہوں۔ میرے والد ایک انسپکٹر مدارس کے اردلی تھے۔ ان کی سعی وسفارش سے اسکول میں داخل ہوگیا۔ تب سے تقدیر سے لڑتا جھگڑتا چلا آرہا ہوں۔ پہلے تو سکول کے ماسٹر مجھے چھوتے ہی نہ تھے۔ اب وہ کیفیت تو نہیں ہے لیکن لڑکے مجھ سے کھنچے ہوئے ضرور رہتے ہیں۔"

"میں تو انسان کی شرافت پیدائش سے نہیں اس کے اطوار سے مانتی ہوں۔"

"یہ تو آپ کی تقریر ہی سے ثابت ہوا اور اسی وجہ سے مجھے آپ سے باتیں کرنے کی جرأت ہوئی۔ ورنہ کہاں میں، اور کہاں آپ۔"

شردھا نے مشتبہ انداز سے کہا۔ شاید آپ کو میرا حال معلوم نہیں ہے؟

"بخوبی معلوم ہے۔ اگر آپ اپنی ماتا جی کے درشن مجھے کرا دیں تو عین احسان ہو۔"

شردھا نے خوش ہو کر کہا۔ چلیے شوق سے، وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ شبھ نام کیا ہے؟

"مجھے بھگت رام کہتے ہیں۔"

یہ تعارف بتدریج آمد ورفت، بے تکلفی، دوستی کے درمیانی منازل طے کر کے بالآخر محبت کی آخری منزل پر جا پہنچا۔ وہ چمار تھا۔ نہایت درجہ مکروہ، پر شردھا کی نظروں میں دیوتا۔ شردھا ایک طوائف کی بیٹی تھی۔ اس کی نظروں میں دیوی۔

(5)

ایک سال گزر گیا۔ بھگت رام قریب قریب روزانہ دیوی کے درشنوں کو آتا۔ دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ شردھا کوئی تقریر کرتی تو بھگت رام سارے کام چھوڑ کر سننے آتا۔ اس کے منصوبے ایک تھے۔ زندگی کا نقشہ ایک، مذاق ایک، بھگت رام محبت اور اس کے رموز پر خوب گل فشانی کرتا اس کی باتوں میں شعریت اور رنگینی کو کبھی اتنا دخل نہ تھا۔ اظہار جذبات میں اسے کمال حاصل ہوگیا تھا۔ لیکن عین موقعوں پر جب شردھا کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی۔ اس کے رخسار اشتیاق سے سرخ ہو جاتے۔ جسم کا ایک ایک عضو ترجمان دل بن جاتا، بھگت رام موضوع کلام کو بدل دیتا اور اتنا بے گانہ بن جاتا، گویا وہ اس کوچہ سے ناآشنا ہے اور جلد ہی کوئی بہانہ بنا کے کھسک جاتا۔ شردھا اس کے چلے جانے پر حسرت کے آنسو بہاتی اور سوچتی، کیا انھیں دل سے میری محبت نہیں؟

ایک دن کوکلا نے بھگت رام کو تخلیہ میں بلا کر کہا۔ بیٹا اب تو مُنّی سے تمھاری شادی... ہو جائے تو اچھا، زندگی کا کیا اعتبار، کہیں مر جاؤں تو یہ آرزو دل میں رہ جائے۔

بھگت رام نے سر جھکا کر کہا۔ اماں ذرا اس امتحان میں کامیاب ہو جانے دو۔ روزی کا مسئلہ حل ہو جانے پر ہی شادی زیب دیتی ہے۔

"یہ سب تمھارا ہی تو ہے، کیا میں ساتھ باندھ لے جاؤں گی؟

"یہ آپ کی شفقت ہے اماں جی! مگر اتنا بے غیرت نہ بنایئے۔ میں شردھا کا ہو چکا۔ اب تو آپ دھتکاریں بھی تو اس دروازہ سے نہیں ٹل سکتا۔ مجھ جیسا خوش نصیب آدمی دنیا میں کون ہے! لیکن دیوی کے مندر میں جانے سے پہلے کچھ پان پھول تو پاس ہونا چاہیے۔

سال بھر اور گزر گیا۔ بھگت رام نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے ہی کالج میں مالیات کا پروفیسر ہوا۔ اس دن کو کلا نے خوب دان پن کیا جب بھگت رام نے آکر اس کے پیروں پر سر جھکایا تو اس نے اسے چھاتی سے لگا لیا۔ اسے یقین تھا کہ آج بھگت رام ضرور شادی کا مسئلہ چھیڑے گا۔ شردھا مجسم انتظار ہو رہی تھی۔ اس کا ایک ایک عضو گویا سو سو تار ہو کر نغمہ ریز ہو رہا تھا۔ دل پر ایک نشہ چھایا ہوا تھا۔ پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنکھیں غرور سے لبریز ہو رہی تھیں۔ بھگت رام کو دیکھتے ہی بولی۔ اماں! اب ہمیں ایک ہلکا سا موٹر لے دیجیے گا۔

کوکلا نے مسکرا کر کہا۔ ہلکا سا کیوں بھاری سا لے لینا پہلے کوئی اچھا سا مکان تو تجویز کر لو۔

شردھا بھگت رام کو اپنے کمرہ میں بلا لے گئی۔ دونوں بیٹھ کر نئے مکان کی سجاوٹ کا ذکر کرنے لگے۔ فرش، پردے، تصاویر، کا ذکر ہوا۔ شردھا نے کہا روپے ابھی اماں جی سے لے لیں گے۔

بھگت رام بولا۔ ان سے روپے لیتے مجھے شرم آئے گی۔

شردھا نے مسکرا کر کہا۔ آخر میرے جہیز کے روپے تو دیں گی۔ کیا پانچ ہزار میں بھی کلام ہے۔

دونوں گھنٹے بھر باتیں کرتے رہے۔ مگر وہ حرف التجا جسے سننے کے لیے شردھا کا دل بے قرار ہو رہا تھا، آج بھی اس کی زبان پر نہ آیا اور وہ رخصت ہو گیا۔ کوکلا نے ڈرتے ڈرتے شردھا سے پوچھا، کیا باتیں ہوئیں؟

شردھا نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔ اگر میں ایسی بھاری ہو رہی ہوں، تو کنوئیں میں کیوں نہیں ڈال دیتیں؟

یہ کہتے کہتے اس کے ضبط کی دیوار ٹوٹ گئی۔ وہ جذبات درد جو اب تک اندر

ہی اندر ٹیس رہ تھے۔ نکل پڑے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
کوکلا نے غصہ سے کہا۔ جب کچھ بات چیت ہی نہیں کرنی ہے تو روز آتے کیوں ہیں۔ کوئی ایسے عالی خاندان بھی تو نہیں اور نہ ایسے دھنا سیٹھ ہی ہیں۔ شردھا نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ اماں جی! میرے سامنے انھیں کچھ نہ کہیے۔ وہ زبان سے چاہے کچھ نہ کہیں۔ مگر دل سے کہہ چکے اور میں کانوں سے چاہے کچھ نہ سنوں پر دل سے سب کچھ سن چکی۔
کوکلا نے شردھا سے کچھ نہ کہا۔ لیکن دوسرے دن بھگت رام سے بولی۔ اب کس سوچ بچار میں ہو بیٹا۔!
بھگت رام نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ اماں جی میں تو حاضر ہوں۔ لیکن گھر والے کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ ذرا فرصت ملے تو گھر جا کر انھیں راضی کر لوں۔ ماں، باپ کو ناراض کرنا بھی تو اچھا نہیں۔
کوکلا خاموش ہوگئی۔

(6)

بھگت رام کے ماں باپ شہر سے دور ایک موضع میں رہتے تھے۔ یہی ان کا ایک لڑکا تھا اور ان کے دل کے سارے حوصلے اسی کی شادی کے منتظر تھے۔ انھوں نے کئی بار اس کی شادی طے کی۔ مگر بھگت رام ہر بار یہی کہہ کر نکل گیا کہ جب تک نوکر نہ ہو جاؤں شادی نہ کروں گا اور اب وہ نوکر ہوگیا تھا۔ اس لیے دونوں ماگھ کی ایک ٹھنڈی، ابر آلود صبح کو لدے پھندے بھگت رام کے پاس آپہنچے۔ بھگت رام نے دوڑ کر ان کے قدموں پر سر جھکا دیا اور خیروعافیت پوچھنے کے بعد بولا۔ آپ لوگوں نے اس جاڑے پالے میں کیوں تکلیف کی مجھے بلا لیا ہوتا۔
چودہری نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ سنتی ہو، بچہ کی اماں، اس کی باتیں جب بلاتے ہیں تو کہتا ہے امتحان ہے۔ یہ ہے، وہ ہے۔ اب جو آگئے تو کہتا ہے مجھے کیوں نہ بلا بھیجا۔ تمھاری شادی ٹھیک ہوگئی ہے۔ اب ایک مہینہ کی چھٹی لے کر ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ اسی لیے ہم دونوں آئے ہیں۔
چودھرائن : ہمیں نے کہا۔ بے گئے کام نہ چلے گا۔ تو آج ہی درکھاس دے دو۔ لڑکی

بڑی سندر پڑھی لکھی۔ اچھے کل کی ہے۔

بھگت رام نے شرماتے ہوئے کہا۔ میری شادی تو یہیں ایک جگہ لگی ہوئی ہے! اگر آپ لوگ راضی ہوں تو کر لوں۔

چودھری : اس شہر میں ہماری برادری کا کون ہے۔ کاہے بچہ کی اماں؟

چودھرائن : یہاں ہماری برادری کا کوئی نہیں ہے۔

بھگت رام : ماں بیٹیاں ہیں۔ گھر میں روپیہ ہے۔ لڑکی ایسی ہے کہ تم دیکھ کر خوش ہو جاؤ گے۔ مفت میں شادی ہو جائے گی۔

چودھری : لڑکی کا باپ مر گیا ہے؟ اس کا نام کیا تھا۔ کہاں کا رہنے والا ہے۔ کل مرجاؤ کا کیسا ہے؟ جب تک یہ ساری باتیں معلوم نہ ہو جائیں بیاہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیوں بچہ کی اماں؟

چودھرائن : اس کا پتہ لگائے بنا کیسے ہو سکتا ہے؟

بھگت رام نے کچھ جواب نہ دیا۔

چودھری : یہاں کس محلہ میں رہتی ہیں ماں بیٹی؟ سارا شہر ہمارا چھانا پڑا ہے۔ یہاں ہم کوئی بیس سال رہے ہوں گے کیونکہ بچہ کی اماں۔

چودھرائن : بیس سال سے جیادہ رہے ہوں گے۔ یہاں رہے کوئی 25 سال۔

بھگت رام : ان کا گھر نخاس پر ہے۔

چودھری : نخاس کے کس طرف؟

بھگت رام : نخاس کے سامنے والی گلی میں پہلا مکان انھیں کا ہے۔ سڑک سے دکھائی دیتا ہے۔

چودھری : پہلا مکان تو کوکلا رنڈی کا ہے۔ وہی دو مجلّا مکان ہے۔ ہم اسپٹر صاحب کی اردلی میں تھے تو بن رہا تھا۔ گلابی رنگ سے پوتا ہوا ہے؟

بھگت رام نے جھینپتے ہوئے کہا جی ہاں وہی مکان ہے؟

چودھری : تو اب کوکلا رنڈی اس میں نہیں رہتی۔

بھگت رام : رہتی کیوں نہیں۔ ماں بیٹی دونوں رہتی ہیں۔

چودھری : تو کیا کوکلا رنڈی کی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتے ہو۔

بھگت رام : میں تو کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔
چودھری : ناک کٹوانے پر لگے ہو کیا۔ برادری میں کوئی پانی تک تو پئے گا نہیں۔
چودھرائن : لو کانہ لگا دوں منہ میں رانڈ کے۔ روپ رنگ۔ دیکھ کے لبھا گئے کیا؟
بھگت رام : میں تو اسے اپنے بڑے بھاگ سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے پر راضی ہے۔ آج وہ چاہے تو کسی بڑے سے بڑے رئیس سے اس کا بیاہ کر سکتی ہے۔
چودھری : رئیس اس سے بیاہ نہ کرے گا۔ رکھ لے گا۔ تمھیں بھگوان سمائی دیں۔ ایک نہیں د س رکھو۔ مردوں کے لیے کون روک ہے لیکن جو بیاہ کی بات کہتے ہو۔ تو بیاہ وہی ہے جو برادری میں ہو۔
چودھرائن : بہت پڑھنے سے آدمی بورا ہو جاتا ہے۔
چودھری : ہم تو گنوار آدمی ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا تمھاری یہ نیت کیسے ہوئی۔ رنڈی کی بیٹی اندر کی پری ہو۔ ہے تو رنڈی کی بیٹی نہ، ہم تمھارا بیاہ وہاں نہ ہونے دیں گے۔ اگر تم نے اس سے بیاہ کیا تو ہم دونوں تمھارے اوپر جان دے دیں گے۔ اتنا سمجھ لو، کیوں بچہ کی اماں۔
چودھرائن : بیاہ کیسے کر لیں گے۔ ٹھٹھا ہے۔ جھاڑو مار کے بھگا دوں گی رانڈ کو اپنی بیٹی اپنے گھر میں رکھے۔
بھگت رام : خیر اگر آپ لوگوں کی مرضی نہیں ہے تو میں اس سے شادی نہ کروں گا۔ شادی کروں گا تو اسی سے۔ ورنہ بن بیاہا رہوں گا۔
چودھرائن : ہاں تم کنوارے رہو۔ یہ ہمیں منجور ہے۔ پتریا کے گھر ہم بیاہ نہ کریں گے۔

بھگت رام نے اب کے جھنجھلا کر کہا۔ آپ اسے بار بار پتریا کیوں کہتی ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ اس کا پیشہ رہا ہوگا۔ آج جتنے دھرم سے وہ رہتی ہے شاید ہی کوئی دوسری عورت رہتی ہو۔ ایسی پارسا، ایسی نیک عورت تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔

مگر بھگت رام کی سرگرمیاں بے اثر ثابت ہوئیں۔ چودھری اور چودھرائن نے ایسی ضد پکڑی کہ جو پھر بھی نہ ہلے۔ جاہلانہ ضد جھکنا نہیں جانتی۔

رات کو بھگت رام کوئے یار میں پہنچا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ایک ایک عضو سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ شردھا چشم براہ بیٹھی گھبرا رہی تھی کہ آج اتنی رات تک آئے کیوں نہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ میرے دل کی کیا حالت ہو رہی ہے جب یار دوستوں سے فرصت ملے گی تو بھول کر ادھر آجائیں گے۔

کوکلا نے کہا۔ میں تو تجھ سے کہہ چکی کہ اب ان کا وہ مزاج نہیں رہا۔ پھر بھی تو نہیں مانتی۔ آخر اس ٹال مٹول کی کوئی حد بھی ہے۔

شردھا نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ اماں جی میں آپ سے بار بار عرض کر چکی کہ میں رسماً کنواری ضرور ہوں۔ لیکن معناً ان کی بیاہتا ہو چکی۔ اگر ایسا آدمی بھی اعتبار کے قابل نہیں ہے تو میں نہیں جانتی دنیا میں اور کس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں آپ کے پیروں پڑتی ہوں۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کیجیے۔ مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے۔

اسی وقت بھگت رام صورت درد بنے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ دونوں عورتوں نے ان کی طرف دیکھا۔ کوکلا نے نگاہ شکایت سے، شردھا نے نگاہ اضطراب سے، کوکلا کی آنکھیں کہہ رہی تھیں یہ تمھارے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ شردھا کے چہرہ سے وحشت برس رہی تھی۔

بھگت رام نے معذرت کے لہجہ میں کہا۔ آپ لوگوں کو آج میرا بہت انتظار کرنا پڑا۔ مگر میں مجبور تھا۔ گھر سے اماں اور دادا آئے ہوئے ہیں۔ انھیں سے باتیں کرتا رہا۔

کوکلا بولی، گھر پر تو سب خیریت ہے نہ؟

بھگت رام نے حسرت سے کہا۔ جی ہاں گھر پر تو سب خیریت ہے۔ میری شادی کا مسئلہ پیش تھا۔ پرانے خیال کے لوگ ہیں۔ کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔

خوددار کوکلا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ بولی، ہاں کیوں راضی ہونے لگے۔ ہم لوگ ان سے بھی نیچ ہیں نہ۔ مگر جب تمھیں انھیں کی مرضی پر چلنا تھا تو پہلے ان سے پوچھ کر یہاں آتے، اس طرح ہمیں ذلیل کرنا تو شرافت نہ تھی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ تم ماں باپ کے اتنے غلام ہو تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔

شردھا نے دیکھا۔ بھگت رام کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔ معاً اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ محبت ہم آہنگی جذبات کے سوا اور کیا ہے۔ شکایت آمیز نظروں سے ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔ اماں! ماں، باپ کی مرضی کا غلام ہونا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر میں آپ کی پروا نہ کروں تو آپ کو کتنا صدمہ ہوگا۔ یہی کیفیت ان لوگوں کی بھی تو ہوگی میں اسے اپنی بدنصیبی سمجھوں گی کہ میری وجہ سے ان لوگوں کا دل ان کی طرف سے پھر جائے۔ یہ کہتی ہوئی وہ اپنے کمرہ کی طرف چلی اور بھگت رام کو بھی اشارے سے بلایا۔ وہاں دونوں بیٹھ کر ایک منٹ تک زمین کی طرف تاکتے رہے۔ تب بھگت رام بولے۔ شردھا، اس وقت میرے دل کی جو کیفیت ہے بیان نہیں کر سکتا۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ زہر کھا کر جان دے دوں۔ تم سے الگ ہو کر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ مر بھی نہیں سکتا۔ صرف تڑپ سکتا ہوں۔ میں نے اماں اور دادا کی کتنی خوشامد کی۔ کتنی منت سماجت کی، رویا، پر انھیں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ شاید میری موت بھی انھیں منظور ہوگی۔ لیکن تم میرے دل کی رانی بنو۔ یہ انھیں منظور نہیں۔

شردھا نے تشفی آمیز انداز سے کہا۔ پیارے مجھ سے ان کی نفرت واجب ہے۔ پڑھے لکھے آدمیوں میں ہی ایسے کتنے ہیں۔ جو تم جیسے آزاد ہوں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ میں کل سویرے ان کے درشن کرنے جاؤں گی۔ شاید میری خدمت سے ان کا دل پگھل جائے۔ میں اس طرح ان کی خدمت کروں گی۔ ان کی دھوتیاں دھوؤں گی۔ ان کے پیر پکھاروں گی۔ جیسے ان کی من چاہی بہو کرتی۔ اس میں شرم کیسی۔ میں ان کے بدن دباؤں گی۔ انھیں بھجن گا کر سناؤں گی۔ مجھے بہت سے دیہاتی گیت آتے ہیں۔ اماں جی کے سر کے سفید بال چنوں گی۔ دادا جی کو چلمیں بھر بھر دوں گی۔ میں فیشن کی لونڈی نہیں، محبت کی چیری ہوں۔ تمھارے لیے میں سب کچھ کروں گی، سب کچھ۔

بھگت رام کو ایسا معلوم ہوا گویا ان کی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی ہے۔ گویا ان کے جسم میں کوئی نئی روح آگئی ہے۔ ان کے دل کی ساری پاکیزگی، ساری عقیدت، ساری رقت آنکھوں سے اس طرح نکل کر شردھا کے پیروں کی طرف جاتی ہوئی

معلوم ہوئی...... جیسے کسی گھر سے ننھے ننھے سرخ رخساروں والے گھونگریلے بالوں والے ریشمی کپڑوں والے، بچے ہنستے ہوئے نکل کر کھیلنے جا رہے ہوں۔

(7)

چودہری اور چودھرائن کو شہر آئے دو ہفتے گزر گئے۔ وہ روز جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور رہ جاتے ہیں۔ شردھا انھیں جانے ہی نہیں دیتی۔ سویرے ان کی نیند کھلتی ہے تو شردھا ان کے اشنان کے لیے پانی گرم کرتی ہوتی ہے۔ چودھری کو اپنا حقہ بھرا ہوا ملتا ہے۔ وہ لوگ جوں ہی نہا کر اٹھتے ہیں۔ شردھا ان کی دھوتی چھانٹنے لگتی ہے۔ دونوں اس کی خدمت اور عقیدت دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ ایسی حسین، ایسی نازک بدن، ایسی شیریں بیان، ایسی ہنس مکھ، ایسی سلیقہ شعار عورت چودھری نے انسپکٹر صاحب کے گھر میں بھی نہ دیکھی تھی۔ چودھری کو وہ دیوی معلوم ہوتی اور چودھرائن کو لکشمی، دونوں شردھا کی شرم اور حیا اور اور پاکیزگی پر حیرت کرتے ہیں۔ حالانکہ برادری اور خاندان کی بندشیں ان کی زبان پر مہر بنی ہوئی ہیں۔ مگر ذاتی منافرت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

پندرھویں دن جب دس بجے رات کو شردھا گھر چلی گئی تو چودھری بولے لڑکی تو اچھی ہے۔

چودھرائن : جب میری دھوتی چھانٹنے لگتی ہے تو میں مارے شرم کے مر جاتی ہوں۔ ہماری طرح تو اس کے گھر میں لونڈی ہوگی۔

چودھری : پھر کیا صلاح دیتی ہو۔ ایسی اچھی سنسار میں نہ پاؤگی۔ برادری میں ایسی لڑکیاں کہاں ہیں؟

چودھرائن : رام کا نام لے کر بیاہ کرو۔ بہت ہوگا بھات لگ جائے گا۔ سو روپیہ میں تو بھات ہوتا ہے۔ کون چھپن ٹکے لگے جاتے ہیں۔ پہلے ہمیں سنکا ہوتی تھی کہ پتریا کی لڑکی ہے۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے پر اب ساری سنکا مٹ گئی۔

چودھری : بات کرنے لگتی ہے تو جیسے منہ سے پھول جھڑیں۔

چودھرائن : میں تو اس کی ماں کو بکھانتی ہوں۔ جس کی کوکھ سے ایسی اچھی جنمی۔

چودھری : کل چلو کوکلا سے مل آئیں۔ متی ساعت سب ٹھیک ہو جائے۔
چودھرائن : مجھے تو اس کے گھر جاتے اج آتی ہے وہ رانی بنی بیٹھی ہوگی۔ میں اس کی لونڈی جچوں گی۔
چودھری : پوڈر منگا کر منہ میں پوت لو۔ گوری ہو جاؤگی۔ اسپٹر صاحب کی میم روج پوڈر لگاتی تھیں۔ رنگ تو سانولا تھا۔ جب پوڈر لگالیتی تھیں تو منہ چمکنے لگا تھا۔
پودھرائن : ہم سے ہنسی کروگے تو گالی دوں گی۔ کالی کملی پر کون رنگ چڑھتا ہے۔ کہ پوڈر چڑھ جائے گا۔ تم تو سچ مچ اس کے چوکیدار سے لگوگے۔
چودھری : تو کل اندھرے یہاں سے چل دیں۔ بیٹا آجائے گی تو گلا نہ چھوڑے گی۔ بچہ سے کہہ دیں گے۔ پنڈت سے ساعت متی ٹھیک کر لو۔ انھیں تو آپ جلدی پڑی ہے۔

(8)

چودھری اور چودھرائن کی رضا مندی پا کر کوکلا زیور اور کپڑے اور برتن جہیز کے سامان جمع کرنے لگی۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ بھگت رام کے چہرہ پر ولولہ مسرت کے آثار نہ تھے۔ نہیں وہ کچھ دل گرفتہ سا نظر آتا تھا۔ شردھا کے گھر بلاناغہ جاتا۔ لیکن وہاں بھی کچھ اداس، متفکر، کھویا سا بیٹھا رہتا۔ گھنٹوں محویت کے عالم میں آسمان یا زمین کی طرف تاکتا رہتا۔ شردھا اسے اپنے بیش قیمت جوڑے اور جڑاؤ گہنے دکھاتی۔ اس کے ایک ایک عضو سے مسرت کا جوش چھلکا پڑتا تھا۔ بسنت میں آنے والی کوئل کی طرح اسے بھی اپنے چاروں طرف گل اور بو اور نغمہ کی بہار نظر آتی۔ وہی مستی اور نشہ تھا۔ بھگت رام بھی اس کی خوشی میں شریک ہوتا۔ لیکن اس کی خوشی آورد معلوم ہوتی تھی۔ اس مسرت کی مدہوشی میں شردھا کو وہ آنسو بھی نظر نہ آتے جو کبھی کبھی بھگت رام کے گوشۂ چشم میں بھر آتے تھے۔ ادھر چودھری بھی انتظامات میں مصروف تھے۔ بار بار شہر آتے اور شادی کے سامان خرید لے جاتے۔ بھگت رام کے آزاد خیال احباب بھی خوش تھے۔ وہ اس کی تقدیر پر رشک کرتے۔ محبت کی ایسی لازوال دولت کسے نصیب ہوتی ہے! مگر وہ جو اس ہجوم شادمانی کا باعث تھا چھپ

چھپ کر روتا تھا اور اپنی زندگی سے بیزار تھا۔ چراغ تلے اندھرا چھایا ہوا تھا۔ اس طوفان عظیم کی کسی کو خبر نہ تھی جو اس غریب کے دل کو زیر وزبر کر رہا تھا۔

جوں جوں شادی کا دن قریب آتا تھا۔ بھگت رام کی مصنوعی زندہ دلی بھی غائب ہوئی جاتی تھی۔ جب چار دن رہ گئے تو یکایک اُسے خفیف سا بخار آگیا۔ وہ شردھا کے گھر بھی نہ جا سکا۔ چودھری، چودھرائن اور چند قریبی رشتہ دار آپہنچے تھے۔ مگر سب کے سب شادی کی دھن میں اتنے منہمک تھے کہ اُس کی طرف کسی نے دھیان بھی نہ دیا۔ دوسرے دن بھی وہ گھر سے نہ نکل سکا۔ شردھا نے سمجھا شادی کے رسوم سے فرصت نہ ملی ہوگی۔ تیسرے دن شام کو چودھرائن بھگت رام کو بلانے گئیں تو دیکھا کہ وہ پریشانی اور وحشت کے عالم میں دونوں ہاتھوں کو سپر بنائے، کمرہ کے کونے کی طرف ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ گویا کسی کے وار سے اپنے کو بچاتا ہو۔

چودھرائن نے گھبرا کر پوچھا۔ بچہ کیسی طبیعت ہے؟ پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔!

بھگت رام کے چہرہ پر مجذوبانہ وحشت نمودار تھی۔ آنکھیں سہمی ہوئی تھیں۔ بولا نہیں اماں جی۔ دیکھئے وہ شردھا چلی آرہی ہے۔ دیکھو اس کے دونوں ہاتھوں میں دو کالی ناگنیں ہیں۔ وہ مجھے ان ناگنوں سے ڈسوانا چاہتی ہے ارے اماں۔ دیکھو وہ قریب آگئی۔ شردھا! شردھا! تم میری جان کی کیوں دشمن ہو رہی ہو۔ کیا میری محبت کا یہی صلہ ہے۔ میں تو تمھارے قدموں پر نثار ہونے کے لیے ہمیشہ تیار تھا۔ اس زندگی کی حقیقت ہی کیا ہے۔ تم ان ناگنوں کو دور پھینک دو۔ میں یہیں تمھارے قدموں پر لیٹ کر اپنی جان تمھاری نذر کردوں گا... تم نہ مانو گی۔

یہ کہتے کہتے وہ چت گر پڑا۔ چودھرائن نے لپک کر چودھری کو بلایا۔ دونوں نے بھگت رام کو اٹھا کر چارپائی پر لٹایا۔ چودھری کو معاً کسی آسیب کا شک ہوا۔ وہ فوراً لونگ اور راکھ لے کر آسیب کو اتارنے کی فکر کرنے لگے۔ جنتر منترِ کے علم کے ماہر تھے۔ بھگت رام کا سارا جسم ٹھنڈا تھا۔ مگر سر توے کی طرح تپ رہا تھا۔

رات کو بھگت رام کئی بار چونک چونک کر اٹھا۔ چودھری نے ہر بار منتر پھونک کر اپنے خیال میں آسیب کو بھگا دیا۔

چودھرائن نے کہا۔ کوئی ڈاکدر کیوں نہیں بلا لیتے۔ سائت دوا سے کچھ آرام ہو جائے۔ کل بیاہ ہے اور آج یہ حال۔

چودھری نے دلیرانہ انداز سے کہا۔ ڈاکدر آکر کیا کرے گا۔ وہی پیپل والے بابا تو ہیں۔ دوا دے کر ان سے اور راڑ مول لوں۔ رات جانے دو۔ سویرے ایک بکرا اور ایک بوتل دارو ان کی بھینٹ کر دی جائے گی۔ بس اور کچھ کرنے کی جرورت نہیں۔ ڈاکدر بیماری کی دوا کرتا ہے کہ ہوا بیار کی۔ بیماری انھیں کوئی نہیں ہے۔ کُل کے باہر بیاہ کرنے سے ہی دیوتا لوگ روٹھ گئے ہیں۔

سویرے چودھری نے ایک بکرا منگوایا۔ عورتیں گاتی بجاتی دیوی کے چبوترے کی طرف چلیں۔ جب لوگ لوٹ آئے تو دیکھا بھگت رام کی حالت خراب ہے۔ اس کی نبض ست ہوگئی تھی اور چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی دونوں آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہ کر رخساروں پر آگئے تھے۔ گویا حسرت نے آخری پیغام سنا دیا ہو۔ زندگی کا کتنا دردناک خلاصہ تھا! آنسو کی دو بوندیں۔!

اب چودھری گھبرائے۔ فوراً کو کلا کو خبر دی۔ ایک آدمی ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ ڈاکٹر کے آنے میں تو دیر تھی۔ وہ بھگت رام کے ملاقاتی تھے۔ مگر کوکلا اور شردھا آدمی کے ساتھ ہی آپہنچیں۔ شردھا بھگت رام کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ذرا دیر میں بھگت رام نے آنکھیں کھولیں اور شردھا کو دیکھ کر بولے۔ تم آگئیں شردھا! میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ یہ آخری پیار لو۔ آج اس کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جو آج سے تین سال قبل شروع ہوئی۔ ان تین سالوں میں مجھے جو روحانی کوفت ہوا ہے۔ وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں جانتا تھا۔ تم وفا کی دیوی ہو۔ لیکن رہ رہ کر یہ وہم ہو جاتا تھا۔ کیا تم خون کے اثر کو زائل کر سکتی ہو۔ کیا تم پیدائش کے قدرتی قانون کو توڑ سکتی ہو۔ اس بدگمانی کے لیے مجھے معاف کرنا شردھا! میرا ماتم نہ

کرنا۔ میں تمھارے قابل نہ تھا۔ کسی طرح نہیں، ہاں! اس وہم کی بدولت دنیا سے نامراد جارہا ہوں۔ تمھاری پاکیزہ، لافانی محبت کی یاد ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔ مگر افسوس!

یہ کہتے کہتے بھگت رام کی آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔ شردھا کے چہرہ پر گاڑھی سرخی دوڑ گئی۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے۔ جھکی ہوئی گردن تن گئی۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ آنکھوں میں عزم قوی کی جھلک نظر آئی۔ وہ ایک لمحہ وہاں کھڑی رہی۔ پھر بلا کچھ کہے سنے آکر اپنی گاڑی پر بیٹھ گئی۔ کوکلا اس کے پیچھے پیچھے دوڑی ہوئی آئی اور بولی، بیٹی، یہ غصہ کا موقع نہیں ہے۔ لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔ ان کی حالت ہر لمحہ خراب ہوتی جاتی ہے۔ تمھارے رہنے سے بڈھوں کی تشفی ہوتی رہے گی۔ لیکن شردھا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ کوچبان سے کہا۔ گھر چلو، مجبور ہوکر کوکلا بھی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈے جھونکے آرہے تھے۔ ماگھ کا آخری دن تھا۔ درخت بھی سردی سے اکڑے ہوئے تھے۔ دن کے 9 بج گئے تھے۔ ابھی تک لوگ لحافوں میں منہ ڈھانپے پڑے تھے۔ مگر شردھا کا جسم پسینہ سے تر تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ آفتاب کی ساری حرارت اس کی رگوں میں سما گئی ہے۔ اس کے ہونٹ خشک ہوگئے تھے۔ پیاس سے نہیں۔ اندرونی شعلوں کی لپٹوں سے۔ اس کا ایک ایک عضو اس جلن سے پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بار بار تپتی ہوئی سانس نکلتی تھی۔ گویا کسی تنور کی لپٹ ہو۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس کا پھول سا جسم مرجھا گیا۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ جیسے کسی کالے نے ڈس لیا ہو۔ کوکلا بار بار چشم پرنم سے اس کی طرف تاکتی تھی۔ پر کیا کہے۔! کیسے سمجھائے؟

گھر پہنچ کر شردھا جب اپنے اوپر کے کمرے کی طرف چلی تو اسے اتنی ضعف ہوگیا تھا کہ وہ بہ مشکل تمام زینہ طے کر سکی۔ ہائے! ابھی آدھ گھنٹہ قبل اس کمرے کے درودیوار تک مسرت سے مدہوش تھے۔ اب سب کے سب سر دھنتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بڑے بڑے صندوقوں میں جوڑے سجائے ہوئے رکھے تھے۔ انھیں دیکھ کر

شردھا کے جگر میں ایک ایسی ہوک اٹھی۔ گویا تیر لگ گیا ہو۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ فرش پر گر پڑی۔

یکایک شردھا کی نگاہ اس تصویر پر پڑی جو آج تین سال سے اس کی زندگی کی سب سے پیاری چیز تھی۔ اس تصویر کو اس نے کتنی بار بوسہ دیا تھا۔ کتنی بار گلے لگایا تھا۔ کتنی بار دل سے چمٹایا تھا۔ وہ ساری باتیں جو مایوسی کے جنون میں اس کے دل سے یک لخت مٹ سی گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مصور ہوگئیں۔ دل میں پھر ایک درد اٹھا پہلے سے کہیں زیادہ جاں گزا، کہیں زیادہ طوفان انگیز۔ ہاں مرنے والے کے دل کو اس نے کتنا صدمہ پہنچایا۔ بھگت رام کی بے وفائی کا یہ جواب کتنا بے رحمانہ، کتنا سفاکانہ تھا! وہ کیوں اتنی بے درد ہوگئی۔ اس کا پیارا اس کی نظروں کے سامنے دم توڑ رہا تھا۔ اس کے لیے تشفی اور تسکین کا ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا۔ یہ خون کے اثر کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ آج شردھا کو پہلی بار کوکلا کی بیٹی ہونے پر پچھتاوا ہوا۔ وہ اتنی خودغرض، وہ اتنی کورباطن ہے! اس لافانی محبت کا یہ صلہ ایک طوائف کی بیٹی کے سوا اور کون دے سکتا تھا۔

شردھا اسی وقت بالاخانہ سے اتری اور بے تحاشا بھگت رام کے مکان کی طرف دوڑی۔ وہ آخری بار اس سے گلے ملنا چاہتی تھی۔ آخری بار اس کے درشن کرنا چاہتی تھی کہ وہ مرتے دم تک آئین وفا کو نبھائے گی۔ مرتے دم تک اس کی پرستش کرے گی۔

راستہ میں کوئی سواری نہ ملی۔ نازک بدن شردھا کا دم پھول رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک پسینہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کتنی بار وہ ٹھوکریں کھا کر گری۔ اس کے گھٹنوں سے خون نکل رہا تھا۔ ساڑی کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ مگر اس وقت اسے اپنے تن بدن کی سدھ نہ تھی۔ اس کا ایک ایک رواں ایک ایک ہزار زبان ہو کر ایشور سے التجا کر رہا تھا کہ وہ چراغ سحری ایک لمحہ اور روشن رہے۔ اس کے منہ سے ایک بار شردھا! لفظ سننے کے لیے اس کی روح کتنی بے قرار ہو رہی تھی۔ یہ لفظ سن کر پھر اسے کوئی آرزو نہ رہ جائے گی۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے فریب آرزو سے آزاد ہو جائے گی۔

شردھا کو دیکھتے ہی چودھرائن نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور روتی ہوئی

بولیں! بیٹی تم کہاں چلی گئی تھیں۔ دو بار تمھارا نام لے کر پکار چکے ہیں۔

شردھا کو ایسا معلوم ہوا گویا اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اس کی بینائی رخصت ہوگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جا پڑی ہے اس نے کمرہ میں جاتے ہی بھگت رام کے ٹھنڈے پیروں پر سر رکھ دیا اور اسے آنسوؤں کے گرم قطروں سے دھونے لگی۔ یہی اس کی آرزوؤں کا معراج تھا۔ اس وقت اس کے روحانی سرور کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

بھگت رام نے آنکھیں کھول کر کہا کہ! تم ہو شردھا! میں جانتا تھا تم آؤگی۔ اسی لیے اب تک دم رُکے ہوئے تھے۔ ذرا میرے سینے پر اپنا سر رکھ دو۔ ہاں! اب مجھے یقین ہوگیا کہ تم نے مجھے معاف کردیا۔ جی ڈوب رہا ہے۔ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔ مگر کس منہ سے مانگوں، جب جیتے جی نہ مانگ سکا۔ تو اب کیا ہے۔

ہمارے آخری لمحے یاد ہائے شیریں کے آموختے ہوتے ہیں۔ موت پہلے ہماری عداوتوں اور کدورتوں کو فنا کردیتی ہے۔ جن کی صورت سے ہم بیزار تھے۔ ان سے ایک بار ہم آغوش ہونے کے لیے ہم تڑپ جاتے ہیں۔ جو کچھ کر سکتے تھے، اور نہ کر سکے اس کی حسرت رہ جاتی ہے۔ بھگت رام نے اکھڑے ہوئے حسرت ناک لہجہ میں ان دل فریبیوں کا ذکر کیا۔ جن کا لطف اس نے شردھا کے ساتھ اٹھایا تھا۔ اس لافانی دولت سے وہ اپنی زندگی کو مالا مال کر سکتا تھا۔ آج وہ خالی ہاتھ جا رہا ہے۔ حسرتوں کا ایک انبار لیے ہوئے۔

شردھا، بھگت رام کے سینہ پر جھکی ہوئی رو رہی تھی۔ دفعتاً بھگت رام نے سر اٹھا کر اس کے مرجھائے ہوئے آنسوؤں سے تر رخسار کا بوسہ لے لیا اور فاتحانہ انداز سے بولا یہ ہماری اور تمھاری شادی ہے شردھا۔ یہی میری آخری نذر ہے۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔

شردھا کی آنکھیں پردرد، حسرتناک، مسرت سے جگمگا اٹھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ گویا بھگت رام اس کے سامنے آغوش محبت کھولے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ حالات کو بھول گئی۔ اپنے کو بھول گئی۔ مہلک زخموں سے چور فاتح دم مرگ بھی فتح کا مژدہ پا

کر اپنا درد بھول جاتا ہے۔ موت ایک لمحے کے لیے حقیر ہو جاتی ہے۔ شردھا کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ ایک باوفا، پُر محبت، دل میں جاگزیں ہونے کا یقین، زندگی کی ساری آزمائشوں اور ساری مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس بوسہ کا جواب دے کر کہا۔ پیارے میں تمھاری ہوں اور ہمیشہ تمھاری رہوں گی۔

(یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ 'مادھوری' کے دسمبر 1928 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا 'آگا پیچھا' 'مان سروور' 4 میں شامل ہے۔ اردو میں 'پریم چالیسی' میں شائع ہوا۔ عنوان ہے 'حسن و شباب' یہ مجموعہ میں اسے کشمکش کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔)

استعفا

(1)

دفتر کا بابو ایک بے زبان مخلوق ہے۔ مزدور کو آنکھیں دکھاؤ تو وہ تیوریاں بدل کر کھڑا ہو جائے گا۔ قلی کو ایک ڈانٹ بتاؤ تو سر سے بوجھ پھینک کر اپنی راہ لے گا۔ کسی بھکاری کو دتکارو تو وہ تمھاری طرف پُر قہر نظروں سے دیکھ کر چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ گدھا بھی کبھی کبھی اذیت پا کر دولتیاں جھاڑنے لگتا ہے۔ مگر بے چارے دفتر کے بابو کو آپ چاہے آنکھیں دکھائیں۔ ڈانٹ بتائیں، دتکاریں یا ٹھوکر ماریں۔ اس کے ماتھے پر بل نہ آئے گا۔ اسے اپنے جذبات پر جو قدرت ہوتی ہے وہ شاید کسی نفس کش سادھو میں بھی نہ ہو۔ قناعت کا پتلا، صبر کی مورت، توکل کی تصویر، اطاعت کا مجسمہ، عبودیت کا پیکر، غرض وہ جملہ ملکوتی صفات کا ایک متحرک تو دہ ہوتا ہے۔ مگر افسوس! خس وخاشاک کے تو دہ کے بھی نصیب ایک دن جاگتے ہیں۔ دیوالی کے دن اس پر بھی روشنی ہوتی ہے۔ برسات میں اس پر بھی ہریالی چھاتی ہے۔ قدرت کی دلچسپیوں میں اس کا بھی حصہ ہے۔ مگر اس غریب بابو کے نصیب کبھی نہیں جاگتے اس کی اندھیری تقدیر میں روشنی کا جلوہ کبھی نظر نہیں آتا۔ اس کے زرد چہرہ پر کبھی تبسم کی روشنی نہیں دکھائی دیتی۔ اس کے لیے ہمیشہ سوکھا ساون ہے کبھی ہرا بھادوں نہیں۔ لالہ فتح چند ایسے ہی ایک بے زبان مخلوق تھے۔

کہتے ہیں، آدمی پر اس کے نام کا بھی کچھ اثر پڑتا ہے۔ فتح چند مستثنیات میں تھے۔ انھیں شکست داس کہنا زیادہ سوزوں ہوتا۔ دفتر میں شکست زندگی میں شکست، دوستوں میں شکست، زندگی میں ان کے لیے چاروں طرف شکستیں اور مایوسیاں تھیں۔ لڑکا ایک بھی نہیں۔ لڑکیاں تین، بھائی ایک بھی نہیں۔ بھاوجیں دو۔ گانٹھ میں کوڑی نہیں۔ مگر دل میں رحم اور مروت، سچا دوست ایک بھی نہیں جس سے دوستی ہوئی۔ اس نے دغا دی۔ اس پر صحت کا نام نہیں۔ بتیس سال کی عمر میں بال کھچڑی ہوگئے تھے۔ آنکھیں بے نور، ہاضمہ چوپٹ چہرہ زرد، گال پچکے، شانے جھکے ہوئے نہ دل میں

ہمت نہ جگر میں طاقت، نو بجے دفتر جاتے اور چھ بجے شام کو لوٹ کر گھر آتے۔ پھر گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑتی۔ دنیا میں کیا ہوتا ہے۔ اس کی انھیں مطلق خبر نہ تھی۔ ان کی دنیا، عقبیٰ، لوک پرلوک جو کچھ تھا دفتر تھا۔ نوکری کی خیر مناتے اور زندگی کے دن پورے کرتے تھے۔ نہ مذہب سے غرض تھی، نہ دین سے واسطہ، نہ کوئی تفریح نہ کھیل، تاش کھیلے ہوئے بھی شاید ایک مدت گذر گئی تھی۔

(2)

جاڑوں کے دن تھے۔ آسمان پر کچھ کچھ ابر تھا۔ فتح چند ساڑھے پانچ بجے دفتر سے لوٹے تو چراغ جل گئے تھے۔ دفتر سے آکر وہ کسی سے کچھ نہ بولتے تھے۔ چپکے سے چارپائی پر لیٹ جاتے تھے اور پندرہ بیس منٹ تک بے حس و حرکت پڑے رہتے تھے۔ تب کہیں جاکر ان کے منہ سے آواز نکلتی تھی۔ آج بھی حسب معمول وہ مراقبہ میں ڈوبے۔ مگر ایک ہی منٹ گزرا تھا کہ باہر کسی نے آواز دی۔ چھوٹی لڑکی نے جاکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ دفتر کا چپراسی ہے۔ شاردا شوہر کے منہ ہاتھ دھونے کے لیے لوٹا گلاس مانجھ رہی تھی بولی، اس سے کہہ دے۔ کیا کام ہے۔ ابھی تو دفتر سے آئے ہیں۔ ابھی سے پھر بلاوا آگیا۔

چپراسی نے کہا۔ صاحب نے کہا۔ ابھی بلا لاؤ۔ کوئی بڑا ضروری کام ہے۔ فتح چند کا مراقبہ ٹوٹ گیا۔ سر اٹھا کر پوچھا۔ کیا بات ہے۔ کون بلا رہا ہے۔

شاردا : کوئی نہیں۔ دفتر کا چپراسی ہے۔

فتح چند نے سہم کر کہا۔ دفتر کا چپراسی، کیا صاحب نے بلایا ہے؟

شاردا : ہاں، کہتا ہے، صاحب بلا رہے ہیں۔ یہ کیسا صاحب ہے تمھارا، کہ جب دیکھو بلایا کرتا ہے۔ صبح کے گئے گئے اب تو مکان کو لوٹے۔ اس پر پھر بلاوا آگیا۔ کہہ دو، نہیں آتے۔ اپنی نوکری ہی لے گا یا اور کچھ۔

فتح چند نے صابرانہ لہجہ میں کہا۔ ذرا سن لوں۔ کس لیے بلایا ہے۔ میں نے تو سب کام ختم کر دیا تھا۔ ابھی آتا ہوں۔

شاردا : ذرا جل پان توکرتے جاؤ۔ چپراسی سے باتیں کرنے لگوگے تو تمھیں اندر آنے کی یاد بھی نہ رہے گی۔

یہ کہہ کر وہ ایک پیالی میں تھوڑی سی دالموٹ اور سیو لائی۔ فتح چند اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ یہ چیزیں دیکھیں تو چارپائی پر بیٹھ گئے اور پیالی کی طرف حریصانہ مگر خوفزدہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ لڑکیوں کو دے دیا ہے؟

شاردا نے آنکھیں چڑھا کر کہا۔ ہاں ہاں دے دیا ہے۔ تم تو کھاؤ۔

اتنے میں چھوٹی لڑکی آکر سامنے کھڑی ہوگئی۔ شاردا نے اس کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا تو کیا آکر سر پر سوار ہو گئی۔ جا باہر کھیل۔

فتح چند : رہنے دو، کیوں ڈانٹتی ہو۔ یہاں آؤ چنی، یہ لو دالموٹ لے جاؤ۔ چنی نے ماں کی طرف پُر خوف نظروں سے دیکھا اور باہر بھاگ گئی۔

فتح چند نے کہا۔ کیوں بے چاری کو بھگادیا۔ دو چار دانے دے دیتا تو خوش ہو جاتی۔

شاردا : اس میں ہے ہی کتنا کہ سب کو بانٹتے پھروگے۔ اسے دیتے۔ باقی دونوں نہ آجاتیں کس کس کو دیتے۔

اتنے میں چپراسی نے پھر پکارا۔ بابو جی ہمیں بڑی دیر ہو رہی ہے۔

شاردا : کہہ کیوں نہیں دیتے۔ اس وقت نہ آئیں گے۔

فتح چند : ایسا کیسے کہہ دوں بھائی۔ روزی کا واسطہ ہے۔

شاردا : تو کیا پران دے کر کام کروگے؟ صورت نہیں دیکھتے اپنی۔ معلوم ہوتا ہے چھ مہینے کے مریض ہو۔ فتح چند نے جلدی جلدی دالموٹ کی دو تین پھنکیاں لگائیں۔ ایک گلاس پانی پیا اور باہر کی طرف دوڑے۔ شاردا پان بناتی ہی رہ گئی۔

چپراسی نے کہا : بابو جی، آپ نے بڑی دیر کر دی۔ اب ذرا لپکے چلیے نہیں تو جاتے ہی ڈانٹ بتادے گا۔

فتح چند نے دو قدم دوڑ کر کہا۔ چلیں گے تو بھئی آدمی ہی کی طرح۔ چاہے ڈانٹ بتائے یا دانت دکھائے۔ ہم سے دوڑا تو نہیں جاتا۔ بنگلہ ہی پر ہے نہ؟

چپراسی : بھلا وہ دفتر کیوں آنے لگا۔ بادشاہ ہے کہ دل لگی۔

چپراسی تیز چلنے کا عادی تھا۔ بابو فتح چند بے چارے آہستہ آہستہ جاتے تھے۔ تھوڑی ہی دور چل کر ہانپ اٹھے۔ مگر مرد تو تھے ہی۔ یہ کیسے کہیں کہ بھئی ذرا اور

دھیرے چلو۔ ہمت کر کے قدم اٹھاتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ قلیوں میں درد ہونے لگا اور آدھا راستہ ختم ہوتے ہوتے پیروں نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ سارا جسم پسینہ میں شل ہوگیا۔ سر میں چکر آگیا۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں اڑنے لگیں۔

چپراسی نے للکارا ذرا قدم بڑھائے چلو بابو۔"

فتح چند بڑی مشکل سے بولے۔ "تم جاؤ میں آتا ہوں۔"

وہ سڑک کے کنارے ٹپڑی پر بیٹھ گئے اور سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر دم لینے لگے۔ چپراسی نے ان کی یہ حالت دیکھی تو آگے چلا۔ فتح چند ڈرے کہ یہ شیطان جا کر نہ جانے صاحب سے کیا کہہ دے تو غضب ہی ہو جاوے گا۔ زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھے اور پھر چلے مگر ضعف سے جسم ہانپ رہا تھا۔ اس وقت کوئی بچہ بھی انھیں زمین پر گرا سکتا تھا۔ بارے بہزار خرابی کسی طرح گرتے پڑتے صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔ صاحب بنگلہ میں ٹہل رہے تھے۔ بار بار پھاٹک کی طرف دیکھتے تھے اور کسی کو آتے نہ دیکھ کر دل ہی دل میں جھلاتے تھے۔

چپراسی کو دیکھتے ہی آنکھیں نکال بولے۔ اتنی دیر کہاں تھا؟

چپراسی نے برآمدے کے زینے پر کھڑے کہا۔ ہجور جب وہ آویں، تب تو۔ میں تو دوڑا چلا آرہا ہوں۔

صاحب نے پیر پٹک کر کہا۔ بابو کیا بولا؟

چپراسی: آرہے ہیں ہجور گھنٹہ بھر میں تو گھر میں سے نکلے۔ اتنے میں فتح چند احاطہ کے تار کے اندر سے نکل کر آئے اور جھک کر سلام کیا۔

صاحب نے کڑک کر کہا۔ اب تک کہاں تھا؟

فتح چند نے صاحب کا غضب آلودہ چہرہ دیکھا تو خون سرد ہو گیا۔ بولے حضور ابھی ابھی تو دفتر سے گیا ہوں۔ جوں ہی چپراسی نے آواز دی۔ حاضر ہوا۔

صاحب: جھوٹ بولتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔ ہم گھنٹے بھر سے کھڑا ہے۔

فتح چند: حضور میں جھوٹ نہیں بولتا۔ آنے میں جتنی دیر گئی ہو۔ مگر گھر سے چلنے میں مجھے بالکل دیر نہیں ہوئی۔

صاحب نے ہاتھ کی چھڑی گھما کر کہا۔ چپ رہو۔ سُور۔ ہم گھنٹہ بھر سے کھڑا

ہے۔ اپنا کان پکڑو۔

فتح چند نے خون کا گھونٹ پی کر کہا۔ حضور مجھے دس سال کام کرتے ہو گئے کبھی...

صاحب : چپ رہو سُور۔ ہم کہتا ہے۔ اپنا کان پکڑو۔

فتح چند : جب میں نے کوئی قصور کیا ہو۔

صاحب : چپراسی، اس سور کا کان پکڑو۔

چپراسی نے دبی زبان سے کہا۔ حضور، یہ بھی میرے افسر ہیں۔ میں ان کا کان کیسے پکڑوں؟

صاحب : ہم کہتا ہے۔ اس کا کان پکڑو۔ نہیں ہم تم کو ہنٹروں سے مارے گا۔

چپراسی : حضور میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں۔ مار کھانے نہیں آیا ہوں۔ میں بھی عزت دار آدمی ہوں۔ حضور اپنی نوکری لے لیں۔ آپ جو حکم دیں وہ بجا لانے کو حاضر ہوں۔ لیکن کسی کی عزت نہیں بگاڑ سکتا۔ نوکری تو چار دن کی ہے۔ چار دن کے لیے کیوں زمانہ بھر سے بگاڑ کریں۔

صاحب اب غصہ نہ ضبط کر سکے۔ ہنٹر لے کر دوڑے۔ چپراسی نے دیکھا۔ یہاں کھڑا رہنے میں خیریت نہیں ہے تو بھاگ کھڑا ہوا۔ فتح چند ابھی تک بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ صاحب نے چپراسی کو نہ پایا تو ان کے پاس آیا۔ ان کے دونوں کان پکڑ کر زور سے ہلا دیے۔ بولا، تم سور گستاخی کرتا ہے۔ جاکر آفس سے فائل لاؤ۔

فتح چند نے کان سہلاتے ہوئے کہا۔ کون سا فائل لاؤں حضور؟

صاحب : فائل۔ فائل اور کون سا فائل۔ تم بہرا ہے۔ سنتا ہے ہم فائل مانگتا ہے۔

فتح چند نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا۔ آپ کون سا فائل مانگتے ہیں؟

صاحب : وہی فائل جو ہم مانگتا ہے۔ وہی فائل لاؤ۔ ابی لاؤ

بے چارے فتح چند کو اب اور کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ صاحب بہادر ایک یوں ہی تیز مزاج تھے۔ اس پر حکومت کا غرور اور سب سے بڑھ کر شراب کا نشہ، ہنٹر لے کر پل پڑے تو بیچارے کیا کر لیتے۔ چپکے سے دفتر کی طرف چل پڑے۔

صاحب نے کہا۔ دوڑ کر جاؤ۔ دوڑو۔

فتح چند نے کہا۔ حضور مجھ سے دوڑا نہیں جاتا۔

صاحب : او تم بہت ست ہوگیا ہے۔ ہم تم کو دوڑنا سکھائے گا۔ دوڑو۔ (پیچھے سے دھکا دے کر) دوڑو۔ تم اب بھی نہیں دوڑے گا۔"

یہ کہہ کر صاحب ہنٹر لینے چلے۔ فتح چند دفتر کے بابو ہونے پر بھی انسان ہی تھے۔ اگر وہ طاقت ور ہوتے تو اس بدمعاش کا خون پی جاتے۔ اگر ان کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو اس پر ضرور چلاتے۔ لیکن اس حالت میں تو مار کھانا ہی ان کی تقدیر میں لکھا تھا۔ بے تحاشا بھاگے اور پھاٹک سے بہر نکل کر سڑک پر آگئے۔

(3)

فتح چند دفتر نہ گئے۔ جاکر کرتے ہی کیا، صاحب نے فائل کا نام تک نہ بتایا۔ شاید نشہ میں بھول گیا۔ آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلے۔ مگر اس تحقیر، ذلت اور تنبیہ نے پیروں میں بیڑیاں سی ڈال دی تھیں۔ ماناکہ وہ جسمانی قوت میں صاحب سے کمزور تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی چیز بھی نہ تھی۔ لیکن کیا وہ اس کی باتوں کا جواب بھی نہ دے سکتے تھے۔ ان کے پیروں میں جوتے تو تھے۔ کیا وہ جوتے سے کام نہ لے سکتے تھے۔ پھر کیوں انھوں نے اتنی ذلت برداشت کی؟

مگر چارہ ہی کیا تھا۔ اگر وہ غصہ میں انھیں گولی مار دیتا تو؟ اس کا کیا بگڑتا شاید ایک دو ماہ کی سادہ قید ہو جاتی۔ ممکن ہے دو چار سو روپئے جرمانہ ہوجاتا۔ مگر ان کا خاندان تو خاک میں مل جاتا۔ دنیا میں کون تھا۔ جو ان کی بیوی بچوں کی خبر لیتا۔ وہ کس کے دروازے پر ہاتھ پھیلاتے؟ کاش ان کے پاس اتنے روپے ہوتے۔ جس سے ان کے کنبہ کی پرورش ہوجاتی تو وہ آج اتنی ذلت نہ برداشت کرتے یا تو مر ہی جاتے۔ یا اس شیطان کو کچھ سبق ہی دے دیتے۔ اپنی جان کا انھیں خوف نہ تھا۔ زندگی میں ایسا کون سا سکھ تھا جس کے لیے وہ اس قدر خائف ہوتے۔ خیال تھا تو صرف خاندان کی بے سروسامانی کا۔

آج فتح چند کو اپنی جسمانی بے پائیگی پر جتنا افسوس ہوا اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ اگر انھوں نے شروع ہی سے صحت کا خیال رکھا ہوتا۔ کچھ ورزش کرتے رہتے، لکڑی چلانا جانتے ہوتے، توکیا اس شیطان کی اتنی ہمت ہوتی کہ وہ ان کے کان پکڑواتا۔ اس کی

آنکھیں نکال لیتے۔ کم سے کم انھیں گھر سے ایک چھری لے کر چلنا تھا اور نہ ہوتا دو
چار ہاتھ ہی جماتے، پیچھے دیکھا جاتا۔ جیلخانہ ہی تو ہوتا یا اور کچھ۔

جوں جوں آگے بڑھتے تھے۔ ان کی طبیعت اپنی بزدلی اور بودے پن پر اور بھی
جھنجھلاتی تھی۔ اگر وہ اچک کر اس کے دو چار تھپڑ ہی لگا دیتے تو کیا ہوتا وہی نہ کہ
صاحب کے خانسامے بہرے سب ان پر پل پڑتے۔ اور مارتے مارتے بے دم کر دیتے۔
بال بچوں کے سر پر جو کچھ پڑتی۔ پڑتی۔ صاحب کو اتنا تو معلوم ہوجاتا کہ کسی غریب کو
بے گناہ ذلیل کرنا آسان نہیں ہے۔ آخر آج میں مر جاؤں تو کیا ہو؟ تب کون میرے
عیال کی پرورش کرے گا؟ تب ان کے سر پر جو کچھ پڑے گی۔ وہ آج ہی پڑ جاتی تو
کیا ہرج تھا۔

اس آخری خیال نے فتح چند کو اتنا مشتعل کیا کہ وہ لوٹ پڑے اور صاحب سے
ذلت کا انتقام لینے کے لیے دو چار قدم چلے۔ مگر پھر خیال آیا آخر جو کچھ ذلت ہونی
تھی۔ وہ تو ہو ہی لی۔ کون جانے بنگلہ پر ہو یاکلب چلا گیا ہو۔ شاردا کی بے کسی اور
بچوں کی بے پدری کا خیال بھی آگیا۔ پھر لوٹے اور گھر چلے۔

(4)

گھر میں جاتے ہی شاردا نے پوچھا۔ کس لیے بلایا تھا؟ بڑی دیر ہوگئی۔

فتح چند نے چار پائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ نشہ کی سنک تھی اور کیا۔ شیطان نے
مجھے گالیاں دیں۔ ذلیل کیا۔ بس یہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ دیر کیوں کی؟ ظالم نے
چپراسی سے میرا کان پکڑنے کو کہا۔

شاردا نے طیش میں آکر کہا: تم نے ایک جوتا اتار کر دیا نہیں سور کو۔

فتح چند : چپراسی بہت شریف ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ حضور مجھ سے یہ کام نہ
ہوگا۔ میں نے بھلے آدمیوں کی عزت اتارنے کے لیے نوکری نہیں کی تھی۔
اُسی وقت سلام کر کے چلا گیا۔

شاردا : یہ ہے دلیری۔ تم نے اس صاحب کو کیوں نہیں پھٹکارا؟

فتح چند : پھٹکارا کیوں نہیں، میں نے بھی خوب سنائیں۔ وہ چھڑی لے کر دوڑا۔
میں نے بھی جوتا سنبھالا۔ اس نے مجھے دو تین چھڑیاں جمائیں۔ میں نے بھی

کئی جوتے اڑا دیے۔

شاردا نے خوش ہو کر کہا۔ سچ! اتنا سا منہ ہو گیا ہوگا اس کا۔

فتح چند : چہرے پر جھاڑو سی پھری ہوئی تھی۔

شاردا : بڑا اچھا کیا تم نے اور مارنا چاہیے تھا۔ میں ہوتی تو بغیر جان لیے نہ چھوڑتی۔

فتح چند : مار تو آیا ہوں۔ لیکن اب خیریت نہیں ہے۔ دیکھو کیا حشر ہوتا ہے۔ نوکری تو جائے گی ہی۔ شاید سزا کاٹنی پڑے۔

شاردا : سزا کیوں کاٹنی پڑے گی۔ کیا کوئی انصاف کرنے والا نہیں ہے۔ اس نے کیوں گالیاں دیں؟ کیوں چھڑی جمائی؟

فتح چند : اس کے سامنے میری کون سنے گا۔ عدالت بھی اسی کی طرف ہو جائے گی۔

شاردا : ہو جائے گی ہو جائے۔ مگر دیکھ لینا اب کسی صاحب کی یہ جرأت نہ ہوگی کہ کسی بابو کو گالیاں دے بیٹھے۔ تمھیں چاہیے تھا کہ جوں ہی اس کے منہ سے گالی نکلی لپک کر ایک جوتا رسید کرتے۔

فتح چند : تو پھر اس وقت زندہ لوٹ بھی نہ سکتا۔ ضرور مجھے گولی مار دیتا۔

شاردا : دیکھی جاتی۔

فتح چند نے مسکرا کر کہا: پھر تم لوگ کہاں جاتیں۔"

شاردا : جہاں ایشور کی مرضی ہوتی۔ آدمی کے لیے سب سے بڑی چیز عزت ہے۔ عزت گنوا کر بل بچوں کی پرورش نہیں کی جاتی۔ تم اس شیطان کو مار کر آئے ہو۔ میں غرور سے پھولی نہیں سماتی۔ مار کھا کر آتے تو شاید میں تمھاری صورت سے بھی نفرت کرتی۔ یوں زبان سے چاہے کچھ نہ کہتی۔ مگر دل سے تمھاری عزت جاتی رہتی۔ اب جو کچھ سر پر آئے گی۔ خوشی سے سر پر جھیل لوں گی۔"... کہاں جاتے ہو۔ سنو، سنو... کہاں جاتے ہو؟

فتح چند ایک مجنونانہ جوش میں گھر سے نکل پڑے۔ شاردا پکارتی رہ گئی۔ وہ پھر صاحب کے بنگلہ کی طرف جارہے تھے۔ خوف سے سہمے ہوئے نہیں۔ غرور سے گردن اٹھائے ہوئے آہنی عزم ان کے چہرہ سے جھلک رہا تھا۔ ان کے پیروں میں وہ ضعف، چہرہ پر وہ نقاہت، آنکھوں میں وہ بے کسی نہ تھی۔ ان کی کایا پلٹ سی ہو گئی تھی۔ اس

خستہ تن، نیم جاں، زرد رُو، لاغر اندام دفتری بابو کی جگہ اب ایک مردانہ صورت چلاق و چست ہمت سے بھرا ہوا۔ مضبوط ہوا جوان تھا۔ انھوں نے پہلے ایک دوست کے گھر جاکر اس کا ڈنڈا لیا اور اکڑتے ہوئے صاحب کے بنگلہ پر جا پہنچے۔

(5)

اس وقت نو بجے تھے۔ صاحب کھانے کی میز پر تھے۔ مگر فتح چند نے آج ان کے میز پر سے اٹھ جانے کا انتظار نہ کیا۔ خانساماں تو کمرہ سے باہر نکلا اور وہ چک اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ زمین پر ایسی قالین بچھی ہوئی تھی۔ جیسی فتح چند کی شادی میں بھی نہ بچھی ہوگی۔ صاحب بہادر نے اس کی طرف خونبار نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تم کیوں آیا؟ باہر جاؤ کیوں اندر چلا آیا؟

فتح چند نے کھڑے کھڑے ڈنڈا سنبھال کر کہا۔ تم نے مجھ سے ابھی فائل مانگا تھا۔ وہی فائل لے کر آیا ہوں۔ کھانا کھالو تو دکھاؤں۔ جب تک میں بیٹھا ہوں۔ اطمینان سے کھاؤ۔ شاید یہ تمھارا آخری کھانا ہوگا۔ اس وجہ سے خوب سیر ہو کر کھالو۔

صاحب سناٹے میں آگئے۔ فتح چند کی طرف خوف اور غصہ کی نظروں سے دیکھا اور کانپ اٹھے۔ فتح چند کے چہرہ پر سفاکانہ عزم جھلک رہا تھا۔ صاحب سمجھے گئے۔ یہ شخص اس وقت مرنے مارنے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔ قوت میں فتح چند ان کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ یقینی تھا کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں بلکہ لوہے سے دینے کو آمادہ ہے۔ اگر وہ فتح چند کو سخت و سُست کہتے ہیں تو کیا عجب ہے ڈنڈا لے کر پل پڑے۔ ہاتھا پائی کرنے میں باوجودیکہ انھیں غالب آنے کا یقین تھا۔ لیکن بیٹھے بٹھائے ڈنڈے کھانا بھی تو کوئی دانشمندی نہیں، کتے کو آپ ڈنڈے سے ماریے۔ ٹھکرایئے۔ جو چاہے کیجیے۔ مگر اسی وقت تک جب تک وہ غراتا نہیں۔ ایک بار وہ غرا کر دوڑ پڑے تو پھر دیکھیں آپ کی ہمت کہاں جاتی ہے۔ یہی حال اس وقت صاحب بہادر کا تھا۔ جب تک یقین تھا کہ فتح چند گھڑکی، دھرکی، ہنٹر ٹھوکر، سب کچھ خموشی سے برداشت کرلے گا۔ تب تک آپ شیر تھے۔ اب وہ تیوریاں بدلے ڈنڈا سنبھالے بلی کی طرح گھات لگائے کھڑا ہے۔ زبان سے کوئی کلمہ ناملائم نکلا اور اس نے ڈنڈا چلایا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے برخاست کر سکتے ہیں۔ اگر مارتے ہیں تو مار کھانے کا بھی

خوف، اس پر فوجداری میں مقدمہ دائر ہوجانے کا اندیشہ، مانا کہ وہ اپنے اثر اور وقار سے بالآخر فتح چند کو جیل میں ڈلوادیں گے۔ لیکن پریشانی اور بدنامی سے کسی طرح نہ بچ سکتے تھے۔ ایک دانشمند دور اندیش آدمی کی طرح انھوں نے حالات حاضرہ کا دل میں تبصرہ کر لیا اور بولے اوہو! ہم سمجھ گیا۔ آپ ہم سے ناراض ہے۔ ہم نے کیا آپ کو کچھ کہا ہے۔ آپ کیوں ہم سے ناراض ہے؟

فتح چند نے تن کر کہا۔ تم نے ابھی آدھ گھنٹہ قبل میرے کان پکڑے تھے۔ اور مجھے سینکڑوں اول فول کہا۔ کیا اتنی جلد بھول گئے؟

صاحب : میں نے آپ کا کان پکڑا۔ اہہہ ہہ ہہ، میں نے آپ کا کان پکڑا۔ اہہ اہہ ہہ ہہ، کیا مذاق ہے۔ کیا میں پاگل ہوں، یا دیوانہ

فتح چند : تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ چپراسی گواہ ہے۔ آپ کے نوکر چاکر بھی دیکھ رہے تھے۔

صاحب : کب کا بات ہے؟

فتح چند : ابھی ابھی کوئی آدھ گھنٹہ ہوا۔ آپ نے مجھے بلایا تھا اور بے وجہ میرے کان پکڑے اور دھکے دیے۔

صاحب : او! بابو جی، اس وقت ہم نشہ میں تھا۔ بہرا نے ہم کو بہت دے دیا تھا۔ ہم کو کچھ کھبر نہیں۔ کیا ہوا مائی گاڈ! ہم کو کچھ کھبر نہیں

فتح چند : نشہ میں اگر تم نے مجھے گولی مار دی ہوتی تو کیا میں مر نہ جاتا۔ اگر تمھیں نشہ تھا اور نشہ میں سب کچھ معافی کے قابل ہے تو میں بھی نشہ میں ہوں۔ سنو میرا فیصلہ یا تو اپنے کان پکڑو کہ پھر کبھی بھلے آدمی کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کروگے یا میں آکر تمھارے کان پکڑوں گا۔ سمجھ گئے نہیں۔ ''اِدھر اُدھر ہلو نہیں۔'' تم نے جگہ چھوڑی اور میں نے ڈنڈا چلایا۔ پھر کھوپڑی ٹوٹ جائے تو میری خطا نہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں۔ وہ بے عذر کرتے چلو۔ پکڑو کان۔

صاحب نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔ ویل بابو جی، آپ بہت دل لگی کرتا ہے۔ اگر ہم نے آپ کو بُرا بات کہا ہے۔ تو ہم آپ سے معافی مانگتا ہے۔

فتح چند : (ڈنڈا تول کر) نہیں، کان پکڑو۔

صاحب آسانی سے اتنی ذلت نہ برداشت کر سکے۔ وہ لپک کر اٹھے اور چاہا کہ

فتح چند کے ہاتھ سے لکڑی چھین لیں۔ لیکن فتح چند غافل نہ تھا۔ صاحب میز سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے ڈنڈے کا بھرپور اور تلا ہوا ہاتھ چلایا۔ صاحب ننگے سر تو تھے ہی۔ چوٹ سر پر پڑ گئی۔ کھوپڑی بھنا گئی۔ ایک منٹ تک سر کو پکڑے رہنے کے بعد بولے ہم تم کو برکاست کردے گا۔

فتح چند : اس کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔ مگر آج میں تم سے بلا کان پکڑائے نہ جاؤں گا۔ کان پکڑ کر وعدہ کرو۔ پھر کسی بھلے آدمی کے ساتھ ایسی بے ادبی نہ کروگے۔ ورنہ میرا دوسرا ہاتھ پڑا ہی چاہتا ہے۔

یہ کہہ کر فتح چند نے پھر ڈنڈا اٹھایا۔ صاحب کو ابھی تک پہلی چوٹ نہ بھولی تھی۔ اگر کہیں یہ دوسرا ہاتھ پڑ گیا تو شاید کھوپڑی کھل جائے۔ کان پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''اب آپ خوش ہوا۔''

''پھر تو کبھی کسی کو گالی نہ دوگے؟''

''کبھی نہیں''

''اگر کبھی پھر ایسی حرکت کی تو سمجھ لینا۔ کہ میں کہیں بہت دور نہیں ہوں۔''

''اب کسی کو گالی نہ دے گا''

اچھی بات ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ آج سے میرا استعفیٰ ہے۔ میں کل استعفیٰ میں یہ لکھ بھیجوں گا کہ تم نے مجھے گالیاں دیں۔ اس لیے میں نوکری نہیں کرنی چاہتا۔ سمجھ گئے۔

صاحب : آپ استیپا کیوں دیتا ہے۔ ہم تو برکھاست نہیں کرتا۔

فتح چند : اب تم جیسے پاجی آدمی کی ماتحتی نہ کروں گا۔''

یہ کہتے ہوئے فتح چند کمرہ سے باہر نکلے اور بڑے اطمینان سے گھر چلے۔ آج انھیں سچی فتح کی خوشی کا تجربہ ہوا۔ زندگی میں یہ مسرت کبھی نہ حاصل ہوئی تھی۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی کے ماہنامہ 'بھارتبندے' کے دسمبر 1928 کے شمارے میں شائع کیا گیا پھر 'مان سروور' 5 میں شامل ہے۔ اردو میں 'پریم چالیسی' میں شائع کیا گیا۔)

کفارہ

(1)

ڈسٹرک بورڈ کے ہیڈ کلرک بابومداری لال کو کئی بار جگر دوز سانحات کے سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن ان کا چہرہ کبھی اتنا زرد اور دل کبھی اتنا پامال نہیں ہوا تھا۔ جتنا وہ سرکاری لفافہ کھول کر ہوا جو ایک دن دس بجے دفتر آتے ہی انھیں ملا۔ لفافہ ہاتھ میں لے کر وہ کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑے رہے گویا سارے حواس مفلوج ہوگئے ہوں۔ گویا دنیا ان کی نظروں میں تاریک ہوگئی ہو۔ بورڈ کے سکریٹری صاحب نے پنشن لے لی تھی اور اس لفافہ میں نئے سکریٹری کے تقرری کا حکم تھا۔ اسی نئے تقرر پر بابو صاحب کی صورت اتنی متغیر ہو گئی تھی۔ سرکار نے سبودھ چندر کو اس عہدہ پر مامور کیا تھا اور سبودھ چندر وہ شخص تھا جس کے نام سے ہی بابو مداری لال کو نفرت تھی۔ وہ سبودھ چندر جو ان کا ہم جماعت تھا۔ جسے زک دینے کے لیے انھوں نے بارہا کوشش کی اور ہمیشہ ناکام رہے۔ وہ آج ان کا افسر ہو کر آرہا تھا۔ سبودھ چندر کی بہت دنوں سے کوئی خبر نہ ملی تھی۔ وہ لڑائی میں شریک ہو کر بصرہ چلا گیا تھا۔ بابو صاحب نے سمجھا تھا وہیں مر گیا ہوگا۔ مگر آج وہ سکریٹری ہوگیا اور مداری لال کو اس کی ماتحتی میں کام کرنا پڑے گا۔ اس ذلت سے تو موت بدرجہا بہتر تھی۔ یقیناً سبودھ کو سکول اور کالج کے واقعات یاد ہوں گے۔ مداری لال نے اسے سکول سے نکلوا دینے کے لیے کئی بار سازشیں کیں۔ غلط اتہام لگائے، بدنام کیا، کیا سبودھ وہ ساری باتیں بھول گیا ہوگا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ آتے ہی انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔ اور مداری لال کو جاں بری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

مداری لال کو سبودھ سے بغض للّٰہی تھا۔ دونوں ایک ہی دن، ایک ہی مدرسہ میں داخل ہوئے تھے اور اسی دن مداری لال کے دل میں حسد کی آگ مشتعل ہو گئی تھی۔ سبودھ کا قصور صرف یہی تھا کہ وہ مداری لال سے زیادہ ذہین، زیادہ حاضر جواب، اور زیادہ خندہ پیشانی تھا۔ اور مداری لال نے اس کا قصور کبھی معاف نہیں کیا۔

جب سبودھ ڈگری لے کر اپنے گھر چلا گیا اور مداری لال فیل ہو کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں نوکر ہوگیا تب اُسے قدرے اطمینان ہوا۔ جب معلوم ہوا کہ سبودھ بصرہ جا رہا ہے تب مداری لال کے چہرہ پر ہلکا سا تبسم نظر آیا تھا۔ ان کے دل سے وہ دیرینہ خلش نکل گئی تھی۔ مگر وائے ناکامی! آج وہ پرانا ناسور صدگونہ سوزش اور تپش کے ساتھ کھل گیا۔ آج ان کی قسمت سبودھ کے ہاتھ میں تھی اور مداری لال کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دریا میں بہے جا رہے ہیں۔

جب ذرا اوسان بجا ہوئے تو مداری لال نے دفتر کے کلرکوں کو سرکاری حکم سناتے ہوئے کہا۔ اب آپ لوگ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہئے گا۔ سبودھ چندر وہ آدمی نہیں ہیں جو غلطیوں کو نظر انداز کر جائیں۔

ایک کلرک نے پوچھا۔ ”کیا بہت سخت ہیں؟“

مداری لال نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ تو آپ لوگوں کو دو ہی چار دن میں معلوم ہو جائے گا۔ میں کیوں اپنی زبان سے کسی کی شکایت کروں۔ بس آگاہ کر دیا کہ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہئے گا۔ آدمی لائق ہے۔ مگر انتہا درجہ غصہ ور، نہایت مغرور اور بدمزاج، خودہزاروں ہضم کر جائے اور ڈکار تک نہ لے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی ماتحت ایک کوڑی بھی ہضم کرنے پائے۔ ایسے آدمی سے ایشور ہی بچائے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ رخصت لے کر گھر چلا جاؤں۔ دونوں وقت حاضری بجا لانی ہوگی۔ آپ لوگ آج سے دفتر کے ملازم نہیں، سکریٹری صاحب کے ملازم ہیں۔ کوئی ان کے لڑکے کو پڑھائے گا، کوئی بازار سے سودا سلف لائے گا، کوئی انھیں اخبار سنائے گا، اور چپراسیوں کے تو شاید دفتر میں درشن ہی نہ ہوں گے۔“

اسی طرح سارے دفتر کو سبودھ کی طرف سے بدظن کر کے مداری لال نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

(2)

سبودھ چندر اس کے ایک ہفتہ بعد گاڑی سے اترے تو اسٹیشن پر بورڈ کے سارے عملہ کو حاضر پایا۔ سب ان کا استقبال کرنے آئے تھے۔ مداری لال کو دیکھتے ہی سبودھ لپک کر ان کے گلے سے لپٹ گئے اور بولے ”تم خوب ملے، بھئی یہاں کیسے

آئے؟" اوہ! آج دس سال کے بعد ملاقات ہوئی، کہاں ہو اب؟

مداری لال بولے۔ "یہاں ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہوں۔ آپ خریت سے تو ہیں۔!"

سبودھ : "اجی میری نہ پوچھو بصرہ، فرانس اور نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا۔ تم دفتر میں ہو۔ یہ بہت اچھا ہوا میری تو سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیسے کام چلے گا۔ میرے لیے یہ کام بالکل نیا ہے۔ کچھ تجربہ ہی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں میری خوش نصیبی میرے ساتھ جاتی ہے۔ بصرہ میں سارے افسر خوش تھے۔ دو سال میں کوئی پچیس ہزار روپے بنا لایا اور سب اڑا دیئے۔ وہاں سے آکر کچھ دنوں کو آپریشن کے دفتر میں مٹر گشت کرتا رہا۔ یہاں آیا تو تم ملے (کلرکوں کو دیکھ کر) یہ لوگ کون ہیں؟

مداری لال کے دل پر برچھیاں سی چل رہی تھیں۔ ظالم پچیس ہزار روپے بصرہ سے کما لایا۔ یہاں قلم گھستے گھستے مرگئے اور پانچ سو بھی نہ جمع کر سکے، بولے "یہ لوگ بورڈ کے کلرک ہیں۔ سلام کو حاضر ہوئے ہیں۔"

سبودھ نے ان سب لوگوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور بولے "آپ لوگوں نے ناحق تکلیف کی۔ بہت مشکور ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ صاحبان کو مجھ سے شکایت کا کوئی موقع نہ ملے گا۔ مجھے اپنا افسر نہیں اپنا بھائی سمجھئے۔ آپ سب مل کر اس طرح کام کیجیے کہ بورڈ سے نیک نامی ہو اور میں بھی سرخرو رہوں۔ آپ کے ہیڈ کلرک صاحب تو میرے پرانے رفیق اور لنگوٹیا یار ہیں۔

ایک چرب زبان کلرک نے کہا۔" ہم سب حضور کے تابعدار ہیں۔ حتیٰ الامکان تو جناب کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیں گے۔ مگر تقاضائے بشری سے اگر کبھی سہو ہو جائے تو حضور بھی ازراہ سر پرستی چشم پوشی فرمائے گا۔"

سبودھ : " یہی میرا اصول ہے۔ ہمیشہ یہی اصول رہا۔ جہاں رہا ماتحتوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رہا۔ ہم اور آپ دونوں ہی کسی تیسرے کے غلام ہیں۔ پھر رعب کیسا اور حکومت کیسی۔ ہاں ہمیں نیک نیتی اور تندہی سے اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔"

جب سبودھ سے رخصت ہو کر عملہ والے دفتر چلے تو آپس میں باتیں ہونے لگیں۔

"آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہیڈ کلرک کے بیان سے تو معلوم ہوتا تھا۔ سب کو کچا ہی کھا جائے گا۔"

"جناب یہ دکھانے کے دانت ہیں۔"

(3)

سبودھ کو آئے ایک مہینہ گزر گیا۔ بورڈ کے کلرک، اردلی، چپراسی سب اس کے برتاؤ سے خوش ہیں۔ دلجوئی کرنے کا اس میں ایسا فطری مادہ ہے کہ جو اس سے ایک بار ملتا ہے ہمیشہ کے لیے گرویدہ ہو جاتا ہے۔ سخت کلمہ تو اس کی زبان پر آتا ہی نہیں۔ مگر ہنر بہ چشم عداوت بزرگ ترعیب است کے مصداق اس کی یہ ساری خوبیاں مداری لال کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی ہیں۔وہ اس کانٹے کو اپنے پہلو سے نکال ڈالنے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ عملہ کو برانگیختہ کرنا چاہا ناکامی ہوئی۔ ممبروں کو بھڑکانا چاہا، منہ کی کھائی، ٹھیکہ داروں کو ابھارنے کی کوشش کی، نادم ہونا پڑا۔ چاہتے تھے کہ بھس میں آگ لگا کر آپ دور سے تماشا دیکھیں۔ سبودھ سے اس طرح ہنس کر ملتے یوں چکنی چپڑی باتیں کرتے۔ گویا اس کے سچے دوست ہیں۔ لیکن گھات میں لگے رہتے کہ کب موقع ملے اور اسے نیچا دکھاؤں۔ سبودھ ذہین تھا۔ لائق تھا۔ مگر مردم شناس نہ تھا۔ وہ مداری لال کو اب بھی اپنا رفیق اور شفیق سمجھتا تھا۔

ایک دن مداری لال سکریٹری صاحب کے کمرے میں گئے تو کرسی خالی دیکھی وہ کسی ضرورت سے باہر چلے گئے تھے۔ ان کی میز پر پانچ ہزار کے نوٹ پلندوں میں بندھے ہوئے رکھے تھے۔ بورڈ کے مدرسوں کے لیے کچھ لکڑی کے سامان بنوانے گئے تھے۔ اس کی قیمت تھی۔ ٹھیکہ دار آج وصولی کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ آج ہی سکریٹری صاحب نے چیک بھیج کر خزانے سے روپے منگوائے تھے۔ مداری لال نے برآمدہ میں نکل کر دیکھا سبودھ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مداری لال کی نیت برگشتہ ہو گئی۔ حسد میں بدنیتی بھی شامل ہوئی۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلندے اٹھائے پتلون کی دونوں جیبوں میں بھر کر فوراً کمرہ سے نکلے اور چپراسی سے پوچھا۔ "سکریٹری

صاحب کمرہ میں ہیں یا نہیں؟ چپراسی نے کہا۔ ''جی نہیں، کچہری میں کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔''

مداری لال نے دفتر میں آکر ایک کلرک سے کہا۔ ''یہ فائل لے جا کر سکریٹری صاحب کو دکھاؤ۔''

کلرک فائل لے کر چلا گیا اور ذرا دیر میں لوٹ کر بولا ''سکریٹری صاحب کمرہ میں نہ تھے۔ فائل میز پر رکھ آیا ہوں۔''

مداری لال : ''کمرہ چھوڑ کر کہاں چلے جایا کرتے ہیں۔ کسی دن دھوکا اٹھائیں گے۔''

کلرک نے کہا۔ ''ان کے کمرہ میں دفتر والوں کے سوا جاتا ہی کون ہے''؟

مداری لال : ''تو کیا دفتر والے سب کے سب فرشتے ہیں۔ کب کسی کی نیت برگشتہ ہوتی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں نے چھوٹی چھوٹی رقموں پر اچھے اچھوں کی نیتیں بدلتے دیکھی ہیں۔ ہم میں اس وقت سبھی شاہ نظر آتے ہیں۔ لیکن موقع پا کر شاید ہی کوئی شاہ رہے۔ یہی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ آپ جا کر ان کے کمرہ کا دروازہ دونوں طرف سے بند کر دیجیے۔''

کلرک : ''چپراسی تو دروازہ پر بیٹھا ہوا ہے۔''

مداری لال نے جھنجھلا کر کہا۔ ''آپ سے میں جو کہتا ہوں وہ کیجیے۔ کہنے لگے چپڑاسی بیٹھا ہوا ہے۔ چپراسی کوئی رشی ہے، منی ہے۔ چپراسی ہی کچھ اڑا دے تو آپ اس کا کیا کرلیں گے؟ ضمانت بھی ہے تو تین سو کی۔ یہاں ایک ایک کاغذ لاکھوں کا ہے۔''

یہ کہہ کر مداری لال اٹھے اور دفتر کے دروازے دونوں طرف سے بند کر دیے۔ جب ذرا موقع ملا تو نوٹوں کے پلندے پتلون کی جیب سے نکال کر ایک الماری میں کاغذوں کے نیچے چھپا دیئے۔ پھر آکر اپنے کام میں ہمہ تن محو ہوگئے۔

سبودھ چندر آدھ گھنٹہ میں لوٹے تو دروازہ بند تھا۔ دفتر میں آکر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''یہ دروازہ کس نے بند کردیا ہے صاحب، کیا مجھے آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

مداری لال نے کھڑے ہو کر واعظانہ لہجے میں کہا۔ ''جناب گستاخی معاف کیجیے گا۔ آپ جب کبھی باہر جائیں چاہے ایک منٹ ہی کے لیے کیوں نہ ہو، دروازہ ضرور

بند کر دیا کریں۔ آپ کی میز پر روپے پیسے اور سرکاری کاغذات بکھرے پڑے، رہتے ہیں۔ نہ جانے کس وقت کس کی نیت بدل جائے۔ میں نے ابھی سنا کہ آپ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں تو دروازے بند کرا دیئے۔

سبودھ دروازہ کھول کر کمرہ میں گئے اور ایک سگار پینے لگے۔ میز پر نوٹ رکھے ہوئے ہیں، اس کی خبر ہی نہ تھی۔

دفعتاً ٹھیکہ دار نے آکر سلام کیا۔ سبودھ کرسی سے اٹھ بیٹھے اور بولے تم نے بہت دیر کردی، تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ دس ہی بجے روپے منگوا لیے تھے۔ رسید کا ٹکٹ لائے ہونا۔"

ٹھیکہ دار : "حضور، رسید لکھتا لایا ہوں۔"

سبودھ : "تو یہ روپیہ لو۔ تمھارے کام سے میں بہت خوش نہیں ہوں۔ لکڑی خراب استعمال کی ہے اور کوئی چیز صاف نہیں۔ اگر ایسا کام پھر کروگے تو ٹھیکہ داروں کے رجسٹر سے تمھارا نام نکال دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر سبودھ نے میز پر نگاہ ڈالی تو نوٹوں کا پلندہ نہ تھا۔ شاید کسی فائل کے نیچے دب گیا ہوگا۔ کرسی کے قریب کے کاغذات الٹ پلٹ ڈالے، مگر نوٹوں کا پتہ نہیں۔ ایں! نوٹ کہاں گئے ابھی یہیں تو میں نے رکھ دیئے تھے۔ جا کہاں سکتے ہیں۔ پھر فائلوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ دل میں ذرا ذرا سی دھڑکن ہونے لگی۔ ساری میز کے کاغذات چھان ڈالے۔ پلندہ کا پتہ نہیں۔ تب وہ کرسی پر بیٹھ کر اس آدھ گھنٹہ کے واقعات اور حرکات پر تبصرہ کرنے لگے۔ چپراسی نے نوٹوں کا پلندہ لا کر مجھے دیا۔ خوب یاد ہے۔ بھلا یہ بھی بھولنے کی بات ہے، اور اتنی جلد۔ میں نے نوٹوں کو لے کر یہیں میز پر رکھ دیا۔ گنا تک نہیں۔ اتنے میں ایک وکیل صاحب آگئے۔ پرانے ملاقاتی ہیں، ان سے باتیں کرتا ہوا ذرا اس درخت کے نیچے چلا گیا۔

ہوں، تو پلندہ رکھا ہوا تھا۔ خوب اچھی طرح یاد ہے۔ پھر نوٹ کہاں غائب ہوگئے۔ میں نے کسی صندوق، دراز یا الماری میں نہیں رکھے۔ پھر گئے تو کہاں گئے۔ شاید دفتر میں کسی نے احتیاطاً اٹھا کر رکھ دیئے ہوں۔ یہی بات ہے۔ میں ناحق اتنا گھبرا گیا۔ فوراً دفتر میں آکر مداری لال سے بولے۔ "آپ نے میری میز پر سے کچھ نوٹ

تو کہیں نہیں رکھوا دیئے۔"

مداری لال نے استعجاب سے پوچھا۔ "کیا آپ کی میز پر نوٹ تھے۔ مجھے تو خبر نہیں۔ ابھی منشی سوہن لال ایک فائل لے کر گئے تھے تو آپ کو کمرہ میں نہ دیکھا۔ میں نے سنا کہ آپ کسی سے باتیں کرتے چلے گئے ہیں تو دروازے بند کروا دیئے۔ کیا کچھ نوٹ نہیں مل رہے ہیں۔

سبودھ : "ارے صاحب پورے پانچ ہزار کے ہیں۔ ابھی ابھی چیک بھنایا ہے۔"

مداری لال نے سر پیٹ کر کہا۔ "پورے پانچ ہزار ! یا بھگوان! غضب ہو گیا آپ نے میز پر دیکھ لیا؟"

سبودھ : جناب پندرہ منٹ سے پریشان ہوں!"

مداری لال : چپراسی سے پوچھ لیا کہ کون کون آیا تھا؟"

سبودھ : آیئے ذرا آپ لوگ بھی تلاش کیجیے۔ میرے حواس درست نہیں ہیں۔"

سارا دفتر سکریٹری صاحب کے کمرہ میں سرگرم تلاش ہوا۔ میز الماریاں، صندوق سب دیکھے گئے۔ مگر نوٹوں کا پتہ نہیں، نوٹ غائب ہو گئے۔ اب اس میں شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ سبودھ نے ایک لمبی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی ہیئت ہی بدل گئی۔ جیسے مسخ ہو گئے ہوں۔

مداری لال نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ غضب ہو گیا۔ آج تک کبھی ایسا سانحہ نہ ہوا تھا۔ مجھے آج یہاں دس سال کام کرتے ہوئے ہو گئے۔ کبھی دھیلے کی چیز بھی غائب نہیں ہوئی۔ میں نے آپ کو پہلے ہی دن متنبہ کر دینا چاہا کہ یہاں ذرا ہوشیار رہیے گا۔ مگر شدنی تھی۔ خیال ہی نہ رہا۔ ضرور باہر سے کوئی آدمی آیا اور پلندہ لے کر غائب ہو گیا۔ چپراسی کی خطا یہی ہے کہ اس نے اس آدمی کو کمرہ میں جانے کیوں دیا۔ وہ لاکھ قسمیں کھائے کہ باہر سے کوئی نہیں۔ لیکن میں اسے کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ صرف منشی سوہن لال ایک فائل لے کر آپ کے کمرہ میں گئے تھے۔ مگر دروازہ سے ہی جھانک کر چلے آئے۔

سوہن لال نے کہا۔ "جی ہاں، میں نے تو اندر قدم بھی نہیں رکھا اپنے جوان بیٹے کی قسم کھاتا ہوں جو میں نے اندر قدم رکھا ہو۔"

مداری لال : آپ ناحق قسمیں کھاتے ہیں۔ آپ سے کوئی کچھ کہتا ہے۔ (سبودھ کے کان میں) "بینک میں آپ کا کچھ روپیہ ہو تو نکال کر ٹھیکہ دار کو دے دینا چاہیے۔ ورنہ سخت بدنامی ہوگی۔ نقصان تو ہو ہی گیا۔ اس کے ساتھ خفت کیوں اٹھائی پڑے۔"

سبودھ چندر نے دردناک لہجہ میں کہا۔ "بینک میں مشکل سے دو چار سو روپے ہوں گے۔ بھائی جان روپے ہوتے تو کیا غم تھا۔ سمجھ لیتا جیسے پچیس ہزار اڑ گئے۔ ویسے پانچ ہزار اڑ گئے مگر میں تو قلانچ ہوں ۔"

اسی رات کو سبودھ چندر نے خودکشی کر لی۔ اتنے روپوں کا انتظام کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ پردۂ موت کے سوا انھیں اپنی خفت، ندامت، بدگمانی اور ذلت کو چھپانے کی اور کوئی آڑ نہ تھی۔

(4)

دوسرے دن علی الصباح چپراسی نے مداری لال کے گھر پہنچ کر آواز دی مداری لال کو رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ گھبرا کر باہر آئے۔

چپراسی : " ہجور، بڑا گجب ہو گیا سکریٹری صاحب نے رات کو اپنی گردن پر چھری پھیر لی۔"

مداری کو ایسا معلوم ہوا گویا ان کے سر پر کوئی بڑا سا پتھر ٹوٹ پڑا ہو۔ "چھری پھیر لی۔"

"جی ہاں، آج سویرے معلوم ہوا پولیس کے آدمی جمع ہیں۔ آپ کو بلایا ہے۔"

"لاش ابھی پڑی ہوئی ہے؟"

"جی ہاں، ابھی ڈاکٹری معائینہ ہونے والا ہے۔"

"بہت سے لوگ جمع ہیں؟"

"سب بڑے بڑے اپسر جمع ہیں۔ لاش کی طرف دیکھتے نہیں بنتا بابو جی! کیسا بھلا مانس، ہیرا آدمی تھا۔ سب لوگ رورہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے بیاہنے لائق۔ بہوجی کو لوگ کتنا روک رہے ہیں۔ پر بار بار دوڑ کر لاش کے پاس آجاتی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو آنکھیں رومال سے نہ پوچھ رہا ہو۔ ابھی

اتنے ہی دن آئے ہوئے پر سب سے کیسا میل جول ہوگیا تھا۔ روپے کی تو انھیں محبت ہی نہیں تھی۔ دریا دل تھا۔"

مداری لال کے سر میں چکر آنے لگا۔ دروازہ کی چوکھٹ پکڑ کر اپنے کو سنبھال نہ لیتے تو شاید گر پڑتے۔

"بہو جی بہت رو رہی تھیں، کے لڑکے بتلائے تم نے؟"

"حجور دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔"

"لڑکی سیانی ہوگی۔"

"جی ہاں، بیاہنے لائک ہے، روتے روتے بچاری کی آنکھیں سوج اٹھی ہیں۔"

"نوٹوں کے بارے میں بھی بات چیت ہو رہی ہوگی؟"

"جی ہاں، سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ دپھتر کے کسی آدمی کا کام ہے داروگا جی سوہن لال کو گرپتار کرنا چاہتے تھے۔ مگر سائت آپ کی صلاح لیں سکریٹری صاحب لکھ گئے ہیں کہ میرا سک کسی پر نہیں ہے۔ نہیں تو اب تک تہلکہ مچ گیا ہوتا۔ سارا دپھتر پھنس جاتا۔"

"کیا سکریٹری صاحب کوئی خط لکھ کر چھوڑ گئے ہیں؟"

"ہاں صاحب، معلوم ہوتا ہے چھری مارتے بکھت انھیں یاد آیا کہ سب دپھتر گرپتار ہو جائے گا۔ بس کلٹر صاحب کے نام چٹھی لکھ دی۔"

"اس چٹھی میں میرا بھی ذکر ہے؟ تمھیں یہ کیا معلوم ہوگا۔"

"ہجور، اب میں کیا بتاؤں۔ مگر اتنا سب لوگ کہتے تھے کہ آپ کی بڑی تارپھ لکھی ہے۔"

مداری لا ل کی سانس اور تیز ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو کے دو بڑے قطرے ٹپک پڑے۔

"میں اور وہ ایک ساتھ کے بڑھے تھے۔ نندو، آٹھ دس سال تک ساتھ رہنا ساتھ اٹھتے بیٹھتے، ساتھ کھاتے۔ بس اسی طرح تھے جیسے دو سگے بھائی ہوں۔ خط میں میری کیا تعریف لکھی ہے؟ یہ تمھیں کیا معلوم ہوگا۔"

"آپ تو چل ہی رہے ہیں، دیکھ لیجیے گا۔"

''کفن کا انتظام ہو گیا ہے؟''

''نہیں صاحب، کہا نہ کہ ابھی لاس کا ڈاکٹری معائنہ ہوگا۔ مگر اب جلدی چلیے۔ ایسا نہ ہو کوئی دوسرا آدمی آتا ہو۔''

''ہمارے دفتر کے بھی سب لوگ آگئے ہوں گے؟''

''جی ہاں، کئی آدمی آگئے تھے۔ وہی جو اس محلّہ میں رہتے ہیں۔''

''ان سے پولیس والوں نے میری بابت تو سوال جواب نہیں کیا؟''

''جی نہیں، کسی سے بھی نہیں۔''

مداری لال جب سبودھ چندر کے گھر پہنچے تو کئی افسر اور محلّہ کے معززین جمع تھے۔ مداری لال کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ سب کے سب ان کی طرف بدگمانی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے انھیں فوراً بلا کر کہا۔ ''آپ بھی اپنا بیان لکھا دیں اور سب کے بیان لکھ چکا ہوں۔'' مداری لال نے اتنی ہوشیاری سے اپنا بیان دیا کہ انسپکٹر پولیس بھی ان کی قانونی نکتہ دانی کا معترف ہوگیا سارے بیان میں ایک لفظ بھی ایسا نہ تھا۔ جو ان کے خلاف پڑسکے۔

یکایک مرحوم کے دونوں بچے روتے ہوئے مداری لال کے پاس آئے اور بولے۔ ''چلیے آپ کو اماں جی بلا رہی ہیں۔'' دونوں مداری لال سے مانوس تھے۔

مداری لال کو سبودھ چندر کی بیوی سے کبھی بات چیت کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہ بلاوا سن کر ان کا دل دھڑک اٹھا۔ کہیں اس کا مجھ پر شبہ نہ ہو، کہیں سبودھ نے میری نسبت شک تو ظاہر نہیں کیا۔ کچھ جھجکے، کچھ ڈرے، اندر داخل ہوئے تو بیوہ کا نالۂ دل خراش سنائی دیا۔ انھیں دیکھتے ہی بے کس بیوہ کے نالہ درد کا کوئی دوسرا سوتا کھل گیا۔ لڑکی نے آکر انھیں پرنام کیا۔ اور ان کے لیے ایک کرسی رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں لڑکوں نے بھی انھیں گھیر لیا۔ مداری لال کو ان تینوں کی نظروں میں ایسی بے کسانہ التجا بھری ہوئی معلوم ہوئی کہ وہ ان کے سامنے دیکھ نہ سکے۔ ان کا نفس انھیں نفریں کرنے لگا۔ جن غریبوں کو ان پر اتنا اعتماد، اتنا بھروسہ، اتنی عقیدت، اتنی یگانگت ہے۔ انھیں کی گردن پر انھوں نے چھری پھیری انھیں کے ہاتھوں یہ بھرا پُرا خاندان خاک میں مل گیا۔ ان غریبوں کا اب کیا حشر ہوگا۔ لڑکی کی

شادی کرنی ہے۔ کون کرے گا؟ بچوں کی تعلیم وتربیت کا بار کون اٹھائے گا؟ مداری لال خود اپنی نظروں میں اتنے ذلیل ہوئے۔ ان کے دل نے خود اتنا دھتکارا کہ ان کی زبان سے تشفی کا ایک لفظ نہ نکلا۔ انھیں ایسا محسوس ہوا گویا ان کے چہرہ پر کوئی سیاہ اور بدنما داغ لگا ہوا ہے۔ گویا ان کا قد کچھ چھوٹا ہو گیا ہے۔ وہ سبودھ چندر کو صرف پریشان کرنا چاہتے تھے۔ اس کا یہ انجام ہوگا، شاید اس کا انھیں گمان بھی نہ تھا۔

مجروح بیوہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "بھیا جی! ہم لوگوں کو وہ منجدھار میں چھوڑ گئے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ دل میں یہ بات ٹھان چکے ہیں تو اپنے پاس جو کچھ تھا۔ سب ان کے قدموں پر رکھ دیتی۔ مجھ سے تو وہ یہی کہتے رہے کہ کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ آپ ہی کے ذریعہ وہ کوئی مہاجن ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے اوپر انھیں کتنا بھروسہ تھا کہ بیان نہیں کر سکتی۔"

مداری لال کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ان کے دل پر نشتر چلا رہا ہے۔ ان کے حلق میں کوئی وزنی چیز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

بیوہ نے پھر کہا۔ "رات سوئے تو خوب ہنس رہے تھے۔ سابق دستور دودھ پیا بچوں کو پیار کیا۔ تھوڑی دیر تک ہارمونیم بجایا۔کوئی ایسی بات نہ کی جس سے کسی قسم کا شبہ ہوتا مجھے متفکر دیکھ کر بولے۔ تم ناحق گھبراتی ہو۔ مداری لال سے پرانی ملاقات ہے۔ آخر وہ کس دن کام آئے گی۔ میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں ان کی خاصی عزت ہے۔ روپوں کا انتظام آسانی سے ہو جائے گا۔ پھر نہ جانے کب ان کا ارادہ پلٹا۔ میں نصیبوں جلی ایسی سوئی کہ رات کو سنکی تک نہیں، کیا جانتی تھی کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔"

مداری لال کو سارا مکان تیرتا ہوا معلوم ہوا۔ انھوں نے بہت ضبط کیا پُر جوش اشک نہ روک سکے۔

بیوہ نے آنکھیں پونچھ کر پھر کہا۔ "بابو جی جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ لیکن آپ اس بدمعاش کا پتہ ضرور لگایئے۔ جس نے ہمارا ستیاناس کیا۔ دفتر ہی کے کسی آدمی کی حرکت ہے۔ وہ بہت سیدھے سادے آدمی تھے۔ مجھ سے یہی کہتے رہے کہ میرا کسی پر شبہ نہیں ہے۔ آپ سے صرف یہی التجا کرتی ہوں کہ اس بدمعاش کو بچ

کر جانے نہ دیجیے گا۔ پولیس والے شاید رشوت لے کر اسے چھوڑ دیں۔ آپ کو دیکھ کر ان کا یہ حوصلہ نہ ہوگا۔ اب ہمارے سر پر آپ کے سوا اور کون ہے کس سے اپنا دکھ کہیں۔ لاش کی یہ درگت ہونی ہی لکھی تھی۔

مداری لال کے سر میں ایسا چکر آیا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔

(5)

تیسرے پہر لاش کا معائنہ ختم ہوا۔ جنازہ ندی کی طرف چلا۔ سارا دفتر سارے حکام اور ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ چتا کے مراسم لڑکوں کے ہاتھوں ادا ہونے چاہیے تھکے۔ مگر لڑکے نابالغ تھے۔ بیوہ چلنے کو تیار ہی ہو رہی تھی کہ مداری لال نے جا کر کہا۔ "بہو جی! یہ فرض مجھے ادا کرنے دو۔ تم کریا پر بیٹھ جاؤگی تو بچوں کو کون سنبھالے گا؟ سیودھ میرے بھائی تھے۔ زندگی میں، میں ان کے ساتھ کچھ سلوک نہ کر سکا۔ اب زندگی کے بعد مجھے اپنا دوستانہ اور برادرانہ فرض ادا کر لینے دو۔ آخر مجھ پر بھی تو ان کا کچھ حق تھا۔"

بیوہ نے رو کر کہا۔ "آپ کو بھگوان نے بڑا وفاپرور دل دیا ہے بابو جی، نہیں تو مرنے پر کون پوچھتا ہے۔ دفتر کے آدمی جو آدھی آدھی رات تک ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ جھوٹوں بھی نہ آئے کہ ذرا دل کو ڈھارس ہوتا۔

مداری لال نے داہ کریا کی۔ تیرہ دن تک سنسکار کرتے رہے۔ تیرہویں دن پنڈادان ہوا۔ برہمنوں نے بھوجن کیا۔ فقیروں کو غلہ تقسیم کیا گیا۔ قریبی احباب کی دعوت ہوئی اور سبھی اخراجات مداری لال نے ادا کیے۔ بیوہ نے ہر چند اصرار کیا کہ آپ نے جتنا کیا اتنا ہی بہت ہے اب میں آپ کو زیادہ زیر بار نہیں کرنا چاہتی۔ دوستی کا حق اس سے زیادہ اور کوئی کیا ادا کرے گا۔ مگر مداری لال نے ایک نہ سنی۔ سارے شہر میں لوگ ان کی تعریف کرنے لگے۔ دوست ہو تو ایسا ہو۔!

سولہویں دن بیوہ نے مداری لال سے کہا۔ "بھیا آپ نے ہمارے ساتھ جو سلوک اور احسان کیے ان سے ہم مرتے دم تک سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ آپ نے ہمارے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو نہیں معلوم ہماری کیا گت ہوتی۔ اسی طرح کبھی کبھی یاد کیجیے گا۔ اب ہمیں اجازت دیجیے کہ گھر جائیں۔ وہاں دیہات میں خرچ بھی کم ہوگا۔

اور کچھ کھیتی باڑی کا سلسلہ بھی کرلوں گی۔ کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن کٹ جائیں گے۔"

مداری لا: "گھر پر کتنی جائداد ہے؟"

بیوہ: "جائداد کیا ہے۔ ایک کچا مکان ہے اور دس بارہ بیگھے کاشتکاری ہے۔ پکا مکان بنوانا شروع کیا تھا۔ مگر روپے پورے نہ پڑے۔ ابھی ادھورا پڑا ہوا ہے۔ دس بارہ ہزار روپے خرچ ہوگئے اور ابھی چھت پڑنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

مداری لال: "کچھ روپے بینک میں جمع ہیں؟ یا بس کھیتی ہی کا سہارا ہے؟"

بیوہ: "جمع تو ایک پائی بھی نہیں ہے بھیا جی! ان کے ہاتھ میں روپیہ رہنے ہی نہ پاتا تھا۔ بس وہی کھیتی باڑی ہے۔"

مداری: "تو ان کھیتوں میں اتنی پیدوار ہو جائے گی کہ لگان بھی ادا ہو جائے اور تم لوگوں کی بسر اوقات بھی ہو؟"

بیوہ: "اور کر ہی کیا سکتے ہیں بھیا جی، کسی نہ کسی طرح زندگی تو کاٹنا ہی ہے بچے نہ ہوتے تو میں زہر کھالیتی۔"

مداری: "اور ابھی لڑکی کی شادی بھی کرنی ہے؟"

بیوہ: لڑکی کی شادی کی اب کوئی فکر نہیں۔ کاشتکاروں میں بہت سے ایسے مل جائیں گے جو بلا کچھ لیے دیے شادی کر لیں گے۔"

مداری نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا۔ "اگر میں کچھ صلاح دوں تو اسے مانیں گی آپ؟"

بیوہ: "بھیا جی، آپ کی صلاح نہ مانیں گے تو کس کی صلاح مانیں گے۔ دوسرا اور ہے ہی کون؟"

مداری: "تو آپ اپنے گھر جانے کے بدلے میرے گھر چلیے، جیسے میرے بال بچے کھائیں رہیں گے ویسے آپ کے بال بچے رہیں گے۔ آپ کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ میرا مکان کافی بڑا ہے۔ آپ چاہیں گی تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ آپ کو دے دوں گا۔ ورنہ ایک ساتھ ہی رہیں گے۔ ایشور نے چاہا تو لڑکی کی شادی بھی کس شریف خاندان میں ہو جائے گی۔"

بیوہ نے آنکھوں میں احسان اور تشکر کے آنسو بھرے ہوئے کہا۔ مگر بابو جی،
سوچیے۔"

مداری نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں نہ کچھ سوچوں گا اور نہ کوئی عذر مانوں گا۔
آپ کو میری یہ درخواست قبول کرنی پڑے گی۔ میں آج دس دن سے اسی مسئلہ
پر غور کر رہا ہوں اور اس تجویز کے سوا مجھے اور کوئی دوسری صورت نظر نہیں آئی۔
اُف، دو بھائیوں کے خاندان کیا ایک ساتھ نہیں رہتے؟ سبودھ کو میں اپنا بھائی سمجھتا
ہوں اور ہمیشہ سمجھوں گا۔"

بیوہ کا کوئی عذر نہ سنا گیا۔ اسی دن مداری لال سارے خاندان کو اپنے گھر لے
گئے اور آج دس سال سے ان کی پرورش کر رہے ہیں۔ لڑکی کی شادی ایک بہت ممتاز
خاندان میں ہوگئی۔ دونوں بچے کالج میں پڑھتے ہیں اور ان کی ماں مداری لال کے گھر
کی مالکن ہے۔ مداری لال اور ان کی بیوی دل وجان سے اس کی خدمت کرتے ہیں۔
اور اسی کی مرضی کو مقدم سمجھتے ہیں۔

مداری لال نے اپنے گناہ کو خدمت کے پردہ میں چھپا لیا ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار الٰہ آباد کے ہندی ماہنامہ 'سرسوتی' کے جنوری 1929 کے
شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا 'پرائشچت'۔ یہ 'مان سرو ور' 5 میں شامل ہے۔ اردو میں
یہ 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔)

کھوچڑ

بابو کندن لال کچہری سے لوٹے، تو دیکھا کہ ان کی پتنی جی ایک کنجڑن سے کچھ ساگ بھاجی لے رہی تھی۔ کنجڑن پالک ٹکے سیر کہتی ہے، وہ ڈیڑھ پیسے دے رہی ہیں۔ اس پر کئی منٹ تک واد، وواد ہوتا رہا۔ آخر کنجڑن ڈیڑھ ہی پیسے پر راضی ہوگئی۔ اب ترازو اور باٹ کا پرشن چھڑا۔ دونوں پلے برابر نہ تھے۔ایک میں پسنگا تھا۔ باٹ بھی پورے نہ اترتے تھے پڑوسن کے گھر سے سیر آیا۔ ساگ تل جانے کے بعد اب گھاٹے کا پرشن اٹھا۔ پتنی جی اور مانگتی تھیں۔ کنجڑن کہتی تھی۔ اب کیا سیر دو سیر گھاٹے میں ہی لے لوں گی بہوجی۔ خیر، آدھ گھنٹے میں وہ سودا پورا ہوا، اور کنجڑن پھر کبھی نہ آنے کی دھمکی دے کر ودا ہوئی۔ کندن لال کھڑے کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ کنجڑن کے جانے کے بعد پتنی جی لوٹے کا پانی لائیں تو آپ نے کہا۔ آج تو تم نے ذرا سا ساگ لینے میں پورے آدھ گھنٹے لگادیے۔ اتنی دیر میں تو ہزار پانچ کا سودا ہوجاتا۔ ذرا ذرا سے ساگ کے لیے اتنی ٹھائیں ٹھائیں کرنے سے تمھارا سر بھی نہیں دکھتا؟

رامیشوری نے کچھ لجّت ہو کر کہا۔ پیسے مفت میں تو نہیں آتے۔

یہ ٹھیک ہے، لیکن سمے کا بھی کچھ مولیہ ہے۔ اتنی دیر میں تم نے بڑی مشکل سے ایک دھیلے کی بچت کی۔ کنجڑن نے بھی دل میں کہا ہوگا کہاں کی گنوارن ہے۔ اب شاید بھول کر بھی ادھر نہ آئے۔

تو پھر مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ پیسے کی جگہ دھیلے کا سواد لے کر بیٹھ جاؤں۔

اتنی دیر میں تو تم نے کم سے کم 20 پنّے پڑھے ہوتے۔ کل مہری سے گھنٹوں سر مارا۔ پرسوں دودھ والے کے ساتھ گھنٹوں شاستزارتھ کیا۔ زندگی کیا انھیں باتوں میں خرچ کرنے کو دی گئی ہے؟

کندن لال پرایہ نتیہ ہی پتنی کو سد اُپدیش دیتے رہتے تھے۔ یہ ان کا دوسرا وِواہ

تھا۔ رامیشوری کو آئے ابھی دو ہی تین مہینے ہوئے تھے۔ اب تک تو بڑی نند جی اوپر کے کام کیا کرتی تھیں۔ رامیشوری کی ان سے نہ پٹی۔ اس کو معلوم ہوتا تھا، وہ میرا سروسو ہی لٹائے دیتی ہیں۔ آخر وہ چلی گئیں۔ تب سے رامیشوری ہی گھر کی سوامنی ہے۔ وہ بہت چاہتی ہے کہ پتی کو پرسنّیہ رکھے۔ ان کے اشاروں پر چلتی ہے۔ ایک بار جو بات سن لیتی ہے، گانٹھ باندھ لیتی ہے۔ پر روز ہی تو کوئی نئی بات ہو جاتی ہے۔ اور کندن لال کو اسے اپدیش دینے کا اَوسَر مل جاتا ہے۔

(2)

ایک دن بلی دودھ پی گئی۔ رامیشوری دُودھ گرم کر کے لائی اور سوامی کے سرہانے رکھ کر پان بنا رہی تھی کہ بلی نے دودھ پر اپنا ایشور پر دت ادھیکار سدھ کر دیا۔ رامیشوری یہ اپہرن سویکار نہ کر سکی۔ رول لے کر بلی کو اتنے زور سے مارا کہ وہ دو تین لڑھکیا کھا گئی۔

کندن لال لیٹے لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بولے۔ اور جو مر جاتی؟

رامیشوری نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ تو میرا دودھ کیوں پی گئی؟

اسے مارنے سے دودھ مل تو نہیں گیا؟

جب کوئی نقصان کر دیتا ہے تو اس پر کرودھ آتا ہی ہے۔

نہ آنا چاہیے۔ پشو کے ساتھ آدمی بھی کیوں پشو ہو جائے؟ آدمی اور پشو میں اس کے سوا اور کیا انتر ہے؟

کندن لال کئی منٹ تک دیا۔ وویک اور شانتی کی شکشھا دیتے رہے۔ یہاں تک کہ بے چاری رامیشوری مارے گلانی کے رو پڑی۔

اسی بھانتی ایک دن رامیشوری نے ایک بھکشک کو دتکار دیا تو بابو صاحب نے پھر اپدیش دینا شروع کیا۔ بولے۔ تم سے نہ اٹھا جاتا ہو تو لاؤ میں دے آؤں۔ غریب کو یوں نہ دتکارنا چاہیے۔

رامیشوری نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ دن بھر تو تانتا لگا رہتا ہے۔ کوئی کہاں تک دوڑے۔ سارا دیش بھکھ منگوں ہی سے بھر گیا ہے شاید۔

کندن لال نے اپیکشھا کے بھاؤ سے مسکرا کر کہا۔ اسی دیش میں تو تم بھی بستی ہو۔

اتنے بھکھ منگے آ کہاں سے جاتے ہیں؟ یہ سب کام کیوں نہیں کرتے؟
کوئی آدمی اتنا نیچ نہیں ہوتا جو کام ملنے پر بھیکھ مانگے۔ ہاں اپنگ ہو تو دوسری بات ہے۔ اپنگوں کا بھیکھ کے سوا اور کیا سہارا ہو سکتا ہے؟
سرکار ان کے لیے اناتھالیہ کیوں نہیں کھلواتی؟
جب سوراجیہ ہوجائے گا، تب شاید کھل جائیں۔ ابھی تو کوئی آشا نہیں ہے مگر سوراجیہ بھی دھرم سے آئے گا۔
لاکھوں سادھو سنیاسی، پنڈے پوجاری مفت کا مال اڑاتے ہیں، کیا اتنا دھرم کافی نہیں ہے؟ اگر اس دھرم سے سوراجیہ ملتا تو کب کا مل چکا ہوتا۔
اسی دھرم کا پرساد ہے کہ ہندو جاتی ابھی تک جیوت ہے نہیں کب کی رساتل پہنچ چکی ہوتی۔ روم، یونان، ایران، سیریا کسی کا اب نشان بھی نہیں ہے۔ یہ ہندو جاتی ہے۔ جو ابھی تک سے کے کرور آگھاتوں کا سامنا کرتی چلی جاتی ہے۔
آپ سمجھتے ہوں گے، ہندو جاتی جیوت ہے۔ میں تو اسے اسی دن سے مرا سمجھتی ہوں۔ جس دن سے وہ ادھین ہوگئی۔ جیون سوادھینتا کا نام ہے، غلامی تو موت ہے۔
کندن لال نے یوتی کو چکت نیتروں سے دیکھا۔ ایسے ودروہی وچار اس میں کہاں سے آگئے؟ دیکھنے میں تو وہ بالکل بھولی تھی۔ سمجھے، کہیں سن سنا لیا ہو گا۔ کٹھور ہوکر بولے۔ کیا ویرتھ کا وواد کرتی ہو۔ لجاتی تو نہیں اوپر سے بک بک کرتی ہو۔
رامیشوری یہ پھٹکار پاکر چپ ہو گئی۔ ایک چھن وہاں کھڑی رہی، پھر دھیرے دھیرے کمرے میں چلی گئی۔

(3)

ایک دن کندن لال نے کئی متروں کی دعوت کی۔ رامیشوری سویرے سے رسوئی میں گھسی تو شام تک سر نہ اٹھا سکی۔ اسے یہ بے گار بُری معلوم ہو رہی تھی۔ اگر دوستوں کی دعوت کرنی تھی تو کھانا بنوانے کا کوئی پربندھ کیوں نہیں کیا؟ سارا بوجھ اسی کے سر کیوں ڈال دیا۔ اس سے ایک بار پوچھ لیا ہوتا کہ دعوت کروں یا نہ کروں۔ ہوتا تب بھی یہی، جواب ہو رہا تھا۔ وہ دعوت کے پرستاؤ کا بڑی خوشی سے

انومودن کرتی، تب وہ سمجھتی، دعوت میں کر رہی ہوں۔ اب وہ سمجھ رہی تھی۔ مجھ سے بے گار لی جا رہی ہے۔ خیر، بھوجن تیار ہوا لوگوں نے بھوجن کیا اور چلے گئے، مگر منشی جی منہ پھلائے بیٹھے ہوئے تھے۔

رامیشوری نے کہا۔ تم کیوں نہیں کھا لیتے۔ کیا ابھی سویرا ہے؟

بابو صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ کیا کھا لوں، یہ کھانا ہے۔ یا بیلوں کی سانی۔

رامیشوری کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ سارا دن چولہے کے سامنے جلی، اس کا یہ اُپکار۔ بولی۔ مجھ سے جیسا ہو سکا بنایا۔ جو بات اپنے بس کی نہیں ہے، اس کے لیے کیا کرتی؟

پوڑیاں سب سیور ہیں۔

ہوں گی؟

کچوڑی میں اتنا نمک تھا کہ کسی نے چھوا تک نہیں۔

'ہوگا'

حلوہ اچھی طرح بھنا نہیں۔ کچائیاں آ رہی تھیں۔

"آتی ہوں گی"

شوربا اتنا پتلا تھا، جیسے چائے۔

'ہوگا'

استری کا پہلا دھرم یہ ہے کہ وہ رسوئی کے کام میں چتر ہو۔ پھر اپدیشوں کا تار باندھا، یہاں تک کہ رامیشوری اوب کر چلی گئی۔

(4)

پانچ چھ مہینے گذر گئے۔ ایک دن کندن لال کے ایک دور کے سمبندھی اس سے ملنے آئے۔ رامیشوری کو جیوں ہی ان کی خبر ملی، جل پان کے لیے مٹھائی بھیجی، اور مہری سے کہلا بھیجا۔ آج یہیں بھوجن کیجیے گا۔ وہ مہاشے پھولے نہ سمائے۔ بوریا بندھنا لے کر پہنچ گئے اور ڈیرا ڈال دیا۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ آپ ٹلنے کا نام بھی نہیں لیتے۔ آؤ بھگت میں کوئی کمی ہوتی، تو شاید انھیں کچھ چنتا ہوتی، پر رامیشوری ان کے سیوا ستکار میں جی جان سے لگی ہوئی تھی۔ پھر وہ بھلا کیوں ہٹنے لگے۔

ایک دن کندن لال نے کہا، تم نے یہ بُرا روگ پالا۔
رامیشوری نے چونک کر پوچھا۔ کیسا روگ؟
انھیں ٹہلا کیوں نہیں دیتیں؟
میرا کیا بگاڑ رہے ہیں؟
کم سے کم کی روز چپت دے رہے ہیں اور اگر یہی خاطر داری رہی، تو شاید جیتے جی ٹلیں گے بھی نہیں۔
مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی دو چار دن کے لیے آجائے تو اس کے سر ہو جاؤں۔ جب تک ان کی اچھا ہو رہے۔
ایسے مفت خوروں کا ستکار کرنا پاپ ہے اگر تم نے اتنا سر نہ چڑھایا ہوتا، تو اب تک لمبا ہوا ہوتا۔ جب دن میں تین بار بھوجن اور پچاسوں بار پان ملتا ہے تو اسے کتے نے کاٹا ہے جو اپنے گھر جائے۔ روٹی کا چور بنتا تو اچھا نہیں
سُپاتر اور کُپاتر، کا وِچار تو کر لینا چاہیے۔ ایسے آلسیوں کو کھلانا پلانا واستو میں انھیں زہر دینا ہے، زہر سے تو کیول پران نکل جاتے ہیں؟ یہ خاطر داری تو آتما کا سروناش کر دیتی ہے۔ اگر یہ حضرت مہینے بھر بھی یہاں رہ گئے تو پھر زندگی بھر کے لیے بیکار ہو جائیں گے۔ پھر ان سے کچھ نہ ہوگا اور اس کا سارا دوش تمھارے سر ہوگا۔
ترک کا تانتا بندھ گیا۔ پرمانوں کی چھڑی لگ گئی۔ رامیشوری کھسیا کر چلی گئی۔ کندن لال اس سے کبھی سنتشٹ بھی ہو سکتے ہیں، ان کے اپدیشوں کی ورشا کبھی بند بھی ہوسکتی ہے۔ یہ پرشن اس کے من میں بار بار اٹھنے لگا۔

(5)

ایک دن دیہات سے بھینس کا تازہ گھی آیا۔ ادھر مہینوں سے بازار کا گھی کھاتے کھاتے ناک میں دم ہو رہا تھا۔ رامیشوری نے اسے کھولایا۔ اس میں لونگ ڈالی اور کڑاہ سے نکال کر ایک مٹکی میں رکھ دیا۔ اس کی سوندھی سوندھی سُگندھ سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ مہری چوکا برتن کرنے آئی تو اس نے چاہا کہ مٹکی چوکے سے اٹھا کر چھینکے یا آلے پر رکھ دے۔ پر سنجوگ کی بات، اس نے مٹکی اٹھائی، تو وہ اس کے ہاتھ سے

چھوٹ کر گر پڑی۔ سارا گھی بہہ گیا دھاکا سن کر رامیشوری دوڑی، مہری کھڑی ہو رہی تھی، اور مٹکی چور چور ہو گئی تھی۔ تڑپ کر بولی۔ مٹکی کیسے ٹوٹ گئی؟ میں تیری طلب سے کاٹ لوں گی۔ رام رام سارا گھی مٹی میں ملا دیا۔ تیری آنکھیں پھوٹ گئی تھی کیا؟ یا ہاتھوں میں دم نہیں تھا۔ اتنی دور سے منگایا۔ اتنی محنت سے گرم کیا، مگر ایک بوند بھی گلے کے نیچے نہ گیا۔ اب کھڑی بسور کیا رہی ہے۔ جا اپنا کام کر۔ مہری نے آنسو پونچھ کر کہا۔ بہوجی، اب تو چوک ہو گئی چاہے طلب کاٹو چاہے جان سے مارو۔ میں نے تو سوچا۔ اٹھا کر آلے پر رکھ دوں تو چوکا لگاؤں کیا جانتی تھی کہ بھاگیہ میں یہ لکھا ہے۔ نہ جانے کس کا منھ دیکھ کر اٹھی تھی۔

رامیشوری : میں کچھ نہیں جانتی۔ سب روپے تری طلب سے وصول کرلوں گی۔ ایک روپیہ جرمانہ نہ کیا تو کہنا۔

مہری : مرجاؤں گی سرکار۔ کہیں ایک پیسے کا ٹھکانا نہیں ہے۔

رامیشوری : مرجا یا جی جا میں کچھ نہیں جانتی۔

مہری نے ایک منٹ تک سوچا اور بولی۔ اچھا کاٹ لیجیے گا سرکار۔ آپ سے صبر نہیں ہوتا۔ میں صبر کر لوں گی۔ یہی نہ ہوگا، بھوکھوں مر جاؤں گی۔ جی کر ہی کون سا سکھ بھوگ رہی ہوں، کہ مرنے کو ڈروں۔ سمجھ لوں گی ایک مہینے کوئی کام نہیں کیا۔ آدمی سے بڑا بڑا نقصان ہوجاتا ہے۔ یہ تو گھی ہی تھا۔

رامیشوری کو ایک ہی چھن میں مہری پر دیا آگئی۔ بولی تو بھوکوں مرجائے گی۔ تو میرا کام کون کرے گا؟

مہری : کام کرانا ہوگا، کھلایئے گا نہ کام کرانا ہوگا بھوکھوں ماریئے گا۔ آج سے آکر آپ ہی کے دوار پر سویا کروں گی۔

رامیشوری : سچ کہتی ہوں، آج تو بڑا نقصان کر ڈالا۔

مہری : میں تو آپ ہی آپ پچھتا رہی ہوں سرکار۔

رامیشوری : جا گوبر سے چوکا لیپ دے۔ مٹکی کے ٹکڑے دور پھینک دے اور بازار سے گھی لیتی آ۔

مہری نے خوش ہو کر چوکا گوبر سے لیپا اور مٹکی کے ٹکڑے بٹور رہی تھی کہ

کندن لال آگئے اور ہانڈی ٹوٹی دیکھ کر بولے۔ یہ ہانڈی کیسے ٹوٹ گئی'؟

رامیشوری نے کہا۔ مہری اٹھا کر اوپر رکھ رہی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔

کندن لال نے چلا کر کہا تو سب گھی بہہ گیا؟

اور کیا کچھ بچ بھی رہا۔

'تم نے مہری سے کچھ نہیں کہا؟'

کیا کہتی؟ اس نے جان بوجھ کر تو گرا نہیں دیا؟

'یہ نقصان کون اٹھائے گا؟'

ہم اٹھائیں گے، اور کون اٹھائے گا۔ اگر میرے ہی ہاتھ سے چھوٹ پڑتی تو کیا ہاتھ کاٹ لیتی۔

کندن لال نے اونٹھ چبا کر کہا۔ تمھاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جس نے نقصان کیا ہے،اس سے وصول ہونا چاہیے۔ یہیں ایشوری نیم ہے۔ آنکھ کی جگہ آنکھ، پران کے بدلے پران۔ یہ عیسیٰ مسیح جیسے دیالو پروش کا کتھن ہیں۔ اگر دنڈ کا ودھان سنسار سے اٹھ جائے تو یہاں رہے کون؟ ساری پرتھوی رکت سے لال ہو جائے۔ ہتیارے دن دہاڑے لوگوں کا گلا کاٹنے لگے۔ دنڈ ہی سے سماج کی مریادا قائم ہے۔ جس دن دنڈ نہ رہے گا سنسار نہ رہے گا۔ منو آدی اسمرتیکار بے وقوف نہیں تھے کہ دنڈ نیائے کو اتنا مہتو دے گئے اور کسی وچار سے نہیں، تو مریادا کی رکشھا کے لیے دنڈ اوشیہ دینا چاہیے۔ یہ روپے مہری کو دینے پڑیں گے۔ اس کی مزدوری کاٹنی پڑے گی۔ نہیں تو آج اس نے گھی کا گھڑا لڑھکا دیا ہے، کل کوئی اور نقصان کردے گی۔ رامیشوری نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ میں نے تو اسے چھما کر دیا ہے۔

کندن لال نے آنکھیں نکال کر کہا۔ لیکن میں نہیں چھما کر سکتا۔

مہری دوار پر کھڑی یہ وواد سن رہی تھی جب اس نے دیکھا کہ کندن لال کا کرودھ بڑھتا جاتا ہے اور میرے کارن رامیشوری کو گھڑکیاں سننی پڑ رہی ہیں۔ تو وہ سامنے جا کر بولی۔ بابوجی، اب تو قصور ہوگیا۔ اب سب روپے میری طلب سے کاٹ لیجیے، روپے نہیں ہیں، نہیں تو ابھی لاکر آپ کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔

رامیشوری نے اسے گھڑک کر کہا۔ جا بھاگ یہاں سے، تو کیا کرنے آئی۔ بڑی

روپے والی بنی ہے۔

کندن لال نے پتنی کی اُور کٹھور نیتروں سے دیکھ کر کہا۔ تم کیوں اس کی وکالت کر رہی ہو۔ یہ موٹی سی بات ہے اسے ایک بچہ بھی سمجھتا ہے کہ جو نقصان کرتا ہے، اسے اس کا دنڈ بھوگنا پڑتا ہے۔ میں کیوں پانچ روپئے کا نقصان اٹھاؤں؟ وجہ؟ کیوں نہیں اس نے مٹکے کو سنبھال کر پکڑا، کیوں اتنی جلد بازی کی، کیوں تمھیں بلا کر مدد نہیں لی؟ یہ صاف اس کی لاپرواہی ہے۔

یہ کہتے ہوئے کندن لال باہر چلے گئے۔

رامیشوری اس اپمان سے آہت ہو اٹھی۔ ڈانٹنا ہی تھا، تو کمرے میں بلا کر ایکانت میں ڈانٹتے۔ مہری کے سامنے اسے روئی کی طرح دھن ڈالا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا، یہ کس سوبھاؤ کے آدمی ہیں۔ آج ایک بات کہتے ہیں، کل اسی کو کاٹتے ہیں، جیسے کوئی جھکی آدمی ہوں، کہاں تو دیا اور ادارتا کے اوتار بنتے تھے، کہاں آج پانچ روپے کے لیے پران دینے لگے۔ بڑا مزہ آجائے، کل مہری بیٹھ رہے۔ کبھی تو ان کے مکھ سے پرسنیتا کا ایک شبد نکلا ہوتا۔ اب مجھے بھی اپنا سوبھاؤ بدلنا پڑے گا۔ یہ سب میرے سیدھے ہونے کا پھل ہے۔ جیوں جیوں میں طرح دیتی ہوں۔ آپ جامے سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ایک کہیں، تو دو سناؤں۔ آخر کب تک اور کہاں تک سہوں۔ کوئی حد بھی ہے۔ جب دیکھو ڈانٹ رہے ہیں۔ جس کے مزاج کا کچھ پتہ ہی نہ ہو، اسے کون خوش رکھ سکتا ہے۔ اس دن ذرا سا بلی کو مار دیا تو آپ دیا کا اُپدیش کرنے لگے۔ آج وہ دیا کہاں گئی۔ ان کو ٹھیک کرنے کا اپائے یہی ہے کہ سمجھ لوں کوئی کتا بھونک رہا ہے۔ نہیں ایسا کیوں کروں۔ اپنے من سے کوئی کام ہی نہ کروں۔ جو یہ کہیں وہی کروں، نہ جو بھر کم نہ جو بھر زیادہ۔ جب انھیں میرا کوئی کام پسند نہیں آتا، مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے جو بربس اپنی ٹانگ اڑاؤں۔ بس، یہی ٹھیک ہے۔
وہ رات بھر اسی ادھیڑ بن میں پڑی رہی۔ سویرے کندن لال ندی اسنان کرنے گئے۔ لوٹے تو 1 بج گئے تھے۔ گھر جا کر دیکھا تو چوکا برتن نہ ہوا تھا۔ پران سوکھ گئے۔ پوچھا کیا مہری نہیں آئی؟

رامیش : نہیں۔

کندن : تو پھر؟

رامے : جو آپ کی آگیہ۔

کندن : یہ تو بڑی مشکل ہے۔

رامے : ہاں، ہے تو۔

کندن : پڑوس کی مہری کو کیوں نہیں بلا لیا؟

رامے : کس کے حکم سے بلاتی، اب حکم ہوا ہے۔ بلائے لیتی ہوں۔

کندن : اب بلاؤگی تو کھانا کب بنے گا؟ نو بج گئے اور اتنا تو تمھیں عقل سے کام لینا چاہیے تھا کہ مہری نہیں آئی تو پڑوس والی کو بلالیں۔

رامے : اگر اس وقت سرکار پوچھتے، کیوں مہری بلائی، تو کیا جواب دیتی؟ اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا۔ اب تمھاری ہی عقل سے کام لوں گی۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے آنکھیں دکھائے۔

کندن : اچھا تو، اس وقت کیا ہوگا؟

رامے : جو حضور کا حکم ہو۔

کندن : تم مجھے بناتی ہو۔

رامے : میری اتنی مجال کہ آپ کو بناؤں میں تو حضور کی لونڈی ہوں۔ جو کہیے وہ کروں۔

کندن : میں تو جاتا ہوں تمھارا جو جی چاہے کرو۔

رامے : جایئے میرا جی کچھ نہ چاہے گا اور نہ کچھ کروں گی۔

کندن : آخر تم کیا کھاؤگی؟

رامے : جو آپ دے دیں گے، وہی کھالوں گی۔

کندن : لاؤ بازار سے پوڑیاں لادوں۔

رامیشوری روپیہ نکال لائی۔ کندن لال پوڑیاں لائے۔ اس وقت کا کام چلا۔ دفتر گئے۔ لوٹے، تو دیر ہوگئی تھی۔ آتے ہی آتے پوچھا مہری آئی؟

رامے : نہیں۔

کندن : میں نے تو کہا تھا پڑوس والی کو بلا لینا۔

رامے : بلایا تھا وہ پانچ روپے مانگتی ہے

کندن : تو ایک ہی روپے کا فرق تھا، کیوں نہیں رکھ لیا؟

رامے : مجھے یہ حکم نہ ملا تھا۔ مجھ سے جواب طلب ہوتا کہ ایک روپیہ زیادہ کیوں دے دیا۔ خرچ کی کفایت پر اپدیش دیا جانے لگتا تو کیا کرتی۔

کندن : تم بالکل مورکھ ہو۔

رامے : بالکل۔

کندن : تو اس وقت بھی بھوجن نہ بنے گا؟

رامے : مجبوری ہے۔

کندن لال سر تھام کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ یہ تو نئی وپتی گلے پڑی۔ پوڑیاں انھیں رُچتی نہ تھیں۔ جی میں بہت جھنجلائے۔ رامیشوری کو دو چار الٹی سیدھی سنائیں۔ لیکن اس نے مانو سنا ہی نہیں۔ کچھ بس نہ چلا تو مہری کی تلاش میں نکلے۔ جس کے یہاں گئے، معلوم ہوا مہری کام کرنے چلی گئی۔ آخر ایک کہار ملا۔ اسے بلا لائے۔ کہار نے دو آنے لیے اور برتن دھو کر چلتا بنا۔

رامیشوری نے کہا بھوجن کیا بنے گا؟

کندن : روٹی ترکاری بنالو، یا اس میں کچھ آپتی ہے؟

رامے : ترکاری گھر میں نہیں ہے۔

کندن : دن بھر بیٹھی رہی ترکاری بھی نہ لیتی بنی؟ اب اتنی رات گئے ترکاری کہاں سے ملے گی؟

رامے : مجھے ترکاری لے رکھنے کا حکم نہ ملا تھا۔ میں پیسہ دھیلا زیادہ دے دیتی تو؟

کندن لال نے دوشتا سے دانت پیس کر کہا۔ آخر تم کیا چاہتی ہو؟

رامیشوری نے سانت بھاؤ سے جواب دیا۔ کچھ نہیں، کیول اپمان نہیں چاہتی۔

کندن : تمھارا اپمان کون کرتا ہے؟

رامے : آپ کرتے ہیں۔

کندن : تو میں گھر کے معاملے میں کچھ نہ بولوں؟

رامے : آپ نہ بولیں گے تو کون بولے گا؟ میں تو کیول حکم کی تابعدار ہوں۔

رات روٹی دال پر کٹی۔ دونوں آدمی لیٹے۔ رامیشوری کو تو ترنت نیند آگئی۔ کندن لال بڑی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔ اگر رامیشوری اس طرح سہوگ نہ کرے گی، تو ایک دن بھی کام نہ چلے گا۔ آج ہی بڑی مشکل سے بھوجن ملا۔ اس کی سمجھ ہی الٹی ہے۔ میں تو سمجھاتا ہوں، یہ سمجھتی ہے، ڈانٹ رہا ہوں۔ مجھ سے بنا بولے رہا بھی تو نہیں جاتا۔ لیکن اگر بولنے کا یہ نتیجہ ہے تو پھر بولنا فضول ہے۔ نقصان ہوگا بلا سے، یہ تو نہ ہوگا کہ دفتر سے آکر بازار بھاگوں۔ مہری سے روپے وصول کرنے کی بات اسے بری لگی اور تھی بھی بے جا۔ روپے تو نہ ملے، الٹے مہری نے کام چھوڑ دیا۔

رامیشوری کو جگا کر بولے کتنا سوتی ہو تم؟

رامے : مزدوروں کو اچھی نیند آتی ہے۔

کندن : چڑھاؤ مت، مہری سے روپے نہ وصول کرنا۔

رامے : وہ تو لیے کھڑی ہے شاید۔

کندن : اسے معلوم ہو جائے گا تو کام کرنے آئے گی۔

رامے : اچھی بات سے کہلا بھیجوں گی۔

کندن : آج سے میں کان پکڑتا ہوں۔ تمھارے بیچ میں نہ بولوں گا۔

رامے : اورجو میں گھر لٹا دوں تو؟

کندن : لٹا دو چاہے مٹا دو، مگر روٹھو مت۔ اگر تم کسی بات میں میری صلاح پوچھوگی، تو دے دوں گا، ورنہ منھ نہ کھولوں گا۔

رامے : میں اپمان نہیں سہہ سکتی۔

کندن : اس بھول کو چھما کرو۔

رامے : سچے دل سے کہتے ہو نہ؟

کندن : سچے دل سے۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں ماہنامہ 'مادھوری' فروری 1929 میں شائع ہوا۔ 'مان سرودر' 4 میں شامل ہے۔ اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔)

پریم کی ہولی

گنگی کا سترھواں سال تھا، پر وہ تین سال سے ودھوا تھی، اور جانتی تھی کہ میں ودھوا ہوں، میرے لیے سنسار کے سکھوں کے دوار بند ہیں پھر وہ کیوں روئے اور کلپے؟ میلے سے سبھی تو مٹھائی کے دونے اور پھولوں کے ہار لے کر نہیں لوٹتے؟ کتنوں ہی کا تو میلے کی سجی ہوئی دوکانیں اور ان پر کھڑے نرناری دیکھ کر ہی منورنجن ہو جاتا ہے۔ گنگی کھاتی پیتی تھی۔ ہنستی بولتی تھی، کسی نے اسے منھ لٹکائے، اپنے بھاگیہ کو روتے نہیں دیکھا۔ گھڑی رات کو اٹھ کر گوبر نکال کر گائے بیلوں کو سانی دینا، پھر اپلے پاتھنا، اس کا نتیہ کا نیم تھا۔ تب وہ اپنے بھیا کو گائے دہانے کے لیے جگاتی تھی پھر کنویں سے پانی لاتی، چوکے کا دھندا شروع ہو جاتا۔ گاؤں کے بھاوجیں اس سے ہنسی کرتیں، پر ایک وِشیش پرکار کی ہنسی چھوڑ کر، سہیلیاں سسرال سے آکر اس سے ساری کتھا کہتیں۔ پر ایک وِشیش پرسنگ بچا کر۔ سبھی اس کے ویدھویہ کا آدر کرتے تھے۔ جس چھوٹے سے اپرادھ کے لیے اس کی بھاوج پر گھڑکیاں پڑتی، اس کی ماں کو گالیاں ملتی، اس کے بھائی پر مار پڑتی، وہ اس کے لیے چھمیہ تھا۔ جسے ایشور نے مارا ہے، اسے کوئی کیا مارے۔ جو باتیں اس کے لیے ورجت تھی ان کی اُور اس کا من ہی نہ جاتا تھا۔ اس کے لیے اس کا اَستتو ہی نہ تھا۔ جوانی کے اس امڑے ہوئے ساگر میں متوالی لہریں نہ تھیں۔ ڈراونی غرض نہ تھی، اچل شانتی کا سامراجیہ تھا۔

(2)

ہولی آئی سب نے گلابی ساڑیاں پہنیں، گنگی کی ساڑی نہ رنگی گئی۔ ماں نے پوچھا۔ بیٹی تیری ساڑی بھی رنگ دوں۔ گنگی نے کہا۔ نہیں اماں یوں ہی رہنے دو۔ بھاوج نے پھاگ گایا۔ وہ پکوان بناتی رہی اسے اسی میں آنند تھا۔

تیسرے پہر دوسرے گاؤں کے لوگ ہولی کھیلنے آئے۔ یہ لوگ بھی ہولی لوٹانے جائیں گے۔ گاؤں میں یہی پرسپر ویوہار ہے۔ میکو مہتو نے بھنگ بنوا رکھی تھی،

چرس گانجا، ماجوم سب کچھ لائے تھے، گنگی نے بھی بھنگ پیسی تھی۔ میٹھی الگ بنائی تھی، نمکین الگ۔ اس کا بھائی پلاتا تھا، وہ ہاتھ دھلاتی تھی۔ جوان سر نیچا کیے پی کر چلے جاتے، بوڑھے، گنگی سے پوچھ لیتے۔ اچھی طرح ہو نہ بنی یا چہل کرتے۔ کیوں ری گنگیا۔ بھاوج تجھے کھانا نہیں دیتی کیا۔ جو اتنی دبلی ہوگئی ہے۔ گنگیا ہنس کر رہ جاتی۔ دیہہ کیا اس کے بس کی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ موٹی ہو گئی تھی۔

بھنگ پینے کے بعد لوگ بھاگ گانے لگے۔ گنگیا اپنی چوکھٹ پر کھڑی سن رہی تھی۔ ایک جوان ٹھاکر گا رہا تھا۔ کتنا اچھا سور تھا، کیسا میٹھا، گنگیا کو بڑا آنند آرہا تھا۔ ماں نے کئی بار پکارا سن جا۔ وہ نہ گئی۔ ایک بار گئی بھی تو جلدی سے لوٹ آئی۔ اس کا دھیان اسی گانے پر تھا۔ نہ جانے کیا بات اسے کھینچ لیتی تھی۔ باندھے لیتی تھی۔ جوان ٹھاکر بھی باربار گنگیا کی اور دیکھتا اور مست ہو ہو کر گاتا۔ اس کے ساتھ والوں کو آشچریہ ہو رہا تھا۔ ٹھاکر کو یہ سدھی کہاں مل گئی۔ وہ لوگ ودا ہوئے تب بھی گنگیا چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ جوان ٹھاکر نے بھی اس کی اور دیکھا اور چلا گیا۔

گنگیا نے اپنے باپ سے پوچھا۔ کون گاتا تھا دادا؟

میکو نے کہا۔ کوٹھار کے بدھو سنگھ کا لڑکا ہے، غریب سنگھ بدھو ریتی ویوہار میں آتے جاتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد اب وہی لڑکا آنے جانے لگا۔

گنگی : یہاں تو پہلے پہل آیا ہے؟

میکو : ہاں، اور تو کبھی نہیں دیکھا۔ مزاج بالکل باپ کا سا ہے۔ اور ویسی ہی میٹھی بولی ہے۔ گھمنڈ تو چھو نہیں گیا۔ بدھو کے بکھار میں اناج رکھنے کو جگہ نہ تھی پر چمار کو بھی دیکھتے تو پہلے ہاتھ اٹھاتے۔ وہی اس کا سوبھاؤ ہے۔ گورو آرہے تھے۔ گنگی پکھیا لینے بھیتر چلی گئی۔ وہی سور اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

کئی مہینے گذر گئے۔ ایک دن گنگی گوبر پاتھ رہی تھی۔ سہسا اس نے دیکھا وہی ٹھاکر سر جھکائے دوار پر سے چلا جار ہاتھا۔ وہ گوبر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھر میں کوئی مرد نہ تھا۔ سب باہر چلے گئے تھے۔ یہ کہنا چاہتی تھی ٹھاکر بیٹھو، پانی پیتے جاؤ۔ پر اس کے منھ سے بات نہ نکلی۔ اس کی چھاتی کتنے زور سے دھڑک رہی تھی۔ اسے ایک وچتر گھبراہٹ ہونے لگی۔ کیا کرے، کیسے اسے روک لے۔ غریب سنگھ نے ایک

بار اس کی اور تاکا اور پھر آنکھیں نیچی کر لیں۔ اس درشٹ میں کیا بات تھی کہ گنگی کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ وہ دوڑی گھر میں گئی اور ماں سے بولی۔ اماں وہ ٹھاکر جا رہے ہیں، غریب سنگھ۔ ماں نے کہا۔ کسی کام سے آئے ہوں گے۔ گنگی باہر آئی تو ٹھاکر چلا گیا تھا۔ وہ پھر گوبر پاتھنے لگی، پر اپلے ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے، آپ ہی آپ ہاتھ بند ہو جاتے، مگر پھر چونک کر پاتھنے لگتی۔ جیسے کہیں دور سے اس کے کانوں میں آواز آرہی ہو۔ وہی درشٹ آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس میں کیا جادو تھا؟ کیا موہنی تھی، اس نے اپنی موک بھاشا میں کچھ کہا۔ گنگی نے بھی کچھ سنا۔ کیا کہا؟ یہ وہ نہیں جانتی، پر وہ درشٹ آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔

رات کو لیٹی تب بھی وہی درشٹ سامنے تھی۔ سوپن میں بھی وہی درشٹ دکھائی دی۔

پھر کئی مہینے گذر گئے۔ ایک دن سندھیا سمے میکو دوار پر بیٹھے سن کات رہے تھے۔ اور گنگی بیلوں کو سانی چلا رہی تھی کہ سہسا چلا اٹھی۔ دادا، دادا، ٹھاکر۔

میکو نے سر اٹھایا تو دوار پر غریب سنگھ چلا آرہا تھا۔

رام رام ہوا۔

میکو نے پوچھا۔ کہاں غریب سنگھ۔ پانی تو پیتے جاؤ۔

غریب آکر ایک ماچی پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ کچھ وہ بیمار سا جان پڑتا تھا۔ میکو نے کہا۔ کچھ بیمار تھے کیا؟

غریب : نہیں تو دادا۔

میکو : کچھ منھ اترا ہوا ہے، کیا سود بیاج کی چنتا میں پڑ گئے؟

غریب : تمھارے جیتے مجھے کیا چنتا ہے دادا۔

میکو : باقی دے دی نہ۔

غریب : ہاں دادا، سب بے باق کر دیا۔

میکو نے گنگی سے کہا۔ بٹی جا، کچھ ٹھاکر کو پانی پینے کو لا۔ بھیا ہو تو کہہ دینا چلم دے جائے۔

غریب نے کہا۔ چلم رہنے دو دادا۔ میں نہیں پیتا۔

میکو : اب کی گھر ہی تمباکو بنی ہے، سواد تو دیکھو۔ پیتے تو ہو؟
غریب : اتنا بے ادب نہ بناؤ دادا۔ کاکا کے سامنے چلم نہیں چھوئی۔
میں تم کو انھیں کی جگہ دیتا ہوں۔
یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میکو کا ہردے بھی گدگد ہو۔
گنگی ہاتھ کی ٹوکری لیے مورتی کے سمان کھڑی تھی۔

اس کی ساری چیتنا ساری بھاؤنا، غریب سنگھ کی باتوں کی اور کھنچی ہوئی تھی۔ اس میں اور کچھ سوچنے کی اور کچھ کرنے کی شکتی نہ تھی۔ اوہ کتنی نمرتا ہے، کتنی سجنتا کتنا ادب۔

میکو نے پھر کہا۔ سنا نہیں بٹی، جاکر کچھ پانی پینے کو لاؤ گنگی چونک پڑی۔ دوڑی ہوئی گھر میں گئی۔ کٹورا مانجا، اس میں تھوڑی سی راب نکالی۔ پھر لوٹا گلاس مانج کر شربت بنایا۔

ماں نے پوچھا کون آیا ہے گنگلیا؟
گنگی : وہ ہیں ٹھاکر غریب سنگھ، دودھ تو نہیں ہے اماں، رس میں ملا دیتی؟
ماں : ہے کیوں نہیں، ہاڑی میں دیکھ

گنگی نے ساری ملائی اتار کر رس میں ملا دی اور لوٹا گلاس لیے باہر نکلی۔ ٹھاکر نے اس کی اور دیکھا۔ گنگی نے سر جھکا لیا۔ یہ سنکوچ اس میں کہاں سے آگیا؟

ٹھاکر نے رس پیا اور رام رام کہہ کر چلا گیا۔

میکو بولا : کتنا دبلا ہوگیا ہے۔
گنگی بیمار ہیں کیا؟
میکو : چنتا ہے اور کیا؟ اکیلا آدمی ہے، اتنی بڑی گرستھی کیا کرے؟ گنگی کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ انھیں کون سی چنتا ہے۔ دادا سے کچھ کہا بھی تو نہیں۔ کیوں اتنے سکوچاتے ہیں۔ چہرہ کیسا پیلا پڑ گیا ہے۔

سویرے گنگی نے ماں سے کہا۔ غریب سنگھ اب کی بہت دبلے ہو گئے ہیں۔ اماں۔

ماں : اب وہ بے فکری کہاں ہے بٹی۔ باپ کے زمانے میں کھاتے تھے اور کھیلتے

تھے۔ اب تو گرستی کا جنجال سر پر ہے۔ گنگی کو اس جواب سے سنتوش نہ ہوا۔ باہر جاکر میکو سے بولی۔ دادا، تم نے غریب سنگھ کو سمجھا نہیں دیا۔ کیوں اتنی چنتا کرتے ہو؟ میکو نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور کہا۔ جا، اپنا کام کر۔ گنگی پر مانو برج پات ہوگیا۔ یہ کٹھور اُتر اور دادا کے منھ سے ہائے۔ دادا کو بھی ان کا دھیان نہیں۔ کوئی اس کا متر نہیں۔ انھیں کون سمجھائے۔ اب کی وہ آئیں گے تو میں خود انھیں سمجھاؤں گی۔ گنگی روز سوچتی۔ وہ آتے ہوں گے۔ پر ٹھاکر نہ آئے۔ پھر ہولی آئی۔ پھر گاؤں میں پھاگ ہونے لگا۔ رمنیوں نے پھر گلابی ساڑیاں پہنی۔ پھر رنگ گھولا گیا۔ میکو نے بھنگ چرس، گانجا منگوایا۔ گنگی نے پھر میٹھی اور نمکین بھنگ بنائی۔ دوار پر ٹاٹ بچھ گیا۔ ویوہاری لوگ آنے لگے۔ مگر کوٹھار سے کوئی نہیں آیا۔ شام ہوگئی۔ کسی کا پتہ نہیں۔ گنگی بے قرار تھی۔ کبھی بھیتر جاتی کبھی باہر آتی۔ بھائی سے پوچھتی۔ کیا کوٹھار والے نہیں آئے؟ بھائی کہتا۔ نہیں۔ دادا سے پوچھتی۔ بھنگ تو نہیں بچی، کوٹھار والے آویں گے تو کیا پئیں گے؟ دادا کہتے۔ اب کیا رات کو آئیں گے، سامنے تو گاؤں ہے۔ آتے ہوتے تو دکھائی دیتے۔ رات ہو گئی پر گنگی کو ابھی تک آشا لگی ہوئی تھی۔ وہ مندر کے اوپر چڑھ گئی اور کوٹھار کی اُور نگاہ دوڑائی۔ کوئی نہ آتا تھا۔

سہسا اسے اسی سیوانے کی اُور آگ دہکتی ہوئی دکھائی دی۔ دیکھتے دیکھتے جوالا پرچنڈ ہوگئی۔ یہ کیا۔ وہاں آج ہولی جل رہی ہے۔ ہولی تو کل ہی جل گئی۔ کون جانے وہاں پنڈتوں نے آج ہولی جلانے کی سایت بتائی ہو۔ تبھی وہ لوگ آج نہیں آئے۔ کل آئیں گے۔ اس نے گھر آکر میکو سے کہا۔ دادا کوٹھار میں تو آج ہولی جلی ہے۔

میکو : دت پگلی۔ ہولی سب جگہ کل جل گئی۔

گنگی : تم مانتے نہیں ہو۔ میں مندر پر سے دیکھ آئی ہوں۔ ہولی جل رہی ہے۔ نہ پتیاتے ہو تو چلو، میں دکھا دوں۔

میکو : اچھا چل دیکھوں۔

میکو نے گنگی کے ساتھ مندر کی چھت پر آکر دیکھا۔ ایک منٹ تک دیکھتے

رہے۔ پھر بنا کچھ بولے نیچے اتر آئے۔ گنگی نے کہا۔ ہے ہولی کہ نہیں تم نہ مانتے تھے؟
میکو : ہولی نہیں ہے پگلی۔ چتا ہے۔ کوئی مر گیا ہے۔ تبھی آج کوٹھار والے نہیں
آئے۔ گنگی کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ اتنے میں کسی نے نیچے سے پکارا۔ میکو
مہتو، کوٹھار کے غریب سنگھ گذر گئے۔ میکو نیچے چلے گئے، پر گنگی وہیں
استمبھت کھڑی رہی۔ کچھ خبر نہ رہی۔ میں کون ہوں کہاں ہوں۔ معلوم ہوا
جیسے غریب سنگھ اس سُودور چتا سے نکل کر اس کی اور دیکھ رہا ہے۔ وہی
درشٹ تھی وہی چہرہ کیا اسے وہ بھول سکتی تھی؟ اس دیوس سے پھر کبھی ہولی
دیکھنے نہیں گئی۔ ہولی ہر سال آتی تھی، ہر سال اسی طرح بھنگ بناتی تھی۔ ہر
سال اسی طرح پھاگ ہوتا تھا۔ ہر سال ابیر گلال اڑتی تھی پر گنگی کے لیے
ہولی سدا کے لیے چلی گئی۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں 'متوالا' 23 مارچ 1929 میں شائع ہوا۔ ہندی مجموعہ 'کفن' میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔)

فاتحہ

سرکاری اناتھالیہ سے نکل کر میں سیدھا فوج میں بھرتی کیا گیا۔ میرا شریر ہشٹ پشٹ اور بلشٹھ تھا۔ سادھارن منشیوں کی اُپیکشا میرے ہاتھ پیر کہیں لمبے اور سنایو یکت تھے۔ میری لمبائی پوری چھے فٹ نو انچ تھی۔ پلٹن میں 'دیو' نام سے وکھیات تھا۔ جب سے میں فوج میں بھرتی ہوا، تب سے میری قسمت نے بھی پلٹا کھانا شروع کیا اور میرے ہاتھ سے کئی ایسے کام ہوئے، جن سے پرتشٹھا کے ساتھ ساتھ میری آیے بھی بڑھتی گئی۔ پلٹن کا ہر ایک جوان مجھے جانتا تھا۔ میجر سردار ہمّت سنگھ کی کرپا میرے اوپر بہت تھی؛ کیوں کہ میں نے ایک باران کی پران رکشھا کی تھی۔ اس کے اتِرکت نہ جانے کیوں ان کو دیکھ کر میرے ہردے میں بھکتی اور شردھا کا سنچار ہوتا۔ میں یہی سمجھتا کہ یہ میرے پوجیہ ہیں اور سردار صاحب کا بھی ویوہار میرے ساتھ اسنیہہ یکت اور مترتا پورن تھا۔

مجھے اپنے ماتا پتا کا پتہ نہیں ہے،اور نہ ان کی کوئی اسمرتی ہی ہے۔ کبھی کبھی جب میں اس پرشن پر وچار کرنے بیٹھتا ہوں ،تو کچھ دھندھلے سے درشیہ دکھائی دیتے ہیں -بڑے بڑے پہاڑوں کے بیچ رہتا ہوا ایک پریوار ،اور ایک استری کا مکھ،جو شاید میری ماں کا ہوگا۔ پہاڑی کے بیچ میں تو میرا پالن پوشن ہی ہوا ہے۔ پیشاور سے 70 میل دور پورڈ ایک گرام ہے،جس کا نام' گلاہا' ہے وہیں پرایک سرکاری اناتھالیہ ہے۔ اسی میں میں پالا گیا۔ یہاں سے نکل کر سیدھا فوج میں چلا گیا۔ ہمالہ کی جل وایو سے میرا شریر بنا ہے، اور میں ویسا ہی دیرگھاکرِت اِدِ بربر ہوں ،جیسے کہ سیما پرانت کے رہنے والے آفریدی، گلزئی، مہسودی آدِی پہاڑی قبیلوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ یدی ان کے اور میرے جیون میں کچھ انتر ہے تو وہ سمّیتا کا۔ میں تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیتا ہوں، بات چیت کر لیتا ہوں، ادب قاعدہ جانتا ہوں۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ کر سکتا ہوں، کِنتُ میری آکرتِ ویسی ہی ہے، جیسی کہ کسی بھی سرحدی پُروش کی ہو سکتی ہے۔

کبھی کبھی میرے من میں یہ اِچھا بلوتی ہوتی کہ سوچھند ہوکر پہاڑوں کی سیر کروں؛ لیکن جیوکا کا پرشن میری اِچھاکو دبا دیتا۔ اس سوکھے دیش میں کھانے کا کچھ بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہاں کے لوگ ایک روٹی کے لئے منشیہ کی ہتیا کر ڈالتے، ایک کپڑے کے لیے مُردے کی لاش چیڑ پھاڑ کر پھینک دیتے اور ایک بندوق کے لیے سرکاری فوج پر چھاپہ مارتے ہیں۔ اس کے اترِکت ان جنگلی جاتیوں کا ایک ایک منشیہ مجھے جانتا تھا اور میرے خون کا پیاسا تھا۔ یدی میں انھیں مل جاتا، تو ضرور میرا نام نشان دنیا سے مٹ جاتا۔ نہ جانے کتنے آفریدیوں اور گِلزئیوں کو میں نے مارا تھا،کتنوں کو پکڑ پکڑ کر سرکاری جیل خانوں میں بھر دیا تھا اور نہ معلوم ان کے کتنے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ میں بھی بہت سترک رہتا، اور جہاں تک ہوتا، ایک استھان پر ہفتے سے ادھک کبھی نہ رہتا۔

(2)

ایک دن میں میجر سردار ہمت سنگھ کے گھر جا رہا تھا۔ اس سمے دو بجے تھے۔ آج کل چھٹی سی تھی؛کیوں کہ حال ہی میں کئی گاؤں بھسمی بھوت کر دیے گئے تھے اور جلدی ان کی طرف سے کوئی آشنکا نہیں تھی۔ ہم لوگ نِشچنت ہو کر گپ اور ہنسی کھیل میں دن گزارتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے دل گھبرا گیا تھا۔ صرف من بہلانے کے لیے سردار صاحب کے گھر کی اور چلا؛ کنتو راستے میں ایک درگھٹنا ہو گئی۔ ایک بوڑھا آفریدی، جو اب بھی ہندوستانی جوان کا سر مروڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ ایک فوجی جوان سے بھڑا ہوا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی کمر سے ایک تیز چھرا نکالا اور اس کی چھاتی میں گھسیڑ دیا۔ اس جوان کے پاس ایک کارتوس بندوق میں تھی، بس اسی کے لیے یہ سب لڑائی تھی۔ پلک مارتے مارتے، فوجی جوان کا کام تمام ہوگیا اور بندوق لے کر بھاگا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا لیکن دوڑنے میں وہ اتنا تیز تھا کہ بات کی بات میں آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں بھی بے تحاشا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ آخر سرحد پر پہنچتے پہنچتے اس کے بیس ہاتھ کی دوری پر رہ گیا۔ اس نے پیچھے پھر کر دیکھا، میں اکیلا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے بندوق کا نشانہ میری اور سادھا۔ میں فوراً ہی زمین پر لیٹ گیا اور بوڑھا بندوق کی گولی میرے سامنے پتھر پر لگی۔ اس نے سمجھا کہ میں گولی

کا شکار ہو گیا۔ وہ دھیرے دھیرے سڑک پدوں سے میری اور بڑھا۔ میں سانس کھینچ کر لیٹ گیا۔ جب وہ بالکل میرے پاس آگیا ،شیر کی طرح اچھل کر میں نے اس کی گردن پکڑ کر زمین پر پٹک دیا اور چھرا نکال کر اس کی چھاتی میں گھسیڑ دیا۔ آفریدی کی جیون لیلا سماپت ہو گئی۔ اسی سمے میری پلٹن کے کئی لوگ بھی آ پہنچے۔ چاروں طرف سے لوگ میری پرشنسا کرنے لگے۔ ابھی تک میں اپنے آپے میں نہ تھا؛ لیکن اب میری سدھ بدھ واپس آئی۔ نہ معلوم کیوں اس بڈّھے کو دیکھ کر میرا جی گھبرانے لگا۔ ابھی تک نہ معلوم کتنے ہی آفریدیوں کو مارا تھا؛لیکن کبھی بھی میرا ہردے اتنا گھبرایا نہ تھا۔ میں زمین پر بیٹھ گیا اور اس بڈّھے کی اور دیکھنے لگا۔ پلٹن کے جوان بھی وہاں پہنچ گئے اور مجھے گھائل جان کر انیک پرکار کے پَرشن کرنے لگے۔ دھیرے دھیرے میں اٹھا اور چپ چاپ شہر کی اور چلا۔ سپاہی میرے پیچھے پیچھے اسی بڈّھے کی لاش گھسیٹتے ہوئے چلے۔ شہر کے نواسیوں نے میری جے جے کار کا تانتا باندھ دیا۔ میں چپ چاپ میجر سردار ہمّت سنگھ کے گھر میں گھس گیا۔

سردار صاحب اس سمے اپنے خاص کمرے میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر پوچھا -کیوں ،اس آفریدی کو مار آئے؟

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا- جی ہاں، لیکن سردار صاحب، نہ جانے کیوں میں کچھ بُزدل ہو گیا ہوں۔

سردار صاحب نے آشچریہ سے کہا- اسد خاں اور بُزدل۔ یہ دونوں ایک جگہ ہونا ناممکن ہے۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا! سردار صاحب یہاں طبیعت نہیں لگتی، اٹھ کر باہر برآمدے میں بیٹھیے۔ نہ معلوم کیوں میرا دل گھبراتا ہے۔

سردار صاحب اٹھ کر میرے پاس آئے اورا سنیہہ سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا- اسد،تم دوڑتے دوڑتے تھک گئے ہو، اور کوئی بات نہیں ہے۔ اچھا چلو برآمدے میں بیٹھیں۔ شام کی ٹھنڈی ہوا تمھیں تازہ کر دے گی۔

سردار صاحب اور میں، دونوں برآمدے میں جاکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شہر کے چومُہانے پر اسی ورِدّھ کی لاش رکھی تھی اور اس کے چاروں اُور بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

برآمدے میں جب مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا، تو لوگ میری اور اشارہ کرنے لگے۔ سردار صاحب نے یہ دِرشیہ دیکھ کر کہا-اسد خاں، دیکھا، لوگوں کی نگاہ میں تم کتنے اونچے ہو؟ تمھاری ویرتا یہاں کا بچہ بچہ سراہتا ہے۔ اب بھی تم کہتے ہو کہ میں بزدل ہوں۔

میں نے مسکرا کر کہا- جب سے اس بڈھے کو مارا ہے، تب سے میرا دل مجھے دِھکار رہا ہے۔

سردار صاحب نے ہنس کر کہا- کیونکہ تم نے اپنے سے نِربل کو مارا ہے۔

میں نے اپنی دل جمعی کرتے ہوئے کہا- ممکن ہے، ایسا ہی ہو۔

اسی سمے ایک آفریدی رمنی دھیرے دھیرے آکر سردار صاحب کے مکان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ جیوں ہی سردار صاحب نے دیکھا، ان کا منہ سفید پڑ گیا۔ ان کی بھے بھیت دِرشٹی اس کی اور سے پھر کر میری اور ہو گئی۔ میں بھی آشچریہ سے ان کے منھ کی اور نہارنے لگا۔ اس رمنی کا سا سگٹھِت شریر مردوں کا بھی کم ہوتا ہے۔ خاکی رنگ کے موٹے کپڑے کا پاجامہ اور نیلے رنگ کا موٹا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ بلوچی عورتوں کی طرح سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ رنگ چمپئی تھا اور یووَن کی آبھا پھوٹ پھوٹ کر باہر نکلی پڑتی تھی۔ اس سمے اس کی آنکھوں میں ایسی بھشینتا تھی، جو کسی کے دل میں بھے کا سنچار کرتی۔ رمنی کی آنکھیں سردار صاحب کی اور سے پھر کر میری اور آئیں اور اس نے یوں گھورنا شروع کیا کہ میں بھی بھے بھیت ہو گیا۔ رمنی نے سردار کی اور دیکھا اور پھر زمین پر تھوک دیا اور پھر میری اور دیکھتی ہوئی دھیرے دھیرے دوسری اور چلی گئی۔

رمنی کو جاتے دیکھ کر سردار صاحب کی جان میں جان آئی۔ میرے سر پر سے بھی ایک بوجھ ہٹ گیا۔

میں نے سردار صاحب سے پوچھا- کیوں، کیا آپ جانتے ہیں؟ سردار صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا- ہاں، بخوبی۔ ایک سمے تھا، جب یہ مجھ پر جان دیتی تھی اور واستو میں اپنی جان پر کھیل کر میری رکشا بھی کی تھی؛ لیکن اب اس کو میری صورت سے نفرت ہے۔ اسی نے میری استری کی ہتیا کی ہے۔ اسے جب کبھی دیکھتا ہوں، میرے ہوش حواس کافور ہو جاتے ہیں، اور وہی درشیہ میری آنکھوں کے سامنے

ناچنے لگتا ہے۔

میں نے بھے وِہَبَل سُور میں پوچھا- سردار صاحب، اس نے میری اور بھی تو بڑی بھیانک درشٹی سے دیکھا تھا۔ نہ معلوم کیوں میرے بھی روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔

سردار صاحب نے سر ہلاتے ہوئے بڑی گمبھیرتا سے کہا- اسد خاں، تم بھی ہوشیار رہو۔ شاید اس بوڑھے آفریدی سے اس کا سمپرک ہے۔ ممکن ہے، یہ اس کا بھائی یا باپ ہو۔ تمھاری اور اس کا دیکھنا کوئی معنی رکھتا ہے۔ بڑی بھیانک استری ہے۔

سردار صاحب کی بات سن کر میری نس نس کانپ اٹھی۔ میں نے باتوں کا سلسلہ دوسری اور پھیرتے ہوئے کہا- سردار صاحب، آپ اس کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے؟ اس کو پھانسی ہو جائے گی۔

سردار صاحب نے کہا- بھائی اسد خاں، اس نے میرے پران بچائے تھے اور شاید اب بھی مجھے چاہتی ہے۔ اس کی کتھا بہت لمبی ہے۔ کبھی اوکاش ملا تو کہوں گا۔

سردار کی باتوں سے مجھے بھی کوتوہل ہو رہا تھا۔ میں نے ان سے یہ ورتانت سننے کے لئے آگرہ کرنا شروع کیا۔ پہلے تو انھوں نے ٹالنا چاہا؛ پر جب میں نے بہت زور دیا تو وِوَش ہوکر بولے- اسد، میں تمھیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں؛ اس لیے تم سے کوئی پردہ نہ رکھوں گا۔ لو سنو۔

(3)

اسد خاں، پانچ سال پہلے میں اتنا وِردھ نہ تھا، جیسا کہ اب دکھائی پڑتا ہوں۔ اس سمے میری آیو 40 سے اِدھک نہ تھی۔ ایک بھی بال سفید نہ ہوا تھا اور اس سمے مجھ میں اتنا بل تھاکہ دو جوانوں کو میں لڑا دیتا۔ جرمنوں سے میں نے مُڈ بھیڑ کی ہے اور نہ معلوم کتنوں کو یملوک کا راستہ بتا دیا۔ جرمن یدّھ کے بعد مجھے یہاں سیما پرانت پر کالی پلٹن کا میجر بناکر بھیجا گیا۔ جب پہلے پہل میں یہاں آیا، تو یہاں کٹھنائیاں سامنے آئیں؛ لیکن میں نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی اور دھیرے دھیرے ان سب پر وجے پائی۔ سب سے پہلے یہاں آکر میں نے پشتو سیکھنا شروع کیا۔ پشتو کے بعد اور زبانیں سیکھیں؛ یہاں تک کہ میں ان کو بڑی آسانی اور محاوروں کے ساتھ بولنے لگا؛ پھر اس کے بعد کئی آدمیوں کی ٹولیاں بناکر دیش کا انتربھاگ بھی چھان ڈالا۔ اس

پڑتال میں کئی بار میں مرتے مرتے بچا، کنتو سب کٹھنائیاں جھیلتے ہوئے میں یہاں پر سکشل رہنے لگا۔ اس زمانے میں میرے ہاتھ ایسے ایسے کام ہوگئے، جن سے سرکار میں میری بڑی ناموری اور پرتشٹھا بھی ہوگئی۔ ایک بار کرنل ہیملٹن کی میم صاحب کو میں اکیلے چھڑا لایا تھا اور کتنے ہی دیشی آدمیوں اور عورتوں کے پران میں نے بچائے ہیں۔ یہاں پر آنے کے تین سال بعد سے میری کہانی آرمبھ ہوتی ہے۔

ایک رات میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ آفریدیوں سے لڑائی ہو رہی تھی۔ دن کے تھکے ماندے سینک غافل پڑے ہوئے تھے۔ کیمپ میں سناٹا تھا۔ لیٹے لیٹے مجھے بھی نیند آگئی۔ جب میری نیند کھلی تو دیکھا کہ چھاتی پر ایک آفریدی، جس کی آیو میری آیو سے لگ بھگ دونی ہوگی، سوار ہے اور میری چھاتی میں چھرا گھسیڑنے ہی والا ہے۔ میں پوری طرح سے اس کے ادھین تھا، کوئی بھی بچنے کا اُپائے نہ تھا، کنتو اس سے میں نے بڑے ہی دھیریہ سے کام لیا اور پشتو بھاشا میں کہا- مجھے مارو نہیں، میں سرکاری فوج میں افسر ہوں، مجھے پکڑ لے چلو، سرکار تم کو روپے دے کر مجھے چھوڑائے گی۔

ایشور کی کرپا سے میری بات اس کے من میں بیٹھ گئی۔ کمر سے رسّی نکال کر میرے ہاتھ پیر باندھے اور پھر کندھے پر بوجھ کی طرح لاد کر خیمے سے باہر آیا۔ باہر مار کاٹ کا بازار گرم تھا۔ اس نے ایک وچتر پرکار سے چلا کر کچھ کہا اور مجھے کندھے پر لادے وہ جنگل کی اور بھاگا۔ یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کو میرا بوجھ کچھ بھی نہ معلوم ہوتا تھا اور بڑی تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے کئی آدمی، جو اسی کے گروہ کے تھے، لوٹ کا مال لیے ہوئے بھاگے چلے آرہے تھے۔

پراتہ کال ہم لوگ ایک تالاب کے پاس پہنچے۔ تالاب بڑے بڑے پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا اس کا پانی بڑا نرمل تھا اور جنگلی پیڑ اِدھر اُدھر اگ رہے تھے۔ تالاب کے پاس پہنچ کر ہم لوگ ٹھہرے۔ بڈھے نے، جو واستو میں اس گروہ کا سردار تھا، مجھے پتھر پر ڈال دیا۔ میری کمر میں بڑی زور سے چوٹ لگی، ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے؛ لیکن ایشور کی کرپا سے ہڈی ٹوٹی نہ تھی۔ سردار نے مجھے پرتھوی پر ڈالنے کے بعد کہا- کیوں، کتنا روپیہ دلائے گا؟

میں نے اپنی ویدنا دباتے ہوئے کہا - پانچ سو روپیے۔
سردار نے منہ بگاڑ کر کہا- نہیں، اتنا کم نہیں لے گا۔ دو ہزار سے ایک پیسہ بھی کم ملا، تو تمھاری جان کی خیر نہیں۔
میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا- سرکار اتنا روپیہ کالے آدمی کے لیے نہیں خرچ کرے گی۔ سردار نے چھرا باہر نکالتے ہوئے کہا۔ تب پھر کیوں کہا تھا کہ سرکار انعام دے گی۔ لے تو پھر یہیں مر۔
سردار چھرا لیے میری طرف بڑھا۔
میں گھبرا کر بولا- اچھا، سردار میں تم کو دو ہزار روپیے دلوا دوں گا۔
سردار رُک گیا اور بڑے زور سے ہنسا۔ اس کی ہنسی کی پرَتی دھونی نے نرجیو پہاڑوں کو بھی کنپا دیا۔ میں نے من ہی من کہا- بڑا بھیانک آدمی ہے۔
گروہ کے دوسرے آدمی اپنی اپنی لوٹ کا مال سردار کے سامنے رکھنے لگے۔ اس میں کئی بندوقیں، کارتوس، روٹیاں اور کپڑے تھے۔ میری بھی تلاشی لی گئی۔ میرے پاس چھ فائر کا طمنچہ تھا۔ طمنچہ پاکر سردار اچھل پڑا، اور اسے پھرا پھرا کر دیکھنے لگا۔ وہیں پر اسی سمے حصہّ بانٹ شروع ہو گیا۔ برابر کا حصہّ لگا؛ لیکن میرا روالور اس میں نہیں شامل کیا گیا۔ وہ سردار صاحب کی خاص چیز تھی۔
تھوڑی دیر وشرام کرنے کے بعد، پھر یاترا شروع ہوئی۔ اس بار میرے پیر کھول دیے گئے اور ساتھ ساتھ چلنے کو کہا- میری آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دی گئی، تاکہ میں راستہ نہ دیکھ سکوں۔ میرے ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے، اور اس کا ایک سرا ایک آفریدی کے ہاتھ میں تھا۔
چلتے چلتے میرے پیر دکھنے لگے، لیکن منزل پوری نہ ہوئی۔ سر پر جیٹھ کا سورج چمک رہا تھا، پیر جلے جارہے تھے، پیاس سے گلا سوکھا جا رہا تھا؛ لیکن وے برابر چلے جارہے تھے۔ وے آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے؛ لیکن اب میں ان کی ایک بات بھی نہ سمجھ پاتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ شبد تو سمجھ جاتا؛ لیکن بہت انشوں میں میں کچھ بھی نہ سمجھ پاتا تھا۔ وے لوگ اس سمے اپنی وجے پر پرسنّ تھے، اور آفریدی نے اپنی بھاشا میں ایک گیت گانا شروع کیا۔ گیت بڑا ہی اچھا تھا۔

اسد خاں نے پوچھا: سردار صاحب، وہ گیت کیا تھا؟

سردار صاحب نے کہا: اس گیت کا بھاو یاد ہے۔ بھاو یہ ہے کہ ایک آفریدی جا رہا ہے، اور اس کی استری کہتی ہے۔ کہاں جاتے ہو؟

یُوک اُتّر دیتا ہے: جاتے ہیں تمھارے لیے روٹی اور کپڑا لانے۔

استری پوچھتی ہے: اور کچھ اپنے بچّوں کے لیے نہیں لاؤ گے؟

یُوک اتّر دیتا ہے: بچّے کے لیے بندوق لاؤں گا، تاکہ وہ جب بڑا ہو، تو وہ بھی لڑے اور اپنی پریمکا کے لیے روٹی اور کپڑا لا سکے۔

استری کہتی ہے: یہ کہو، کب آؤ گے؟

یُوک اتّر دیتا ہے: آؤں گا تبھی، جب کچھ جیت لاؤں گا؛ نہیں تو وہیں مر جاؤں گا۔

استری کہتی ہے: شاباش، جاؤ، تم ویر ہو، تم ضرور سپھل ہو گے۔

گیت سن کر میں مگدھ ہو گیا۔ گیت سماپت ہوتے ہوتے ہم لوگ بھی رک گئے۔ میری آنکھیں کھولی گئیں۔ سامنے بڑا سا میدان تھا اور چاروں اور گپھائیں بنی ہوئی تھیں، جو انھیں لوگوں کے رہنے کی جگہ تھی۔

پھر میری تلاشی لی گئی اور اس دفعہ سب کپڑے اتروا لیے گئے، کیول پاجامہ رہ گیا۔ سامنے ایک بڑا سا شلاکھنڈ رکھا ہوا تھا۔ سب لوگوں نے مل کر اسے ہٹایا اور مجھے اسی اور لے چلے۔ میری آتما کانپ اٹھی۔ یہ تو زندہ قبر میں ڈال دیں گے۔ میں نے بڑی ہی ویدناپورن دِرشٹی سے سردار کی اور دیکھ کر کہا۔ سردار، سرکار تمھیں روپیہ دے گی۔ مجھے مارو نہیں۔

سردار نے ہنس کر کہا۔ تمھیں مارتا کون ہے، قید کیا جاتا ہے۔ اس گھر میں بند رہو گے، جب روپیہ آ جائے گا، چھوڑ دیے جاؤ گے۔

سردار کی بات سن کر میرے پران میں پران آئے۔ سردار نے میری پاکٹ بک اور پنسل سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ لو، اس میں لکھ دو۔ اگر ایک پیسہ بھی کم آیا، تو تمھاری جان کی خیر نہیں۔

میں نے کمشنر صاحب کے نام ایک پتر لکھ کر دے دیا۔ ان لوگوں نے مجھے اسی اندھ کوپ میں لٹکا دیا اور رسّی کھینچ لی۔

(4)

سردار صاحب نے ایک لمبی سانس لی اور کہنا شروع کیا- اسد خاں، جس سمے میں اس کنویں میں لٹکایا جا رہا تھا، میری انتر آتما کانپ رہی تھی۔ نیچے گھٹا ٹوپ اندھکار کی جگہ ہلکی چاندنی چھائی ہوئی تھی۔ بھیتر سے گپھا نہ بہت چھوٹی اور نہ بہت بڑی تھی۔ فرش کھردرا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں یہاں پر پانی کی دھارا گری ہے اور یہ گڑھا تب جاکر تیار ہوا ہے۔ پتھر کی موٹی دیوار سے وہ کوپ گھرا ہوا تھا اور اس میں جہاں تہاں چھید تھے، جن سے پرکاش اور وایو آتی تھی۔ نیچے پہنچ کر میں اپنی دشا کو ہیر پھیر سوچنے لگا۔ دل بہت گھبراتا تھا۔ کال کوٹھری کی یَنترنا بھوگنا بھی بھاگیہ میں ودھاتا نے لکھ دیا تھا۔

دھیرے دھیرے سندھیا کا آگمن ہوا۔ ان لوگوں نے ابھی تک میری کچھ کھوج خبر نہ لی تھی۔ بھوک سے آتما ویاکل ہو رہی تھی۔ بار بار ودھاتا اور اپنے کو کوستا۔ جب مَنُشیہ بُرا پائے ہو جاتا ہے، تو ودھاتا کو کوستا ہے۔

انت میں ایک چھید سے چار بڑی بڑی روٹیاں کسی نے باہر سے پھینکیں۔ جس طرح کتا ایک روٹی کے ٹکڑے پر دوڑتا ہے، ویسے ہی میں دوڑا اور اٹھا کر اس چھید کی اور دیکھنے لگا؛ لیکن پھر کسی نے کچھ نہ پھینکا، اور نہ کچھ آدیش ہی ملا۔ میں بیٹھ کر روٹیاں کھانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسی چھید پر ایک لوہے کا پیالہ رکھ دیا گیا، جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ میں نے پرماتما کو دھنیہ واد دے کر پانی اٹھا کر پیا۔ جب آتما کچھ ترپت ہوئی، تو کہا- تھوڑا پانی اور چاہیے۔

اس پر دیوار کی اس اور ایک بھیشن ہنسی کی پرتی دُھونی سنائی دی اور کسی نے کھنکھناتے ہوئے سُور میں کہا- پانی اب کل ملے گا۔ پیالہ دے دو، نہیں تو کل بھی پانی نہیں ملے گا۔

کیا کرتا، ہار کر پیالہ وہیں پر رکھ دیا۔

اسی پرکار کئی دن بیت گئے نِت دونوں سے چار روٹیاں اور ایک پیالہ پانی مل جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے میں بھی اس شُشک جیون کا آدی ہو گیا۔ نرجناب اتنی نہ کھلتی۔ کبھی کبھی میں اپنی بھاشا میں اور کبھی کبھی پشتو میں گاتا۔ اس سے طبیعت کچھ بہل

جاتی اور ہردے بھی شانت ہو جاتا۔

ایک دن راتری کے سمے میں ایک پشتو گیت گا رہا تھا۔ مجنوں جھلسانے والے بگولوں سے کہہ رہا تھا- تم میں کیا وہ حرارت نہیں ہے،جو قافلوں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے؟ آخر وہ گرمی مجھے کیوں نہیں جلاتی؟کیا اس لیے کہ میرے اندر خود ایک جوالا بھری ہوئی ہے؟

دیکھو جب لیلیٰ ڈھونڈتی ہوئی یہاں آوے، تو میرا شریر بالو میں ڈھک دینا، نہیں تو شیشے کی طرح لیلیٰ کا دل ٹوٹ جائے گا۔

میں نے گانا بند کر دیا۔ اسی سمے چھید سے کسی نے کہا- قیدی پھر تو گاؤ۔

میں چونک پڑا۔ کچھ خوشی بھی ہوئی، کچھ آشچریہ بھی، پوچھا- تم کون ہو؟ اسی چھید سے اتر ملا- میں ہوں توریا، سردار کی لڑکی۔

میں نے پوچھا- کیا تم کو یہ گانا پسند ہے؟

توریا نے اتر دیا- ہاں، قیدی، گاؤ، میں پھر سننا چاہتی ہوں۔

میں ہرش سے گانے لگا۔ گیت سماپت ہونے پر توریا نے کہا- تم روز یہی گیت مجھے سنایا کرو۔ اس کے بدلے میں میں تم کو روٹیاں اور پانی دوں گی۔

توریا چلی گئی۔ اس کے بعد میں سدا رات کے سمے وہی گیت گاتا، اور توریا سدا دیوار کے پاس آکر سنتی۔

میرے منورنجن کا ایک مارگ نکل آیا۔

دھیرے دھیرے ایک ماس بیت گیا، پر کسی نے ابھی تک میرے چھڑانے کے لیے روپیہ نہ بھیجا۔ جیوں جیوں دن بیتتے جاتے میں اپنے جیون سے نراش ہوتا جاتا۔

ٹھیک ایک مہینے بعد سردار نے آ کر کہا- قیدی، اگر کل تک روپیہ نہ آئے گا، تو تم مار ڈالے جاؤگے۔ اب روٹیاں نہیں کھلا سکتا۔ مجھے جیون کی کچھ آشا نہ رہی۔ اس دن نہ مجھ سے کھایا گیا اور نہ کچھ پیا ہی گیا۔ رات ہوئی، پھر روٹیاں پھینک دی گئیں؛ لیکن کھانے کی اچھا نہیں ہوئی۔

نشچت سمے پر توریا نے آکر کہا- قیدی، گانا گاؤ۔

اس دن مجھے کچھ اچھا نہ لگتا تھا۔ میں چپ رہا۔

توریا نے پھر کہا- قیدی، کیا سو گیا؟
میں نے بڑے ہی مَلِن سور میں کہا- نہیں آج سو کر کیا کروں، کل سوؤں گا کہ پھر جاگنا نہ پڑے گا۔
توریا نے پرشن کیا -کیوں، کیا سرکار روپیہ نہ بھیجے گی؟
میں نے اتر دیا- بھیجے گی تو؛ لیکن کل تو میں مار ڈالا جاؤں گا، میرے مرنے کے بعد روپیہ آیا بھی، تو میرے کس کام کا۔
توریا نے سانتوناپورن سُور میں کہا- اچھا، تم گاؤ، میں کل تمھیں مرنے نہ دوں گی۔
میں نے گانا شروع کیا۔ جاتے سمے توریا نے پوچھا- قیدی، تم کٹھرے میں رہنا پسند کرتے ہو۔
میں نے سَہرش اتر دیا- ہاں کسی طرح اس نرک سے تو چھٹکارا ملے۔
توریا نے کہا- اچھا، کل میں ابّا سے کہوں گی۔
دوسرے ہی دن مجھے اندھے کوپ سے باہر نکالا گیا۔ میرے دونوں پیر دو موٹی شہتیروں کے چھیدوں میں بند کر دیے گئے۔ اور وہ کاٹھ کی ہی کیلوں سے پراکرتِک گڈھوں میں کس دیے گئے۔
سردار نے میرے پاس آ کر کہا۔ قیدی، پندرہ دن کی اودھی اور دی جاتی ہے، اس کے بعد تمھاری گردن تن سے الگ کر دی جائے گی۔ آج دوسرا خط اپنے گھر کو لکھو۔ اگر عید تک روپیہ نہ آیا، تو تمھیں کو حلال کیا جائے گا۔
میں نے دوسرا پتر لکھ کر دے دیا۔
سردار کے جانے کے بعد توریا آئی۔ یہ وہی رمنی تھی، جو ابھی گئی ہے۔ یہی اس سردار کی لڑکی تھی۔ یہی میرا گانا سنتی تھی اور اسی نے سفارش کرکے میری جان بچائی تھی۔
توریا آکر مجھے دیکھنے لگی۔ میں بھی اس کو دیکھنے لگا۔
توریا نے پوچھا- قیدی گھر میں تمھارے کون کون ہے؟
میں نے بڑے ہی کاترسُور میں کہا- دو چھوٹے چھوٹے بالک؛ اور کوئی نہیں۔
مجھے معلوم تھا کہ آفریدی بچّوں کو بہت پیار کرتے ہیں۔

توریا نے پوچھا- ان کی ماں نہیں ہے؟

میں نے کیول دیا اپجانے کے لیے کہا- نہیں، ان کی ماں مر گئی ہے۔ وہ اکیلے ہیں۔ معلوم نہیں، جیتے ہیں یا مر گئے۔ کیوں کہ میرے سوائے ان کی دیکھ ریکھ کرنے والا اور کوئی نہ تھا۔

کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ توریا کی بھی آنکھیں سوکھی نہ رہیں۔ توریا نے اپنا آویگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ یو تمھارے کوئی نہیں ہے بچّے اکیلے ہیں؟ وہ بہت روتے ہوں گے۔

میں نے من ہی من پرسنّ ہوتے ہوئے کہا۔ ہاں، روتے ضرور ہوں گے۔ کون جانتا ہے، شاید مر بھی گئے ہوں؟

توریا نے بات کاٹ کر کہا۔ نہیں، ابھی مرے نہ ہوں گے۔ اچھا تم رہتے کہاں ہو؟ میں جاکر پتہ لگا آؤں گی۔

میں نے اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔ اس نے کہا۔ اس جگہ تو میں کئی بار ہو آئی ہوں۔ بازار سے سودا لینے میں اکثر جاتی ہوں، اب جاؤں گی تو تمھارے بچّوں کی بھی خبر لے آؤں گی۔

میں نے شنکت ہردے سے پوچھا- کب جاؤگی؟

اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ اُس جمعرات کو جاؤں گی۔ اچھا تم وہی گیت گاؤ۔

میں نے آج بڑی امنگ اور اُتساہ سے گانا شروع کیا۔ میں نے آج دیکھا کہ اس کا اثر توریا پر کیسا پڑتا ہے۔ اس کا شریر کانپنے لگا، آنکھیں ڈبڈبا آئیں، گال پیلے پڑگئے اور وہ کانپتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس کی دشا دیکھ کر میں نے دونے اتساہ سے گانا شروع کیا اور انت میں کہا۔ توریا، اگر میں مارا جاؤں، تو میرے بچّوں کو میرے مرنے کی خبر دینا۔

میری بات کا پورا اثر پڑا۔ توریا نے بھرائے ہوئے سور میں کہا۔ قیدی تم مروگے نہیں۔ میں تمھارے بچّوں کے لیے تمھیں چھوڑ دوں گی۔

میں نے نراش ہوکر کہا۔ توریا، تمھارے چھوڑ دینے سے بھی میں بچ نہیں سکتا۔ اس جنگل میں میں بھٹک بھٹک کر مر جاؤں گا، اور پھر تم پر بھی مصیبت آ سکتی

ہے۔ اپنی جان کے لیے تم کو مصیبت میں نہ ڈالوں گا۔

توریا نے کہا۔ میرے لیے تم چنتا نہ کرو۔ میرے اوپر کوئی شک نہ کرے گا۔ میں سردار کی لڑکی ہوں، جو کہوں گی وہی سب مان لیں گے، لیکن کیا تم جاکر روپیے بھیج دوگے۔

میں نے پرسن ہوکر کہا۔ ہاں توریا، میں روپیہ بھیج دوں گا۔

توریا نے جاتے ہوئے کہا۔ تو میں بھی تمھیں چھٹکارا دِلا دوں گی۔

اس گھنٹا کے بعد توریا سدیو میرے بچّوں کے سمبندھ میں باتیں کرتی۔ اسد خاں، سچ مچ ان آفریدیوں کو بچّے بہت پیارے ہوتے ہیں ودھاتا نے یدی انھیں بربر ہنسک پشو بنایا ہے، تو منوشیوچت پراکرتی سے ونچت بھی نہیں رکھا ہے۔ آخر جمعرات آئی اور ابھی تک سردار واپس نہ آیا۔ نہ کوئی اس گروہ کا آدمی ہی واپس آیا۔ اس دن سندھیا سے توریا نے آکر کہا۔ قیدی، اب میں نہیں جا سکتی؛ کیوں کہ میرا پتا ابھی تک نہیں آیا۔ یدی کل بھی نہ آیا، تو میں تمھیں رات کو چھوڑ دوں گی۔ تم اپنے بچّوں کے پاس جانا؛ لیکن دیکھو، روپیہ بھیجنا نہ بھولنا۔ میں تم پر وشواس کرتی ہوں۔

میں نے اس دن بڑے اتساہ سے گانا گایا۔ آدھی رات تک توریا سنتی رہی، پھر سونے چلی گئی۔ میں بھی ایشور سے مناتا رہا کہ کل اور سردار نہ آئے۔ کاٹھ میں بندھے بندھے میرا پیر بالکل نکما ہوگیا تھا۔ تمام شریر دکھ رہا تھا۔ اس سے تو میں کال کوٹھری میں ہی اچھا تھا، کیونکہ وہاں ہاتھ پیر تو ہلا ڈُلا کرتا تھا۔

دوسرے دن بھی گروہ واپس نہ آیا۔ اس دن توریا بہت چنتت تھی۔ شام کو آکر توریا نے میرے پیر کھول کر کہا۔ قیدی، اب تم جاؤ۔ چلو میں تمھیں تھوڑی دور پہنچا دوں۔

تھوڑی دیر تک میں اَوشیہ لیٹا رہا۔ دھیرے دھیرے میرے پیر ٹھیک ہوئے اور ایشور کو دھنیہ واد دیتا ہوا میں توریا کے ساتھ چل دیا۔

توریا کو پرسن کرنے کے لیے میں راستے بھر گیت گاتا آیا۔ توریا بار بار سنتی اور بار بار روتی۔ آدھی رات کے قریب میں تالاب کے پاس پہنچا۔ وہاں پہنچ کر توریا نے کہا۔ سیدھے چلے جاؤ؛ تم پشاور پہنچ جاؤگے۔ دیکھو ہوشیاری سے جانا، نہیں تو کوئی

تمھیں اپنی گولی کا شکار بنا ڈالے گا۔ یہ لو، تمھارے کپڑے ہیں؛ لیکن روپیہ ضرور بھیج دینا۔ تمھاری ضمانت میں لوں گی۔ اگر روپیہ نہ آیا، تو میرے بھی پران جائیں گے، اور تمھارے بھی۔ اگر روپیہ آ جائے گا، تو کوئی بھی آفریدی تم پر ہاتھ نہ اُٹھائے گا، چاہے تم کسی کو مار بھی ڈالو۔ جاؤ، ایشور تمھاری رکشھا کرے اور تم کو اپنے بچّوں سے ملائے۔

توریا پھر ٹھہری نہیں۔ گنگناتی ہوئی لوٹ پڑی۔ رات دو پہر بیت چکی تھی۔ چاروں اور بھیانک نستبدھتا چھائی ہوئی تھی، کیول وایو سائیں سائیں کرتی ہوئی بہہ رہی تھی، آکاش کے بیچوں بیچ چندرما اپنی سولھوں کلا سے چمک رہا تھا۔ تالاب کے تٹ پر رکتا سر کشچھت نہ تھا۔ میں دھیرے دھیرے دکشچھن کی اور بڑھا۔ بار بار چاروں اور دیکھتا جاتا تھا۔ ایشور کی کرپا سے پراتہہ کال ہوتے ہوتے میں پیشاور کی سرحد پر پہنچ گیا۔ سرحد پر سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تمام فوج بھر میں ہل چل مچ گئی۔ سبھی لوگ مجھے مرا سمجھے ہوئے تھے جیتا جاگتا لوٹا ہوا دیکھ کر سبھی پرسنّ ہو گئے۔

کرنل ہیملٹن صاحب بھی سماچار پاکر اسی سے ملنے آئے اور سب حال پوچھ کر کہا- میجر صاحب، میں آپ کو مرا ہوا سمجھتا تھا۔ میرے پاس تمھارے دو پتر آئے تھے، لیکن مجھے سوپن میں بھی وشواس نہ ہوا تھا کہ تمھارے لکھے ہوئے ہیں۔ میں تو انھیں جالی سمجھتا تھا۔ ایشور کو دھنیہ واد ہے کہ تم جیتے بچ کر آ گئے۔

میں نے کرنل صاحب کو دھنیہ واد دیا اور من ہی من کہا- کالے آدمی کا لکھا ہوا جالی تھا اور کہیں گورا آدمی لکھتا، تو دو کی کون کہے، چار ہزار روپیہ پہنچ جاتا۔ کتنے ہی گاؤں جلا دیے جاتے، اور نہ جانے کیا کیا ہوتا۔

میں چپ چاپ اپنے گھر آیا۔ بال بچّوں کو پاکر آتما سنتشٹ ہوئی۔ اسی دن ایک وشواسی انوچر کے دوارا دو ہزار روپیہ توریا کے پاس بھیج دیا۔

(5)

سردار نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا- اسد خاں، ابھی میری کہانی سماپت نہیں ہوئی۔ ابھی تو دکھانت بھاگ اوشیش ہی ہے۔ یہاں آکر میں دھیرے دھیرے اپنی سب مصیبتیں بھول گیا، لیکن توریا کو نہ بھول سکا۔ توریا کی کرپا سے ہی میں اپنی استری اور بچّوں کو مل پایا تھا، یہی نہیں، جیون بھی پایا تھا؛ پھر بھلا میں اسے کیسے بھول جاتا۔

مہینوں اور سالوں بیت گئے۔ میں نے توریا کو اور نہ اس کے باپ کو ہی دیکھا۔ توریا نے آنے کے لیے کہا بھی، لیکن وہ آئی نہیں۔ وہاں سے آکر میں نے اپنی استری کو اس کے مائیکے بھیج دیا تھا؛ کیونکہ خیال تھا کہ شاید توریا آئے، تو پھر میں جھوٹا بنوں گا۔ لیکن جب تین سال بیت گئے اور توریا نہ آئی، تو میں نِشچنت ہو گیا اور استری کو مائیکے سے بلالیا۔ ہم لوگ سکھ پوروک دن کاٹ رہے تھے کہ اچانک پھر دُردشا کی گھڑی آئی۔

ایک دن سندھیا کے سمے اسی برآمدے میں بیٹھا ہوا اپنی استری سے باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا، نوکر نے دروازہ کھول دیا اور بے دھڑک زینہ چڑھتی ہوئی ایک کابلی عورت اوپر چلی آئی۔ اس نے برآمدے میں آکر وِشدھ پشتو بھاشا میں پوچھا- سردار صاحب کہاں ہیں؟

میں نے کمرے کے بھیتر آکر پوچھا- تم کون ہو، کیا چاہتی ہو؟

اسی استری نے کچھ مونگے نکالتے ہوئے کہا- یہ مونگے میں بیچنے کے لیے آئی ہوں، خریدیے گا؟

یہ کہہ کر اس نے بڑے بڑے مونگے نکال کر میز پر رکھ دیے۔

میری استری بھی میرے ساتھ کمرے میں بھیتر آئی تھی۔ وہ مونگے اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اسی کابلی استری نے پوچھا- سردار صاحب، یہ کون ہے آپ کی؟

میں نے اتر دیا- میری استری ہے، اور کون ہے؟

کابلی استری نے کہا- آپ کی استری تو مر چکی تھی، کیا آپ نے دوسرا وِواہ کیا ہے؟

میں نے روش پورن سور میں کہا- چپ بیوقوف کہیں کی، تو مر گئی ہو گی۔

میری استری پشتو نہیں جانتی تھی، وہ تنمیہ ہو کر مونگے دیکھ رہی تھی۔

کنتو میری بات سن کر نہ معلوم کیوں کابلی عورت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے بڑے ہی تیور سوار میں کہا- ہاں، بیوقوف نہ ہوتی، تو تمھیں چھوڑ کیسے دیتی؟ دوزخی پلتے، مجھ سے جھوٹ بولا۔ لے، اگر تیری استری نہ مری تھی، تو اب مر گئی۔

کہتے کہتے شیرنی کی طرح لپک کر اس نے ایک تیز چھرا میری استری کی چھاتی میں گھسیڑ دیا۔ میں اسے روکنے کے لیے آگے بڑھا؛ لیکن وہ کود کر آنگن میں چلی گئی

اور بولی- اب پہچان لے، میں توریا ہوں۔ میں آج تیرے گھر میں رہنے کے لیے آئی تھی۔ میں تجھ سے وِواہ کرتی اور تیری ہو کر رہتی۔ تیرے لیے میں نے باپ، گھر، سب کچھ چھوڑ دیا تھا، لیکن تو جھوٹا ہے، مکّار ہے۔ تو اب اپنی بیوی کے نام کورو، میں آج سے تیرے نام کوروؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے نیچے چلی گئی۔

اب میں اپنی استری کے پاس پہنچا۔ چھرا ٹھیک ہردے میں لگا تھا۔ ایک ہی وار نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ ڈاکٹر بلوایا؛ لیکن وہ مر چکی تھی۔

کہتے کہتے سردار صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھوں نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھ کر کہا- اسد خاں، مجھے سوپن میں بھی اَنومان نہ تھا کہ توریا اتنی پشاچ ہردے ہو سکے گی۔ اگر میں پہلے اسے پہچان لیتا تو یہ آفت نہ آنے پاتی؛ لیکن کمرے میں اندھکار تھا؛ اور اس کے اترکت میں اس کی اور سے نراش ہو چکا تھا۔

تب سے پھر کبھی توریا نہیں آئی۔ اب جب کبھی مجھے دیکھتی ہے، تو میری اور دیکھ کر ناگن کی بھانتی پھپھکارتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

اسے دیکھ کر میرا ہردے کانپنے لگتا ہے اور میں اَوَش ہو جاتا ہوں۔ کئی بار کوشش کی، میں اسے پکڑوادوں، لیکن اسے دیکھ کر میں بالکل نکما ہو جاتا ہوں، ہاتھ پیر بے قابو ہو جاتے ہیں، میری ساری ویرتا ہوا ہو جاتی ہے۔

یہی نہیں، توریا کا موہ اب بھی میرے اوپر ہے۔ میرے بچّوں کو ہمیشہ وہ کوئی نہ کوئی بہُمولیہ چیز دے جاتی ہے۔ جس دن بچّے اسے نہیں ملتے دروازے کے بھیتر پھینک جاتی ہے۔ ان میں ایک کاغذ کا ٹکڑا بندھا ہوتا ہے جس میں لکھا رہتا ہے- سردار صاحب کے بچّوں کے لیے۔

میں ابھی تک اس استری کو نہیں سمجھ پایا۔ جتنا ہی سمجھنے کا یتن کرتا ہوں، اتنی ہی یاد کٹھن ہوتی جاتی ہے۔ نہیں سمجھ میں آتا کہ یہ مانوی ہے یا راکشسی۔

اسی سمے سردار صاحب کے لڑکے نے آ کر کہا- دیکھیے، وہی عورت یہ سونے کی تعویذ دے گئی ہے۔

سردار نے میری اور دیکھ کر کہا- دیکھا، اسد خاں، میں تم سے کہتا نہ تھا۔ دیکھو، آج بھی یہ تعویذ دے گئی۔ نہ معلوم کتنے ہی تعویذ اور کتنی ہی دوسری چیزیں اَرجن

اور نہال کو دے گئی ہو گی۔ کہتا ہوں کہ توریا بڑی ہی وچتر استری ہے۔

(6)

سردار صاحب سے وداع ہو کر میں گھر چلا۔ چوراستے سے بڈھے کی لاش ہٹا دی گئی تھی؛ پر وہاں پہنچ کر میرے روئیں کھڑے ہو گئے۔ میں آپ ہی آپ ایک منٹ وہاں کھڑا ہو گیا۔ سہسا پیچھے دیکھا۔ چھایا کی بھانتی ایک استری میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ مجھے کھڑا دیکھ کر وہ استری رک گئی اور ایک دوکان میں کچھ خریدنے لگی۔

میں نے اپنے ہردے سے پرشن کیا- کیا وہ توریا ہے۔

ہردے نے اتر دیا- ہاں، شاید وہی ہے۔

توریا میرا پیچھا کیوں کر رہی ہے؟ یہ سوچتا ہوا میں گھر پہنچا اور کھانا کھا کر لیٹا؛ پر آج کی گھٹناؤں کا مجھ پر ایسا اثر پڑا تھا کہ کسی طرح بھی نیند نہ آتی تھی۔ جتنا ہی میں سونے کا یتن کرتا اتنا ہی نیند مجھ سے دور بھاگتی۔

فوجی گھڑیال نے بارہ بجائے، ایک بجائے، دو بجائے؛ لیکن مجھے نیند نہ تھی۔ میں کروٹیں بدلتا ہوا سونے کا اُپکرم کر رہا تھا۔ اسی ادھیڑبن میں کب نیند نے مجھے دھر دبایا، مجھے ذرا بھی یاد نہیں۔

یدیپی میں سو رہا تھا؛ لیکن میرا گیان جاگ رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی استری، جس کی آکرتِ توریا سے بہت کچھ ملتی تھی لیکن اس سے کہیں ادھیک بھیاونی تھی، دیوار پھوڑ کر بھیتر گھس آئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھرا ہے، جو لالٹین کے پرکاش میں چمک رہا ہے۔ وہ دبے پاؤں سترک نیتروں سے تاکتی ہوئی دھیرے دھیرے میری اور بڑھ رہی ہے۔ میں اسے دیکھ کر اٹھنا چاہتا ہوں، لیکن ہاتھ پیر میرے قابو میں نہیں ہیں۔ مانو ان میں جان ہے ہی نہیں۔ وہ استری میرے پاس پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر تک میری اور دیکھا، اور پھر اپنے چھرے والے ہاتھ کو اوپر اٹھایا۔ میں چلانے کا اپکرم کرنے لگا؛ لیکن میری گھگھی بندھ گئی۔ شبد کنٹھ سے پھوٹا ہی نہیں۔ اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے گھٹنے کے نیچے دبایا اور میری چھاتی پر سوار ہو گئی۔ میں چھٹپٹانے لگا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ سچ مچ ایک کالی عورت میری چھاتی پر سوار تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ اور وہ چھرا مارنا ہی چاہتی تھی۔

میں نے کہا- کون توریا؟

یہ واستو میں توریا ہی تھی۔ اس نے مجھے بل پوروک دباتے ہوئے کہا- ہاں میں توریا ہی ہوں۔ آج تو نے میرے باپ کا خون کیا ہے، اس کے بدلے میں تیری جان جائے گی۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا چھرا اوپر اٹھایا۔ اس سے میرے جیون اور مرن کا پرشن تھا۔ جیون کی لالسا نے مجھ میں ساہس کا سنچار کیا میں مرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میرے ارمان اور امنگیں اب بھی باقی تھیں۔ میں نے بل پوروک اپنا داہنا ہاتھ چھڑانے کا پریتن کیا اور ایک ہی جھٹکے میں میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے توریا کا چھرا والا ہاتھ پکڑ لیا۔ نہ معلوم کیوں توریا نے کچھ بھی وروده نہ کیا۔ وہ میرے ہاتھ کو دیکھتی ہوئی میری چھاتی سے اُتر آئی۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور وہ ایک ٹک میرے ہاتھ کی اور دیکھ رہی تھی۔

میں نے ہنس کر کہا- توریا، اب تو پانسہ پلٹ گیا۔ اب تیرے مرنے کی باری ہے۔ تیرے باپ کو مارا اور اب تجھے بھی مارتا ہوں۔

توریا اب بھی ایک ٹک میرے ہاتھ کی اور دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی اتر نہ دیا۔

میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا- بولتی کیوں نہیں؟ اب تو تیری جان میری مٹھی میں ہے۔

توریا کا موہ ٹوٹا۔ اس نے بڑے گمبھیر اور دِڑھ کنٹھ سے کہا- تو میرا بھائی ہے۔ تو نے اپنے باپ کو مارا ہے آج۔

توریا کی بات سن کر مجھے اس اوسر پر بھی ہنسی آ گئی۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا- آفریدی مکار بھی ہوتے ہیں، یہ آج ہی مجھے معلوم ہوا۔

توریا نے شانت سُوار میں کہا- تو میرا کھویا ہوا بڑا بھائی ناظر ہے۔ وہ جو تیرے ہاتھ میں نشان ہے، وہی بتلا رہا ہے کہ تو میرا کھویا ہوا بھائی ہے۔

بچپن سے ہی میرے ہاتھ میں ایک سانپ گُدا ہوا تھا۔ اور یہی میری پہچان

فوجی رجسٹر میں بھی لکھی ہوئی تھی۔

میں نے ہنس کر کہا- توریا، تو مجھے بھلاوا نہیں دے سکتی۔ میں اب تجھے کسی طرح نہ چھوڑوں گا۔

توریا نے اپنے ہاتھ سے چھرا پھینک کر کہا- سچ مچ تو میرا بھائی ہے۔ اگر تجھے وشواس نہیں ہوتا، تو دیکھ، میرے داہنے ہاتھ میں بھی ایسا ہی سانپ گدا ہوا ہے۔

میں نے توریا کے ہاتھ پر درشٹی ڈالی، تو وہاں بھی بالکل میرا ہی جیسا سانپ گدا ہوا ہے۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا- توریا میں تیرا وشواس نہیں کر سکتا، یہ اتّفاق کی بات ہے۔

توریا نے کہا- میرا ہاتھ چھوڑ دے۔ میں تجھ پر وار نہ کروں گی۔ آفریدی جھوٹ نہیں بولتے۔

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا، وہ پرتھوی پر بیٹھ گئی اور میری اور دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا- اچھا، تجھے اپنے ماں باپ کا پتہ ہے؟

میں نے سر ہلا کر اتر دیا- نہیں، میں سرکاری اناتھالیہ میں پالا گیا ہوں۔

میری بات سن کر توریا اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی- تب تو میرا کھویا ہوا بھائی ناظر ہی ہے۔ میرے پیدا ہونے کے ایک سال پہلے تو کھویا تھا- میرے ماں باپ تب سرکاری فوج پر چھاپا ڈالنے کے لیے آئے تھے اور تو بھی ساتھ تھا- میری ماں لڑنے میں بڑی ہوشیار تھی۔ تو ان کی پیٹھ سے بندھا ہوا تھا اور وے لڑ رہی تھیں ۔ اسی سمے ایک گولی ان کے پیر میں لگی اور وے گر کر بیہوش ہو گئیں۔ بس، تجھے کوئی کھول لے گیا۔ میری ماں کو میرا باپ اپنے کندھے پر اٹھا لایا؛ لیکن تجھے کھوج نہ سکا۔ بہت تلاش کی؛ لیکن کہیں بھی تیرا پتہ نہ لگا۔ اماں اکثر تیری چرچا کیا کرتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بھی نشان تھا۔

یہ کہہ کر اس نے پھر وہی ہاتھ مجھے دکھلایا۔ میں اس کا اور اپنا سانپ ملانے لگا۔ واستو میں دونوں سانپ ہوبہو ایک سے تھے، بال بھر بھی انتر نہ تھا۔ میں ہتاش سا ہوکر چارپائی پر گر پڑا۔

توریا میرے پاس بیٹھ کر اسنیہہ سے میرے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگی۔ اس نے کہا- ناظر، ماں کہتی تھی کہ تو مرا نہیں زندہ ہے۔ ایک دن ضرور تو ہم لوگوں سے ملے گا۔

توریا کی بات پر اب مجھے وشواس ہو چلا تھا۔ جانے کون میرے ہردے میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ توریا جو کہتی ہے؛ ٹھیک ہے۔ میں نے ایک لمبی سانس لے کر کہا- کیوں توریا، میں نے جسے آج مارا ہے وہ ہم لوگوں کا باپ تھا؟

توریا کے منہ پر شوک کا ایک چھوٹا سا بادل گھر آیا۔ اس نے بڑے ہی دکھ پورن سور میں کہا- ہاں، ناظر، وہ ابھاگا ہمارا باپ ہی تھا۔ کون جانتا تھا کہ وہ اپنے پیارے لڑکے کے ہاتھوں حلال ہوگا۔

پھر سانتوناپورن سور میں بولی- لیکن ناظر، تونے تو انجانے میں یہ کام کیا ہے۔ باپ کے مرنے سے میں بالکل اکیلی ہو گئی تھی؛ لیکن اب تجھے پا کر باپ کے رنج کو بھول جاؤں گی۔ ناظر، تو رنج نہ کر۔ تجھے کیا معلوم تھا کہ کون تیرا باپ ہے اور کون تیری ماں ہے۔ دیکھ، میں ہی تجھے مارنے آئی تھی، تجھے مار ڈالتی؛ لیکن خدا کی مہربانی سے میں نے اپنا خاندانی نشان دیکھ لیا۔ خدا کی ایسی ہی مرضی تھی۔

توریا سے معلوم ہوا کہ میرے باپ کا نام حیدر خاں تھا، جو آفریدیوں کے ایک گروہ کا سردار تھا۔ میں نے سردار ہمّت سنگھ کے سمبندھ میں بھی توریا سے باتیں کیں تو معلوم ہوا کہ توریا سردار صاحب کو پیار کرنے لگی تھی۔ وہ ہمارے باپ سے لڑ بھڑ کر سردار صاحب سے نکاح کرنے آئی تھی؛ لیکن وہاں ان کی استری کو پاکر وہ ایرشیا اور کرودھ سے پاگل ہو گئی، اور اس نے ان کی استری کی ہتیا کر ڈالی۔ کابلی عورت کے بھیش میں جاکر وہ کچھ مذاق کرنا چاہتی تھی؛ لیکن گھٹنا چکر اسے دوسری اور لے گیا۔

میں نے سردار صاحب کی دَشا کا ورڑن کیا۔ سن کر وہ کچھ سوچتی رہی اور پھر کہا- نہیں وہ آدمی جھوٹا اور دغاباز ہے۔ میں اس سے نکاح نہیں کروں گی۔ لیکن تیری خاطر اب سب بھول جاؤں گی۔ کل ان کے بچّوں کو لے آنا، میں پیار کروں گی۔

پراتہہ کال توریا کو دیکھ کر میرا نوکر آشچریہ کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا- یہ میری بہن ہے۔

نوکر کو میری بات پر وشواس نہ ہوا۔ تب میں نے وستارپوروَک سب حال کہا اور اسی سے اپنے باپ کی لاش کی خبر لینے کے لیے بھیجا۔ نوکر نے آ کر کہا۔ لاش ابھی تک تھانے پر رکھی ہوئی ہے۔

میں نے بڑے صاحب کے نام ایک پتر لکھ کر سب حال بتا دیا اور لاش پانے کے لیے درخواست کی۔ اسی سے صاحب کے یہاں سے سُویکرتی آ گئی۔

ایک پتر لکھ کر میجر صاحب کو بھی بلوایا۔

میجر صاحب نے آ کر کہا۔ کیا بات ہے اسد، اتنی جلدی آنے کے لیے کیوں لکھا؟

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میجر صاحب، میرا نام اب اسد نہیں رہا، میرا اصلی نام ہے ناظر۔

میجر صاحب نے ساشچریہ میری اور دیکھتے ہوئے کہا۔ رات بھر میں تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ نہیں سردار صاحب، ابھی اور سنیے۔ توریا میری سگی بہن ہے، اور جسے کل میں نے مارا وہ میرا باپ تھا۔

سردار صاحب میری بات سن کر مانو آکاش سے گر پڑے۔ ان کی آنکھیں کپال پر چڑھ گئیں۔ انھوں نے کہا۔ کیوں اسد، تم مجھے پاگل کر ڈالو گے؟

میں نے سردار صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ آیئے، توریا کے منہ سے ہی سب حال سن لیجیے۔ توریا میرے یہاں بیٹھی ہوئی آپ کی پرتیکشا کر رہی ہے۔

سردار صاحب سکتے کی حالت میں میرے پیچھے پیچھے چلے۔ توریا انھیں آتے ہوئے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہنستے ہوئے بولی۔ قیدی، تم وہی گیت پھر گاؤ۔ توریا کی بات سن کر میں اور سردار صاحب بھی ہنسنے لگے۔

سردار صاحب کو بٹھا کر میں نے وستارپوروَک سب حال کہا۔ کہانی سن کر سردار صاحب نے مجھ سے کہا۔ ناظر، اب تمھیں ناظر ہی کہوں گا۔ توریا کو میں تم سے مانگتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ وِواہ کروں گا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ لیکن آپ ہندو ہیں، اور ہم لوگ مسلمان۔

سردار صاحب نے ہنس کر کہا- پلٹنوں کی کوئی ذات پات نہیں ہے۔
توریا نے اسی سے کہا- لیکن سردار صاحب، میں تم سے وواہ نہیں کروں گی۔
ہاں، اگر تم اپنے دونوں بچّوں کو میرے پاس بھیج دوتو میں ان کی ماں بن سکتی ہوں۔
سردار صاحب ہنستے ہوئے وداع ہوئے۔
اسی دن شام کو ہم نے سردار صاحب، توریا اور دوسرے پلٹنوں کے ساتھ جاکر اپنے باپ کی لاش دفنائی۔
سورج ڈوب رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اندھیرا ہو رہا تھا؛ اور ہم دونوں، توریا اور میں اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

(یہ افسانہ 'وشال بھارت' کے مارچ 1929 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ ہندی میں 'مان سروور' 7 میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار پیش کیا جارہا ہے۔)

پرَوَت یاتُرا

پراتہ کال محمد گل باز خاں نے نماز پڑھی، کپڑے پہنے اور مہری سے کرائے کی گاڑی لانے کو کہا۔ شیریں بیگم نے پوچھا۔ آج سویرے سویرے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟

گل : ذرا چھوٹے صاحب کو سلام کرنے جانا ہے۔

شیریں : تو پیدل کیوں نہیں چلے جاتے؟ کون بڑی دور ہے۔

گل : جو بات تمھاری سمجھ میں نہ آئے اس میں زبان نہ کھولا کرو۔

شیریں : پوچھتی تو ہوں پیدل چلے جانے میں کیا ہرج ہے؟ گاڑی والا ایک روپیہ سے کم نہ لے گا۔

گل : (ہنس کر) حکام کرایہ نہیں دیتے۔ اس کی ہمت ہے کہ مجھ سے کرایہ مانگے۔ چالان کروادوں گا۔

شیریں : تم تو حاکم بھی نہیں ہو، تمھیں وہ کیوں لے جانے لگا۔

گل : حاکم کیسے نہیں ہوں؟ حاکم کے کیا سینگ پونچھ ہوتی ہے۔ جو میرے نہیں ہے؟ حاکم کا دوست حاکم سے کم روب نہیں رکھتا۔ احمق نہیں ہوں کہ سو کام چھوڑ کر حکام کی سلامی بجایا کرتا ہوں۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ پولس، مال، دیوانی کے اہلکار مجھے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ تھانے دار نے کل جو سوغات بھیجی تھی، وہ کس لیے؟ میں ان کا داماد تو نہیں ہوں۔ سب مجھ سے ڈرتے ہیں۔ اتنے میں مہری ایک تانگا لائی۔ خاں صاحب نے فوراً سافہ باندھا اور چلے۔ شیریں نے کہا۔ ارے تو، پان تو کھاتے جاؤ۔

گل : ہاں لاؤ ہاتھ میں مہندی بھی لگادو۔ اری نیک بخت، حکام کے سامنے پان کھا کر جانا بے ادبی ہے۔

شیریں : آؤ گے کب تک؟ کھانا تو یہیں کھاؤ گے۔

گل : تم میرے کھانے کی فکر نہ کرنا، شاید کنور صاحب کے یہاں چلا جاؤں۔ کوئی مجھے پوچھے تو کہہ دینا، بڑے صاحب سے ملنے گئے ہیں۔

خاں صاحب آکر تانگے پر بیٹھے۔ تانگے والے نے پوچھا۔ حضور کہاں چلوں؟

گل : چھوٹے صاحب کے بنگلے پر۔ سرکاری کام سے جانا ہے۔

تانگے والا : حضور کو وہاں کتنی دیر لگے گی؟

گل : یہ میں کیسے بتادوں، یہ تو ہو نہیں سکتا کہ صاحب مجھ سے بار بار بیٹھنے کو کہیں، اور میں اٹھ کر چلا آؤں۔ سرکاری کام ہے، نہ جانے کتنی دیر لگے۔ بڑے اچھے آدمی ہیں بے چارے۔ مجال نہیں کہ جو بات کہہ دوں، اس سے انکار کردے۔ آدمی کو غرور کرنا چاہیے۔ غرور نہ کرنا شیطان کا کام ہے۔ مگر کئی تھانے داروں سے جواب طلب کرا چکا ہوں جس کو دیکھا کہ رعایا کو ایذا پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہوں۔

تانگے والا : حضور، پولس بڑا اندھیر کرتی ہے۔ جب دیکھو بے گار، کبھی آدھی رات کو بلا بھیجا، کبھی فجر کو۔ مرے جاتے ہیں حضور۔ اس پر ہر موڑ پر سپاہیوں کو پیسے چاہیے۔ نہ دیں، تو جھوٹا چالان کردیں۔

گل : سب جانتا ہوں جی، اپنی جھوپڑی میں بیٹھا ساری دنیا کی سیر کیا کرتا ہوں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے بدمعاشوں کی خبر لیا کرتا ہوں۔ دیکھو تانگے کو بنگلے کے بھیتر نہ لے جانا۔ باہر پھاٹک پر روک دینا۔

تانگے والا : اچھا حضور۔ اچھا اب دیکھیے وہ سپاہی موڑ پر کھڑا ہے۔ پیسے کے لیے ہاتھ پھیلائے گا۔ نہ دوں تو للکارے گا۔ مگر آج قسم قرآن کی، ٹکا سا جواب دے دوں گا۔ حضور بیٹھے ہیں، تو کیا کر سکتا ہے۔

گل : نہیں نہیں ذرا۔ ذرا سی بات پر میں ان چھوٹے آدمیوں سے نہیں لڑتا۔ پیسے دے دینا۔ میں تو پیچھے سے بچہ کی خبر لوں گا۔ معطل نہ کرادوں تو سہی۔ دوبدو گالی گلوج کرنا۔ ان چھوٹے آدمیوں کے منہ لگنا میری عادت نہیں۔

تانگے والے کو بھی یہ بات پسند آئی۔ موڑ پر اس نے سپاہی کو پیسے دے دیے۔ تانگا صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ خاں صاحب اترے، اور جس طرح کوئی شکاری پیر دبا دبا کر چوکنی آنکھوں سے دیکھتا ہوا چلتا ہے، اُسی طرح آپ بنگلے کے برآمدے میں جاکر کھڑے ہوگئے۔ بیرا برآمدے میں بیٹھا تھا۔ آپ نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔

بیرا : حضور تو اندھیر کرتے ہیں۔ سلام ہم کو کرنا چاہیے اور آپ پہلے ہی ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔

گل : اجی ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ خدا کے نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔

بیرا : حضور کو اللہ سلامت رکھے، کیا بات کہی ہے۔ حق تو یہی ہے، پر آدمی اپنے کو کتنا بھول جاتا ہے۔ یہاں تو چھوٹے چھوٹے عملے بھی انتظار کرتے ہیں کہ یہ ہاتھ اٹھادیں۔ صاحب کو اطلاع دوں؟

گل : آرام میں ہوں تو رہنے دو، ابھی ایسی کوئی جلدی نہیں

بیرا : جی نہیں حضور، حاضری پر سے تو کبھی اٹھ چکے۔ کاغذ واغذ پڑھتے ہوں گے۔

گل : اب اس کا تمھیں اختیار ہے۔ جیسا موقعہ ہو ویسا کرو۔ موقعہ محل پہچاننا تمھیں لوگوں کا کام ہے، کیا ہوا تمھاری لڑکی خیریت سے ہے نہ؟

بیرا : ہاں حضور، اب بہت مزے میں ہے جب سے حضور نے اس کے گھروالوں کو بلا کر ڈانٹ دیا ہے، تب سے کسی نے چوں بھی نہیں کیا۔ لڑکی حضور کی جان مال کو دعا دیتی ہے۔

بیرے نے صاحب کو خاں صاحب کی اطلاع کی اور ایک چھن میں خاں صاحب جوتے اتار کر صاحب کے سامنے جاکھڑے ہوئے اور سلام کرکے فرش پر بیٹھ گئے۔ صاحب کا نام کاٹن تھا۔

کاٹن : اُو۔ اُو۔ یہ آپ کیا کرتا ہے، کرسی پر بیٹھیے کرسی پر بیٹھیے۔

خاں : بہت مزے میں بیٹھا ہوں حضور۔ آپ کے برابر بھلا بیٹھ سکتا ہوں۔ آپ بادشاہ میں رعیت۔

کاٹن : نہیں، نہیں، آپ ہمارا دوست ہے۔

خاں : حضور چاہے میرے کو آفتاب بنادیں، پر میں تو اپنی حقیقت سمجھتا ہوں۔ بندہ ان لوگوں میں نہیں ہے جو حضور کے کرم سے چار حرف پڑھ کر زمین پر پاؤں نہیں رکھتے اور حضور لوگوں کی برابری کرنے لگتے ہیں۔

کاٹن : خاں صاحب آپ بہت اچھا آدمی ہے۔ ہم آج سے پانچویں دن نینی تال جارہا ہے۔ وہاں سے لوٹ کر آپ سے ملاقات کرے گا۔ آپ تو کئی بار نینی تال

گیا ہوگا۔ اب تو سب رئیس لوگ وہاں جاتا ہے۔

خاں صاحب نینی تال کیا بریلی تک بھی نہ گئے تھے، پر اس سے کیسے کہہ دیتے کہ میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ صاحب کی نظروں سے گر نہ جاتے۔ صاحب سمجھتے کہ یہ رئیس نہیں کوئی چرکٹا ہے۔ بولے۔ ہاں حضور کئی بار ہو آیا ہوں۔

کاٹن : آپ کئی بار ہو آیا ہے؟ ہم تو پہلی دفعہ جاتا ہے۔ سنا بہت اچھا شہر ہے؟

خاں : بہت بڑا شہر ہے حضور، مگر کچھ ایسا بڑا بھی نہیں ہے۔

کاٹن : آپ کہاں ٹھہرتا ہے۔ وہاں ہوٹلوں میں تو بہت پیسا لگتا ہے۔

خاں : میری حضور نہ پوچھیں، کبھی، کہیں ٹھہر گیا، کبھی کہیں ٹھہر گیا۔ حضور کے اقبال سے سبھی جگہ دوست ہیں۔

کاٹن : آپ وہاں کسی کے نام چھٹی دے سکتا ہے کہ میرے ٹھہرنے کا بندوبست کردے۔ ہم کفایت سے کام کرنا چاہتا ہے آپ تو ہر سال جاتا ہے، ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتا۔

خاں : صاحب بڑی مشکل میں پھنسے۔ اب بچاؤ کا کوئی اپائے نہ تھا۔ کہنا پڑا۔ جیسا حضور کا حکم، حضور کے ساتھ ہی چلا چلوں گا۔ مگر مجھے ابھی ذرا دیر ہے حضور۔

کاٹن : اُو۔ کچھ پرواہ نہیں ہم آپ کے لیے ایک ہفتہ ٹھہر سکتا ہے۔ اچھا سلام آج ہی آپ اپنے دوست کو جگہ کا انتظام کرنے کو لکھ دوں۔ آج کے ساتویں دن ہم اور آپ ساتھ چلے گا۔ ہم آپ کو ریلوے اسٹیشن پر ملے گا۔

خاں صاحب نے سلام کیا، اور باہر نکلے۔ تانگے والے سے کہا کنور شمشیر سنگھ کی کوٹھی پر چلو۔

(2)

کنور شمشیر سنگھ خاندانی رئیس تھے۔ انھیں ابھی تک انگریزی رہن سہن کی ہوا نہ لگی تھی۔ دس بجے دن تک سونا، پھر دوستوں اور مصاحبوں کے ساتھ گپ شپ کرنا، دو بجے کھانا کھا کر پھر سونا، شام کو چوک کی ہوا کھانا اور گھر آکر بارہ ایک بجے رات تک کسی پری کا مجرا دیکھنا، یہیں ان کی دن چریا تھی۔ دنیا میں کیا ہوتا ہے، اس

کی انھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی یا ہوئی بھی تو سنی سنائی۔ خاں صاحب ان کے دوستوں میں تھے۔ جس وقت خاں صاحب کوٹھی میں پہنچے دس بج گئے تھے۔ کنور صاحب باہر نکل آئے تھے۔ متر گن جمع تھے۔ خاں صاحب کو دیکھتے ہی کنور صاحب نے پوچھا کہیے خاں صاحب کدھر سے؟

خاں صاحب ذرا صاحب سے ملنے گیا تھا کئی دن بلا بلا بھیجا، مگر فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ آج ان کا آدمی زبردستی کھینچ لے گیا۔کیا کرتا جانا ہی پڑا کہاں تک بے رخی کروں۔

کنور : یار تم نہ جانے افسروں پر کیا جادو کردیتے ہو کہ جو آتا ہے تمھارا دم بھرنے لگتا ہے۔ مجھے وہ منتر کیوں نہیں سکھا دیتے۔

خاں : مجھے خود ہی نہیں معلوم کہ کیوں حکام مجھ پر اتنے مہربان رہتے ہیں۔ آپ کو یقین نہ آوے گا، میری آواز سنتے ہی کمرے کے دروازے پر آکر کھڑے ہوگئے اور لے جاکر اپنی خاص کرسی پر بیٹھا دیا۔

کنور : اپنی خاص کرسی پر؟

خاں : ہاں صاحب، حیرت میں آگیا۔ مگر بیٹھنا ہی پڑا۔ پھر سگار منگوایا، الائچی، میوے، چائے سبھی کچھ آگئے۔ یوں کہیے کہ خاصی دعوت ہوگئی۔ یہ مہمان داری دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔

کنور : تو وہ سب دوستی بھی کرنا جانتے ہیں۔

خاں : آ.جی دوسرا کیا خاں کے دوستی کرے گا۔ اب حد ہوگئی کہ مجھے اپنے ساتھ نینی تال چلنے کو مجبور کیا۔

کنور : سچ۔

خاں : قسم قرآن کی۔ حیران تھا کہ کیا جواب دوں۔ مگر جب دیکھا کہ کسی طرح نہیں مانتے، تو وعدہ کرنا ہی پڑا آج ہی کے دن کوچ ہے۔

کنور : کیوں یار۔ میں بھی چلا چلوں تو کیا حرج ہے؟

خاں : سبحان اللہ اس سے بڑھ کر کیا بات ہوگی

کنور : بھائی لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اس سے جاتے ڈر لگتا ہے۔ آپ

تو ہو آئے ہوں گے؟

خاں : کئی بار ہو آیا ہوں۔ ہاں۔ ادھر کئی سال سے نہیں گیا۔

کنور : کیوں صاحب، پہاڑوں پر چڑھتے چڑھتے دم پھول جاتا ہوگا؟

رادھا کانت بیاس بولے : دھرم اُوتار۔ چڑھنے کو تو کسی طرح چڑھ بھی جایئے، پر پہاڑوں کا پانی ایسا خراب ہوتا ہے کہ ایک بار لگ گیا تو پران ہی لے کر چھوڑتا ہے۔ بدری ناتھ کی یاترا کرنے جتنے یاتری جاتیں ہیں۔ ان میں بہت کم جیتے لوٹے ہیں۔ اور سنگرہنی تو پرایہ سبھی کو ہوجاتی ہے۔

کنور : ہاں سنا تو ہم نے بھی ہے کہ پہاڑوں کا پانی بہت لگتا ہے۔ لالہ سکھ دیال نے ہامی بھری۔ گوسائی جی نے بھی تو پہاڑ کے پانی کی نندا کی ہے۔

"لاگت اتی پہاڑ کر پانی

بڑھ دکھ ہوت نہ جائی بکھانی"

خاں : تو یہ اتنے انگریز وہاں کیوں جاتے ہیں صاحب؟ یہ لوگ اپنے وقت کے لقمان ہیں۔ ان کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ پہاڑوں کی سیر سے کوئی فائدہ نہ ہوتا تو کیوں جاتے۔ ذرا یہ تو سوچئے۔

بیاس : یہی سوچ سوچ کر تو ہمارے رئیس اپنا سروناش کررہے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی دھن کا ناش، دھرم کا ناش، بل کا ناش، ہوتا چلا جاتاہے، پھر بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلتی

لالہ : میرے پتاجی ایک بار کسی انگریز کے ساتھ پہاڑ پر گئے۔ وہاں سے لوٹے تو مجھے وصیت کی کہ خبر دار کبھی پہاڑ پر نہ جانا آخر کوئی بات دیکھی ہوگی، تبھی تو یہ وصیت کی۔

واجد : حضور۔ خاں صاحب جاتے ہیں، جانے دیجیے، آپ کو میں جانے کی صلاح نہ دوں گا۔ ذرا سوچیے، کوسوں کی چڑھائی پھر راستہ اتنا خطرناک کہ خدا کی پناہ۔ ذراسی پگ ڈنڈی اور دونوں طرف کوسوں کا کھڈ نیچے دیکھا اور تھر تھرا کر آدمی گر پڑا اور جو کہیں پتھروں میں آگ لگ گئی تو چلیے وارا نیارا ہوگیا۔ جن بھن کے کباب ہوگئے۔

خاں : اور جو لاکھوں آدمی پہاڑوں پر رہتے ہیں؟

واجد : اُن کی اور بات ہے بھائی صاحب۔

خاں : اور بات کیسی؟ کیا وہ آدمی نہیں ہیں؟

واجد : لاکھوں آدمی دن بھر ہل جوتتے ہیں، پھاوڑے چلاتے ہیں، لکڑی پھاڑتے ہیں، آپ کریں گے؟ ہے آپ میں اتنا دم ؟ حضور اس چڑھائی پر چڑھ سکتے ہیں؟

خاں : کیوں نہیں ٹٹوؤں پر جائیں گے۔

واجد : ٹٹوؤں پر چھ کوس کی چڑھائی۔ ہوش کی دوا کیجیے۔

کنور : ٹٹو پر۔ بھائی ہم سے نہ جایا جائے گا۔ کہیں ٹٹو بھڑکے تو کہیں کے نہ رہے۔

لالہ : گرے تو ہڈیاں تک نہ ملیں۔

بیاس : پران تک چور چور ہو جائے۔

واجد : خدا وند۔ ایک ذرا سی اونچائی پر سے آدمی دیکھتا ہے تو کانپنے لگتا ہے، نہ کہ پہاڑ کی چڑھائی۔

کنور : وہاں سڑکوں پر ادھر اُدھر اینٹ یا پتھر کی منڈیر نہیں بنی ہوئی ہے؟

واجد : خداوند، منزلوں کے راستے میں منڈیر کیسی

کنور : آدمی کا کام تو نہیں ہے۔

لالا : سُنا وہاں گھیگھا نکل آتا ہے۔

کنور : ارے بھئی۔ یہ بُرا روگ ہے۔ تب میں وہاں جانے کا نام بھی نہ لوں گا۔

خاں : آپ لالہ صاحب سے پوچھیں کہ صاحب لوگ جو وہاں رہتے ہیں، ان کو گھیگھا کیوں نہیں ہو جاتا۔

لالہ : وہ لوگ برانڈی پیتے ہیں۔ ہم اور آپ ان کی برابری کر سکتے ہیں بھلا۔ پھر ان کا اقبال۔

واجد : مجھے تو یقین نہیں آتا کہ خاں صاحب کبھی نینی تال گئے ہوں۔ اس وقت ڈینگ مار رہے ہیں۔ کیوں صاحب۔ آپ کتنے دن وہاں رہے؟

خاں : کوئی چار برس تک رہا تھا۔

واجد : آپ وہاں کس محلے میں رہتے تھے؟

خاں : (بڑ بڑا کر) جی۔ میں۔
واجد : آخر۔ آپ چار برس تک کہاں رہے؟
خاں : دیکھیے یاد آجائے تو کہوں۔
واجد : جایئے بھی۔ نینی تال کی صورت تک تو دیکھی نہیں، گپ ہانک دی کہ وہاں چار برس تک رہے۔
خاں : اچھا صاحب۔ آپ ہی کا کہنا صحیح۔ میں کبھی نینی تال نہیں گیا۔ بس اب تو خوش ہوئے۔
کنور : آخر آپ کیوں نہیں بتاتے کہ نینی تال میں آپ کہاں ٹھہرے تھے۔
واجد : کبھی گئے ہو تب نہ بتائیں۔
خاں : کہہ تو دیا کہ میں نہیں گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ اب آپ فرمایئے کنور صاحب، آپ کو چلنا ہے یا نہیں ؟ یہ لوگ جو کہتے ہیں سب ٹھیک۔ وہاں گھیگھا نکل آتا ہے، وہاں کا پانی اتنا خراب کہ کھانا بالکل نہیں ہضم ہوتا۔ وہاں ہر روز دس پانچ آدمی کھڈ میں گرا کرتے ہیں۔ اب آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں؟ وہاں جو مزے ہیں۔ وہ یہاں خواب میں بھی نہیں مل سکتے۔ جن حکام کے دروازے پر گھنٹوں کھڑے رہنے پر بھی ملاقات نہیں ہوتی۔ ان سے وہاں چوبیسوں گھنٹوں کا ساتھ رہے گا۔ مِسوں کے ساتھ جھیل میں سیر کرنے کا مزہ اگر مل سکتا ہے تو وہیں۔ آجی سینکڑوں انگریزوں سے دوستی ہوجائے گی۔ تین مہینے وہاں رہ کر آپ نام حاصل کر سکتے ہیں۔ جتنا یہاں زندگی بھر بھی نہ ہوگا۔ بس، اور کیا کہوں۔
کنور : وہاں بڑے بڑے انگریزوں سے ملاقات ہوجائے گی۔
خاں : جناب دعوتوں کے مارے آپ کو دم مارنے کی مہلت نہ ملے گی۔
کنور : جی تو چاہتا ہے کہ ایک بار دیکھ ہی آئیں۔
خاں : تو بس تیاری کیجیے۔

سبھاجن نے جب دیکھا کہ کنور صاحب نینی تال جانے کے لیے تیار ہوگئے تو سب کے سب ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

بیاس : پروت کندراؤں میں کبھی کبھی یوگیوں کے درشن ہو جاتے ہیں۔

لالہ : ہاں صاحب۔ سنا ہے۔ دو دو سو سال کے یوگی وہاں ملتے ہیں۔ جس کی اور ایک بار آنکھ اُٹھا کر دیکھ لیا۔ اسے چاروں پدارتھ مل گئے۔

واجد : مگر حضور چلیں تو اس ٹھاٹھ سے چلیں کہ وہاں کے لوگ بھی کہیں کہ لکھنؤ کے کوئی رئیس آئے ہیں۔

لالہ : لکشمی ہتھنی کو ضرور لے چلیے۔ وہاں کبھی کسی نے ہاتھی کی صورت کاہے کو دیکھی ہوگی۔ جب سرکار سوار ہوکر نکلیں گے اور گنگا جمنی ہودا چمکے گا تو لوگ دنگ ہو جائیں گے۔

بیاس : ایک ڈنکا بھی ہو تو کیا پوچھنا۔

کنور : نہیں صاحب۔ میری صلاح ڈنکے کی نہیں ہے۔ دیش دیکھ کر بھیس بنانا چاہیے۔

لالہ : ہاں۔ ڈنکے کی صلاح تو میری بھی نہیں ہے۔ پر ہاتھی کے گلے میں گھنٹہ ضرور ہو۔

خاں : جب تک وہاں کسی دوست کو تار دے دیجیے کہ ایک پورا بنگلہ ٹھیک کر رکھیں۔ چھوٹے صاحب کو بھی اسی میں ٹھہرا لیں گے۔

کنور : وہ ہمارے ساتھ کیوں ٹھہرنے لگے۔ افسر ہیں۔

خاں : ان کو لانے کا ذمہ ہمارا۔ کھینچ کھانچ کر کسی نہ کسی طرح لے ہی آؤں گا۔

کنور : اگر ان کے ساتھ ٹھہرنے کا موقعہ ملے۔ تب تو میں سمجھوں نینی تال کا جانا پارس ہوگیا۔

(3)

ایک ہفتہ گزر گیا سفر کی تیاریاں ہوگئی۔ پراتہ کال کاٹن صاحب کا خط آیا کہ آپ ہمارے یہاں آئیں گے یا مجھ سے اسٹیشن پر ملیں گے۔ کنور صاحب نے جواب لکھوایا کہ آپ ادھر ہی آجایئے گا اسٹیشن کا راستہ اسی طرف سے ہے۔ میں تیار رہوں گا۔ یہ خط لکھوا کر کنور صاحب اندر گئے تو دیکھا کہ ان کی بڑی سالی رامیشوری دیوی بیٹھی ہوئی ہیں۔ انھیں دیکھ کر بولی۔ کیا آپ سچ مچ نینی تال جارہے ہیں؟

کنور : جی ہاں۔ آج رات کو تیاری ہے۔

رامیشوری : ارے۔ آج ہی رات کو۔ یہ نہیں ہو سکتا کل بچہ کا منڈن ہے۔ میں ایک نہ مانوں گی۔ آپ ہی نہ ہوں گے تو اور لوگ آکر کیا کریں گے۔
کنور : تو آپ نے پہلے ہی کیوں نہ کہلا دیا۔ پہلے سے معلوم ہوتا تو میں کل جانے کا ارادہ ہی کیوں کرتا۔
رامیشوری : تو اس میں لاچاری کی کون سی بات ہے، کل نہ سہی دو چار دن بعد سہی۔
کنور صاحب کی پتنی ششیلا دیوی بولی۔ ہاں اور کیا، دو چار دن بعد ہی جانا، کیا ساعت ٹلی جاتی ہے۔
کنور : آہ۔ چھوٹے صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں، وہ رات ہی کو مجھے لینے آئیں گے۔ آخر وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے؟
رامیشوری : ایسے ایسے وعدہ ہوا ہی کرتے ہیں۔ چھوٹے صاحب کے ہاتھ کچھ بک تو گئے نہیں ہو۔
کنور : میں کیا کہوں کہ کتنا مجبور رہوں۔ بہت لجّت ہونا پڑے گا۔
رامیشوری : تو گویا جو کچھ ہے وہ چھوٹے صاحب ہی ہیں، میں کچھ بھی نہیں۔
کنور : آخر صاحب سے کیا کہوں، کون بہانا کروں۔
رامیشوری : کہہ دو کہ ہمارے بھتیجے کا مُنڈن ہے، ہم ایک ہفتہ تک نہیں چل سکتے۔ بس چھٹی ہوئی۔
کنور : (ہنس کر) کتنا آسان کر دیا ہے آپ نے اس سمتیا کو ایسا ہو سکتا ہے کہیں۔ کہیں منھ دکھانے لائق نہ رہوں گا۔
ششیلا : کیوں، ہو سکنے کو کیا ہوا؟ تم اس کے غلام تو نہیں ہو؟
کنور : تم لوگ باہر تو نکلتی بیٹھتی نہیں ہو، تمھیں کیا معلوم کہ انگریزوں کے وچار کیسے ہوتے ہیں۔
رامیشوری : ارے بھگوان، آخر اس کے کوئی لڑکا بالا ہے، یا نگوڑا ناٹھا ہے؟ تیوہار اور بیوہار ہندو مسلمان سب کے یہاں ہوتے ہیں۔
کنور : بھئی ہم سے کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔
رامیشوری : ہم نے کہہ دیا ہم جانے نہیں دیں گے۔ اگر تم چلے گئے تو مجھے بڑا رنج

ہوگا۔ تمھیں لوگوں سے تو محفل کی شوبھا ہوگی اور اپنا کون بیٹھا ہوا ہے۔

کنور : اب تو صاحب کو لکھ بھیجنے کا بھی موقع نہیں ہے۔ وہ دفتر چلے گئے ہوں گے۔ میرا سب اسباب بندھ چکا ہے۔ نوکروں کو پیشگی روپیہ دے چکا کہ چلنے کی تیاری کریں۔ اب کیسے رک سکتا ہوں۔

رامیشوری : کچھ بھی ہو جانے نہ پاؤ گے۔

ششیلا : دو چار دن بعد جانے میں ایسی کون سی بڑی ہانی ہوئی جاتی ہے؟ وہاں کون لڈو دھرے ہوئے ہیں؟

کنور صاحب بڑے دھرم سنکٹ میں پڑے، آگر نہیں جاتے تو چھوٹے صاحب سے چھوٹے پڑتے ہیں۔ وہ اپنے دل میں کہیں گے کہ اچھے بے ہودے آدمی کے ساتھ پالا پڑا۔ اگر جاتے ہیں تو استری سے بگاڑ ہوتا ہے، سالی منہ پھلاتی ہے۔ اسی چکر میں پڑے ہوئے باہر آئے تو میاں واجد بولے۔ حضور اس وقت کچھ اداس معلوم ہوتے ہیں۔

بیاس : مدرا تیج ہین ہو گئی ہے۔

کنور : بھئی، کچھ نہ پوچھو بڑے سنکٹ میں ہوں۔

واجد : کیا ہوا حضور، کچھ فرمایئے تو؟

کنور : یہ بھی ایک وچتر دیش ہے۔

بیاس : دھرم اوتار، پراچین کال سے یہ رشیوں کی تپو بھومی ہے۔

لالہ : کیا کہنا ہے، سنسار میں ایسا دیش دوسرا نہیں۔

کنور : جی ہاں، آپ کیسے گوکھے اور کس دیش میں ہوں گے۔ بدھی تو ہم لوگوں کو چھو بھی نہیں گئی۔

واجد : حضور عقل کے پیچھے تو ہم لوگ لٹھ لیے پھرتے ہیں۔

بیاس : دھرم اوتار، کچھ کہتے نہیں بنتا۔ بڑی ہین دشا ہے۔

کنور : نینی تال جانے کو تیار تھا۔ اب بڑی سالی کہتی ہیں کہ میرے بچے کا منڈن ہے، میں نہ جانے دوں گی، چلے جاؤ گے تو مجھے رنج ہوگا۔ بتلایئے اب کیا کروں۔ ایسی مورکھتا اور کہاں دیکھنے میں آئے گی۔ پوچھو منڈن نائی کرے گا۔ ناچ

تماشا دیکھنے والوں کی شہر میں کی نہیں، ایک میں نہ ہوں گا نہ سہی مگر ان کو کون سمجھاوے۔

بیاس : دین بندھو، ناری ہٹھ تو لوک پرسدھ ہی ہے۔

کنور : اب یہ سوچیے کہ چھوٹے صاحب سے کیا بہانہ کیا جائے گا۔

واجد : بڑا نازک معاملہ آپڑا حضور۔

لالہ : حاکم کا ناراض ہو جانا بُرا ہے۔

واجد : حاکم مٹی کا بھی ہو پھر بھی حاکم ہی ہے۔

کنور : میں تو بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔

لالہ : حضور اب باہر نہ بیٹھیں۔ میری تو یہی صلاح ہے جو کچھ سر پر پڑیں گی ہم اوڑھ لیں گے۔

واجد : آجی، پسینے کی جگہ خون گرا دیں گے۔ نمک کھایا ہے کہ دل لگی ہے۔

کنور : ہاں، مجھے بھی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آپ لوگ کہہ دیجیے بیمار ہوگئے ہیں۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھی کہ خدمت گار نے آکر ہانپتے ہوئے کہا۔ سرکار کوؤ آوا ہے۔ تون سرکار کا بلاوت ہے۔

کنور : کون ہے پوچھا نہیں؟

خدمت گار : کوئی رنگ ریز ہے سرکار، لال لال منہ ہے، گھوڑا پر سوار ہے۔

کنور : کہیں چھوٹے صاحب تو نہیں ہے۔ بھئی میں تو بھیتر جاتا ہوں۔ اب آبرو تمھارے ہاتھ ہے۔

کنور صاحب نے تو بھیتر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ واجد علی نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ تو چھوٹے صاحب کھڑے تھے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے اب صاحب کے سامنے کون جائے؟ کسی کی ہمت نہیں پڑتی ایک دوسرے کو ٹھیل رہا ہے۔

لالہ : بڑھ جاؤ واجد علی۔ دیکھو کیا کہتے ہیں؟

واجد : آپ ہی کیوں نہیں چلے جاتے؟

لالہ : آدمی ہی تو وہ بھی ہیں، کچھ کھا تو نہ جائے گا۔

واجد : تو چلے کیوں نہیں جاتے۔

کاٹن صاحب دو تین منٹ کھڑے رہے۔ جب یہاں سے کوئی نہ نکلا تو بگڑ کر بولے۔ یہاں کون آدمی ہے؟ کنور صاحب سے بولو، کاٹن صاحب کھڑا ہے۔

میاں واجد بوکھلائے ہوئے آگے بڑھے اور ہاتھ باندھ کر بولے۔ خداوند، کنور صاحب نے آج بہت دیر سے کھانا کھایا تو طبعیت کچھ بھاری ہو گئی ہے۔ اس وقت آرام میں ہیں۔ باہر نہیں آسکتے۔

کاٹن : اوہ۔ تم یہ کیا بولتا ہے۔ وہ تو ہمارے ساتھ نینی تال جانے والا تھا۔ اس نے ہم کو خط لکھا تھا۔

واجد : ہاں، حضور، جانے والے تو تھے پر بیمار ہوگئے۔

کاٹن : بہت رنج ہوا۔

واجد : حضور اتفاق ہے۔

کاٹن : ہم کو بہت افسوس ہے۔ کنور صاحب سے جاکر بولو۔ ہم ان کو دیکھنا مانگتا ہے۔

واجد : حضور، باہر نہیں آسکتے۔

کاٹن : کچھ پرواہ نہیں، ہم اندر جاکر دیکھے گا۔

کنور صاحب دروازے سے چمٹے ہوئے کاٹن صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔ نیچے کی سانس نیچے تھی اوپر کی اوپر۔

کاٹن صاحب کو گھوڑے سے اتر کر دروازے کی طرف آتے دیکھا تو گرتے پڑتے دوڑے اور ششیلا سے بولے۔ ڈشٹ مجھے دیکھنے گھر میں آرہا ہے۔ میں چارپائی پر لیٹ جاتا ہوں۔ چٹ پٹ لحاف نکلواؤ اور مجھے اوڑھا دو۔ دس پانچ شیشیاں لاکر اس گول میز پر رکھوا دو۔ اتنے میں واجد علی نے دووار کھٹکھٹا کر کہا۔ ہری، ذرا دروازہ کھول دو۔ صاحب بہادر کنور صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ششیلا نے لحاف مانگا پر گرمی کے دن تھے، جاڑے کے کپڑے صندوق میں بند پڑے تھے۔ چٹ پٹ صندوق کھول کر دو تین موٹے موٹے لحاف کنور صاحب کو اوڑھا دیے۔ پھر الماری سے کئی شیشیاں اور کئی بوتل نکال کر میز پر چُن دیے اور مہری سے کہا۔ جاکر کیواڑ کھول دو، میں اوپر چلی جاتی ہوں۔

کاشن صاحب جیوں ہی کمرے میں پہنچے کنور صاحب نے لحاف سے منھ نکال لیا اور کراہتے ہوئے بولے، بڑا کشٹ ہے حضور۔ سارا شریر پھونکا جاتا ہے۔

کاشن : آپ دوپہر تک تو اچھا تھا، خاں صاحب ہم سے کہتا تھا کہ آپ تیار ہیں۔ کہاں درد ہے؟

کنور : حضور، پیٹ میں درد ہے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ دم نکل جائے گا۔

کاشن : ہم جاکر سول سرجن کو بھیج دیتا ہے۔ وہ پیٹ کا درد ابھی اچھا کر دے گا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ سول سرجن ہمارا دوست ہے۔

کاشن چلا گیا تو کنور صاحب پھر باہر آ بیٹھے۔ روزہ بخشوانے گئے تھے، نماز گلے پڑی۔ اب یہ فکر پیدا ہوئے کہ سول سرجن کو کیسے ٹالا جائے۔

کنور : بھئی، یہ تو نئی بلا گلے پڑی۔

واجد : یہاں تو حضور، ہماری عقل کام نہیں کرتی۔

کنور : کوئی جاکر خاں صاحب کو بلا لاؤ، کہنا، ابھی چلیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دیر کریں اور سول سرجن یہاں سر پر سوار ہو جائے۔

لالہ : سول سرجن کی فیس بھی بہت ہوگی؟

کنور : اجی تمھیں فیس کی پڑی ہے، یہاں جان آفت میں ہے۔ اگر سو دو سو دے کر گلا چھوٹ جائے تو اپنے کو بھاگیہ وان سمجھوں۔

واجد علی نے فٹن تیار کرائی اور خاں صاحب کے گھر پہنچے۔ دیکھا تو وہ اسباب بندھوا رہے ہیں۔ ان سے سارا قصہ بیان کیا اور کہا۔ ابھی چلیے آپ کو بلایا ہے۔

خاں : معاملہ بہت ٹیڑھا ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی۔ قسم خدا کی، تم سب کے سب گردن مار دینے کے لائق ہو۔ ذرا دیر کے لیے میں ٹل کیا گیا کہ سارا کھیل ہی بگاڑ دیا۔

واجد : خاں صاحب ہم سے تو اڑیئے نہیں۔ کنور صاحب بوکھلائے ہیں۔ دو چار سو کا وارا نیارا ہے۔ چل کر سول سرجن کو منع کر دیجیے۔

خاں : چلو، شاید کوئی تدبیر سوجھ جائے۔

دونوں آدمی سول سرجن کے بنگلے کی طرف چلیں، وہاں معلوم ہوا کہ صاحب

کنور صاحب کے مکان پر گئے ہیں۔ فوراً فٹن گھما دی اور کنور صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ دیکھا تو سرجن صاحب انیا لیے ہوئے کنور صاحب کی چارپائی کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔

خاں : میں تو حضور کے بنگلے سے چلا آرہا ہوں۔ کنور صاحب کا کیا حال ہے؟

ڈاکٹر : پیٹ میں درد ہے ابھی پچکاری لگانے سے اچھا ہو جائے گا۔

کنور : حضور، اب درد بالکل نہیں ہے۔ مجھے کبھی کبھی یہ مرض ہو جاتا ہے اور آپ ہی آپ اچھا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر : اوہ۔ آپ ڈرتا ہے۔ ڈرنے کا کوئی بات نہیں ہے آپ ایک منٹ میں اچھا ہو جائے گا۔

کنور : حضور میں بالکل اچھا ہوں۔ اب کوئی شکایت نہیں ہے۔

ڈاکٹر : ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہ سب آدمی ہٹ جائے۔ ہم ایک منٹ میں اچھا کر دے گا۔

خاں صاحب نے ڈاکٹر کے کان میں کہا۔ حضور اپنی رات کی ڈبل فیس اور گاڑی کا کرایہ لے کر چلے جائیں، ان رئیسوں کے پھیر میں نہ پڑیں۔ یہ لوگ بارھوں مہینے اسی طرح بیمار رہتے ہیں۔ ایک ہفتے تک آکر ایک بار دیکھ لیا کیجیے۔

ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ کل پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ لوگوں کے سر سے بلا ٹلی خاں صاحب کی کارگزاری کی تعریفیں ہونے لگیں۔

کنور : خاں صاحب آپ وقت پر کام آئے۔ زندگی بھر آپ کا احسان مانوں گا۔

خان : جناب، دو سو چٹانے پڑے۔ کہتا تھا کہ چھوٹے صاحب کا حکم ہے میں بلا پچکاری لگائے نہ جاؤں گا۔ انگریزوں کا حال تو آپ جانتے ہیں۔ بات کے پکّے ہوتے ہیں۔

کنور : یہ بھی کہہ دیا نا کہ چھوٹے صاحب کو میری بیماری کی اطلاع کر دیں اور کہہ دیں، وہ سفر کرنے لائق نہیں ہے۔

خاں : ہاں صاحب، اور روپے دیے، کس لیے، کیا میرا کوئی رشتے دار تھا؟ مگر چھوٹے صاحب کو ہوگی بڑی تکلیف۔ بے چارے نے آپ کے بنگلے کے آسرے پر

ہوٹل کا انتظام بھی نہ کیا تھا۔ معاملہ بے ڈھب ہوا۔

کنور : تو بھئی، میں کیا کرتا، آپ ہی سوچیے؟

خاں : یہ چال الٹی پڑی۔ جس وقت کاٹن صاحب یہاں آئے تھے آپ کو ان سے ملنا چاہئے تھا۔ صاف کہہ دیتے آج ایک سخت ضرورت سے رکنا پڑا۔ لیکن خیر میں صاحب کے ساتھ رہوں گا۔ کوئی انتظام ہو ہی جائے گا۔

کنور : کیا ابھی آپ جانے کا ارادہ کرہی رہے ہیں۔ حلف سے کہتا ہوں۔ میں آپ کو نہ جانے دوں گا، یہاں نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ میاں واجد دیکھو، آپ کے گھر کہلا دو باہر نہ جائیں گے۔

خاں : آپ اپنے ساتھ مجھے ڈبانا چاہتے ہیں۔ چھوٹے صاحب آپ سے ناراض بھی ہوجائیں تو کیا کرلیں گے۔ لیکن مجھ سے ناراض ہو گئے تو خراب ہی کر ڈالیں گے۔

کنور : جب تک ہم زندہ ہیں بھائی صاحب۔ آپ کو کوئی ترچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ جاکر چھوٹے صاحب سے کہیے کنور صاحب کی حالت اچھی نہیں۔ میں اب نہیں جاسکتا۔ اس میں میری طرف سے بھی صاف ہو جائے گا اور آپ کی دوستی دیکھ کر آپ کی اور بھی عزت کرنے لگے گا۔

خاں : اب وہ عزت کرے یا نہ کرے۔ جب آپ اتنا اسرار کر رہے ہیں تو میں بھی اتنا بے مروت نہیں ہوں کہ آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ذرا دیر کے لیے گھر چلا گیا اس کا تو اتنا تاوان دینا پڑا۔ نینی تال چلاجاؤں تو شاید کوئی آپ کو اٹھا ہی لے جائے۔

کنور : مزے سے دوچار دن جلسے دیکھیں گے۔ نینی تال میں یہ مزے کہاں ملتے۔ بیاس جی اب تو یوں نہیں بیٹھا جاتا۔ دیکھیے، آپ کے بھنڈار میں کچھ ہے۔ دوچار بوتلیں نکالیے کچھ رنگ جمایئے۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں ماہنامہ 'مادھوری' اپریل 1929 میں شائع ہوا۔ 'گپت دھن' 2 میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔)

دیوی

رات بھیگ چکی تھی۔ میں بر آمدہ میں کھڑا تھا سامنے امین الدولہ پارک نیند میں ڈوبا کھڑا تھا۔ صرف ایک عورت تکیہ دار بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

پارک کے باہر، لب سڑک، ایک فقیر کھڑا راگیروں کو دعائیں دے رہا تھا۔

"خدا اور رسول کا واسطہ... رام اور بھگوان کا واسطہ... اس اندھے پر رحم کرو۔"!!!

سڑک پر موٹروں اور سواریوں کا تانتا بند ہو چکا تھا۔ اِکے دُکے آدمی نظر آجاتے تھے۔ فقیر کی صدا جو پہلے نقار خانے میں میں طوطی کی صدا تھی۔ اب نالۂ صحرا ہو رہی تھی۔!

دفعتاً وہ عورت اٹھی اور ادھر اُدھر محتاط نظروں سے دیکھ کر فقیر کے ہاتھ میں کچھ رکھ دیا۔ پھر بہت آہستہ سے کچھ کہہ کر ایک طرف چلی گئی۔ فقیر کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔ جسے وہ بار بار مل رہا تھا۔ کیا اس عورت نے یہ کاغذ دیا ہے۔

یہ کیا اسرار ہے؟ میں فرط اشتیاق سے بے تاب ہوکر نیچے آیا اور فقیر کے پاس کھڑا ہوگیا۔

میری آہٹ پاتے ہی فقیر نے اس کاغذ کے پرزے کو دو انگلیوں سے دبا کر مجھے دکھایا اور پوچھا۔ بابا دیکھو یہ کیا چیز ہے؟

میں نے دیکھا دس روپیہ کا نوٹ تھا۔! پوچھا، دس روپیہ کا نوٹ ہے۔ کہاں پایا؟

فقیر نے نوٹ کو اپنی جھولی میں رکھتے ہوئے کہا، کوئی خدا کی بندی دے گئی ہے۔

میں نے اور کچھ نہ کہا۔ اس عورت کی طرف دوڑا جو اب تاریکی میں محض خوابِ حسرت بن کر رہ گئی تھی۔

وہ کئی گلیوں میں ہوتی ہوئی ایک بوسیدہ، خستہ حال مکان کے دروازے پر رکی۔ قفل کھولا اور اندر چلی گئی۔

رات کو کچھ پوچھنا مصلحت کے خلاف سمجھ کر لوٹ آیا۔
رات بھر میرا جی اسی طرف لگا رہا۔ علی الصبح میں پھر اس کوچہ میں جا پہنچا۔
معلوم ہوا وہ ایک غریب بے کس بیوہ ہے۔
میں نے دروازہ پر جاکر، پکارا دیوی! میں تمھارے درشن کرنے آیا ہوں۔
عورت باہر نکل آئی۔ افلاس اور بیکسی کی مجسم تصویر تھی۔
میں نے ہچکتے ہوئے کہا۔ رات آپ نے فقیر کو...
دیوی نے قطع کلام کر کے کہا۔ اجی وہ کیا بات تھی۔ مجھے وہ نوٹ پڑا مل گیا تھا میرے کس کام کا تھا۔
میں نے اس دیوی کے قدموں پر سر جھکا دیا۔

(یہ افسانہ 'پریم چالیسی' میں شائع ہوا ہے۔ ہندی میں 'گپت دھن' 2 میں شامل ہے۔)

ماں

(1)

آج قیدی چھوٹ کر گھر آرہا ہے۔ کرونا نے ایک دن پہلے ہی گھر لیپ پوت رکھا تھا۔ اس تین سال میں اس نے اپنا پیٹ اور تن کاٹ کر جو دس پانچ روپے جمع کر رکھے تھے وہ اس نے اپنے پیارے شوہر کی خاطر وخیر مقدم کی تیاریوں میں صرف کیے۔ اس کے لیے دھوتیوں کا نیا جوڑا لائی تھی۔ نئے کرتے بنوائے تھے۔ بچہ کے لیے نیا فراک اور کنٹوپ بنایا۔ بار بار بچہ کو چھاتی سے لگاتی اور خوش ہوتی۔ وہ اس پیارے بچہ کو شوہر کی گود میں دے دے گی تو وہ کتنے خوش ہوں گے۔ اس خیال کا دل میں مزہ لے کر وہ پھولے نہ سماتی تھی۔ آتے ہی آتے وہ اسے گود میں اٹھا لیں گے۔ پیار کریں گے اور کہیں گے۔ کرونا تم نے یہ رتن دے کر مجھے نہال کر دیا۔ قید کی ساری مصیبتیں اور سختیاں بچہ کی توتلی باتوں میں بھول جائیں گے۔ اس کی ایک طفلانہ معصوم نگاہ میں سارے غم ڈھل جائیں گے۔ وہ سوچتی تھی ان کے ساتھ بہت سے آدمی ہوں گے۔ جس وقت وہ دروازہ پر پہنچیں گے جے۔ جے کے نعرے بلند ہوں گے۔ اور لوگ ان پر پھولوں کی برکھا کریں گے۔ کتنا پاک نظارہ ہوگا۔ ان آدمیوں کو بٹھانے کے لیے کرونا نے ایک چھوٹا سا ٹاٹ بچھا رکھا تھا۔ کچھ پان بھی بنا لیے تھے۔ اور بار بار منتظر نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھتی تھی۔ شوہر کی وجیہ مردانہ صورت بار بار آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ ان کی وہ باتیں بار بار یاد آتی تھیں۔ جو چلتے وقت ان کی زبان سے نکلی تھیں۔ ان کا وہ استقلال، وہ ضبط، جو پولیس کی دست درازیوں میں بھی اٹل رہا تھا۔ وہ تبسم جو اس وقت بھی ان کے لبوں کو شگفتہ کر رہا تھا۔ وہ خود داری جو اس وقت بھی ان کے چہرہ سے ٹپک رہی تھی۔ کیا کرونا کے دل سے محو ہو سکتی تھی۔ اس کی یاد آتے ہی کرونا کے چہرہ پر غرور کی سرخی نمایاں ہو گئی۔ یہی وہ سہارا تھا جس نے ان تین برسوں کی بڑی بڑی سخت آزمائشوں میں اس کے دل کو تقویت دی تھی۔ راتیں فاقوں سے گزریں۔ اکثر گھر میں چراغ جلنے کی نوبت بھی نہ آتی تھی۔ مگر حرف

التجا کبھی اس کی زبان پر نہ آیا۔ آج ان ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان کے آغوش محبت میں وہ سب کچھ ہنس کر جھیل لے گی۔ اس لازوال دولت کو پاکر اسے پھر کسی چیز کی آرزو نہ رہے گی۔

شام ہو رہی تھی۔ قضا کا رہنورد ازل اپنی منزل کی طرف لپکا چلا جاتا تھا۔ جہاں افق نے اس کے لیے سنہرا فرش بچھا رکھا تھا۔ اور آرام گاہ میں پھولوں کی سیج بچھادی تھی۔ اسی وقت مکان کے سامنے میدان میں ایک آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ گویا کسی جاں بہ لب مسافر کا نالۂ ضعیف ہو۔ قدم قدم پر رک جاتا تھا، کھانسنے لگتا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کرونا اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ رفتار سے معلوم ہوتا تھا کوئی بوڑھا آدمی ہے۔ مگر ایک منٹ میں جب وہ قریب آگیا تو کرونا پہچان گئی۔ اس کا پیارا شوہر ہی تھا۔ لیکن آہ! اس کی صورت کتنی مسخ ہوگئی تھی۔ وہ جوانی وہ مردانہ حسن وہ چستی اور پھرتی رخصت ہو گئی تھی۔ صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ نہ کوئی یار نہ مددگار! ایک آدمی بھی ساتھ نہیں! کرونا اسے پہچانتے ہی دروازہ کے باہر آگئی۔ مگر شوہر سے بغل گیر ہونے کا اشتیاق دل میں دب کر رہ گیا۔ سارے ولولے خاک میں مل گئے۔ آنسوؤں کے سیلاب میں ساری خوشیاں بہہ گئیں، فنا ہو گئیں۔

آدتیہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی مسکرا کر کرونا کو دیکھا۔ مگر مسکراہٹ میں درد کا ایک دریا بھرا ہوا تھا۔ کرونا ایسی بے حس ہوگئی تھی گویا بدن میں جان ہی نہ ہو۔ گویا دل کی حرکت بند ہوگئی ہو۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے شوہر کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔ پر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا، نہ مزاج پرسی کا، نہ خیر مقدم کا، نہ رنج کا۔ بچہ اس کی گود میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے اس تودۂ استخواں کو دیکھ رہا تھا اور ماں کی گود سے چمٹا جاتا تھا۔ وہ بھول گئی کہ میری گود میں بچہ ہے۔

آخر اس نے دردناک لہجہ میں کہا۔ یہ تمھاری کیا حالت ہے۔ بالکل پہچانے نہیں جاتے۔

آدتیہ نے اس کی تشویش کو رفع کرنے کے خیال سے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا۔ کچھ نہیں۔ ذرا دبلا ہوگیا ہوں۔ اب تمھارے ہاتھوں کی روٹیاں کھا کر پھر توانا ہو جاؤں گا۔

کرونا... رام... رام۔ بالکل سوکھ کر کانٹا ہوگئے۔ کیا وہاں کھانا بھی نہیں ملتا۔ تم تو کہتے تھے۔ پولٹیکل قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور وہ تمھارے ساتھی کیا ہوئے جو تمھیں رات دن گھیرے رہتے تھے اور تمھارے پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتے تھے؟

آدتیہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ بولے یہ بہت تلخ تجربہ ہے۔ کرونا مجھے نہ معلوم تھا کہ میرے قید ہوتے ہی لوگ میری طرف سے آنکھیں پھیر لیں گے کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ قوم پر مٹنے والوں کا یہی انعام ہے۔ یہ مجھے نہ معلوم تھا۔ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا۔ لیکن اپنے رفیق اور غمگسار بھی اتنے بے وفا ہوتے ہیں۔ اس کا مجھے نیا تجربہ ہوا۔ مگر مجھے کسی سے شکایت نہیں۔ قوم کی خدمت خود اپنا انعام ہے۔ میری حماقت تھی کہ اس کے لیے صلہ یا تحسین چاہتا تھا۔

کھانے پینے کا قصہ نہ پوچھو کرونا، بڑی دردناک کہانی ہے۔ بیس فاقے کرچکا ہوں۔ بس یہی غنیمت سمجھو کہ زندہ آگیا۔ تمھارے درشن بدے تھے۔ ورنہ تکلیفیں تو ایسی ایسی اٹھائیں کہ اب تک مجھے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ جیل کے قیدی کتے سے بھی بدتر سمجھے جاتے ہیں اور کھانا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کتا بھی نہ سونگھے۔

کرونا، تو چل کر کچھ کھا لو۔ نہیں... یہیں لاتی ہوں۔ کچھ کھا کر آرام سے لیٹو۔ (بچے سے) بابو جی ہیں۔ بیٹا... تمھارے بابوجی۔

آدتیہ نے پشیمان نظروں سے بچے کو دیکھا اور ان کا ایک ایک رواں انھیں نفریں کرنے لگا۔ اپنی خستہ حالی پر انھیں کبھی اتنا صدمہ نہ ہوا تھا۔ کاش ان کی حالت اب کے سنبھل جاتی تو وہ پھر قومی تحریکوں کے قریب نہ جاتے۔ اس پھول سے بچے کو یوں دنیا میں لاکر اس بے کسی اور افلاس کا شکار بنانے کا انھیں کیا حق تھا۔ وہ ایک بار پھر دنیا کی پرستش کریں گے اور اس بچے کی پرورش وپرداخت کے لیے اپنے کو نثار کردیں گے۔ انھیں اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ بچہ انھیں شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ گویا کہہ رہا ہے۔ تم نے میرے ساتھ اپنا کون سا فرض ادا کیا۔ ان کا سارا اشتیاق سارا پیار بچہ کو سینہ سے لگا لینے کے لیے تڑپ اٹھا۔ مگر ہاتھ نہ پھیل سکے۔ ہاتھوں میں طاقت نہ تھی۔

کرونا بچہ کو لیے ہوئے اٹھی اور ایک تھالی میں کچھ کھانا نکال کر لائی۔ آدتیہ نے حریص نظروں سے تھالی کی طرف دیکھا۔ گویا مدت کے بعد کوئی کھانے کی چیز سامنے آئی ہے وہ جانتا تھا۔ ہفتوں کی فاقہ کشی کے بعد اور صحت کی اس گئی گزری حالت میں یہ پُر تکلف چیزیں اسے ہضم نہ ہوں گی۔ لیکن وہ صبر نہ کر سکا۔ تھالی پر ٹوٹ پڑا۔ اور دم زدن میں تھالی صاف کر دی۔ کرونا ان کی یہ پُر خوری دیکھ کر ڈر گئی۔ اس نے دوبارہ کسی چیز کے لیے نہ پوچھا۔ تھالی اٹھا کر چلی گئی اور لالٹین جلانے بیٹھی ہی تھی کہ کانوں میں آواز آئی کرونا۔!

کرونا نے جلدی سے لالٹین جلائی اور دوڑی ہوئی آدتیہ کے پاس آکر بولی تم نے مجھے پکارا ہے؟

آدتیہ نے جواب نہ دیا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور سانس زور سے چل رہی تھی۔ ہاتھوں کے سہارے ٹوٹ گئے تھے۔ کرونا گھبرا گئی۔ بولی تمھاری طبعیت کیسی ہے۔ جا کر کسی وید کو بلا لاؤں؟

آدتیہ نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر کے کہا فضول ہے کرونا۔ اب تم سے چھپانا فضول ہے۔ مجھے تپ دق ہوگیا ہے۔ اس تین سال کی متواتر تکلیف فکر اور فاقہ کشی نے آخر مجھے اس مرض کا شکار بنا ڈالا۔ کئی بار مرتے مرتے بچ گیا ہوں۔ تمھیں دیکھنے کی آرزو باقی تھی۔ شاید اسی لیے جان نہ نکلتی تھی۔ اب کوئی بہانہ نہیں رہا۔ دیکھو روؤ مت۔

کرونا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ میں ابھی وید جی کو لیے آتی ہوں۔

آدتیہ بے سود ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ ایک قدم بھی چلنا محال تھا۔ مجھے تو یہی تعجب ہے کہ یہاں پہنچ کیسے گیا۔ نہ جانے کون سی غیبی طاقت مجھے یہاں لائی۔ شاید وہ اس بجھتے ہوئے چراغ کی آخری جھلک تھی۔ آہ! میں نے تمھارے لیے کچھ نہ کیا۔کوئی آرام نہ دے سکا۔ تمھارے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ محض سہاگ کا داغ لگا کر اور ایک بچہ کی پرورش کا بار چھوڑ کر چلا جا رہا ہوں۔ افسوس!

کرونا نے دل مضبوط کر کے کہا۔ تمھیں کہیں درد ہو رہا ہے؟ آگ بنا لاؤں کچھ بتلاتے کیوں نہیں۔

آدتیہ نے کروٹ بدل کر کہا۔ کوئی ضرورت نہیں۔ کہیں درد نہیں۔ بس ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ دل بیٹھا جاتا ہے۔ گویا پانی میں ڈوبا جاتا ہوں۔ زندگی کا کھیل ختم ہو رہا ہے۔ چراغ کو بجھتے ہو۔ دیکھ رہا ہوں۔ کچھ نہیں کہہ سکتا کب آواز بند ہو جائے۔ اب جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالوں گا۔ کیوں یہ حسرت لے جاؤں میرے ایک سوال کا جواب دوگی۔ پوچھوں۔

کرونا کے دل کا سارا ضعف، ساری مایوسی، سارا غم، سارا درد غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ وہ روحانی طاقت رُونما ہوئی جو موت پر ہنستی ہے اور مصائب سے کھیلتی ہے۔ جواہر نگار خول کے اندر جیسے تیز تلوار چھپی رہتی ہے۔ پانی کے نغمہ شیریں میں جیسے بعید القیاس قوت چھپی ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت کا نازک دل صبر اور استقلال کو اپنی گود میں چھپائے رہتا ہے۔ غصہ جیسے تلوار کو باہر کھینچ لیتا ہے۔ علم جیسے پانی کی مخفی طاقت کو بے نقاب کردیتا ہے۔ اسی طرح الفت حسینہ کے صبر اور استقلال کو بیدار کر دیتی ہے۔

کرونا نے آہستہ سے شوہر کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور بولی: پوچھو پیارے۔ کیا پوچھتے ہو؟

آدتیہ نے کرونا کی طرف بے کسانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تمھارے خیال میں میری زندگی کیسی تھی؟ رنج کرنے کے قابل، یا خوش ہونے کے قابل! دیکھو تم نے مجھ سے کبھی پردہ نہیں کیا اس وقت بھی پردہ نہ رکھنا۔ تمھارے خیال میں مجھے اپنی زندگی پر رونا چاہیے یا ہنسنا چاہیے؟

کرونا نے جوش کے ساتھ کہا۔ تمھاری زندگی دیوتاؤں کی زندگی تھی۔ بالکل بے غرض، بے لوث، ضرورتوں سے تنگ آکر میں نے بارہا تمھیں دنیا کی طرف کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں اس وقت بھی دل میں سمجھ رہی تھی کہ میں تمھیں اونچے درجہ سے گرا رہی ہوں۔ شاید تم مال و متاع کی طرف زیادہ مائل ہوتے تو میرے نفس کو زیادہ اطمینان ہوتا۔ لیکن میری آتما کو وہ غرور اور سرور کبھی نہ ہوتا۔ جو اس وقت مجھے ہو رہا ہے۔ میں اگر کسی کو اچھی دعا دے سکتی ہوں تو وہ یہی ہوگی کہ اس کی زندگی تمھاری جیسی ہو۔

یہ کہتے کہتے کرونا کے چہرہ پر ایک نورانی جھلک نمودار ہوئی۔ گویا اس کی ہستی کا ایک ایک ذرہ پاکیزہ ہوگیا ہو۔

آدتیہ کا زرد اور مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ آنکھوں میں ایک نورانی مستی پیدا ہوگئی۔ اس دم واپسیں کے ایک لمحے میں اسے وہ سرور حاصل ہوا جو کبھی ساری زندگی میں نہ ہوا تھا۔ اس نے پُرغرور نظروں سے کرونا کو دیکھ کر کہا۔ بس اب مجھے اطمینان ہو گیا کرونا! مجھے اب اپنے بچے کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میں اسے اس سے بہتر ہاتھوں میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ زندگی کا یہی اونچا معیار تمھارے سامنے ہمیشہ رہے گا۔ اب میں خوشی سے مرنے کے لیے تیار ہوں۔

(2)

سات سال گزر گئے۔ بچہ پرکاش اب دس سال کا خوبصورت، مضبوط دل فریب لڑکا تھا۔ بلا کا ذہین، مغرور اور دلیر، زمانہ کرونا کو بدنصیب سمجھے۔ وہ خود کبھی اپنی قسمت کا گلہ نہیں کرتی۔ اس کے پاس کچھ زیور تھے۔ ان سے اس نے تین چار بھینسیں اور گائیں لے لیں اور خالص دودھ کے خواستگار ٹوٹ پڑے۔ اس کا سارا دودھ گھر بیٹھے ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ یہی اس کی گذران کی صورت تھی۔ اسے پہر رات سے پہر رات تک مویشیوں کی داشت و پرداخت میں مصروف رہنا پڑتا۔ پھر بھی وہ اپنے حال پر خوش ہے۔ اس کے چہرہ پر مایوسی اور بے کسی کی زردی نہیں۔ عزم اور ہمت کا جلال ہے۔ ایک ایک عضو سے خود داری کی شان ٹپک رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک روحانی غرور ہے۔ خاموش، متین اور عمیق، حسرتیں اور کلفتیں۔ وہ بیوگی کا صدمہ۔ وہ بے کسی کا غم سب اس گہرائی میں فنا ہوگئے ہیں۔ پرکاش پر وہ جان دیتی ہے۔ اس کی خوشیاں، اس کی تمنائیں، اس کی دنیا، اس کی جنت، سب کچھ پرکاش پر نثار ہے۔ مگر یہ مجال نہیں کہ پرکاش کوئی شرارت کرے اور کرونا اغماض کر جائے۔ نہیں۔ وہ اس کے اطوار کی بڑی بے دردی سے نگرانی کرتی ہے۔ وہ پرکاش کی صرف ماں نہیں۔ ماں اور باپ دونوں ہے۔ اس کے برتاؤ میں ماں کے پیار کے ساتھ باپ کی تندی بھی شامل ہے۔ شوہر کے آخری الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ وہ روحانی مستی جو ان کی آنکھوں میں چھا گئی تھی۔ وہ غرور جو ان کے چہرہ

پر دوڑ کیا تھا۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔شب و روز کی یاد نے آدتیہ کو اس کے لیے زندہ کر دیا ہے۔ وہ دنیا کے لیے مر گئے ہیں۔ اس کے لیے زندہ ہیں۔ اسے ہمیشہ ان کی ہستی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ آدتیہ کی روح اس کی ہر حال میں شریک ہے۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ پرکاش جوان ہو کر اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصود ہے۔ اس زندگی کا جو درد اور غم کی ایک داستان ہے۔

شام ہوگئی تھی۔ ایک بھکارن دروازہ پر آکر بھیک مانگنے لگی۔ پرکاش دروازہ پر کھیل رہا تھا۔ شرارت سوجھی۔ گھر میں گیا اور ایک کٹورے میں تھوڑا سا بھوسہ لایا۔ بھکارن نے اپنی جھولی پھیلادی پرکاش نے وہ بھوسہ جھولی میں ڈال دیا اور زور سے تالیاں بجاتا بھاگا۔ بھکارن نے قہر کی نگاہ سے دیکھا اور بولی واہ رے لاڈلے۔ مجھ سے ہنسی کرنے چلا ہے۔ کیا یہ ماں باپ نے سکھایا ہے؟ تب تو خوب کُل کا نام جگاؤ گے۔

کرونا باہر نکل آئی اور بولی۔ کیا ہے ماتا، کسے کہہ رہی ہو؟

بھکارن نے پرکاش کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ تمھارا لڑکا ہے نہ ؟ دیکھو کٹورے میں بھوسہ بھر کر میری جھولی میں ڈال گیاہے۔ تھوڑا سا آٹا تھا وہ بھی مٹی میں مل گیا۔ کوئی اس طرح دکھیاروں کو ستاتا ہے۔ سب کے دن ایک سے نہیں رہتے آدمی کو گھمنڈ نہ کرنا چاہیے۔

کرونا نے کرخت لہجہ میں پکارا... پرکاش!

پرکاش نادم نہ ہوا۔ تمکنت کے انداز سے سر اٹھائے ہوئے آیا اور بولا۔ یہ کیوں ہمارے یہاں بھیک مانگنے آتی ہے۔ کچھ کام نہیں کرتی۔

کرونا خفیف ہو کر بولی۔ شرم تو نہیں آتی۔ الٹے زبان درازی کرتے ہو۔

کرونا نے بڑھیا کو آٹا دال دے کر رخصت کیا۔ مگر پرکاش کی یہ حرکت اس کے دل میں پھوڑے کی طرح ٹیستی رہی۔ یہ شرارت اس نے کہاں سیکھی؟ رات کو بھی اُسے بار بار یہی خیال ستاتا رہا۔

آدھی رات کے قریب یکایک پرکاش چونکا تو دیکھا لالٹین جل رہی ہے۔ اور کرونا بیٹھی رو رہی ہے۔ بولا اماں! ابھی تم سوئیں نہیں؟ کرونا نے منہ پھیر کر کہا۔ نیند

نہیں آئی۔ تم کیسے جاگ گئے؟ پیاس تو نہیں لگی ہے؟
پرکاش : میرا قصور معاف کرو۔ اب میں پھر ایسی شرارت نہ کروں گا۔
یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ کرونا نے اسے گلے لگا لیا اور بولی۔ بیٹا مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو یا تمھاری دل میں سچ مچ پچھتاوا ہو رہا ہے؟
پرکاش نے سسکتے ہوئے کہا۔ نہیں اماں! مجھے دل سے افسوس ہو رہا ہے۔ اب کی وہ بڑھیا آئے گی تو میں اسے پیسے دوں گا۔
کرونا کا چہرہ غرور سے سرخ ہو اٹھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ آدتیہ سامنے کھڑے بچے کو دعائیں دے رہے ہیں اور کچھ کہہ رہے ہیں۔ کرونا! رنجیدہ مت ہو۔ تیری ساری آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔

(3)

نوجوان پرکاش کے قول اور فعل میں مناسبت نہ تھی۔ اور دنوں کے ساتھ اس کے کیرکٹر کا یہ پہلو نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ زبان سے وہ قوم کا سچا ہمدرد اور جاں نثار تھا۔ مگر قوم کے لیے کسی قسم کے ایثار کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔ ذہین تھا ہی۔ یونیورسٹی سے اسے وظیفے ملتے تھے۔ کرونا بھی اس کی مدد کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کا خرچ پورا نہ پڑتا تھا۔ وہ کفایت شعاری اور سادہ معاشرت پر عالمانہ تقریریں کر سکتا تھا۔ مگر وضع اور قطع یونیورسٹی کے فیشن ایبل طلباء سے جو بھر بھی گھٹ کر نہ ہوتی تھی۔ نمود و نمائش کی دھن اسے ہمیشہ سوار رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی تھی۔ دل قوم کی طرف تھا۔ دماغ اپنی طرف۔ مگر دماغ کے مقابلہ میں دل کی ایک نہ چلتی تھی۔ قوم کی خدمت اُوسر کی کھیتی تھی۔ وہاں غربت اور تنگدستی کے سوا اور کیا تھا۔ بڑے سے بڑا صلہ جو مل سکتا تھا۔ وہ تھی قوم کی عقیدت، ہر دل عزیزی، نیک نامی، وہ بھی پائدار نہیں۔ اتنی عارضی کہ ایک غلطی میں عمر بھر کی کمائی پر پانی پھر سکتا تھا۔ اس کا دل ایک بے اختیار جوش کے ساتھ امیرانہ زندگی کی طرف مائل ہوتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اسے افلاس اور غربت سے نفرت ہونے لگی۔ وہ پست حالی کو ہمدردی کے قابل نہیں نفرت کے قابل سمجھتا تھا۔ اور اس کی ذمہ داری قوم کے سر منڈھتا تھا۔ دماغ میں درد کہاں، احساس کہاں، اس کا جوہر تو

دلیل ہے۔ ذہانت ہے، حوصلہ ہے۔

سندھ میں سیلاب آیا۔ ہزاروں آدمی تباہ ہوگئے۔ یونیورسٹی نے سیلاب زدوں کی امداد کے لیے ایک سیوا سمتی بھیجی۔ پرکاش نے پہلے بڑی سرگرمی اور خلوص کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے اندر یہ جنگ برابر جاری رہی کہ کیوں نہ اس اثناء میں بیٹھ کر کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کروں۔ تاکہ اول درجہ میں پاس ہوجاؤں۔ آخر روانگی کے وقت وہ بیماری کا بہانہ کر کے بیٹھ رہا۔ کرونا نے سنا تو اسے بہت رنج ہوا۔

چند ہی مہینوں کے بعد اڑیسہ میں قحط نے آفت برپا کردی کانگریس نے قحط زدوں کی امداد کے لیے ایک مشن تیار کیا۔ اسی زمانہ میں یونیورسٹی نے طلباء کو تاریخی یادگاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے لنکا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کرونا نے لکھا تم اڑیسہ جاؤ۔ مگر پرکاش کا دل لنکا کی جانب مائل تھا۔ وہ کئی دن تک اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر لنکا کی کشش غالب آئی۔ کرونا کو معلوم ہوا تو اسے بے انتہا صدمہ ہوا۔ مگر جب پرکاش نے لکھا۔ "اماں! میں یہ سب تیاریاں قومی خدمت کے لیے کر رہا ہوں۔ کیونکہ خدمت کے لیے یونیورسٹی کی ڈگریوں ہی کی قدر ہوتی ہے۔ دلسوزی اور لگن کوئی نہیں دیکھتا۔ تو کرونا کو تشفی ہو گئی۔

اسی سال پرکاش اول درجہ میں ایم۔ اے ہوا اور یونیورسٹی میں اول آیا۔

(4)

یونیورسٹی کھلتے ہی پرکاش کے نام یونیورسٹی کے رجسٹرار کا خط پہنچا۔ انھوں نے پرکاش کو انگلینڈ جاکر تعلیم کی تکمیل کے سرکاری وظیفہ منظور ہونے کی خبر دی تھی۔ پرکاش خط لیے ہوئے مجنونانہ مسرت سے ماں کے پاس دوڑا اور بولا۔ اماں! مجھے انگلینڈ جاکر پڑھنے کے لیے سرکاری وظیفہ ملا ہے۔

کرونا نے بے اعتنائی سے کہا۔ تو تمھارا کیا ارادہ ہے؟

پرکاش نے تعجب سے کہا :۔ ایسا موقع پاکر بھلا کون چھوڑتا ہے۔ اماں!

کرونا : تم تو قومی والنٹیروں میں بھرتی ہونے جارہے تھے۔

پرکاش : تو کیا آپ سمجھتی ہیں وہی ایک قومی خدمت ہے۔ میں انگلینڈ سے آکر بھی تو قومی کام کر سکتا ہوں اور اماں سچ پوچھو تو ایک مجسٹریٹ قوم کی جتنی

خدمت کر سکتا ہے۔ اتنی ایک ہزار والنٹیر بھی نہیں کر سکتے۔ میں سول
سروس کے امتحان میں بیٹھوں گا اور مجھے یقین ہے کہ کامیاب ہو جاؤں گا۔
کرونا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ تو تم بھی مجسٹریٹ ہو جاؤ گے۔
پرکاش نے مباحثہ کے انداز سے کہا۔ قومی درد رکھنے والا مجسٹریٹ کانگریس کے
ایک ہزار پریسڈنٹوں سے زیادہ قومی خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے کام کی اخباروں میں
تعریفیں نہ ہوں گی۔ اس کی تقریروں پر تالیاں نہ بجیں گی۔ اس کی گاڑیاں جہلانہ
کھینچیں گے نہ یونیورسٹی کے طلباء اسے سپاسنامے پیش کریں گے۔ لیکن حقیقی معنوں میں
جو خدمت وہ کرسکتا ہے۔ وہ دوسرا نہیں کر سکتا۔ وہ قوم کا خاموش بے غرض
خادم ہے۔

کرونا : لیکن یہی مجسٹریٹ تو قومی خدمت کرنے والوں کو سزائیں دیتے ہیں ان پر
گولیاں چلاتے ہیں۔

پرکاش نے کچھ خفیف ہو کر کہا۔ یہ تو مجسٹریٹ کی طبیعت ہے۔ اگر اس کے
دل میں قومی درد ہے۔ تو وہ ملائمت سے وہی کام کر سکتا ہے۔ جو دوسرے گولیاں چلا
کر بھی نہیں کر سکتے۔

کرونا : میں یہ نہ مانوں گی۔ سرکار اسے کوئی ایسا کام نہ کرنے دے گی۔ جس سے
سرکار کی شان میں کوئی فرق آئے۔ اگر مجسٹریٹ اس کی مرضی کے مطابق
کام نہ کرے گا تو وہ مجسٹریٹ نہ رہے گا۔ وہ ہندوستانی مجسٹریٹ ہی تو تھا جس
نے تمھارے بابوجی کو ذرا سی بات پر تین سال کی قید ٹھونک دی تھی۔ اور
اس نے آخر ان کی جان ہی لے کر چھوڑی۔ بیٹا تم میری اتنی بات مان لو۔
سرکاری عہدوں پر نہ گرو۔ مجھے یہ منظور ہے کہ تم موٹا کھا کر اور موٹا پہن
کر اپنے بھائیوں کی کچھ خدمت کرو۔ بجائے اس کے کہ تم حاکم بن جاؤ اور
شان سے زندگی بسر کرو۔ یہ سمجھ لو کہ جس دن تم حاکم کی کرسی پر
بیٹھو گے۔ اسی دن تمھارا دماغ حاکموں کا ہو جائے گا۔ تم کوئی ایسی کارگزاری
دکھانی چاہو گے کہ افسروں کی نگاہ میں تمھاری نیک نامی ہو۔ ترقی ہو جس کا
کھاؤ گے اس کا گاؤ گے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔

پرکاش: تو آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا پھروں؟
کرونا: اگر ٹھوکر کھانے سے آتما آزاد رہ سکتی ہے تو میں یہ کہوں گی۔ ٹھوکریں کھانا اچھا ہے۔

پرکاش نے جواب نہ دیا۔ اٹھ کر باہر چلا گیا اور اسی غصہ میں رجسٹرار کو لکھ دیا۔ مجھے انگلینڈ جانا منظور نہیں ہے۔ مگر اس دن سے اس کی زندہ دلی رخصت ہوگئی۔ مغموم متفکر اپنے کمرہ میں پڑا رہتا۔ نہ کہیں گھومنے جاتا۔ نہ کسی سے ملتا۔ منہ لٹکا کر گھر میں آتا۔ دو چار لقمے کھاتا اور باہر چلا جاتا۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر گیا۔ نہ چہرہ پر وہ سرخی رہی نہ تازگی۔ معلوم ہوتا تھا برسوں کا مریض ہے۔ ہنسنا بولنا سب چھوٹ گیا۔ گویا اس انکاری خط کے ساتھ اس کی حرارت، ساری زندگی رخصت ہوگئی۔ کرونا اس کا دل بہلانا چاہتی۔ اس غم کو بھلا دینا چاہتی مگر سب بے سود۔

آخر ایک دن اس نے پرکاش سے کہا۔ بیٹا! اگر تم نے ولایت جانے کی ٹھان ہی لی ہے تو جاؤ میں منع نہ کروں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں ناحق روکا۔ میں نے تو اس خیال سے منع کیا تھا کہ تمھیں قومی خدمت کرتے دیکھ کر تمھارے بابوجی کی آتما خوش ہوگی۔ یہی ان کی آخری وصیت تھی۔ مگر جب تمھیں اتنا صدمہ ہے تو نہ روکوں گی۔

پرکاش نے ترشی سے جواب دیا۔ اب تو انکاری خط لکھ چکا۔ کوئی دوسرا آدمی چن لیا گیا ہوگا۔ اب کس منہ سے پھر درخواست کروں اور پھر کرنا ہی کیا ہے۔ جب آپ کی مرضی ہے کہ گاؤں گاؤں کی خاک چھانوں، تو وہی سہی۔

کرونا کا غرور پامال ہوگیا۔ بولی! مجھے یقین ہے ابھی جگہ خالی ہوگی۔ کل لکھ دو۔ اب جانے کو تیار ہوں۔

پرکاش نے چڑ کر کہا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اماں! لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ جس طرح آپ کی منشا ہوگی اسی طرح زندگی بسر کروں گا۔

کرونا نے منہ پھیر کر کہا۔ یہ میری یا کسی غیر کی منشا کی بات نہیں ہے۔ یہ خیال تو تمھارے دل میں خود بخود پیدا ہونا چاہیے تھا۔ جب تم نے میری منشا سے، مجھ

پر احسان جتاکر اپنے دل پر جبر کر کے مجھے اپنے راستہ کا کانٹا سمجھ کر، والینٹروں میں نام لکھا بھی لیا تو کیا فائدہ؟ تم آج ہی اپنے رجسٹرار کو لکھ دو۔

پرکاش :اب نہیں لکھ سکتا۔

کرونا : اس سے کیا فائدہ کہ نہ ادھر کے رہو نہ ادھر کے۔ بے دل قومی کارکن سے سرگرم سرکاری افسر کہیں اچھا۔

پرکاش : مجبوری ہے۔

کرونا نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ ذرا دیر میں کپڑے بدل کر باہر چلی گئی۔ پرکاش نے دیکھا وہ کہیں جارہی ہے۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ کرونا کے لیے باہر آنا جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مگر جب شام ہوگئی اور وہ نہ لوٹی تو پرکاش کو اندیشہ ہوا۔ وہ افسوس کرنے لگا کہ میں نے اماں سے پوچھا کیوں نہیں کہاں جارہی ہو؟ جوں جوں رات گزرنے لگی۔ اس کا اندیشہ خوف کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اب اسے یاد آیا۔ ماں کے ہاتھ میں چھوٹا بیگ بھی تھا۔ اگر کہیں قریب ہی گئی تو بیگ کیوں لے گئی؟ تو کیا کہیں دور چلی گئی۔ آخر گئی تو کہاں۔جب وہ 10 بجے تک نہ لوٹی۔ تو پرکاش کو ایک دوسرا ہی خوف پیدا ہوا وہ گھر سے نکلا اور سیدھا دریا کی طرف جا پہنچا۔ مگر وہاں گہرا سناٹا تھا۔ اس نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر کئی بار کانپتی ہوئی آواز سے پکارا۔ اماں! اماں!! مگر لہروں کے ماتمی راگ کے سوا اور کوئی آواز نہ آئی۔ وہیں بیٹھ کر وہ رونے لگا۔ مگر اسے پھر خیال ہوا کہیں اماں آنہ گئی ہوں۔

اسے گھر پر نہ دیکھ کر گھبرا نہ رہی ہوں۔ وہ فوراً اٹھا اور تیزی سے قدم اٹھایا۔ گھر چلا۔ امید وبیم سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر کرونا ابھی تک نہ لوٹی تھی۔

پرکاش نے ساری رات بیٹھے بیٹھے کاٹی۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے۔ اپنی ضد اور ماں کی دل شکنی پر صدمہ ہوتا۔ اپنی بے حسی پر غصہ آتا۔ میں نے کیوں اماں کی بات نہ مانی؟ کیوں دولت و ثروت کے لیے ان کی تمناؤں کا خون کیا؟ اس نے ارادہ کیا۔ اب بھول کر بھی انگلینڈ کا نام نہ لوں گا۔ اس طرح ہنس کھیل کر زندگی بسر کروں گا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ علی الصباح پرکاش ماں کی تلاش میں نکل ہی رہا تھا کہ اسے سامنے آتے دیکھا۔ چہرہ زرد، دل بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی اس

کا سہاگ اٹھ گیا ہے۔ گویا دنیا میں اب اس کے لیے کچھ نہیں رہا۔ گویا وہ دریا کے کنارے کھڑی اپنی لدی ہوئی ناؤ کو ڈوبتے دیکھ رہی ہے اور کچھ کر نہیں سکتی۔

پرکاش نے دوڑ کر پوچھا۔ اماں کہاں چلی گئی تھیں۔ بڑی دیر لگائی۔ میں ساری رات تمھارا انتظار کرتا رہا۔ دریا کے کنارے دوڑا گیا۔ ادھر ادھر چاروں طرف تلاش کیا۔ کہاں گئی تھیں تم؟

کرونا نے جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا یونیورسٹی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ پرکاش نے تعجب سے اسے کھول کر پڑھا۔ مسرت کی سرخی چہرہ پر دوڑ گئی۔

بولا۔ یہ تمھیں کہاں مل گیا اماں؟

کرونا : اسی کے لیے تو گئی تھی۔

پرکاش : توکیا تم نے رجسٹرار سے ملاقات کی؟

کرونا : اور کیا کرتی۔

پرکاش : گئیں کس ٹرین سے؟ اس وقت گاڑی کہاں ملی؟

کرونا : موٹر پر گئی۔

پرکاش : پچاس میل کا سفر کر ڈالا۔ رجسٹرار نے کیا کہا؟

کرونا : کچھ نہیں۔ ابھی تک کسی دوسرے آدمی کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔ یہ خط لکھ دیا۔

پرکاش نے افسردہ خاطر ہو کر کہا۔ جب تم نہیں چاہتیں کہ میں جاؤں تو پھر کیوں بھیج رہی ہو؟

کرونا : اس لیے کہ تم جانا چاہتے ہو۔ میں تمھارا یہ رنجیدہ چہرہ نہیں دیکھ سکتی۔ اپنی زندگی کے بیس سال تمھارے اوپر نثار کر دیے۔ تمھارے لیے خوشیوں کے ہار گوندھتی تھی۔ تمھارے لیے دعاؤں کے تھال سجاتی تھی۔ اب ان آنکھوں سے تمھاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتی۔ تمھارا سفر مبارک ہو۔ جب تک زندہ رہوں گی تمھیں دعائیں دوں گی۔ جب تم نہ تھے تب بھی روتی تھی۔ تم ہوئے تب بھی روتی تھی۔ تم نہ رہوگے تب بھی روؤں گی۔ میرا تو جنم ہی رونے کے لیے ہوا ہے۔ کرونا اور کچھ نہ کہہ سکی۔ رقت نے اس کی زبان بند کر دی۔

اسی دن سے پرکاش سفر کی تیاریوں میں مشغول ہوگیا۔ نئے نئے سوٹ بنوائے۔ ضروری اور غیر ضروری صدہا چیزیں خریدیں۔ کرونا کے پاس جو کچھ تھا۔ وہ سب کا سب خرچ ہوگیا۔ قرض کی نوبت آئی۔ مگر پرکاش اپنی دھن میں مست تھا۔ کرونا کی سرخ آبگوں آنکھیں اور تمتماتا ہوا چہرہ اسے نظر نہ آتا۔ اس ایک ہفتہ میں وہ کتنی نحیف و ضعیف ہوگئی ہے۔ اس کے بالوں پر کتنی سفیدی آگئی ہے۔ اس کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ یہ اسے کچھ نظر نہ آتا۔

آخر روانگی کا دن آیا۔ پرکاش کو احباب نے رخصتی دعوت دی۔ وہ تو دعوتیں کھانے اور دوستوں سے ملنے ملانے میں منہمک تھا اور کرونا اپنے شوہر کی یادگاروں پر اپنا غم و غصہ اتار رہی تھی۔ ان کی گاڑھے کی چادریں کھدر کے کرتے اور پائجامہ اور لحاف ابھی تک صندوقوں میں حفاظت سے رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہر سال دھوپ میں سکھائے جاتے اور جھاڑ کر رکھ دیے جاتے تھے۔ کرونا نے آج پھر ان کپڑوں کو نکالا۔ مگر سکھا کر رکھنے کے لیے نہیں بلکہ غریبوں کو تقسیم کرنے کے لیے۔ وہ آج شوہر سے ناراض ہے۔ وہ لٹیا ڈورا اور چھڑی جو پرتاب کی مونس اور تنہائی کی رفیق تھی اور جن کی آج بیس سال سے کرونا پرستش کرتی چلی آتی تھی بڑی بے دردی سے آنگن میں پھینک دی گئیں۔ وہ جھولی جو ہمیشہ پرتاب کے کندھوں پر رہتی تھی۔ آج کوڑے میں ڈال دی گئی۔ وہ تصویر جس کے سامنے کرونا بیس سال سے بلا ناغہ سر جھکاتی اور پھول چڑھاتی تھی۔ آج زمین پر پڑی ہوئی ہے۔ شوہر کی کوئی یادگار اب وہ گھر میں رکھنا نہیں چاہتی۔ اس کا دل غم و غصہ سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ اور شوہر کے سوا وہ کس پر اپنا غصہ اتارے؟ کون اس کا اپنا ہے؟ وہ کس سے اپنا درد کہے، کسے اپنی چھاتی چیر کر دکھائے۔ وہ ہوتے تو کیا آج پرکاش غلامی کی زنجیر گلے میں ڈال کر یوں خوش ہوتا۔ وہ کیوں نہیں ہیں، کیوں اپنی روحانی اور جسمانی طاقت سے پرکاش کا دل نہیں پھیر دیتے؟ دکھیا کو کون سمجھائے؟

(5)

کرونا زندہ تھی۔ مگر اسے اب کوئی علاقہ دنیا سے نہ تھا۔ اس کا چھوٹا سا سنسار خواب کی طرح پریشان ہو گیا تھا۔ وہ سنہری تمنائیں اب حسرت کی تاریکی میں فنا

ہو چکی تھیں۔ جس روشنی کو وہ سامنے دیکھ کر زندگی کی اندھیری رات میں بھی دل میں امیدوں کا خزانہ لیے آگے بڑھی چلی جاتی تھی۔ وہ بجھ گئی اور وہ خزانہ لٹ گیا۔ اب نہ اس کی کوئی منزل تھی اور نہ منزل پر پہنچنے کی ضرورت۔ جن گایوں کو وہ دونوں وقت اپنے ہاتھوں سے روٹیاں کھلاتی اور سہلاتی تھی۔ وہ اب کھونٹوں پر کھڑی مشتاق نگاہوں سے دروازہ کی طرف تکتی رہتی تھیں۔ بچھڑوں کو گلے سے لگا کر چمکارنے والا اب کوئی نہ تھا۔ کس کے لیے مسکا نکالے۔ کس کے لیے مکھن بنائے؟ کھانے والا کون تھا؟ اپنے اس چھوٹے سے سنسار کو کرونا نے اپنے ہی اندر سمیٹ لیا تھا۔

مگر ایک ہفتہ میں کرونا کے مزاج نے پھر رنگ بدلا۔ اس کا وہ چھوٹا سا سنسار پھیلتے پھیلتے عالمگیر ہوگیا۔ جس لنگر نے کشتی کو ساحل سے ایک مرکز پر باندھ رکھا تھا وہ اکھڑ گیا۔ اب کشتی سمندر کی وسیع فضا میں تیرے گی۔ چاہے وہ غضب ناک موجوں کا لقمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کرونا ایک دن دروازہ پر آ بیٹھی اور محلے بھر کے لڑکوں کو جمع کر کے انھیں دودھ پلایا۔ دوپہر تک مکھن نکالنے میں لگی رہی۔ اور یہ مکھن محلے کے لڑکوں نے کھایا۔ پھر کھانا پکانے بیٹھی اور کئی طرح کے کھانے پکائے۔ یہ سب کا سب کتوں نے کھایا۔ اب یہ ہی اس کا روز کا وطیرہ ہو گیا۔

چڑیاں اور کتے بلّیاں اور چیونٹیاں اور محلے کے لڑکے بالے سب اس کے اپنے ہو گئے محبت کا وہ دروازہ اب کسی کے لیے بند نہ تھا۔

ایک دن پرکاش کا خط آیا۔ کرونا نے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ پھر چند منٹوں کے بعد اسے اٹھا کر پھاڑ ڈالا۔

مگر جب آسمان کا جوگی اپنی کٹی میں دھونی رما کر بیٹھا اور آسمانی ہستیاں اپنا قصہ غم سنانے کے لیے جمع ہوئیں تو کرونا اس خط کو پڑھنے کے لیے بے قرار ہو اٹھی۔

اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ پرکاش تیرا کون ہے؟ مجھے اس سے کیا سروکار! وہ کہیں رہے اس سے کیا مطلب؟ ہاں پرکاش میرا کون ہے؟ دل نے جواب دیا پرکاش تیرا سب کچھ ہے۔ وہ اس لافانی محبت کی یادگار ہے۔ جس سے تو ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔ وہ تیری جان کی جان ہے۔ تیری روح کی روح ہے۔ کرونا اس خط کے پرزوں

کو جمع کرنے لگی۔ گویا اس کی جان بکھر گئی ہو۔ ایک ایک ٹکڑا اسے اپنی کھوئی ہوئی الفت کا نقش قدم سا معلوم ہوتا تھا۔ جب سارے منتشر پرزے جمع ہو گئے تو وہ چراغ کے سامنے بیٹھ کر انھیں جوڑنے لگی۔ جیسے کوئی حسرت زدہ دل یاد ہائے شیریں کے شکستہ تاروں کو جوڑ رہا ہو۔

ہائے ری ماتا! وہ برہمن ساری رات اس خط کو جوڑنے میں لگی رہی۔ خط دونوں طرف سے لکھا ہوا تھا۔ اس لیے عبارت کا مربوط ہونا اور بھی مشکل! کوئی لفظ کوئی جملہ بیچ میں غائب ہوجاتا اور راستہ میں ایک خلیج سی حائل ہوجاتی۔ اس ٹکڑے کو وہ پھر تلاش کرنے لگتی۔ ساری رات گزر گئی۔ مگر خط ناتمام تھا۔ دن چڑھا محلے کے لڑکے مکھن دودھ کے اشتیاق میں، آکر جمع ہوگئے۔ کتوں اور بلیوں نے آسن جمائے۔ چڑیاں آنگن میں پھدکنے لگیں۔ کوئی اولتی پر بیٹھی۔ کوئی چبوترے پر۔ مگر کرونا کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔ جیسے بچہ اپنی ماں کو پاکر ساری دنیا کے کھلونے اور مٹھائیاں اور میوے اس گود پر نثار کر دے۔ دو پہر ہوا کرونا نے سر نہ اٹھایا۔ نہ بھوک تھی، نہ پیاس، شام ہوگئی۔ مگر وہ خط ابھی تک نامکمل تھا۔ خط کا منشاء کچھ کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔

پرکاش کا جہاز... سے... جا رہا ہے۔ اس کے دل میں... اٹھا ہوا ہے۔ لیکن پیاس سے تڑپتے ہوئے آدمی کی پیاس کیا اوس سے بجھ سکتی ہے۔

کرونا اپنے لخت جگر کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو پڑھنا اور اسے دل پر نقش کر لینا چاہتی تھی۔ اس طرح تین دن گزر گئے۔

شام ہوگئی تھی۔ تین دن کی جاگی آنکھیں ذرا جھپک گئیں۔ کرونا نے دیکھا ایک وسیع کمرہ ہے۔ اس میں کرسیاں اور میزیں لگی ہیں۔ بیچ میں ایک اونچے چبوترہ پر کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ کرونا نے اسے غور سے دیکھا وہ پرکاش تھا۔ ایک لمحہ میں ایک دست و پابہ زنجیر قیدی چبوترے کے سامنے لایا گیا۔ بالکل خستہ حال، جاں بہ لب، یہ پرتاب تھا۔ کرونا کی آنکھیں کھل گئیں۔ آنسو جاری ہو گئے۔ اس خط کے ٹکڑوں کو پھر سمیٹ دیا اور اس تودے کو چراغ کی نذر کر دیا۔ ایک شعلہ اٹھا اور ایک لمحہ میں اس کی راکھ کی ایک چٹکی کے سوا کچھ نہ رہا۔ یہ اس ماتا کی چتا تھی۔ جو ایک اضطراب و انتشار بن کر اس کے دل میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ اُسی ایک چٹکی راکھ میں اس کا

گڑیوں والا بچپن، اس کی غم نصیب جوانی، اس کی پر تمنا بیوگی، مدفون ہو گئی!!

صبح کو لوگوں نے دیکھا تو چڑیا پنجرے سے اڑ چکی تھی۔ پنجرا خالی پڑا ہوا تھا۔ پرتاب کی تصویر ابھی تک اس سینہ سے چمٹی ہوئی تھی۔ جس کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔

اور پرکاش کا جہاز یورپ چلا جا رہا تھا۔

(یہ افسانہ اسی عنوان سے لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ 'مادھوری' کے جولائی 1929 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ 'مان سرودور' 1 میں شامل ہے۔ اردو میں 'واردات' مجموعہ میں شامل ہے۔)

قانونی کمار

مسٹر قانونی کمار ایم.ایل.اے. اپنے آفس میں سماچار پتروں پتریکاؤں اور رپورٹوں کا ایک ڈھیر لیے بیٹھے ہیں۔ دیش کی چنتاؤں میں ان کی دیہہ استھول ہوگئی۔ سدیو دیش ادّھار کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔ سامنے پارک ہے۔ اس میں کئی لڑکے کھیل رہے ہیں۔ کچھ پردے والی استریاں بھی ہیں فیسنگ کے سامنے بہت سے بھکھ منگے بیٹھے ہیں، ایک چائے والا ایک ورکھش کے نیچے چائے بیچ رہا ہے۔

قانونی کمار (آپ ہی آپ) دیش کی دشا کتنی خراب ہوتی جاتی ہے گورنمنٹ کچھ نہیں کرتی۔ بس دعوتیں کھانا اور موج اُڑانا اس کا کام ہے۔ (پارک کی اُور دیکھ کر) آہ۔ یہ کومل کمار سگریٹ پی رہے ہیں۔ شوک۔ مہاشوک۔ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ کوئی اس کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ تمباکو کتنی زہریلی چیز ہے۔ بالکوں کو اس سے کتنی ہانی ہوتی ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ (تمباکو کی رپورٹ دیکھ کر) اُوف۔ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جتنے بالک اپرادھی ہوتے ہیں ان میں 75 پرتی سیکڑے سگریٹ باز ہوتے ہیں۔ بڑی بھینکر دشا ہے۔ ہم کیا کریں۔ لاکھ سمجھائیں کوئی سنتا ہی نہیں۔ اس کو قانون سے روکنا چاہیے۔ نہیں تو انرتھ ہوجائے گا۔ (کاغذ پر نوٹ کرتا ہے) تمباکو بہشکار بل پیش کروں گا۔ کونسل کھلتے ہی یہ بل پیش کردینا چاہیے۔ ایک چھن کے بعد پھر پارک کی اُور تاکتا ہے، اور پردے دار مہیلاؤں کو گھاس پر بیٹھے دیکھ کر لمبی سانس لیتا ہے غضب ہے، غضب ہے، کتنا گھور انیائے۔ کتنا پاشوک ویوہار۔ یہ کوملانگی سندریاں چادر میں لپٹی ہوئی کتنی بھدی کتنی پھوہڑ معلوم ہوتی ہے۔ تبھی تو دیش کا یہ حال ہو رہا ہے۔ (رپورٹ دیکھ کر) استریوں کی مرتیو سنکھیا بڑھ رہی ہے۔ تپ دق اچھلتا چلا آتا ہے، پرسوت کی بیماری آندھی کی طرح چڑھی آتی ہے اور ہم ہیں کہ آنکھیں بند کیے پڑے ہیں۔ بہت جلدی رشیوں کی یہ بھومی، یہ ویر۔ پرسوِنی جتنی رساتل کو چلی جائے گی، اس کا کہیں نشان بھی نہ رہے گا۔ گورنمنٹ کو کیا فکر۔

لوگ کتنے پاشان ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے یہ اتیاچار دیکھتے ہیں اور ذرا بھی نہیں چونکتے۔ یہ مرتیو کا شیتھلیہ ہے۔ یہاں بھی قانونی ضرورت ہے۔ ایک ایسا قونون بننا چاہیے جس سے کوئی استری پردے میں نہ رہ سکے۔ اب سے آگیا ہے کہ اس وشے میں سرکار قدم بڑھاوے۔ قانون مدد کے بغیر کوئی سودھار نہیں ہو سکتا اور یہاں قانونی مدد جتنی ضرورت ہے، اتنی اور کہاں ہو سکتی ہے ماتاؤں پردیش کا بھوشیہ اُولمبت ہے۔ پردا ہٹاؤ بل پیش ہونا چاہئے جانتا ہوں بڑا وِرودھ ہوگا۔ لیکن گورنمنٹ کو ساہس سے کام لینا چاہیے۔ ایسے پُن سک وِرودھ کے بھئیے سے اُدھار کے کاریہ میں بادھا نہیں پڑنی چاہیے۔ (کاغذ پر نوٹ کرتا ہے) یہ بل بھی اسمبلی کے کھلتے ہی پیش کر دینا ہوگا۔ بہت ولمب کی گنجائش نہیں ہے۔ ورنہ مریض کا انت ہو جائے گا۔ (مسودا بنانے لگتا ہے۔ بیتو اور اُدشیہ سہسا ایک بھکشک (بھکاری) سامنے آکر پکارتا ہے۔ جے ہو سرکار کی۔ لکشمی پھولیں پھلیں۔

قانونی : ہٹ جاؤ، یوں سور کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟

بھکشک : بڑا دھرم ہوگا سرکار مارے بھوکھ کے آنکھوں تلے اندھیرا۔

قانونی : چپ رہو سور ہٹ جاؤ سامنے سے ابھی نکل جاؤ، بہت دور نکل جاؤ۔ (مسودا چھوڑ کر پھر آپ ہی آپ) یہ رشیوں کی بھومی آج بھکشکوں کی بھومی ہو رہی ہے۔ جہاں دیکھیے۔ وہاں ریوڑ کے ریوڑ اور دَل کے دَل بھکاری۔ یہ گورنمنٹ کی لاپرواہی کی برکت ہے۔ انگلینڈ میں کوئی بھکشک بھیک نہیں مانگ سکتا۔ پولس پکڑ کر کال کوٹھری میں بند کردے۔ کسی سبھ دیش میں اتنے بھکھ منگے نہیں ہیں۔ یہ پرادھین غلام بھارت ہے۔ جہاں ایسی باتیں اس بیسویں صدی میں بھی سمبھو ہے۔ اُف کتنی شکتی کا اَپ وِییہ ہورہا ہے۔ (رپورٹ نکال کر) اُوہ۔ 50 لاکھ 50 لاکھ آدمی کیول بھکشا مانگ کر گزر کرتے ہیں اور کیا ٹھیک ہے کہ سنکھیا اس کی دگنی نہ ہو۔ یہ پیشہ لکھانا کون پسند کرتا ہے۔ ایک کروڑ سے کم بھکاری اس دیش میں نہیں ہیں۔ یہ تو بھکاریوں کی بات ہوئی جو دوار دوار جھولی لیے گھومتے ہیں۔ اس کے اپرانت ٹیکادھاری کوپین دھاری اور جٹادھاری سموادائے بھی تو ہے، جن کی سنکھیا کم سے کم دو کروڑ ہوگی۔ جس

دیش میں اتنے حرام خور مفت کا مال اُڑانے والے دوسروں کی کمائی پر موٹے ہونے والے پرانی ہوں۔ اس کی دشا کیوں نہ اتنی ہین ہو۔ آشچر یہ یہی ہے کہ اب تک یہ دیش جیوت کیسے ہے؟ (نوٹ کرتا ہے۔) ایک بل کی سخت ضرورت ہے پرنتو پیش کرنا چاہیے۔ نام ہو بھکھ منگا بہشکار بل۔ خوب جوتیاں چلیں گی، دھرم کے سوترادھار خوب ناچیں گے، خوب گالیاں دیں گے، گورنمنٹ بھی کنی کاٹے گی مگر سودھار کا مارگ تو کنٹکا کیرن ہے ہی۔ تینوں ہی بل میرے نام سے ہوں، پھر دیکھئے کیسی کھلبلی مچتی ہے۔

(آواز آتی ہے۔ چائے گرم۔ چائے گرم۔ مگر گراہکوں کی سنکھیا بہت کم ہے۔ قانونی کمار کا دھیان چائے والے کی اُور آکر شِت ہو جاتا ہے۔)

قانونی (آپ ہی آپ) : چائے والے کی دوکان پر ایک بھی گراہک نہیں، کیسا مورکھ دیش ہے۔ اتنی بل وردھک وستو اور گراہک کوئی نہیں۔ سبھیہ دیشوں میں پانی کی جگہ چائے پی جاتی ہے۔ (رپورٹ دیکھ کر) انگلینڈ والے مورکھ نہیں ہیں۔ ان کا آج سنسار پر آدھپتیہ ہے، اس میں چائے کا کتنا بڑا بھاگ ہے، کون اس کا انومان کر سکتا ہے؟ یہاں بے چارہ چائے والا کھڑا ہے اور کوئی اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ چین والے چائے پی کر سوادھین ہوگئے، مگر ہم چائے نہ پئیں گے۔ کیا عقل ہے۔ گورنمنٹ کا سارا دوش ہے۔ کیٹوں سے بھرے دودھ کے لیے اتنا شور مچتا ہے۔ مگر چائے کو کوئی نہیں پوچھتا، جو کیٹوں سے خالی انتجک اور پشٹ کارک ہے۔ سارے دیش کی متی ماری گئی ہے۔ (نوٹ کرتا ہے) گورنمنٹ سے پرشن کرنا چاہئے۔ اسمبلی کھلتے ہی پرشنوں کا تانتا باندھ دوں گا۔

پرشن : کیا گورنمنٹ بتائے گی کہ گت پانچ سالوں میں بھارت ورش میں چائے کی کھپت کتنی بڑھی ہے اور اس کا سروسادھارن میں پرچار کرنے کے لیے گورنمنٹ نے کیا قدم لیے ہیں؟

(ایک رمنی کا پرویش) کٹے ہوئے کیش آڑی مانگ پارسی ریشمی ساڑی، کلائی پر گھڑی آنکھوں پر عینک پاؤں میں اونچی ایڑی کا لیڈی شو، ہاتھ میں ایک بٹوا لٹکائے ہوئے، ساڑی میں بروچ ہے گلے میں موتیوں کا ہار۔

قانونی : (ہاتھ بڑھاکر) ہلو میسز بوس۔ آپ خوب آئیں، کہیے کدھر کی سیر ہو رہی ہے؟ اب کی تو الوک میں آپ کی کویتا بڑی سندر تھی۔ میں تو پڑھ کر مست ہو گیا۔ اس ننھے سے ہردے میں اتنے بھاؤ کہاں سے آجاتے ہیں، مجھے آشچریہ ہوتا ہے۔ شبد ونیاس کی تو آپ رانی ہیں۔ ایسے ایسے چوٹ کرنے والے بھاؤ آپ کو کیسے سوجھ جاتے ہیں۔

مسز بوس : دل جلتا ہے تو اس میں آپ سے آپ دھوئیں کے بادل نکلتے ہیں۔ جب تک استری سماج پر پروش کا اتیاچار رہے گا ایسے بھاؤ کی کمی نہ رہے گی۔

قانونی : کیا ادھر کوئی نئی بات ہو گئی؟

بوس : روز ہی ہوتی رہتی ہے۔ میرے لیے ڈاکٹر بوس کی آگیاں نہیں کہ کسی سے ملنے جاؤ یا کہیں سیر کرنے جاؤ۔ اب کی کیسی گرمی پڑی ہے کہ سارا رکت جل گیا۔ پر میں پہاڑوں پر نہ جا سکی۔ مجھ سے یہ اتیاچار یہ غلامی نہیں سہی جاتی۔

قانونی : ڈاکٹر بوس خود بھی تو پہاڑوں پر نہیں گئے۔

بوس : وہ نہ جائیں، انھیں دھن کی ہائے ہائے پڑی ہے۔ مجھے کیوں اپنے ساتھ لیے مرتے ہیں۔ وہ کلب بس نہیں جانا چاہتے۔ ان کا سے روپے اُگلتا ہے، مجھے کیوں روکتے ہیں۔ وہ کھدر پہنیں، مجھے کیوں پسند کے کپڑے پہننے سے روکتے ہیں۔ وہ اپنی ماتا اور بھائیوں کے غلام بنے رہیں۔ مجھے کیوں ان کے ساتھ روکر دن کاٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوسکتا۔ امریکہ میں ایک کٹووچن کہنے پر سمبندھ وچھید ہوجاتا ہے پروش ذرا دیر میں گھر آیا اور استری نے طلاق دیا۔ وہ سوادھینتا کا دیش ہے، وہاں لوگوں کے وچار سوادھین ہیں یہ غلاموں کا دیش ہے، یہاں ہر ایک بات میں اسی غلامی کی چھاپ ہے۔ میں اب ڈاکٹر بوس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ ناکوں دم آگیا۔ اس کا اتر دائتو انھیں لوگوں پر ہے۔ جو سماج کے نیتا اور ودھاپک بنتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ استریوں کو غلام بنا کر سوادھین ہو جائیں، تو یہ انہونی بات ہے جب تک طلاق کا قانون نہ جاری ہوگا، آپ کا سواراجیہ آکاش کسم ہی رہے گا۔ ڈاکٹر بوس کو آپ جانتے ہیں، دھرم میں ان کی کتنی شردھا ہے۔ خبط

کہیے۔ مجھے دھرم کے نام سے گھرنا ہے۔ اسی دھرم نے استری جاتی کو پروش کی داسی بنا دیا ہے۔ میرا بس چلے تو میں سارے دھرم کی پوتھیوں کو اٹھا کر پرنالے میں پھنک دوں۔
میسز ایئر کا پرویش۔ گورا رنگ، اونچا قد، اونچا گاؤن، گولی بانڈی کی سی ٹوپی، آنکھوں پر عینک چہرے پر پاؤڈر، گالوں اور ہونٹوں پر سرخ پنٹ ریشمی جرابیں اور اونچی ایڑی کے جوتے۔)
قانونی : (ہاتھ بڑھا کر) ہلو میسیز ایئر۔ آپ خوب آئیں۔ کہئے کدھر کی سیر ہو رہی ہے۔ آلوک میں اب کی آپ کا لیکھ اتینت سندر تھا، میں تو پڑھ کر دنگ رہ گیا۔
میسز ایئر : (میسز بوس کی اور مسکرا کر) دنگ ہی تو رہ گئے یا کچھ کیا بھی ہم استریاں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیں لیکن پروش کا دل پسیجے گا
بوس : ستہ بالکل ستہ
ایئر : مگر اس پروش راج کا بہت جلد انت ہو جاتا ہے۔ استریاں اب قید میں نہیں رہ سکتی۔ مسٹر ایئر کی صورت میں نہیں دیکھنا چاہتی۔
(میسز بوس منہ پھیر لیتی ہیں)
قانونی : (مسکرا کر) مسٹر ایئر تو خوبصورت آدمی ہیں۔
لیڈی ایئر : ان کی صورت انھیں مبارک رہے۔ میں خوبصورت پرادھینتا نہیں چاہتی، بدصورت سوادھینتا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے اب کی زبردستی پہاڑ پر لے گئے۔ وہاں کی شیت مجھ سے نہیں سہی جاتی، کتنا کہا کہ مجھے مت لے جاؤ، مگر کسی طرح نہ مانے۔ میں کسی کے پیچھے پیچھے کتیا کی طرح نہیں چلنا چاہتی۔(میسز بوس اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی جاتی ہیں)
قانونی : اب مجھے معلوم ہو گیا کہ طلاق کا بل اسمبلی میں پیش کرنا پڑے گا۔
ایئر : خیر، آپ کو معلوم تو ہوا، مگر شاید قیامت میں۔
قانونی : نہیں میسز ایئر اب کی چھٹیوں کے بعد ہی یہ بل پیش ہوگا اور دھوم دھام کے ساتھ پیش ہوگا۔ بیشک پروشوں کا اتیاچار بڑھ رہا ہے جس پر تھا کا وردوھ

آپ دونوں مہیلائیں کر رہی ہیں، وہ اوشیہ ہندو سماج کے لیے گھاتک ہے۔
اگر ہمیں سبھیہ بننا ہے تو سبھیہ دیشوں کے پد چنھوں پر چلنا پڑے گا۔ دھرم
کے ٹھیکیدار چل پوں مچائیں گے، کوئی پرواہ نہیں۔ ان کی خبر لینا آپ دونوں
مہیلاؤں کا کام ہوگا۔ ایسا بنانا کہ منھ نہ دکھا سکے۔

لیڈی ایئر : پیشگی دھنیہ واد دیتی ہے۔ (ہاتھ ملاکر چلی جاتی ہے)

میسز بوس : (کھڑکی کے پاس سے آکر) آج اس کے گھر میں گھی کا چراغ جلے گا۔
یہاں سے سیدھے بوس کے پاس گئی ہوگی۔ میں بھی جاتی ہوں۔
(چلی جاتی ہے۔)

قانونی کمار ایک قانون کی کتاب اٹھا کر اس میں طلاق کی ویوستھا دیکھنے لگتا ہے
کہ مسٹر آچاریہ آتے ہیں۔ منھ صاف ایک آنکھ پر عینک خالی آدھے بانہہ کا شرٹ،
نیکر، اونی موزے، لمبے بوٹ، پیچھے ایک ٹیریئر کتا بھی ہے۔

قانونی : ہیلو مسٹر آچاریہ۔ آپ خوب آئے، آج کدھر کی سیر ہورہی ہے۔ ہوٹل
کا کیا حال ہے۔

آچاریہ : کتے کی موت مر رہا ہوں۔ اتنا بڑھیا بھوجن اتنا صاف ستھرا مکان ایسی
روشنی اتنا آرام پھر بھی مہمانوں کا دربھکش سمجھ میں نہیں آتا، اب کتنا نرخ
گھٹاؤں۔ ان داموں الگ گھر میں موٹا کھانا بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس پر
سارے زمانے کی جھنجھٹ، کبھی نوکر کا رونا، کبھی دودھ والے کا رونا، کبھی دھوبی
کا رونا، کبھی مہتر کا رونا، یہاں سارے جنجال سے مکت ہوجاتی ہے۔ پھر بھی
آدھے کمرے خالی پڑے ہیں۔

قانونی : یہ تو آپ نے بری خبر سنائی۔

آچاریہ : پچھم میں کیوں اتنا سکھ اور شانتی ہے، کیو اتنا پرکاش اوردھن ہے، کیوں اتنی
سوادھینتا اور بَل ہے۔ انھیں ہوٹلوں کے پرساد سے۔ ہوٹل پچھمی گورو کا
مکھیہ انگ ہیں۔ پچھمی سبھیتا کا پران ہیں۔ اگر بھارت کو اُنّتی کے شکھر پر دیکھنا
چاہتے ہیں، تو ہوٹل جیون کا پرچار کیجئے۔ اس کے سوا دوسرا اُپائے نہیں ہے۔
جب تک چھوٹی چھوٹی گھریلوں چنتاؤں سے مکت نہ ہوجائیں گے، آپ اُنّتی

کر ہی نہیں سکتے۔ راجوں رئیسوں کو الگ گھروں میں رہنے دیجیے، وہ ایک کی
جگہ دس خرچ کرتے ہیں۔ مدھیم شرینی والوں کے لیے ہوٹل کے پرچار میں
ہی سب کچھ ہے۔ ہم اپنے سارے مہمانوں کی فکر اپنے سر لینے کو تیار ہیں،
پھر بھی جنتا کی آنکھیں نہیں کھلتی۔ ان مورکھوں کی آنکھیں اس وقت تک نہ
کھلے گی، جب تک قانون نہ بن جائے۔

قانونی : (گمبھیر بھاؤسے) ہاں میں سوچ رہا ہوں۔ ضرور قانون سے مدد لینی چاہیے۔
ایک ایسا قانون بن جائے کہ جن لوگوں کی آئے 500 سے کم ہو، ہوٹلوں
میں رہے۔ کیوں؟

آچاریہ : آپ اگر یہ قانون بنوادیں تو آنے والی سنتان آپ کو اپنا مکت داتا سمجھے گی۔
آپ ایک قدم میں دیش کو 500 ورش کی منزل طے کرادیں گے۔

قانونی : تو لو اب کی یہ قانون بھی اسمبلی کھلتے ہی پیش کردوگا۔ بڑا شور مچے گا۔ لوگ
دیش دوروہی اور جانے کیا کیا کہیں گے پر اس کے لیے تیار ہوں۔ کتنادکھ ہوتا
ہے، جب لوگوں کو آہر کے دوار پر ٹلیالے کھڑا دیکھتا ہوں۔ استریوں کا جیون
تو نرک تلیہ ہو رہا ہے۔ صبح سے دس بارہ بجے رات تک گھر کے دھندوں
سے فرصت نہیں۔ کبھی برتن مانجو، کبھی بھوجن بناؤ کبھی جھاڑو لگاؤ۔ پھر
سواستھیہ کیسے بنے، جیون کیسے سکھی ہو، سیر کیسے کریں، جیون کے آمود پرمود
کا آنند کیسے اٹھائیں، اَدھیَن کیسے کریں؟ آپ نے خوب کہا ایک قدم میں
500 سالوں کی منزل پوری ہوئی جاتی ہے۔

آچاریہ : تو اب کی بل پیش کر دیجیے گا؟

قانونی : اوشیہ

(آچاریہ ہاتھ ملاکر چلا جاتا ہے۔)

قانونی کمار کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوکر، ہوٹل پرچار بل کا مسودا سوچ رہا ہے۔
سہسا پارک میں ایک استری سامنے سے گزرتی ہے۔ اس کی گود میں ایک بچہ ہے۔ دو
بچے پیچھے چل رہے ہیں اور اُدر کے ابھار سے معلوم ہوتا ہے کہ گربھوتی بھی
ہے۔ اس کا کرش شریر پیلا، مکھ اور مند گتی دیکھ کر انومان ہوتا کہ اس کا سواستھیہ بگڑا

ہوا ہے اور اس بھار کا وہن کرنا اسے کشٹ پرد ہے۔

قانونی کمار (آپ ہی آپ) اس سماج کا اس دیش کا اور اس جیون کا ستیاناش ہو، جہاں رمنیوں کو کیول بچہ دینے کی مشین سمجھا جاتا ہے۔ اس بے چاری کو جیون کا کیا سکھ۔ کتنی ہی ایسی بہنیں اسی جنجال میں پھنس 35-32 کی اوستھا میں جب کہ واستو میں جیون کو سکھی ہونا چاہئے۔ رگن ہوکر سنسار یا ترا سماپت کردیتی ہیں۔ ہابھارت۔ یہ وپتی تیرے سر سے کب ٹلے گی؟ سنسار میں ایسے ایسے پاشان ہردے منشیہ پڑے ہوئے ہیں۔ جنھیں اس دکھیاریوں پر ذرا بھی دیا نہیں آتی۔ ایسے اندھے ایسے پاشان، ایسے پاکھنڈی سماج کو، جو استری کو اپنی واسناؤ کی ویدی پر بلیدان کرتا ہے، قانون کے سوا اور کس ودھی سے سچیت کیا جائے؟ اور کوئی اُپائے ہی نہیں ہے۔ نربتیا کا جو دنڈ ہے، وہی دنڈ ایسے منشیوں کو ملنا چاہیے۔ مبارک ہوگا وہ دن جب بھارت میں اس ناشنی پرتھا کا انت ہو جائے گا۔ استری کا مرن بچوں کا مرن اور جس سماج کا جیون ایسی سنتانوں پر آدھارت ہو، اس مرن ایسے بدمعاشوں کو کیوں نہ دنڈ دیاجائے؟ کتنے اندھے لوگ ہیں۔ بیکاری کا یہ حال کہ بھرپیٹ کسی کو روٹیاں نہیں ملتیں، بچوں کو دودھ سوپن میں نہیں ملتا اور یہ اندھے ہیں کہ بچے پر بچے پیدا کرتے جاتے ہیں۔ سنتان نگرہ بل کی جتنی ضرورت ہے، اس دیش کو اتنی اور کسی قانون کی نہیں۔ اسمبلی کھلتے ہی یہ بل پیش کروں گا۔ پرلے ہوجائے گا۔ یہ جانتا ہوں، پر اور اُپائے ہی کیا ہے؟ دوبچوں سے زیادہ جس کے ہوں، اسے کم سے کم پانچ ورش کی قید، اس میں پانچ مہینے سے کم کال کوٹھری نہ ہو۔ جس کی آمدنی سو روپے سے کم ہو، اسے سنتان اپتی کا ادھیکار ہی نہ ہو۔ (من میں بل کے بعد کی اوستھا کا آنند لے کر) کتنا سکھ سے جیون ہوجائے گا۔ ہاں ایک دفعہ یہ بھی رہے کہ ایک سنتان کے بعد کم سے کم سات ورش تک دوسری سنتان نہ آنے پاوے۔ تب اس دیش میں سکھ اور سنتوش کا سامراجیہ ہوگا، تب استریوں اور بچوں کے منھ پر خون کی سرخی نظر آئے گی، تب مضبوط ہاتھ پاؤں اور مضبوط دل اور جگر کے پروش اتپن ہونگے۔ (میسز قانونی کمار کا پرویش)

قانونی کمار جلدی سے رپورٹوں اور پتروں کو سمیٹ لیتا ہے اور ایک اپنیاس کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔

میسز : کیا کر رہے ہو؟ وہی دُھن۔

قانونی : اپنیاس پڑھ رہا ہوں۔

میسز : تم ساری دنیا کے لیے قانون بناتے ہو۔ ایک قانون میرے لیے بھی بنادو۔ اس سے دیش کا جتنا بڑا اُپکار ہوگا اتنا اور کسی قانون سے نہ ہوگا۔ تمھارا نام امر ہو جائے گا اور گھر گھر تمھاری پوجا ہوگی۔

قانونی : اگر تمھارا خیال ہے کہ میں نام اور یش کے لیے دیش کی سیوا کر رہا ہوں، تو مجھے یہی کہنا پڑے گا کہ تم نے مجھے رتی بھر نہیں سمجھا۔

مسز : نام کے لیے کام کوئی برا کام نہیں ہے تمھیں یش کی اکانکشا ہو، تو میں اس کی نندا نہ کروں گی، بھول کر بھی نہیں۔ میں تمھیں ایک ایسی ہی تدبیر بتادوں گی، جس سے تمھیں اتنا یش ملے گا کہ تم اُوب جاؤگے۔ پھولوں کی اتنی ورشا ہوگی کہ تم اس کے نیچے دب جاؤگے۔ گلے میں اتنے ہار پڑیں گے کہ تم گردن سیدھی نہ کر سکو گے۔

قانونی : (اتسکتا کو چھپا کر) کوئی مذاق کی بات ہوگی۔ دیکھا مَیں کام کرنے والے آدمی کے لیے اس سے بڑی دوسری بادھا نہیں ہے کہ اس کے گھر والے اس کے کام کی نندا کرتے ہوں۔ میں تمھارے اس ویوہار سے نراش ہو جاتا ہوں۔

مسیز : طلاق کا قانون تو بنانے جا رہے ہو، اب کیا ڈر ہے۔

قانونی : پھر وہی مذاق۔ میں چاہتا ہوں تم ان پرشنوں پر گمبھیر وچار کرو۔

میسز : میں بہت گمبھیر وچار کرتی ہوں۔ سچ مانو۔ مجھے اس کا دکھ ہے کہ تم میرے بھاؤ کو نہیں سمجھتے۔ میں اس وقت تم سے جو بات کرنے جا رہی ہوں، اسے میں دیش کی انتی کے لیے آوشیک ہی نہیں پرماوشیک سمجھتی ہوں۔ مجھے اس کا پکا وشواس ہے۔

قانونی : پوچھنے کی ہمت تو نہیں پڑتی۔ (اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ہنستا ہے)

میسز : میں خود ہی کہنے آئی ہوں۔ ہمارا ویواہک جیون کتنا لجا سپد ہے، تم خوب جانتے

ہو۔ رات دن رگڑا جھگڑا مچا رہتا ہے۔ کہیں پروش استری پر ہاتھ صاف کرلیتا ہے، کہیں استری پروش کی مونچھوں کے بال نوچتی ہے۔ ہمیشہ ایک نہ ایک گل کھلا ہی رہتا ہے۔ کہیں ایک منہ پھلائے بیٹھا ہے، کہیں دوسرا گھر چھوڑ کر بھاگ جانے کی دھمکی دے رہا ہے۔ کارن جانتے ہو کیا ہے۔ کبھی سوچا ہے؟ پروشوں کی رسکتا اور کرپنتا یہیں دونوں عیب منشیوں کے جیون کو نرک تلیہ بنائے ہوئے ہیں۔ جدھر دیکھو اشانتی ہے، وِرودھ ہے۔ بادھا ہے۔ سال میں لاکھوں ہتیائیں انھیں برائیوں کے کارن ہوجاتی ہے، لاکھوں استریاں پتت ہوجاتی ہیں، پروش مدیہ سیون کرنے لگتے ہیں، یہ بات ہے یا نہیں ؟

قانونی : بہت سی برائیاں ایسی ہیں، جنھیں قانون نہیں دور سکتا۔

میسز : (قہقہہ مار کر) اچھا کیا آپ بھی قانون کی اکشھمتا سویکار کرتے ہیں؟ میں یہ نہیں سمجھتی تھی۔ میں تو قانون کو ایشور سے زیادہ سرو ویاپی سروشکتی مان سمجھتی ہوں۔

قانونی : پھر تم نے مذاق شروع کیا۔

میسز : اچھا لو کان پکڑتی ہوں۔ اب نہ ہنسوں گی۔ میں نے ان برائیوں کو روکنے کا ایک قانون سوچاہے۔ اس کا نام ہوگا۔ دمپتی سکھ شانتی بل اس کی دومکھیہ دھارائیں ہوں گی اور قانونی باریکیاں تم ٹھیک کر لینا۔ ایک دھارا ہوگی کہ پروش اپنی آمدنی آدھا بنا کان پونچھ ہلائے استری کو دے دے۔ اگر نہ دے تو پانچ سال کٹھن کاراواس اور پانچ مہینے کال کوٹھری۔ دوسری دھارا ہوگی، پندرہ سے پچاس تک کے پروش گھر سے باہر نہ نکل پاویں۔ اگر کوئی نکلے دس سال کاراواس دس مہینے کال کوٹھری۔ بولو منظور ہے؟

قانونی : (گمبھیر ہوکر) اسمبھو تم پرکرتی کو پلٹ دینا چاہتی ہو۔ کوئی پروش گھر میں قیدی بن کر رہنا سویکار نہ کرے گا۔

میسز : وہ کرے گا اور اس کا باپ کرے گا۔ پولیس ڈنڈے کے زور سے کرائے گی۔ نہ کرے گا تو چکی پیسنی پڑے گی۔ کرے گا کیسے نہیں۔ اپنی استری کو گھر کی مرغی سمجھنا اور دوسری استریوں کے پیچھے پیچھے دوڑنا، کیا خالہ جی کا گھر ہے؟

تم ابھی اس قانون کو اسوابھاوک سمجھتے ہو۔ مت گھبراؤ۔ استریوں کا ادھیکار ہونے دو۔ یہ پہلا قانون نہ بن جاوے تو کہنا کہ کوئی کہتا تھا۔ استری ایک ایک پیسے کے لیے ترسے اور آپ گلچھرّے اڑائیں دل لگی ہے۔ آدھی آمدنی استری کو دے دینی پڑے گی جس کا اس سے کوئی حساب نہ پوچھا جا سکے گا۔

قانونی : تم مانو۔ سماج کو مٹی کا کھلونا سمجھتی ہو۔

میسز : کداپی نہیں۔ میں یہی سمجھتی ہوں کہ قانون سب کچھ کر سکتا ہے۔ منشیہ کا سوبھاؤ بھی بدل سکتا ہے۔

قانونی : قانون یہ نہیں کر سکتا۔

میسز : کر سکتا ہے۔ اگر وہ زبردستی لڑکوں کو اسکول بھیج سکتا ہے۔ اگر وہ زبردستی وِواہ کی عمر نیت کر سکتا ہے۔ اگر وہ زبردستی بچوں کو ٹیکا لگوا سکتا ہے۔ تو وہ زبردستی پروش کو گھر میں بند بھی کر سکتا ہے۔ اس کی آمدنی کا آدھا استریوں کو بھی دلا سکتا ہے۔ تم کہو گے، پروش کو کشٹ ہوگا۔ زبردستی جو کام کرایا جاتا ہے۔ اس میں کرنے والے کو کشٹ ہوتا ہے۔ تم اس کشٹ کا انوبھو نہیں کرتے، اسی لیے وہ تمھیں نہیں اکھرتا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ سدھار ضروری نہیں ہے۔ میں بھی شکشا کا پرچار چاہتی ہوں۔ میں بھی بال وِواہ بند کرنا چاہتی ہوں، میں بھی چاہتی ہوں کہ بیماریاں نہ پھیلیں۔ لیکن قانون بنا کر زبردستی یہ سدھار نہیں کرنا چاہتی۔ لوگوں میں شکشا اور جاگرت پھیلاؤں، جس میں قانونی بھے کے بغیر وہ سدھار ہو جائے۔ آپ سے کرسی تو چھوڑی جاتی نہیں، گھر سے نکلا جاتا نہیں، شہروں کی ولاستا کو ایک دن کے لیے بھی نہیں تیاگ سکتے اور سدھار کرنے چلے ہیں آپ دیش کا۔ اس طرح سدھار نہ ہوگا۔ ہاں پرادھینتا کی بیڑی اور بھی کٹھور ہو جائے گی۔ (میسز کمار چلی جاتی ہیں اور قانونی کمار ایوستھت چتا سا کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔)

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی ماہنامہ 'مادھوری' اگست 1929 میں شائع ہوا۔ 'مان سرودر' 2 میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔)

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔